اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات

(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

مقالہ نگار

نسیمہ رحمان

نگران کار

ڈاکٹر سعادت سعید

(صدر شعبہ اردو)

شعبۂ اردو

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

۲۰۱۰ء

اردو نثر میں لاہور کی خدمات

(تحقیقی و تنقیدی جائزہ)

یہ مقالہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کو

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی سند عطا کیے جانے کے لئے پیش کیا گیا

مقالہ نگار

نسیمہ رحمان

رجسٹریشن نمبر

06-Ph.D-GCU-URDU-06

۰۶۔پی ایچ۔ڈی۔۰۶

لاہور۔پاکستان

۲۰۱۰ء

اقرار نامہ

میں، نسیمہ رحمان رجسٹریشن نمبر 06-Ph.D-GCU-URDU-06 اس بات کا اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ میں پیش کیا جانے والا مواد بعنوان

اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات

(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

میری ذاتی کاوش اور محنت کا نتیجہ ہے اور یہ کام پاکستان یا پاکستان سے باہر کسی بھی تحقیقی یا تعلیمی ادارے کی طرف سے شائع یا طبع یا پیش نہیں کیا گیا۔

نسیمہ رحمان

امیدوار پی ایچ۔ڈی (اردو)

۳۱۔اگست ۲۰۱۰ء

تصدیق نامہ/تصدیق برائے تکمیل مقالہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ تحقیقی مقالہ بہ موضوع

اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات
(تحقیقی وتنقیدی جائزہ)

نسیمہ رحمان رجسٹریشن نمبر 06-Ph.D-GCU-URDU-06 نے پی ایچ۔ڈی کی سند کے حصول کے لئے میری زیر نگرانی مکمل کیا۔

نگران
ڈاکٹر سعادت سعید
پروفیسر و صدر شعبہ اردو
جی سی یونیورسٹی، لاہور

۳۱۔اگست، ۲۰۱۰ء

بتوسط
ڈاکٹر سعادت سعید
پروفیسر و صدر شعبہ اردو
جی سی یونیورسٹی، لاہور

کنٹرولر امتحانات
جی سی یونیورسٹی، لاہور

فہرست ابواب

کتابیات ۵۵۳۔۔۵۷۴

ضمیمہ جات

(۱) مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر کا خطی عکس

(۲) ۹۔اپریل ۱۸۷۴ء کے ''پنجاب گزٹ'' میں پنجاب بک ڈپو سے شائع ہونے والی کتب کی فہرست

(۳) انیسویں صدی کے نصف دوم کے اخبارات و رسائل کی فہرست

(۴) بیسویں صدی کے اخبارات و رسائل کی فہرست

انتساب

پنج تن پاک کے نام

دیباچہ

لاہور ایک ایسا خطۂ سرزمین ہے جو قدیم زمانے سے جغرافیائی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، لسانی، روحانی اور ادبی حوالے سے اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔ انہی تمام عوامل کو کسی ایک چیز میں تلاش کرنا چاہیں تو ادب کی صورت میں ایک ایسا آلۂ کار ہمیں میسر ہے جس میں یہ تمام رنگ اپنی مختلف جہتوں کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ ادب خواہ جذبے کی صورت میں شعر کا پیکر اختیار کرے یا اس میں فکر و خیال نثر میں ڈھل کر سامنے آئے تخلیقی روایت کی جہت کا یہ دھارا مذکورہ روایات کو خود میں سموئے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔

تحقیق، تخلیقی روایت کو اس کی اصل کے ساتھ چھان پھٹک کر دیکھتی ہے تو تنقید اسے معیار کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ یوں تو تخلیقی اعتبار سے شاعری پہلے اور نثر بعد میں ظہور پذیر ہوئی لیکن میلان، رویے، رجحان اور تحریک کی صورت میں ایک مسلسل ارتقا دونوں میں کارفرما رہتا ہے۔ آج شاعری اور نثر دونوں میں موضوع، اسلوب، ہیئت اور فن کی سطح پر جو مہتم بالشان سرمایہ میسر ہے اس کے پیچھے ایک پوری روایت موجود ہے جو تغیر و تبدّل سے ہمکنار ہوتی ہوئی مختلف صورتوں میں ہم تک پہنچی ہے۔ خطۂ لاہور میں تخلیق کی اس روایت کو شعری حوالے سے حافظ محمود شیرانی کے علاوہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور ڈاکٹر علی محمد خان دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کر چکے ہیں۔ جبکہ لاہور میں لکھی جانے والی نثر سے متعلق ایسی کوئی کاوش یا جستجو سامنے نہیں آئی۔ حالانکہ اردو نثر آج جس مقام پر فائز ہے اس میں لاہور نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اردو نثر کے آغاز و ارتقا پر بیشتر تحقیقی و تنقیدی کتب اور ادبی تاریخوں میں جنوبی ہند (دکن)، شمالی ہند (دہلی)، لکھنؤ، فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج، غالب کی نثر اور سرسید تحریک کے منصۂ شہود پر آنے والی نثر پر ارتکاز کیا گیا ہے لیکن خطۂ پنجاب میں بالخصوص لاہور نے اردو نثر کے ارتقا میں جو خدمات انجام دی ہیں انہیں احاطہ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ حافظ محمود شیرانی نے قدیم نثری نمونے ''رسالہ ہزار مسائل'' اور ''پوتھی سلوتری'' نامی تصانیف کا ذکر کیا لیکن یہ پنجاب کے کس خطہ میں لکھی گئیں؟ اس ضمن میں نشاندہی نہیں ہو سکی۔ حافظ محمود شیرانی کی تحقیق و تدقیق کا متعد بہ حصہ پنجاب میں لسانیات اور اس میں بشمول لاہور کے شعرا کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر ادبی دنیا میں متعارف کرانے پر مشتمل ہے۔ استثنائی صورتوں میں ڈاکٹر ممتاز گوہر کی کتاب ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' میں محض اشارات سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی کتاب ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' میں بھی لاہور کی اردو نثر پر حوالے مل جاتے ہیں لیکن یہ چشتی خاندان تک محدود ہیں۔

لاہور، خطۂ پنجاب کا دارالحکومت ہونے کی وجہ سے سیاسی، سماجی، لسانی اور ادبی نمائندہ تھا۔ یہاں فارسی نثر کی مضبوط روایت کے ساتھ عربی، پنجابی اور اردو نثر لکھنے کا دستور بھی رہا ہے۔ بالخصوص اردو نثر کے آغاز و ارتقا پر کوئی واضح تحقیقی و تنقیدی

مطالعہ سامنے نہیں آسکا اسی لیے ڈاکٹر سہیل احمد خان (مرحوم) نے ''اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات'' (تحقیقی وتنقیدی جائزہ) کے موضوع پر مجھے پی ایچ۔ڈی کا مقالہ تحریر کرنے کی ترغیب دلائی اور یہی امر میرے لیے تقویت کا باعث بنا کہ لاہور میں لکھی جانے والی اردو نثر کو دریافت کیا جائے۔ سن ستاون کے بعد لاہور مرکز کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جہاں یوپی اور دیگر علاقوں سے اہل قلم حضرات نے لاہور کا رخ کیا۔نیز انگریز حکمرانوں کی سرپرستی نے اسے ترقی کی نئی راہوں پر گامزن کیا۔

اردو نثر کی تاریخ میں پہلی بار اس مقالے میں تحقیقی وتنقیدی حوالے سے لاہور کی خدمات بالخصوص انیسویں صدی کے نصف دوم (۱۸۵۰ء۔۱۹۰۰ء) کو احاطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔حوالے تلاش کرنے اور اصل ماخذ تک رسائی میں روایتی مشکلات درپیش رہیں۔اس کے باوجود تلاش وجستجو اور تنقیدی تجزیے سے لاہور میں اردو نثر کے واضح دستیاب شدہ ماخذوں کو اس تحقیقی مقالہ میں اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ مقالہ سات ابواب اور ایک مجموعی جائزہ پر مشتمل ہے۔

باب اول ''لاہور: تاریخ وتہذیب'' میں عہد غزنوی سے کلونیل دور تک لاہور کی تاریخ وتہذیب کا احاطہ کیا گیا ہے۔اس باب میں لاہور کے نام اور اس کی تاسیس کے ساتھ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ کس طرح لاہور کو تاریخ میں جغرافیائی، سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی، روحانی اور ادبی مرکز کے طور پر اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس ضمن میں تاریخی واقعات کے تسلسل کا بالخصوص خیال رکھا گیا ہے۔محمود غزنوی سے لے کر مغلوں کی آمد تک کے ثمرات؛ سکھوں کا عمل دخل، سکھا شاہی دور کی تخریب کاریاں اور الحاق پنجاب (۱۸۴۹) کے نتیجے میں تعمیر کی مختلف قوتوں کی کارفرمائی تاریخی تناظر میں پیش کی گئی ہے۔

باب دوم ''نثری سرمائے کا پس منظر'' ہے۔جسے تین ضمنی عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔پہلے عنوان **''نثر اور نثری اسالیب''** میں نثر کیا ہے؟ نظم ونثر میں فرق؛ شاعری کے مقابل اس کی اہمیت؛ اقسام اور اسلوب پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔دوسرے عنوان **''اردو ادب کا نثری سرمایہ** (سن ستاون سے پہلے تک)'' میں اولیاءکرام سے لے کر مرزا غالبؔ تک اردو نثر میں مذہبی، علمی، تنقیدی، تاریخی، قانونی، سائنسی اور ادبی موضوعات اور اسالیب کا اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔باب کے تیسرے ضمنی عنوان **''پنجاب میں اردو نثر کے ابتدائی آثار''** میں یہ بتایا گیا ہے کہ خطۂ پنجاب میں اردو کس طرح بول چال کی سطح سے بلند ہو کر تخلیق کی زبان بنی۔عہد غزنوی سے سکھا شاہی دور تک اولیا کے فقروں اور جملوں کے علاوہ صرف ونحو کے قواعد، شعرا کے کلام اور منظوم نصابی کتب سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا گیا ہے کہ اردو زبان کی بول چال کا وہ کون سا انداز ہوگا جو کسی نہ کسی سطح پر نثر میں بھی استعمال ہو رہا ہوگا چند استثنائی جملوں، ''رسالہ ہزار مسائل'' اور ''پوتھی سلوتری'' کے علاوہ یہاں نثر کی روایت نایاب رہی ہے۔اس کے مقابلے میں اردو شاعری موضوع اور اسلوب کے حوالے سے بکثرت موجود ہے۔لاہور میں سکھ عہد تک فارسی بدستور سرکاری زبان کے طور پر رائج تھی اور نثر میں تخلیقی اظہار فارسی ہی میں مروج ومقبول تھا۔لاہور میں طباعت کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر نسخے قلمی ہوا کرتے تھے پھر اس حوالے سے مسجد وزیر خان اور کشمیری بازار کتابت کے بہت

بڑے مرکز تھے۔کتابیات میں موجود مخطوطات کی دستیاب فہارس میں اردو شاعری اور نثر میں فارسی کے قلمی نسخے تو موجود ہیں لیکن اردو نثر میں کوئی مخطوطہ ۱۸۵۰ء سے قبل کا نہیں مل سکا۔یہی وجہ ہے کہ بالخصوص لاہور میں تخلیق کردہ شعری مواد سے ہی یہاں بولی اور لکھی جانے والی اردو زبان کا اندازہ لگایا گیا ہے۔

باب سوم کا مرکزی عنوان **"اردو نثر اور مرکز لاہور" (۱۸۴۹ء کے بعد کلونیل عہد میں اردو نثر کی ابتدا و فروغ)** ہے جسے پانچ ذیلی عنوانات میں منقسم کیا گیا ہے۔ایسٹ انڈیا کمپنی سے پنجاب کا الحاق (۱۸۴۹ء) ہی وہ نقطہ آغاز ہے جب خطہ لاہور کے لیے نہ صرف انتظامی ڈھانچہ مرتب کرتے ہوئے وسیع اصلاحی اقدامات کیے گئے بلکہ پریس کے قیام سے اردو نثر کی اشاعت کو بھی فروغ دیا گیا۔انگریزوں کا لاہور میں فارسی کی جگہ اردو نثر کو رائج کرنا ایک بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔جس نے ایک طرف ان کے مقاصد (مفاہمت اور اعتماد کا رشتہ استوار کرنا) کی تکمیل کی تو دوسری طرف اردو نثر کو تخلیقی اعتبار سے مقبول و ہر دلعزیز بنا دیا کہ فارسی لکھنے والے بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔مولوی احمد بخش یکدل ان میں سے ایک ہیں۔ڈاکٹر ممتاز گوہر نے یکدل کے تحریر کردہ چند جملوں کا ذکر انیسویں صدی کے نصف اول میں عہد رنجیت کے شعری نمونے کے طور پر کیا ہے جو درست نہیں ہے۔مقالہ نگار نے تحقیقی وتنقیدی تجزیے کی بنا پر یہ ثابت کیا ہے کہ یکدل کی اردو نثر کے نمونے بشمول ان جملوں کے ۱۸۵۶ء سے بھی بعد کے ہیں۔لہٰذا حوالے کے طور پر دیے گئے جملے کسی بھی طرح عہد رنجیت سنگھ سے منسوب نہیں کیے جا سکتے۔

لاہور میں کمپنی کے افسران کی آمد اور انتظامیہ کی معاونت کے لیے ماتحت اور معمولی درجے کے ملازمین یوپی، بہار اور بنگال سے کمپنی کے ساتھ آئے یہ اردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ اور کمپنی کے تربیت یافتہ تھے۔کمپنی کے افسران بھی اردو بولتے تھے۔انہوں نے اپنی آسانی کے لیے بھی لاہور میں فارسی اور پنجابی کی جگہ اردو کو فروغ دیا۔اسے عدالتی اور ضلعی انتظامیہ کی زبان بنایا۔یہیں سے اردو نثر کو فروغ ملنا شروع ہوا۔چنانچہ کلونیل عہد میں اردو ورنیکلر زبان ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے دفتری وانتظامی اور عدالتی امور میں استعمال ہونے لگی۔جس سے اردو نثر میں سرکاری سمن، پروانے، احکامات، عدالتی فیصلے، قانونی کتب کے تراجم اور شرحیں منظر عام پر آنے لگیں۔نیز "سرکاری اخبار" (۱۸۵۸ء) گنج شائگاں (۱۸۶۰ء)، "انوار الشمس" (۱۸۶۷ء)، اتالیق پنجاب (۱۸۶۹ء) وغیرہ نے بھی دفتری وقانونی نثر کو موضوع اور اسلوب کے حوالے سے فروغ دیا۔ان سب باتوں کو **"دفتری، انتظامی وعدالتی اردو نثر"** کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔**"انجمن پنجاب اور اردو نثر"** کے زیر عنوان نثر میں پیدا ہونے والے جدید خیالات اور تحقیقی وتنقیدی شعور کا احاطہ کیا گیا ہے۔حکومت کی ایما پر ڈاکٹر لائٹنر کی قائم کردہ "انجمن پنجاب" (۱۸۶۵ء) نے پہلی بار مجلسی تنقید کا آغاز کیا اور صحیح معنوں میں علمی، ادبی اور تنقیدی نثر کے فروغ کا باعث بنی۔عوام الناس کی اصلاح اور فلاح و بہبود کے لیے ڈاکٹر لائٹنر، پنڈت من پھول، پنڈت رادھا کشن، بابو چندر ناتھ

متر، منشی ہر سکھ رائے، مولانا محمد حسین آزاد، بابو نوبین چندر رائے، فقیر سید جمال الدین اور منشی امین چند وغیرہ نے انجمن کے جلسوں میں اخلاق وتہذیب سے متعلق عمدہ مضامین لکھنے اور پڑھنے کی روایت کا آغاز کیا۔ مذکورہ احباب میں مولانا آزاد نے سب سے فعال کردار ادا کیا اور انجمن کے زیر اہتمام سائنسی، لسانی، تاریخی اور تنقیدی موضوعات پر سب سے زیادہ لیکچر دیے جو باقاعدہ طور پر اس کام پر مامور کیے گئے تھے۔ اس سے نت نئے موضوعات کے ساتھ نئے اسالیب بیان بھی میسر آئے۔ نیز مولانا آزاد کی بیشتر تصانیف ''انجمن پنجاب'' کی ادبی نشستوں ہی کا نتیجہ تھیں۔ انجمن کے انہی جلسوں نے مولانا آزاد کو مغربی خیالات سے روشناس کرایا اور انہوں نے شاعری کے نئے تصورات پر لیکچر دیے جو جدید تنقید کا نقطۂ آغاز بھی ہیں۔ اورینٹل کالج یونیورسٹی لاہور کا قیام انجمن کا ایسا کارنامہ ہے جس سے بالواسطہ اور بلاواسطہ ریاضی، سائنس، طب، انجینئرنگ، قانون، منطق، اقتصادیات، لسانیات اور ادبی تراجم سے اردو نثر کے ارتقا کو تقویت دی۔ انجمن پنجاب ہی نے مولانا الطاف حسین حالی کو بھی جدید شعری وتنقیدی افکار وخیالات کو جاننے اور سمجھنے کا موقع دیا۔ انجمن نے ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ'' کے نام سے اپنے رسالے کا اجراء کیا جس میں انجمن کے جلسوں کی کارروائیاں؛ اس میں پڑھے جانے والے مضامین اور دیے جانے والے لیکچر شائع کیے جاتے تھے۔ اس رسالے نے علمی وادبی ذوق پروان چڑھانے کے ساتھ مضمون نگاری کی روایت کو فروغ دیا۔ جو مضامین نصاب سے متعلق ہوتے انہیں کمیٹی منظور کر کے اورینٹل کالج یونیورسٹی کے لیے کتابی صورت میں شائع کر دیتی۔ یہ مضامین سائنس، تاریخ، جغرافیہ، سیاست، انجینئرنگ، طب اور علم وادب کے موضوعات پر مشتمل ہوتے تھے۔ اخبار انجمن پنجاب کے صفحات پر بابو نوبین چندر رائے اور پنڈت رشی کیش اردو نثر کے زود نویس کے طور پر ابھرتے ہیں۔ ۱۸۷۴ء میں جدید مشاعروں کے انعقاد سے عمومی خبروں کے ساتھ یہ مشاعرے بھی 'گلدستہ' کے نام سے ''اخبار انجمن پنجاب'' کے ضمیمے کے طور پر چھپنے لگے۔ اب انجمن پنجاب میں پڑھے جانے والے مضامین اور لیکچر ''انجمن مفید عام قصور'' (جو انجمن پنجاب ہی کی ذیلی شاخ تھی) کے ''رسالہ'' میں شائع ہونے لگے۔ رسالہ کے صفحات پر مولانا محمد حسین آزاد اور مولوی سیف الحق ادیب کے علاوہ مرزا مولوی محمد فتح بیگ، ڈپٹی غلام نبی خان، مولوی محمد دین، مرزا افضل بیگ، پنڈت رادھا کشن، کنہیا لال کپور، عبدالحکیم کلانوری، منشی غلام جیلانی، مولانا الطاف حسین حالی، منشی دوست محمد خان، برکت علی خان اور مولوی کریم الدین وغیرہ مضمون نگار کے طور پر متعارف ہوئے۔ اس ''رسالہ'' سے معیاری مضامین کا معتد بہ نثری سرمایہ وجود میں آیا۔ انجمن پنجاب نے انجمن سازی کی بھی تربیت کی۔ نتیجتاً اس کی تقلید میں بہت سی انجمنوں کا قیام عمل میں آنا بھی اردو نثر کے لیے سودمند ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صفیہ بانو ''انجمن پنجاب تاریخ وخدمات'' نے انجمن پنجاب کے زیر اثر لکھی جانے والی جن نثری تحریروں کی فہرست دی ہے۔ مقالہ نگار نے تحقیق وتنقید سے یہ واضح کیا ہے کہ ان میں سے بیشتر انجمن پنجاب سے قبل منصۂ شہود پر آچکی تھیں اور جن کا انجمن پنجاب یا اس کے اثرات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

تیسرا حصہ **''تاریخ نویسی''** کے عنوان سے ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اگرچہ انگریز قوم یہاں کے باشندوں سے شکل

وصورت، رنگ ولباس، وضع قطع اوررسم ورواج ہر حیثیت سے جدا تھی لیکن انتظامی ضرورتوں کے تحت مقامی لوگوں کے قریب آنا اوران کی تاریخ وتہذیب اور رسم و رواج سے آگاہ ہونا ان کے لیے ناگزیر تھا۔اس مقصد کے لیے اردو زبان کے علاوہ تاریخ نویسی اہم ذریعہ تھی۔''یادگارچشتی'' (۱۸۵۸ء) مصنفہ مولوی نوراحمد چشتی لاہور میں لکھی جانے والی اولین تاریخ ہے۔ تاریخ نگاری کی اس روایت کودانستہ رواج دیا گیا۔ مقامی تاریخ وتہذیب سے شناسائی کے لیے دوسرا بہترین راستہ سفرناموں کی صورت میں تلاش کیا گیا۔یہ سفرنامے اس بات کے بھی غماز ہیں کہ انگریزوں کی آمد سے ذرائع آمدورفت نے راستوں کو سمیٹ دیا تھا۔''تحفۂ کشمیر'' (۱۸۵۲ء) سب سے پہلا سفرنامہ ہے جسے منشی ہرسکھ رائے نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا۔بعد ازاں ''سفرنامہ منشی امین چند'' وجود میں آیا۔یہ پہلا طبع زاد سفرنامہ تھا اس لیے مقالہ نگار نے اس کا تفصیلی تحقیقی وتنقیدی تجزیہ کیا ہے۔اس کے بعد دیگر سفرنامے لکھے گئے۔اپنی نوعیت کے یہ نئے سفرنامے تھے جنہیں **''نئے اردو سفرناموں کی نثر''** کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔جبکہ **''مذہبی نثر''** کے ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ عیسائی مشنریوں، علماء دین کی مذہبی سرگرمیوں اور تبلیغ اشاعت نے کس طرح اردو نثر کوموضوع اوراسلوب کے حوالے سے وسعت دی۔

باب چہارم **''کلونیل دور کی درسی کتب اور اردو نثر''** دوحصوں پر مشتمل ہے۔پہلا حصہ **''محکمہ تعلیم''** کے عنوان سے موسوم ہے۔انگریزوں کو اپنے نوآبادیاتی نظام کو قائم رکھنے کے لیے افرادی قوت درکار ہوئی تو انہوں نے میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں محکمہ تعلیم (۱۸۵۶ء) قائم کیا اور درسی کتب کی تیاری کا اہتمام کیا گیا۔اس کے لیے وقتاً فوقتاً انعامی مقابلوں کا اعلان اور ٹیکسٹ بک کمیٹی (۱۸۷۷ء) قائم کی گئی تھی۔سن ستاون کے بعد یہی وہ پلیٹ فارم ہے جس نے موضوع اوراسلوب ہر دوحوالوں سے اردو نثر کو علمی، ادبی اور فنی اعتبار سے روزافزوں ترقی دی۔ویسے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد لاہور، علم و ادب کا بہت بڑا مرکز بن جاتا ہے۔معیاری علمی، درسی ونصابی کتب کی تیاری اور تکمیل کے لیے یوپی سے تجربہ کار اہل علم حضرات کو لاہور لایا گیا جن میں بیشتر دہلی کالج کے قابل اساتذہ اور ہونہار طالبعلم شامل تھے۔جوقدیم وجدید علوم کے ساتھ انگریز سرکار کے مقاصد کو سمجھتے تھے اوران کی تکمیل میں معاون ثابت ہوئے۔مولوی کریم الدین، ماسٹر پیارے لال آشوبؔ، مولانا محمد حسین آزادؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، عزیز الدین خان، مولانا ضیاءالدین خان، منشی عزیز الدین اور آیا رام وغیرہ محض چند نام جنہوں نے نصابی ودرسی سلسلہ تصنیف وتالیف کو بہترین خطوط پر استوار کیا۔اگرچہ نصابی کتب کی نثر کو فنکشنل نثر میں شمار کیا جاتا ہے لیکن اسی نے ادبی نثر کے لیے بنیادفراہم کی۔اس ضمن میں بالخصوص مولوی کریم الدین، مولانا محمد حسین آزاد اور پیارے لال آشوب کی نثری تخلیقات نے ادبی نثر کی آبیاری کی۔یہی وجہ ہے کہ موضوع اور فن کے اعتبار سے ''رسوم ہند'' (۱۸۶۸ء) میں موجود قصے اولین افسانوں کی صورت میں دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اولین مکمل تمثیل ''جوہر عقل'' (۱۸۶۴ء)، ناول نگاری کی ابتدائی صورت ''نصیحت کا کرن پھول'' (۱۸۶۴ء)؛ ''خط تقدیر'' کا دیباچہ فکشن کی ترقی پسندانہ اور رومانوی تنقید کا اولین نقش؛ تاریخ نگاری میں ''قصص ہند''؛ لسانی مباحث میں ''سخندان فارس'' (۱۸۷۲ء)؛

باقاعدہ اولین ادبی تاریخ وتذکرہ اور خاکہ نگاری میں ''آب حیات'' (۱۸۸۰ء)؛ تمثیل وانشائیہ میں نیرنگ خیال (۱۸۸۰ء) کے علاوہ دیگر نصابی کتب نے بھی ادبی نثر کو فروغ دیا۔ نیز اس باب میں مقالہ نگار نے تحقیقی وتنقیدی حوالے سے اب تک پائی جانے والی اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ''قصص ہند'' (حصہ دوم) مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد کسی بھی درسی مقابلے کے تحت تحریر نہیں کی گئی تھی۔ درسی وتدریسی مقاصد کی معاونت اور تکمیل اور بالخصوص تراجم کے لیے ''پنجاب بک ڈپو'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے متعلق اہل علم اور ادباء کس قسم کا فریضہ انجام دیتے تھے اس کا ذکر اس باب کے دوسرے حصے **''پنجاب بک ڈپو''** میں کیا گیا ہے۔ پنجاب بک ڈپو میں انگریزی اور دیگر زبانوں کی کتابوں سے ترجمہ شدہ کتب کے ذخیرے کا واضح سراغ اور اس سے متعلق ضروری تفصیلات میسر نہ آسکیں اس لیے مقالہ نگار نے اس ضمن میں قیاسی تحقیق میں منطقی استدلال سے ایسی کتب کا تعین کیا ہے جن پر اغلب گمان ہے کہ وہ ''پنجاب بک ڈپو'' کی خدمت ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہیں۔

باب پنجم ''اردو نثر کی ترقی میں مطابع، اخبارات ورسائل کا کردار'' کے عنوان کے تحت صراحت کی گئی ہے کہ مطابع اور اخبارات ورسائل کے اجراء نے اردو نثر کی ترویج واشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان میں سے بیشتر کو حکومتی سرپرستی حاصل تھی۔ لاہور میں حکومتی سرپرستی میں قائم ہونے والا اردو کا پہلا مطبع اور جاری ہونے والا پہلا اخبار ''کوہ نور'' ہے جس کے مہتمم اور ایڈیٹر منشی ہرسکھ رائے تھے۔ صحافت ہی کی آغوش میں علمی وادبی نثر نے اپنا رنگ روپ نکھارا۔ عام خبروں کے علاوہ تواتر سے مضمون نگاری، قسط وار ناول، تنقید نگاری، کالم نگاری اور طنز ومزاح کے سلسلوں کا آغاز اخبارات ورسائل ہی سے ہوا۔ اس زمانے میں ادب اور صحافت کا خوبصورت امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ آج اردو نثر جس ترقی یافتہ صورت میں موجود ہے اس میں اخبارات ورسائل کا کردار نمایاں ہے۔ موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے ہر قسم کے اخبار اور رسالے کا اجراء کے سلسلہ نے اردو نثر کو تازہ کاری سے متصف کیے رکھا۔ اس باب میں ایسے ہی اخبارات ورسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

باب ششم ''انیسویں صدی کی آخری دو دہائیاں'' میں بتایا گیا ہے کہ اخبارات ورسائل اور درسی کتب کے نتیجے میں سوانح، ناول، ڈرامہ اور تراجم جیسی نثری اصناف فن اور اسلوب کی سطح پر اپنے خدوخال واضح کر چکی تھیں جن کا دائرہ نہ صرف لاہور بلکہ پنجاب بھر میں پھیل چکا تھا۔ نیز اس کے ساتھ طب، فلسفہ واخلاقیات، نفسیات، تاریخ اور دیگر متفرق موضوعات پر مشتمل کتب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تشکیل پا چکا تھا۔ نتیجتاً انیسویں صدی کے اواخر تک کوئی ایسا موضوع نہ تھا جو اردو نثر میں بیان ہونے سے رہ گیا ہو۔ مذکورہ ابواب میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں تشکیل پانے والا یہی وہ نثری سرمایہ تھا جو لاہور کی خدمات کا نتیجہ تھا اور اب تک منتشر اور تاریکی میں تھا۔ جس میں ترقی پسندی، رومانویت اور جمالیات کے عناصر موجود تھے۔ وجود میں آنے والا مذکورہ نثری سرمایہ ہی وہ اہم کڑی اور بنیاد ہے جس پر آج اردو نثر کی مہتمم بالشان عمارت مضبوطی سے قائم ہے۔

باب ہفتم **"بیسویں صدی میں اردو نثر کے امکانات"** مقالے کا آخری باب ہے جو دراصل اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات کے پیش منظر کی حیثیت رکھتا ہے۔اسے چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔حصہ اول **"اخبارات و رسائل"** ہے۔اس میں بتایا گیا ہے کہ مخزن اور اس کی تقلید میں جاری ہونے والے اخبارات و رسائل نے موضوع اور اسلوب کی سطح پر نثر کو انقلابی جہت سے ہمکنار کیا۔جن میں جدت تنوع اور جدید مغربی افکار و خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے نت نئے تجربات کو خوش آمدید کہا گیا۔ایک نئی بات یہ ہوئی کہ بیسویں صدی میں خالصتاً ادبی رسائل کا اجراء ہونے لگا۔یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جتنی بھی اصناف نثر ہیں سب کی سب ادبی رسائل کی آغوش میں پرورش پا کر توانا روایت کی صورت میں مقبول و معروف ہوئیں۔بیسویں صدی میں سیاسی و سماجی شعور نے بالخصوص اخبارات و رسائل میں آزادی اظہار کو فروغ دیا۔لسانیات، اقبالیات، غالبیات کے مستقل موضوعات اور تحقیقی و تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔چنانچہ اس صدی میں خالصتاً ادبی صحافت کو ترقی ملی۔اس حوالے سے چند نمایاں اخبارات و رسائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ **"علمی و ادبی انجمنیں، مجالس اور ادارے"** کے ضمن میں انجمن پنجاب کے تسلسل میں بیسویں صدی میں جاری رہنے والی انجمن سازی کا جائزہ لیتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ ادبی مجالس اور ادبی بیٹھکوں نے کس طرح اردو نثر میں جدید خیالات کی رو کو قائم رکھا۔نیز متنوع موضوعات پر علمی، سائنسی، اسلامی، تنقیدی، تحقیقی اور ادبی کتب شائع کرنے والے اداروں کی خدمات کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ ان اداروں کے ترجمان کے طور پر جاری ہونے والے رسائل کا ذکر "اخبارات و رسائل" کے ضمن میں کیا گیا ہے۔اردو نثر میں رومانوی، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے آزادانہ پلیٹ فارم سے پیدا ہونے والے نت نئے رویے، رجحانات مثلاً فطرت نگاری، نفسیات نگاری، اسلامی ادب، تہذیبی نظریے، لسانی تشکیلات، علامت نگاری اور تجریدیت نے موضوع اور اسلوب میں کبھی جمود نہیں آنے دیا۔انہی عوامل کا احاطہ اجمالاً **"تحریکات و رجحانات"** کے عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔مذکورہ تحریکات و رجحانات کا سب سے زیادہ اثر افسانوی ادب پر ہوا۔چنانچہ موضوع، اسلوب اور فن کے حوالے سے اس کی ارتقائی صورت کو اس حصہ میں پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس باب کے آخری حصہ **"اصناف نثر"** میں بیسویں صدی میں تحقیق و تنقید، ڈرامہ نگاری، طنز و مزاح، خطوط نویسی، خاکہ نگاری، کالم نگاری، خودنوشت سوانح، رپورتاژ، سفرنامہ اور انشائیہ کی مستقل صورت وجود میں آنے والی اصناف پر نگاہ ڈالی گئی ہے۔

مقالہ کے آخر میں جہاں **"مجموعی جائزہ"** لیا گیا ہے وہیں یہ باور کرایا گیا ہے کہ اردو کے ارتقا میں لاہور کی خدمات کو سرسید تحریک پر فوقیت حاصل ہے۔لاہور کی علمی و ادبی فضا نے سرسید کو قومی، علمی اور ادبی حوالے سے تحریک دلائی۔کتابیات کے ضمن میں اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ محکمہ تعلیم کی جانب سے شائع ہونے والی کچھ کتابیں ایسی دستیاب ہوئیں جن پر مصنف کا نام موجود نہیں تھا۔لہٰذا ان کا اندراج مصنف نامعلوم کے تحت کیا گیا ہے۔سب سے آخر میں چار ضمیمے دیے گئے ہیں۔ضمیمہ (ا) مولانا محمد حسین آزاد کی تحریر کا خطی عکس ہے جو اس عہد کے علمی و ادبی مباحث اور انداز تحریر کا بھی عکاس ہے۔

ضمیمہ (۲) میں ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء کے ''پنجاب گزٹ'' سے پنجاب بک ڈپو کے تحت شائع ہونے والی کتب کی فہرست درج کی گئی ہے۔ضمیمہ (۳) انیسویں صدی کے نصف دوم کے اخبارات ورسائل جبکہ ضمیمہ (۴) بیسویں صدی کے اخبارات ورسائل کی فہرست پر مشتمل ہے جو کتابیات میں موجود صحافت کی تاریخوں سے مرتب کی گئی ہے۔اس کا مدعا یہ تھا کہ اندازہ لگایا جا سکے کہ درحقیقت انہی نے اردو نثر کے ارتقا میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔چونکہ بیشتر اخبارات ورسائل متعدد بار بند اور دوبارہ جاری ہوئے مگر یہ کب تک جاری رہے اس بارے میں حتمی معلوم نہ ہو سکا اس لیے مذکورہ فہرست میں صرف سن اجراء پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

زیر نظر مقالہ میں اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات کے حوالے سے نہ صرف اس کے ماضی (انیسویں صدی کے نصف دوم) کو تابندہ کیا گیا ہے بلکہ بیسویں صدی پر بھی نگاہ رکھی ہے تا کہ بیک نظر یہ دیکھ سکیں کہ اردو نثر کن راستوں سے گزری اور فکری، علمی، تخلیقی، فنی اور اسلوبیاتی سطح پر کن رویوں، میلانات ورجحانات سے شناسا ہوئی۔ آخر میں اتنی سی تعلّی کی اجازت ضرور چاہوں گی کہ اس مقالہ کی صورت میں پہلی بار اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے دہلی، لکھنؤ، حیدرآباد، دکن اور سرسید تحریک کے تحت وجود میں آنے والی نثر سے اس کی الگ اور منفرد پہچان کی نشاندہی کی گئی ہے۔یہی وہ اہم کڑی تھی جو آج سے پہلے مفقود تھی۔لہٰذا اب سے اس نئی کڑی کو سرسید تحریک سے پہلے جوڑ کر ہی مجموعی طور پر اردو نثر کے ارتقا کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے گا۔تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں ہوتی اور یہی اس کا حسن ہے لیکن اس کے باوجود امید ہے کہ میری اس تحقیقی وتنقیدی کاوش کو سراہا جائے گا۔

مقالے کی تکمیل پر سب سے پہلے میں اللہ تعالیٰ کی بے حد شکر گزار ہوں کہ اس ذات باری تعالیٰ نے پنجتن پاک کے صدقے مجھے اس مقالے کو مکمل کرنے کا حوصلہ، ہمت اور توفیق عطا فرمائی اور انسانوں کو میرے لیے وسیلہ بنایا۔ان سب کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔یہ تحقیقی مقالہ میرے والدین (اللہ تعالیٰ ان کا سایہ ہمیشہ قائم ودائم رکھے۔آمین)، میری نانی اماں اور خالہ کی دعاؤں کا ثمر ہے ان کے لیے دل سے ڈھیروں دعائیں نکلتی ہیں۔تحقیقی مراحل کے دوران آخرالذکر دو ہستیوں کی وفات کا جانکاہ صدمہ بھی مجھے برداشت کرنا پڑا جو والدین کے بعد میرے لیے شجر سایہ دار تھیں (اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔آمین)۔اپنے بہن بھائیوں بالخصوص شازیہ، فوزیہ، سمیّہ، سارہ، محمد زبیر، اور محمد شہباز کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف میری حوصلہ افزائی کی بلکہ مجھے یکسوئی سے کام کرنے کے مواقع فراہم کیے اور میرا بھرپور ساتھ دیا۔میں نثار حسین صاحب کی بھی بے حد ممنون احسان ہوں جن کی ذات، دکھ اور پریشانی کے عالم میں وسیلۂ رحمت بنی۔ان کی ہمت افزائی، دعاؤں، نیک تمناؤں اور خلوص نے میرا حوصلہ ہمیشہ بلند رکھا۔میں ان کے لئے بے حد دعا گو ہوں۔

میں ڈاکٹر خالد آفتاب (وائس چانسلر، جی سی یو) کی شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ نہ صرف طلباء بلکہ اساتذہ کے

لیے بھی علم کی جستجو اور تحقیق کے یکساں مواقع فراہم کیے ہیں۔ان کی وقتاً فوقتاً حوصلہ افزائی نے اس تحقیقی مقالے کی تکمیل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ صاحبزادہ فیصل خورشید (رجسٹرار، جی سی یو) کے کلمات خیر اور دعا کے لیے ان کی بھی سپاس گزار ہوں۔ اس تحقیقی موضوع کو تفویض کرنے پر میں ڈاکٹر سہیل احمد خان (مرحوم) کے لیے بہت دعا گو ہوں۔اپنے اساتذہ ڈاکٹر معین الرحمٰن (مرحوم)، ڈاکٹر نیر صمدانی (مرحوم)، ڈاکٹر معراج نیر زیدی (مرحوم)، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر اصغر ندیم سید، ڈاکٹر محمد خان اشرف، ڈاکٹر شفیق عجمی، ڈاکٹر طارق حسین زیدی کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے علم کے حصول اور تحقیق و تنقید کا سلیقہ سکھایا۔ بالخصوص ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی ممنون احسان ہوں جن کہ رہنمائی، مفید مشورے، خلوص اور حوصلہ افزائی تحقیق کے اس کٹھن راستے پر مشعل راہ ثابت ہوئی۔ انہی کی ذات نے مجھ میں خالصتاً تحقیقی جستجو کا شوق پیدا کیا۔اس مقالہ کی تیاری میں اپنے نگران کار ڈاکٹر سعادت سعید کی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے تحقیقی مراحل میں مجھے سوچنے کے متنوع زاویے دیے اور تحقیق کی نئی راہیں سجھائیں اور جن کی مہربانی، توجہ اور حوصلہ افزائی قدم قدم پر میرے ہمرکاب رہی ان کی شفقت سے بھرپور باز پرس نے مقالے کی تکمیل کو ممکن بنایا۔ جی سی یونیورسٹی کی لائبریری سے بھرپور استفادے کے لیے میں عبدالوحید صاحب (چیف لائبریرین)، محمد نعیم صاحب (سینئر لائبریرین) اور عملہ لائبریری کی بے حد شکر گزار ہوں۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری سے استفادے کے لیے اجازت مرحمت فرمانے پر ہارون عثمانی صاحب (انچارج اوریئنٹل سیکشن) کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں۔ وقتاً فوقتاً ہمت افزائی کرنے پر ڈاکٹر اختر علی میرٹھی، ڈاکٹر سید مرتضٰی زیدی، ڈاکٹر ہارون قادر، ڈاکٹر ثاقب نفیس، پروفیسر محمد فاروق، ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی، تبسم عاصم، صائمہ ارم اور فرح کی ممنون ہوں۔ جی سی یو میں پروفیسر عظمت محمد فاروق (چیف پروکٹر) اور پروفیسر یوسف بشیر کی دعاؤں اور حوصلہ افزائی کرنے پر ان سب کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔حوصلہ بڑھانے اور کمپوزنگ کے مرحلے کو خوش اسلوبی سے پایۂ تکمیل پہنچانے پر عابد صدیقی صاحب کی بھی بہت شکر گزار ہوں۔

نسیمہ رحمان

باب اول

لاہور: تاریخ وتہذیب

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بیرونی اثرات دو اطراف سے وارد ہوئے۔ اول شمال کی جانب سے داخل ہوئے اور اس کی ابتدائی بستیاں سندھ اور ملتان میں قائم ہوئیں۔ دوم مغربی جانب سے پنجاب میں آئے۔ تاریخی مطالعہ ہمیں اس بات سے آگاہ کرتا ہے کہ پنجاب جو کہ ہندوستان کی خوش بختی کے ساتھ اس کی بدبختی کی کنجی بھی بنا رہا ہے اس کی جغرافیائی حدود ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہی ہیں۔ اس علاقہ کی کوئی پختہ حد بندی کبھی بھی نہیں کی جا سکی لیکن جو علاقہ ہمیشہ پنجاب میں شامل رہا وہ لاہور ہے یہاں تک کہ بعض جگہوں پر لاہور کا ذکر بمعنی پنجاب بھی ملتا ہے[۱]۔ ان میں کتاب الہند (البیرونی) زین الاخبار (گردیزی) تاریخ بیہقی پانچویں صدی کے نصف اول یعنی سلاطین غزنوی کے عہد اقبال میں تالیف ہوئی تھیں۔ ان میں بعض جگہ ''ولایت لوہور'' کا اس طرح مذکور ہے کویا یہ پورے صوبے یا ملک کا نام تھا[۲]۔ لاہور ہمیشہ سے پنجاب کا دارالسلطنت اور افغانستان، ہندوستان کی راہ میں واقع ہونے کی وجہ سے بیرونی حملہ آوروں کے لیے گذرگاہ اور سیاست و ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے:

> ''چونکہ پنجاب کو وادیٔ گنگا کے دروازے کی حیثیت حاصل تھی اس لیے سکندر اعظم کے زمانے سے یہ علاقہ حملہ آوروں کی مسلسل یلغار کا نشانہ بنتا رہا ہے جو لوٹ مار کرتے ہوئے جرنیلی سڑک (جو کہ دہلی کو کابل سے منسلک کرتی ہے) کے ذریعے وادیٔ گنگا و جمنا تک جا پہنچے۔ پنجاب کے اکثر قصبات جرنیلی سڑک کے کنارے پر ہی چھوٹے چھوٹے تجارتی مراکز کے طور پر ظہور میں آئے۔ مثال کے طور پر اٹک، جہلم، گجرات کی ترقی اسی وجہ سے ممکن ہو سکی کیونکہ وہ دریاؤں کے کنارے پر ان مقامات پر آباد ہوئے تھے جہاں سے دریاؤں کو عبور کیا جاتا تھا اسی لیے جغرافیائی اعتبار سے انہیں خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ پنجاب میں صرف لاہور اور کسی حد تک ملتان ایسے شہر تھے جو سیاسی و ثقافتی میراث کے حامل تھے لہٰذا ان دونوں شہروں کا شمالی ہند میں واقع دہلی، لکھنؤ، آگرہ جیسے ثقافتی و سیاسی مراکز سے تقابل کیا جا سکتا ہے''[۳]

''لاہور۔۔۔ لاہور ہے'' یہ جملہ ہم بڑی آسانی اور روانی سے بولتے ہیں لیکن لاہور کو لاہور بننے کے لیے کتنے نشیب و فراز سے گذرنا پڑا اس کو جاننے کے لیے جب تاریخ کے در وا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اہم دفاعی راستے پر واقع ہونے کی بنا پر ہمیشہ سے شمالی ہند کی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے والا شہر لاہور صدیوں تک تجارتی قافلوں، لوٹ مار کرنے والے گروہوں اور دولت و طاقت کے حصول کے لیے نکلنے والے فاتحین کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ لاہور کا ذکر سلطان سبکتگین غزنوی کے زمانے میں پہلی مرتبہ معین طور پر نویں صدی عیسوی میں ''حدود العالم''[۴] (۳۷۲ھ/۹۸۲ء) میں ملتا ہے کہ ''لاہور شہر کے بہت سے اضلاع ہیں اس کا حاکم امیر ملتان کا نائب ہے۔ اس کے بازار بڑے بارونق ہیں یہ مندروں کا شہر ہے۔ یہاں چلغوزے، بادام اور ناریل کے درخت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔''[۵] اس بات کی تائید ہاشمی فرید آبادی کے ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے۔ ''حقیقت کتاب الہند (البیرونی) میں اشارۃً اور آداب الحرب (فخر مدبر) میں صراحتاً منقول ہے کہ نویں

صدی عیسوی (قرن سوم ہجری) کے اواخر میں "لوہور" ایک جداگانہ ریاست کا نام تھا جو بیاس تا چناب تک پھیلی ہوئی تھی۔"۶

لاہور جس کا شمار دنیا کے قدیم اور مشہور شہروں میں ہوتا ہے جہاں ہندو راجاؤں، سلاطین، مغل شہنشاہوں، سکھ بادشاہوں اور برطانوی مقتدروں نے حکومت کی۔ یوں بلا شبہ یہ شہر صدیوں سے ہندوستان کے سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی مراکز میں سے ایک رہا ہے۔ اس شہر کو ایسا آئینہ قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا جس میں پنجاب کی رنگا رنگ زندگی کی ہر کرن اسی شہر سے منعکس ہوتی ہے۔ ایک پرانی ضرب المثل ہے کہ "اگر شیراز اور اصفہان اکٹھے ہو جائیں تو بھی وہ ایک لاہور نہیں بنا سکتے۔"۷

تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "لاہور" اپنے اندر ایک مقناطیسی کشش رکھتا ہے۔ مختلف ادوار میں یہ لفظ مختلف املا اور تلفظ کے ساتھ استعمال کیا جاتا رہا ہے جن میں لوہور، لوہاور، لوح کوٹ، لوہ کوٹ۸، الاھور، الہاور، لہور، لہاور، لہاوور، لھانور، لھانگر، لوبوکلا، لاأر، لہور، لہانور، لووھور، لوھور، لھاوور، لوھاور، لاوھور، لاہور، لھاور، لانہور، لھور، لوھادور، لھادور، لھادار، لوہ آور، لوہر، الہنور، لوپور کے علاوہ اسلامی دور میں لاہور کے لیے مبارک پور اور محمود پور کے نام بھی لیے جاتے رہے ہیں۔۹ جبکہ تاریخی شواہد کی روشنی میں لوہور، لہانور، محمود پور، لہاور اور لاھور ہی معتبر ٹھہرتے ہیں۔ محمود پور کے نام کی حقیقت کو سید ہاشمی فرید آبادی اس طرح آشکار کرتے ہیں:

> "البیرونی اور بیہقی کی تحریروں سے واضح ہے کہ مندککور، خود لاہور کا یا اس کے متصل قلعے کا نام تھا اور اس سے دارالحکومت کا کام لیا جاتا تھا یعنی اس کے احاطے میں سرکاری دفاتر قائم کیے گئے تھے۔ قرینہ کہتا ہے کہ شروع میں اسی بے ڈھنگے نام کو بدل کر محمود پور تجویز کیا گیا اور چند ابتدائی سنین میں اس کے دارالضرب سے وہ سکے مضروب ہوئے جن پر صاف محمود پور تحریر ہے"۱۰

دارالضرب کے ان سکوں کی عبارت کو ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی کے توسط سے اس طرح بیان کرتی ہیں:

> "محمود ہندوستانیوں سے ان کی زبان کے ذریعے قریب ہونا چاہتا تھا چنانچہ اس نے ایسے نقروی سکے درہم پر ہجری سنہ میں ایسی عبارت کندہ کرائی تھی جو مخلوط تھی سنسکرت لفظوں کے ساتھ عربی الفاظ بھی تھے۔ الفاظ یہ ہیں: ایا کم ایکم محمد اوتا رز پتی محمود ایام تنکو محمود پور گھٹے ہتو جنیا نا سمپت"۱۱

"لوہور" کی بابت سید ہاشمی فرید آبادی سید محمد لطیف کے حوالے سے لکھتے ہیں: "قریبی عہد یعنی سلطان مودود متوفی ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء وفرخ زاد بن مسعود اول کے چند لاہور کے مضروبہ سکے سلامت ہیں۔ پہلے پر "لوہور" ہی نقش ہے۱۲" "لاہور گزیٹیر" کے مترجم نعیم اللہ ملک کے مطابق "امیر خسرو دہلوی تیرہویں صدی کے آخر میں لاہور کو لہانور۱۳ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مراد شاہ لاہور نے اپنی مثنوی "مراد المحبین" (۱۲۱۲ھ/۱۷۹۸ء) لاہور میں تصنیف کی جس میں وہ لاہور کو لہانور۱۴ لکھتا ہے۔

لاہور کا اصل تلفظ جاننے میں فارسی مثنوی ''حقیقت الفقراء''۱۵؎ (۱۰۷۱ھ/۱۶۸۱ء) مصنفہ محمد پیر، ہماری مدد کرتی ہے جس میں کئی جگہ لاہور کا نام آیا ہے۔ جس میں لاہور بفتح ھا نہیں بلکہ بضم ھا استعمال ہوا ہے یعنی واؤ معروف پڑھی جاتی ہے۔ اس مثنوی میں لاہور ان مختلف تلفظ لاھور، بلاھور، لھاور، لہاور میں استعمال ہوا ہے۔

تاریخی حقائق کے پیش نظر مقالہ نگار کو ہاشمی فرید آبادی کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ''غزنوی اور غوری عہد میں یہ شہر زیادہ تر ''لوہور'' اور ''لُہادور'' ہی مشہور تھا۔ پنجابی لہجہ آج بھی لُہور تلفظ کرتا ہے''۱۶؎ اگر چہ ڈاکٹر انجم رحمانی کا یہ استدلال بھی درست ہے۔

> ''غزنوی اور سلاطین دہلی کے ادوار میں لاہور کا نام سرکاری طور پر ''لھور'' کی شکل میں لکھا گیا۔۔۔ مغل دور میں یہ ''لوہور'' سے لاہور کی صورت میں رائج ہو گیا پھر نام کی یہی صورت سکھ اور برطانوی ادوار میں جاری رہی البتہ پنجابی لہجے کی املائی صورت ابتدا سے آج تک اسی شکل میں جاری وساری ہے۔''۱۷؎

جہاں تک ''لاہور'' کے لغوی معنی کا تعلق ہے تو اس ضمن میں بھی مختلف مطالب بیان کیے گئے ہیں۔ بقول لیفٹیننٹ کرنل عبدالرشید ''جس طرح لاسہ کا مطلب بیت اللہ ہے اسی طرح لاہُر کا معنی بھی بیت اللہ ہی ہے۔ اگر تحت اللفظ لاہور کا ترجمہ کیا جائے تو اس کے معنی بھی بیت اللہ ہی نکلتے ہیں یعنی اللہ کا آباد کیا ہوا۔''۱۸؎ لاہور کے معنی کی ایک توجیہہ ڈاکٹر محمد باقر بھی روایت کرتے ہیں:

> ''۱۹۵۲ء میں مَیں کتاب خانہ ملی تہران میں چند علماء کی صحبت میں موجود تھا۔ لاہور کے نام کی وجہ تسمیہ کی بحث چل نکلی۔ ریڈیو کے مشہور افسانہ خواں آقای صبحی نے کہا: میرا خیال ہے یہ لاہور ایک مرکب لفظ ہے اور دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ دو لفظ ''لاؤ'' اور ''ھور'' ہیں۔ لغت ہای محلی میں ایران میں ''لاؤ'' کے معنی شہر کے ہیں اور ''ھور'' سورج کے معنوں میں عام استعمال ہے۔''۱۹؎

جبکہ ڈاکٹر انجم رحمانی تفصیل کے ساتھ اس کے مختلف لغوی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''لاہور کا ایک لغوی مطلب نشیبی علاقہ ہے۔ چونکہ لاہور قدیم زمانے میں دریائے راوی کے نشیب میں واقع تھا لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ اس کا یہ نام اس کی اسی پوزیشن کی وجہ سے پڑا ہو۔ دوسرے لغوی معنی زمین کا ایسا ٹکڑا ہے جو ایک ہی رہٹ سے سیراب ہو جائے۔ ظاہر ہے لاہور آغاز میں ایک چھوٹی سی آبادی تھی لہٰذا ممکن ہے کہ اس کا یہ نام اسی وجہ سے پڑا ہو۔ اگر ہم لاہور کی ایٹ مالوجی (Etmology) پر غور کریں تو لوھور دو لفظوں کا مرکب معلوم ہوتا ہے۔ لو اور ھور جس کے معنی علی الترتیب ''لوہا'' اور ''گھر'' کے ہیں۔ اس طرح اس نام کا مطلب ہوا ''لوہے کا گھر''۔ دوسرے لفظوں میں ایسی آبادی جو حفاظتی لحاظ سے محفوظ ہو۔۔۔ لو کا مقامی زبان میں دوسرا مطلب روشنی ہے اور ھور کا سورج۔ چونکہ لاہور ابتدا میں آفتاب

پرستوں کا شہر تھا اور چچ خاندان کے زمانے (متاخم ۹۹۹ء) میں آفتاب نامی مندر کی لاہور میں موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ اس مندر میں رکھے گئے بت کا نام آفتاب تھا۔ گویا یہ سورج مندر ہوا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو لاہور کے یہ معنی کسی حد تک معقول نظر آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں لاہور ''سورج دیوتا'' کا شہر ہوا۔۔۔ داراشکوہ نے الہ نور لکھا ہے بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہ ''لوہور'' ہندووانہ نام سے خوش نہ تھے جس کی وجہ سے انہوں نے لاہور کو سورج دیوتا کے مقابلے میں خدائے واحد کا نورانی شہر کہنا پسند کیا۔''[۲۰]

لاہور شہر کے نام اور معنی کے ساتھ اس کی تاسیس کے ضمن میں بھی مختلف آراء ملتی ہیں۔ بہت سے مورخین و احباب مصنفین [۲۱] کے مطابق: مشہور ہندو روایت ہے کہ لاہور کو راجہ رام چند ر کے بیٹے لو نے بسایا تھا جبکہ فقیر محمد فقیر اس کی تائید نہیں کرتے۔ ان کا استدلال بھی اپنی جگہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بعض منچلے تذکرہ نگار لاہور کو تاریخی طور پر راجہ رام چندر کے بیٹے لہو کا بسایا ہوا شہر مانتے ہیں مجھے ان حضرات کی تائید میں بھی تامل ہے کیونکہ اگر لاہور لہو کا بسایا ہوا ہوتا تو اس کی عوامی زبان سنسکرت ہوتی مگر تاریخ ہمیں اس امر کی بھی نشاندہی نہیں کرتی کہ لاہور کی عوامی زبان کبھی سنسکرت تھی۔ ابوالفضل نے اپنے دور میں جو لسانی فہرست مرتب کی ہے اس میں وہ پنجابی کو لاہوری لکھتے ہیں۔''[۲۲]

حافظ محمود شیرانی کے نزدیک اس زبان کو ابوالفضل ملتانی اور امیر خسرو لاہوری کے نام سے یاد کرتا ہے۔ امیر خسرو نے اپنی مثنوی ''نہ سپہر'' میں ہندوستان میں بولی جانے والی تیرہ زبانوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک ''لاہوری'' [۲۳] ہے۔ اگر اس لسانی بحث میں لیفٹیننٹ کرنل عبدالرشید کو بھی شامل کر لیں جن کے مطابق لاہور آرین اقوام کا قدیم مرکز [۲۴] ہے اور چونکہ آریہ کی زبان ویدی سنسکرت تھی اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانے میں یہاں کے باشندوں کی زبان ویدک سنسکرت اور دیسی زبانوں کا آمیزہ ہوگی۔ پھر حافظ محمود شیرانی کا خیال بھی اسے تقویت دیتا ہے کہ ''مسلمانوں کی آمد سے پیشتر سنسکرت زبان ہندوؤں کی مذہبی، علمی، درباری اور ادبی زبان تھی'' [۲۵] ایک پنجابی شاعر اپنی مثنوی مرزا صاحباں (۱۱۵۵ھ/۴۲ء۱۷) میں ایاز کو لاہور کا بانی بتاتا ہے [۲۶] جبکہ بقول طاہر لاہوری ''شیخ احمد زنجانی نے اپنی تصنیف 'تحفۃ الواصلین' میں لاہور کا ذکر کیا ہے۔ یہ رسالہ ۴۳۵ھ میں لکھا گیا۔ اس میں لکھا ہے کہ لاہور کی بنیاد چچ بندرا نے رکھی۔'' [۲۷] چچ خاندان کے راجہ راجپوت بھٹی تھے ان میں ہزت، ہزت اور چندرت کا نام لیا جاتا ہے جو ۳۸۹ھ تک حکمران رہے۔ لاہور کی تاسیس ہی کے حوالے سے انجم سلطان شہباز ''اقوام پنجاب'' میں رقمطراز ہیں:

''لاہور کی راجدھانی پر ایک مدت تک بھٹی قبیلہ حکمران رہا۔ لاہور کا شہر راجہ رام چندر کے بڑے لڑکے راجہ لو نے آباد کیا تھا بعد میں بے شمار خاندان حکمران بنے اور لاہور کئی بار بسا اور اجڑا۔ چونکہ یہاں زیادہ عرصہ راجپوت حکمران رہے اس لیے لاہور کو بھٹیوں کا مرکز کہا جاتا رہا ہے۔ بھٹی راجدھانی کی بنیاد راجا گنگ پال

نے رکھی تھی اور آخری راجا انند پال تھا جس نے محمود کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔ راجگان لاہور کو راجگان غزنوی، راجگان ہندنہ، راجگان و ہند بھی کہا جاتا ہے"۲۸

یاسر جواد کا کہنا ہے کہ "سوریہ بنسی راجپوت اس شہر کے بانی تھے"۲۹ درحقیقت ہندی مورخین راجپوتوں کو چھتیسیوں میں تقسیم کرتے ہیں جن کا تعلق خالص مذہب سے ہوتا ہے۔ ان میں ایک شاخ سورج بنسی بھی ہے جو سورج کو دیوتا مانتے تھے اس حوالے سے لاہور شہر کے معنی بھی اس کی مزید تائید کرتے ہیں۔ لہٰذا قرین قیاس ہے کہ یہی اصل میں لاہور شہر کے بانی ہوں گے۔ جہاں اتنے اختلافی بیانات پڑھنے کو ملتے ہیں وہیں ایک بیان مزید تحقیق کے در وا کرتا ہے کہ اصل شہر لاہور کہاں واقع تھا؟ اس ضمن میں ایک روایت شہر اور قلعہ کی صورت میں تو موجود۳۰ ہے ہی اس کے ساتھ اس بات کی بھی نشاندہی ملتی ہے کہ لاہور اچھرہ یا اس کے آس پاس واقع تھا۔

"اصل ہندو لاہور شہر موجودہ جائے وقوع پر نہیں تھا یا پھر مسلمانوں نے حتمی قبضہ کرنے کے بعد اسے تباہ اور پھر نئے سرے سے تعمیر کیا۔ اول الذکر رائے زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ پرانا شہر لاہور غالباً اچھرہ گاؤں کے آس پاس یعنی موجودہ پرانے لاہور سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ اچھرہ کو پرانے زمانے میں اچھرہ لاہور کہا جاتا تھا۔ پرانی دستاویزات میں اس کا ذکر ہے نیز قدیم اور مقدس ترین زیارت گاہیں مثلاً (بھیرو کا استھان) یہیں پر ہیں"۳۱

تاریخ جلیلہ کے مصنف غلام دستگیر نامی ہندو مسلم بیانات کی تطبیق کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"قدیم شہر، شہر ویران اور اس کی بجائے سیالکوٹ دارالسلطنت مقرر ہوا۔ ایاز نے پرانے کھنڈرات پر جو تعمیر کیا وہ موجودہ شہر اور قلعہ ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قدیمی ہندوی لاہور موجودہ اچھرہ کے قریب تھا۔۔۔ لاہور مستقل طور پر اسلامی حکومت کے ماتحت محمود غزنوی کے عہد میں آیا"۳۲

جبکہ تحقیق سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اچھرہ لاہور نہیں بلکہ لاہور کا ایک موضع تھا چنانچہ اچھرہ، مزنگ اور ررونہ۳۳ کو لاہور ہی کا موضع بھی کہا گیا ہے۔ پرانی دستاویزات میں اب بھی ان کو موضع لاہور لکھا ہوا ملتا ہے۔ بقول پروفیسر شجاع الدین "آج سے تقریباً ایک صدی قبل باغبانپورہ، چاہ میراں، گڑھی شاہو، گنج، اچھرہ، مزنگ، قلعہ گوجر سنگھ وغیرہ تحصیل لاہور کے گاؤں شمار کیے جاتے تھے اور مثال کے طور پر انہیں یوں لکھا جاتا تھا موضع مزنگ تحصیل و ضلع لاہور"۳۴ سبط حسن بھی اسی استدلال پر زور دیتے ہوئے رقمطراز ہیں "سو سال پیشتر تک باغبانپورہ، مغل پورہ، مزنگ، بادامی باغ، مصری شاہ اور اچھرہ وغیرہ لاہور کے مضافاتی گاؤں تھے بلکہ پٹواری اور پولیس کے کاغذات میں اب تک ان علاقوں کو موضع ہی لکھا جاتا ہے لیکن لاہور نے ترقی کی تو یہ موضع شہر کا جزو بن گئے"۳۵

تاریخی شواہد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لاہور شہر اپنے نام، تاسیس اور جغرافیائی حوالے سے ایک قدیم تاریخی شہر ہے۔ تاہم ساتویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں مسلمانوں کی پہلی یلغار کے وقت لاہور اجمیر خاندان کے ایک چوہان شہزادے کے قبضے میں تھا۔ ۶۸۲ء میں کرمان اور پشاور کے افغان جو اسلام قبول کر چکے تھے؛ ہندو بادشاہ سے مخصوص علاقے چھین لیے۔ نتیجتاً جنگ ہوئی جس میں افغانوں نے ہندو گکھڑوں کے ساتھ اتحاد کر کے راجا کو اپنے علاقے کا ایک حصہ ان کے حوالے کرنے پر مجبور کر دیا۔ تاریخ فرشتہ کے مطابق ''راجہ لاہور نے بھی افغانوں سے لڑائی بند کر دی اور ان سے صلح کر کے لمغان کے چند گاؤں ان کے دیئے''۳۶؎

بعد ازاں پنجاب اور سرحد میں ہندو شاہی خاندان مسلط نظر آتے ہیں۔ لاہور کے ہندو حکمرانوں میں جے پال، انند پال اور تر لوچن پال نے دو صدیوں تک بیرونی حملہ آوروں کی سخت یورشوں کی مزاحمت کی اور ملک میں ان کی مزید پیش قدمی کو روکے رکھا۔

تاریخ فرشتہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس پیش قدمی کو انہوں نے افغانوں اور خلجیوں کی مدد سے روکا جو ان کے بغیر ممکن نہ تھا۔ خلجیوں نے بھی راجہ کے خلاف جنگ میں افغانوں کی مدد کی تھی اور انہیں اس شرط پر افغانوں کی سی مراعات دیں کہ وہ افغانوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے مقابلے میں سرحد کی حفاظت کریں۔ چنانچہ افغانوں نے پشاور کے کوہستان میں ''خیبر'' کے نام سے ایک حصار کھینچا اور وہ ملک پر ایسے قابض ہوئے کہ انہوں نے کسی سامانی لشکر کو لاہور تک نہ پہنچنے دیا۔

لاہور میں محمود غزنوی کی آمد سے قبل دسویں صدی ہجری کے ربع آخر میں راجہ جے پال ایک وسیع علاقے پر حکمران تھا۔ پنجاب کی وسعت پشاور سے لمغان اور کشمیر سے ملتان تک تھی۔ وہ ۱۰۱۶ء تک اس علاقے پر حکمران رہا۔ ادھر افغانستان میں سامانی بادشاہ عباسی خلفاء کی طرح اپنی فوجوں میں ترک رکھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ عبد الملک سامانی جو غزنی کے وسیع علاقے پر حکمران تھا اس کے ترک غلام الپتگین جو سامانیوں کا ایک مقتدر جرنیل تھا جس نے بعد ازاں اپنے آقا منصور بن عبد الملک سے علیحدگی اختیار کی اور سامانیوں کی طرف سے حاکم خراسان مقرر ہو کر حکمران بن گیا۔ اس نے غزنی تک اپنی سلطنت کو وسیع کر لیا اور پندرہ سال تک کامیابی سے حکومت کی۔ اسی عرصہ میں الپتگین کا انتقال (۳۶۵ھ) ہو گیا جس کے بعد اس کا ترک غلام سپہ سالار اور داماد امیر ناصر الدین سبکتگین حکمران بنا۔ عدل وانصاف، مہربانی، جہانداری اور اپنی فتوحات سے سلطنت غزنی کو تقویت بخشی۔ سبکتگین کا کئی بار ہندوؤں سے مقابلہ ہوا اور وہ ان کے مقابلے پر فتح یاب رہا۔ ۹۷۵ء میں سبکتگین نے دریائے سندھ کے پار چڑھائی کی۔ جس کا مقابلہ لاہور کے برہمن قوم کے راجہ جے پال (راجہ استپال کا بیٹا) نے کیا۔ بھٹی قبیلے کے شہزادے کے مشورے پر راجا نے افغانوں سے اتحاد کیا اور ان کی مدد سے پہلے حملے کا جواب دینے کے قابل ہوا۔ یوں راجا کو مسلمانوں کی سلطنت کے پھیلاؤ پر تشویش ہوئی اور اس نے ۳۷۶ھ میں سبکتگین کے سرحدی علاقے پر حملہ کر دیا۔ لمغان

کے نواح میں گھمسان کی جنگ میں جے پال کو شکست ہوئی نتیجتاً ایک لاکھ درہم تاوان جنگ ادا کرنے اور پچاس ہاتھی بطور نذرانہ پیش کرنے کے وعدے پر لاہور واپس آیا۔ خراج وصول کرنے کے لئے سبکتگین کے نمائندے ساتھ آئے۔ لاہور پہنچ کر راجا جے پال کا ارادہ بدل گیا اور اس نے ان نمائندوں کو جیل میں ڈال دیا جس کے ردعمل پر ایک اور لڑائی ہوئی اور راجا جے پال کو دوسری بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس فتح کے بعد سبکتگین اپنا ایک گورنر مع دس ہزار سواروں کے پشاور میں متعین کر گیا۔ یوں ایک طرح سے پشاور تک کا علاقہ غزنی میں شامل کر لیا گیا۔ شکست کھانے کی وجہ سے راجا جے پال دریائے سندھ کے مغرب کا سارا علاقہ بشمول لمغان و پشاور سبکتگین کے قبضے میں چھوڑ کر ہندو رسم جوہر۳۷ کے مطابق اپنے ہی دارالحکومت کی فصیل کے باہر خود کو آگ لگا لی۔ راجا جے پال کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا انند پال تخت پر بیٹھا۔ ادھر سبکتگین کا بھی انتقال (۹۹۷ء) ہو گیا۔ اس کے بڑے بیٹے ابوالقاسم محمود غزنوی نے ۹۹۸ء میں عنان حکومت سنبھالی۔ راجا انند پال کو اپنے باپ راجا جے پال کی ذلت آمیز موت کا بہت رنج تھا اس نے سارے ہندوستان کے ہندو راجاؤں سے امداد طلب کی اور ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ پشاور کے قریب حملہ آور ہوا۔ محمود غزنوی اور اس کے لشکر نے راجا انند پال کو شکست دی۔ راجا انند پال بھی باجگزاری کا وعدہ دے کر واپس چلا آیا۔ اس واقعہ کے تقریباً تیرہ برس بعد تک لاہور میں امن و امان رہا۔ محمود غزنوی ہندوستان کی دیگر فتوحات قنوج، گوالیار، کانگڑہ، کالنجر، سومنات وغیرہ میں مصروف رہا۔ راجا انند پال کے بعد اس کا بیٹا جے پال ثانی لاہور کا حکمران ہوا۔ جے پال ثانی کی فتنہ پروری اور بدعہدی کی وجہ سے ۱۰۲۲ء میں محمود غزنوی کشمیر سے آیا اور لاہور پر بغیر کسی مزاحمت کے قبضہ کر لیا اور اسے تاخت و تاراج کیا۔ راجا جے پال ثانی اجمیر بھاگ گیا اسی کے ساتھ ہی لاہور میں ہمیشہ کے لیے ہندو حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ بعد ازاں محمود غزنوی دور حکومت میں ۱۰۲۵ء میں راجا جے پال ثانی نے اپنی حکومت بحال کرانے کے لیے ایک آخری کوشش کی جس میں چھ ماہ کے طویل بے کار محاصرہ کے بعد وہ پسپا ہو گیا۔ محمود غزنوی جب اپنے مفتوحہ علاقوں کے انتظام کے لیے روانہ ہوا تو اس نے اپنے معتمد افسر ملک ایاز کو لاہور کا گورنر مقرر کیا، تمام مقامات پر فوجی چوکیاں قائم کیں اور یہاں مستعد افسران متعین کیے یوں لاہور غزنوی سلطنت سے ملحق ہو گیا۔ ملک ایاز نے اپنے دور نظامت میں لاہور کا نہایت اچھا انتظام کیا۔ اس نے یہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرایا، شہر کی فصیل کو وسیع کیا علاوہ ازیں شہر کی خوبصورتی میں اس قدر اضافہ کیا کہ اس کا شمار اہم شہروں میں ہونے لگا۔

سلطان محمود غزنوی کا عہد غزنویوں کے عروج کا زمانہ ہے۔ اس عظیم فاتح نے ہندوستان اور ایران کے بیشتر حصے اپنی مقبوضات میں شامل کیے۔ یہ پہلا بادشاہ تھا جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ محمود غزنوی اور اس کی افواج کی آمد سے لاہور میں سماجی، ثقافتی، تمدنی، تہذیبی، روحانی، لسانی اور معاشی سطح پر تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ محمود غزنوی کی آمد سے قبل یہاں صرف ہندو آبادی تھی لیکن لاہور کے غزنی مقبوضات میں شامل ہونے سے یہاں اسلامی تہذیب و تمدن کے عناصر پروان چڑھنا شروع ہوئے۔ غزنوی کے آنے سے دو بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں ہیں۔ پہلی یہ کہ دو بڑی تہذیبوں کا ملاپ عمل

میں آیا دوم لسانی فکری اور ذہنی سطح پر طرز احساس کے نئے در وا ہوئے اور ایک اسلامی طرز احساس فروغ پایا اور لاہور اسی نئے کلچر کا ابتدائی مرکز بنا۔اس طرح لاہور میں ایک نئے دور کا آغاز محمود غزنوی کی آمد سے ہوا۔اس عہد میں لاہور کو بڑی ترقی اور اہمیت ملی۔وہ فاتح بن کر آئے لیکن لاہور کو انہوں نے اپنے وطن کی حیثیت دی۔لاہور میں اہل ہنود مقیم تھے۔غزنوی دور میں ہزاروں خاندان غزنی اور ایران کے دیگر حصوں سے ترک وطن کر کے یہاں آباد ہو گئے۔اس طرح مقامی ہندو معاشرہ جو پہلے تہذیبی و سیاسی سطح پر جمود کا شکار تھا اس میں مسلمانوں کے عقیدہ، زبان اور معاشرت کی صورت میں کچھ نئے اثرات داخل ہونے لگے جس کے نتیجے میں یہاں کے آداب، رسم و رواج، رہن سہن کے طریقہ کار اور بول چال کی سطح پر تبدیلی رونما ہونا شروع ہوگئی۔مٹی اور کانسی میں ظروف سازی مجلوں کو تصویروں سے آراستہ کرنا اور لکڑی میں کھدائی غزنوی تمدن ہی کی دین ہیں۔غزنی سے آنے والوں میں صوفیاء، علماء اور شعراء بھی شامل تھے۔ان کی آمد سے جہاں لاہور میں فارسی زبان کا رواج ہوا وہیں لاہور کی مقامی زبان پنجابی سے فارسی کا اختلاط بھی ہوا اور ایک نئی زبان 'اردو' اس طرح وجود میں آئی۔

> ''مسلمانوں کے الفاظ یہاں کی زبانوں میں شامل ہونے لگے جسے سہولت اور ضرورت کے لیے دونوں قومیں استعمال کرتی تھیں۔آنے والے مسلمان ہندوؤں کے الفاظ صحیح تلفظ و لہجہ سے ادا نہیں کر سکتے ہوں گے۔اسی طرح ہندو عربی اور فارسی کے الفاظ اپنے مخصوص صوتی نظام کے مطابق ادا کرتے ہوں گے اور چونکہ ایک دوسرے کے الفاظ کا استعمال اس دور کی معاشرتی ضرورت تھی اس لیے لفظوں کی یہ بگڑی ہوئی شکل عام و مروج ہو کر ایک نئے روپ میں ڈھل گئی اور یہی اردو کی ابتدائی شکل ہوگی یعنی ایک ایسی زبان جس میں اس علاقے کی مختلف زبانیں بولنے والے لوگ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے ہوں گے۔''[۸]

اسی عہد میں حسین شاہ زنجانی، حضرت داتا علی ہجویری، فخر الدین میراں، سید اسماعیل محدث بخاری لاہور تشریف لائے۔ان صوفیاء کی تشریف آوری اور رشد و ہدایت کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہمی میل جول اور ایک دوسرے کے افکار و نظریات سے واقف ہونے کا زیادہ موقع ملا۔ غزنویوں کے مسلسل حملوں کی وجہ سے ہندو مسلمانوں سے بہت زیادہ متنفر ہو چکے تھے۔ان مشکل حالات میں ان صوفیاء نے اپنے علم اور پاکیزہ کردار سے ہندوؤں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور بڑی تعداد میں ہندو جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔عہد غزنوی کے تاریخی حالات کا بغور مطالعہ کریں تو پروفیسر خلیق احمد نظامی کا حضرت علی ہجویری کی نسبت صوفیاء کے بارے میں یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''آپ اور بعد میں آنے والے بزرگان دین نے ہندو مسلم مخالفت کو صوفیانہ محبت اور رواداری سے دوستی میں تبدیل کر دیا''[۹] ان صوفیاء کی آمد سے لاہور میں اسلامی درسگاہیں اور مساجد قائم ہوئیں اور اسلامی علوم و فنون کا آغاز ہوا۔ان درسگاہوں میں ہر مذہب اور ملت کے لوگوں کو حصول علم کی عام اجازت تھی۔ابراہیم غزنوی کے ایک وزیر ابونصر فارسی نے ایک خانقاہ ''ابونصر'' بھی تعمیر کرائی جو اہل علم کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی۔''علامہ سمنانی نے اپنی کتاب 'الانساب' میں لاہور کو ایک بابرکت اور کثیر الخیر شہروں میں شمار کرتے

ہیں"۲۰ے

محمود غزنوی اور اس کے وزراء اور امراء کی علم دوستی اور ادب پروری سے لاہور بہت جلد ایک علمی و ادبی مرکز بن گیا۔ محمود غزنوی شعراء کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "سلطان محمود کے دربار میں جس قدر شاعران با علم اور بہادران روزگار جمع تھے اتنے شاید ہی کسی دوسرے بادشاہ کے دربار میں جمع ہوئے ہوں"۲۱ے اسے جہاں کہیں علماء کا پتہ چلتا انہیں اپنے دربار میں لانے کی کوشش کرتا فوجی مہمات میں اکثر شعراء اس کے ہمرکاب ہوتے۔ پروفیسر براؤن نے سلطان محمود غزنوی کو اسی وجہ سے "اغوا کنندہ علماء"۲۲ے لکھا ہے۔ عصائری رازی، اسد طوسی، منوچہر بلخی، عسجدی، حکیم عنصری، فرخی اور دقیقی کے علاوہ البیرونی جیسا عالم و فاضل بھی اس کی ملازمت میں رہا جس نے ہندوستان کے تہذیب و تمدن پر عربی میں شاہکار کتاب "تحقیق ماللہند" لکھی۔

لاہور میں غزنوی دور کے شعراء کا ذکر عوفی کے تذکرہ "لباب الالباب" میں ملتا ہے۔ جس کی تفصیل "فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ" میں دیکھی جاسکتی ہے ۲۳ے۔ ابوالفرج رونی کے علاوہ مسعود سعد سلمان جواب تک کی تحقیق کے مطابق اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہے اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔ مسعود سعد سلمان نے ہندی، اردو، فارسی اور پنجابی ۲۴ے زبان میں شاعری کی۔ غزنوی عہد میں سنسکرت، ہندی، عربی، فارسی، پنجابی زبانوں کا رواج تھا۔ فارسی نے یہاں کی مقامی پراکرت لاہوری (جو پنجابی ہی تھی) کو متاثر کیا اور خود بھی اس سے متاثر ہوئی۔

> "البیرونی کے مطابق سنسکرت لکھائی پڑھائی کی مقبول عام زبان تھی فارسی، عربی اور بعض دوسری مقامی زبانیں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھیں۔ کاغذ اور تعلیمی مدرسوں کے رواج عام سے کتابت کا فن بڑا مقبول ہوا۔ تاریخ بیہقی کے مطابق اس وقت لاہور میں باقاعدہ دفتر دیوان قائم ہوا۔ قلم دوات اور کاغذ بھی عمدگی سے دستیاب ہونے لگا"۲۵ے

غزنوی دور میں عربی زبان استعمال کی گئی، فارسی کو فروغ ملا اور اردو زبان کا آغاز ہوا ۲۶ے اس دور میں فارسی اور اردو زبان میں شعری سرمایہ تو ملتا ہے لیکن نثری سرمایہ ہم تک نہیں پہنچتا ماسوائے اس دور کے اہم ترین نثر نگار حضرت علی ہجویری کی فارسی تصنیف "کشف المحجوب" کے جو انہوں نے لاہور ہی میں بیٹھ کر لکھی۔ چنانچہ اردو اور فارسی شاعری کا سرچشمہ لاہور کی سرزمین سے ہی پھوٹا۔ فن موسیقی کو فروغ ملا۔ اس دور کے مروجہ ساز چنگ، بربط، عود، نے اور طبل تھے۔ بقول سید سبط حسن:

> "جب لاہور غزنویوں کا پایہ تخت ہوا تو شاہی درباروں اور امرا کی حویلیوں میں نشاط و طرب کی محفلیں جمنے لگیں۔ ابتدا میں ان کے گویے سازندے اور ساز بیشتر ایرانی ہوتے تھے۔ ان کی راگ راگنیاں بھی زیادہ تر ایرانی ہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ ہندوستانی موسیقی بھی دربار میں باریاب ہونے لگی"۲۷ے

غزنوی عہد ہی میں لاہور بطور ٹکسال کے بھی اہمیت اختیار کر گیا:

''سلطان محمود نے اس ٹکسال سے اپنا ایک سکہ جاری کیا جس کے ایک طرف عبارت کوفی رسم الخط میں اور دوسری طرف سنسکرت زبان میں دیوناگری رسم الخط میں تحریر تھی۔ سلطان محمود نے اس سکہ پر شہر کا نیا نام محمود پورہ ٹھپہ کرایا، سکوں اور کتبوں پر عربی عبارتوں کا رواج یہاں ایک نئی تمدنی اختراع تھی''۴۸؎

''سلطان محمود غزنوی نے لاہور سے ۱۰۲۷ء اور ۱۰۲۸ء میں بھی ایسے سکے جاری کروائے جن کے سیدھے رخ عربی میں کلمہ طیبہ اور الٹے رخ سنسکرت زبان میں اس کا ترجمہ اور لاہور کا نام محمود پورہ ٹھپہ تھا۔ لاہور سے جاری ہونے والے اپنی نوعیت کے یہ پہلے سکے تھے''۴۹؎

عہد غزنوی ہی میں عالیشان تعمیرات کا تذکرہ بھی ملتا ہے کہ ''عہد غزنوی کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان لاہور کے عالیشان محلات بھی لاہور میں تعمیر ہوئے تھے جن کا ذکر مسعود کے استاد الفرج رونی نے اپنے قصائد میں بخوبی کیا ہے''۵۰؎ عہد غزنوی ہی میں دیوناگری کی جگہ اسلامی خط، خط کوفی اور خط نسخ رائج کئے اسی خط میں دور غزنوی کے سلطنتی اور علمی امور کو لکھا جاتا۔ اسی دور میں عربی خط، خط بہار معرض وجود میں آیا جو قرآن اور تفسیری خطاطی کے لیے مستعمل ہوا بعد ازاں خط کوفی کو ترک کر کے ایک نیا خط تعلیق بنایا گیا۔ غزنوی عہد میں لاہور کو اپنی اس رونق کی بناء پر ''غزنین خورد''۵۱؎ ''ثانی غزنین''۵۲؎ ''غزنہ خورد''۵۳؎ کہا گیا۔ چنانچہ لاہور غزنوی دور میں اسلامی تہذیب وتمدن کے مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔ پروفیسر شجاع الدین عہد غزنوی کی اسی کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

''غزنوی دور کی معارف پروری اور علم نوازی کی داستانیں زبان زد عام ہیں۔ اس عہد میں غزنی علماء وفضلا کا مسکن وماوی بن چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی سلطنت کا دوسرا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی علم وفضل کا مرکز بن گیا۔ یہاں سے حکام کے درباروں میں علماء کی تعداد کثیر نظر آنے لگی۔ اس زمانے میں بے شمار مسلمان خاندان دوسرے ممالک سے تلاش معاش، سرکاری ملازمت یا تبلیغ وغیرہ کے مقاصد کے لیے لاہور میں آباد ہو گئے۔ مقامی باشندے بھی جوق در جوق مسلمان ہونے لگے اور یہاں ایک مسلم سوسائٹی عالم وجود میں آ گئی''۵۴؎

سلطان محمود غزنوی کی وفات (۴۲۱ھ) کے بعد سلطان کے بیٹے امیر محمد نے حکومت سنبھالی لیکن سلطان کے دوسرے بیٹے مسعود نے محمد کو تخت سے الگ کر کے خود حکومت پر قابض ہو گیا۔ اس کے زمانے میں سلجوقیوں کی قوت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ مرو کے مقام پر ان سے شکست کھا کر واپس آ گیا اور وہاں سے اس نے ہندوستان کے غزنی مقبوضات کا رخ کیا۔ پہلے سلاجقہ اور بعد ازاں غوریوں کی بڑھتی ہوئی قوت نے غزنویوں کو غزنی چھوڑنے اور لاہور میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ مسعود ثالث کے عہد (۱۰۹۹ء۔۱۱۱۴ء) میں غزنی کے بجائے لاہور کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ اس زمانے

میں لاہور خطے کی معاشی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کر رہا تھا چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ "بارہویں صدی کی ایک آرمینیائی دستاویز سے لاہور ایک بہت بڑا اور سرمایہ دار شہر معلوم پڑتا ہے اس میں تحریر ہے کہ یہ خوشحال شہر ہے اور اس ملک میں جو چیز بھی اچھی یا قیمتی ہوتی ہے وہ یہاں مل جاتی ہے" ۵۵

سلاطین کا زیادہ وقت پنجاب ہی میں گذرتا حتیٰ کہ غوریوں نے غزنی پر قبضہ (۱۱۷۳ء) کرنے کے بعد ۱۱۸۶ء میں آخری غزنوی سلطان خسرو ملک سے لاہور بھی چھین لیا۔ اس کے ساتھ ہی آل غزنہ کے اقتدار کا خاتمہ ہوگیا۔ عہد غزنوی میں لاہور کی صوبہ داری پر مامور اصحاب میں سالار عبداللہ قراتگین، سالار ایارق، سالار احمد نیال تگین، شہزادہ مجدود، ایاز، شہزادہ محمود بن مودود، علی بن ربیع، حاجب توشتگین، ابوبکر صالح، نجم الدین وزیر شیبانی، شہزادہ سیف الدولہ محمود بن ابراہیم، شہزادہ علاؤ الدولہ مسعود بن ابراہیم، حاجب طغاتگین، شہزادہ شیرزاد بن مسعود، ربیع شیبانی، شہزادہ جلال الدولہ دولت شاہ بن بہرام، ظہیر الدولہ خسرو ملک کے نام شامل ہیں۔ ۵۶ یوں غزنوی خاندان نے ۱۰۲۲ء تا ۱۱۸۶ء حکمرانی کی یوں آل غزنہ نے تقریباً ایک سو چینسٹھ برس حکومت کی لیکن حقیقت میں سلطان محمود غزنوی کا دور ہی ہر حوالے سے اس میں زیادہ اہمیت کا حامل رہا۔ ۵۶

۱۱۸۶ء میں سلطان معزالدین سام محمد شہاب الدین غوری نے لاہور پر قبضہ کرلیا اور اس نے یہیں سے ہندوستان کے دیگر علاقوں دہلی، اجمیر، گجرات، قنوج اور بنارس پر یلغاریں کیں۔ محمد شہاب الدین غوری نے اپنے وفادار غلام قطب الدین ایبک (جو نسلاً ترک تھا اور خاندان غلاماں کا بانی تھا) کو اپنے مفتوحہ علاقوں کا حاکم مقرر کیا۔ شہاب الدین غوری کی شہادت (۱۲۰۶ء) کے بعد اس کے بھتیجے سلطان غیاث الدین محمود نے قطب الدین ایبک کو سلطان کا خطاب دے کر ہندوستان کا نائب السلطنت تسلیم کیا۔ ۱۲۰۶ء میں خودمختار فرمانروا قطب الدین ایبک کی تاجپوشی کا جشن لاہور میں منایا گیا اگرچہ قطب الدین ایبک کے دور میں پایۂ تخت لاہور سے دہلی منتقل ہو چکا تھا لیکن قطب الدین ایبک کو غزنہ کے حکمران تاج الدین یلدز اور سندھ اور ملتان کے حاکم ناصر الدین قباچہ کے جارحانہ عزائم کی وجہ سے زیادہ تر لاہور میں رہنا پڑا۔ لاہور ہی میں قطب الدین ایبک چوگان کھیلتے ہوئے وفات (۱۲۱۰ء) پا گیا اور یہیں مدفون ہوا۔ قطب الدین ایبک سے پہلے علی کرماخ، محمد ابن علی غوری اور قطب الدین ایبک کے بعد آرام شاہ ابن قطب الدین لاہور کے صوبہ دار رہے۔ قطب الدین ایبک نے چودہ برس تک نائب السلطنت اور پانچ برس تک خودمختار حکمران کے طور پر حکومت کی۔ کثرت داد و دہش کی وجہ سے "لکھ بخش" کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ سلطان اور اس کے جانشینوں کے دور میں بھی لاہور کی علمی وتمدنی روایات قائم رہیں۔

قطب الدین ایبک کے زمانے میں تمام جشن لاہور ہی میں منعقد ہوا کرتے تھے اور یہ بدستور علماء وفضلاء کا مرکز تھا۔ پروفیسر شجاع الدین کے خیال میں "یہاں کی نوے فی صد آبادی علم سے مزین تھی اس جگہ فخر مدبر مبارک شاہ اور تاج الدین حسن نظامی جیسے محققین اور مؤرخین شیخ عبدالعزیز مکی المتوفی ۶۱۲ھ، سید احمد توختہ ترمذی المتوفی ۶۰۲ھ، شیخ یعقوب زنجانی

المتوفی ۶۰۴ھ جیسے علماء اور اصفیاء مقیم تھے۔علاوہ ازیں بے شمار ادیب، شاعر اور فاضل یہاں موجود تھے''۵۷ فخر مدبر نے اپنی بارہ سالہ محنت شاقہ سے بحر الانساب کتاب ایک دور ہی میں مکمل کر کے سلطان کی خدمت میں پیش کی۔قطب الدین ایبک کی معارف پروری ملاحظہ ہو: ''سلطان یہ کتاب دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے مؤلف کو انعام واکرام سے نوازا اور حکم دیا کہ اس کا خاص نسخہ شاہی کتب خانے کے لیے تیار کیا جائے''۵۸ قطب الدین ایبک نے جابجا مدرسے، مساجد اور خانقاہیں بنوائیں اور رعایا پروری پر بھرپور توجہ مبذول کی۔اس دور کا تفریحی مشغلہ چوگان (پولو) بھی اسی دور سے معلوم ہوتا ہے۔ خاندان غلاماں کے بانی ہونے کے حوالے سے حکومت کا جو سلسلہ ایبک سے شروع ہوا اس کے جانشینوں (آرام شاہ، شمس الدین التمش، رکن الدین فیروز شاہ، رضیہ سلطانہ، معز الدین بہرام شاہ، ناصر الدین محمود، اعز الدین بلبن (الغ خان)، بغرا خان، کیقباد، معز الدین) سے ہوتا ہوا ۱۲۹۰ء تک قائم رہا۔اس دوران لاہور کی مسند حکومت پر نصیر الدین ایتمر بہائی، شہزادہ رکن الدین بن التمش، جلال الدین جانی، عز الدین کبیر خان، اختیار الدین قراقش فائز رہے۔

برصغیر کی اس اسلامی سلطنت کے دفاع میں پنجاب ایک اہم حصار تھا۔خصوصاً چنگیز خانی تاتاریوں کی مسلسل یلغاروں نے پنجاب کو عرصہ دراز تک میدان حرب وضرب بنائے رکھا۔سلطان شمس الدین التمش کے عہد (۱۲۱۰ء۔ ۱۲۳۵ء) میں چنگیز خان نے صحرائے گوبی سے ترکستان، خراسان وایران کی طرف خروج کیا۔اس پہلی یلغار سے گو پنجاب محفوظ رہا لیکن آئندہ کے لئے مسلسل خطرہ بن گیا جو بعد ازاں حقیقت بنا۔۱۲۴۱ء میں چنگیز خانی منگولوں نے لاہور کو تسخیر کر کے اسے لوٹا اور تاراج کیا چنانچہ غیاث الدین بلبن (۱۲۶۶ء۔۱۲۸۷ء) نے تاتاری حملوں کا سدباب کرنے کے لئے ایک طرف تو دفاعی نظام کی بہتری کے لیے پنجاب کے اکثر شہروں میں مضبوط قلعے بنوائے۔تاریخ فرشتہ کے مطابق: ''(کوہ پایہ کے سفر سے واپس کے بعد) بلبن نے چند روز دہلی میں قیام کر کے لاہور کا سفر اختیار کیا۔لاہور پہنچ کر اس نے حصار شہر کو از سر نو تعمیر کروایا جو شمسی حکمرانوں کے عہد میں مغلوں کی شورشوں کے باعث شکستہ ہو گیا تھا۔اس کے بعد بلبن نے نواح شہر کو آباد کیا جو مغلوں کی لوٹ مار کی وجہ سے ویران ہو گیا تھا''۵۹ اس نے ایک طرف یہاں سامان حرب وضرب سے لیس افواج متعین کیں تو دوسری طرف تاتاریوں سے دوستانہ مراسم بھی قائم کرنے کی کوشش کی۔تاتاری بارہا آئے لیکن بلبن کے قائم کردہ دفاعی حصار کو نہ توڑ سکے۔بلبن کا فرزند سلطان محمد ۱۲۸۶ء میں لاہور اور دیپالپور کے درمیان تاتاریوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوا۔

خاندان غلاماں کے بعد سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لئے سلاطین خلجی (۱۲۹۰ء۔۱۳۲۰ء) برسر اقتدار آئے۔خلجی گروہ کا سردار ملک فیروز جو ایک بہادر اور قابل سپہ سالار تھا ملتان اور سندھ کے گورنر کی حیثیت سے منگولوں کے خلاف جنگ میں نام پیدا کر چکا تھا۔جلال الدین کے لقب سے مسند سلطنت پر متمکن ہوا۔جلال الدین ملک فیروز خان سمیت اس خاندان کے تین حکمران تخت نشین ہوئے۔فیروز خان کے بعد اس کا بھتیجا علاؤ الدین محمد خلجی اور اس کا بیٹا قطب الدین مبارک شامل ہیں۔

لیکن ان تینوں میں علاؤالدین خلجی کا دور اہمیت کا حامل ہے۔علاؤالدین خلجی علماؤفضلاء ۹۰ کی بھرپور سرپرستی کرتا تھا۔امیر خسرو اور حسن سنجری کی شاعری اسی کے عہد میں اوج کمال کو پہنچی۔دیگر شعراء میں صدرالدین جمالی فخرالدین قواس،حمید الدین راجہ،مولانا عارف عبدالحکیم،شہاب الدین قابل ذکر ہیں۔

سلاطین خلجی کے بعد سلاطین تغلق (غیاث الدین تغلق،فخرالدین جونا خان تغلق،فیروز شاہ تغلق،سلطان محمود تغلق) ۱۲۳۰ء سے ۱۴۱۳ء تک برسراقتدار رہے۔غیاث الدین تغلق نے بھی منگولوں کے خلاف ۲۹ جنگیں لڑیں اورانہیں شکست دے کر مرکز کو مضبوط کیا۔غیاث الدین تغلق نے تخت نشینی کے چند سال کے اندر ہی تمام شالی ہند اور دکن پر قبضہ کرلیا۔اس کی سلطنت لاہور اور دہلی سے جنوب میں دوارسمدر تک اور سندھ سے بنگال تک پھیلی ہوئی تھی۔اس نے مرنے سے پہلے اپنے چچا زاد بھائی فیروز شاہ تغلق کو جانشین نامزد کیا جو ۱۳۵۱ء تک تقریباً ۳۸ برس تک حکومت کرتا رہا۔اس کے عہد میں لاہور مشہور صنعتی مراکز میں سے ایک تھا۔اس خاندان کا آخری بادشاہ محمود تغلق نااہل ہونے کی بناء پر اپنے بیس سالہ دورحکومت میں ملک کے بگڑتے حالات پر قابو نہ پاسکا جس کی وجہ سے ہندوستان میں کئی خودمختار ریاستیں بن گئیں۔امیر تیمور نے ۱۳۹۸ء میں ہندوستان پر چڑھائی کردی۔لاہور اور دیپالپور پر قبضہ کرکے دہلی میں فاتحانہ داخل ہوا۔محمود تغلق کے انتقال (۱۴۱۲ء) کے ساتھ ہی تغلق خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

تغلق خاندان کے بعد دو اور خاندانوں (سلاطین سادات،سلاطین لودھی) نے حکومت سنبھالی۔سلاطین سادات ۱۴۱۴ء تا ۱۴۵۰ء حاکم رہے۔سید خاندان کی بنیاد خضر خان والئ لاہور و ملتان نے رکھی۔امیر تیمور نے جب ۱۸ دسمبر ۱۳۹۸ء میں دہلی میں فاتحانہ داخل ہوکر پانچ دن تک دہلی میں قتل وغارت اور اس کے گردونواح کو تاخت وتاراج کرکے واپس ہوا تو اس نے خضر خان کو جو کہ پنجابی تھا اور اس کی تمام فوج پنجاب سے تعلق رکھتی تھی اسے لاہور،ملتان اور دیپالپور کے علاقے سپرد کرکے خود سمرقند کا رخ کیا۔بعدازاں خضر خان نے ۱۴۱۴ء میں دہلی کو فتح کرکے خاندان سادات کی حکومت قائم کی۔سادات خود کو امیر تیمور کا نائب سمجھتے تھے۔خضر خان کی وفات (۱۴۲۱ء) کے بعد چار جانشینوں نے ۳۷ برس حکومت کی ان سب میں قابل مبارک شاہ اور آخری بادشاہ علاؤالدین عالم شاہ تھا جو ۱۴۴۵ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں پنجاب کے حاکم بہلول لودھی نے بغاوت کی اور ۱۴۵۱ء میں تخت وسلطنت پر قابض ہوگیا۔علاؤالدین عالم شاہ بدایوں چلا گیا۔جبکہ لودھی خاندان ۱۴۵۱ء تا ۱۵۲۶ء جانشین رہا۔بہلول لودھی جو شاہ عبدالجلیل جوہڑ بندگی سے عقیدت رکھتا تھا اس نے مسلمانوں کے اقتدار کو دوبارہ مضبوط کرکے پہلی افغان حکومت قائم کی۔"بہلول لودھی کی دعوت پر لودھی،لوہانی،نیازی، مروت اور یوسف زئی،بنگش اور اورکزئی قبیلے کے لوگ بڑی تعداد میں ہندوستان آگئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہوگئے۔شاہو خیل لودھی قبیلے دہلی،آگرہ،کانسی اور لکھنؤ کے مضافات میں،یوسف خیل اور سرنگ خانی لاہور اور جونپور میں۔"۹۱

بہلول لودھی کے بعد اس کا بیٹا نظام خان سکندر لودھی کے نام سے جانشین ہوا جو علم و ہنر کا دلدادہ اور علماء اور ادباء کی سرپرستی کرنے والا تھا۔ فارسی کی مشہور لغت فرہنگ سکندری اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس نے سنسکرت سے فارسی میں بہت سی کتب کا ترجمہ کرایا۔ اس نے سکندر آباد (آگرہ) شہر کی بنیاد ڈالی اور اسے دارالحکومت بنالیا۔ ۱۵۱۷ء کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم لودھی جانشین ہوا۔ ابراہیم لودھی حکومتی امور میں رواداری سے کام نہ لیتے ہوئے افغانوں سے اچھا سلوک روا نہ رکھتا تھا جس کی وجہ سے اس کے بھائیوں اور امراء نے بغاوتیں کیں۔ یوں ایک طرف بہار کے حاکم دریا خان نے خودمختاری کا اعلان کردیا تو دوسری جانب پنجاب کے حاکم دولت خان نے خفیہ طریقے سے بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ جسے قبول کرکے ظہیر الدین بابر یہاں آیا۔ ۱۵۲۴ء میں بابر نے لاہور پر قبضہ کیا اور شہر کو لوٹ کر واپس چلا گیا۔

خلجی، تغلق، سادات اور لودھی خاندانوں کے عہد میں بھی لاہور کو سلطنت کے قیام واستحکام میں بڑی اہمیت حاصل رہی کیونکہ جب کوئی حکمران زوال پذیر ہوتا تو اس سیاسی خلا کو پُر کرنے کے لیے نیا حکمران خاندان لاہور سے جا کر مسند سلطنت کو سنبھالتا۔ یوں مرکزی سلطنت کو لاہور سے تقویت پہنچتی رہی۔ یہ لاہور ہی تھا جس نے مرکزی سلطنت میں سیاسی بحران کو حل کرنے کے ساتھ مرکزی حکومت کے وقار کو بحال رکھنے کے لیے افراد و اسباب فراہم کیے۔ ان خاندانوں کے بعد یوں تو مغلیہ دور کا آغاز تیمور کے لاہور پر حملے سے ہی ہو چکا تھا لیکن تیمور نے یہاں صرف تباہی و بربادی چھوڑی، قیام نہیں کیا۔ جب تیمور گھرانے کے چشم و چراغ بابر نے ۱۵۰۴ء میں عنان حکومت سنبھالی تو پنجاب میں سکندر لودھی (۱۴۸۸ء۔ ۱۵۱۷ء) برسر اقتدار تھا۔ سکندر لودھی کے جانشین ابراہیم لودھی کے ناروا سلوک نے پٹھان سرداروں کو ناراض کردیا تو یہی ناراضی نہ صرف بابر کو لاہور آنے کی دعوت کا باعث بنتی ہے بلکہ ہندوستان پر حملہ کرنے کا بہانہ بھی دیتی ہے۔ بابر پہلی بار (۱۵۲۴ء) دولت خان یوسف زئی اور رانا سانگا کی ترغیب پر لاہور وارد ہو کر لوٹ مار کرتا ہوا واپس پلٹ گیا لیکن اگلی بار ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو پانی پت کی لڑائی میں شکست دے کر نہ صرف لاہور بلکہ پورے ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا ہے۔ پہلے فرمانرواؤں کے برعکس بابر نے خود کے لئے بادشاہ کا لقب اختیار کیا۔

مغلیہ دور سے اقتدار کی نئی حکمت عملی کے تحت پنجاب، کابل، کشمیر اور قندھار کی جانب سے آنے جانے کے لیے گزرگاہ یا پڑاؤ کی حیثیت سے اہمیت اختیار کر گیا۔ تیموری ترکوں کا یہ خاندان جس کی حکمرانی کی داغ بیل بابر نے ڈالی، برصغیر میں پہلا خاندان ہے جو وسط ایشیا سے آکر یہاں حکمران ہوا۔ بابر کو یہاں اپنی خداداد صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کی مہلت نہ ملی لیکن اس نے پنجاب کے باشندوں کو اپنی رعایا گردانتے ہوئے اپنی تزک میں بارہا اپنے لوگ قرار دیا ہے۔ بابر زبردست شاعر اور نثر نگار تھا ''تزک بابری'' اس کی صلاحیتوں اور مشاغل کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بابر ۱۵۳۰ء میں آگرہ میں وفات پا گیا اور کابل میں مدفون ہوا۔ اس نے اپنے چار سالہ دور حکومت میں انتظام سلطنت کو مضبوط کیا اور عوام کی حالت سدھارنے پر بھی

بھرپور توجہ دی۔

بابر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا نصیر الدین ہمایوں ۱۵۳۰ء میں تخت نشین ہوا۔ بابر نے بیٹے کو رعایا سے رواداری اور انصاف سے پیش آنے اور سوتیلے بھائیوں سے فیاضانہ سلوک کرنے کی تلقین کی۔ یہ دونوں نصیحتیں تیموری بادشاہت کے لیے اہمیت کی حامل رہیں چنانچہ اس نے پنجاب، کابل اور قندھار جو اپنے چھوٹے بھائی شہزادہ کامران کی تحویل میں تھے اس کے حوالے کر دیئے۔ شہزادہ کامران اپنی مقبوضات کا انتظام تندہی سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ یہ تیموری شہزادہ فنون لطیفہ کا بھی گرویدہ تھا اور صاحب دیوان ۴۲ تھا۔ شاعرانہ ذوق رکھنے کے ساتھ فن تعمیر سے بھی لگاؤ رکھتا تھا۔ لاہور میں سب سے پہلے خوشنما عمارات کی بناء اسی نے ڈالی۔ پنجاب کا علاقہ چونکہ اس کی تحویل میں تھا اس لیے وہ لاہور میں قیام پذیر رہا تھا۔ اس کے دور میں لاہور نے بڑی ترقی کی اور اس کی آبادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اپنی شاہانہ رہائش اور شان و شوکت کے اظہار کے لیے راوی کے پار ایک عالیشان باغ تعمیر کرایا جس کے عین وسط میں فن تعمیر کی بے مثال یادگار بارہ دری تعمیر کرائی اس کے علاوہ نولکھا باغ بنوایا۔ بقول پروفیسر شجاع الدین: ''لاہور میں اس نے ایک عالیشان باغ وسط ایشیا کے باغات کے نمونہ پر لگوایا تا کہ گرمیوں کے ایام میں تمازت آفتاب سے پناہ لینے کا کام آئے اور علاوہ اس کے موسم بہار اور موسم سرما میں بھی شعر و ادب کی محفلیں اور راحت و عشرت کے جشن یہاں منعقد کیے جا سکیں۔'' ۴۳

جبکہ ہمایوں راجپوتانہ اور گجرات کی تسخیر میں مصروف تھا۔ ادھر شمالی ہند میں شیر شاہ سوری افغانوں کی قوت کو مجتمع کر کے اس کے لیے بہت بڑا چیلنج بن رہا تھا۔ ہمایوں کو بھائیوں کی جانب سے دشمنی کا رویہ رکھنے اور مدد نہ ملنے پر شیر شاہ سوری کے مقابل ہزیمت اٹھا کر تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑے کیونکہ ''جب شاہی دستہ راوی پار کر رہا تھا تو ہمایوں کے مشیروں نے صلاح دی کہ فوراً اپنے بھائی کو بھجوا دے (جس کی دغابازی غالباً ہمایوں کی بدقسمتی کی ایک وجہ بنی) لیکن شہنشاہ نے تجویز مسترد کر دی۔'' ۴۴

یوں ہندوستان میں سوری خاندان کی بنیاد پڑی۔ ۱۵۴۰ء میں ہمایوں آگرہ اور دہلی کو خیر باد کہہ کر لاہور آیا۔ یہاں بھائیوں کے ناروا سلوک کی وجہ سے ہمایوں نے پنجاب سے سندھ اور وہاں سے بلوچستان کے راستے ایران کا رخ کیا۔ شیر شاہ سوری نے اپنے سب سے معتبر سالار ہیبت خان نیازی کو پنجاب بشمول ملتان کا صوبے دار مقرر کیا اور دہلی واپس چلا گیا۔ شیر شاہ سوری کو پٹھانوں کی بہبود کا بڑا خیال تھا۔ وہ انہیں کوہستانی علاقوں سے نکال کر نیلاب (سندھ) سے لاہور تک کی زرخیز زمینوں پر آباد کر کے ان کی اقتصادی اور تہذیبی حالت سنوارنے کا خواہشمند تھا۔ اس سے اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مغل کابل کے راستے ہندوستان پر حملہ نہ کر سکیں۔ مشہور روایت ہے کہ شیر شاہ سوری کی ایک خواہش لاہور کو نیست و نابود کرنے کی بھی تھی تا کہ شمال کی جانب سے آنے والے حملہ آور اس وسیع شہر کی دولت اور صنعت و حرفت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اس

کے خیال میں اتنا بڑا سرحدی شہر حملہ آور کی راہ میں نہیں ہونا چاہیے جو یہاں آ کر سامان فراہم کر کے مزید فتوحات کے لیے تیار ہو جاتے ہیں یوں وہ لاہور کو سیاسی لحاظ سے خطرناک سمجھتا تھا۔ شیر شاہ سوری مغلوں کو اپنا دشمن سمجھتا تھا اور چونکہ لاہور مغلوں کا مرکز تھا اس لیے بھی شیر شاہ سوری کو عداوت تھی۔

چودہ برس جلاوطن رہنے کے بعد ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی میں کامیابی حاصل کی اور فاتح بن کر لاہور واپس آیا۔ عوام الناس نے دھوم دھام اور جوش و خروش سے استقبال کیا لیکن تخت نشینی کے چند ماہ بعد ہی کتب خانہ کی سیڑھیوں سے گر کر دہلی میں وفات (۱۵۵۶ء) پا گیا۔ ہمایوں کی وفات کے بعد اس کا بیٹا جلال الدین اکبر جو باپ کی وفات کے وقت اپنے اتالیق بیرم خان کے ہمراہ کلاہ نور کے مقام پر خیمہ زن تھا، ۱۵۵۶ء میں تخت پر متمکن ہوا تو اس نے خضر خواجہ کو لاہور کا گورنر مقرر کر کے سکندر سوری کے استیصال کے لیے ہدایات دیں اور خود اپنے اتالیق بیرم خان اور درباری امراء سمیت دہلی کا رخ کیا کیونکہ اس مرحلے پر آگرہ اور دہلی پھر تیموریوں کے قبضے سے نکل گئے اور عادل شاہ سوری کے ہندو وزیر ہیمو بقال نے یہاں کے تیموری گورنروں کو شکست دے کر راجہ بکرماجیت کے لقب سے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ راجپوت راجے اور افغان سردار بھی اس کے ساتھ مل گئے۔ مغلوں کے لیے یہ انتہائی نازک وقت تھا۔ ۵ نومبر ۱۵۵۶ء کو پانی پت کی دوسری جنگ ہوئی جس میں ہیمو بقال اور اس کے اتحادیوں کو تاریخی شکست ہوئی اور ایک بار پھر سارا شمالی ہندوستان تیموریوں کے قبضہ میں آ گیا۔ اسی اثناء میں سکندر سوری پٹھانوں اور پہاڑی راجاؤں کے لشکر نے لاہور کا رخ کیا۔ خضر خواجہ حاکم لاہور نے چمیاری کے مقام پر خیمہ زن ہو کر دو ہزار کا لشکر بھیجا جسے سکندر سوری کے حملے نے شکست دے دی۔ اس شکست کے بعد خضر خواجہ لاہور واپس لوٹ آیا۔ جب اکبر کو یہ خبر ملی تو اس نے اپنے ایک درباری سکندر خان کو بھیجا اور کچھ عرصہ بعد سلطنت دہلی کے امور سے فراغت پا کر ۷ دسمبر ۱۵۵۶ء کو اپنے سرپرست اور اتالیق بیرم خان کے ہمراہ لاہور آیا۔ اکبر کی آمد کی خبر سن کر سکندر سوری نے نواح لاہور سے بھاگ کر مانکوٹ کے قلعہ میں پناہ لی۔ بعد ازاں اتکہ خان اور پیر محمد خان کی کوششوں سے صلح ہوئی اور ۳۱ جولائی ۱۵۵۷ء کو سکندر سوری نے ہتھیار ڈال کر قلعہ بادشاہ کے حوالے کر دیا۔ اس صلح کے بعد اکبر چار ماہ اور چودہ دن لاہور میں رہا۔ مانکوٹ کے محاصرہ کے دوران بہادری کے جوہر دکھانے والے درویش صفت حسین خان کو لاہور کا گورنر مقرر کیا اور صوبہ لاہور کی انتظامیہ کو منظم کیا۔ ۷ دسمبر ۱۵۵۷ء کو اکبر دہلی روانہ ہو گیا۔ ۱۵۶۴ء میں میر محمد خان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ اسی زمانے میں اکبر کے سوتیلے بھائی مرزا حکیم (جس کے پاس کابل کی حکومت تھی) نے لاہور پر حملہ کر دیا۔ میر محمد خان نے اسے شکست دی ادھر اکبر کو خبر ہوئی تو وہ بھی فروری ۱۵۶۷ء میں لاہور پہنچا۔ اکبر کی آمد کی خبر سن کر مرزا حکیم کابل بھاگ گیا۔ مرزا حکیم نے دوسری بار لاہور پر حملہ فروری ۱۵۸۱ء میں سعید خان کی صوبہ داری میں کیا اور اس بار بھی ناکام و نامراد کابل لوٹ گیا۔

مارچ ۱۵۶۷ء میں لاہور کی حکومت پھر سے میر محمد خان اتکہ کے سپرد کر دی بعد ازاں اسے معزول کر کے ۱۵۶۸ء میں حسین قلی خان کو صوبہ لاہور کے انتظامات سونپے گئے۔ حسین قلی خان ہی کے دور میں اکبر ۷ مئی ۱۵۷۱ء کو لاہور پہنچا۔ حسین قلی خان کی ارادت کی بناء پر اسے ''خان جہاں'' کا خطاب دے کر بنگال کی مہم پر بھیج دیا اور شاہ قلی خان محرم کو صوبہ دار لاہور مقرر کیا۔ اگلی بار اکبر ۱۵۷۸ء میں لاہور آیا تو رعایا کی شکایت پر شاہ قلی خان محرم کو معزول کر کے سعید خان ۱۵۷۸ء میں صوبہ دار لاہور مقرر کرتے ہوئے رعایا پروری اور مظلوموں کی دادرسی کی خاص ہدایت کی۔ جنوری ۱۵۸۳ء میں سعید خان کی جگہ راجہ بھگونت سنگھ کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ۱۵۸۶ء میں بھگوت سنگھ کی علالت پر اسمٰعیل قلی لاہور کا صوبہ دار رہا لیکن ناتجربہ کاری اور لالچی طبیعت کی بناء پر اکبر نے اسے معزول کر دیا۔

تقریباً ۱۵ برس فتح پور سیکری میں قیام کرنے کے بعد مئی ۱۵۸۶ء میں اکبر نے لاہور کو دارالحکومت مقرر کیا اور شہر لاہور میں راجہ بھگونت داس کی حویلی میں اقامت اختیار کی اور یہیں سے اس نے کشمیر، پٹھان قبائل اور سندھ کو فتح کرنے کے علاوہ وسط ایشیا کو بھی تسخیر کیا۔ اکبر لاہور ہی میں دربار منعقد کیا کرتا تھا۔ ایک بار پھر بھگونت داس کو صوبہ دار لاہور مقرر کیا۔ نومبر ۱۵۸۶ء میں بھگونت داس کا انتقال ہو گیا۔ بھگونت داس کی وفات کے بعد تقریباً تین برس تک قلیچ خان اندی جانی صوبہ دار لاہور مقرر رہا۔ اکبر نے ۱۵۹۲ء میں صوبوں کے انتظام کے لیے ایک نیا نظام رائج کرتے ہوئے ۱۲ فروری ۱۵۹۲ء کو پنجاب، ملتان اور کابل کے صوبوں کو خواجہ شمس الدین خواضی کے سپرد کیا۔ اکبر نے لاہور کو ۱۵۹۸ء تک دارالحکومت بنائے رکھا اور اسی سال دکن کی مہمات پر روانہ ہو گیا اور زندگی کا بقیہ حصہ آگرہ میں گذارا۔ ۱۶۰۰ء میں خواجہ شمس الدین خواضی کے انتقال کے بعد اس کا بھائی مومن خان صوبہ دار لاہور مقرر رہا۔ بعد ازاں ۱۶۰۲ء میں ایک بار پھر قلیچ خان کو اس عہدے پر فائز کیا جو اکبر کی وفات تک لاہور کی صوبہ داری پر متعین رہا۔ اکبر کے اس قیام ۱۵۸۶ء۔ ۱۵۹۹ء تک لاہور کی سطح پر خوب ترقی ہوئی کہ یہ ایک عظیم الشان شہر بن گیا۔

اکبر نے شہر لاہور کو اس کی خوشگوار معتدل آب و ہوا کی وجہ سے بہت پسند کیا۔ وہ اپنی تخت نشینی کے بعد کئی بار لاہور آیا اور مہینوں مقیم رہا اور جب اس نے ۱۵۸۶ء میں لاہور منتقل ہو کر طویل مدت تک قیام کیا تو اس شہر کی حیثیت دارالسلطنت کی ہو گئی اور شاہی دربار تہذیب و تمدن کا سرچشمہ بن گیا۔ لاہور شہر کی خوشحالی، رونق اور زیبائش میں بہت اضافہ ہوا۔ اکبر نے شہر کو آباد کیا اس کے گرد فصیل بنوائی اور ''پہلی مرتبہ شہر کی حفاظت اور عمارات کی تعمیر کی طرف توجہ دی گئی گلیاں پختہ کرائی گئیں، بے شمار مساجد بنائی گئیں، شہر کی دیوار پختہ اور دوہری تعمیر ہوئی اور قلعہ کے اندر بھی تعمیرات ہوئیں اور پرانی فصیل کو گرا کر شہر کا کچھ نواحی حصہ فصیل کے اندر شامل کر کے رہائشی جگہ کو کھلا کیا گیا۔''[۲۵]

اکبر بادشاہ کی تقلید میں امراء دربار نے بھی لاہور میں اپنے لیے حویلیاں بنوائیں۔ اکبر کے اتالیق بیرم خان کا رفیع

الشان محل بنا۔ابوالفضل نے لاہور میں عالیشان مکان اور فضل آباد کے نام سے ایک محلّہ تعمیر کیا۔ راجہ مان سنگھ، مرزا قلیج بیگ، راجہ ٹوڈرمل، راجہ بھگوان داس، نظام الدین (مصنف طبقات اکبری) کے سر بفلک محلات اور باغات بھی لاہور ہی میں بنائے گئے۔ دریائے راوی کے کنارے کے علاوہ مغلپورہ اور باغبانپور کی بستیاں آباد کیں۔ تفریح گاہیں اور باغات لگوائے۔ لاہور میں حکیم علی گیلانی کا حوض بھی اکبری دور کے عجائبات میں سے ایک تھا۔ اکبر کے دور میں لاہور شہر کی وسعت ابوالفضل کچھ اس طرح بیان کرتا ہے:

> ''صوبہ لاہور کی لمبائی دریائے ستلج سے دریائے سندھ تک ۱۸۰ کوس اور چوڑائی بھمبر سے گوگیرہ کے نزدیک ستکھرہ کی ذیل چوکنڈی تک ۸۶ کوس تھی۔ اس کی سرحدیں مشرق میں سرہند، شمال میں کشمیر، جنوب میں ریاست بیکانیر واجمیر اور مغرب میں ملتان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ نیز اس میں شمالی پہاڑوں سے نکلنے والے چھ دریا بہتے تھے۔''۶۶

شہنشاہ اکبر ناخواندہ ہونے کے باوجود علوم وفنون کا شیدائی تھا۔ شعراء کی سرپرستی کرنے کے ساتھ علم تاریخ سے شغف رکھتا تھا۔ تراجم کے شوق اور ہندو مسلم مشترکہ مفاد کی غرض سے ایک دارالترجمہ قائم کیا۔ یوں اپنی تعلیمی کمی کو کئی صورتوں میں پورا کیا۔ عہد اکبر میں بڑی تعداد میں دربار کے متعلقین، فوجی سردار، جاگیردار، علماء وفضلاء آگرہ اور فتح پور سیکری سے لاہور میں آ کر آباد ہو گئے۔ بقول امین الدین رازی: ''لاہور میں فضلاء اور علماء کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے کہ وہ گنتی اور شمار میں نہیں آ سکتے۔''۶۷

اکبر نے ملا احمد ٹھٹھوی کو ''تاریخ الفی''، شیخ عبدالقادر بدایونی کو ''رامائن''، ''جامع رشیدی'' اور ''تاریخ کشمیر'' لکھنے کا حکم دیا۔ اسی شہر لاہور میں فیضی نے مثنوی ''نل دمن'' لکھی۔ لاہور میں قیام اکبر کے دوران جن امراء کے علمی کارنامے منظر عام پر آئے ان میں عبدالرحیم خانِ خاناں، مرزا عزیز کوکلتاش، خان زمان علی قلی خان سیتانی، حکیم ابوالفتح گیلانی، ابوالفضل اور فیضی کے نام اہم ہیں۔ علماء میں شیخ سعداللہ بنی اسرائیلی، شیخ اسحاق کاکو، ملا جمال تلوی، سید منصور لاہوری، مولانا علاؤالدین، شیخ منور لاہوری، شیخ مبارک ناکوی، شیخ معین لاہوری، شیخ موسیٰ حداد، ملا ہادی محمد، مولانا محمد مفتی، مولانا الہ داد لنگر خانی، قاضی صدر الدین لاہوری، ملا ابوالفتح لاہوری، ملا اسحاق کاکر لاہوری، شیخ نعمت لاہوری، شیخ نورالدین کمبوہ لاہوری، ملا ہاشم کمبوہ، ملا شمس خان کمبوہ لاہوری، ملا بایزید لاہوری، مفتی اسماعیل اور ملا حسام الدین لاہوری کے نام شامل ہیں۔۶۸ اکبر کے دور کی نابغہ روزگار ہستیوں خان جہاں حسین قلی خان (۱۵۷۳ء)، ٹوڈرمل (۱۵۸۱ء)، عرفی شیرازی (۱۵۸۲ء) راجہ بھگوان داس (۱۵۸۹ء)، شیخ مبارک (۱۵۹۲ء) اور فیضی (۱۵۹۵ء) نے لاہور ہی میں وفات پائی۔ اکبر کے قیام لاہور ہی میں یہ شہر صوفیاء وعرفاء کا مرکز بن گیا جنہوں نے مذہبی خدمات انجام دیں ان میں حضرت میاں میرؒ، ملا شاہ بدخشی، حضرت خواجہ باقی باللہ، حضرت میاں وڈا، شیخ چوہڑ بندگی وغیرہ نمایاں تھے۔ بقول محمد دین کلیم: ''لاہور ان دنوں علم وفضل کا بہت بڑا مرکز تھا،

توران، ایران، افغانستان، خراسان یا دوسرے اسلامی ممالک سے جو مشائخ کرام آتے ان کی پہلی منزل لاہور تھی۔" ۶۹

اکبر نے فن مصوری، فن خطاطی، نگینہ کاری، سنگ تراشی اور آرائشی کندہ کاری اور چوب کاری کے فن کی خوب حوصلہ افزائی کی چنانچہ اکبر نے قیام لاہور کے دوران اپنے پسندیدہ مصور، خطاط، شاعر، ادیب، عالم و فاضل، تاریخ نویس لاہور بلا لیے اس طرح لاہور اہل ہنر و فن کا مرکز بن گیا۔ لاہور میں اکبر کے زمانے کی شاندار یادگار شاہی قلعہ ہے جو فوجی قلعہ نہیں بلکہ قلعہ نما شاہی محل ہے۔ سولہویں صدی میں دریائے راوی جب قلعے کے نیچے بہتا تھا تو پٹھان بادشاہوں نے اس پُر فضا محفوظ جگہ کو اپنی اقامت گاہ کے لیے منتخب کیا اور یہاں عمارتیں تعمیر کیں۔ منگولوں (مغلوں) کے حملوں سے اسے بہت نقصان پہنچا تھا چنانچہ اکبر نے اس میں نہ صرف نئی عمارتیں بنوائیں جن میں جھروکے والا دیوان عام اس کی عظیم یادگار ہے بلکہ شہر پناہ کی چہار دیواری اور اس کے بیشتر دروازے (اکبری دروازہ، کشمیری دروازہ، موچی دروازہ، ٹکسالی دروازہ، مستی دروازہ) بنوانے کے ساتھ اکبری منڈی کی تعمیر بھی اکبر ہی نے کروائی۔ لاہور شہر اپنے باغوں، مسجدوں اور شہ نشینوں کے ساتھ شاہی قیام گاہ بن گیا۔ ابوالفضل "آئین اکبری" میں لاہور کے متعلق لکھتا ہے:

> "باری دوآب میں ایک عظیم شہر، شان و شوکت، کر و فر اور آبادی کثرت کے حوالے سے چند ہی شہر اس کے مساوی ہیں۔ قدیم تاریخ میں اسے لوہاور کہا جاتا تھا۔ ظل الٰہی کے دور میں یہاں پختہ اینٹوں اور چونے سے ایک قلعہ تعمیر ہوا بعد میں یہ وقتاً فوقتاً حکومت کا مرکز رہا اور یہاں تمکین مقامات تعمیر ہوئے۔ باغات کی افراط سے اس کا حسن دوچند ہوا۔ یہ تمام قوموں اور تمام شہروں کے لوگوں کا مرجع بنا۔" ۷۰

لاہور اکبری دور میں ہندو مسلم اتحاد کا مظہر دکھائی دیتا ہے۔ اکبر نے اپنے عہد میں مسلم اور غیر مسلموں کو کامل مساوات کا درجہ دے کر فیاضانہ سلوک کیا۔ راجپوتوں سے رشتے ناطے کیے۔ ہندووانہ رسموں کا اپنایا۔ اکبر کے عہد میں عیدالفطر، عیدالضحیٰ، عید میلادالنبی، شب برات محرم اور ہندووانہ تہوار بسنت، ہولی، شیوراتری، دیوالی، دسہرہ، رکھشا بندھن یکساں جوش و خروش سے منائے جاتے۔ لاہور میں خیر پورہ اور دھرم پورہ کے نام سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے دو عظیم الشان غریب خانے قائم کیے۔ پرتگیزی مشنری اکبر ہی کے دور (۱۵۹۱ء) میں لاہور آئے۔

> "یہ جیسیوٹ تھے جو تبلیغ مذہب کے شوق میں آئے تھے۔ اکبر نے خود ان کو گوا سے دعوت دے کر اپنے ہاں طلب کیا۔ ان سے انجیل کے مطالب سمجھنے کی کوشش کی اور انہیں اجازت دی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے مدارس جاری کر سکتے ہیں۔ چنانچہ لاہور میں انہوں نے اپنا ایک مدرسہ جاری کیا۔ یہ پادری ۱۵۹۱ء میں لاہور آئے۔ اکبر نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی۔ انہیں لاہور کے شاہی قلعہ میں رہنے کے لیے جگہ دی اور سامان خورد و نوش سے بے نیاز کر دیا۔" ۷۱

علمی جلسوں کی رونق اس زمانہ میں لاہور کی علمی زندگی کی روح تھی۔ شہنشاہ اکبر بڑے بڑے علماء فضلاء و پنڈتوں اور پادریوں کے مباحثے کراتا تھا۔ ''لاہور ہی میں اکبر نے ایک مباحثہ کا اہتمام کیا جس میں مختلف عقائد کے دانشوروں بشمول پرتگیزی مشنریوں کو اکٹھا کر کے مذہبی بے تعصبی کے کچھ اصول اخذ کیے جس کی وجہ سے وہ بطور خاص مشہور ہوا۔'' ۲ یہاں تک کہ اکبر مذہبی بے تعصبی میں حد سے تجاوز کر گیا۔ ''لاہور میں بھی آتش کدے تعمیر کرائے۔ نوروز کی صبح کھلے بندوں سورج کی پوجا کرتا۔ برہمن اپنے مذہبی تہواروں میں اس کی پیشانی پر ٹیکہ لگاتے تھے۔'' ۳

دور اکبری میں لاہور نے صنعت و حرفت میں بھی بہت ترقی کی۔ اسلحہ سازی، تیر کمان، توپ، اسطرلاب کی صنعت، کاغذ سازی اور قالین سازی کے ساتھ ساتھ لاہور میں شالبافی اور پشمینہ کا کام بکثرت ہوتا تھا یہی وجہ ہے کہ لاہور اس زمانے ''چھوٹا کشمیر'' معلوم ہوتا تھا۔ بقول محمد دین فوق ''اسی لاہور میں جہاں سولہویں صدی عیسوی میں ایک ہزار شالبافی کے کارخانے تھے۔'' ۴ اس دور میں لاہور کی ترقی کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے میں دریائے راوی میں کشتی رانی کے ساتھ ساتھ جہازوں کی آمد و رفت بھی ہوتی تھی۔ دریائے راوی جو لاہور سے بہتا ہوا ملتان، ٹھٹھہ اور بھکر تک جاتا جس میں کشتیوں کے ذریعے خوب تجارت ہوتی تھی۔ لاہور کے باشندوں کی اکثریت تجارت سے وابستہ تھی اور اس کے لیے وہ خراسان سے ترکستان تک کا سفر کرتے تھے۔ اکبر نے قیام لاہور کے دوران جہاز بھی بنوائے۔

> ''اکبر کے زمانے میں دریائے راوی میں جہاز رانی بڑے عروج پر تھی چنانچہ مئی ۱۵۹۴ میں اکبر نے لاہور میں راوی کنارے ایک جہاز بنوایا جو ۳۵ گز لمبا تھا۔ جس میں سال اور ریلوط کی مضبوط لکڑی کے ۲۹۲۵ تختے خرچ ہوئے تھے اس کی تیاری کے بعد شہنشاہ بہ نفس نفیس اسے دیکھنے گئے اور راوی کے راستے لہری بندر بھیجا گیا۔ اس زمانے میں لہری بندر تک سامان بھی اس کے ذریعے جاتا تھا۔'' ۵
>
> ''۹۹۹ھ کے اواخر میں اکبر نے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ (سندھ) پر یورش کی سامان جنگ خشکی کے راستے کے علاوہ راوی کے ذریعے ٹھٹھہ بھیجا گیا۔'' ۶

یوں سولہویں صدی میں لاہور ایک اہم معاشی مرکز کے طور پر معاشی و اقتصادی ثمرات سے بہرہ مند ہوتا رہا کیونکہ یہ وہ وقت تھا جب لاہور نے کابل اور مشرق میں گنگا کی وادی کے اہم شہروں کے درمیان تجارتی شاہرہ کے ایک اہم پڑاؤ کی شکل اختیار کر لی تھی یہی وجہ تھی کہ دریائے راوی کشمیر سے لے کر دریائے سندھ میں ملنے اور وہاں سے بحیرہ عرب تک پہنچنے کے لیے کشتی رانی کے لیے بے حد موزوں تھا ''شہر لاہور چونکہ دریائے کے بائیں کنارے پر واقع تھا اس لیے شمال سے جنوب کی طرف سامان تعیشات کی تجارت میں اس شہر نے خوب منافع کمایا۔'' ۷ اور یوں معاشی و اقتصادی سطح پر لاہور کو خوب فائدہ پہنچا۔

اس زمانے میں لاہور کے اردگرد بے شمار جنگل تھے۔اکبر نے سیروشکار کے لیے اسے شکارگاہ کے طور پر بھی استعمال کیا اور یہاں پر شکار قمرغہ کا اہتمام کیا۔ اکبر کے طویل قیام کے باعث لاہور کے باہر ایک اور لاہور تیار ہو کر روز بروز افزوں تر ہو رہا تھا۔چنانچہ اکبر نے لاہور کو چھتیس ۸ے حلقوں (گزر) میں تقسیم کیا جن میں سے نو گزر شہر کے اندر اور باقی ستائیس شہر کے باہر تھے۔یعنی نو آبادیاں شہر کے اندر تھیں اور ستائیس آبادیاں شہر کے باہر تھیں۔جس سے اس وقت کے لاہور کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اکبر کے قیام لاہور ہی میں یورپین سیاح طامس ہربرٹ ۱۵۹۵ء میں لاہور آیا۔وہ ان لفظوں میں عہد اکبری کے لاہور کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''لاہور کا مقابلہ اگر ہندوستان کے کسی شہر سے ہو سکتا ہے تو وہ صرف آگرہ ہی ہے۔اس کی آب وہوا سال کے آٹھ ماہ تک نہایت خوشگوار رہتی ہے بازار اچھے بارونق اور پختہ ہیں ان میں بہت سے دریائے راوی کے ذریعے جو شہر کے پاس ہی بہتا ہے صاف کیے جاتے ہیں۔یہاں کی قابل دید عمارات میں قلعہ، محلات، حمام، تالاب، باغات اور بعض بہترین عمارات ہیں۔قلعہ بہت بڑا ہے جسے اکبر نے اپنے لاہور کے قیام کے ایام میں پختہ خشتی بنوایا اور اس میں فلک شگاف عمارتیں تعمیر کرائیں۔قلعہ کے بارہ چور دروازے ہیں جن میں تین کا منہ شہر کی طرف اور نو کا باہر جنگل کی طرف۔''۹ے

عہد اکبر میں ہی ایک بڑی تبدیلی یہ آئی کہ اس نے اپنے وزیر ٹوڈرمل کے پیش کردہ اصلاحاتی ڈھانچہ (۱۵۸۲ء) کو تسلیم کرتے ہوئے ایک فرمان جاری کیا۔اس فرمان کی ایک شق یہ تھی کہ ''تمام مملکت کے طول وعرض میں فارسی زبان کو دفتری زبان قرار دیا جاتا ہے۔آئندہ ہر مقام، ہر جگہ اور ہر دفتر میں ہر قسم کی کارروائی فارسی زبان میں ہوا کرے گی۔''۸۰ اکبر کے اس فرمان سے قبل دفتری کام ہندی زبان میں کیا جاتا تھا۔فارسی زبان اختیار کرنے سے ملک کی تہذیبی اور ثقافتی روایات پر بڑا گہرا اثر پڑا۔

> ''فارسی زبان اختیار کرنے کا ایک اثر یہ ہوا کہ سوا اعلیٰ تعلیم کے باقی ساری تعلیم فارسی میں ہونے لگی۔ہندوؤں نے فارسی سیکھی جس کی وجہ سے وہ مسلمانی تمدن ومعاشرت سے متاثر ہوئے۔تنگ نظری، تنگ دلی جن کا شکار وہ صدیوں سے چلے آتے تھے ان میں کسی حد تک کمی واقع ہونے لگے۔اس کے علاوہ ایک نئی ثقافت عالم وجود میں آئی جس کی بناء ایک زبان پر تھی جسے ہندو اور مسلم پڑھا لکھا طبقہ بولتا، اسی میں اظہار خیال کرتا اور اسی میں تصنیف وتالیف کا کام کرتا تھا۔اسی ثقافت کو وہ اپنی میراث سمجھتا اور اسی کا دلدادہ تھا۔''۸۱

غرض اکبر کے قیام لاہور میں قلعہ مستحکم ہوا جگہ جگہ محلات اور باغات وجود میں آئے، مدارس قائم ہوئے، درس و تدریس کا چرچا ہوا، آبادی میں اضافہ اور تجارت کو فروغ ملا۔شہنشاہ اکبر کے بعد اس کا بیٹا نورالدین جہانگیر ۱۶۰۵ء میں تخت

نشین ہوا ہی تھا کہ اس کے بڑے بیٹے خسرو نے بغاوت کر دی جس کا اثر لاہور شہر نے بھی محسوس کیا۔ جہانگیر نے اس بغاوت کو فرو کیا اور لاہور میں باغیوں کو عبرتناک سزا دی۔

> "بادشاہ نے حکم دیا کہ باغ کامران سے قلعہ تک سڑک کے دو طرفہ سولیاں نصب کی جائیں اور ان پر خسرو کے ساتھیوں کو جن کی تعداد سات سو کے قریب تھی پھانسی دے دی جائے۔ بادشاہ نے یہ منظر قلعہ لاہور کے شاہ برج سے دیکھا۔۔۔ خسرو کو ایک ہاتھی پر بٹھا کر ان سولیوں کے درمیان سے گذارا گیا۔"۸۲؎

شہنشاہ جہانگیر اس واقعہ کے بعد تقریباً ایک سال شاہی قلعہ میں قیام کرنے کے بعد ۱۶ مارچ ۱۶۰۷ء کو شکار اور سیر و سیاحت کی غرض سے کابل گیا اور ۳ دسمبر ۱۶۰۷ء کو لاہور واپس لوٹ کر دو ہفتے قیام کرنے کے بعد آگرہ رخصت ہو گیا۔ جہانگیر کے دورِ حکومت میں شیخ فرید، مرزا غیاث، قاسم خان، صادق خان اور آصف خان صوبہ دار لاہور رہے۔ جہانگیر کو لاہور سے بے پناہ محبت تھی۔ ۱۶۲۰ء میں لاہور آنے کے بعد اکبر کی طرح ۱۶۲۲ء میں اس نے لاہور میں اپنا دربار قائم کیا۔ چنانچہ جہانگیر نے بھی لاہور کو اپنی حکومت کا دوسرا دارالسلطنت قرار دے کر اپنے باپ کی طرح اس کی تعمیر و ترقی پر خصوصی توجہ مرکوز رکھی۔ لاہور تہذیب و تمدن کا مرکز تو اکبر کے زمانے میں ہی بن چکا تھا لیکن جہانگیر نے بھی اس میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہ چھوڑی یہی وجہ ہے کہ عہد جہانگیر کو اکبری دور کا ضمیمہ قرار دیا جاتا ہے۔

شہنشاہ جہانگیر نے قلعہ لاہور میں نئی عالیشان عمارتیں بنوائیں جن میں اپنی شاندار خوابگاہ تعمیر کروائی۔ قلعہ کی شمالی اور مغربی دیواروں کو مزید خوبصورت بنانے کے لیے انہیں روغنی ٹائلوں سے آراستہ کیا جس سے قلعہ کی دیوار کی شان و شوکت میں گرانقدر اضافہ ہوا۔ آگرہ سے لاہور تک کوس میناروں کی تعمیر بھی اسی عہد کا نادر نمونہ ہے۔ جہانگیر نے لاہور میں ایک وسیع و عریض عیدگاہ بنوائی۔ اکبری دروازے کے اندر دیوار پر شکار اور تفریح کی تصویریں بھی جہانگیر کے مصوروں کی تخلیق قرار دی جاتی ہیں۔ جہانگیر کے کئی وزراء نے بھی لاہور میں کئی خوبصورت عمارتیں بنائیں اور ان کے گرد وسیع باغات لگوائے۔ جہانگیر کے قیام لاہور ہی کے زمانے میں انگریز سیاح ۱۶۲۶ء میں لاہور آیا۔ وہ اپنے سفر نامہ میں قلعہ لاہور سے متعلق لکھتا ہے:

> "قلعہ کے اندر ایک محل ہے جس کے دو پھاٹک ہیں۔ پھاٹک کے اندر دو صحن ہیں۔ ایک صحن سے گذر کر دیوان عام اور جھروکے کو راستہ جاتا ہے جہاں رواج کے مطابق بادشاہ رعایا کو درشن دیتا ہے اور دوسرا دیوان خاص کو جاتا ہے جہاں وہ ہر رات آٹھ سے گیارہ بجے تک امراء سے گفتگو کرتا ہے۔ دیوار پر طرح طرح کی تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ایک تصویر میں جہانگیر قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اس کے دائیں جانب اس کے بیٹے پرویز اور خرم کھڑے ہیں اور اس کے بھائی مراد اور جہاندار۔۔۔۔ بائیں جانب راجہ مان سنگھ، راجہ رام سنگھ، راجہ رام داس، مقرب خان وغیرہ ایک اور مقام پر بادشاہ آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اور دروازے پر حضرت مریم اور صلیب کی تصویریں بنی ہیں۔"۸۳؎

قیام لاہور ہی میں جہانگیر نے گوا کے پادریوں کو لاہور میں سب سے پہلا گرجا گھر تعمیر کرنے کی اجازت دی اور ان کے لئے خزانہ لاہور سے معقول وظائف بھی مقرر کیے۔ عہد جہانگیر میں لاہور کی خوشحالی اور رونق دوچند تھی ''عہد جہانگیر میں لاہور کی آبادی اور رونق کا یہ عالم تھا کہ ٹھٹھہ سے ہزاروں اونٹ مال و اسباب لاد کر قندھار کے راستے ایران جاتے تھے۔'' ۸۴

جہانگیر اہل علم و فن کا مربی اور علماء و مشائخ کا قدر دان تھا۔ لاہور کی علمی و ثقافتی زندگی ہی کی بناء پر اس دور میں لاہور کو ''دارالامان''، ''دارالشعراء''، ''خانہ عافیت خردمنداں'' ۸۵ کہا گیا۔ عہد جہانگیر کے شعراء میں طالب آملی، شاہ ابوالمعالی، منیر لاہوری، چندر بھان برہمن لاہوری، جلال الدین سیادت، ملا حاجی بے خود لاہوری، نعمت اللہ لاہوری، اسیر لاہوری، عارف لاہوری، ملا نور محمد لاہوری، حشمی لاہوری نے لاہور میں شعری بساط سجائی ہوئی تھی جبکہ علماء میں ملا عبدالسلام لاہوری، میر شیخ ہروی، ملا سید عبدالخالق، مولوی محمد سعید اعجاز، ملا بایزید، مولوی عبدالحکیم گیلانی، ملا یوسف لاہور کی علمی رونق بڑھا رہے تھے۔

جہانگیر نے بھی ایک مورخ اور ادیب کی حیثیت سے ''تزک جہانگیری'' کے ذریعے خود کو متعارف کرایا۔ اپنے دور میں خط نستعلیق کو رواج دیا۔ جہانگیر کی چہیتی ملکہ نور جہاں کو بھی لاہور سے بہت محبت تھی اور شعر گوئی اور شعر فہمی کا اعلیٰ ذوق رکھتی تھی۔ ۸۶ لاہور میں اپنے محلات اور مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔ نور جہاں نے لاہور ہی میں نئی طرح کے پھول متعارف کروانے کے ساتھ خوشبوؤں کو بھی رواج دیا۔ عہد جہانگیر میں سکہ سازی کو فروغ ملا۔ اس عہد کے سکوں پر جہانگیر نے اپنے نام کے ساتھ نور جہاں کا نام بھی ٹھپہ کرایا۔ ۱۶۲۶ء میں لاہور آنے والے دو یورپین اس شہر کی خوشحالی کو یوں بیان کرتے ہیں:

> ''لاہور ہندوستان میں چوٹی کا شہر ہے۔ ہر چیز یہاں بافراط مل سکتی ہے حقیقت میں ایسا خوبصورت اور ہموار اور ایسا آباد قطعہ زمین کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہندوستان کے ہر حصہ کے سوداگر یہاں موجود ہیں۔ تجارت کی گرم بازاری ہے۔ سندھ کے مشہور شہر ٹھٹھہ کے لیے سوداگر لوگ جہازوں میں اپنا مال لاتے ہیں اور دریا کے کنارے پر عجیب رونق رہتی ہے ہر سال بارہ چودہ ہزار اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے قندھار کے راستے ایران کو جاتے۔'' ۸۷

جہانگیر کی یہ لاہور ہی سے محبت تھی کہ کشمیر میں راجوڑی کے مقام پر مرتے وقت (۱۶۲۷ء) خود کو لاہور میں مدفون کیے جانے کی خواہش کی جسے بعد ازاں پورا کیا گیا۔

جہانگیر کی وفات کے بعد لاہور ایک بار پھر تخت و تاج کے دعویداروں کے درمیان میدان جنگ بنا۔ ایک طرف نور جہاں کا حمایت یافتہ شہریار (شاہ جہاں کا بھائی اور نور جہاں کا داماد) تو دوسری طرف شاہجہاں تھا۔ شہریار کو نور جہاں کی اور شاہجہان کو اپنے سسر اور نور جہاں کے بھائی آصف خان کی حمایت حاصل تھی۔ شہریار نے لاہور میں خزانے پر قابض ہو کر

شہنشاہ ہونے کا اعلان کیا لیکن آصف خان اور شاہجہاں نے ایک بھرپور حملہ کیا اور مخالفین کو سزائے موت دی۔اس کشمکش کا اختتام بھی حسب معمول مرنے والوں کی موت پر ہوا۔نور جہاں سیاسی سرگرمیوں سے دستبردار ہوگئی، دولاکھ سالانہ وظیفہ لے کر لاہور آ مقیم ہوئی اور جہانگیر کی وفات کے بعد اٹھارہ برس تک زندہ رہی اور ۱۶۴۵ء میں وفات پا کر لاہور میں اپنے بنائے ہوئے مقبرے میں مدفون ہوئی۔

شاہجہاں ۱۶۲۸ء میں تخت نشین ہوا۔اکبر اور جہانگیر کی طرح شاہجہاں کو بھی لاہور سے بے حد محبت تھی پھر لاہور شاہجہاں کی جائے پیدائش بھی تھا۔اکبر کے بعد لاہور کو تہذیب وثقافت اور صنعت وحرفت کے حوالے سے سب سے زیادہ ترقی شاہجہاں کے تیس سالہ عہد میں ملی۔یہ دور لاہور میں خوشی اور خوشحالی کا دور تھا کیونکہ اس کے عہد میں سیاسی انتشار و جنگی مہمات بھی کم ہوئیں۔اگرچہ لاہور شاہجہاں کے عہد میں دارالحکومت نہیں رہا تھا لیکن اہم ترین صوبہ کے دارالحکومت ہونے کی وجہ سے بدستور اہمیت کا حامل رہا کہ لاہور ہی کشمیر کی طرف جانے والے شاہی قافلوں کی گذرگاہ تھا۔بلخ اور شمال مغربی سرحد کی طرف جانے والی فوجیں اسی شہر میں قیام کرتیں۔یہی وجہ ہے کہ لاہور کے حجم اور شان وشوکت میں بتدریج اضافہ ہی ہوا۔ شاہجہاں کے عہد میں خان رضا بہادر، آصف خان، قلیج خان، عنایت یزدی، وزیر خان، معتمد خان، سعید خان بہادر، جعفر خان، قاضی افضل، شیخ عبدالکریم، خواجہ معین خان، سید عزت بیگ صوبہ دار لاہور رہے۔

شاہجہاں ۱۶۳۳ء میں وزیر خان کی صوبیداری میں لاہور آیا جس پر بادشاہ کا تزک واحتشام سے شاندار استقبال کیا گیا۔شاہجہاں کے بیٹوں میں بڑے بیٹے دارالشکوہ کو اپنے باپ دادا کی طرح لاہور سے بہت محبت تھی۔وہ پنجاب کا نائب السلطنت بھی رہا۔اس نے لاہور میں رہائش اختیار کی اور اپنی عادات وخصائل سے اہل لاہور میں مقبولیت پائی۔اس نے بھی شہر کی بہبود میں گہری دلچسپی لی یہی وجہ ہے کہ اہل لاہور ہمیشہ دارالشکوہ کے طرفدار رہے جبکہ شجاع بنگال، اورنگزیب عالمگیر دکن اور مراد گجرات میں نائب السلطنت مقرر ہوئے۔

شاہجہاں کے خسر ابوالحسن آصف خان کے قیام لاہور کے دوران لاہور کی آبادی میں اضافہ ہوا۔اس نے شاہجہاں کی طرف سے بے شمار تاریخی عمارات بنوائیں جس میں خود آصف خان کی حویلی تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔پھر اپنے قیام لاہور (۱۶۳۸ء) میں شاہجہاں نے جہانگیر کا عالیشان مقبرہ تعمیر کروایا، قلعہ کی مرمت کروائی، نئی عمارتیں تعمیر کروائیں، اکبر اور جہانگیر کی تعمیر کردہ بعض عمارات (دیوان عام، خواب گاہ، شیش محل، مثمن بُرج، نولکھا) کو مسمار کر کے ازسرنو سنگ مرمر میں بنوانے کے لئے نواب وزیر خان کو حکم دیا۔لاہور کے باہر دور دور تک نئے محلے آباد کیے۔کثرت سے باغات لگوائے۔اقامت لاہور کے دوران شاہجہاں کے مشاغل کا اندازہ اس اقتباس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

”قیام لاہور کے زمانے میں شاہجہاں بار بار جہانگیر کے مقبرے کی زیارت کے لیے گیا اور وہاں ہزاروں

روپے فقیروں، مسکینوں، عالموں، حافظوں اوران لوگوں میں تقسیم کیے جومقبروں کے متعلقہ اداروں سے وابستہ تھے۔معراج شریف اور بارہ وفات کے موقعوں پر بھی بے انتہا روپیہ مسکینوں میں تقسیم کیا گیا۔لاہور میں بادشاہ اور امراء کی طرف سے جن میں آصف خان، علی مردان خان، وزیر خان اور افضل خان شامل تھے عیش ونشاط کی ایسی ایسی محفلیں ترتیب دی گئیں کہ چشم فلک نے ان کی نظیر نہ دیکھی ہوگی۔'' ۸۸؎

شاہجہاں کی سب سے بڑی یادگار شالامار باغ ہے جسے نواب علی مردان خان اور خلیل اللہ خان کے اہتمام سے ڈیڑھ سال کے اندر تیار کیا گیا۔ ۱۳؍اکتوبر ۱۶۴۲ء کو شاہجہاں نے اس باغ کی افتتاحی رسم کی۔ابوالحسن آصف خان کی وفات کے بعد لاہور میں ایک مقبرہ تعمیر کروایا اور اس کے چاروں اطراف خوش وضع باغ لگوائے۔علی مردان خان نے مغل پورلاہور میں اپنی والدہ کا فلک بوس مقبرہ بھی بنوایا۔مقبرہ جہانگیر قلعہ لاہور میں شیش محل، موتی مسجد، دیوان عام و دیوان خاص، محل پری مکان، چوبرجی باغ، باغ اناراں، باغ مہاں سنگھ، انگوری باغ، گلابی باغ، بادامی باغ، باغ رتن چند، دائی لاڈو کی مسجد اور اس کے فلک بوس ایوانات شاہجہانی دور ہی کی یادگار نشانیاں ہیں۔وزیر خان نے لاہور میں ایک عالیشان مسجد بنوائی جو خاص اہمیت کی حامل تھی کیونکہ:

''یہ مسجد لاہور کا ایک بہت بڑا علمی مرکز تھی اور علمی حلقوں میں خاص شہرت رکھتی تھی۔لاہور کے ارباب فضل وکمال، فصحائے خوش بیان، شعرائے شیریں زباں اور دوسرے شوقین لوگ جو ایران تو ران اور ہندوستان کے دوسرے مقامات سے لاہور آئے ہوتے تھے اس مسجد میں جمع ہو کر آپس میں تبادلۂ خیال کرتے تھے اور اس طرح شعروشاعری کی مجالس گرم ہو جاتی تھیں۔'' ۸۹؎

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی بھی مسجد وزیر خان کو ایک ثقافتی ادارہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شاہجہاں کے عہد میں نواب وزیر خان حکیم علی الدین نے یہ مسجد لاہور کے مرکز میں ۱۰۴۴ھ میں تعمیر کی جس کی تعمیری شان وشوکت واضح ہے مگر سے بڑھ کر اس نے اس مسجد کو ایک تعلیمی مرکز بصورت یونیورسٹی بعہد شاہجہاں تعمیر کر کے ایک بہت بڑا ثقافتی ادارہ قائم کیا۔'' ۹۰؎

مزید لکھتے ہیں:

''تعمیر مسجد وزیر خان میں سب سے عجیب وغریب قابل ستائش حجروں اور کمروں کا پہلو ہے جو فوراً مسجد کی کرسی پر چڑھتے ہی ملتے ہیں اور اس حصہ مسجد کو عام طور پر انگریزی میں گیلری کہتے ہیں جو کسی اور مسجد میں نہیں ہے۔ان کمروں میں اکثر کتب فروش، کاتب، صحاف، نقاش، جلد ساز اپنے پیشے کے مطابق سکونت رکھتے تھے۔'' ۹۱؎

عہد شاہجہانی میں مسجد وزیر خان کا بازار کاغذ، مخطوطات، اشیاء خورد و نوش اور دیگر سامان ضروریہ کی خرید و فروخت کے لیے بین الاقوامی منڈی کی حیثیت سے معروف ہوا۔ دارالشکوہ پسر شاہجہان نے بھی لاہور میں عالیشان محلات تعمیر کروائے۔ عہد شاہجہاں میں بزرگان دین کے مزاروں اور دیگر شاہی افراد کے مقبروں سے ملحق باغ لگوائے گئے۔ عہد شاہجہاں میں لاہور نہروں، باغوں اور عمارتوں سے ایک عظیم الشان شہر بن گیا۔ لاہور بدستور تعلیم و تدریس کا مرکز بنا رہا۔ صوفیاء اور اولیاء کی خانقاہیں اور مزارات بھی توجہ اور فیض کا مرکز تھے۔ شاہجہانی عہد میں شہر کی ترقی وسعت بیان کرتے ہوئے غلام دستگیر نامی لکھتے ہیں:

> ''شاہجہاں کے عہد حکومت جیسی لاہور کو آبادی اور وسعت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ اس وقت وہ ۱۶۔۱۷ میل کے دائرے میں بستا تھا۔ دیوار شہر کے گرد میلوں تک آباد چلی گئی تھی۔ شہر سے سب طرف سڑکیں جاری تھیں اور جہاں آبادی فاصلہ پر تھی اس کے درمیان مقبرے اور باغات بنا دیئے گئے تھے۔ ایک طرف اس کی وسعت میاں میر تک تھی دوسری اچھرہ تک اور تیسری طرف شالامار باغ تک یعنی ہر طرف تین میل تک آبادی تھی۔''۹۴

شاہجہاں کو اپنے آباء کی طرح شعر و ادب سے زیادہ شغف تو نہ تھا لیکن علماء و شعراء کی سرپرستی میں وہ پیچھے نہیں رہا۔ اس کے عہد میں شاعری کے ساتھ فارسی لغت نویسی، تاریخ نویسی، اور تراجم کو فروغ ملا۔ پنجابی زبان میں کتابوں کی تصنیف کے کام کا آغاز ہوا۔ عہد شاہجہاں میں لاہور کے علماء و فضلاء میں شیخ جان اللہ، شیخ عبدالکریم چشتی لاہوری، شیخ جان محمد لاہوری، مولوی محمد صدیق لاہوری، امام گاموں، مولانا محمد فاضل بدخشی، ملا عبدالسلام دیوی، مولانا عبداللطیف سلطان پوری، ملا یعقوب لاہوری، ملا جمال نیشاپوری، ملا یوسف لاہوری، ملا جامی لاہوری، مفتی محمد باقر لاہوری، ملا عبدالحمید لاہوری، حاجی محمد سعید، ملا رحمت اللہ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ چنانچہ شاہجہاں کے عہد میں لاہور ایک بہت بڑا علمی اور تمدنی مرکز تھا۔ عہد شہاجہاں میں سپین کا ایک پادری آگرہ سے ۱۶۴۱ء میں لاہور پہنچا جس نے اپنے سفرنامہ میں لاہور کی زندگی کا بھرپور نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

> ''آگرہ سے روانہ ہوئے ہمیں اکیسواں دن تھا کہ مغلیہ سلطنت کا مشہور شہر لاہور نظر آیا جس میں آبادی اس قدر تھی کہ شہر کے باہر ڈیڑھ میل تک خوشنما خیموں اور نفیس عمارتوں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوبصورت شہر کے بڑے دروازے ہیں اور ہر دروازے پر مختلف رنگوں کے گنبد ہیں (اب یہ گنبد نہیں ہیں۔ فوق) شہر میں داخل ہونا معمولی بات نہ تھی۔ کچھ لوگ پیادہ چل رہے تھے کچھ اونٹوں پر تھے اور کچھ ہاتھیوں پر سوار تھے۔ چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بھی بکثرت تھیں۔ کھوے سے کھوا اچھلتا تھا۔ اس لیے ہم واپس آ گئے۔ شہر کے دروازے کے باہر بہت سے درخت تھے جہاں نانبائی اور مختلف دکاندار تھے۔ ہم وہاں چلے گئے ہم نے

بھیڑ کم ہونے پر بازار کی سیر کی۔ بھیڑ بکری، گائے وغیرہ کے گوشت کے علاوہ پرندوں کا گوشت بھی مل سکتا تھا البتہ خنزیر کے گوشت کی قطعی ممانعت تھی۔ بعض دکاندار زندہ پرندے بھی بیچتے تھے۔ ہر قسم کی سبزی اور میوہ بہ افراط موجود تھا۔ ہم نے بازاروں میں چار قسم کی روٹیاں دیکھیں۔ ایک وہ جو لوہے کے توے پر پکائی جاتی ہے ایک مٹی کے بڑے بڑے برتنوں میں (یعنی تنوروں میں۔ فوق) ایک قسم کی روٹی کا نام کلچہ ہے جو میدہ سے بنائی جاتی ہے ایک قسم کا نام روغنی روٹی ہے جو آٹے اور گھی سے بنتی ہے ایک آدمی اعلیٰ کھانا دو وقتوں میں پانچ آنہ تک کھا سکتا ہے۔ اشیائے خوردنی کی افراط و ارزانی اور بازاروں کی صفائی اور خوش سلیقگی سے ہم بے حد متاثر ہوئے خصوصاً اس بات سے کہ سکون واطمینان اور امن وامان ہر شخص کے چہرے بلکہ درودیوار سے ظاہر ہو رہا تھا اور سوداگر لوگ نہایت آزادی اور بےفکری کے ساتھ تجارت میں مصروف تھے۔

لاہور کے ایک طرف دریا بہتا ہے جو مختلف علاقوں کو سیراب کرتا ہوا ملتان پہنچتا ہے اور وہاں سے سندھ چلا جاتا ہے یہ شہر مغلیہ سلطنت میں دوسرے درجہ کا شہر ہے۔ یہاں کے خوبصورت باغات، محلات، تالاب، اور فوارے سیاح اور ناظر پر بڑا اثر ڈالتے ہیں اس کے بڑے بازار کا نام بازار دلکشا ہے اس میں اس قدر دولت ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ یورپین منڈی کا مقابلہ کر سکتا ہے۔'' ۹۴

غرض عہد شاہجہاں میں لاہور کی ترقی اور رنگا رنگ زندگی اپنے عروج پر رہی۔ ۱۶۵۷ء میں شاہجہاں کی بیماری کے دوران ہی اس کے بیٹوں میں اقتدار کے لیے کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ مراد اور اس کے بعد شجاع نے بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ بعد ازاں مراد اور اورنگزیب میں معاہدہ ہوا کہ دارالشکوہ کو بادشاہ نہ بننے دیا جائے۔ دارالشکوہ اور اورنگزیب کی فوجوں میں فیصلہ کن لڑائی میں دارالشکوہ کو شکست ہوئی۔ بوڑھے باپ شاہجہاں کو قید کرنے کے بعد ۱۶۵۸ء میں اقتدار اورنگزیب کے ہاتھ آیا۔ اس نے نصف صدی تک حکومت کی۔ اورنگزیب عالمگیر نے خلیل اللہ خان کو لاہور کا صوبیدار بنا کر انتظامات اس کے سپرد کر کے خود دہلی روانہ ہو گیا۔ اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ میں لاہور معاملات سلطنت کے لحاظ سے پہلے کی طرح نامور نہ رہا۔ عالمگیر اپنے دور حکومت میں صرف دو بار لاہور آیا کیونکہ دکن کے مرہٹوں اور راجپوتانہ کے باغیوں سے برسرپیکار رہا اور لاہور شہر کی افزائش اور اس کے حالات پر توجہ نہ دے سکا تاہم اپنی تخت نشینی کے چوتھے برس دریائے راوی کی طغیانی کی وجہ سے شہر کو محفوظ بنانے کے لیے پختہ بند (۱۶۶۱ء) بنوایا۔ بند عالمگیری کے علاوہ لاہور میں شاہی مسجد کی تعمیر (اس کا سنگ بنیاد ۱۶۷۳ء میں رکھا گیا) نے لاہور کی زیب وزینت میں اضافہ کیا۔ حضرت میاں میرؒ کا مقبرہ بھی تعمیر کرایا۔ عہد عالمگیری میں جن شعراء، علماء اور فضلاء نے لاہور کی رونق بڑھائی ان میں ابوالبرکات منیر لاہوری، مولوی نظام الدین، شاہ رضا شطاری، شیخ عبدالعزیز اور ملا محمد اکرم کا نام نمایاں ہے۔ خود عالمگیر کی بیٹی زیب النساء بھی شاعرہ تھی اور لاہور میں قیام پذیر اور صاحب دیوان تھی۔ عالمگیری دور میں خلیل اللہ خان کے بعد امین خان، قوام الدین خان، مکرم خان، خان جہاں بہادر، ابراہیم مہابت خان، نواب میاں خان صوبیدار لاہور رہے۔ عہد عالمگیری میں بھی لاہور کے حالات کم وبیش پُرسکون رہے۔

اورنگزیب عالمگیر کی وفات (۳ مارچ ۱۷۰۷ء) کے بعد مغلوں کا جاہ وجلال زوال پذیر ہوا اور مغلیہ سلطنت کے بہت سے صوبے خودمختار بن گئے۔ سکھوں نے بھی پنجاب کے بہت سے علاقوں پر تسلط جمالیا۔ بیرونی صوبے کے دارالحکومت کی حیثیت سے مغل سلطنت کے زوال کی کمزوری کا نشانہ بھی سب سے پہلے لاہور ہی بنا۔ اورنگزیب عالمگیر نے ۱۷۰۰ء کے قریب شہزادہ معظم (جو شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے مشہور ہوا) کو لاہور، ملتان اور کابل کے صوبوں کا نائب السلطنت بنایا۔ عالمگیر کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں معظم، اعظم اور کام بخش کے مابین حصول تخت کی جنگیں ہوئیں جن میں معظم کامیاب ہوا اور اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ شاہ عالم نے صوبہ لاہور اپنے فرزند معزالدین جہاندار شاہ کے حوالے کیا۔ جہاندار شاہ خود باپ کے ہمراہ ہولیا اور سید محمد اسلم خان کو نائب ناظم مقرر کر گیا۔ شاہ عالم کا پانچ سالہ دور راجپوتوں اور سکھوں کی شورشوں کو کچلنے میں گزرا۔

دراصل سکھوں کا عمل دخل جہانگیر کے دور میں نظر آتا ہے جہانگیر نے جب خسرو کی بغاوت کو فرو کیا تو پانچویں گورو ارجن (پہلے چار میں بابا نانک، گرو انگد، امر داس اور رام داس تھے) کو خسرو کے ساتھ سازشیں رکھنے کے الزام میں جرمانہ اور قید کیا۔ اسی قید میں گورو ارجن مر گیا۔ گورو ارجن کی وفات کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین گورو ہرگوبند (سکھوں کا چھٹا گرو) نے باپ کا بدلہ لینے کے لیے جنگ وجدل کا آغاز کیا۔ سکھ قوم کو جنگجو اور لڑاکا بنایا۔ جہانگیر نے اسے اس کے رفقاء کو اپنی ملازمت سے منسلک کر لیا لیکن جب جہانگیر نے ہرگوبند کی ملک ہوس گیری کو بھانپ لیا تو اسے قلعہ گوالیار میں مقید کر دیا اور بارہ برس بعد ایک مسلمان امیر کی سفارش پر اس کو رہائی دی۔ ہرگوبند نے ایک بار پھر خودمختار ہو کر لشکر بنانے کے لیے سکھوں کو مجتمع کیا۔ جہانگیر کی وفات کے بعد شاہجہاں کے عہد میں ہرگوبند نے دارالشکوہ کے ساتھ موافقت پیدا کی۔ جب وہ حاکم پنجاب تھا اور لاہور میں قیام پذیر تھا۔ شاہجہاں کے دور میں ہی سکھوں سے مغل مسلمانوں کی تین جنگیں ہوئیں جن میں گورو ہرگوبند کو فتح ہوئی۔ اگر چہ فتح پائی لیکن شاہی انتقام سے مغلوب ہو کر بھٹنڈہ کی طرف پہاڑوں میں روپوش ہو گیا اور چند سال بعد ۱۶۴۵ء میں وہیں وفات پا گیا۔ گورو ہرگوبند کے بعد اس کا پوتا گورو ہررائے اس کا جانشین اور ساتواں گورو بنا۔ اورنگزیب اور دارالشکوہ میں جب تخت نشینی کے لیے جنگ ہوئی تو گورو ہررائے نے اپنے دادا ہرگوبند سے دوستی کی بناء پر دارالشکوہ کا ساتھ دیا لیکن جب دارالشکوہ کو شکست ہوئی تو وہ کیرت پور چلا گیا۔ اورنگزیب نے ہررائے کو سزا دینے کے لیے اسے پیغام بھیجا۔ ہررائے نے اس پیغام کا ایک معقول جواب اپنے بیٹے رام راؤ کے ہاتھ بھیجا جس سے عالمگیر متاثر ہوا اور اسے خلعت فاخرہ اور دربار میں حاضر رہنے کی اجازت دی۔ اورنگزیب عالمگیر نے ہی گورو تیغ بہادر کو دہلی میں قتل کروا دیا۔ جس کا بدلہ لینے کے لیے سکھوں کے دسویں گورو گوبند نے شورشیں شروع کر دیں۔ بادشاہ نے زبردست خان صوبہ دار لاہور اور سرہند کے صوبہ دار شمس الدین کو اسے سزا دینے کے لیے بھیجا۔ گورو کو شکست ہوئی لیکن وہ روپوش ہو گیا بعد ازاں عالمگیر کو معافی نامہ بھیج کر فقیرانہ گذران کا وعدہ کیا جس پر عالمگیر نے اس کی خطا کو معاف کر دیا۔ بہادر شاہ عالم اول نے بھائیوں کو

شکست دینے کے بعد گورو گوبند کو پنجاب سے طلب کر کے اپنی ملازمت سے منسلک کر لیا۔ گورو گوبند نے شاہ عالم اول کے عہد (۱۷۰۸ء) میں وفات پائی۔ شاہ عالم اول ہی کے عہد میں لچھمن دیو المعروف بندہ بیراگی (گورو گوبند کا چیلا) نے گورو کی وفات پر سکھوں کے مذہبی پیشوا ہونے کا دعویٰ کیا۔

بندہ بیراگی بہت سے سکھوں کی سرگروہی میں ملک کے اندر اُدھم اور شورش برپا کی اور لدھیانہ کے قرب و جوار کے شوالک کے پہاڑوں میں اپنا مسکن بنایا۔ کرنال اور لدھیانہ کے علاقوں میں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی قتل و غارت کرتے ہوئے ستلج پار کر کے مضافات لاہور کے کئی شہروں اور حصوں کو لوٹتا ہوا لاہور آ پہنچا۔ لاہور جو مغلوں کے دور سے فتنہ و فساد سے محفوظ خوشحال و متمول چلا آ رہا تھا۔ باغی لشکر کی گوشمالی کے لیے شاہ عالم کے مقرر کردہ صوبیدار لاہور سید اسلم خان نے اس کا مقابلہ کیا لیکن شہر میں فوج کی کمی کے باعث اسے ہزیمت اٹھانا پڑی۔ چنانچہ جب بہادر شاہ عالم اول کو صورت حال کی اطلاع ملی تو وہ خود اس فتنے کے استیصال کے لیے ۱۷۱۱ء میں لاہور آیا۔ بندہ بیراگی شاہی افواج کے مقابلے کی تاب نہ لا کر پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ عالم اول اپنے چاروں بیٹوں (جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان، جہاں شاہ) سمیت لاہور میں تھا کہ جنوری ۱۷۱۲ء میں صحت خراب ہو گئی جو ۲۷ فروری ۱۷۱۲ء کو پیغام اجل بن گئی۔ بہادر شاہ عالم اول کے بعد کسی مغل بادشاہ کو لاہور آنا نصیب نہ ہوا۔

شاہ عالم اول کی بیماری کے دوران ہی اس کے بیٹوں میں بھی حصول تخت کے لیے جنگ و جدل کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہ جنگ لاہور کے نواح میں راوی کے کنارے کئی روز جاری رہی۔ جس میں جہاندار شاہ نے عظیم الشان اور اس کے بیٹوں کے بعد جہاں شاہ سے نبرد آزما ہو کر کامیاب ہوا۔ آخر میں رفیع الشان اپنے بیٹوں کے ساتھ جہاندار شاہ اور اس کی فوج سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ یوں بالآخر سلطنت کا تخت جہاندار شاہ کے ہاتھ آیا اور اس نے ۲۹ مارچ ۱۷۱۲ء کو اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ یکم مئی ۱۷۱۲ء کو دہلی روانہ ہو گیا۔ ''مقتول شہزادوں کی افواج منتشر کر دی گئیں۔ نامور امراء موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے بچے کھچے امراء کو طوق و سلاسل میں جکڑ کر دہلی پہنچایا گیا اس طرح حریفان اقتدار کو خاک و خون میں ملا کر جہاندار شاہ نے تخت شاہی پر قدم رکھا۔''[۹۴]

جہاندار شاہ نے بھائیوں سے جنگ میں وفاداری دکھانے کی بناء پر زبردست خان کو اس کے دادا کا لقب ''علی مردان'' بطور خطاب دے کے لاہور کا صوبہ دار بنایا۔ جہاندار شاہ تیموری خانوادے کا پہلا ایسا بدترین حکمران تھا جس نے ظلم و ستم اور عیش و نشاط کا راستہ اختیار کیا۔ ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے بنگال سے آ کر ۱۷۱۳ء میں جہاندار شاہ کے اقتدار کا خاتمہ کیا اور عبرت ناک انجام تک پہنچا کر خود سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ فرخ سیر نے اپنے دورِ حکومت میں انگریزوں کو تجارتی حقوق دیئے۔ راجپوتوں اور سکھوں کی سرکشی کو فرو کیا۔

بہادر شاہ عالم اول کی موت (۱۷۱۲ء) کے بعد مغل شہزادوں کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے بندا بیراگی کو ایک بار پھر اپنی عسکری قوت کی تنظیم نو کا موقع مل گیا چنانچہ پہاڑی پناہ گاہوں سے نکل کر سرہند پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا قتل عام کرنے اور شہر کو آگ لگانے کے بعد ستلج، بیاس اور راوی کے درمیان کئی قصبوں کو جلا کر تباہ کیا اور بٹالہ پر بھی یورش کی۔ بندا بیراگی کی غارتگری سے لاہور بھی نہ بچ پایا۔ یہ فرخ سیر کا عہد تھا اس نے بندا بیراگی کی سرکشی فرو کرنے اور اس کی سرکوبی کر کے اس کے خلاف تادیبی کارروائی کے لیے تورانی امیر زادے عبدالصمد خان کو لاہور کی صوبہ داری پر مقرر کیا۔ اس نے بندہ بیراگی اور اس کے ساتھی باغیوں کے خلاف شاندار کامیابی حاصل کی اور بندا بیراگی کو ۱۷ دسمبر ۱۷۱۵ء کو گرفتار کر کے دہلی بھجوا دیا جہاں اسے اس کے رفقاء کے ساتھ قتل کر دیا گیا جبکہ باقی ماندہ سکھ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپے۔ صوبہ دار عبدالصمد خان کی مدبرانہ انتظامی صلاحیتوں اور بہادری کی وجہ سے اس کے جیتے جی سکھوں نے دوبارہ سر نہ اٹھایا۔ عبدالصمد خان ۱۷۱۳ء تا ۱۷۳۷ء لاہور کا ناظم رہا اور اس کے دور میں لاہور میں امن وامان قائم رہا۔ اس دور میں صوبہ دار کو اپنے علاقے میں اندرونی حکومت کے سلسلہ میں مکمل اختیار تھا۔ نظامتیں اور صوبہ داریاں موروثی بن گئیں تھیں اور یہ شہنشاہ دہلی کے ساتھ اپنی وفاداری کو استوار رکھتے۔

ادھر مرکز میں امراء کی طاقت بڑھ گئی اور اپنے خودغرضانہ عزائم کی بناء پر سیدوں نے فرخ سیر کو معزول کرنے کے بعد قتل کر دیا اور ۱۷۱۹ء میں تخت پر بہادر شاہ کے دو کمزور پوتوں رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کو تین تین ماہ کے لیے تخت شاہی پر بٹھایا۔ جو سال بھر میں ہی وفات پا گئے۔ ان کے بعد ایک اور تیموری شہزادے روشن اختر کو تخت پر بٹھایا گیا جو جہاں شاہ کا بیٹا تھا۔ یہ بھی کمزور بادشاہ تھا۔ ۱۷۱۹ء میں بادشاہ گر سید بھائیوں کا زور ٹوٹ گیا چنانچہ روشن اختر ۱۷۴۸ء تک تخت دہلی پر متمکن رہا۔ گو کہ اس کا دور حکومت طویل تھا لیکن سلطنت کا زوال بھی انتہا کو پہنچ چکا تھا کیونکہ صوبے خودمختار ہو چکے تھے اور دکن کے مرہٹے پھر سرگرم ہو گئے انہوں نے شمالی ہند تک یلغاریں کرنی شروع کر دی تھیں۔ لاہور میں نواب عبدالصمد خان کی وفات (۱۷۳۷ء) تک امن وسکون رہا۔ اس کے بعد جب اس کا بیٹا نواب زکریا خان شاہی دربار سے خان بہادر کا خطاب پا کر لاہور کا صوبہ دار بنا تو اس نے بھی باپ کی طرح لاہور کا امن وامان قائم رکھا۔

۱۸ نومبر ۱۷۳۸ء کو مغرب سے ایرانی جنگجو نادر شاہ دریائے سندھ، جہلم اور چناب کو عبور کرتا ہوا ۱۷۳۹ء میں لاہور کی طرف روانہ ہوا تو ذکریا خان نے پہلے اس کا وزیر آباد کے مقام پر مقابلہ کیا۔ پھر لاہور میں راوی کے پار تین روز تک مقابلہ کیا لیکن شکست کھا کر لاہور شہر کی سلامتی کے لیے صلح کا خواستگار ہوا۔ بدلے میں بیس لاکھ روپیہ اور چند زنجیر فیل بطور نذرانہ پیش کیا ۹۵ جسے نادر شاہ نے منظور کر لیا اور لاہور میں نواب زکریا خان کی صوبیداری بدستور قائم رہی اور شہر نادرشاہی لوٹ مار سے بچ گیا۔ نادر شاہ کی واپسی کے بعد سکھوں نے ایک بار پھر مختلف گڑھیاں بنا کر غارت گری کا سلسلہ شروع کر دیا اسی اثناء میں زکریا خان وفات (۱۷۴۵ء) پا گیا۔ لاہور کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی۔ زکریا خان کے بعد اس کا بیٹا یحییٰ خان صوبیدار بنا۔''۳

جنوری ۱۷۴۶ءکو اس امر کا فرمان ملا کہ ناظم پنجاب تو وزیر قمر الدین ہوگا لیکن وہ دہلی میں رہ کر امور وزارت انجام دے گا لیکن پنجاب میں اس کا نائب یحییٰ خان حکومت کرے گا۔"۹۶

یحییٰ خان کے عہد میں بھی سکھوں کی انسانیت سوز سرگرمیوں نے پھر سے زور پکڑا۔سکھوں نے لاہور کے دیوان اور مدارالمہام لکھپت رائے کے بھائی جسپت رائے فوجدار امین آباد کو قتل کر دیا۔۱۷۴۶ء میں لکھپت رائے یحییٰ خان کی فوج کے ہمراہ سکھوں کی سرکوبی کے لیے گیا۔سکھ جموں بھاگ گئے لکھپت رائے نے تعاقب کیا اور ایک ہزار سکھ گرفتار کر کے لاہور لایا اور دہلی دروازے کے باہر بمقام شہید گنج ۹۷ قتل کر دیا۔اس طرح سکھوں کا فتنہ پھر سے دب گیا لیکن اسی عرصہ میں یحییٰ خان اور اس کے بھائی شاہنواز خان (حاکم ملتان) کے درمیان وراثت کا تنازعہ شروع ہوا۔جس کی وجہ سے دونوں بھائیوں کے درمیان ۱۷ مارچ ۱۷۴۶ءکو بیگم پورہ کے قریب جنگ ہوئی۔شاہنواز نے اپنے رفیق آدینہ بیگ (ناظم جالندھر) کے ہمراہ یحییٰ خان کو شکست دی جس پر وہ دہلی بھاگ گیا اور شاہنواز نے لاہور کی نظامت پر قبضہ کر لیا لیکن لاہور میں صوبیداری کے لیے شاہی فرمان حاصل نہ کر سکا چنانچہ اس نے سرزنش کے خوف اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے کے لیے دوسری راہ اختیار کی اور آدینہ بیگ کے مشورے سے احمد شاہ ابدالی (جس نے ایرانی قزلباشوں کے ہاتھوں نادر شاہ کے قتل کے بعد نادر شاہ کی سلطنت کے مشرقی حصہ جو اکثر وبیشتر موجودہ افغانستان پر مشتمل ہے؛ پر قابض ہو کر اپنی حکومت کا اعلان کر دیا تھا) سے موافقت کر کے اسے لاہور پر حملے کی دعوت دے کر اپنی حمایت کا یقین دلایا۔اس بات کی خبر جب اس کے چچا قمر الدین خان وزیر دہلی کو ہوئی تو اس نے شاہنواز خان کو اس کی غلطی کا احساس دلایا اور اسے احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لیے رضامند کیا۔

ادھر احمد شاہ ابدالی مشرقی ممالک فتح کرتا ہوا ابھی اٹک کے پار ہی پہنچا تھا کہ اسے شاہنواز کے تبدیلی ارادہ کا حال معلوم ہوا تو اس بدعہدی پر برافروختہ ہوا اور اسے سزا دینے کا فیصلہ کیا۔احمد شاہ ابدالی نے شاہنواز کے پاس لاہور کے ایک درویش صابر شاہ (ابدالی کی صابر شاہ سے بمقام مشہد میں ملاقات ہوئی اور اس نے ابدالی کو تخت وتاج کی بشارت دی جو بعد ازاں پوری ہوئی اسی لیے ابدالی ان درویش کو بہت عزیز رکھتا تھا) کو بھیجا لیکن سفارتی آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے شاہنواز نے اس درویش کی جرات مندانہ گفتگو پر اسے قتل کروا دیا۔اس خبر پر احمد شاہ ابدالی آگ بگولہ ہوا۔اس نے شاہدرہ سے شمال کی طرف بڑھتے ہوئے دریائے راوی عبور کیا اور شالامار باغ کے متصل خیمہ زن ہوا۔شاہنواز خان نے لاہور اور قلعہ کی مضبوطی سے مورچہ بندی کی لیکن اس کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا جس میں شاہنواز شکست کھا کر دہلی فرار ہو گیا۔لاہور پر پہلے حملے (۱۲ جنوری ۱۷۴۸ء) میں ابدالی کے سپاہیوں نے لاہور قابض ہو کر بیگم پورہ کے محلوں اور بیرون شہر امرائے لاہور کی آبادی مغلپورہ میں لوٹ مار کرنے کے ساتھ بے دریغ قتل عام کیا۔جس سے لاہور کو جانی اور مالی حوالے سے بہت نقصان پہنچا۔"آخر میر مومن خان، سید جمیل الدین، میر نعمت خان بخاری، دیوان لکھپت رائے اور دیوان صورت سنگھ

وغیرہ اکابر لاہور بصورت وفد احمد شاہ درانی کی بارگاہ میں حاضر ہوئے تمیں لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کر کے رحم کی درخواست کی جو مقبول ہوئی۔ قتل وغارت گری کا سلسلہ بند ہو گیا۔'' ۹۸

احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر قابض ہونے کے بعد ایک ماہ قیام کے دوران اپنے نام کا سکہ جاری کیا اور جملہ خان کو لاہور کا ناظم مقرر کرنے کے بعد سرہند پر قبضہ کے لیے دہلی کی طرف پیش قدمی کی۔ جسے کرنال کے مقام پر قمر الدین وزیر دہلی نے روکا اور خونریز لڑائی میں ابدالی کے گولہ انداز جاسوسوں نے قمر الدین خان وزیر کی جان لے لی لیکن قمر الدین خان وزیر کے بیٹے میر معین الملک المعروف میر منو نے اپنی بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کو شکست دی جس پر ابدالی واپس لاہور آیا اور یہاں سے کابل روانہ ہو گیا۔ اسی سال مغل فرمانروا محمد شاہ کا انتقال (۱۷۴۸ء) ہوا اور اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا جس نے میر منو کو اس کی بہادری کے صلے میں ''معین الملک'' ''رستم ہند'' کا خطاب دے کر لاہور کی نظامت پر مامور کیا۔ میر منو نے اپریل ۱۷۴۸ء کو نظامت کا عہدہ سنبھالا۔ مغلوں اور افغانوں کی لڑائی کے نتیجہ میں پھیلنے والی ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سکھ گردی کا بازار پھر سے گرم ہو گیا۔ میر منو نے ان کی سرکوبی کی جس پر سکھ اپنی پناہ گاہوں میں جا چھپے۔

میر منو نے کوڑامل کی مدد سے سکھوں سے خوشگوار تعلقات استوار کرنے کی بھی کوشش کی۔ ادھر احمد شاہ ابدالی نے سرہند کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے لاہور پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں اور دوسری بار ۱۷۴۸ء کے اواخر میں لاہور کی جانب خروج کیا۔ میر منو کو مرکز میں احمد شاہ کے دربار میں عرضیاں بھیجنے کے باوجود جب امداد نہ پہنچائی گئی تو جتنے بھی وسائل اس کے پاس تھے انہیں بروئے کار لاتے ہوئے احمد شاہ ابدالی کے حملے کو روکنے کی کوشش کی۔ سودھرا کے مقام پر ۱۷۴۹ء میں احمد شاہ ابدالی اور میر منو میں گفت وشنید کے نتیجہ میں پنجاب کے چار اضلاع کا مالیہ بطور خراج دے کر صلح کا راستہ اختیار کیا۔ میر منو کے اس اقدام کو مرکز میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا گیا۔ اس دوران موقع پا کر سکھوں نے پھر سے لاہور کے مضافات میں لوٹ مار شروع کر دی۔ میر منو احمد شاہ ابدالی کی روانگی کے بعد سکھوں کے خلاف تادیبی کارروائیوں میں مصروف ہو گیا۔

میر منو کی جانب سے سال کے آخر میں بروقت چار اضلاع کا مالیہ نہ پہنچنے پر احمد شاہ ابدالی ناراض ہوا اور تیسری بار ۱۷۵۲ء میں لاہور پر فوج کشی کی۔ میر منو نے کسی نہ کسی طرح نو لاکھ روپیہ بھیج کر بقیہ بھی جلد ادا کرنے کا وعدہ کر کے فوج کو ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ روپیہ لینے کے باوجود ابدالی نے پیش قدمی کرتے ہوئے راوی عبور کر کے موضع نیاز بیگ کے راستے لاہور پہنچ کر بیگم پورہ سے کچھ فاصلے پر ڈیرے ڈال دیئے جبکہ میر منو افغانی فوج کو روکنے کے لیے شہر سے ۲۲ میل دور شاہ دولہ کے پل پر مورچہ بند تھا۔ جب اسے معلوم ہوا تو لاہور پہنچا اور شہر کے دفاعی انتظامات درست کیے۔ ابدالی افواج نے شہر کا محاصرہ چھ ماہ تک کیے رکھا۔ اس صورتحال میں بھی میر منو کو مرکز سے کوئی مدد نہ پہنچی۔ ۵ مارچ ۱۷۵۲ء کو پنجابی اور افغانی فوج میں گھمسان کی جنگ ہوئی اور میرے منو کو شکست ہوئی۔ میر منو اس دلیری سے لڑا تھا کہ احمد شاہ ابدالی بھی اس کی شجاعت سے متاثر ہوئے بغیر

نہ رہ سکا۔اس معرکے میں کوڑامل کے مارے جانے کے بعد میر منو قلعہ لاہور چلا آیا اور احمد شاہ ابدالی سے صلح کی درخواست کی۔ شالامار باغ میں جہاں خان وزیر کے ذریعے ابدالی اور میر منو کی ملاقات ہوئی۔ ’’میر منو گراں بہا جواہرات ایک کروڑ روپیہ نقد، تین سو حلقہ کمان لاہور، پانچ سو عمدہ بندوقیں، دو سو ایرانی تلواریں، اکیس عراقی گھوڑے اور گیارہ ہاتھی لے کر بادشاہ افغان کے سامنے پیش ہوا۔بادشاہ نے تاجرانہ طریقے سے رقم وصول کی اور میر منو کو اپنی طرف سے لاہور کا ناظم مقرر کیا‘‘۹۹ اس واقعہ کے بعد میر منو احمد شاہ ابدالی کی طرف سے لاہور میں حکومت کرنے لگا اور اہل لاہور ابدالی کی رعایا بن گئے۔’’اس کے بعد احمد شاہ درانی نے اپنے سفیر قلندر بیگ کو اپنے ہم نام احمد شاہ تیموری کے دربار میں دہلی بھیجا کہ صوبہ جات لاہور و ملتان کو احمد شاہ درانی کے حوالے کر دے۔بادشاہ نے سفیر کو دیوان عام میں شرف باریابی بخشا اور عہد نامے پر مہر لگا کر سفیر حوالے کر دیا اور پنجاب بادشاہ دہلی کی سلطنت سے نکل کر احمد شاہ درانی کی قلمرو میں شامل ہو گیا۔‘‘۱۰۰ ایک بار پھر سکھوں نے احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور کے گرد و نواح میں زور پکڑا۔میر منو نے ابدالی کے کابل جانے کے بعد سکھوں کی گوشمالی کی طرف بھرپور توجہ دی اور سکھوں کو سزائیں دیں لیکن ان کی تعداد کم ہونے میں نہ آتی تھی جس کا اندازہ اس زمانے میں پنجابی کے ان مصرعوں سے بخوبی ہوتا ہے۔

’’منو ساڈی داتری اسی منو دے سوئے

جوں جوں سانوں وڈدا اساں تیوں تیوں دونے ہوئے

یا

میر منو دے سوئے الوں لاڑے۔۔۔بیٹھوں دونے ہوئے‘‘۱۰۱

سکھوں پر فتح یابی کے بعد ۱۷۵۳ء میں زہر خورانی کے باعث اچانک میر منو کی وفات ہو گئی تو اس کے شیر خوار بیٹے محمد امین خان کو لاہور کا صوبیدار بنایا گیا اور میر منو کی بیوہ مراد بیگم عرف مغلانی بیگم اس کی سرپرست بنی۔مئی ۱۷۵۴ء میں شیر خوار ناظم لاہور کا بھی انتقال ہو گیا۔مغلانی بیگم مضبوط اعصاب کی مالک تھی لہٰذا اس نے فہم و فراست سے کام لیتے ہوئے اپنے سفیر دہلی و قندھار بھیج کر مغل بادشاہ اور احمد شاہ ابدالی دونوں فرمانرواؤں سے اپنے لیے فرمانِ حکومت حاصل کر لیا۔مغلانی بیگم کا دور زیادہ تر سیاسی انتشار اور بدامنی کا رہا۔بھکاری خان، خواجہ محمد سعید خان اور اس کے بھائی خواجہ مرزا خان نے سازباز کر کے مغلانی بیگم کو اقتدار سے محروم کر کے نظر بند کر دیا۔یہ خبر سنتے ہی احمد شاہ ابدالی نے پشاور کے گورنر جہاں خاں کے بھائی امان خان کو مغلانی بیگم کی مدد کے لیے لاہور بھیجا جس نے خواجہ مرزا خان کو قید کیا جبکہ بھکاری خان کو مغلانی بیگم نے قتل کروا دیا۔ امان خان نے لاہور کو خوب لوٹا۔مغلانی بیگم لاہور کی ناظم مقرر کی گئی اور خواجہ عبداللہ کو اس کا نائب بنایا گیا۔امان خان کے جانے کے بعد خواجہ عبداللہ نے لاہور کی نظامت پر قبضہ کرنے کے لیے مغلانی بیگم کو نظر بند کر دیا اور خود عنانِ حکومت سنبھال لی۔اہل لاہور خواجہ عبداللہ کو اس کی لوٹ مار کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے۔اس دور میں لاہور کی اقتصادی بدحالی کا اندازہ اس

مشہور ضرب المثل سے بھی ہوتا ہے:

''حکومت نواب عبداللہ   نہ رئی چکی نہ رنیا چلھا''۱۰۲

ان حالات میں آدینہ بیگ نے فوج کشی کر کے لاہور پر قبضہ کرلیا۔ خواجہ عبداللہ سندھ کی جانب فرار ہوگیا۔ اس بار مغلانی بیگم نے دہلی کے وزیر اور اپنے داماد غازی الدین عمادالملک کو مدد کے لیے خط بھیجا۔ جس نے مغلانی کی نظامت واپس دلائی لیکن بعد ازاں عمادالملک نے تیس لاکھ خراج کے عوض لاہور کی صوبہ داری آدینہ بیگ کے سپرد کی اور مغلانی کو قید کر کے اپنے ہمراہ دہلی لے گیا۔ چونکہ احمد شاہ ابدالی مغلانی بیگم کو اپنی صوبہ دار خیال کرتا تھا اس لیے جب یہ خبر احمد شاہ ابدالی کو ہوئی تو وہ چوتھی بار لاہور کا رخ کرتے ہوئے لاہور کو روندتا ہوا دہلی پہنچا۔ مغلانی بیگم کو خلعت فاخرہ عطا کرنے کے ساتھ تیس ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کیا۔ لاہور میں احمد شاہ ابدالی نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کو ناظم اور جہان خان کو اس کی نیابت پر مقرر کیا۔ تیمور شاہ نے ایک طرف سکھوں کی غارت گری پر ان کی سرکوبی کی تو دوسری طرف آدینہ بیگ کو لاہور پر زبردستی قابض ہونے کی گستاخی کی سزا دینے کا ارادہ کیا لیکن آدینہ بیگ پنجاب کے پہاڑوں کی طرف چلا گیا اور اس نے مرہٹوں سے سازباز کر کے انہیں لاہور پر حملے کی دعوت دی۔ ۱۷۵۸ء میں مرہٹوں نے کثیر تعداد میں لاہور پر چڑھائی کی جس کا سردار جہان خان نے بہادری سے مقابلہ کیا لیکن بالآخر اپنی فوج سمیت پشاور کی راہ لی۔ جبکہ تیمور شاہ بھی پسپائی پر شہر چھوڑ کر چناب کی طرف چلا گیا۔ یوں پہلی بار سکھوں نے جسا سنگھ کلال کی سرکردگی میں لاہور پر قبضہ کرلیا اور آدینہ بیگ کو ۷۵ لاکھ روپے سالانہ خراج پر لاہور کا ناظم مقرر کیا اور واپس دکن چلے گئے لیکن آدینہ بیگ نے خواجہ مرزا خان کو لاہور میں چھوڑا اور خود بٹالہ میں قیام پذیر ہوا۔

ان سب حالات کی خبر پا کر احمد شاہ ابدالی نے لاہور پر پانچویں حملے کی تیاری کی اور ۱۷۵۹ء میں لاہور پہنچا۔ اب کی بار سے ابدالی نے لاہور پر حملے کے لیے نہیں بلکہ اہل پنجاب کو سکھوں کی تخریبی سرگرمیوں سے بچانے کے لیے پنجاب کا رخ کیا چنانچہ سکھ ابدالی کی آمد کا سن کر ملتان اور لاہور خالی کر کے دہلی کی طرف چلے گئے۔ ابدالی لاہور میں خواجہ بلند خان سدوزئی کو حاکم لاہور مقرر کر کے سرہند کی طرف روانہ ہوا۔ احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی فیصلہ کن تیسری جنگ میں مرہٹوں کی طاقت کا قلع قمع کرنے کے بعد واپس قندھار آ گیا۔ ابدالی کی واپسی پر سکھوں نے پھر سے طاقت پکڑی چڑھت سنگھ نے گوجرانوالہ میں اپنی گڑھی بنالی جس پر ۱۷۶۲ء میں بلند خان نے حملہ کیا لیکن شکست کھائی۔ اس سے سکھوں کے حوصلے اور بڑھ گئے۔ لہٰذا ابدالی نے لاہور پر ۱۷۶۲ء میں چھٹا حملہ کر کے سکھوں کو شکست دے کر ستلج پار دھکیل دیا۔ اس بار وہ لاہور کا ناظم ایک ہندو کابلی مل کو مقرر کر دیا اس کی توجیہہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے یہ بیان کی ہے کہ ''احمد شاہ ابدالی اور اس کے جانشینوں نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اب اہل پنجاب کے پاس لٹوانے کو کچھ نہیں رہا مسلمان امراء کی بجائے سکھ سرداروں پر اعتماد کرنا شروع کر دیا۔''۱۰۳

اس بار بھی ابدالی کے جانے کے بعد سکھوں نے حسب معمول غارت گری شروع کر دی چنانچہ قصور، جالندھر

دوآب، مالیر، کوٹلہ، سرہند، دوآب گنگن وجمن، سہارنپور اور میرٹھ کے ضلعوں کو تخت و تاراج کرتے ہوئے لاہور کا محاصرہ کر کے سکھوں کی پہلی مثل، بھنگی مثل کے تین سکھ سرداروں گوجر سنگھ، لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ نے کابلی مل کو لاہور سے نکال کر یہاں قبضہ کر لیا اور خوب لوٹ مار کی۔ یہی وجہ ہے کہ ابدالی نے ۱۷۶۴ء میں لاہور پر ساتواں حملہ کیا۔ ابدالی اور سکھ فوج میں لڑائی ہوئی لیکن کسی ہنگامے کی وجہ سے ۱۷۶۵ء میں ابدالی کو اپنے وطن واپس لوٹنا پڑا جس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سکھوں نے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر دوسری بار لاہور پر قبضہ کر لیا۔ سوبھا سنگھ، گوجر سنگھ اور لہنا سنگھ لاہور کو باہم تین حصوں میں تقسیم کر کے خود مختار بن بیٹھے اور اہل لاہور پر مظالم کی انتہا کر دی۔ سکھوں نے پنجاب کے دیگر حصوں میں بھی اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنالیں چنانچہ دو سال تک سکھوں نے سکون اور بے فکری میں گذارے کیونکہ اپنے اپنے حصے میں ہر سکھ آزاد اور خود مختار تھا۔ اس دوران مساجد کو مسمار کرنا اور مسلمانوں کا قتل عام کرنا ان کا روزمرہ کا معمول بن گیا۔ ان کی اس وحشت، بربریت اور لاقانونیت سے ایک نئے سکھ گردی دور کا آغاز ہوتا ہے جس کا زیادہ تر نشانہ مسلمانوں کو بنایا گیا۔ مسلمانوں کی اس حالت زار کے پیش نظر ابدالی لاہور پر آٹھویں [۴] اور آخری بار ۱۷۶۷ء میں حملہ آور ہوا نتیجتاً تینوں حاکمان لاہور خوفزدہ ہو کر شہر چھوڑ کر بھاگ گئے۔ لیکن اب کی بار لاہور کے معاشرتی اور سیاسی حالات یکسر بدل چکے تھے۔ پورے پنجاب پر سکھوں کے مضبوط تسلط کو دیکھتے ہوئے ابدالی نے مصالحتی رویہ اختیار کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے:

> ''۱۷۶۷ء میں سرہند کے قریب کابلی مل کے بھتیجے پھولکیاں مثل کے سردار امر سنگھ کو ابدالی بادشاہ کی طرف سے خلعت علم، راجہ راجگان کا خطاب اور سرہند کی صوبہ داری عطا ہوئی ۔۔۔ امر سنگھ نے احمد شاہ ابدالی کو راجگی کے خطاب اور خلعت کے عوض ایک لاکھ روپیہ پیش کیا ۔۔۔ اس نے نذر کے ساتھ ہی بادشاہ کو راضی کر لیا کہ سہارنپور اور متھرا کے قرب و جوار سے جو سکھ گرفتار کیے گئے ہیں چھوڑ دیئے جائیں۔ اس نیکی کے بدلے سکھوں نے اسے ''بندی چھوڑ'' کا خطاب دیا۔'' [۵]

چنانچہ لاہور ہی کے ایک وفد کی درخواست پر لہنا سنگھ کو لاہور اور اس کے گردونواح کے علاقہ کی نظامت دے کر ابدالی کابل چلا گیا اور وہیں ۱۷۷۲ء میں وفات پا گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا۔ تیمور شاہ کے دور حکومت میں پنجاب افغانی آشوب سے محفوظ رہا حالانکہ تیمور شاہ ایک سے دوبار یہاں آیا۔ ۱۷۷۷ء میں تیمور شاہ نے ملتان پر قبضہ کیا لیکن اس نے زیادہ توجہ اپنے ملکی حالات کو سنوارنے کی طرف دی۔ ۱۷۶۷ء تا ۱۷۹۷ء تک پنجاب بغیر کسی مخالفت کے بھنگی مثل کے سرداروں کے قبضے میں رہا۔ ''اس زمانے میں پنجاب میں برائے نام مغلوں یا افغانوں کا سکہ رائج تھا اصل حکومت سکھوں کی تھی جو مختلف ریاستیں قائم کر کے پنجاب کے گوشے گوشے میں مطلق العنان حاکموں کی طرح رہتے تھے۔'' [۶]

تیمور شاہ کے بعد اس کا فرزند زمان شاہ کابل کے تخت پر براجمان ہوا۔ اس نے پنجاب میں اپنی افغانی مقبوضات کا کنٹرول دوبارہ حاصل کرنے اور خراج وصول کرنے کے لیے چار بار پنجاب کا رخ کیا جس میں دوبار کابل اور قندھار میں

اپنے بھائی شاہ محمود کے پیدا کردہ انتشار اور بدامنی کی خبر سن کر اسے جلد ہی واپس جانا پڑا۔ ۱۷۹۸ء میں جب وہ لاہور آیا تو سہ حاکمان لاہور خوفزدہ ہو کر شہر چھوڑ کر فرار ہو گئے اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے لاہور پر قابض ہو گیا اسی اثناء میں بھائی کی بغاوت کی خبر پا کر واپس ہوا واپسی پر جلدی میں ہونے اور دوسرے دریائے جہلم میں طغیانی کے باعث دریائے جہلم پر واقع کشتیوں کا پل ٹوٹ گیا۔ جس سے شاہ زمان کی بارہ بھاری توپیں دریا میں گر گئیں۔ جنہیں بعد ازاں سکر چکیہ مثل کے سردار رنجیت سنگھ نے نکلوا کر کابل بھیج دیا۔ اس خدمت کے صلہ میں شاہ زمان نے رنجیت سنگھ کو لاہور کی حکومت کا پروانہ لکھ دیا گو کہ یہ محض کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا لیکن اس نے رنجیت سنگھ کو آئینی جواز فراہم کر دیا جس سے وہ لاہور کا قانونی راجا بن گیا۔ ادھر زمان شاہ کا جانا تھا کہ بھنگی مثل کے سردار دوبارہ واپس آ گئے اور مسلمانوں پر زیادہ سختی برتی۔ ''لاہور کے حاکم مسلمانوں پر کڑی نظر رکھتے تھے اور انہیں شاہ زمان کا جاسوس سمجھا جاتا تھا۔ شک کی بناء پر قید و بند کی اذیتیں مسلمانوں کو برداشت کرنا پڑتی تھیں ۔۔۔ لاہور کے زمینداروں خاص طور پر ارائیوں اور باغبانوں کو سزا اور بے عزتی کے شکنجے سے گزارا جا رہا تھا۔'' ۱۰۷ انہی مظالم سے تنگ آ کر عمائدین لاہور نے پہلے والئ قصور نظام الدین خان کو لاہور پر حملہ کی دعوت دی لیکن مخبری کے باعث نظام الدین خان کی حکمت عملی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ چنانچہ ان عمائدین ۱۰۸ نے رنجیت سنگھ کو لاہور پر حملہ کی دعوت دی اور اسے اہل لاہور کی حمایت کا یقین دلایا۔ رنجیت سنگھ تو اسی انتظار میں تھا لہٰذا آمادگی ظاہر کی اور اپنی ساس سدا کور سے مدد حاصل کر کے اس نے لاہور کی جانب کوچ کیا۔ رنجیت سنگھ کی آمد سے قابضان لاہور فرار ہو گئے اور عمائدین کی مدد سے وہ ۵ جولائی ۱۷۹۹ء میں لاہور شہر پر قابض ہو گیا۔ خود کو ہر دلعزیز بنانے کے لیے اس نے فوج کو لوٹ مار سے باز رکھا۔ اہل لاہور کا خوف وہراس دور کیا؛ شخصی آزادی کی ضمانت دی؛ نظم و نسق کو بہتر بنایا؛ گردونواح کے راجوں اور جاگیرداروں کو بڑی چالاکی سے اپنا ماتحت بنا کر اپنی حیثیت کو نا صرف منوایا بلکہ خود کو مستحکم بھی کیا۔ ۱۸۰۱ء میں اپنے لیے ''مہاراجا'' ۱۰۹ کا لقب اختیار کیا نیز اپنی مہر کے استعمال اور ٹکسال کا اجراء بھی کیا۔ لاہور کو اپنا دارالحکومت بنا کر چالیس سال (۱۷۹۹ء۔۱۸۳۹ء) تک لاہور پر حکومت کی۔ رنجیت سنگھ کے اقدامات جن میں قاضیوں، مفتیوں، عاملوں کے ذریعے پنچایتی نظام، برادری ازم، کوتوالی پولیس، شفاخانوں اور شہر کے گرد نئی فصیل، مزارات کی مرمت، مجاوروں کے روزینے اور مساجد کی تعمیر کی وجہ سے بہتری ہوئی اور قدرے سکون ہوا۔ شہر میں مکانات، حویلیاں، مندر، گوردواروں اور سادھیوں کی بہتات ہو گئی، مہاراجا نے حکومت کا انتظام و انصرام بہتر طریقے سے چلانے کے لیے بارہ دفاتر قائم کئے۔ ۱۱۰

رنجیت سنگھ نے چنیوٹ، ساہیوال، قصور، اٹک، ستلج کے درمیانی علاقے، فرید کوٹ، جھنگ، ملتان، امرتسر، لدھیانہ، انبالہ، مغربی سرحدی علاقوں میں لداخ، تبت، پشاور، ہزارہ، جمرود اور پھلوار تک اپنی سلطنت کی حدود کو وسیع کر لیا تھا۔ مسلمانوں کی آزادی کے لیے مولانا اسمٰعیل شہید اور مولانا عبدالحئی نے رنجیت سنگھ کے مظالم سے تنگ آ کر جہاد کا اعلان کیا لیکن رنجیت سنگھ نے مقابلہ کر کے تحریک کو ختم کر دیا۔ ستلج کے پار کا علاقہ چونکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تصرف میں تھا اس لیے انگریزوں نے

رنجیت سنگھ کو واپس جانے اور ستلج کو سرحد قرار دے کر دوبارہ ادھر کا رخ نہ کرنے پر مٹکاف کی سعی سے ۶ جنوری ۱۸۰۹ء کو معاہدہ امرتسر کیا۔ بعد ازاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل ولیم بینٹنگ سے ملاقات میں باہمی دلچسپی کے مسائل پر مذاکرات کیے اور دوستی کا ایک اور معاہدہ کیا جو پہلے معاہدے کی توثیق تھا۔ ڈاکٹر گنڈا سنگھ کے مطابق انگریزوں نے اس سے اپنے مفادات کو عملی جامہ پہنایا کیونکہ ''۱۸۰۹ء کا معاہدہ دوستی کمپنی کے سیاسی و فوجی مصلحتوں پر مبنی تھا اور جب تک کمپنی کا مفاد رہا وہ رنجیت سنگھ سے دوستی کا بھرم بھرتی رہی۔ وقت کے ساتھ اس کا رویہ سخت و جارحانہ ہوتا گیا بلکہ اس نے معاہدہ دوستی کو باہمی مفادات کی بجائے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔''[۱۱] مہاراجا نے ہمیشہ تمام معاہدوں کی پاسداری کی۔ یہ رنجیت سنگھ کے عروج کا زمانہ تھا۔ رنجیت سنگھ نے جب اپنا تسلط اچھی طرح سے قائم کر لیا تو اس نے بھی اپنے عہد میں سکھوں اور ہندوؤں کو زیادہ اہمیت دی اور مسلمانوں پر مظالم ڈھانے شروع کر دیئے۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کے ساتھ بڑی احتیاط سے موافقت اور مطابقت کرنے کے لیے اپنی سپاہ کی تربیت یورپین طرز پر کی۔ اس کے لیے یورپین جرنیل ملازم رکھے۔

> ''جنرل ایلرڈ صاحب اکثر دربار میں مہاراجا کی خدمت میں حاضر رہتے۔ مہاراجا ان سے معاملات جنگی میں ہمیشہ مشورہ لیتا اور انہیں نہایت عزیز رکھتا۔ جنرل ونتورا صاحب کو پیدل سپاہ کی آراستگی کی خدمت سپرد تھی۔ جنرل صاحب نے اس سپاہ کو یورپ کے طریقہ پر آراستہ کیا اور ضوابط و آئین جنگ سے خوب واقف کر دیا''[۱۲]

رنجیت سنگھ ترقی پسند سوچ کا حامل تھا اس نے اپنے سکھ نوجوانوں کو انگریزی زبان، فن طباعت اور جراحی وغیرہ سیکھنے کے لیے لدھیانہ کے مشنری سکولوں میں بھی بھیجا۔ انگریزوں کی خوب آؤ بھگت کرنے کا موقع کبھی نہ گنوایا۔ چنانچہ امرتسر میں اپنے پوتے کنور نونہال سنگھ کی شادی پر نواب گورنر جنرل بہادر ہند سر چارلس مٹکاف، گورنر آگرہ سر ہنری فین کمانڈر انچیف سپاہ ہند کو مدعو کیا۔ جہاں ان کی خاطر میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

> ''سب سے زیادہ خاطر مہاراجا کو اپنے مہمان عزیزی سر ہنری فین صاحب بہادر کمانڈر انچیف ہند کی منظور تھی۔ ہر ایک قسم کی ضروریات فرش فروش شیشہ و آلات سے لے کر پلنگ، بستر، تکیہ تک مہاراجا نے کمانڈر انچیف کے واسطے بھجوائے۔ منجملہ ان کے ایک بستر نہایت مکلف اور شاہانہ تیار کیے تھے۔ سر ہنری فین کے بستر پر ۴۹ قسم کے پارچہ جات موجود تھے اور سب پر نہایت مکلف کار زردوزی و کارچوبی کیا ہوا تھا۔ چند گھوڑے مع ساز و سامان مطلا مہاراجا نے خاص سر ہنری فین کی سواری کے لیے دیئے اور بہت سے زنجیر ہائے فیل مع ہودج و ساز و سامان طلائی و نقرئی ان کے اور ان کے ہمراہیوں کے استعمال کے لیے بھجوائے۔ غرض ہر ایک امر جوان کے خوش کرنے کے لیے ہو سکتا تھا کیا گیا۔''[۱۳]

مہاراجا رنجیت سنگھ کی شخصیت خوبیوں اور خامیوں کا عجیب و غریب مرقع تھی۔ مہاراجا نے جہاں اپنی قابلیت اور تدبر

سے کل پنجاب پر اپنا تسلط قائم کیا؛ سکھوں کو اپنا تابع فرماں بنایا؛ بہت سے خودمختار طاقتور والیان ریاست کو اپنا محکوم بنایا؛ انگریزوں کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کیے وہیں عیش وعشرت اور کثرت شراب نوشی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا۔ کثرت شراب نوشی ہی مہاراجا کی موت کا سبب بنی۱۱۴اور وہ ۳۰ جون ۱۸۳۹ء۱۱۵ میں اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

خالصہ عہد میں لاہور میں جو تمدنی سرگرمیاں عمل میں آئیں ان میں سکھ ثقافت کا رنگ بھی شامل ہوگیا اس ضمن میں قلعہ لاہور میں مائی جنداں اور لاہور شہر ہی میں ہری سنگھ کی حویلی اس کی عکاس ہیں۔ سکھوں کی عمارتوں کی چھتوں اور دیواروں کی نقاشی میں سکھ مذہبی موضوعات در آئے۔ جس نے نقاشی کے معیار کو کمتر کر دیا۔ حضوری باغ کی بارہ دری اور قلعہ لاہور سے ملحق ''مڑھی رنجیت سنگھ'' کا فن تعمیر سکھ دور کی یادگار ہیں جس میں سکھ دور کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ مہاراجا اس بارہ دری میں اکثر عیش ونشاط کا اہتمام کیا کرتا تھا۔

مہاراجا کو باغات لگوانے کا شوق بھی تھا۔ لاہور میں اکثر امراء اور وزراء نے اپنی عالیشان حویلیاں تعمیر کرا رکھی تھیں رنجیت سنگھ امراءِ دربار کو باغات کی تعمیر کے لیے بھی کہا کرتا تھا۔ اس لیے اکثر سرداروں اور وزیروں نے اپنی اپنی جاگیروں کے علاوہ لاہور میں باغات بھی تعمیر کرر کھے تھے۔ لاہور میں خالصہ دور کے باغات میں حضوری باغ، باغ راجہ دھیان سنگھ، باغ دیوان کرپا رام، باغ مصر دیوان چند، باغ رتن چند، باغ راجہ دینا ناتھ، باغ بھائی مہاں سنگھ، باغ راجہ تیجا سنگھ، باغ جمعدار خوشحال سنگھ، باغ سردار رتن سنگھ، باغ ہر سنگھ نلوہ، باغ موراں، باغ رانی گل بیگم، فیض باغ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔۱۱۶ نیز عہد رنجیت سنگھ میں لاہور میں گردواروں، شوالوں اور مندروں کی بہتات ہوگئی ۱۱۷ خالصہ دور بالخصوص رنجیت سنگھ کے دور میں قدرے امن وامان کی وجہ سے درس وتدریس کے ساتھ مصوری کا گذشتہ تسلسل بھی جاری رہا اگر چہ اس میں پہلے کی سی برق رفتاری نہ تھی۔ فارسی بدستور سرکاری زبان تھی۔ درس وتدریس میں عربی، فارسی، پنجابی اور اردو کا رواج تھا۔ سکھوں نے اپنے رسم الخط گورمکھی کو بھی ترقی دینے کے لیے بے شمار کتابیں اس رسم الخط میں لکھیں۔ گرنتھ صاحب، جنم ساکھی اور دیگر مذہبی کتب کے مصور اور رنگین ایڈیشن مرتب کیے جو زیادہ تر لاہور میں تیار کیے گئے۔ سکھوں نے مصوری میں زرد رنگ کو نمایاں استعمال کیا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں جن علماء نے لاہور کے مسند درس کو سجایا ان میں حافظ روح اللہ لاہوری، خلیفہ غلام رسول وغلام اللہ، مولوی غلام فرید، مولوی جان محمد لاہوری، مولوی غلام محی الدین بگوی، مولوی احمد دین بگوی، مولوی غلام محمد بگوی، حافظ ولی اللہ، حافظ غلام رسول چیٹ ملیا، مولوی محمد دین فوقی قابل ذکری ہیں۔ خالصہ عہد ہی میں سکھوں کے بعض مذہبی اور ثقافتی تہواروں کا آغاز ہوا۔ جن میں سکھوں کے علاوہ مسلمان بھی شریک ہوتے تھے۔ ثقافتی تہوار بیساکھی اور بسنت اسی نوعیت کے تہوار تھے۔ مذہبی تہواروں میں گورونانک کا جنم دن بھی لاہور میں جوش وخروش سے منایا جاتا تھا۔

یوں تو لاہور کئی چھوٹے بڑے حملوں میں اجڑا اور تاریخی عمارات، جگہوں اور بازاروں کی صورت میں پروان چڑھنے

والی ثقافت اور شناخت کئی بار برباد ہوئی لیکن مجموعی طور پر خالصہ حکومت کی توجہ لاہور میں تعمیری سے زیادہ تخریبی کاموں پر مرکوز رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں بہت سی اسلامی عمارات اور باغات کو نقصان پہنچا اور کئی ایک کو مسمار کر دیا گیا چنانچہ اس حوالے سے مسٹر گھوشال ایم اے لکھتے ہیں کہ ''انہی مغلیہ باغات کے پتھروں کو اکھاڑ کر اٹھارویں صدی عیسوی میں سکھوں نے امرتسر رام باغ تیار کرایا تھا۔''۱۸ سکھوں کی تخریبی سرگرمیوں کا اندازہ ذیل کے اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے

بہار بے خزاں تھا کامران کا باغ نولکھا مگر اب حال اس کا حد گویائی سے باہر ہے
یہی خطہ بدروکارمراں جنت کا ٹکڑا تھا یہی ہے آج وہ خطہ جو بے دیوار و بے در ہے
وہاں اب خاک اڑتی ہے جہاں چلتے تھے فوارے جہاں شاہی دفاتر تھے وہاں عبرت کا دفتر ہے ۱۹

مراد شاہ لاہوری نے بھی اپنی مثنوی ''مگس نامہ'' میں اشاراتی زبان اختیار کرتے ہوئے جہاں لاہور شہر کی رونق کا نقشہ کھینچا ہے وہیں سکھ دور کے جبر و استبداد کو اس طور بیان کیا ہے:

شہر لاہور قبہ اسلام روشن آفاق میں ہے جس کا نام
تھا بہشت بریں بروئے زمیں عجب انسان تھے اس مکاں کے مکیں
اولیاء و مشائخ و سادات علماء اک ستودہ صفات
شاعر و شعر فہم لائق شعر طبع موزوں فہم لائق شعر
شہر تھا یہ کہ کان علم و ادب کان کیا بلکہ جان علم و ادب
رشک آبادی جہاں تھا یہ الغرض خوب ہی مکاں تھا یہ
کوئی اس پر پڑا جو بوم قدم ہے اب کا وجود رشک عدم
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے مکھیوں کی غرض دہائی ہے
زر تو شاہ زماں سدھار لے مکھیوں کو گئے اجارہ دے
اسی صورت سے آ گئے احمد شاہ تھا گیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ
اب ہیں مکھیوں سے سب ناچار ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار ۲۰

اولیاء کے مقبرے بھی سکھ گردی کا نشانہ بنے اس کی ایک جھلک محمد دین کلیم حضرت خواجہ خاوند محمود کے مقبرے کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں:

''جب سکھ گردی شروع ہوئی تو مہاراجہ رنجیت سنگھ کے وقت اس روضہ کے قریب سردار گلاب سنگھ بھونڈیہ

نے چھاؤنی بنائی۔ چاردیواری خانقاہ گرادی۔ باغ تباہ کردیا گیا۔ مسجد کے صحن کی اینٹیں نکال لیں۔ مزارات کو کھود کر خشت فروشوں نے ان کی اینٹیں بھی نکال کر بیچ لیں۔ مزار کا تعویز اتار لیا گیا۔ کئی سال تک اس مقبرہ میں بارود بھری رہی اور قفل لگا رہا۔''[۲۱]

غرض خالصہ دور میں مساجد کو بارود خانوں، گھوڑوں کے اصطبل، ٹھاکردواروں، شوالوں، دھرم شالوں اور سراؤں میں تبدیل کر دیا گیا۔ لاہور شہر ویران ہو کر رہ گیا۔ بقول دستگیر نامی:

''سکھوں کے وقت تک لاہور کی آبادی بوجہ بیرونی حملوں اور سکھ گردی کے گھٹنی شروع ہوئی حتیٰ کہ شہر پناہ کے اندر یہ ایک ایسے قصبے کی شکل بن گیا جس کے گرد کھنڈرات حلقہ زن ہوں۔ گز رنگر خان کے متمول باشندوں نے اپنے خوبصورت مکانات چھوڑ کر شہر کی دیواروں کے اندر امن کی صورت تلاش کی۔ سوداگر امرتسر کو بھاگ گئے۔ صناع کابل یا ہندوستان کی طرف چلے گئے۔''[۲۲]

رنجیت سنگھ کے بعد اس کے وارث کھڑک سنگھ، نونہال سنگھ، شیر سنگھ اور دلیپ سنگھ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے لیکن وراثت کے قضیوں اور سکھ وزیروں، سرداران سندھانوالیہ (اجیت سنگھ، لہنا سنگھ، سوچیت سنگھ، عطر سنگھ)، دھیان سنگھ، ہیرا سنگھ، گلاب سنگھ، سوہن سنگھ، جواہر سنگھ، پشوار سنگھ، لال سنگھ، مہارانی جنداں کی باہم رنجشوں اور خالصہ فوج کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے باعث لاہور شہر کے حالات مسلسل بگڑنا شروع ہو گئے یوں ایک بار پھر خون و آشام سے لاہور کے در و دیوار رنگے گئے۔ رام لال سنگھ وزیر اور تیج بہادر سپہ سالار نے خالصہ سپاہ کے زور کو توڑنے کے لیے خالصہ فوج کو انگریز سپاہ سے بھڑا دیا چنانچہ ۱۸۴۵ء میں خالصہ فوج ستلج پار کر کے انگریز علاقے پر حملہ آور ہوئی ادھر انگریز فوج بھی پنجاب پر قبضہ کے لیے موقع کی تاک میں تھی:

''سکھوں کے ستلج عبور کرنے کی خبر لارڈ ہارڈنگ کو دفعتاً اور غیر متوقع طور پر ملی (مفتی کے بقول) سکھوں نے اکیس ہزار فوج اور بھاری توپ خانے کے ساتھ ستلج عبور کیا تھا اور ۱۹ دسمبر ۱۸۴۵ء کو دوپہر کے وقت موضع مدکی کے قریب جنگ شروع ہوئی اور حیرت کا مقام یہ ہے کہ لارڈ ہارڈنگ کی ''بے خبر'' اور ''غیر متوقع'' فوج نے ایک ہی حملے میں سکھوں کے جم غفیر کو پسپا کر دیا۔ اس حملے کی کمان فیلڈ مارشل گف کے سپرد تھی جو اس زمانے میں انگریزی فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔''[۲۳]

انگریزوں اور سکھوں کے درمیان ۱۹۔ دسمبر ۱۸۴۵ء سے لے کر ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء تک پانچ جنگیں[۲۴] ہوئیں جن میں سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریز فاتحانہ انداز میں لاہور میں داخل ہوئے یوں بالآخر ہندوراج، مسلم سلاطین، مغل فرمانرواؤں اور سکھ تسلط کے بعد سب سے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا لاہور پر قبضہ ہو گیا۔ انگریزی فوج ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء کو سبھراؤں میں آخری جنگ میں فتح کے بعد جب ۲۲ فروری ۱۸۴۶ء لاہور پہنچی تو رانی جنداں اور سرداران دربار نے راجہ گلاب

سنگھ کو عفو و تقصیر کے لیے انگریز گورنر جنرل بہادر ہند سر ہنری ہارڈنگ کے پاس بھیجا۔ گلاب سنگھ نے اپنے ذاتی اثر ورسوخ کو بروئے کار لا کر انگریزوں سے سکھوں کی تقصیر معاف کروائی۔ کم سن مہاراجا دلیپ سنگھ کی سرپرست اس کی ماں رانی جنداں کے لیے دربار لاہور کی وزارت عظمیٰ کی درخواست کی اور اپنے لیے انگریزوں سے خیرخواہی کا خطاب حاصل کیا۔ چنانچہ اوائل مارچ ۱۸۴۶ء میں مسٹر کری چیف سیکریٹری گورنمنٹ اور میجر لارنس اور گلاب سنگھ کے درمیان مذاکرات سے چار نکاتی[۱۲۵] شرائط کے نتیجہ میں صلح نامہ پر دستخط ہو گئے۔ اس صلح نامہ کے ذریعے مہاراجا دلیپ سنگھ کی ساری فوجی و اقتصادی طاقت پر انگریزوں نے قبضہ کر کے اسے ڈیڑھ کروڑ روپیہ تاوان جنگ، شاہی لطور تاوان جنگ، جس میں پچاس لاکھ نقد اور بقیہ جلد ادا کرنے کا پابند کیا۔ مزید یہ کہ دربار لاہور کا تمام سامان حرب توپ خانہ اور دیگر اسلحہ انگریز سرکار کو فروخت کر دیا جائے اور اس کی بقیہ رقم ایک کروڑ روپیہ میں سے وضع کر لی جائے۔ معاہدے ہی کی رو سے سر ہنری لارنس[۱۲۶] کو لاہور میں ریذیڈنٹ مقرر کر کے مستقل اپنا ایک فوجی دستہ لاہور میں تعینات کیا۔ رفتہ رفتہ لاہور میں انگریزی طاقت بڑھتی چلی گئی۔

سکھوں کی بعض بدعہدیوں، بدانتظامیوں اور دغابازیوں کی وجہ سے ۲۷ فروری ۱۸۴۷ء سے ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء تک مہاراجا دلیپ سنگھ کی نام نہاد سرپرست رہنے والی انگریز سرکار نے طے شدہ معاہدے کو کالعدم قرار دے کر لارڈ ڈلہوزی کے ایک فرمان کے ذریعے دلیپ سنگھ کو ۲۹ مارچ ۱۸۴۹ء کو معزول اور پنجاب پر مستقل قبضہ کر کے اسے باقاعدہ انگریزی قلمرو میں شامل کر لیا۔ گارساں دتاسی کے خطبہ ۲۹ نومبر ۱۸۵۳ء میں دلیپ سنگھ کی بابت اطلاع دیتا ہے کہ ''مہاراجہ دلیپ سنگھ لاہور کے شاہی خاندان کا سکھ شہزادہ ہے اس نے فتح گڑھ میں گذشتہ مارچ کی آٹھویں تاریخ کو عیسائی مذہب قبول کیا ہے اس وقت وہ فتح گڑھ میں مقیم ہے۔''[۱۲۷]

اس طرح پنجاب میں رنجیت سنگھ کی موت کے دس سال کے اندر ہی تقریباً ایک صدی پر محیط سکھا شاہی دور (۱۷۶۰ء تا ۱۸۴۹ء) کا خاتمہ ہو گیا۔ اب پنجاب کا شمار بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں ہو گیا جو شمال میں ستلج تک پھیل چکی تھی۔ انگریزی عہد میں شہر لاہور ہی پنجاب کا دارالحکومت قرار پایا اور دہلی بھی اسی صوبے کے ماتحت ہو گئی۔ لاہور ہی میں بیٹھ کر انگریزوں نے تمام صوبہ جات کے انتظامات کو کنٹرول کیا۔ انگریزوں کے آنے سے لاہور کی سیاسی، انتظامی اور معاشی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ سکھ گردی کے تحت خوف و دہشت کی فضا اور سکھا شاہی چیرہ دستیوں کے ستائے ہوئے لوگوں نے سکون کا سانس لیا اور زندگی کی ازسرنو تعمیر ہوئی۔ انگریزوں نے نظم و نسق اور امن و امان قائم کرنے پر خصوصی توجہ مرکوز کی۔ شہر لاہور میں صحت و صفائی کی حالت بہتر بنائی گئی۔ اس حوالے سے امین چند اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں ''آبادی یہاں کی بہت گنجان اور گلی کوچے بازار تنگ ہیں سکھوں کے عہد میں ان گلی کوچوں میں اس قدر کیچڑ ہوتا تھا کہ شہر میں چلنا دشوار تھا اور اب جس روز سے انگریزی عملداری ہوئی ہے اس روز سے بہ نسبت سابق کے یہ شہر بہت صاف رہتا ہے[۱۲۸]

چنانچہ عمارتیں، بارکیں، کوٹھیاں اور دفاتر تعمیر کرنے کے ساتھ شہر میں نئے فرش بنوائے گئے۔ پرانے شاہی محلات اور عمارات کی قدرے مرمت اور تعمیر کرائی گئی۔ مزار حضرت میاں میرؒ کے علاقہ میں ایک بڑی چھاؤنی بنائی جس سے وہاں ایک نیا لاہور آباد ہو گیا۔ تمام مساجد جن پر سکھوں نے قبضہ کر کے رسالوں اور کارگاہوں میں بدل دیا تھا لاہور کے مسلمانوں کو واپس کر دی گئیں۔ برطانوی حکمرانوں نے قومی دلچسپی اور تاریخی اہمیت کی حامل عمارات کو محفوظ کرنے کے خصوصی انتظامات کیے۔ الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے بعد لارڈ ڈلہوزی کے ماتحت تین ممبران ہنری لارنس، جان لارنس اور رابرٹ منٹگمری [۱۲۹] پر مشتمل ایک انتظامی بورڈ تشکیل دے کر ان کے سپرد بالترتیب سیاسی، مالی اور عدالتی سطح پر نظم و نسق کے لیے بہتر اقدامات کرنے کا فریضہ سونپا گیا اور بہت سی اصلاحات کی گئیں مثلاً

> ''قلعوں اور گڑھیوں کو مسمار کرایا گیا جو سکھوں نے جگہ جگہ اپنی کمین گاہوں کے طور پر بنا رکھی تھیں صرف وہ قلعے باقی رہنے دیئے گئے جو دفاعی لحاظ سے کمپنی کی سپاہ کے لیے ضروری تھے۔ لوگوں سے ہتھیار لے لیے گئے اور آئندہ اسلحہ رکھنے کے لیے اجازت نامہ (لائسنس) ضروری قرار دیا گیا۔۔۔ پنجاب و سرحد کو سات کمشنریوں اور ستائیس اضلاع میں تقسیم کر کے یہاں انگریز کمشنر اور ڈپٹی کمشنر مقرر کئے گئے۔ پھر اضلاع کو تحصیلوں اور ذیلوں میں تقسیم کر کے مالیہ کی فراہمی اور اراضی کا بندوبست کیا گیا نیز پولیس کے حلقے (تھانے) قائم کر کے جرائم کے انسداد پر توجہ کی گئی۔ تین سال کے قلیل عرصے میں ان اصلاحات کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور اس خطے کی زندگی معمول پر آ گئی۔'' [۱۳۰]

۱۸۵۳ء میں بورڈ کو موقوف کر کے اس کی جگہ چیف کمشنری نظام قائم کیا اور سر جان لارنس کو پنجاب کا پہلا چیف کمشنر مقرر کر کے کلی طور پر ملکی و جنگی منتظم بنا کر جوڈیشل اور فنانشل کمشنر کو ان کے ماتحت کیا گیا۔ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۴ء کو لاہور میں پہلی بار مردم شماری کی گئی جس کے مطابق یہاں کی آبادی ۹۴ ہزار تھی۔ اسی زمانے میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا آغاز ہو گیا جس میں انگریزوں کو فتح ہوئی، دہلی پر قبضہ کر کے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون بھیج دیا۔ اس جنگ میں عوام نے بغیر مذہب و ملت کی تخصیص کے حریت پسندوں کی سیاسی، مالی اور اخلاقی مدد کی۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی نے برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی اور علمی و ادبی تاریخ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اگرچہ لاہور، دہلی اور لکھنؤ کی طرح جنگ آزادی کا اہم مرکز نہ بن سکا پھر بھی انفرادی اور اجتماعی سطح پر اگر کسی بھی بغاوت کے آثار نمودار ہوئے بھی تو انہیں دبا دیا گیا اور حالات کی ابتری کے خدشے سے دفاع کے لیے انتظامات کیے گئے۔

> ''فیروز پور چھاؤنی میں بعض دیسی فوجی دستوں کے انگریزوں کے خلاف ہو جانے کی خبریں اُڑیں اور یہ بھی سنا گیا کہ ان دستوں نے ستلج پار کر کے لاہور کی طرف مارچ شروع کر دیا ہے۔ اس خبر نے لاہور کے فوجی اور ملکی حکمرانوں کو بہت پریشان کیا۔ مسٹر رابرٹ ایجرٹن کمشنر، ڈپٹی کمشنر ایلیٹ اسسٹنٹ کمشنر، لیفٹیننٹ

> گلیور اور بریگیڈیر کاربٹ وغیرہ بہت ہی مستعد رہے۔ ۱۴ مئی کی دوپہر کے قریب یہ خبر ملی کہ میاں میر چھاؤنی کے سپاہی بغاوت کی تیاری میں مصروف ہیں اس سے لاہور کی انگریزی آبادی اور بالخصوص علاقہ انارکلی میں رہنے والے انگریزوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ لاہور کی انگریزی فوج کی مستعدی سے یہ ہنگامہ دب گیا۔[۳۱]

اسی حوالے سے اقبال صلاح الدین ''تاریخ پنجاب'' میں لکھتے ہیں:

> ''یہاں میاں میر چھاؤنی کے دیسی سپاہیوں کو غیر مسلح کر دینے والا واقعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اسے انگریزوں کی تاریخ کا ایک اہم موڑ قرار دیا جاتا ہے۔ انگریز نے جو قدم میاں میر چھاؤنی میں اٹھایا اس نے ان کی تاریخ بدل ڈالی۔۔۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چند گھنٹوں کے بعد یہی سپاہی انگریز کو لاہور میں غیر مسلح کر دیتے کیونکہ وہ باقاعدہ طور پر جنگ آزادی میں شریک ہونے والے تھے اور اس کے فوراً بعد ان کا پہلا قدم اسلحہ خانہ پر قبضہ کرنا تھا لیکن حکومت نے اس سے قبل ہی فیصلہ کر کے تاریخ کو نئے رخ پر ڈال دیا۔''[۳۲]

ان دفاعی اقدامات سے لاہور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے اس حادثہ سے بظاہر علیحدہ نظر آتا ہے لیکن بعض واقعات لاہور میں خونِ مسلم کی ارزانی کے لحاظ سے یہ بتاتے ہیں کہ اس کے اثرات سے کچھ زیادہ محفوظ بھی نہیں رہا۔

> ''انگریزوں نے یہاں ہندوستانی اور غیر ہندوستانی کا سوال پیدا کر کے سکھوں اور ہندوؤں کی مدد سے تقریباً پچاس ہزار مسلمانوں کو شہید کیا یا جلاوطن اور تباہ و برباد کر دیا۔ پنجاب میونٹی ریکارڈ مطبوعہ سن ۱۹۱۱ء کی ضخیم جلدیں اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ صرف لاہور شہر سے ۲۵۳۶ ہندوستانی مسلمانوں کو چن چن کر راوی پار کیا۔ اس وقت انگریزوں کا طریقہ یہ تھا کہ نوکری یا منصب سے علیحدہ کر کے جو لوگ اپنے گھروں کو روانہ ہوتے تھے ان کو وفادار سکھوں کی مدد سے لوٹنے کے بعد قتل کروا دیتے تھے۔ چنانچہ مجولابالہ رپورٹوں میں مقامی آبادیوں کے ہاتھوں قتل ہونے والوں کی تعداد باقاعدہ مرتب کی گئی ہے۔''[۳۳]

۱۸۵۷ء میں جب دہلی تباہ و برباد ہوا تو اس کے بعد لاہور ایک بار پھر شمالی ہندوستان کا ایک اہم مرکزی شہر بن گیا۔ نتیجتاً انگریزوں کے زیر اثر شہر ایک بار پھر بدلا۔ نئی زندگی اور نئے حالات و ماحول کی وجہ سے ایک نیا کلچر وجود میں آیا۔ ۱۸۵۸ء میں کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور برطانوی پارلیمنٹ نے براہ راست حکومت شروع کی۔ جس نے چیف کمشنر سر جان لارنس کو پہلا لیفٹیننٹ گورنر مقرر کیا۔ ۱۸۵۹ء میں سر جان لارنس اپنے عہدے سے ناسازی طبع کی وجہ سے مستعفی ہو کر انگلستان چلے گئے۔ ان سات آٹھ برسوں میں تعمیر و ترقی کا ایک نقشہ ملاحظہ ہو۔

> ''دریائے راوی سے مادھو پور کے مقام سے نہر باری دوآب کی کھدائی کا کام ۱۸۵۱ء میں شروع ہوا اور اس

نہر میں ۱۸۵۹ء میں پانی چھوڑا گیا۔ ۱۸۵۹ء ہی میں لاہور اور امرتسر کے درمیان اولین ریلوے لائن بچھائی گئی۔ شاہراؤں کی تعمیر کا سلسلہ بھی اسی زمانے میں شروع ہوا۔ سب سے پہلے قدیم جرنیلی سڑک کے نقش قدم پر پشاور سے لاہور تک سڑک بنائی گئی اور پھر اسے دوسرے حصوں سے ملایا گیا۔ صوبے کے مختلف شہروں اور قصبوں میں مدرسے، شفا خانے، ڈاک خانے قائم کیے گئے۔ جرائم کے انسداد کے لیے پولیس اور ملٹری پولیس (فرنٹیئر فورس) قائم کر لی گئیں۔ مال گذاری کا بندوبست کرنے کے علاوہ پنجاب کے رسم و رواج اور مختلف مذاہب کے مطابق مجموعہ قوانین دیوانی منضبط کیا گیا۔ ان تعمیری کاموں کی وجہ سے پنجاب کی شہری و دیہاتی زندگی میں طویل عرصے کی بد انتظامی اور انتشار کے بعد سکون و اطمینان پیدا ہوا۔ نہ صرف مسلمانوں کو سکھوں کے جور و استبداد سے نجات ملی بلکہ خود ہندوؤں اور سکھوں کو بھی پُرامن حالات میں اپنے اپنے پیشوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔''[۳۴]

سر جان لارنس کے بعد بالترتیب سر رابرٹ منٹگمری (۱۸۵۹ء)، سر ڈانلڈ میکلوڈ (۱۸۶۵ء)، سر ہنری ڈیورینڈ (۱۸۷۰ء)، سر ہنری ڈیوس (۱۸۷۱ء)، سر رابرٹ ایجرٹن (۱۸۷۷ء)، سر جیمز لائل (۱۸۸۲ء) پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر رہے۔ مذکورہ احباب نے پنجاب کی ترقی اور رفاح و بہبود کے لیے بہترین اصلاحات وضع کیں۔ چنانچہ برطانوی حکمرانوں نے لاہور کا نقشہ ہی بدل دیا۔ لاہور شہر کی خوبصورتی کے لیے نئے باغات لگوائے مثلاً لارنس گارڈن، تعلیمی اداروں میں گورنمنٹ کالج (۱۸۶۴ء)، فارمن کرسچین کالج (۱۸۶۶ء)، اورینٹل کالج (۱۸۷۲ء)، سنٹرل ٹریننگ کالج (۱۸۸۰ء)، کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج (۱۸۸۸ء) اور دیگر عمارات میں گورنمنٹ ہاؤس، کوتوالی (۱۸۵۰ء)، جیل خانے (۱۸۵۴ء)، ریلوے اسٹیشن (۱۸۶۰ء)، ٹولنٹن مارکیٹ (۱۸۶۴ء)، منٹگمری ہال (۱۸۶۶ء)، میو ہسپتال (۱۸۷۱ء)، یونیورسٹی سینٹ ہال (۱۸۷۶ء)، جنرل پوسٹ آفس (۱۸۸۰ء)، ٹاؤن ہال (۱۸۸۷ء)، ہائی کورٹ (۱۸۸۹ء) اور راوی کا پل کی صورت میں اضافہ کیا۔ علمی ادارے، انجمنیں اور کمیٹیاں بنیں اور رفاہ عامہ کے کاموں کا دور شروع ہوا۔ عہد انگریزی میں لاہور میں ہندو، کھتری، اروڑے، مسلمان، سید، قریشی، مغل، شیخ، خوجے، کشمیری بکثرت آباد تے۔ لاہور کی معاشی زندگی کا اندازہ ذیل کے اس اقتباس سے بخوبی ہوتا ہے۔

''لاہور کی معاشی زندگی میں ہندو، کھتری اور اروڑے نمایاں تر تھے۔ ان میں زیادہ تر تاجر پیشہ تھے اس کے علاوہ سول سروسز اور لبرل پیشوں جیسے قانون، طب اور تعلیم میں بھی وہ اعلیٰ عہدوں پر متمکن تھے۔ یہاں تک کہ مسلمان اور سکھ حکمرانوں کے تحت بھی کھتری ہی اعلیٰ انتظامی عہدوں پر فائز تھے۔ برطانوی بھی انہیں ملک کے مختلف طبقوں میں سب سے زیادہ تیز، باہمت اور ممتاز قومیت تصور کرتے تھے۔۔۔ اگرچہ شہر کی بڑی آبادی مسلمان تھی لیکن ان میں سے بہت کم تعداد کاروبار، سول سروس اور دوسرے پیشوں سے وابستہ تھی۔ حکومت کی ملازمتوں میں کوٹے کی پالیسی کے بعد مختلف سروسز میں مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔

> مسلمانوں کی اکثریت کارکنوں اور دستکاروں پر مشتمل تھی یا تو وہ فنی صنعتوں میں ملازمت کی صورت میں تھی یا ہندوؤں کی زیر ملکیت فیکٹریوں میں کارکنوں کی صورت میں، تاہم سبزیوں اور پھلوں کی مارکیٹ، دودھ کی فراہمی، فرنیچر کی دکانیں، ٹینٹوں کی سلائی پر ان کا قبضہ تھا۔ ایک معقول تعداد اشرافیہ کی بھی تھی جن کو دولت اور مرتبہ برطانوی حکومت کی طرف سے عطا ہوا۔ لاہوری ہندو اور مسلمان آزادانہ طور پر خرچ کرتے تھے اور زندگی کو اچھے طریقے سے گذارنا پسند کرتے تھے۔'' [۳۵]

۱۸۳۴ء میں جب اردو کو فارسی کی جگہ دفتری زبان قرار دیا گیا تو لاہور میں بھی فارسی کی جگہ اردو دفتری زبان بن گئی اور مختلف قومیتوں کے درمیان بول چال کی ایک بڑی زبان کے طور پر ظاہر ہوئی۔ ۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے تعلیمی کمیشن نے اردو کی بجائے انگریزی زبان بطور ذریعہ تعلیم کی سفارش کر دی چنانچہ لاہور میں عربی اور فارسی کے ساتھ جدید علوم کے لیے انگریزی زبان کو بھی بطور ذریعہ تعلیم کے فروغ ملا۔ لاہور میں تعلیمی، معاشرتی اور ثقافتی امور کو زیادہ منظم اور بہتر بنانے کے لئے ڈاکٹر لائٹر کی سربراہی میں انجمن پنجاب (۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء) کا قیام عمل میں آیا جس سے انگریزی دور میں لاہور علمی و ادبی مرکز کے طور پر خصوصی شہرت اور اہمیت اختیار کر گیا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کی جدید سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے جس سے سیاسی و جمہوری تنظیموں کا سلسلہ شروع ہوا۔ انڈین نیشنل کانگرس (۱۸۸۵ء) کا قیام اے او ہیوم کے ہاتھوں عمل میں آیا جس کا مقصد حکومت اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں خوشگوار تعلقات استوار کرنے کے علاوہ برصغیر کی مختلف اور متصادم قوتوں کو متحد کر کے ایک قوم بنانا تھا۔ ۱۸۸۵ء ہی میں پنجاب میں بھی اس کی ایک شاخ قائم ہوگئی۔ ۱۸۹۲ء میں انڈین نیشنل کانگرس کا جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ ابتدا میں کانگرس میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے لیکن بعد ازاں یہ صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت بن کر رہ گئی۔ سر سید احمد خان جنہوں نے تحریک علی گڑھ سے مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے قدم اٹھایا اور بالخصوص تعلیمی سطح پر مضبوط بنانے کی سعی کی اسی سلسلے میں چار بار پنجاب آئے تو لاہور کے مسلمانوں نے ان کا بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا۔

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں بین الاقوامی سطح پر جنگ بلقان اور طرابلس (۱۹۱۲ء) اور جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء) سے لاہور کی سیاسی فضا متلاطم ہوگئی تو اہل لاہور کو بھی احساس ہوگیا کہ قومی اور بین الاقوامی حقوق حکومت برطانیہ کے ہاتھوں محفوظ نہیں رہ سکتے جس کے نتیجہ میں سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ کیا گیا۔ سانحہ جلیانوالہ باغ اور انڈین رولٹ ایکٹ کے بعد آزادی کی تحریک نے لاہور پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ لاہور ہی میں بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کی صورت میں تین انقلابی شخصیات ابھریں۔ جنہوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ ان کے علاوہ دیگر جماعتوں کے بارے میں پروفیسر شجاع الدین لکھتے ہیں کہ ''خلافت، احرار، کانگرس، خاکسار، لیگ، ہندو مہاسبھا اور اکالی دل وغیرہ سبھی جماعتیں یہاں فعال رہیں اور لاہور کے در و دیوار ان ہنگاموں سے گونجتے رہے۔'' [۳۶] ان انجمنوں کے اکابرین

اور قائدین کی پر جوش تقریروں نے اہل لاہور کے طبائع کو بے حد متاثر کیا کیونکہ:

> ''تمام سیاسی میٹنگوں اور عوامی کانفرسوں کا مرکز لاہور ''موچی دروازہ'' تھا جس کی لاہور میں وہی حیثیت تھی جولندن میں ہائیڈ پارک کارنر کی ہے۔اس جگہ نے بہت سے سیاسی، سماجی اور مذہبی رہنما دیکھے ہیں جو اپنے حاضرین کو پر جوش تقریروں پر ابھارتے تھے۔تقریباً ہر دوسرے دن یہ علاقہ ''انقلاب زندہ باد'' کے پر جوش نعروں سے گونجتا تھا۔''[۴۷]

چنانچہ ۱۹۳۵ء میں نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا جس کے تحت برصغیر کی دو بڑی جماعتوں کانگرس اور مسلم لیگ میں سے کانگرس کو برتری حاصل ہوئی۔ ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے مطابق آئینی وزارت کے تحت یکم اپریل ۱۹۳۷ء کو صوبائی خودمختاری ملی اور سکندر حیات خان اس کی وزارت پر فائز ہوئے۔کانگرس نے مسلمانوں کی سیاسی وقومی حیثیت کو ختم کرنا چاہا تو ایسے نازک وقت میں قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی رہنمائی کرتے ہوئے مسلمانوں کے سیاسی تشخص کی حفاظت کی۔۱۹۳۷ء سے مسلمانوں کی بیداری کا ایک اور نیا دور شروع ہوا جس کے نتیجے میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے لاہور میں مسلمانوں کے لیے خودمختار آزاد حکومت اور جداگانہ وطن ''پاکستان'' کے مطالبے کی قرارداد منظور کی۔لاہور کے مسلمانوں نے بھی تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بالآخر ۱۴۔اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی تشکیل ہوئی۔لاہور ہی پنجاب کا دارالحکومت رہا۔۱۹۴۷ء سے لے کر دور حاضر تک اہل لاہور نے سیاست اور جمہوریت کے لیے بے پناہ قربانیاں دی ہیں۔لہٰذا آج بھی جغرافیائی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی، ثقافتی، صنعتی، لسانی، روحانی، علمی وادبی منظرنامے میں لاہور کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

حواشی:

۱۔ اس حوالے سے آئن ٹالبوٹ کی ''تاریخ پنجاب'' مترجم طاہر کامران؛ لاہور؛ ادارہ تخلیقات، ۲۰۰۶ء اور ڈاکٹر انجم رحمانی کی ''پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ'' لاہور، الفیصل، ۱۹۹۸ء ملاحظہ ہوں

۲۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، ''مآثر لاہور''، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، طبع اول ۱۹۵۶ء، ص:۱۹

۳۔ آئن ٹالبوٹ: ''تاریخ پنجاب''، مترجم: طاہر کامران؛ لاہور، ادارہ تخلیقات، ۲۰۰۶ء، ص:۲۶۔۲۷

۴۔ نقوش، ''لاہور نمبر'' لاہور، ادارہ فروغ اردو، ۱۹۶۲ء، ص:۲۴

۵۔ طاہر لاہوری: ''سوہنا شہر لاہور''؛ لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز؛ ۱۹۹۴ء، ص:۵

۶۔ ہاشمی فرید آبادی، سید: مآثر لاہور، ص:۱۵

۷۔ سہ ماہی ''تاریخ'' ''لاہور نمبر، لاہور، فکشن ہاؤس، جنوری ۲۰۰۲ء، ص:۳۱

۸۔ لاہور گزیٹئر کے مترجم نعیم اللہ ملک کے مطابق راجپوتانہ کی تاریخ میں لوہ کوٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ (ص ۱۷۸) جبکہ ''تاریخ فرشتہ'' سے پتہ چلتا ہے کہ ''لوہ کوٹ'' کشمیر کے نواح میں ایک قلعہ تھا جس کا محاصرہ محمود غزنوی نے لاہور کو فتح کرنے سے پہلے ۴۱۲ھ میں کیا۔ (ص:۱۱۱) اسی بات کی تائید ہاشمی فرید آبادی بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں ''بعد کی تاریخوں میں ہمارے شہر کا ایک اور قلعہ ''لہور'' سے بھی التباس ہو گیا جو کشمیر کی سرحد کے قریب وادی سندھ میں واقع تھا اور البیرونی اسے قلعہ راج گری کے ساتھ نہایت مضبوط قلعہ بتاتا ہے۔ غالباً یہی سرحد کشمیر کا لہور بعض متون میں لوہ گر، لوہ کوٹ اور لوہر کوٹ کا روپ بدل کر سامنے آتا ہے۔'' (مآثر لاہور، ص:۲۰)

۹۔ مذکورہ ناموں کی وجہ تسمیہ کے مزید تفصیلی شواہد کے لیے ''نقوش'' لاہور نمبر (ص ۱۷ تا ۲۹) ''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور'' مصنفہ سید محمد لطیف (ص:۱۹) ''تاریخ لاہور'' مصنفہ کنہیالال کپور (ص:۸)، ''لاہور نامہ'' مصنفہ ڈاکٹر ایم ایس ناز (ص:۲۸ تا ۳۰)، ''لاہور عظمتوں کی کہانی۔ گناہوں کی داستان'' ترجمہ و تالیف یاسر جواد (ص:۱۴)، مضمون ''لاہور کے علمی و تاریخی پہلو'' از ڈاکٹر انجم رحمانی مشمولہ سہ ماہی ''سورج'' لاہور شمارہ نمبر ۲، ۲۰۰۵ء (ص:۱۹۔۲۰) ملاحظہ ہوں۔

۱۰۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، ''مآثر لاہور''، ص:۲۲

۱۱۔ رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر، ''اردو نثر کا آغاز و ارتقا'' کراچی، کریم سنز پبلشرز، ۱۹۷۸ء، ص:۴

۱۲۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، ''مآثر لاہور''، ص:۲۱

۱۳۔ نعیم اللہ ملک: (مترجم) ''لاہور گزیٹئر'' لاہور، ابوذر پبلی کیشنز، فروری ۲۰۰۸ء، ص:۱۷۸

۱۴۔ محمد باقر، ڈاکٹر: ''اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص:۲۶۸

۱۵۔ ملاحظہ ہو: ظہور الدین احمد، ڈاکٹر: ''پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۴ء

۱۶۔ ہاشمی فرید آبادی، سید، ''مآثر لاہور''، ص: ۲۳

۱۷۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''لاہور کے علمی و تاریخی پہلو''، مضمون مشمولہ، سہ ماہی ''سورج'' لاہور، شمارہ نمبر ۲، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۹

۱۸۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص: ۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص: ۳۰

۲۰۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر، مضمون ''لاہور کے علمی و تاریخی پہلو'' مشمولہ سہ ماہی ''سورج''، ص: ۲۰۔۲۱

۲۱۔ نور احمد چشتی (تحقیقات چشتی)، سید محمد لطیف (تاریخ پنجاب بمع حالات شہر لاہور) کنہیا لال کپور (تاریخ لاہور) سید ہاشمی فرید آبادی (مآثر لاہور)، انجم سلطان شہباز (اقوام پنجاب) پران نوائل (جب لاہور جوان تھا: مترجم نعیم احسن) یاسر جواد (تالیف و ترجمہ، لاہور عظمتوں کی کہانی گناہوں کی داستان) ڈاکٹر محمد باقر (مضمون لاہور تاریخ، تاسیس اور وجہ تسمیہ مشمولہ نقوش لاہور نمبر) نعیم اللہ ملک (ترجمہ: لاہور گزیٹئر) غلام دستگیر نامی (تاریخ جلیلہ) امین چند (سفرنامہ امین چند)

۲۲۔ فقیر محمد فقیر، ڈاکٹر: ''پنجابی زبان و ادب کی تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۳۸

۲۳۔ محمد اکرام، چغتائی: (ترتیب و تدوین معہ اضافات) ''پنجاب میں اردو'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۱۶

۲۴۔ نقوش لاہور نمبر، ص: ۲۲

۲۵۔ محمد اکرام، چغتائی: (ترتیب و تدوین معہ اضافات) ''پنجاب میں اردو''، ص: ۱۱۶

۲۶۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص: ۳۰

۲۷۔ طاہر لاہوری: ''سوہنا شہر لاہور''، ص: ۵

۲۸۔ انجم سلطان شہباز: ''اقوام پنجاب''، جہلم، بک کارنر، سن ندارد، ص: ۳۲۷

۲۹۔ یاسر جواد: (ترجمہ و تالیف) ''لاہور عظمتوں کی کہانی۔ گناہوں کی داستان، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۴

۳۰۔ ''مسلمانوں کی روایت ہے کہ لاہور کے موجودہ شہر اور قلعہ کی بنیاد محمود غزنوی کے دوست اور مشیر ایاز نے رکھی جس کا مقبرہ ٹکسالی دروازے کے قریب ہے'' (لاہور گزیٹیئر، مترجم: نعیم اللہ ملک)، ص: ۱۷۷

۳۱۔ یاسر جواد: (تالیف و ترجمہ) ''لاہور عظمتوں کی کہانی۔ گناہوں کی داستان''، ص: ۱۴

۳۲۔ نامی، غلام دستگیر: ''تاریخ جلیلہ''، لاہور، گلزار عالم پریس، طبع دوم، ۱۹۶۰ء، ص: ۱۹۴

۳۳۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق ''رونی منسوب ہے روہنہ کی طرف جو لاہور کا ایک موضع بیان کیا جاتا ہے'' (بحوالہ پنجاب میں اردو، ص: ۵۷) جبکہ ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' یہ بھی بتاتی ہے کہ ''عرفی نے روہنہ کو ضلع لاہور کا ایک قصبہ لکھا لیکن اس نام کا قصبہ کا کہیں سراغ نہیں لگ سکا'' (ص: ۱۵۳)

۳۴۔ ''نقوش''، لاہور نمبر، ص: ۱۲۴

۳۵۔ اشتیاق احمد: (مرتب) ''کلچر منتخب تنقیدی مضامین'' لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۲۳

۳۶۔ فرشتہ محمد قاسم: ''تاریخ فرشتہ'' (مترجم) عبدالحیٔ، خواجہ ایم اے، لاہور، ن ن، ۱۹۹۱ء، ص: ۶۷

۳۷۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے جو ہندو راجہ دو بار مسلمانوں سے شکست کھائے یا ان کی قید میں رہ چکا ہو وہ اس قابل نہیں رہتا کہ فرمانروائی کرے، یہ چیز ایسا گناہ ہے کہ جس کو سوائے آگ کے کوئی دوسری شے پاک نہیں کرسکتی'' (بحوالہ تاریخ فرشتہ، ص: ۸۸)

۳۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''پنجاب اور اردو'' مقالہ مشمولہ 'پاکستان میں اردو' (چوتھی جلد)، (مرتبین: فتح محمد ملک، تجمل شاہ، احمد پیرزادہ، سید)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۶ء، ص: ۱۷۶

۳۹۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ'' لاہور، الفیصل، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۹۱

۴۰۔ ایضاً، ص: ۱۹۳

۴۱۔ فرشتہ محمد قاسم: ''تاریخ فرشتہ'' مترجم: عبدالحیٔ، خواجہ ایم اے، ص: ۸۳

۴۲۔ محمد ریاض، ڈاکٹر: صدیق شبلی، ڈاکٹر: ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۷ء، ص: ۲۸

۴۳۔ ایضاً، ص: ۱۵۲

۴۴۔ فقیر محمد فقیر، ڈاکٹر: ''پنجابی زبان و ادب کی تاریخ''، ملاحظہ ہو ص: ۶۱

۴۵۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ''، ص: ۱۹۴

۴۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''پنجاب میں اردو''، مرتبہ: اکرام چغتائی، ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' فارسی ادب (اول) تیسری جلد ۱۰۰۰ء۔۱۵۲۶ء، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۱ء

۴۷۔ سبط حسن، سید: ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا'' کراچی، مکتبہ دانیال، (چھٹا ایڈیشن) ۱۹۸۶ء، ص: ۲۵۳

۴۸۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ''، ص: ۱۹۴

۴۹۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: مضمون ''لاہور کے علمی و ادبی پہلو'' مشمولہ سہ ماہی ''سورج''، ص: ۴۸

۵۰۔ ایضاً، ص: ۳۸

۵۱۔ محمد ریاض، ڈاکٹر: صدیق شبلی، ڈاکٹر: ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ''، ص ۱۵۲

۵۲۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: مضمون ''لاہور کے علمی و ادبی پہلو'' مشمولہ سہ ماہی ''سورج''، ص: ۲۲

۵۳۔ ایضاً، ص: ۵۵

۵۴۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص: ۳۸

۵۵۔ سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر، ص: ۳۱

۵۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''مآثر لاہور''

۵۷۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۴۰

۵۸۔ ایضاً، ص:۴۰

۵۹۔ تاریخ فرشتہ، ص:۱۷۱

۶۰۔ تاریخ فرشتہ میں ۴۶ علماء کی فہرست دی گئی ہے، ص:۳۷۷

۶۱۔ سبطِ حسن، سید: ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''، ص:۲۰۵

۶۲۔ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا: (مدیر خصوصی) ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' چوتھی جلد، فارسی ادب (دوم) ۱۵۲۶ء۔۱۷۰۷ء، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ص:۵۳

۶۳۔ نقوش، لاہور نمبر، ص:۴۷

۶۴۔ یاسر جواد: (تالیف و ترجمہ)، ''لاہور عظمتوں کی کہانی۔ گناہوں کی داستان''، ص:۲۰

۶۵۔ روزنامہ ''جنگ''، مڈ ویک میگزین، لاہور، ۶۔مئی ۲۰۰۹ء، ص:۹

۶۶۔ اکرام علی ملک: ''تاریخ پنجاب'' (جلد اول) قدیم زمانہ تا ۱۸۵۷ء''، لاہور، سلمان مطبوعات، بار اول، ۱۹۹۰ء، ص:۴

۶۷۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۴۶۰، یہ علماء و فضلاء اپنے نام کے آخر میں لاہوری لکھا کرتے تھے۔

۶۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۴۶۱ تا ۴۷۲

۶۹۔ محمد دین کلیم: ''لاہور میں اولیائے نقشبند کی سرگرمیاں''، لاہور، مکتبہ تاریخ، طبع اول ستمبر ۱۹۶۸ء، ص:۱۹

۷۰۔ پران نوائل: ''لاہور جب جوان تھا'' (مترجم) نعیم احسن، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۴ء، ص:۱۴

۷۱۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۴۵۹

۷۲۔ پران نوائل: ''لاہور جب جوان تھا''، (مترجم) نعیم احسن: ص:۱۴

۷۳۔ محمد دین فوق: ''لاہور عہد مغلیہ میں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۱۵

۷۴۔ ایضاً، ص:۱۱

۷۵۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''لاہور کے علمی و تاریخی پہلو'' مشمولہ سہ ماہی ''سورج''، ص:۳۹

۷۶۔ محمد دین فوق: ''لاہور عہد مغلیہ میں''، ص:۱۵

۷۷۔ سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر، ص:۴۰

۷۸۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۱۹۴ تا ۱۹۹

۷۹۔ ''لاہور عہد مغلیہ میں''، ص:۱۰۔۱۱

۸۰۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۴۵۳

۸۱۔ ایضاً،ص:۴۵۴

۸۲۔ ایضاً،ص:۵۹

۸۳۔ سبط حسن،ڈاکٹر:''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''،ص:۳۶۸۔۳۶۹

۸۴۔ ظہور احمد،ڈاکٹر:''پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ''،ص:۵

۸۵۔ ''نقوش'' لاہور نمبر،ص:۴۸۰

۸۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو''پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ''،ص:۱۹تا۲۲

۸۷۔ محمد دین فوق:''لاہور عہد مغلیہ میں''،ص:۱۷

۸۸۔ ''نقوش'' لاہور نمبر،ص:۶۷

۸۹۔ ایضاً،ص:۵۵۳

۹۰۔ عبداللہ چغتائی،ڈاکٹر:''لاہور سکھوں کے عہد میں''،لاہور،پرنٹ لائن پبلشرز،اپریل ۲۰۰۰ء،ص:۸۰

۹۱۔ ایضاً،ص:۸۲

۹۲۔ نامی،غلام دستگیر:''تاریخ جلیلہ''،ص:۱۹۵

۹۳۔ محمد دین فوق:''لاہور عہد مغلیہ میں''،ص:۵

۹۴۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر:''پنجاب تحقیق کی روشنی میں''،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۹۱ء،ص:۱۵۳

۹۵۔ محمد لطیف،سید:''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور''،لاہور،بک ٹاک،۲۰۰۲ء،ص:۶۳

۹۶۔ ''نقوش'' لاہور نمبر،ص:۹۱

۹۷۔ محمد لطیف،سید:''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور''،ص:۷۱

۹۸۔ ''نقوش'' لاہور نمبر،ص:۹۳

۹۹۔ گوہر نوشاہی،ڈاکٹر:''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''،لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۹۳ء،ص:۲۶

۱۰۰۔ ''نقوش'' لاہور نمبر،ص:۹۶

۱۰۱۔ ایضاً،ص:۹۶

۱۰۲۔ ایضاً،ص:۱۰۲

۱۰۳۔ گوہر نوشاہی،ڈاکٹر:''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''،ص:۲۸

۱۰۴۔ آخری بار اس لیے کہ اگلی دو بار دسمبر ۱۷۶۸ء اور دسمبر ۱۷۶۹ء میں جب لاہور میں اپنی مقبوضات پر کنٹرول رکھنے کے لیے جب لاہور کا رخ کیا تو اول الذکر بار دریائے چناب کے کنارے اور موخر الذکر بار پشاور سے واپس جانا پڑا۔

۱۰۵۔ ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''،ص:۲۹

۱۰۶۔ ایضاً،ص:۳۰

۱۰۷۔ ایضاً،ص:۳۲

۱۰۸۔ میاں بدرالدین، میاں حکم دین، محمد باقر، محمد طاہر، مفتی محمد مکرم، مہر شادی، حکیم حاکم رائے اور بھی کور بخش سنگھ کے نام لیے جاتے ہیں (''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا''، ڈاکٹر ممتاز گوہر، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص:۱۹)

۱۰۹۔ ''مہاراجگی کا خطاب رنجیت سنگھ کو شاہ زماں کی طرف سے لاہور کی جاگیر کے ساتھ ہی ملا۔'' (''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'')،ص:۲۳

۱۱۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''تاریخ پنجاب'' حصہ اول، قدیم زمانہ تا ۱۷۵۷ء، ص:۱۶۰

۱۱۱۔ ایضاً،ص:۱۹۵

۱۱۲۔ محمد لطیف، سید: ''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور''، ص:۲۳۰

۱۱۳۔ ایضاً،ص:۱۸۱

۱۱۴۔ کثرت شراب نوشی کیسے مہاراجا کی موت کا سبب بنی اس ضمن میں واقعات ''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور'' (ص:۲۳۵ تا ۲۳۶)، ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' (ص:۲۳۰ تا ۲۶۰) پر ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔

۱۱۵۔ سید محمد لطیف (تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور، ص:۲۳۶)، غلام حسین ذوالفقار (پنجاب تحقیق کی روشنی میں، ص:۲۶۱) پر، ۳۰ جون ۱۸۳۹ء جبکہ ڈاکٹر ممتاز گوہر (''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا''، ص:۲۶ پر)، ۲۷ جون ۱۸۳۸ء اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی (لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات، ص:۳۸) ۱۱ جولائی ۱۸۳۹ء لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر علی محمد خان (لاہور کا دبستان شاعری، ص:۵۱)، ۲۷ جون ۱۸۹۳ء کو مہاراجا کی تاریخ وفات بتاتے ہیں جو انہوں نے ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۱۱۸ سے نقل کی ہے۔

۱۱۶۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۳۷۷ تا ۴۰۳، ''لاہور کی یادیں'' مصنفہ احمد سعید، ص:۱۶۹ تا ۱۷۱

۱۱۷۔ تفصیل کے لیے دیکھئے ''تاریخ لاہور'' مصنفہ کنہیا لال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۱ء

۱۱۸۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۲۱۰

۱۱۹۔ ایضاً،ص:۲۱۴

۱۲۰۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اردو'' جلد اول، لاہور مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء طبع پنجم، ص:۶۶۱

۱۲۱۔ محمد دین کلیم: ''لاہور میں اولیائے نقشبند کی سرگرمیاں''، ص:۱۲۲۔۱۲۳

۱۲۲۔ نامی، غلام دستگیر: ''تاریخ جلیلہ''، ص:۱۹۶

۱۲۳۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' ص:۴۴

۱۲۴۔ پہلی جنگ دسمبر ۱۸۴۵ء کو بمقام مدکی فیروز پور سے ۲۰ میل کے فاصلے پر ہوئی۔ دوسری ۲۱ دسمبر کو بمقام موضع بھائی پھیرو ہوئی لیکن اس کا سن مذارد ہے، تیسری ۱۴ جنوری ۱۸۴۶ء بمقام بدووال لدھیانہ کے قریب ہوئی، چوتھی ۲۸ جنوری ۱۸۴۶ء علی وال جبکہ پانچویں اور آخری جنگ ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء بمقام سبھراؤں ہوئی۔ ان جنگوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''تاریخ پنجاب معہ حالات شہر لاہور''، از سید محمد لطیف، ص:۳۵۲ تا ۳۵۹

۱۲۵۔ ان شرائط کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور'' ص:۳۶۶ تا ۳۷۴

۱۲۶۔ بعد ازاں سر ہنری لارنس ناسازی طبع کے باعث انگلستان چلے گئے اور ان کی جگہ ان کے بھائی جان لارنس ریذیڈنٹ ہوئے لیکن وہ بھی انگلستان چلے گئے اس کے بعد سکھوں کے معاملات میں تجربہ رکھنے والے سر فریڈرک کری یکم اپریل ۱۸۴۸ء کو ریذیڈنٹ لاہور کے عہدے پر فائز ہوئے۔

۱۲۷۔ گارساں دتاسی، ''خطبات گارساں دتاسی'' (جلد اول) کراچی انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء، ص:۵۵

۱۲۸۔ امین چند ''سفر نامہ پنجاب'' پنجاب رئیس بجواڑہ ضلع، ہوشیار پور، ۱۸۵۰ء، ص:۷۱

۱۲۹۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۱۲۱، جبکہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار تیسرے رکن کا نام چارلس مینسل تحریر کرتے ہیں (پنجاب تحقیق کی روشنی میں، ص:۲۶۸)

۱۳۰۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: ''پنجاب تحقیق کی روشنی میں'' ص:۲۶۸

۱۳۱۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۱۲۱

۱۳۲۔ علی محمد خان، ڈاکٹر: ''لاہور کا دبستان شاعری''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص:۵۶

۱۳۳۔ مصطفیٰ علی بریلوی، سید: ''پنجاب میں انگریزوں کی لسانی پالیسی'' مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، ص:۲۶۸

۱۳۴۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: ''پنجاب تحقیق کی روشنی میں'' ص:۲۶۹

۱۳۵۔ پران نوائل: ''جب لاہور جوان تھا''، (مترجم) نعیم احسن، ص:۲۴

۱۳۶۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص:۱۲۵

۱۳۷۔ پران نوائل ''جب لاہور جوان تھا''، (مترجم) نعیم احسن، ص:۲۹

[نوٹ: تمام حوالہ جاتی کتب میں سنین کا فرق نظر آتا ہے۔ سنین کی صحت و درستی کے لیے مقالہ نگار نے بھرپور تحقیق و تقابل کوشش کی ہے]

باب دوم

نثری سرمائے کا پس منظر

ا) نثر اور نثری اسالیب

ب) اردو ادب کا نثری سرمایہ (سن ستاون سے پہلے تک)

ج) پنجاب میں اردو نثر کے ابتدائی آثار

اس سے قبل کہ اردو کے نثری سرمائے کا جائزہ لیں،ضروری ہے کہ یہ معلوم کریں کہ زبان کس طرح علمی اور تخلیقی سطح پر نظم و نثر میں ڈھلتی ہے اور ان میں فرق کیونکر کیا جاتا ہے؟ نیز انداز نثر اور اس کے اسالیب بیان کی تشکیل کن عوامل کی متقاضی ہوتی ہے۔

ا) نثر اور نثری اسالیب:

زبان علمی اور تخلیقی سطح پر خیال کی ترسیل اور انسانی جذبات و کیفیات کا ذریعہ ہونے کے ساتھ انسانی زندگی میں انفرادی، سماجی اور نفسیاتی اہمیت کی حامل ہے۔ان تمام سطحوں پر زبان ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔بنیادی طور پر زبان کا مقصد ابلاغ ہے جس میں اپنے خیالات وافکار اور جذبات کو دوسروں تک پہنچایا جاتا ہے۔یہیں سے زبان کا اسلوب کے ساتھ رشتہ بھی استوار ہو جاتا ہے۔یوں زبان کی اہمیت ادائے مقاصد، خیالات کے اظہار، افکار کے بیان اور خیالات کو مخصوص انداز میں ادا کرنے کا نام ہے جس میں مختلف اسلوب بیان، زبان کے ذریعے الفاظ کے پیرہن میں سامنے آتے ہیں۔تحریر کے فن نے یہ سہولت پیدا کی کہ ہم بہت دور بیٹھ کر بھی اپنی بات کو دوسروں تک پہنچا سکتے ہیں یا اپنے خیالات احساسات وجذبات کو محفوظ کر سکتے ہیں۔چنانچہ زبان اور اظہار کی دو مربوط اور منظم صورتیں شاعری اور نثر وجود میں آئیں۔ بقول سید عابد علی عابد

> ”آگڈن کی نظر میں زبان کے استعمال کے دو طریقے ہیں، ایک تحویلی (Refrential) اور دوسرے جذباتی (Emotional) ۔تحویلی طریقہ، افکار اور اشیاء کا حوالہ دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جذباتی طریقہ اس غرض سے اختیار کیا جاتا ہے کہ ان افکار واشیاء سے جو جذبات یا امیال پیدا ہوتے ہیں ان کو بروئے کار لایا جائے۔سائنس اور نثر کی زبان تحویلی ہوتی ہے اور شاعری کی زبان جذباتی۔“[۱]

جبکہ لسانی عمل اور ادبی تخلیق کا آغاز یوں ہوتا ہے:

> ”دنیا کی ہر زبان میں لسانی عمل اور ادب کی تخلیق کے درمیان وقت کا ایک طویل فاصلہ ہوتا ہے، بولی صدیوں میں جا کر زبان بنتی ہے اپنی شکل بناتی ہے اور خدوخال اجاگر کرتی ہے لسانی ارتقا کی تاریخ جب اک ایسی منزل پر پہنچ جاتی ہے جہاں محسوس کرنے والا انسان سوچنے والا ذہن اور اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے والے افراد اس زبان میں اپنی صلاحیتوں کے اظہار کی سہولت پاتے ہیں تو ادب کی تخلیق اپنا سر نکالتی ہے۔“[۲]

جذبے اور تخیل کی یہی ہم آہنگی کسی بھی ادبی تخلیق کو وجود میں لانے کا باعث ہوتی ہے بالفاظ دیگر ان دونوں کی مکمل

ہم آہنگی ہی گویا ادبی تخلیق کی بنیاد بنتی ہے۔ادب جذبات اور کیفیات کا شخصی اظہار کہلاتا ہے۔ادب میں یہی شخصی اظہار دو راستوں شاعری اور نثر کے راستے پروان چڑھا۔اگر چہ ابتداً انسان جو الفاظ ادا کرتا ہے وہ نثر ہی میں ہوتے ہیں لیکن ادب میں اس کی پہلی ہیئت شاعری میں ملتی ہے۔نثر نے اس کے بعد ترقی کی۔یقیناً یہی وجہ ہے کہ ابتدائی نثر میں شاعرانہ عناصر کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔جیسے جیسے تہذیبی ترقی کے لیے حالات سازگار ہوئے ویسے ویسے نثر کے ارتقا کے امکانات بھی روشن تر ہوتے چلے گئے۔

جب اپنی بات دوسروں کو سمجھانے اور اس کی وضاحت و تشریح کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اس کے لیے شاعری مفید نہ تھی چنانچہ یہیں سے نثر کے لیے منطقی اور تعمیری اظہار کی ضرورت کو محسوس کیا گیا۔یہ امر اب طے شدہ ہے کہ خیالات کی اشاعت اور ترجمانی کا کام جس انداز اور عمدگی سے نثر سے لیا جا سکتا ہے شاعری سے نہیں۔ پھر یہ کہ سائنس اور عمرانی علوم فکرو فلسفہ، قانون اور منطق کے لیے نثر کی ضرورت ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ نثر کے ارتقا میں پہلے پہل ایسی ہی نثر وجود میں آئی جب کہ تخلیقی نثر بہت بعد میں وجود میں آئی۔

آج یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ادب میں نثر کو مقبولیت حاصل ہونے سے ماقبل شاعری کو بلند درجہ حاصل رہا ہے۔یہ محض اردو زبان میں ہی نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان میں ادبی طور پر نظم پہلے اور نثر بعد میں ظہور میں آئی۔اس کی ایک قابل فہم وجہ ڈاکٹر این میری شمل یوں بیان کرتی ہیں: "۔۔۔کہ ہندوستان میں صدیوں سے ناخواندہ آبادیوں تک اپنے خیالات وافکار پہنچانے کا واحد ذریعہ شاعری ہی رہی ہے جس کے نتیجہ میں آج بھی ہندوستان کے ناخواندہ لوگ نثر کے مقابلے میں کہیں زیادہ شاعری کو اپنے حافظے میں جگہ دیتے ہیں۔"[۱۳] این میری شمل کے مذکورہ بیان کی تائید حافظ محمود شیرانی کے ہاں بھی ملتی ہے۔

> "پنجاب کے علماء نے بے شمار کتابیں اور رسالے اس نظر سے تخلیق کیے ہیں کہ مسلمان جماعت کا غیر تعلیم یافتہ طبقہ احکام دین روزے، نماز اور مسائل شرعیہ سے ضروری واقفیت حاصل کر سکے۔ایسی کتابیں اکثر اوقات مختصر نظم کی شکل میں ہوتی تھیں تا کہ لوگ آسانی سے یاد کر سکیں۔جاہل طبقے کے لیے یہ طریقہ تعلیم مسلمانوں نے ہندوستان کی باقی زبانوں میں بھی اختیار کیا ہے۔"[۱۴]

گارساں دتاسی کے نزدیک جو باتیں شعر کے پیرائے میں وزن اور آہنگ کے ساتھ کی جائیں وہ حافظے میں جلد محفوظ ہو جاتی ہیں خواہ یہ نثری پیرائے میں ہی کیوں نہ ہوں۔یہی وجہ ہے کہ وہ مقفیٰ و مسجع نثر کو سادہ نثر پر ترجیح دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ہمارا خیال بھی یہی ہے کہ جس طرح نگینہ جڑا جاتا ہے اسی طرح شعر انسانی روح میں نقش ہو جاتا ہے۔ لوگ اشعار یاد رکھ سکتے ہیں لیکن نثر نہیں یاد رکھ سکتے۔ شعر اپنے وزن اور دلکشی کے باعث حافظے میں محفوظ رہ جاتا ہے اور جب یاد آتا ہے تو اس سے دل کو حظ اور انبساط حاصل ہوتا ہے اور مقفّیٰ و مسجع نثر بھی سادہ کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے یاد رہتی ہے کیونکہ وہ بھی اشعار کے مماثل ہوتی ہے۔''[۵]

محمد حسین آزاد بھی نظم کے زیادہ موثر ہونے کے قائل ہیں چنانچہ اپنے لیکچر ''نظم و کلام موزوں کے باب میں خیالات'' میں لکھتے ہیں کہ ''نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ تر زور طبیعت سے نکلتی ہے یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر کے موثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔''[۶] گو کہ ڈاکٹر ابو سعید نور الدین کا یہ استدلال بھی اپنی جگہ درست ہے:

> ''میرے نزدیک اس کا جواز صرف یہ ہے کہ بچہ جب ذرا بڑا ہو کر بات کرنے لگتا ہے تو یک ایک شعر کہنے نہیں لگ جاتا بلکہ وہ جو کچھ بولتا ہے نثر میں بولتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان جب بات کرتا ہے نثر میں ہی کرتا ہے۔ الفاظ کا سرمایہ نثر کی شکل میں اس کے پاس موجود ہوتا ہے اگر اس نے موزوں طبیعت پائی ہے تو ان ہی الفاظ کو وہ شعر کا جامعہ پہنا دیتا ہے اس لیے فطری طور پر نثر کو نظم پر تقدم حاصل ہے۔''[۷]

مذکورہ بیان کی تائید شیر علی سرخوش بھی ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ ''کوئی زبان بھی پہلے پہل نظم سے آغاز پذیر نہیں ہوتی بلکہ نثر سے اور نثر میں اول اول۔۔۔ مفرد الفاظ جمع کیے جاتے ہیں پھر ان سے ایک سیدھی سادی بول چال قائم ہوتی ہے''[۸] چنانچہ اس حوالے سے دیکھیں تو نثر کو نظم پر تقدم حاصل ہے اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کے استعمال میں نثر کی مقدار نظم سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اور یہ بات چیت کی حد تک ہی نہیں بلکہ تحریر و تصنیف کے معاملے میں بھی درست رہی ہو گی لیکن چونکہ ابھی تک نظم کے مقابلے میں نثر کی قدیم ترین تحریر دستیاب نہیں ہوئی اس لیے تحریری سطح پر نظم کو اولیت حاصل ہے۔

شاعر اور نثر نگار دونوں ہی اپنے اپنے اسلوب بیان کے مالک ہوتے ہیں۔ شاعر اپنے جذبات، احساسات، تجربات، مشاہدات اور فکر کو منظوم صورت میں بیان کرتا ہے جبکہ نثر نگار انہیں نثر میں ڈھالتا ہے۔ شاعری اور نثر اپنی اثر پذیری کے اعتبار سے بھی خاص نوعیت کی حامل ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''نثر شعوری و تجزیاتی ہوتی ہے وہ تشریح و توضیح کرتی ہے۔ نظم تخیل اور ربط آفریں ہے وہ قاری کے سارے وجود کو اس طرح متحرک کر دیتی ہے کہ وہ اپنے اندر تجربے کو از سر نو تخلیق کر سکے''[۹] قدیم علمائے فن نظم اور نثر کو الگ الگ اصناف قرار دیتے ہیں مگر وہ شعر کو نظم کے اندر محدود

کر دیتے ہیں اور شعر کو بہترین منظوم کلام کہتے ہیں جبکہ نثر میں ان کے نزدیک شعریت تو آسکتی ہے مگر اسے شعر نہیں کہا جا سکتا۔ نثر میں اگر شاعرانہ عناصر نمایاں ہو جائیں تو وہ اسے شاعرانہ نثر کہیں گے شعر نہیں۔ جبکہ جدید نقد و نظر کا فتویٰ یہ ہے کہ جس چیز کو نثر کہتے ہیں اور جس کو عموماً شعر کی ضد قرار دیا جاتا ہے وہ دراصل شعر کی نہیں بلکہ نظم کی ضد ہے کیوں کہ شعر موزوں انداز سے جذبات کی مصوری کا نام ہے اور یہ نثر میں بھی ممکن ہے۔ شعر کی یہی صفات نثر میں بھی پیدا ہو سکتی ہیں کیونکہ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''کوئی نثر جسے ادبی ہونے کا دعویٰ ہے جذبے کی آمیزش سے خالی نہیں ہو سکتی۔ اعلیٰ درجہ کی ادبی نثر میں منطق کی کامیاب گرفت کے ساتھ جذبے کی زبان بھی نہایت خوبصورت رنگ آمیزیاں کرتی ہے''[۱۰] یہی وجہ ہے کہ جدید ناقدین نثر اور شعر کو ایک دوسرے کی ضد قرار نہیں دیتے۔ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں ''نظم و نثر میں کوئی بنیادی فرق نہیں۔ فنکار اپنی واردات اور جذبات کو جن حالات اور کوائف میں قاری تک منتقل کرتا ہے وہ محض اتفاقی ہوتے ہیں اور اس لیے ان کا نظم و نثر کے قالب میں ڈھلنا بھی ایک طرح کا اتفاق ہوتا ہے''[۱۱]

نتیجتاً یہ کہ نثر، نثر ہی ہے اور شعر کا صحیح قالب نظم ہی ہے۔ اس بناء پر شاعر اور نثر نگار کے اسلوب کے مابین فرق قائم کرنا کچھ زیادہ نامناسب نہیں ہے۔ ہر چند کہ نثر اور شعر دونوں قسم کی تحریریں کئی معاملات میں مشترک اصولوں کی پابند ہوتی ہیں۔ بقول سید عابد علی عابد ''نثر اور نظم یا شعر میں فرق ہے تو یہ کہ جہاں محرکات ایسے جذبے ہوتے ہیں جو شدید ہوں اور جو نثر کی زبان میں اچھی طرح ادا نہ کئے جا سکیں ان کے لیے شعر کا قالب اختیار کیا جاتا ہے''[۱۲] پھر مزید لکھتے ہیں ''نظم یا شعر نے اپنے اظہار کے لیے جو عروضی پیمانے وضع کر لیے تھے نثر کی بعض اصناف کو خواہ مخواہ ان پیمانوں کے ذریعے قاری تک منتقل کرنا تکلف محض معلوم ہوتا تھا۔''[۱۳]

شعر کیا ہے؟ اس کا سادہ اور مختصر جواب یہ ہے کہ شعر شدید اور بھرپور جذبے کے اظہار کے لیے مناسب ترین سانچہ ہے جس کے اظہارات ضروری نہیں کہ عقل اور منطق کے حوالے سے صحیح ثابت ہوں۔ شعر انسانی جذبات کو اپیل کرتا ہے کیونکہ شعر میں جذبہ تخیل کی زبان سے گفتگو کرتا ہے۔ شاعری میں خیالات کا اظہار براہ راست نہیں کیا جاتا بلکہ تشبیہ، استعارہ، صنائع بدائع کے ذریعے ابہام اور تہہ داری پیدا کی جاتی ہے۔ اسی بناء پر ایک شعر میں کثیر الجہت معنی پنہاں ہوتے ہیں اور ہر قاری اپنی فکر اور ذہن رسا کے مطابق مختلف نتائج اخذ کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس نثر میں بات کو براہ راست کہنا اس کی خوبی مانا جاتا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس میں علم بیان اور صنائع بدائع کا استعمال نہیں کیا جاتا، نثر میں بھی ان سے مدد لی جاتی ہے لیکن یہاں خیال

میں ابہام اور تہہ داری پیدا کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ بات میں زور اور شدت پیدا کرنا ہوتا ہے اس کی وجہ سے کیفیت بھرپور انداز کے ساتھ پیش ہو پاتی ہے۔ نثر میں ابہام پیدا ہونا اس عیب کا جبکہ وضاحت، صفائی اور سلاست اس کا حسن ہے۔ نظم کی عمومی تعریف یہ کی جاتی ہے:

''وہ بہترین الفاظ کی بہترین ترتیب کا نام ہے ۔۔۔ یعنی شاعری ذہنی تصویروں، خیالی پیکروں اور ذہنی پرچھائیوں یا استعاروں کا آرٹ ہے اس لیے چیزوں کو اصل نام سے پکارنے کی بجائے کسی اور نام سے پکارتے ہیں۔''۱۴

اس کے برعکس نثر کی عام الفاظ میں اس طرح تعریف کی جاتی ہے:

''نثر الفاظ کی بہترین ترتیب کا نام ہے ۔۔۔ اس میں اصل چیزوں کو اصلی نام سے پکارا جاتا ہے۔''۱۵

ڈاکٹر محمد صادق زیادہ صراحت کے ساتھ نثر کی بابت یوں بیان کرتے ہیں ''نثر فی نفسہٖ توضیحی وتشریحی اور تجزیاتی ہوتی ہے۔ نثر نگار بالعموم باقی تمام بیرونی اثرات وعائدات سے اجتناب کرتا ہے اور ایسے مقابلوں اور موازنوں سے کام لیتا ہے جن سے بیان میں وضاحت اور زور پیدا ہو۔''۱۶

نثر کا میدان شعر کی نسبت زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ اس میں جذبہ، معلومات، محسوسات، حقائق مجرد اور معقولات کا بیان ہوسکتا ہے۔ شعر دل کی گہرائیوں کا ترجمان ہے تو نثر اس کی وسعتوں کی امین ہے۔ اسی بناء پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعر داخلیت کے موزوں ترین اظہار بیان کا نام ہے اور نثر خارجیت کے لیے بہترین سانچا ہے۔ دونوں میں ایک فرق یہ بھی ہوتا ہے کہ شاعر جب تخلیق کرتا ہے تو اسے اپنا مواد خود تخلیق کرنا پڑتا ہے جب کہ نثر نگار کا مواد پہلے ہی سے موجود ہوتا ہے۔ اردو نثر نگاروں کے ہاں چونکہ فکری عنصر ہوتا ہے اس لیے یہ جذبے میں اس شدت کے ساتھ سمویا نہیں جا سکتا جس طرح شعر کے فکری عنصر میں جذبے کو سمویا جا سکتا ہے۔ شعری اور نثری اسلوب کو سمجھنے کے لئے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ ذہن کی دو قوتیں ہوتی ہیں تخیل اور فکر۔ اولذکر قوت سے شاعری جنم لیتی ہے اور مؤخرالذکر قوت سے نثر پیدا ہوتی ہے۔ نثر ایک بات کو بیان کر دیتی ہے جب کہ شاعری اسی بات کو محسوس کروا دیتی ہے لہٰذا یوں کہا جا سکتا ہے کہ فکر کا تعلق نثر سے اور جذبے کا تعلق شعر سے ہوتا ہے۔ ایک میں فکر وخیال کی اور دوسرے میں جذبے کی اہمیت، ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر نظم تخلیقی اظہار جب کہ نثر تعمیری اظہار کا نام ہے۔ دونوں کا انداز پیشکش بھی جدا ہوتا ہے۔ چنانچہ نثر کے ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا یہ کہنا بجا ہے:

"انسانی تصورات کی دنیا کے دو بڑے بر اعظم ہیں ایک اس کے دل کے اندر ہے اور دوسرا اس کی آنکھوں کے سامنے جس کا تعلق اندر کی دنیا ہے۔ وہ کبھی کبھی عموماً باہر کی دنیا کی باتوں کو بھی دوسرے تک پہنچانا چاہتا ہے اور بڑے یقین اور وضاحت کے ساتھ پہنچانا چاہتا ہے کہ سننے والے تک وہ باتیں ٹھیک ٹھیک اور ہو بہو پوری جزئیات سمیت پہنچ جائیں اس کے لیے وہ اپنے مطالب کو مرتب اس طرح کرتا ہے کہ مخاطب کی عقل وفہم ہو بہو ان کا احاطہ کرے۔ اس غرض کے لئے شعر کا سانچا ہرگز موزوں نہیں اس قسم کی سچائی اور خارجی ٹھوس واقفیت کے لئے جس میں کامل یقین اور وضاحت مطلوب ہو نثر ہی حقیقی قالب ہے جو اس کی مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔"۱۷

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم اشاروں اور کنایوں میں گفتگو کرتی ہے اور نثر میں وضاحت اور صراحت کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ نثر نگار کے ہاں جو فکری عنصر موجود ہوتا ہے وہ جذبے میں اس شدت سے نہیں سمویا جاتا جس طرح شعر میں ہوتا ہے۔ آل احمد سرور نہایت لطیف انداز میں اس بات کو یوں بیان کیا ہے:

"نظم اس چاندنی کی طرح ہے جس میں سائے گہرے اور بلیغ معلوم ہوتے ہیں نثر اس دھوپ کی طرح ہے جو ہر چیز کو آئینہ کر دیتی ہے۔ نظم وہ کنجی ہے جو ذہنی تصویروں کا صنم کدہ وا کرتی ہے۔ نثر وہ تلوار ہے جو حق و باطل کا فیصلہ کرتی ہے۔۔۔ نظم زبان کی توسیع اور نثر اس کی حفاظت کا نام ہے۔۔۔ نظم میخانہ ہے اور نثر آئینہ خانہ"۱۸

نثر کے اس آئینہ خانہ میں ہمیں دو انداز تحریر نظر آتے ہیں۔ ایک قافیہ دار عبارت جو مقفیٰ و مسجع نثر کہلاتی ہے اور بیشتر اہل لکھنؤ کو طرہ امتیاز رہی ہے۔ مقفیٰ و مسجع نثر کو علمیت و ادبیت کی علامت سمجھا جاتا تھا جس میں لکھنے والا خیال سے زیادہ الفاظ کی اہمیت کا قائل تھا۔ دوم: سادہ انداز نثر جو روزمرہ بول چال کی طرح سادہ ہو جس میں بے تکلفی اور بے ساختگی ہو۔ ایسی نثر کا اسلوب بیان قدرتی طور پر آسان ہوگا۔ نثر کے اسلوب کو علم بیان، صنائع بدائع، علامت اور تمثیل نگاری سے بھی سجایا گیا۔ ان سب عوامل کا تعلق اظہار بیان کی تاثیر سے ہے جو شاعری میں تو مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں جب کہ نثر میں ان کا کثرت سے استعمال اس کی روح کو مجروح اور اس کی افادیت کو کم کر دیتا ہے۔ البتہ ان عوامل کے استعمال سے نثر میں رعنائی اور دلکشی خود بخود پیدا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر یہی خصوصیت ارادۃً پیدا کی جائے تو نامناسب ہے۔ غرض تخیل کی بلند پروازی اور جذبہ و احساس کا ادراک نثر میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن جذبات و احساسات کے اظہار اور اس کے لیے الفاظ کے استعمال کے ساتھ عقل و منطق کی گرفت اور تخیل کی بلندی پر واقعیت کی چھاپ سے نثر میں اعتدال و توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

جوا سے شاعری کے مقابلے میں انفرادیت اور امتیازی حیثیت دیتا ہے۔اس حوالے سے سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''مبتدی فنکار (نثر میں) ایک فقرے کا آغاز کرتے ہیں اور پھر اپنے ذہن میں اپنے مفہوم کی تمام دلالتوں سے ناواقف ہونے کے باعث فقرے پر فقرے لکھتے چلے جاتے ہیں کہ ان کی اصل بات محدود ہوجائے اور صفت سے متصف ہو کر اصل کی بنیادی صفت سے معرا ہوجائے۔اس کے خیال میں طویل فقرے تو شاید وقارِ تحریر سے متصف ہوں لیکن ایک طویل پارہ (Paragraph) طبیعت کے لیے بوجھ بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نثر کی سادگی اور شعر کی سادگی جدا نوعیت کی ہوتی ہے۔البتہ تشبیہ و استعارہ کے استعمال میں فنکار اپنے مطلب کی توضیح بھی کر لیتا ہے اور اسے ایک خاص قسم کی متین خوبصورتی بھی عطا کرتا ہے۔''[۱۹]

جہاں تک نثر کے اسلوب بیان کا تعلق ہے تو اس کا سیدھا مفہوم یہ ہے کہ اسلوب بیان سے مراد کسی انشا پرداز کا وہ مخصوص فنکارانہ طریقہ کار جس کی مدد سے وہ اپنے خیالات اور احساسات اپنے پڑھنے والے تک پہنچاتا ہے۔اسلوب یا طرز بیان میں دو باتیں ہوتی ہیں۔اول: ادائے خیالات، دوم: اظہار جذبات۔یعنی خیالات کے ادا کرنے اور محسوسات کو بیان کرنے کا ڈھنگ۔شعر میں عام طور پر جذبے کا اور نثر میں فکر کا اظہار ہوتا ہے ان میں فرق مدارج کا ہوتا ہے۔شعر میں جذبہ نمایاں ہوتا ہے اور نثر میں فکر یا خیال زیادہ حاوی ہوتا ہے اس میں شخصیت کا عمل دخل کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

اردو کے نثری سرمائے کو پیش نظر رکھیں تو علمی، ادبی و تدریسی لحاظ سے پانچ عوامل اسلوب کی تشکیل میں کارفرما ہوتے ہیں۔اول: مصنف کی ذات کا دخل؛ دوم: ماحول کا دخل؛ سوم: موضوع کیا ہے؟؛ چہارم: مقصد کیا ہے؟؛ پنجم: مخاطب کون ہے؟ مذکورہ عوامل میں سے کوئی ایک رویہ زیادہ اجاگر ہوجائے تو وہ چیز نمایاں ہوجاتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسلوب کے تعین میں ان باتوں کا عمل دخل ہے کہ کون بات کہہ رہا ہے؟ کس زمانے میں کہہ رہا ہے؟ کیا کہہ رہا ہے؟ کیوں کہہ رہا ہے؟ کس سے کہہ رہا ہے؟ یعنی سب سے پہلے یہ کہ انشا پرداز کی علمی استعداد کیا ہے؟ اس کا ادبی ذوق اور نقطۂ نظر موضوع کا واضح اثر رکھتا ہے کہ نہیں؟ روایت کا اسیر ہے یا تجربے کا بھی قائل ہے؟ ماحول سے مراد یہ کہ اس وقت کا ادبی ماحول کیسا تھا؟ اس ماحول میں رکھ کر کس انشا اسلوب کی ضرورت ہوگی؟ کیوں کہ مصنف خواہ کتنا ہی اصلیت اور حقیقت پسند ہو اپنے ماحول کے اثرات سے خالی نظر نہیں آتا۔لہٰذا اسلوب اس عہد کے سماجی، سیاسی، اقتصادی، علمی و ادبی ماحول کی پیداوار ہوگا۔پھر موضوع یا خیال کی نوعیت کئی طرح کی ہوسکتی ہے۔مثلاً صحافتی، علمی، تدریسی، تاریخی، افسانوی وغیرہ۔ہر ایک کا اسلوب بیان جداگانہ ہوگا۔اس طرح مصنف کے اسلوب پر موضوع کا اثر ضرور پڑتا ہے۔مقصد کے ضمن میں یہ بات پیش نظر ہوتی ہے کہ جن

لوگوں کے لیے لکھ رہا ہے کس طبقے کے ہیں؟ ذخیرہ الفاظ، رجحانات اور مخاطب کی علمی صلاحیتوں اور نفسیات کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کے مصنف کے ہاں ایک جیسا اسلوب نہیں ملتا۔

یوں تو مختلف ادوار میں مختلف اصناف ادب مقبول رہی ہیں لیکن انیسویں صدی میں بالخصوص نثر نے اپنا تشخص قائم کیا اور بتدریج نثر اپنی ممکنات سے آگاہ ہو کر علمی سے تخلیقی بنتی چلی گئی کیونکہ اس سطح پر نثر بھی جذبات کو اکسانے اور ابھارنے لگی تھی۔ تخلیقی نثر ہی کی وجہ سے اس میں جمالیاتی عنصر نکھر کر سامنے آنے لگا۔ تخلیقی نثر میں بیانیہ کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ چوں کہ تخلیقی نثر بنیادی طور پر افسانویت، قصہ پن اور کہانی پن سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے تمام تر افسانوی نثر چاہے اس کا تعلق داستان، ناول، افسانے یا ڈرامے سے ہو یہ تمام اصناف بیانیہ نثر کی نشاندہی کرتی ہیں جب کہ غیر افسانوی نثر جس میں قصہ کہانی کے بیان کی بجائے حقیقتوں تجربوں اور احساسات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اس لیے ایسی تمام تر غیر افسانوی نثر وضاحتیہ کی ذیل میں آتی ہیں۔ اس کی بہترین مثالیں تذکرہ، تاریخ، خاکہ، سفرنامہ، خطوط، انشائیہ، مضمون، رپورتاژ، تنقید، تحقیق وغیرہ ہیں ان تمام اصناف میں قصہ پن کی بجائے وضاحت کا انداز کارفرما ہونے کی وجہ سے وضاحتیہ نثر کی ذیل سمجھا جائے گا۔ وضاحتیہ نثر کو غیر افسانوی اصناف میں طرز تحریر کے انفرادی وصف کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا ہے اور اس طرز اظہار کے توسط سے نثر نگار وضاحت و تشریح کی بے شمار خوبیوں سے متصف ہو جاتا ہے اس لیے اصناف سخن کے علاوہ علوم و فنون کی نمائندگی کرنے والی کتب میں بھی وضاحتیہ نثر ہی کا پہلو کارفرما رہتا ہے۔ اصناف ادب کے علاوہ ترجمہ، تلخیص، ترتیب و تالیف کے دوران بھی وضاحتیہ نثر کو بطور وسیلہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وضاحتیہ نثر درحقیقت غیر افسانوی نثر کے اظہار کا ایسا طریقہ ہے جو علمی و ادبی کتب میں ہی نہیں بلکہ ہر تحریر کے غیر افسانوی انداز میں نمایاں ہوتا ہے۔ صوفیاء کرام کے رسائل کا شمار بھی اسی ضمن میں کیا جاتا ہے۔

نثر کا تعلق اس کے موضوع کے ساتھ بہت گہرا ہوتا ہے۔ داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، سفرنامہ، تنقید اور تاریخ سے لے کر خطوط اور اخبارات تک سبھی نثر میں لکھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نثر کی ہیئت تنوع اور وسعت کی حامل ہے۔ داستان، ناول، افسانہ اور ڈراما جس میں جذبہ خالصتاً ذاتی نہیں ہوتا نثر نگار کو غیر شخصی جذبات کو زبان عطا کرنا ہوتی ہے چنانچہ اس کے لیے نثر ہی کو اختیار کیا گیا۔ اس حوالے سے نثر کو مزید دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول: سادہ نثر اور دوم: ادبی نثر۔ سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اپنی روزمرہ زندگی میں جس نثر کو بول کر اور لکھ کر اپنا مافی الضمیر بیان کرتے ہیں۔

وہ سادہ نثر یا بالفاظ دیگر ترسیلی زبان کہلاتی ہے۔چونکہ یہ جذبات وخیالات کی ترسیل کا کام انجام دیتی ہے اسی لیے زیادہ تر اسی نثر سے کام لیا جاتا ہے۔یہ نثر کی سادہ اور صاف شکل ہے جس میں الفاظ کی معنی آفرینی یا شان وشکوہ کی بجائے عام فہم اور مانوس الفاظ کو سادہ انداز سے استعمال کیا جاتا ہے۔سادگی،برجستگی و بے تکلفی اس کا وصف ہوتی ہیں اس میں خیال کی بلندی اور فکر کی گہرائی اس درجہ نہیں ہوتی کہ بات گنجلک ہو جائے اس میں بنیادی طور پر ابلاغ کا معنی پیش نظر رکھا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسی تمام تحریریں جو کسی فوری مقصد کے پیش نظر انفرادی سے زیادہ اجتماعی تجربے اور خارجی حقیقتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کی جاتی ہیں اسی نثر کی ذیل میں شمار کی جائیں گی۔ مثلاً اخبارات،درسی کتب،معلوماتی کتب،خطوط اور سائنسی علوم وغیرہ اس کا مظہر ہوتے ہیں۔جب کہ ادبی نثر میں نثر نگار کا اپنا انفرادی تجربہ،مخصوص انداز فکر، آہنگ اور لب ولہجہ شامل ہوتا ہے یہی وہ نثر ہے جس کا تعلق ادب جیسی اعلیٰ اور مخصوص قسم سے ہے اس میں جمالیاتی عناصر کی فراوانی ہوتی ہے جس میں اعلیٰ خیالات اظہار بیان کی پوری صلاحیتوں کے ساتھ ذہن وفکر کو متاثر کرنے اور لطافت بخشنے کی خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں۔اسی لیے اس نثر میں کیف،ایمائیت،تخیل،زور بیان،شیرینی،شاعرانہ زبان کے عناصر،خطیبانہ اور بیانیہ نثر کے اجزاء،نثر نگار کا تجربہ لب ولہجہ اور مخصوص ذہن وفکر نمایاں ہوتا ہے۔یہی مخصوص نمایاں خوبی نثر کا اسلوب قرار پاتی ہے اور پھر ادبی نثر کہلاتی ہے۔گویا ادبی نثر میں الفاظ کا بہترین انتخاب واستعمال، جملوں کی درست ترتیب، زبان کا فطری آہنگ،حسن آفرینی، اجمال اور جذبہ بھی ضروری ہے۔ایسی ہی نثر کے لیے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا یہ کہنا بالکل درست ہے:

> ’’۔۔۔یعنی ربط وتسلسل اور آہنگ وکیف تخلیقی ادبی نثر کا جزو ہیں مگر غیر موزونیت اور اجمال کی کمی انہیں شعر نہیں بننے دیتی اسی لیے جدید افسانہ، ناول اور ادب لطیف زبان کے تخلیقی اور تمثیلی استعمال کے باوجود شاعری بجائے تخلیقی نثر کے زمرے میں شامل ہوتے ہیں۔پس جو نثر فلسفہ کے ساتھ جمالیاتی عناصر، وضاحت کے ساتھ ابہام قطعیت کے ساتھ تہہ داری اور لچک، جامعیت وسنجیدگی کے ساتھ تشبیہ واستعارہ کا دلکش امتزاج بھی رکھتی ہو وہ اعلیٰ درجہ کی ادبی وتخلیقی نثر کہلانے کی مستحق ہے اور اس نثر کا منفرد طرز وانداز مصنف کا مخصوص اسلوب کہلائے گا۔‘‘[۱۹]

ب) اُردو ادب کا نثری سرمایہ (سن ستاون سے پہلے تک)

اُردو زبان برصغیر پاک و ہند کی سب سے قدیم دیسی زبان کی وہ ترقی یافتہ شکل ہے جو اس سرزمین میں خارجی حملہ آوروں کے ساتھ آئی ہوئی متعدد زبانوں سے اختلاط کے باعث ظہور میں آئی لیکن اُردو زبان کی تشکیل صدیوں پر محیط ہے۔ عربی، ترکی، ایرانی اور افغانی مجاہدین اسلام کے ساتھ ہی ان کی زبانیں بھی آئیں۔ان فاتحین نے ہمہ گیر رواداری کے اصول پر عمل کرتے ہوئے مفتوحین سے بڑے تپاک سے اپنا ربط ضبط بڑھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی لوگوں نے فاتحین کی عربی اور فارسی زبانوں کو نہ صرف سیکھنا شروع کیا بلکہ اس میں مہارت بہم پہنچانے کی کوشش بھی کی۔ پھر فاتحین نے بھی اپنے محکوموں سے دوست نوازی اور ان کی دلجوئی کی خاطر ان سے ان کی مقامی زبانوں (پراکرت)[۲۱] میں بات چیت کرنے لگے۔یہ فاتحین کے لیے بھی ضروری تھا کہ اس کے بغیر وہ عوام الناس کے دلوں کو فتح نہیں کر سکتے تھے یوں عربی، فارسی اور مقامی پراکرتوں کے اختلاط کا آغاز ہوا جس سے ایک مخلوط اور مشترکہ زبان وجود میں آئی۔ایسا ہونا فطری امر تھا کیونکہ:

> "جب دو صاحب زبان قومیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور آپس میں رشتہ اتحاد وارتباط قائم ہوتا ہے تو قانونِ فطرت کے مطابق اخلاق، مذہب، زبان، طرز بود و ماند، ادب و آداب، لباس اور دیگر شعائر پر ایک دوسرے کا اثر نامعلوم طریقہ سے شروع ہو جاتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ اثر کچھ دنوں میں ایک صورت اختیار کر لیتا ہے اور سب کو نظر آنے لگتا ہے اس قاعدہ کلیہ میں کوئی استثنا نہیں جن لوگوں نے تاریخ عالم کا مطالعہ کیا ہے وہ اس امر کی بھی شہادت دے سکتے ہیں کہ ایسی حالت میں دیگر امور متذکرہ بالا کی نسبت دونوں قوموں کی زبان پر خصوصاً زیادہ اثر پڑتا ہے کیونکہ اظہار مطالب کے لیے ہر شخص وہ لفظ استعمال کرنے کی قدرتاً کوشش کرتا ہے جس کو دوسری قوم کا فرد بآسانی سمجھ لے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ آخر الذکر قوم کی زبان کا لفظ بولا جائے اس طریقہ سے دونوں قوموں کے افراد روزمرہ کے کاروبار چلانے کے لیے کچھ الفاظ ایک دوسرے کی زبان کے سیکھ لیتے ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ ایک زبان کے بہت سے الفاظ دوسری زبانوں کے اصلی الفاظ بن جاتے ہیں"[۲۲]

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم بھی اس بات کی تائید میں لکھتے ہیں: "مختلف اللسان اور مختلف المذاہب اقوام کا اس طرز او راس انداز میں وسیع پیمانے پر نادیر میل میلاپ ہو رہا ہے ان میں سے ایک فاتح اور دوسری مفتوح ہو کر یا ایک اثر انداز اور دوسری

اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتی ہوتو ایک نئی ثقافت اور ایک نئی زبان نے ضرور جنم لینا ہوتا ہے'' ۲۳؎

زبانوں کے اس میل جول کا آغاز محمود غزنوی کے برصغیر پر حملہ سے ہوتا ہے۔ غزنوی کے ساتھ آنے والے مسلمان فارسی زبان بولتے تھے۔ عربوں کی فتح ایران اور عربی کے مختلف زبانوں پر اثرات کی وجہ سے زبان ایک نئے آہنگ اور نئے روپ سے روشناس اور نئے ادبی زاویوں سے ہمکنار ہوئی۔ عربی کے بعد فارسی دنیائے اسلام کی سب سے بڑی زبان تھی۔ فاتح اور مفتوح کے اختلاط سے اہل ہنود کی زبان کے ذخیرہ الفاظ میں اضافہ اور اسلوب بیان متاثر ہوا۔ نئی نئی ترکیبیں اور جدتیں رونما ہوئیں کہ رفتہ رفتہ اس زبان کی صورت نکھر کر جدید رنگ اختیار کرنے لگی چنانچہ دتوں کے اختلاط کے بعد یہی جدید رنگ مستقل صورت اختیار کر گیا جسے ''اُردو'' کا نام دیا گیا۔ مسلمان جہاں جہاں گئے ان کے ساتھ ان کی مادری زبان بھی ہر جگہ پہنچتی رہی اور ساتھ ہی نئی مشترکہ زبان میں معاملات طے کرتے تھے۔ یہی زبان جب تحریر میں ڈھلنے لگی تو ادب وجود میں آنے لگا۔ جو انسانی جذبوں کا آئینہ دار اور ان کی ترسیل کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔ اردو ادب نے دیگر زبانوں کے ادب کی طرح دوراہیں اختیار کیں۔ اول: نظم، دوم: نثر اور دونوں حوالوں سے تدریجی ترقی کر کے اہم مقام حاصل کیا۔

تاریخ ادب کے مطالعہ اور تحقیق سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ عربی، فارسی اور دیسی زبان کے اختلاط سے مشترکہ زبان ''اُردو'' کی قدیم ترین تصنیف نظم ۲۴؎ میں ہے۔ اب تک کی علمی تحقیق نے جو انکشاف کیا ہے اس کے مطابق سب سے قدیم کتاب ویسل دیوراسو ۲۵؎ ہے جو ایک شاعر بت لدل نامی نے چھٹی صدی ہجری (۱۱۵۵ء) میں نظم میں لکھی۔ اس میں کلا (کلاہ) کبائی (قبا) جرہ (زرہ) تاجی (تازی) وغیرہ جیسے متعدد فارسی اور عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اسے اردو کی ادبی شکل کا ابتدائی نشان قرار دیا جا سکتا ہے'' ۲۶؎

لیکن ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم کے مطابق تخت دہلی کے مسلمانوں کے قبضہ میں آنے کے بعد اس علاقے میں یہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری اجمیری اور ان کے خلفاء اور مریدوں کا فیض تھا کہ عربی، فارسی الفاظ مقامی پراکرتوں میں شامل ہو کر ایک نئی زبان کا ہیولیٰ تیار ہو رہا تھا۔ اس کا اندازہ اس دور کی ان تصانیف سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو راجپوتوں کی جنگی اور مذہبی روایات پر مشتمل ہیں۔ یہ کتابیں کھومان راسو، بیسل دیوراسو، پرتھوی راج راسو، جے چندر پرکاش راسو، ہمیر راسو، جے پال راسو وغیرہ کے ناموں سے دوہوں کے رنگ میں قدیم زبان میں لکھی گئی ہیں۔ جن میں عربی فارسی کے کئی الفاظ اپنی اصل

اور بگڑی ہوئی شکل میں نظر آتے ہیں مثلاً نیزہ کی جگہ نیجا، تازیانہ کی جگہ تاجیو وغیرہ ملتے ہیں۔

شہاب الدین غوری (۱۱۹۳ء/۵۸۵ھ) نے اس وقت دہلی کے آخری ہندو حاکم پرتھوی راج کو شکست دے کر فتح پائی تو پرتھوی راج کے درباری شاعر "چند بردائی" ۲۷ نے "پرتھی راج راسا" ۲۸ جنگ نامہ لکھا۔ اس میں جو زبان استعمال کی گئی اس میں پہلی بار کثرت سے غیر ہندی الفاظ داخل ہوئے مثلاً گریب نواج (غریب نواز) ہجور (حضور) کھلک (خلق) آلم (عالم) وغیرہ۔ ڈاکٹر الف دنیم بھی "پرتھوی راج راسو" کی اہمیت کے قائل ہیں کیونکہ اس میں ایسے پھلوں، پھولوں، ہتھیاروں اور لباس کے نام ملتے ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ہی اس علاقے میں آئے تھے۔ مثلاً گلاب، سیب، اخروٹ، نارنگی، صلح، تیغ، زرہ، کمان، تیر، ترکش، ہدف نشان، نوبت، شہنائی، عراقی اور تازی جیسے الفاظ لسانی اختلاط کا بیّن ثبوت ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی سطح پر اُردو زبان کی نشوونما کا آغاز چھٹی صدی ہجری میں اردو نظم میں تخلیقات کے ذریعے ہو چکا تھا۔ لیکن اردو نثر کا سراغ اس دور میں نہیں ملتا اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم دور میں ابلاغ و اظہار کا بنیادی ذریعہ شاعری تھی جس میں ہر طرح کے موضوعات کے ادا کرنے کی صلاحیت اور گنجائش موجود تھی۔ پھر یہ کہ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کی ابتدا بھی نظم سے ہوئی جبکہ نثر بہت بعد میں پیدا ہوئی اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ "زبانوں کی نشوونما کے ابتدائی مراحل ہمیشہ تکلمی رہے ہیں بولی کی صورت میں مستقل حیثیت اختیار کر لینے کے بعد ہی زبانوں کے تحریری آثار نشوونما پانے لگتے ہیں اردو زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں"۔ ۲۹

اردو نثر کے آغاز میں عرصہ دراز تک قافیہ، اوزان، تشبیہات، استعارات کا التزام کیا جاتا رہا۔ رفتہ رفتہ یہ چیزیں دور ہوتی چلی گئیں تو اردو نثر کی نکھری ہوئی صورت سامنے آئی۔ جس زمانے میں اردو شاعری اپنے عروج پر تھی اس وقت بول چال کی سطح پر اردو نثر مروج تھی یوں چھٹی صدی ہجری میں اردو نثر کی نشوونما محض بول چال کی سطح پر ترقی پا رہی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اردو نثر کے اولین نقوش باقاعدہ اور مستقل صورت میں بہت بعد میں دستیاب ہوتے ہیں لیکن آج یہ امر طے شدہ ہے کہ اردو نثر کے تحریری آثار سے قبل اس کا فطرتاً عرصہ دراز تک بول چال کی زبان کے طور پر برصغیر پاک و ہند کے ایسے تمام علاقوں میں رائج رہی ہے جو مسلمانوں کے زیر تسلط آ چکے تھے چنانچہ یوں قدیم ادبی سرمایے میں نظم کے مقابلے میں نثر کا حصہ بہت کم رہا ہے۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ نثر کا دامن محدود اور غیر معیاری تھا۔ تاریخ ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سرمایہ ادب کا بڑا حصہ مذہب، تصوف اور اخلاقیات پر مشتمل تھا۔ اسی لیے اردو بان اور خصوصاً اس کے نثری اسلوب کی

تشکیل میں اولیاء،صوفیاء، اور علماء خصوصیت کے ساتھ سرگرم عمل رہے۔یہی وہ احباب ہیں جنہوں نے پہلے پہل مقامی زبانوں کوتبلیغ واشاعت اسلام کے لیے وسیلہ بنایا۔اس حوالے سے یہ کہنا بالکل درست ہے۔

> ''علمائے کرام کی جماعت اردو زبان اور اردو پڑھنے لکھنے والوں کی سب سے بڑی محسن ہے یہی وہ جماعت ہے جس نے پہلے پہل اس کو بال و پر عطا کیے۔تحریر و کتابت کے منصب بلند سے نوازا اسے اظہار و تبلیغ کا ذریعہ بنایا۔اس میں مذہبی دینی مسائل بیان کیے اور اسے نئے افکار، نئے لہجے اور نئے اسلوب سے روشناس کیا''[۳۹]

اگر چہ ہمیں ساتویں صدی ہجری کی ابتدا میں بھی اردو نثری تصانیف کے کسی سراغ کا پتہ نہیں ملتا لیکن اس زمانہ میں اولیائے کرام، بزرگان دین کے فارسی ملفوظات میں موجود اردو کے بعض جملے لسانی تبرکات کی حیثیت کے حامل نظر آتے ہیں۔اس وقت نومسلموں کو دینی مسائل سمجھانے کے لیے عام فہم زبان کی ضرورت تھی اور یقیناً وہ اردو زبان کے علاوہ کوئی اور زبان نہ رہی ہوگی۔

> ''جب انہیں اپنے مریدوں اور معتقدوں کی ہدایت کے لیے نظم و نثر میں رسالے لکھنے کی ضرورت پڑی یا معرفت و سلوک میں سوالات کے جوابات لکھنے پڑے تو وہ اپنی مذہبی اصطلاحات ہندی تصوف کے الفاظ کے ساتھ ساتھ بے تکلف استعمال کرنے لگے۔یہاں تک کہ حمد و نعت میں بھی عربی کے خاص الفاظ کے ساتھ سنسکرت کے مذہبی لفظ بھی بے ساختہ لکھ گئے۔اس رواداری سے ان کی غرض یہ تھی کہ ان کی ہدایت عام اور وسیع ہو جس طرح انہوں نے ملک کے حالات کے لحاظ سے بعض ظاہری قیود کو توڑ کر اہل ملک سے ارتباط اور میل جول بڑھانے اور ان کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔اسی نظر سے انہوں نے ان کی اور اپنی زبانوں کو بھی ملانا شروع کیا۔۔۔ہوتے ہوتے اس میل اور ارتباط سے خود بخود ایک نئی زبان بن گئی جو نہ ہندی تھی نہ فارسی بلکہ ایک نئی مخلوط زبان تھی جسے ہم اب اردو یا ہندوستانی کہتے ہیں''[۴۰]

یہ بزرگان دین جو عربی اور فارسی بولتے تھے جب عوام الناس سے بات چیت کرتے یا ان کے خیالات کو ظاہر کرنا چاہتے تو اردو جملوں سے مدد لیتے۔چنانچہ اس عمل سے برصغیر پاک و ہند میں ایک طرف غیر مسلموں کو دعوت اسلام، نومسلموں کی تربیت اور مسلمانوں کے لیے اصلاح احوال کا کام شروع ہوا اور دین حق پھیلانے میں خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے وہیں مختلف زبانوں کے امتزاج سے بننے اور ابھرنے والی ایک نئی زبان کی تشکیل میں بھی مدد ملی جو بعد ازاں اردو کہلائی۔اس کی وجہ

سمجھنی دشوار نہیں کیونکہ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان بزرگان دین کی مذہبی زبان عربی جبکہ بول چال کی زبان فارسی تھی۔لیکن عوام سے گفتگو کے وقت مقامی زبان بھی استعمال کر لیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اکا دکا جملے فارسی ملفوظات میں محفوظ ہو گئے۔جس سے نہ صرف اس عہد کی زبان کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس نئی زبان اردو کی ہمہ گیر مقبولیت کا بھی پتہ چلتا ہے جو مستقبل قریب میں تصنیف و تالیف کی زبان بننے والی تھی۔یقیناً یہ طبقہ صوفیا ہی تھا جس نے پہلے پہل برصغیر پاک و ہند کی مقامی زبانوں کو سیکھا اور جانا اور عوام الناس سے زیادہ قریب ہوئے۔جس سطح پر اور جس وجہ عوام کا ربط ضبط صوفیاء کے ساتھ تھا ویسا طبقہ حکمران سے نہ تھا اس کی وجہ یہ تھی:

> ''درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا تھا بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور محبت کو موجب برکت سمجھتے عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔اس لیے تلقین کے لیے انہوں نے جہاں اور رنگ ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔چنانچہ جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے انہی کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔یہ بڑا گر تھا اور صوفیا اسے خوب سمجھتے تھے''[۴۲]

بلاشبہ تبلیغ مذہب میں مقامی بول چال کی زبان اردو نے اہم کردار ادا کیا اس بات کی صراحت صوفیاء کے تذکروں سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے عام بول چال کی زبان کو سیکھا۔چنانچہ اولیاء اور صوفیاء کرام کے ملفوظات اور نوشتوں میں ان کے اقوال،ابیات، جملے، دوہے اور اشعار اس زبان میں ملتے ہیں۔بزرگان دین نے تبلیغ و تلقین کے لیے ابتدائی دور میں اظہار بیان کے لیے خطبہ،مکتوب،ملفوظہ،قول، رسالہ،شاعری اور موسیقی وغیرہ کے سانچوں کو استعمال کیا۔خطبہ نثر کی ایک قسم ہے جو کسی مخصوص موضوع میں مقید نہیں ہوتا۔اگر چہ یہ کسی مجمع میں زبانی خطاب کو کہا جاتا ہے لیکن جب کوئی خطبہ تحریری صورت اختیار کرتا ہے تو اس کے پڑھنے والے اس کے مخاطب پڑھے لکھے لوگ ہو جاتے ہیں۔گو کہ صوفیاء قدیم کے تحریری خطبات دستیاب نہیں ہو سکے لیکن قیاس ہے کہ انہوں نے جمعہ کے اجتماعات یا دیگر مخصوص جلسوں میں زبانی خطبے ضرور دیئے ہوں گے جن کی زبان جزواً ضرور اردو آمیز رہی ہو گی۔چونکہ یہ خطبات دستیاب نہیں ہیں اس لیے تحریری شہادت بھی موجود نہیں ہے۔نثر کی ایک اور قسم مکتوب نگاری ہے۔عام طور پر اس کی ضرورت نجی حالات و معاملات میں پیش آتی ہے ان کا موضوع کچھ بھی ہو سکتا ہے۔قدیم صوفیاء مثلاً شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شیخ جلال الدین تھانیسری،خلیفہ شیخ رکن الدین،مولانا مظفر بلخی، شیخ شرف

الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات فارسی اور عربی آمیز فارسی میں ملتے ہیں ان میں بھی اردو الفاظ کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

ملفوظات اور اقوال صوفیاء کی ایسی باتیں ہوتی ہیں جو وہ کسی مجلس میں پہلے سے سوچے سمجھے موضوع کے بغیر فی البدیہہ ہوتی ہیں اس کے موضوعات مخصوص، متفرق اور متنوع ہوتے ہیں۔قول بالخصوص آفاقی صداقت کا حامل ہوتا ہے۔ چونکہ یہ نصیحت آموز اور راہنمائی پر مبنی باتیں ہوتیں اس لیے ان کو تحریری شکل میں محفوظ کرلیا جاتا تھا۔یہ ملفوظاتی رسالے اور کتب فارسی زبان میں ہیں۔اغلب ہے کہ ان میں بھی جستہ جستہ ابتدائی اردو نثر کے جملے یا الفاظ ہوں لیکن پھر یہ گمان غالب آجاتا ہے کہ بے شک یہ کلی یا جزوی طور پر اردو نثر ہی میں ہوں اور مرتب کرنے والوں نے انہیں فارسی میں مرتب کردیا ہو کیونکہ اس وقت نظم ونثر کی زبان فارسی ہی تھی۔اس ضمن میں شیخ عین الدین گنج العلم، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، سید شاہ زندہ حسین ۳۳، شاہ امین الدین اعلیٰ، شاہ صدر الدین، شیخ خوب محمد چشتی، محمود خوش دہان، حضرت نور قطب عالم شیخ نور الحق کے اقوال اور رسائل ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔جو نظم ونثر دونوں میں ہیں۔ملفوظات میں شیخ وجیہہ الدین علوی گجراتی کے ملفوظات کا مجموعہ''بحر الحقائق''میں ہے۔یہی انداز شاہ میراں جی اور شاہ برہان الدین جانم کے رسائل میں بھی دکھائی دیتا ہے۔سوال فارسی میں اور جواب ہندی (اُردو) میں ہے۔سوال وجواب پر مبنی مکالماتی انداز افہام وتفہیم کا قدیم ترین طریقہ رہا ہے چونکہ مکالمہ خیالات کی ترسیل وتشریح کا ایک مؤثر ذریعہ ہے اس لیے قدیم نثری رسائل میں زیادہ تر سوال وجواب اور مکالمے کی تکنیک اور اسلوب سے کام لیا گیا ہے۔نثری رسائل میں مرید اپنی تشکیک دور کرنے کے لیے روحانی رہبر سے سوالات کرتا اور وہ ان کے جوابات عام فہم اور سلیس زبان میں دیتا۔اس طرح کسی خاص موضوع کے تمام پہلوؤں پر اظہار خیال کا اچھا موقع ملتا۔جس سے موضوع کے بنیادی پہلو یکے بعد دیگرے پوری وضاحت کے ساتھ ادا ہوجائے۔شیخ حمید الدین ناگوریؒ، شیخ انوار پنڈوی، شیخ احمد کھٹو، حضرت قطب شاہ عالم، حضرت شاہ عالم، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، نصیر الدین چراغ دہلوی، کے ملفوظات بھی ملتے ہیں۔اس سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ صوفیاء کرام کی مجالس میں غیر مسلموں اور فارسی ان پڑھ مسلمانوں کے لیے یہی انداز اپنایا جاتا ہوگا۔اسی طرح اقوال جو ایک آدھ جملے پر مبنی ہوتے ہیں اس حوالے سے حضرت شیخ محمد غوث گوالیاری، حضرت فرید الدین مسعود گنج شکرؒ، کے وہ اقوال ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں جو شیخ باجنؒ نے اپنی کتاب''آیۂ رحمت''میں درج کیے ہیں۔مختصر رسائل کے ساتھ اردو نثر کا کتابی صورت میں تصنیف وتالیف کا آغاز بھی ہوجاتا ہے۔یہ ان علماء ہی کا وصف ہے کہ انہوں نے اس وقت اس زبان میں تصنیف وتالیف کا آغاز کیا جب نہ تو اس زبان کے قواعد وضوابط مرتب ہوئے تھے اور نہ

ہی اس کی کوئی صرف ونحو وجود میں آئی تھی۔ چنانچہ پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کا آغاز تبلیغ واشاعت کے ایک وسیلے کی حیثیت سے ہوا جس کا ابتدا میں مقصد مذہبی احکام، اخلاقی تصورات واقدار کی ترسیل اور دینی ترویج سے متعلق تھا۔ اس لیے اردو نثر کے ابتدائی نمونے مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں اس ضمن میں بزرگان دین کے اقوال وملفوظات اور رسائل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ساتویں صدی ہجری کا دور اردو نثر پاروں یا بالفاظ دیگر ملفوظات کا دور ہے جس سے اس صدی میں اردو نثر مستقل صورت اختیار کرتی چلی گئی اور یوں پہلی بار اس عہد میں اردو نثر مربوط جملوں کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس کا اندازہ ان بزرگان دین کی تحریروں سے بخوبی ہوتا ہے جنہوں نے اطراف واکناف کے عوام کی بول چال کی زبان کی رعایت اور ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی فارسی تصانیف میں مقامی مردو خواتین سے تخاطب کے لیے کچھ اردو جملے بھی شامل کر لیے۔ ان بزرگان دین کے ملفوظات ابتدائی نثری نمونوں کے حوالے سے مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں لہذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آٹھویں صدی ہجری اس لحاظ سے اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ اس عہد سے عربی اور فارسی تصانیف کے پہلو بہ پہلو اردو نثر میں بھی تصنیف وتالیف کے کام کا باقاعدہ آغاز ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے جن اولیاء، صوفیاء اور علماء حضرات کے یہاں اردو نثر کے جو نمونے ملتے ہیں انہیں دیکھتے ہیں جو کسی بھی عہد اور علاقے سے متعلق ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کا ذکر ملتا ہے۔ حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' میں شیخ فرید الدین گنج شکر متوفی (۶۶۴ھ) کے چند واقعات کے حوالے سے اردو فقرات ملتے ہیں۔

> ''مولانا برہان الدین صوفی ابھی خورد سال ہی تھے کہ ان کے والد جمال الدین ہانسوی مرید شیخ فرید الدین کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی بیوی ''مادر مومناں'' شوہر کی وصیت کے مطابق اپنے فرزند خواجہ برہان الدین صوفی کو لے کر حضرت گنج شکر کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ شیخ نے خواجہ برہان الدین کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ان کی خورد سالی کا لحاظ نہ کر کے اپنی بیعت میں لے لیا۔ اس پر مادر مومناں معترض ہوئیں اور ہندی زبان میں بولیں:
>
> ''خوجا برہان الدین بالا ہے''
>
> یعنی کم عمر ہیں۔ شیخ فرید الدین نے ہندوی زبان میں جواب دیتے ہوئے کہا:
>
> ''مادر مومناں! پونوں کا چاند بالا ہوتا ہے''[۳۴]

''ایک روز شیخ فرید الدین اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کو وضو کرا رہے تھے اتنے میں حضرت کی نگاہ ان کے

چہرے پر پڑی۔ دیکھا کہ آنکھ پر پٹی بندھی ہے۔ آپ نے دریافت کیا۔ بابا آنکھ پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟ بابا فرید نے ہندی زبان میں جواب دیا:

"آنکھ آئی ہے"

شیخ نے جواب دیا:

"اگر آئی ہے ایں راچہ البستہ آید"

جن ایام میں بابا فرید گنج شکرؒ سرسہ میں حضرت خواجہ عبدالشکور کے مزار پر آتے جاتے تھے ایک دن سرسہ کے لوگ جنھیں یہ معلوم کرنے کا اشتیاق تھا کہ باوا مزار پر جا کر کیا کیا کرتے ہیں ان کے راستے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ جب آپ کو معلوم ہوا۔ ناراض ہوئے اور ہندی زبان میں فرمایا:

"سرسہ سرسہ کبھی سرسہ کبھی نرسہ"۳۵

"رحم کرے تو چھوٹیاں، عدل کرے تو لوٹیاں"۳۶

مذکورہ فقرات اس بات کی دلیل ہیں کہ ساتویں صدی میں اردو زبان اپنے امتیازی خدوخال وضع کر چکی تھی۔ لہٰذا یہ جملے اور فقرے نثر میں ابتدائی منزل کی نشاندہی کرتے ہیں جو آگے چل کر مستقل نثری رسائل کا پیش خیمہ بنے۔ اردو نثر نے اس سے ترقی کی سمت ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ باقاعدہ اور مکمل جملوں کے دور کا اختتام نثر کی مربوط تصانیف کا نقطۂ آغاز ہے۔ اردو کے اس قدیم ابتدائی مزاج کی وجہ سے شیر علی سرخوش کا یہ نتیجہ درست معلوم ہوتا ہے کہ "قدیم ترین اردو زبان کا سراغ جہاں سے نکالا گیا اس کا سرچشمہ پنجابی پراکرت اور اس میں عربی فارسی کی شرکت ہی معلوم ہوتی ہے"۳۷ دکن میں اردو کی سب سے پہلی نثری تصنیف خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا اردو نثری رسالہ "تصوف" (۱۳۰۸ء/ ۷۰۸ھ) کا نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

"اے طالب آسمان زمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب خدا میں ہے جو تحقیق جان، اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھتیر سب ذات ہی ذات"۳۸

دکن ہی کے بزرگ خواجہ بندہ نواز گیسودراز (متوفی ۸۲۵ھ) نے بھی اپنے مریدوں کی فرمائش پر دکنی (اردو) نثر میں چھوٹے بڑے رسالے تحریر کیے۔ جن میں معراج العاشقین ۳۹ ہدایت نامہ، عشق نامہ، تلاوت الوجود، درالاسرار، شکار

نامہ، تمثیل نامہ، ہشت مسائل، سہ بارہ کے نام شامل ہیں۔[۴۰] خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سے منسوب کیے جانے والے نثری نمونوں کی عبارت ملاحظہ ہو:

"اے عزیز، اللہ بندہ بنا یہاں پہچان کو جانا ہیں تو شرع جانا ہے اول اپنی پہچانت بعد از خدا کی پہچانت کرنا"[۴۱]

"ایمان کا جیو قرآن، ایمان کی جڑ توبہ، ایمان کی ڈالیاں بندگی، ایمان کے پات پرہیز گاری، ایمان کا تخم سو علم، ایمان کا پوست سوشرم، ایمان کا وطن سو مومن کا دل"[۴۲]

شمس العشاق شاہ میراں جی (متوفی ۹۰۲ھ/۱۴۹۶ء) بھی علم وفضل میں یگانہ روزگار تھے ان کی تصوف پر مبنی اردو نظم و نثر میں "شرح مرغوب القلوب" "جل ترنگ" "گل باس" "سب رس" کتب و رسائل ملتے ہیں۔ جن میں تمثیلی انداز کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ کتاب "شرح مرغوب القلوب" سے نمونہ نثر ملاحظہ ہو:

"پیغمبر کہے۔ جے کچ کام کرے گا کوئی۔ خدا ناؤں نا لے کر تو او کام پامال ہوگا سرانا۔ نواز نا خدا کو بہوت کہ او پالن ہار ہے عالم کا"[۴۳]

"خدا کہا تحقیق مال اور پنگڑے (اولاد) تمہارے دشمن ہیں چھوڑ دیو دشمنوں کوں۔ اے کیا غفلت ہے جو تجھے اندھلا (اندھا) کیا موت کی یاد تھے (سے) تجھے بسرا کر (بھلا کر)"[۴۴]

حضرت شاہ میراں جی کے فرزند شاہ برہان الدین جانم (متوفی ۹۹۰ھ) کی مضامین عارفانہ پر مبنی کتاب "کلمۃ الحقائق" ملتی ہے۔ جو مسائل تصوف کے موضوع پر ایک ضخیم ترین رسالہ ہے۔ جس میں مرید سوال کرتے ہیں اور پیر طریقت ان کے مختلف سوالوں کے جواب دیتا ہے۔ ذات وصفات، قدیم وجدید، ابتدا وانتہاء، بقا وفنا جیسے موضوعات کی عام فہم تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

"اللہ کرے سو ہووے کہ قادر، توانا سوئے کہ قدیم القدیم اس قدیم کا بھی کرن ہار کچ کچ سو نیر اٹھارو کچ کچ ہوا بھی تو کچ بھی باؤ جدھان کچھ نہیں بھی تھا تھیں۔ دوجا شریک کوئی نہیں ایسا حال سمجھنا خدا تھے۔ خدا کوں جس پر کرم خدا کا ہوتے"[۴۵]

حضرت شاہ امین الدین اعلی (متوفی ۱۰۸۶ھ) نے بھی "گنج مخفی در مبحث شاہد و مشہود" تقریباً (۱۰۱۰ھ/۱۶۰۱ء)

میں تصنیف کی نثری نمونہ ملاحظہ ہو:

''اللہ تعالیٰ گنج مخفی کو عیاں کرنے چاہا۔تو اول اس میں سوں یک نظر نکلی۔سواس سے امین دیکھ ہوا۔امین شاہد کو کہتے ہیں یہ دونوں ذات کے دوطور ہیں۔ذات نے اپس کوں دیکھا اسے نظر کہتے ہیں۔دیکھ کر گواہی دیا تو اسے شاہد کہتے ہیں۔یو(یہ) تینوں مرتبے ذات کے ہیں''۴۶

ان بزرگان دین کے علاوہ جن احباب کے ہاں اردو نثر کا ارتقا دکھائی دیتا ہے ان میں حضرت شاہ میراں جی حسن خدا نما (متوفی ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کی کتاب شرح تمہید (۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء) مولانا عبداللہ کی ''احکام الصلوۃ'' (۱۰۳۲ھ)، برہان الدین اولیا اورنگ آبادی کی ''شمائل الاتقیاء'' شامل ہیں چنانچہ تاریخ ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، شیخ حمید الدین ناگوری، خواجہ علی احمد صابر کلیر شریفی، شیخ صوفی بدھنی، شیخ شرف الدین بوعلی قلندر، حضرت نظام الدین اولیا، شیخ جمال الدین ہانسوی، حضرت امیر خسرو، شاہ بہرام فرید ثانی، شیخ لطیف الدین دریا نوش، شیخ سراج الدین عثمان، حضرت نور قطب عالم شیخ نورالحق پنڈوی، شیخ شرف الدین یحییٰ منیری، حضرت زین الدین خلد آبادی، سید محمد عبداللہ حسینی، سید اکبر حسینی، حضرت شاہ زندہ حسین، شیخ بہاء الدین باجن جیسے بزرگان دین اردو زبان سے بخوبی شناسا تھے ان کی تحریروں میں اردو نثر کی جابجا جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔۴۷

اُردو میں نثری تراجم کا آغاز بھی صوفیاء کرام ہی کے دور میں نظر آتا ہے مثلاً فارسی کی کتاب شمائل الاتقیا کا ترجمہ میراں یعقوب نے کیا۔سید محمد عبداللہ حسینی نے سید عبدالقادر جیلانی کی کتاب ''نشاط العشق'' کا نثری ترجمہ کیا۔شاہ میراں جی خدا نما کی ''شرح تمہید حمدانی'' اردو نثر کا صاف اور رواں ترجمہ ۴۸ ہے۔نتیجتاً اردو نثر کے مربوط ابتدائی آثار ہمیں ایسے ہی بزرگان دین کی تحریروں میں ملتے ہیں جو اپنے اپنے عہد میں رشد و ہدایت کا مرکز و منبع تھے۔جنہوں نے انسان کی ظاہری و باطنی دنیا کی ترتیب و تنظیم کرنے جیسے عظیم فریضے کو انجام دیا۔صوفیاء کے اسی منصب کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا یہ کہنا بالکل درست ہے۔

''صوفیاء کا مشرب انسان دوستی اور رہنمائی تھا یہ ایک ایسا مشرب تھا کہ جس نے صدیوں تک برصغیر کی اخلاقیات پر گہرا اثر ڈالے رکھا۔وہ انسان کو اس کی گمراہیوں سے ہٹا کر اس کے باطنی مرکز کی سمت سفر کا رستہ دکھاتے تھے اور جب باطنی مرکز بیدار ہو کر آنکھ کھولتا تھا تو اس وقت تک اس کی قلب ماہیت ہو چکی ہوتی تھی اور اب یہ انسان معاشرے کی فلاح کا موجب بنتا تھا۔وہ خود دوسرے انسانوں کو ان کے باطنی مرکز کا رستہ

دکھاتا اور یوں معاشرہ کشود قلب کے باعث انسان اور انسانیت سے محبت کرنا سیکھتا تھا۔صوفیاء کی تعلیمات صرف باطنی دنیا تک محدود نہ تھیں بلکہ انسانی ترتیب و تنظیم کا درس بھی ان میں موجود تھا۔ان کا یہ سوال کہ انسان کیا ہے اور زمین پر اس کے فرائض کیا ہیں؟ ایک بڑی صداقت کو دریافت کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جب انسان اس صداقت کو پالیتا ہے تو اس کی باطنی اور دنیوی ترتیب کا مرحلہ شروع ہو جاتا تھا۔''۴۹

رشد وہدایت کا یہ سلسلہ ساتویں صدی ہجری سے لے کر گیارہویں صدی ہجری پر محیط نظر آتا ہے اور اس کا تسلسل جاری رہتا ہے۔اردو نثر کا یہ سرمایہ مذہبی تبلیغ و تلقین کی خاطر یا پھر تصوف کے کسی اہم مسئلے کی توضیح کے لیے تصنیف ہوا۔جو چھوٹے چھوٹے رسائل پر مشتمل تھا۔جن میں عربی اور فارسی کے ترجمے جو زیادہ تر فارسی رنگ میں تھے۔تاریخ ادب کے مطالعے سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگانِ دین کوئی بڑے ادیب نہ تھے اور نہ ان کا مقصد ومدعا اردو زبان کو ترقی دینا تھا بلکہ ان کا مطمحِ نظر تو محض عوام الناس کی ہدایت تھا۔ان کا یہی مقصد بالواسطہ طور پر اردو نثر کے فروغ کا باعث بنا اور انہی کے ہاتھوں اردو نثر کی اولین خدمت کا کام ہوا۔جس سے اردو زبان میں نئے اضافے اور اصلاحات سے زبان کا دامن وسیع ہونا شروع ہوا۔غرض بلاشبہ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے اس بیان سے مکمل اتفاق کیا جائے گا۔

''اردو کو جوان ہونے اور پروان چڑھنے کے لیے صوفیوں کی خانقاہیں، مبلغین کی مجلسیں اور اللہ والوں کی محفلیں تلاش کرنا پڑیں۔ان کے بھی دربار تھے مگر شاہی دربار نہ تھے یہ عوام کے لیے کھلتے تھے یہاں شرافت کی زبان، ثقافت کی زبان اور تہذیب کی زبان کا سکہ نہیں چلتا تھا۔یہاں عوام کے دلوں میں اترنے کے لیے عوام کی بولی کا رواج تھا۔چنانچہ اردو کی ابتدائی نشو ونما میں سب سے زیادہ صوفیاء کرام ہی نے کام کیا۔''۵۰

یہ بزرگانِ دین کا فیضانِ نظر تھا کہ اردو نثر نے دوسرے درجے پر قدم رکھا چنانچہ سترھویں صدی عیسوی اردو زبان و ادب کے ارتقا کے لیے بڑی سازگار بن گئی۔سترہویں صدی عیسوی کے وسط میں جنوبی ہند میں ملا وجہی (متوفی ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۳ء) نے ''سب رس'' اور ''تاج الحقائق''۵۱ دو مشہور کتابیں لکھیں۔''سب رس'' ایک تمثیلی قصہ ہے جو یحییٰ ابن سیبک فتاحی نیشاپوری (متوفی ۸۵۲ھ/۱۴۴۸ء) کے فارسی نثری فرضی قصہ ''حسن و دل''۵۲ کا قدرے تصرف کے ساتھ اردو نثر کا ترجمہ ہے۔سب رس کی اردو نثر کا اندازِ بیان تمام قدیم تصانیف سے مختلف اور اس کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے۔''سب رس'' سے قبل کی تصانیف چونکہ مذہبی اور متصوفانہ رسائل پر مبنی تھیں اس لیے ''سب رس'' کی اردو نثر نے تصوف اور

مذہب کے بندھے ٹکے موضوعات کو ایک نئے طرز انداز یعنی داستان وتمثیل کی صورت بیان کیا۔اس لحاظ سے ''سب رس'' صوفیانہ مذہبی تصنیف ہونے کے باوجود جنوبی ہند میں اردو نثر کی پہلی ادبی تصنیف کہی جاتی ہے۔اس میں عربی فارسی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ بھی بکثرت استعمال کیے گئے ہیں گو کہ اس میں بہت سے الفاظ اور محاورات ایسے ہیں جواب بالکل متروک ہیں لیکن پھر بھی اس سے اس عہد کی قدیم اردو نثر کے الفاظ وقواعد کے تغیر وتبدل کا بھی پتہ چلتا ہے اور اردو نثر کے ارتقا میں ایک نئی منزل کی نشاندہی ملتی ہے۔اس کا نثری نمونہ ملاحظہ ہو۔

''۔۔۔ایک شہر تھا اس شہر کا ناؤں سیتان۔اس سیتان کے بادشاہ کا ناون عقل، دین ودنیا کا تمام اس نے چلتا اس کے حکم باج ذرا کین نیں ہلتا۔اس کے فرمائے پر جنو چلے، ہر دو جہاں میں ہوئے بھلے، دنیا میں خوب کہوائے چار لوکاں میں عزت پائے۔جان رہے کھڑے وہاں قبول پڑے نہ آفت دیکھے نہ زلزلہ، ایسے بھلے تو عالم بھلا۔''[۵۳]

''سب رس'' کے علاوہ شاہ ولی اللہ قادری کی فارسی کتاب ''معرفت السلوک'' کا اردو ترجمہ، سید شاہ میر کے رسائل ''اسرار توحید'' ''رسالہ حقائق'' ''مترجم طوطی نامہ قادری'' ''مترجم طوطی نامۂ ابوالفضل'' وجود میں آئیں۔ جنوبی ہند کے برعکس شمالی ہند میں اردو نثر کی کوئی ادبی تصنیف سترہویں صدی عیسوی میں نہیں ملتی۔البتہ اٹھارویں دی عیسوی میں فضل علی فضلی کی اردو تصنیف ''کربل کتھا''[۵۴] جو محرم کی مجالس کی ضرورت کے لیے ترجمہ کی گئی۔اس ترجمہ وتالیف کو شمالی ہند کے لیے اردو نثر کی پہلی ادبی کتاب قرار دیا جاتا ہے۔''کربل کتھا'' کی عبارت رنگین ہے لیکن اس میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ اس کی زبان اہل مجلس خصوصاً عورتوں کے لیے قریب الفہم ہو لہٰذا وہاں پر عبارت میں عام فہم اسلوب بھی ملتا ہے۔''کربل کتھا'' کی اردو نثر پر فارسی اور عربی کے طرز احساس اور اسلوب بیان کے اثرات نمایاں ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر میں یہی وہ معیاری اسلوب تھا جس کی اس دور میں تقلید کی جاتی تھی۔نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

''امام حسین کے چچا کا بیٹا ہوں کوفیوں نے بے وفائی کی اور مجھے ورطہ میں ڈالا۔طوعہ سنتے ہی مسلم کے پانو پر گری اور گھر میں لا اچھی جگہ بٹھا کھانے پینے سے جو کچھ کر رکھتی تھی حاضر کی۔مسلم نے کھانا نوش فرما اور نماز قضا کرا دو رات دن کا تھکا ہارا ہوا تکیہ پر سر رکھ آرام کیا۔اتنے میں بیٹا اس بوڑھیا کا آیا دیکھا کہ اس میں کبھو گھر میں جاتی اور کبھو باہر آتی۔کبھو ہنستی اور کبھو روتی۔لعین نے پوچھا اے ماں آج رات عجب حال ہے تیرا خیر ہے۔طوعہ کی خیر ہے تو مشغول اپنے کار رہ پر وہ بجد ہوا۔''[۵۵]

فضل علی فضلی کے ترجمہ ''کربل کتھا'' کے بعد تقریباً نصف صدی تک اردو نثر کی کوئی کتاب شمالی ہند میں نہیں ملتی۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ایک تو یہ کہ اردو نثر کی بجائے اردو شاعری پر زیادہ توجہ مرکوز نظر آتی ہے دوسرے یہ کہ جو نثری کتب لکھی جا رہی تھیں وہ زیادہ تر فارسی نثر میں تھیں۔اسی زمانے کی اردو نثر کا ایک اور مختصر نمونہ مرزا رفیع سودا کے ''سبیل ہدایت''۵۶ کے دیباچہ کی صورت میں ملتا ہے۔دیباچہ میں سودا نے اردو نثر میں شعری اسلوب استعمال کیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کو نثر کا پیرہن دے دیا گیا ہو غرض اس کا نثری اسلوب شاعرانہ انداز پر مبنی ہے۔

''ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے جو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہو۔پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ در ریختہ خامہ۔دو زبان اپنی سے صفحہ کاغذ پر تحریر پائے لازم ہے کہ تحویل سخن سامعہ سنجان روزگان کروں،تا زبانی ان اشخاص کی ہمیشہ مورد تحسین وآفرین رہوں .... میں پیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو پیچ قفس کے جس زبان پر آیا۔فریاد بلبل ہے واسطے گوش دادرس کے۔غرض جس اہل سخن کا در مصفیٰ زینت لب ہے۔سر رشتہ حسن معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے مانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ ہرگز ندز ہر آلود سے بے اجل کا ہے کو مرے۔''۵۷

اردو نثر میں دیگر شعراء نے بھی اپنے دواوین اور منظوم تصانیف پر اردو دیباچے تحریر کیے۔ان دیباچوں کو ڈاکٹر جمیل جالبی کا عملی وتنقیدی نثر کے اولین نمونے قرار دینا بھی درست ہے جہاں ان تمام دیباچوں کے اسلوب میں اردو کی نسبت فارسی طرز احساس غالب ہے۔وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سودا سے بھی پہلے عزلت نے اپنے اردو دیوان کا دیباچہ اردو نثر میں لکھا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''عزلت کے اردو دیوان کا دیباچہ مجموعہ رسائل پر محمد تقی انصاف حیدر آبادی کا دیباچہ،مثنوی سبیل ہدایت پر مرزا رفیع سودا کا دیباچہ،ہشت بہشت،محبوب القلوب،ریاض الجنان بگلزار عشق اور دیوان اردو پر محمد باقر آگاہ ویلوری کے دیباچے اور اردو منظوم بدماوت پر غلام علی عشرت کا دیباچہ شامل ہیں ان کے علاوہ برکت اللہ عشقی کی اردو امثال اور مرزا طپش کی فرہنگ اردو بھی شامل ہے۔عبداللہ ولی عزلت پہلے شاعر ہیں جنھوں نے اپنے اردو دیوان پر جو ۱۱۷۲ھ/ ۵۹-۱۷۵۸ء سے پہلے مرتب ہوا،اردو نثر میں دیباچہ لکھا۔''۵۸

اسی صدی میں اردو نثر میں تصوف،تفسیر،مذہبی رسائل،قرآن کے تراجم اور سیرت النبی پر کام بھی سامنے آتا ہے۔

تصوف میں معین الدین علی کی "فتوح المعین" "ترجمہ از فارسی رسالہ "جام جہاں نما" تفسیر میں شاہ مراد اللہ انصاری سنبھلی کی "پارہ عم" کی مفصل تفسیر "تفسیر مرادیہ"۔ مذہبی رسائل میں مولانا شاہ ظہور الحق بھلوری کے "رسالہ نماز" رسالہ فضائل قرآن، رسالہ فیض عام اور رسالہ کسب النبی ۵۹، جب کہ قرآن کے اردو نثری تراجم شاہ ولی اللہ دہلوی کے لائق فرزندان میں شاہ رفیع الدین نے پہلا اور مولانا شاہ عبدالقادر نے دوسرا اردو ترجمہ کیا۔۶۰ اردو نثر میں سیرت النبی پر قدیم ترین کتاب محمد باقر آگاہ نے "ریاض السیر" ۶۱ کے نام سے لکھی۔

پھر شاہ ولی اللہ کے تتبع میں شروع ہونے والی سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کے ذریعے بھی علماء نے اردو نثر کے ذریعے تبلیغ کی روایت آگے بڑھائی اور جلد ہی ترجمۂ قرآن تفسیر، فقہ، کلام، تاریخ، سیرت، واعظ و نصیحت اور تصوف سے متعلق تصنیفات پر ایک معتد بہ ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اسی تحریک کی پیروی میں دیگر علماء نے بھی اردو زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا۔ جس سے بہت سے تراجم اور مستقل تصانیف وجود میں آئیں۔ یوں اردو نثر نگاری میں نئے نئے تجربات کا آغاز ہو گیا۔ ہر چند یہ ترجمے کا دور تھا لیکن اس تجرباتی دور کو اردو نثر کے ارتقا میں انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ یہ سلسلہ بعد ازاں بہار، بنگال، پشاور، سرحد، بمبئی، مدارس تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔۶۲

اٹھارویں صدی میں منظر عام پر آنے والی تمام تصانیف کی بناء پر مذہبی اردو نثر میں ایک معیاری اسلوب اپنا تشخص قائم کر لیتا ہے جس میں سادگی، دلکشی، وضاحت، منطقی انداز جیسے عناصر نظر آتے ہیں اور اسی کا تسلسل روایت بن جاتا ہے۔ اردو زبان اس دور میں کس قدر مقبول تھی اس کا اندازہ اردو شاعری سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے تقریباً اواخر میں بائبل، بھگوت گیتا کے اردو تراجم کے ساتھ اردو زبان کی قواعد و لغات بھی مرتب ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ وہیں تاریخ نثر کے آثار بھی "قصہ و احوال روہیلہ" ۶۳ مصنفہ رستم علی بجنوری، تاریخ فیروز شاہی مترجمہ وارث علی بن شیخ بہادر کی صورت میں نمودار ہونا شروع ہوئے نیز قصہ کہانی کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں اٹھارویں صدی کے تقریباً اختتام پر "قصہ مہر افروز" مصنفہ نواب عیسوی خان، "نوطرز مرصع" ۶۴ مصنفہ میر محمد عطا حسین خان تحسین، عجائب القصص مصنفہ شاہ عالم ثانی، نو آئین ہندی مصنفہ مہر چند کھتری، جذب عشق، مصنفہ شاہ حسین حقیقت وغیرہ منظر عام پر آتیں ہیں۔

سیاسی حوالے سے اٹھارویں صدی ایسا دور ہے جس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حکمرانوں کا برصغیر میں تسلط بہت

حد تک مضبوط اور ان کا دائرہ اثر بہت وسیع ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال سلطنت کی طرف سے قانون کی پہلی کتاب اردو نثر میں ترجمہ ہو کر ''مجمع القوانین''۶۵ یا ''مجموعہ قوانین'' کے نام سے سامنے آتی ہے۔ صحیح معنوں میں اس صدی میں اردو نثر کو فروغ ملنا شروع ہوتا ہے اور شاعری کے ساتھ نثر کی مسلمہ حیثیت کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اردو نثر میں اسالیب اور موضوعات کا تنوع ۶۶ نظر آتا ہے اس عہد میں اردو نثر کے ابتدائی رنگ کو دیکھ کر یہ واضح طور پر یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ترقی بہت آہستہ روی سے ہوئی۔ اگر چہ اردو نثر میں تصنیف و تالیف کے کام کا آغاز ہو چکا تھا لیکن پھر بھی طبقہ خواص فارسی ہی میں لکھنا پسند کرتا اور اردو نثر لکھنے کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتا تھا۔ اسی لیے خطوط، نسخے اور حتیٰ کہ گھر کا حساب بھی فارسی زبان ہی میں تحریر کیا جاتا تھا۔ فارسی کے اس قدر غلبہ اور اثر کی وجہ یہ تھی کہ فارسی درباری زبان تھی اور ہندو مسلمان شرفا طبقہ فارسی ہی میں تصنیف و تالیف کا کام کر رہا تھا۔ ایسے افراد جنہوں نے اردو کی جانب توجہ کی وہ بھی فارسی دانی کے اظہار کے ذریعے اپنا وقار قائم کرنا چاہتے تھے جس کی عبارت جس قدر مشکل اور دقیق ہوتی اتنی ہی اس کی علمیت کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ اسی بناء پر اس زمانے کے لکھنے والے خود کو فارسی اسلوب سے نہ بچا سکے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اسی دور میں اردو نثر بہت حد تک فارسی، عربی کے اثرات سے آزاد ہوتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔

انیسویں صدی میں جب قدم رکھتے ہیں تو ہمیں اردو نثر کی ترویج و اشاعت کا سبب بننے والے دو بڑے ادارے فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) اور دہلی کالج (۱۸۲۵ء) دکھائی دیتے ہیں جو رواں اور سلیس اردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج صاحبان نو آموز کو اردو زبان سکھانے کے لیے قائم کیا۔ سیاسی حوالے سے مغلیہ سلطنت اور اس دور کی تمدنی علامت فارسی زبان روبہ زوال تھی اور یہ بات کمپنی کے ارباب اختیار نے سمجھ لی تھی یہی وجہ تھی کہ انہوں نے فورٹ ولیم کالج میں مستقبل کی زبان اردو کو سیکھنے اور سکھانے کا فیصلہ کیا۔ اردو چونکہ عام بول چال کی زبان کی سطح سے اٹھ کر ادبی اور تخلیقی زبان بننے کے مراحل سے گذر کر فارسی کی جگہ لے رہی تھی۔ اس لیے نو آموز انگریزوں کے لیے اس زبان کو سیکھنا ناگزیر تھا۔ اس زبان کو سیکھنے کے بعد ہی ملک کی تہذیب، رسم و رواج، احساس و خیالات سے براہ راست استفادہ کرنا ممکن تھا۔ پھر اس کالج کے ٹائپ پریس کے قیام نے اس زبان کی اشاعت میں مزید اضافہ کیا۔ لہٰذا کالج کا قیام سیاسی اغراض و مقاصد کا نتیجہ تھا لیکن بالواسطہ طور پر اس نے اردو نثر کو فروغ اور اس کی اشاعت کے لیے بے بہا اور قابل ستائش خدمات سر انجام دیں۔

فورٹ ولیم کالج سے جدید اردو نثر میں آسان نثر نگاری کا آغاز ہوا۔ڈاکٹر گلکرسٹ اس کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ جس کے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ نو آموز شاگردوں کے لیے رواں سلیس اردو نثر کی ایسی کتب موجود نہیں تھیں جو تدریسی مقاصد کو نہ صرف پورا کرسکیں بلکہ مطلوبہ معیار پر بھی پوری اتریں۔استثنائی صورتوں میں ''عجائب القصص'' اور ''نوآئین ہندی'' موجود لیکن ناکافی تھیں۔اس کمی کا حل تراجم کی صورت میں تلاش کیا گیا۔چنانچہ تراجم کے ذریعے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے وسیع پیمانے پر تصنیف وتالیف کا باقاعدہ آغاز فورٹ ولیم کالج ہی کے پلیٹ فارم سے ہوا۔اس ضمن میں سید وقار عظیم کی یہ رائے درست ہے:

> ''اردو میں پہلی مرتبہ ایک وسیع پیمانے پر ایک منظم اور باضابطہ انداز میں تصنیف وتالیف کے مقابلے میں ترجمے کی اہمیت واضح ہوئی اور ترجموں کو ان منظم مساعی نے اردو نثر میں ترجمے کی ایک ایسی روایت کا آغاز کیا۔جس سے آگے آنے والوں نے اپنی شمعیں روشن کیں۔اردو نثر کی تاریخ میں دوسری زبانوں سے ترجمہ کرنے کی جتنی تحریکیں انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں شروع کی گئیں ان سب کی زندگی میں فورٹ ولیم کالج کی اس روایت کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔''[۶۷]

ڈاکٹر گلکرسٹ نے اس کام کے لیے ملک کے بہترین ادیبوں اور انشاء پردازوں،منشیوں[۶۸] کو اکٹھا کیا۔جو ملک کے مختلف حصوں کے رہنے والے تھے،ان میں میرامن،دہلوی،سید حیدر بخش حیدری،میر شیر علی افسوس،میر بہادر علی حسینی،میر کاظم علی جوان،نہال چند لاہوری،مرزا لطف علی معروف بہ مظہر علی خان ولا،حفیظ الدین احمد،للو لال جی،بینی نارائن جہاں، مرزا علی لطف،مولوی امانت اللہ شیدا،خلیل خان اشک،مولوی اکرام علی وغیرہ شامل تھے۔گلکرسٹ نے کالج میں محکمہ تالیف و تصنیف کا محکمہ قائم کیا نیز منتخب مصنفین کی اعلیٰ نثری کاوشوں پر ان کی حوصلہ افزائی کے لیے انہیں انعامات سے نوازنے کی سفارشات بھی کیں۔جس کا مقصد نثر کے اس جدید رجحان کو فروغ دینا تھا۔یہ ڈاکٹر گلکرسٹ ہی تھے جن کی توجہ اور انتھک کاوشوں سے انیسویں صدی کی ابتدا میں اردو نثر میں نئے تجربات کے آغاز کا سلسلہ نظر آتا ہے۔

اگرچہ فورٹ ولیم کالج کا مقصد ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں کو اردو زبان کی تعلیم دینا تھا لیکن اس مقصد کے لیے ایسی کتابیں پہلے سے موجود نہ تھیں۔جنہیں ان نو آموز انگریز ملازمین کے درس وتدریس کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا۔اس فوری مقصد کی تکمیل کے لیے گلکرسٹ نے مذکورہ بالا ارباب قلم کو اکٹھا کیا اور ان سے سلیس اور عام فہم درسی کتب

لکھوائیں ۔جو کہ ان کی مستقل تصانیف نہیں تھیں بلکہ فارسی کی مشہور اور متداول قصص و حکایات ،تاریخ قواعد زبان،اور اخلاق و مذہب کی کتابوں کے سادہ، سلیس اور رواں ترجمے تھے۔تراجم کے علاوہ کچھ تالیفیں اور قواعد زبان پر کتب جبکہ قصوں، حکایتوں ، تاریخوں، تذکروں،نعتوں، اخلاق و مذہب کے سلسلے کے انتخابات تھے۔اس کالج کے سیاسی مقصد کے تحت انگریزوں کو برصغیر پاک و ہند کے باشندوں پر بہترین حکمران بنانا تھا لہذا ان کتب میں نثری تراجم کے حوالے سے دو باتوں کا خیال رکھا گیا۔اول: فارسی میں مقبول عام کا درجہ رکھتی ہوں ۔دوم: جن سے اہل ہند کے تہذیب و تمدن،ادب و آداب، رسم و رواج اور مذاق وخیالات سے شناسائی میں کافی مدد مل سکے۔

چنانچہ میر امن دہلوی نے نوطرز مرصع کا ترجمہ سلیس، رواں اور آسان اردو نثر میں ''باغ و بہار'' (۱۸۰۱ء) کے نام سے کیا جس سے ایک نئے اسلوب بیان کی داغ بیل پڑی جبکہ دوسرا املا واعظ حسین کاشفی کی کتاب ''اخلاق محسنی'' کا ترجمہ ''گنجینۂ خوبی'' کے نام سے کیا۔ان میں باغ و بہار اپنی فصیح و سلیس زبان کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔سادگی اور روانی کے حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جس خالق نے ساری خلقت کو پیدا کیا اور تجھ سی محبوبہ سے میری خدمت کروائی اور تیرے دل کو مجھ پر مہربان کیا اور زنداں سے خلاص کروایا ۔اس کی ذات لاشریک ہے اس کی میں نے عبادت کی اور بندگی بجا لایا اور ادائے شکر کیا۔ یہ بات سن کر کہنے لگی تم مسلمان ہو؟ میں نے کہا: شکر الحمد اللہ۔ بولی! میرا دل تمہاری باتوں سے خوش ہوا۔میرے تئیں بھی سکھاؤ اور کلمہ پڑھاؤ۔ میں نے دل میں کہا: الحمد اللہ کہ یہ ہمارے دین کی شریک ہوئی غرض میں نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھا اور اس سے پڑھوایا۔''[۱۹]

سید حیدر بخش حیدری نے سب سے زیادہ اردو نثر میں کتب تحریر و ترجمہ کیں۔جن میں قصہ لیلیٰ مجنوں (امیر خسرو کی مثنوی لیلیٰ مجنوں کا ترجمہ) طوطا کہانی (سید محمد قادری کے فارسی طوطی نامہ کا ترجمہ)، آرائش محفل (قصہ حاتم طائی کا ترجمہ)، گل مغفرت (دہ مجلس کا ترجمہ گلشن شہیداں کا خلاصہ)،گلزار دانش (شیخ عنایت اللہ کی بہار دانش کا اردو ترجمہ) گلشن ہند (اردو شعراء کا تذکرہ) لکھا۔ان کی اردو نثر بھی سادہ،صاف اور سلیس ہے۔

میر شیر علی افسوس نے باغ اردو (ترجمہ گلستان سعدی) اور ''آرائش محفل'' لکھی ۔میر بہادر علی حسینی نے اخلاق ہندی (مفرح القلوب کا اردو ترجمہ) نثر بے نظیر (تالیف) اور تاریخ آسام (شہاب الدین طالش کی تاریخ آسام کا ترجمہ)

لکھیں۔میر کاظم علی جوان نے کالی داس کے مشہور ناٹک ''شکنتلا''،قرآن مجید اور تاریخ فرشتہ متعلقہ خاندان بہمنی کا اردو ترجمہ، سنگھاسن بتیسی اور بارہ ماسہ یا دستور ہند لکھی۔نہال چند لاہوری ۲۰؎ نے ''مذہب عشق'' (شیخ عزت اللہ بنگالی کے فارسی قصہ گل بکاؤلی کا اردو ترجمہ) لکھی۔اس ترجمہ میں اردو کی بہ نسبت فارسی طرز انداز غالب ہے لیکن ترجمہ رواں ہے۔نمونہ عبارت ملاحظہ ہو۔

''جب تاج الملوک سے ان ناعاقبت اندیشوں نے گل بکاولی چھین لیا اور وہ بےچارہ دل میں پیچ وتاب کھا کر رہ گیا۔مثل ہے کہ ''قہر درویش بجان درویش'' پھر کج فہموں کے پیچھے پیچھے بعد چند روز کے اپنے باپ کی سرحد میں آیا۔ایک جنگل جو درختوں کا مسکن تھا اس میں جا پہنچا اور چقماق سے آگ جھاڑ کر حمالہ کے دیئے ہوئے بال کو اس پر رکھ دیا۔چوتھائی بھی نہ جلا ہوگا کہ وہ اٹھارہ ہزار دیوؤں سمیت آ پہنچی اور تاج الملوک کو فقیروں کے بھیس میں دیکھ کر آگ بہ گئی کہ اے شہزادے میری بیٹی کو کیا کیا اور تو نے خاص کیا بنایا۔تاج الملوک بولا کہ آپ کی توجہ سے سب خیریت ہے لیکن ایک کام مجھے نہایت ضروری ہے اور اس کی تدبیر مجھ سے نہیں ہو سکتی اس واسطے آپ کو تصدیع دی ہے۔حمالہ نے کہا کہ اے عیار باتیں نہ بنا وہ کون کام ہے جلدی کہہ۔تاج الملوک نے عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں ایک محل اور باغ کہ ہوبہو بکاؤلی کے قصر اور باغ سا ہو بناؤ۔تم جس طرح جانو جلد بنوا دو۔وہ بولی اے بیٹا یہ کتنی بڑی بات ہے مگر میں نے اس باغ اور عمارت کو دیکھا نہیں بھلا بن دیکھے مکان کا نقشہ کس طرح بناؤں اور بنوا دوں۔تاج الملوک بولا جس طرح میں کہوں اسی طرح بنوا دو۔حمالہ نے اسی وقت کئی سو دیو لعل بدخشانی کے اور سینکڑوں عقیق یمانی کے لیے اور ہزاروں روپے اور جواہر بیش قیمت کے واسطے ہر چہار طرف بھیجے۔دیوؤں نے تین روز کے عرصہ میں جواہرات وغیرہ کے جا بجا تو دے لگا دیئے پھر شہزادہ جس طرح بتانے لگا اسی طرح وہ بنائے گئے۔پہلے تو دو، دو نیزے مٹی کھود کر پھینک دی اور وہاں زر خالص بھر دیا اور اس قطعہ طلائی پر جڑاؤ عمارتوں کی بنا ڈالی۔غرض تھوڑے دنوں میں ویسا ہی قصر اور اس طرح کا باغ جواہر نگار جڑاؤ بہترین درختوں سمیت اور زبرجد اور یاقوت کے دو دالان عالیشان آمنے سامنے بیچ میں ان کے ایک حوض مرصع اسی قطعہ کا گلاب سے معمور بنایا پھر ایک مکان میں فرش اسی رنگ کا بچھوایا۔حاصل یہ کہ جتنا جواہر سونا دیو لائے تھے اس میں سے آدھا مکانات کے بنانے میں خرچ ہوا۔چوتھائی کارخانہ جات کی تیاری کو دے دیا اور باقی خزانہ میں داخل کیا۔''۲۱؎

مرزا لطف علی بہ معروف مظہر علی خان ولا نے قصہ مادھونل وکام کندلا (موتی رام کبیشر کی برج بھاشا کا ترجمہ) ہفت

گلشن (ناصر علی خان بلگرامی کی فارسی تصنیف کا ترجمہ) بیتال پچیسی (صورت کیشر کی بیتال پچیسی بھاشا کا اردو ترجمہ) تاریخ شیر شاہی (فارسی تاریخ کا اردو ترجمہ) لکھی۔ شیخ حفیظ الدین نے ''خرد افروز'' (شیخ ابوالفضل علامی کی کتاب عیار دانش کا اردو ترجمہ) جبکہ للو لال جی نے ''لطائف ہندی، اور سنگاسن بتیسی'' لکھی۔ بینی نارائن۲ے جہاں نے ''چار گلشن'' عشقیہ داستان لکھی اور ایک تذکرہ تالیف کیا نیز ''تنبیہ الغافلین'' مصنفہ مولوی شاہ رفیع الدین کا اردو ترجمہ بھی کیا۔ ''چار گلشن'' سلیس اردو نثر میں لکھی گئی داستان کا نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

> ''زمانہ گذشتہ کے نقل کرنے والوں اور ایام سلف کے قصہ کہنے ہاروں نے ان نادر قصوں اور عجیب حکایتوں کے گوہر آبدار کو رشتہ بیان میں اس طرح منسلک کیا ہے کہ بیچ بلاد خجستہ بنیاد وسعت آباد ہندوستان جنت نشان کے شہروں سے کسی شہر میں ایک بادشاہ جم جاہ نہایت عالیشان والا دودمان تھا۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے شان و شوکت اور جاہ و حشمت اس کو اس قدر عطا فرمائی تھی کہ اس زمانہ میں کوئی دوسرا بادشاہ اس کی برابری نہ کر سکتا تھا اور اس کے داب و رعب کے آگے پاؤں رستم کا بھی نہ ٹھہر سکتا تھا بہت فلک مرتبت تھا۔ وہ کیوان شاہ رو مشعل فروز اس کے تھے۔ مہر و ماہ ایک دن وہ بادشاہ قلعہ کے جھروکے میں بیٹھا ہوا دریا کی سیر کر رہا تھا۔ بہت آدمی اپنے اپنے کاروبار میں مشغول ہو رہے تھے گزارے کی کشتیاں آدمیوں سے بھری ہوئیں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتی جاتی تھیں۔''۳ے

مرزا علی لطف نے ''تذکرہ گلشن ہند'' مولوی امانت اللہ شیدا نے ہدایت الاسلام، ترجمہ قرآن مجید، جامع الاخلاق (اخلاق جلالی کا اُردو ترجمہ) خلیل خان اشک نے ''داستان امیر حمزہ'' اور مولوی اکرام علی نے ''اخوان الصفا ہندی'' (عربی کی مشہور اخلاقی کتاب اخوان الصفا کا ترجمہ) لکھی۔۴ے ان تمام انشا پردازوں کی پچاس سے زائد کتب کالج کے مطبع سے شائع ہوئیں جو اردو ٹائپ کا پہلا مطبع تھا فورٹ ولیم کالج کے تحت لکھی جانے والی نثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے والوں نے ابلاغ کے مقصد کو اولین ترجیح دیتے ہوئے سلیس اور آسان نثر کا خاص طور سے خیال رکھا۔ اس کے لیے انہوں نے مرصع فارسی اسلوب کو ترک کیا اور سلیس اردو نثر کو اپنا اسلوب بنالیا کیونکہ جتنی بھی کتابیں قصہ و کہانی، علمی، مذہبی، اخلاقی، تاریخ، تذکرہ کی اس کالج میں لکھی گئیں ان تمام میں روزمرہ محاورہ کا خاص خیال رکھا گیا۔ جس سے لوگوں کو اردو روزمرہ لکھنے کا سلیقہ آیا یوں اردو نثر کی بہت خدمت ہوئی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا بھی یہی کہنا ہے: ''فورٹ ولیم کالج کے مصنفین شعوری سطح پر فارسی اسالیب کے آرائشی قرینے سے دور رہتے ہوئے نئی نثر میں آرائشی اسلوب، استعارے کے استعمال اور قافیہ کی کھنک سے گریز کرتے

ہیں۔ پرانے نثری اسلوب پر اگر آرائش لفظی کا دباؤ تھا تو فورٹ ولیم کالج کے جدید اسلوب پر سادگی اور سلاست کا دباؤ تھا''۵؎ پھر یہ بھی کہ پہلی بار اس کالج کے توسط سے اردو داستانوی نثر کا سرمایہ کثیر تعداد میں ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر طیبہ خاتون فورٹ ولیم کالج کے اس دور کو داستانوی عہد سے تعبیر کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''ترجمہ کی ہوئی داستانیں عربی وفارسی سے ہندوستانی سانچے میں ڈھلنے لگی تھیں اور بیش قیمت تہذیبی سرمایہ بنتی چلی جارہی تھیں اس زمانے کی نثر کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے۔داستانوں کی اس وقت اتنی افراط تھی کہ اسے داستانوی عہد سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔یہاں تک کہ زبان سے لے کر خیال تک ہر جگہ خوبیاں اور خامیاں بھی داستانوں ہی کی پائی جاتی ہیں۔''۶؎

غرض فورٹ ولیم کالج ہی وہ بنیادی کڑی ہے جس نے اردو نثر کو فارسی نثر کے غلبے سے نہ صرف آزاد کرایا بلکہ اس میں تخلیقی امکانات کی وسعت اور گنجائش کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا۔نیز اسلوب کی سطح پر نئے تجربے کا آغاز کیا جو اس وقت کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جس سے اردو نثر کو مزید ترقی ملی۔اسی زمانہ میں لکھنؤ میں انشاءاللہ خان انشاء نے خالص اردو نثر میں ''داستان انشاء''یعنی رانی کیتکی اور کنورے اودے بھان کی کہانی آسان اور عام فہم زبان میں لکھی جس میں ایک بھی لفظ عربی فارسی کا نہیں آنے دیا۔مولوی اسماعیل شہید نے رسوم بد اور بدعات کے رد میں کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے علاوہ رسالہ توحید، صراۃ مستقیم، تنویر المعینین وغیرہ لکھیں۔سید الاعظم علی اکبر آبادی نے ''سکندر نامہ'' کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ''فسانہ سرور افزاء'' تصنیف کیا۔

انیسویں صدی میں اردو نثر میں سادگی کا چلن عام ہوا۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ پر تکلف مقفی و مسجع اسلوب نثر بھی موجود رہا۔اس ضمن میں لکھنؤ میں لکھی جانے والی کتب اور تراجم دیکھے جاسکتے ہیں جن میں نواب فقیر محمد خان گویا نے ''انوار سہیلی'' کا اردو ترجمہ ''بستان حکمت'' کے نام سے کیا۔مرزا رجب علی بیگ سرور کی ''فسانہ عجائب'' سرور سلطانی (شاہنامہ فردوسی کے ملخص شمشیر خانی کا ترجمہ) اور دو مختصر قصے ''شرر عشق'' ''شگوفہ محبت'' لکھے۔گلزار سرور (فارسی کتاب حدائق العشاق کا اردو ترجمہ) مجموعہ خطوط بعنوان ''انشائے سرور'' کے علاوہ ''الف لیلہ'' کے چند قصوں کا ترجمہ ''شبستان سرور'' کے نام سے لکھا۔رجب علی بیگ سرور کے ہاں قدیم اسلوب یعنی مقفی و مسجع عبارت آرائی ملتی ہے۔جس میں عربی فارسی تراکیب و تشبیہات واستعارات کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا ہے بالخصوص ''فسانہ عجائب'' کو لکھنؤ کی زبان میں بڑے خوبصورت اور

دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

> ''گرہ کشایان سلسلہ سخن وتازہ کنندگان فسانہ کہن یعنی محرران رنگین تحریر ومورخان جادو تقریر نے اشہب جہندہ قلم کو میدان وسیع بیان میں باکرشمہ سحر وساز ولطیفہ ہائے حیرت و پرواز گرم عنان و جولان یوں کیا ہے کہ سرزمین ختن میں ایک شہر تھا سینوسواد، بہشت نژاد و پسند خاطر محبوبان جہاں، قابل بود و باس غرباں زماں شمیم صفت، اس کی معطر کن دماغ جان، مسکن التہاب قلب دافع غم ہستان۔ زمین اس کی رشک چرخ بریں رفعت وشان چشمک بلندی، فلک ہفتمیں گل کوچہ، خجلت وہ گلشن آبادی، گلزار ِبستان تختہ چمن، بازار ہر ایک بے آزار، مصفا ہموار، دکان نفیس مکان نازک پائیدار، خلق خدا باخاطر شاد اسے فسحت آباد کہتی تھی۔''۷۷

اسی عہد میں نیم چند کھتری نے ''قصہ گل باصنوبر'' مولوی قطب الدین دہلوی نے ''مظفر جلیل'' (ترجمہ حصن حصین از شمس الدین محمد دمشقی) ''مظاہر حق'' (ترجمہ مشکوۃ المصابیح)، سید فدا حسین نے ''تاریخ افغانستان'' سید باقر حسینی نے عجائب القصص اور مفتی سعد اللہ نے فقہ اکبر کا ترجمہ کیا۔ سید فضل علی نے ''مفید الاجسام'' مولوی کریم الدین اور مسٹر فیلن کا تذکرہ ''طبقات الشعرائے ہند'' انشاء اللہ خان انشاء کی ''دریائے لطافت'' سرسید احمد خان نے ''آثار الصنادید'' امام الدین طالب نے ''تقویت الشعراء'' شیخ احمد علی نے ''حملاتِ حیدری'' (جنگ نامہ نواب حیدر علی والیٔ میسور کا ترجمہ)، یوسف خان کمبل پوش نے ''تاریخ یوسفی'' (سفرنامہ انگلستان) اور سید ابن درویش نے ''مطلع القمرین فی احکام العیدین'' لکھی۔

انیسویں صدی میں ایسے یوروپین مصنفین بھی ملتے ہیں جنہوں نے اردو قواعد ولغات کی صورت میں بالواسطہ اور بلاواسطہ اردو نثر کے ارتقا میں اپنا حصہ ڈالا۔ ان میں ڈاکٹر گلکرسٹ جنہوں نے ''انگریزی ہندوستانی لغت، ہندوستانی علم اللسان، مشرقی زبان دان، ہندی کی آسان مشقیں، رہنمائے اردو، عملی خاکے، اتالیق ہندی، ہندی عربی آئینہ، مکالمات انگریزی و ہندوستانی، مشرقی قصے وغیرہ لکھے۔ کپتان ٹامس روبک نے ''لغت جہاز رانی'' اور ''ترجمانِ ہندوستانی'' لکھی۔ جان شیکسپیئر نے اردو لغت ''منتخبات ہندی'' جبکہ ولیم ٹیسٹ نے ''مقدمہ زبان ہندوستانی'' لکھی۔

اردو نثر کے ارتقا میں فورٹ ولیم کالج کی طرح ''دہلی کالج'' کی ادبی خدمات کو بھی کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ دہلی کالج ۱۸۲۵ء میں قائم کیا گیا۔ فورٹ ولیم کالج نو وارد انگریزوں کی تعلیم اور ان کو اردو زبان اور ہندوستان کی معاشرت سے روشناس کرانا تھا جس کا مقصد بہتر حکمران بن کر ہندوستانیوں کو اپنا ماتحت بنانا تھا۔ جبکہ دہلی کالج کا مقصد

ہندوستان کے عوام کو جدید انگریزی علوم و تصورات سے متعارف کرانا تھا یا بالفاظ دیگر انگریز سرکار کے لیے بہتر ماتحت عملہ تیار کرنا تھا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اول الذکر خواص کے لیے اور موخر الذکر عوام کے لیے قائم کیا گیا لیکن دونوں کے مقاصد سیاسی تھے۔ گویا دہلی کالج انگریزی تصورات اور علوم کی تربیت گاہ تھا۔ یہ ایسی سرکاری تعلیمی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا علم و ادب ایک ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ کالج کا ذریعہ تعلیم بھی چونکہ اردو تھا اس لیے اردو نثر کی ترقی و نشو و نما میں اس نے اہم کردار ادا کیا۔ اس ادارے کے توسط سے ہونے والے تراجم نے اردو زبان و ادب کو مغربی خیالات کے اثرات سے روشناس کرایا۔ یہاں ہونے والے سائنسی تراجم نے مغربی علوم کی ترویج و اشاعت بھی کی اور ساتھ ہی نئی فنی اور ادبی اقدار کو وجود میں لانے کا باعث بھی بنے۔ یوں اس پلیٹ فارم سے اردو نثر کے دامن کو مزید وسعت اور ترقی ملی۔ یہ اس کالج کے اساتذہ اور طلباء ہی کی مرہون منت ممکن ہوسکا جن میں مسٹر ٹیلر، ڈاکٹر اشپرنگر، مسٹر کارگل، مسٹر فلیکس بوتروس، امام بخش صہبائی، ماسٹر چمن لال، ماسٹر رامچندر، مولوی کریم الدین، مولوی ذکاء اللہ، میر اشرف، ماسٹر حسینی، سبحان بخش، مولوی مملوک علی، ماسٹر امیر علی، مولوی احمد علی، مولوی ضیاء الدین، ماسٹر پیارے لال آشوب، رام کرشن، مدن گوپال، دھرم نرائن، پنڈت سروپ نرائن، شیو نرائن، مولوی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، موہن لعل کشمیری، پنڈت من پھول اور میر ناصر علی وغیرہ کالج کے اہم مصنفین میں شمار کیے جاتے ہیں اس اعتبار سے یہی وہ ادارہ تھا جہاں مغربی و مشرقی علوم اور تہذیب کی اعلیٰ اقدار کو ملایا اور فروغ دیا گیا کیونکہ اس میں معاشرتی مسائل، سائنسی علوم اور ادب و حکمت کے موضوعات پر آزادہ روی سے بحث و نظر کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس حوالے سے مولوی عبدالحق کا کہنا بالکل بجا ہے۔

> ”یہ ہی وہ پہلی درسگاہ تھا جہاں مغرب و مشرق کا سنگم قائم ہوا۔ ایک ہی چھت کے نیچے ایک ہی جماعت میں مشرق و مغرب کا علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھایا جاتا تھا۔ اس میلاپ نے خیالات کے بدلنے معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں جادو کا سا کام کیا اور ایک نئی تہذیب اور نئے دور کی بنیاد رکھی اور آپ نئی جماعت ایسی پیدا کی جس سے ایسے پختہ، روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔“[۸۷]

”قرآن السعدین“ کے نام سے کالج کا باتصویر مجلّہ جاری کیا گیا۔ بعد ازاں ماسٹر رامچندر نے ”محبّ ہند“ اور ”فوائد الناظرین“ جیسے رسائل بھی شائع کیے جن میں سائنسی معلومات فراہم کرنے پر زور دیا جاتا تھا۔ ان علمی و ادبی رسائل

نے طلبہ اور عوام الناس میں ادبی اور اخباری ذوق کو بھی پروان چڑھایا اور فروغ دیا۔ پھر اس کالج میں ''ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی (۱۸۴۳ء) بھی قائم کی گئی۔ جس کا مقصد اردو نثر میں جدید سائنسی، تکنیکی، علمی و ادبی علوم کا ترجمہ کرنا اور طلباء کو نئے نئے خیالات اور جدید اصطلاحات سے مانوس کرانا تھا۔ گویا اس کالج میں اردو نثر متعدد موضوعات سے روشناس ہوئی۔ اس سوسائٹی کا ایک اور مقصد انگریزی، سنسکرت، عربی اور فارسی زبان کی اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ترجمہ دیسی زبانوں میں کرنا اور درسی کتب کی تیاری تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس مجلس ترجمہ نے کالج کے طلباء کے لیے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے کیے۔۷۹ اس مجلس کے ترجموں اور تالیفوں کی تعداد تقریباً سو،سوا سو ہے۔ یہ کتابیں تاریخ، جغرافیہ، اصول قانون، ریاضیات، کیمیا، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، معاشیات، عضویات، نباتات جیسے علوم وفنون پر مشتمل نظر آتی ہیں۔۸۰ اس ورنا کیولر سوسائٹی کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے اطراف و جوانب میں انگریزی سے کتابیں اردو میں ترجمہ ہونا شروع ہوئیں۔ اس عہد کے لحاظ سے دہلی کالج کا یہ بڑا اہم کارنامہ تھا جو ایک تحریک کی صورت میں نظر آتا ہے جس سے اردو زبان کو بطور علمی زبان کے اردو نثر میں استعمال کیا اور خالص علمی نثر کو فروغ دیا گیا جو اس سے قبل بالکل مفقود تھی۔ اس حوالے سے دلی کالج کی مطبوعات کا احاطہ کریں تو احساس ہوتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں کتنے ہی متنوع موضوعات اہل ہند کی علمی دسترس میں اس کالج کے توسط سے آگئے تھے۔ ان میں ولیم میکناٹن کی قانون کی کتابیں، قانون محمدی، وراثت وفوجداری، ہندو قانون کے اصول اور اصول قوانین، عجائب روزگار، تذکرہ کاملین اور جبر و مقابلہ کی کتب تالیف ہوئیں مثلاً اصول علم ہیئت، اصول علم مثلث بالجبر، علم ہندسہ بالجبر، تراش ہائے مخروطی وغیرہ۔ تاریخ کو عالمی تناظر میں پرکھنے کے لیے تاریخ ہند، تاریخ اسلام، تاریخ ایران، تاریخ یونان وروما، تاریخ خاندان مغلیہ، تاریخ کشمیر، سوانح رنجیت سنگھ، تاریخ میسوری وغیرہ لکھی گئیں۔ ادبی قصوں میں کلیلہ و دمنہ، قصہ چہار درویش، جامع الحکایات، تاج الملوک و بکاولی، بدر منیر، شکنتلا، کے علاوہ تذکرہ ہندو شعراء، سودا، میر درد اور جرأت کے دواوین اور انتخاب الف لیلیٰ وغیرہ شائع ہوئیں۔ اردو لغت اور قواعد کی کتابوں میں ''محاورات اردو چشمہ فیض اور صرف ونحو انگریزی اہم کتابیں ملتی ہیں۔

فورٹ ولیم کالج اور دلی کالج کی خدمات سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں اول الذکر نے اردو نثر نویسی کے رواج کو فروغ دیا وہیں موخر الذکر نے تراجم کی روایت کو پروان چڑھایا۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے اسی دور میں اردو اخبارات ''جام جہاں نما'' (۱۸۲۲ء) کلکتہ، دہلی اردو اخبار (۱۸۳۶ء) دہلی اور ''سید الاخبار'' (۱۸۳۷ء) دہلی سے اردو صحافت اور مطابع نے

با قاعدہ اردو نثر کے فروغ اور ارتقا میں اپنا کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ۱۸۳۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے اردو کو سرکاری اور عدالتی زبان قرار دے دیا۔ جس کے نتیجہ میں بہت سی قانونی کتابوں کے اردو تراجم کرائے گئے۔ عدالتوں اور دفتروں میں عدالتی دستاویزات ریکارڈ اردو میں تیار ہونے لگے۔ ان مقاصد کے لیے اردو زبان میں اصطلاحات وضع کی گئیں۔ چنانچہ وہ مقام جو پہلے فارسی کو حاصل تھا اب انگریزوں کے ہاتھوں اردو کو مل گیا۔ احسن مارہروی لکھتے ہیں: ''۱۸۳۵ء/۱۲۵۱ھ میں اردو ملکی اور دیسی زبان تعلیم ہو کر فارسی کی جگہ سرکاری دفاتر میں تھوڑی بہت لکھی جانے لگی تھی اور عموماً سرکاری سمن اور پروانے اور اکثر تجاویز واحکام اردو میں تحریر ہونے لگے تھے۔''۸۱

انیسویں صدی کے نصف اول ہی میں تقریظ و تنقید، مقدمہ و دیباچہ اور رقعات و خطوط کے ادبی دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مرزا اسداللہ خان غالب پیش پیش نظر آتے ہیں۔ غالب کے خطوط کے مجموعے 'عودِ ہندی' ''اردوئے معلیٰ'' چند کتابوں پر تقریظیں اور مختصر رسائل ''لطائف غیبی'' ''تیغ تیز'' ''نامہ غالب'' اس وقت کی اردو نثر کا بہترین نمونہ اور غالب کی شخصیت اور ان کے خاص رنگ کا آئینہ ہیں۔ یہ اردو نثر کی خوش قسمتی ہے کہ اسے مرزا غالب جیسا صاحب طرز فنکار ملا۔ جس نے اپنی اردو مکتوب نویسی میں سادگی کو پرکاری بنا دیا اور بے تکلفی کا خاص وصف عطا کرتے ہوئے مراسلے کو مکالمہ بنایا۔ یوں غالب کے ان خطوط نے طرز مکتوب نگاری کو یکسر بدل ڈالا۔ غالب نے اردو نثر میں اپنی کوئی با قاعدہ تصنیف یادگار نہیں چھوڑی۔ لیکن ان کے اردو خطوط۸۳ نے اردو نثر کی دنیا ہی بدل کر رکھ دی۔ جہاں یہ خطوط تاریخی و دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں وہیں ان میں ادبی موضوعات اور جدید اصناف نثر اور ان کے اسالیب کے ابتدائی نقوش کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

اردو نثر کے پیش کردہ اس کل ادبی سرمایے سے یہ بات بخوبی عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو زبان ۱۸۵۰ء سے قبل کیسے ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے علمی و ادبی زبان کا درجہ اختیار کر رہی تھی جس میں ہندو مسلم ادیب برابر کے شریک رہے۔ بعد ازاں اس سلسلہ کو سرسید احمد خان کی تحریک۸۴ نے آگے بڑھایا اور مزید تقویت دی۔

غرض جہاں اولیاء کرام سے لے کر غالب تک اردو نثر میں مذہبی، علمی، تنقیدی، تاریخی، سائنسی اور ادبی موضوعات کا تنوع دکھائی دیتا ہے وہیں پر رنگا رنگ اسالیب نثر (سلیس رواں، عمدہ، شستہ، عام فہم، قافیہ بند، نئی تراش خراش، عبارت کی رنگینی، فارسی کا تتبع، مقفّیٰ و مسجع عبارت آرائی اور سادگی) بھی وجود میں آئے۔ جنہوں نے اردو نثر کے فروغ اور ارتقا کے عمل کو

خوش اسلوبی سے جاری وساری رکھا۔

۱۸۵۰ء تک تاریخ ادب کا مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ہر چند اردو نثر کا آغاز ہو چکا تھا اور یہ بتدریج ارتقا کے مدارج طے کر رہی تھی لیکن ساتھ ہی تحقیق سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اردو کے مقابل فارسی زبان کو ہی علمی و ادبی سطح پر اہمیت دی جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ اردو کی کسی طبع زاد تصنیف کی بجائے فارسی سے اردو تراجم کی تعداد کثیر ہے۔ دوسرے یہ کہ نثر سے زیادہ اب بھی اظہار بیان کے لیے شاعری کا پیکر ہی استعمال کیا جا رہا تھا۔

ج) پنجاب میں اُردو نثر کے ابتدا آثار:

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو زبان کی بابت کیسی سچی بات کہی ہے!

> ”پنجاب اور اہل پنجاب سے اس زبان کا رشتہ ناتا روز ازل ہی سے قائم ہے اور اہل پنجاب نے شروع ہی سے اس زبان کو بنانے سنوارنے میں حصہ لیا ہے وہ زبان جو عبوری دور میں دہلی سے دکن، گجرات، مالوہ اور دوسرے صوبوں میں پہنچی اس کی ساخت اس کے مزاج لہجے اور آہنگ پر پنجاب ہی کا اثر سب سے زیادہ اور گہرا تھا۔ قدیم گجری و دکنی ادب کے نمونوں میں جب ہم پنجابی اثر و مزاج کو دیکھتے ہیں تو ذرا دیر کو حیرت ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری حیرت اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ہم اردو اور پنجاب کے اثر و رشتہ کو تاریخ کی روشنی میں دیکھ کر ان نمونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔“ ۸۵؎

دہلی، حیدر آباد اور لکھنؤ کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا اہم مرکز پنجاب رہا ہے جس میں لاہور سر فہرست ہے۔ عہد غزنوی ہی سے یہاں پر علم و ادب کی سرگرمیاں بھرپور انداز میں نظر آتی ہیں۔ مسلمان فاتحین اپنے ہمراہ عربی اور فارسی زبانیں لے کر آئے۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق فاتح اور مفتوح کی مقامی زبان کے اختلاط سے ایک نئی زبان ”اردو“ ۸۶؎ کا ابتدائی ہیولا تیار ہوا جو بول چال کی سطح پر تھا جبکہ علمی و ادبی زندگی کے طور پر فارسی کا رواج ہوا۔ چنانچہ لاہور میں فارسی نثر کی روایت کا آغاز عہد غزنوی ہی میں ابی الحسن بن عثمان الجلابیؒ المعروف داتا گنج بخش کی ”کشف المحجوب“ سے ہوتا ہے۔ یہیں سے تاریخ اور تذکرہ کی ابتدا بھی ہو جاتی ہے۔ ابو ریحان البیرونی ۸۷؎ نے ہندوؤں کے فلسفہ، مذہب اور تہذیب کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد ”تاریخ الہند“ پنجاب ہی میں لکھی۔ شعراء میں ابو عبداللہ روزبہ بن عبداللہ النکتی اللہوری، مسعود سعد سلمان لاہوری، مسعود

رازی، ابوالفرج رونی وغیرہ نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آل غزنہ کی تقریباً پونے دوسو سال حکومت میں لاہور ایک بارونق اسلامی شہر اور مرجع علم وفضل وادب بن گیا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ پنجاب میں مسلمان فاتحین اوران کے ہمراہیوں کی آمد کے بعد مقامی آبادی کے باہم میل جول سے نئی زبان اردو کا وجود عمل میں آیا۔ پنجاب پانچ دریاؤں کی سرزمین ہونے کے ناطے ابتدا سے ہی انتہائی زرخیز خطہ رہا ہے اور یہاں کے باشندے خوب محنتی اور کڑیل جوان تھے اسی لیے یہ بیرونی حملہ آوروں کی توجہ کا مرکز رہے۔ ''خطہ پنجاب کے باشندے اپنے قد وقامت اور طبعی جرأت کی بناء پر فوجی خدمات کے لیے بے حد موزوں اور مناسب تھے اس لیے سلطان محمود نے جو فوج ہندوؤں سے منتخب کی وہ تمام پنجابی تھی۔ اس کے جانشین بھی پنجابی فوجیں رکھتے تھے''۸۸؎ اس میل جول سے نئی زبان کی ساخت پرداخت اور نشو ونما میں یقیناً تیزی آئی ہوگی اور غالباً اس کا آغاز پنجاب کے دارالحکومت لاہور ہی سے ہوا ہوگا۔ بقول ڈاکٹر گوہر نوشاہی: ''غزنوی عہد کو اردو زبان کی پیدائش کا زمانہ کہا جا سکتا ہے اور اس کی پیدائش کا علاقہ پنجاب اور خاص کر لاہور تسلیم کیا جا سکتا ہے''۸۹؎

بالخصوص لاہور جو بطور دارالحکومت کے فاتحین کا مستقر رہا۔ یہاں بھی اس زبان کو پہلے پہل صوفیاء اور علماء نے اپنایا ہوگا جو کہ واعظ اور تبلیغ کا ایک وسیلہ رہی ہوگی۔ صوفیاء کی تبلیغی سرگرمیوں سے دین اسلام کا پھیلاؤ ہوا۔ چنانچہ لسانی روابط مذہب کے پھیلاؤ، تہذیب وتمدن اور سیاسی سطح پر ظہور میں آئے۔ پنجابی اور فارسی کی باہمی آویزش سے جو زبان یا بولی اختیار کی گئی وہ اردو زبان ہی ہوگی۔ اغلب ہے کہ حضرت داتا گنج بخش، شیخ اسماعیل لاہوری، شاہ یوسف، فخر الدین حسین زنجانی لاہوری، سید احمد توختہ ترمذی لاہوری، سید یعقوب زنجانی لاہوری، سید عبدالرزاق مکی، پیر مکی، حضرت سید میٹھا لاہوری، میراں بادشاہ، شاہ عبدالجلیل چوہڑ بندگی، شیخ ابواسحاق المشہور موج دریا بخاری، شاہ ابوالمعالی قادری، شیخ طاہر بندگی، حضرت میاں میر، خواجہ خاوند محمود المشہور حضرت ایشان نقشبندی، شاہ چراغ گیلانی، شیخ محمد اسماعیل لاہوری المشہور میاں وڈا، شاہ شمس الدین قادری، شیخ سعدی بلخاری لاہوری، شاہ محمد غوث قادری، شیخ حامد قادری اور مولانا علاء الدین وغیرہ نے بھی اسی زبان کو استعمال کیا ہوگا لیکن بدقسمتی سے ہمیں ان بزرگان دین کی فارسی کے علاوہ کوئی ایسی باقاعدہ تصنیف نہیں ملتی جو اردو نثر میں ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس دور میں لکھی گئی فارسی کتب میں اردو کے الفاظ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔۹۰؎

فارسی شاہی، دفتری اور کتابی زبان تھی جبکہ عوام الناس میں بول چال کی زبان اردو تھی۔ یہاں تک کہ فارسی کی قدیم لغات میں بھی فارسی الفاظ کی شرح میں اردو مرادفات کو بھی درج کیا جاتا رہا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے فخر الدین مبارک کے ''فرہنگ نامہ'' کے علاوہ اس کے تتبع میں لکھی گئی فارسی لغات کی ایک فہرست درج کرتے ہوئے مذکورہ لغات سے اردو الفاظ کے نمونے بھی پیش کیے ہیں ۹۱۔ اس حوالے سے جو استدلال پیش کرتے ہوئے نتیجہ اخذ کرتے ہیں وہ درست معلوم ہوتا ہے:

> ''یہ فرہنگ نگار جس چیز کو ہندی کہتے ہیں وہ نہ برجی ہے نہ پنجابی، نہ راجستانی اور نہ بنگالی و گجراتی، ہندی سے ان کی مراد یہی اردو ہے جو اس عہد کے مسلمانوں میں بالعموم رائج تھی ـــ فرہنگ نویس باوجودیکہ مختلف مقامات ہند سے تعلق رکھتے ہیں کوئی مالوہ کا ہے۔ کوئی بنگالہ کا اور کوئی پنجاب کا جہاں مختلف زبانیں بولی جارہی ہیں اور ان لوگوں کا اپنے اپنے وطن کی زبانوں سے واقف ہونا بھی لازمی ہے لیکن اپنے لغات میں وہ وطنی زبانوں کے الفاظ نہیں دیتے بلکہ اسی عام زبان کے جو تمام ملک کے مسلمانوں میں مشترک ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ الفاظ ان تمام لغات میں عام ہیں'' ۹۲

پنجاب میں اردو نثر کا قدیم ترین فقرہ حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی یادگار ہے۔ جسے مقالہ ہذا کے باب دوم میں بیان کیا گیا ہے۔ اردو زبان کا لسانی اشتراک دو سطحوں پر نظر آتا ہے۔ پہلا عربی فارسی کے ساتھ دوسرا پنجابی کے ساتھ جو اردو سے بے حد مماثلت رکھتی تھی۔ حافظ محمود شیرانی کے نظریہ ''پنجاب میں اردو'' کے مطابق اس وقت جو زبان تیار ہوئی جسے آج اردو کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پنجابی زبان ہوگی۔ جسے مسعود سعد سلمان ''ہندوی'' اور امیر خسرو ''لاہوری'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ پنجابی اور اردو کے باہمی تعلق کو مدنظر رکھتے ہوئے پنجابی زبان کی تاریخ کی ابتدا پر نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ اردو میں تین حصے پنجابی اور پنجابی میں تین حصے اردو شامل ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ ساٹھ فی صد سے زائد الفاظ دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ پنجابی اور اردو صرف ونحو اور قواعد و مسائل میں بہت حد تک مماثلت و مطابقت پائی جاتی ہے ۹۳۔ اس ضمن میں شیر علی سرخوش مولوی عبدالحق کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''اردو کی سب سے پہلے قواعد کی کتاب جان شواکٹلر صاحب کے قلم سے مرتب ہوئی تھی اس کا متن اندازاً ۱۰ دسمبر ۱۷۱۱ء کو لاہور پہنچا تھا اور وہ دلی اور آگرہ سے بھی گزرا تھا۔ صاحب موصوف اس وقت کی زبان کو اپنے کانوں سن کر جن قواعد کو ترتیب دیتے ہیں اس میں فاعل کی علامت ''نے'' کا کچھ ذکر نہیں کرتے اسی طرح وہ ہم کی طرح آپ کو بھی جمع متکلم کی ضمیر بتاتے ہیں۔ ایسا ہونا تو ـــ ناگزیر تھا کیونکہ اردوئے قدیم پنجابی

ماخوذ ہے اور زبان پنجابی میں علامت فاعل یعنی "نے" حذف کی جاتی ہے مثلاً کہتے ہیں تو کیتا (یعنی تو نے کیا) اور اوس لکھیا وغیرہ اور آپاں جائیں گے جس میں آپاں جمع متکلم کی ضمیر ہے۔ جہلائے پنجاب میں اب تک مستعمل ہے۔ غالباً اس سے آپ جائیں گے بہ معنی ہم جائیں گے اردو میں وضع کیا گیا"۹۴

یہی وجہ ہے کہ پنجابی کو اردو کی ماں کہا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اردو زبان پنجابی کا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا روپ ہے۔ شیر علی کو خوش اسے ایک مثال سے کچھ اس طرح سمجھاتے ہیں:

"سلطان محمود غزنوی کے ساتھ جب ترک، ایرانی، عرب اور اہل سرحد وغیرہ مختلف اسلامی قومیں بکثرت یہاں درآئی ہوں تو ان کی بھانت بھانت کی بولیوں پر پنجابیوں ہی کے گلے حاوی ہوئے ہوں گے۔ خصوصاً غزنی اور کابل وغیرہ کی فارسی اور پشتونیوں کی زبانیں جب یہاں بولی جاتی ہوں گی تو اہل پنجاب ان کو اسی طرح سمجھنے کی کوشش کرتے ہوں گے جیسے کہ انگریزوں کے آنے پر ہماری چھاؤنیوں کے خانسامے، بیرے یورپین لوگوں کی بولیوں کو اپنے کانوں سن کر پہلے کچھ غلط ملط انگریزی الفاظ بولنے لگے پھر وہی غیر صحیح الفاظ ملک میں رائج ہو گئے۔ اسی طرح جب سرحدی افغان آمدہ ایست - دادہ ایست یا کردہ ایست وغیرہ بولتے ہوں گے تو اہل پنجاب ان کو آوندہ اے، ویندہ اے، کردہ اے وغیرہ سمجھ لیتے ہوں گے اور یہ سب الفاظ خالص پنجابی ہیں۔ پھر جب آوندہ اے سے آوتا ہے بنا تو یہ دکن میں استعمال کیا گیا۔ آخر دلی میں مزید اصلاح ہو کر یہ آتا ہے بن گیا اور اسی طرح ان دوسرے پنجابی الفاظ سے کرتا اور دیتا ہے وضع کیے گئے"۹۵

عمومی طور پر اس رائے کو اس بناء پر تقویت ملی کہ پنجابی اردو کا منبع و مخرج ہونے کی حیثیت سے قدرتی طور پر اس کے مماثل ہے۔ حمید احمد خان بھی اردو اور پنجابی کو دو مختلف نہیں بلکہ ایک ہی زبان قرار دیتے ہیں اور وہ زبان اردو ہے۔ بقول پروفیسر حمید احمد خان "قدیم اُردو حیرت انگیز حد تک پنجابی کی طرح معلوم ہوتی ہے"۹۶ لیکن شیر علی سرخوش کسی تامل کے بغیر کہتے ہیں "اول اول پنجابی اور اردو ایک ہی زبان تھی"۹۷ ڈاکٹر جمیل جالبی بھی سرخوش کی تائید میں لکھتے ہیں "قدیم اردو پنجابی میں ایک ایسی گہری مشابہت ہے کہ دور ہی سے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں ایک روپ علاقائی ہے اور دوسرا بین العلاقائی"۹۸ ایس ایم ناظر اپنے مضمون "اردو پنجابی" میں یوں رقمطراز ہیں "اردو دراصل منجھی ہوئی پنجابی زبان ہے اس کے افعال عموماً پنجابی ہیں مگر تھوڑی سی نفیس تبدیلی کے ساتھ لائے گئے"۱۰۰ چنانچہ اردو ہی وہ زبان ہے جو مسلمانوں کے ہمراہ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی گئی۱۰۱ اس نقطہ نظر سے دیکھیں تو خواجہ مسعود سعد سلمان، خواجہ فرید الدین

مسعود گنج شکرؒ، فرید الدین ابراہیم، گورونانک (گرنتھ صاحب جپ جی) امیر خسرو، کبیر داس، شیخ بہاؤ الدین باجن، شاہ حسین، شیخ عبدالقدوس گنگوہی، شاہ علی جیو گام گجراتی، شیخ خوب محمد چشتی، شیخ عثمان، شیخ بہاؤ الدین برناوی، مولانا افضل جھنجھانوی، محبوب عالم عرف شیخ جیون وغیرہ کے یہاں جو کلام ملتا ہے وہ اردو کے مماثل ہے۔ دوسرے الفاظ میں انہیں ہم اردو زبان کے ابتدائی نقوش قرار دے سکتے ہیں۔ مذکورہ احباب کے علاوہ دیگر شعراء جن میں حاجی محمد قادری المشہور نوشہ گنج بخش، رائے چندر بھان برہمن لاہوری، حضرت سلطان باہو، ناصر علی سرہندی، میر محمد صابر، خفیہ بیگم، میر علی اکبر حاجی لاہوری، شیخ ابوالفرح محمد فاضل الدین بٹالوی، سید بلھے شاہ، غلام قادر شاہ، فدوی لاہوری، مولانا محمد ابراہیم خوشدل، سید وارث شاہ، شیخ موسیٰ، اشرف نوشاہی، پیر مراد شاہ لاہوری، سکندر شاہ امداد لاہوری، غنیمت کنجاہی، دلشاد پسروری، فقیر سید نور الدین منور، مولوی احمد بخش یکدل اور دیوان امرناتھ اکبری جیسے شعراء کے کلام [۱۰۱] سے بالعموم پنجاب اور بالخصوص لاہور میں بولی جانے والی اردو زبان کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جو نثر میں بھی استعمال کی جاتی ہوگی۔

پنجاب کی چند قدیم دستیاب تصانیف جن میں ''مثنوی گلزار فقراء'' (۱۱۳۱ھ) از غلام محی الدین بن شیخ محمد یوسف، ''مثنوی رمز العشق'' [۱۰۲] (۱۱۵۱ھ سے قبل کی تصنیف) از غلام قادر ابن شیخ محمد فاضل شاہ بٹالوی، ''نامۂ مراد'' (۱۱۹۶ھ) مراد شاہ لاہور، ''گنج شہیداں'' (۱۱۹۸ھ) از غلام محمد غوث بٹالوی، ''مثنوی'' ''سر مکنون'' (۱۲۰۴ھ) از فقیر اللہ، ''مثنوی گلریز'' (۱۲۰۶ھ) از حافظ مرتضیٰ، ''ذوق الصبیان'' (۱۲۰۷ھ) از احسن اللہ لاہوری، ''مراد المحبین'' (۱۲۱۲ھ)، ''مثنوی مگس نامہ'' ''مثنوی موش نامہ'' از مراد شاہ لاہوری، ''بخشائش نامہ'' [۱۰۳] (۱۲۱۳ھ) از ملا احسن اللہ، ''واردات'' (۱۲۳۶ھ) از تحسین، ''مثنوی فتح الرمز'' (۱۲۵۰ھ) از صوفی شیخ نور محمد، اور حضرت قلندر شاہ کی ''حلیہ شریف'' کے علاوہ ''مثنوی عبداللہ ورادھا'' ''سسی پنوں''، ''جنگ سیالکوٹ'' اور ''رحمت شیریں فرہاد کا قصہ'' کا ذکر کیا جاتا ہے۔[۱۰۴]

مذکورہ تصانیف میں فارسی اور پنجابی کے ساتھ مل کر اردو زبان پورے پنجاب میں پھیل چکی تھی جو اول صوفیاء اور علماء کے ہاں نظر آتی ہے۔ جس سے بیرونی حملہ آور بھی بخوبی شناسا تھے۔ وہ محمود غزنوی ہو یا پھر مغلیہ سلطنت کا پہلا بادشاہ بابر جس نے ''تزک بابری'' میں کثرت سے اردو الفاظ ہاتھی، پان، پنکھا، جامن، کمرک، گلہری، مور، دوپہر، چرونجی، کیوڑا وغیرہ کے استعمال کے ساتھ اپنے ترکی دیوان میں اردو کے الفاظ وافعال کو استعمال کیا ہے۔ ذیل کا شعر جس میں پہلا مصرع واضح طور پر پڑھا جاسکتا ہے۔

مجکانہ ہوا کج ہوسِ مانک و موتی
فقرا بلیفہ بس بولفو سید ور پانی وروتی ۱۰۵

اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں اردو کا دیگر زبانوں سے لسانی اشتراک اس حد تک ہو چکا تھا کہ اردو زبان مشترک زبان کے طور پر مقبول رہی ہوگی۔ اکبرِ اعظم جس نے ۱۵۵۶ء - ۱۶۰۵ء تک ہندوستان پر حکومت کی اور اپنی زندگی کے چودہ پندرہ برس لاہور میں قیام کیا وہ بھی اس زبان سے بخوبی واقف تھا۔ اس کے حرم میں ہندو رانیاں اور دربار میں ہندو وزیر، مشیر بھی تھے۔ اغلب ہے کہ اس وقت فارسی درباری اور علمی زبان ہونے کے باوجود وہ اردو زبان کو بھی گفتگو میں استعمال کیا کرتا ہو۔ اس حوالے سے یہ واقعہ ملاحظہ ہو۔

''جب اکبر نے جہانگیر کی شادی راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے کی اور اکبرو جہانگیر دلہن کی پالکی خود اپنے کندھوں پر اٹھا کر لے چلے تو راجہ نے کہا:

ہماری بیٹی تمہارے محلوں کی چیری ہم باندگلام رے

اکبر نے برجستہ جواب دیا:

تمہاری بیٹی ہمارے محلوں کی رانی تم صاحب سردار رے'' ۱۰۶

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ اکبر نا خواندہ ہونے کے باوجود علم و ادب کا شیدائی تھا اس کے عہد میں فارسی کے ساتھ اردو شاعرانہ سطح پر ادبی زبان بن رہی تھی۔ اکبر نے مختلف زبانوں کے تراجم کے لیے باقاعدہ ایک ''دارالترجمہ'' قائم کیا تھا جس کے تحت بہت سی کتب کے تراجم کیے گئے۔ قیاس ہے کہ اردو نثر میں بھی کتابیں موجود ہوں گی۔ پھر یہ بھی اغلب ہے کہ اکبر کے قیام لاہور کے دوران اردو زبان میں نثر کی کتب بھی رہی ہوں اگر زمانے کے انقلابات سے اس عہد کی ہر چیز محفوظ رہتی تو آج اس عہد کی کوئی نہ کوئی مستقل اردو نثری تصنیف بھی موجود ہوتی۔ شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں اردو زبان فارسی کے مقابل مشہور و مقبول زبان بن گئی تھی۔ عہد جہانگیر میں اردو شاعری کے نمونے اس بات کی دلیل ہیں۔ خود جہانگیر کی اس زبان سے واقفیت کا پتہ اس کی ''تزکِ جہانگیری'' سے ہوتا ہے۔ جس میں اردو زبان کے الفاظ کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں۔ پھر شاہجہاں جس کا مولد ہی لاہور شہر ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اس زبان میں گفتگو نہ کرتا ہو۔ اس کے عہد میں ہونے والی شاعری میں اردو زبان کا بہترین رچاؤ ملتا ہے۔

یوں تو سرزمین پنجاب کے علماء کی کتب اور رسائل دستیاب ہو چکے ہیں جو عوام الناس کو دینی احکامات سے روشناس کرانے کے لیے تصنیف کیے گئے۔ یہ تمام تصانیف شاعری کی صورت میں نظم کی گئیں تا کہ آسانی سے یاد کی جاسکیں۔ اس ضمن میں جو کتب دستیاب ہو چکی ہیں ان میں عبدالوہاب بابو کا ''رسالہ مبتدی'' (۹۹۷ھ) ہے جو عہد اکبر میں تصنیف ہوا۔ عبدالوہاب بابو کے بیٹے عبداللہ بابو کی کتاب ''فرائض بابو'' بھی پنجاب کے دیسی مکتبوں میں بچوں کو یاد کرائی جاتی رہی ہے۔ ایسی کتب کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے جن میں مولوی عبداللہ لاہوری کی ''تحفۃ الفقہ'' (۱۰۲۵ھ)، ''رسالہ نص فرائض'' (۱۰۳۲ھ)، ''خلاصہ معاملات'' (۱۰۴۳ھ)، ''انواع العلوم'' (۱۰۴۴ھ) ''معرفت الٰہی''، ''خیر العاشقاں'' (۱۰۵۴ھ) ''نورنامہ'' (۱۰۵۴ھ) خیر العاشقین خورد (۱۰۵۸ھ) ''حصار الایمان'' (سن ندارد)، ''رسالہ فقہ ہندی'' (۱۰۷۴ھ)، ''مسائل فقہ''، ''نجات المومنین'' (۱۰۸۶ھ) ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

چونکہ بالعموم پنجاب اور بالخصوص لاہور میں اردو نثر میں لکھی گئی کوئی قدیم ترین تصنیف دستیاب نہیں اس لیے یہ جاننے کے لیے کہ اردو زبان کے بول چال کا وہ کونسا انداز ہوگا جس سے نہ صرف اس وقت اردو زبان کے مزاج کو سمجھ سکیں بلکہ اس کی نوعیت کو بھی جان سکیں تو اس کے لیے اردو نثر کی عدم موجودگی میں اس دور کی اردو شاعری کی طرف رجوع کریں گے کیونکہ نثر کے بجائے شاعری ہی دستاویزی سطح پر دستیاب ہوئی ہے جو مقبول و معروف بھی رہی۔ ہر چند کہ علمی وادبی سطح پر فارسی زبان کی اہمیت مسلمہ تھی لیکن اردو کا عوام الناس کی بول چال کی زبان کی سطح سے اٹھ کر ادبی سطح پر استعمال ہونا اول اول شاعری میں ہی ہوا۔ اس حوالے سے خطہ پنجاب کے شعراء کا کلام بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔

پنجابی جسے اردو کی ابتدائی صورت قرار دیا ہے پنجاب میں نصابی سطح پر بھی مدرسوں میں رائج نظر آتی ہے۔ عہد شاہجہاں میں لاہور میں اردو کے سب سے قدیم نصاب کے حوالے سے مولوی اسحاق لاہوری کے دو نصاب ''فرح الصبیان'' (۱۰۵۷ھ) کے نام سے ملتے ہیں جن میں اردو کے کثیر الفاظ موجود ہیں ۷؎ نصابی حوالے سے تصنیف و تالیف کا سلسلہ عہد عالمگیر کی اہم خصوصیت قرار پاتا ہے جو بعد ازاں سکھا شاہی دور تک قائم رہتا ہے۔ اس عہد میں بے شمار منظوم کتابیں بچوں کی تعلیم کے لیے لکھی گئیں۔ نصابی کتب کا ذریعہ تعلیم پنجابی زبان تھی جو کہ اردو زبان کی اصل ہے۔ اس حوالے سے درج ذیل رسائل کے نام ملتے ہیں جو بارہویں اور تیرہویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں ''رازق باری'' (۱۰۷۱ھ) ایک اور ''رازق باری'' (۱۰۸۵ھ) ''ایزد باری'' (۱۱۰۵ھ)، ''اللہ باری'' (۱۱۹۶ھ)، ''ناصر باری'' (۱۲۰۸ھ)، ''صنعت باری''

(۱۲۲۰ھ)، ''قادر باری'' (۱۲۲۳ھ) کے علاوہ ''واحد باری'' ''نصاب ضروری'' ''حمد باری'' ''خالق باری''۱۰۸ ''حامد باری'' ''صمد باری'' ''اعظم باری'' ''صادق باری'' وغیرہ جیسی نصابی کتب سے بھی اس وقت اردو کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مذکورہ کتب کی موجودگی سے احساس ہوتا ہے کہ پنجاب میں بچوں اور ناخواندہ افراد کی تعلیم کے انتظامات بہت بہترین تھے۔ وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو فارسی کے مقابل اپنی اہمیت منوانے کے قابل ہو چکی تھی۔ اسی لیے ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں ''اورنگ زیب عالمگیر کے طویل دورِ حکومت میں یوں معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان فارسی کی جگہ لینے کی تیاری کر رہی ہے۔ اس دور میں اردو زبان مدرسوں اور مکتبوں میں عام طور پر ذریعہ تعلیم بن جاتی ہے۔''۱۰۹

نصابی کتب کا یہ سلسلہ سکھا شاہی دور میں بھی نظر آتا ہے اس دور میں ایسی کتب بھی ہیں جن میں عربی فارسی کے ساتھ اردو زبان کے الفاظ بھی بکثرت استعمال ہوئے ہیں۔ اس حوالے سے حافظ احسن اللہ بن حافظ ہدایت اللہ بن حافظ عنایت اللہ لاہوری جو معلم ہونے کے ساتھ کاتب بھی تھے ان کی ''مفتاح الافوہ'' کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آسان اردو زبان میں ''ذوق الصبیان'' (۱۷۹۳ء/۱۲۰۷ھ)۱۱۰ میں بمقام لاہور تصنیف کی۔ حافظ محمود شیرانی کی وساطت سے ان کی اس تصنیف کے دیباچہ سے اشعار نقل کیے جا رہے ہیں جس سے اس وقت کی اردو بول چال اور اس میں الفاظ کے استعمال کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو بہت شگفتہ اور رواں ہے۔ کیونکہ یہی وہ زبان تھی جو عام بول چال میں رواں جملوں میں استعمال ہوتی ہوگی جو منظوم سطح پر اس صورت میں ہمارے سامنے آتی ہے جس سے اس کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ ''ذوق الصبیان'' کے دیباچہ کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

احسن نام اک عاجز بندہ ملاں کاتب، مہر کنندہ
احسن اللہ کی ہے یہ رعایت اس کی ہدایت اس کی عنایت
اس کا وطن لاہور نگر ہے کمتر، کہتر اور احقر ہے
اوس کی داتا خطا کو بخشے اوس کے ماتا پتا کو بخشے
کہاں ہیں یہ کیتیاں بیتاں فارسی عربی ہندی باتاں
لڑکے میرے پاس ہیں پڑھتے لوگ ہیں مجھ کو ملاں کہتے
آگے ایک کتاب لکھی ہے اس پر محنت بہت کی ہے

پر وہ بہت دراز و کلاں ہے — لڑکوں کی بھی ابھی کند زباں ہے
یہ آسان اور ہندی بولی — لڑکوں کو ایک کھیل ہے کھول
خوشی خوشی وہ پڑھتے ہیں اوسکو — چشم و سر اوپر دھرتے ہیں اوسکو
ذوق الصبیان نام رکھا ہے — سال اوس در باغ کہا ہے
جو کوئی اوسکو پڑھے پڑھاوے — عیب سنوارے اور بناوے
دے اصلاح جو ہووے بھلائی — مجھ کو دے دعا وہ بھائی
بحر فروغ تقارب میزاں — فعلن فعلن فعلن فلاں

جبکہ ''ذوق الصبیان'' کے اصل نصاب کی زبان بھی ملاحظہ ہو۔

دل و جگر ہے ھیا کلیجہ — کلاسر ہے مغز ہے بھیجا
امہ کنیز ہے لونڈی باندی — جیتل نقرہ فضہ چاندی
ربا سو ناسیم و زر ہے — ڈبا کو یا ڈھال سپر ہے
عاشق مترا بندہ چیرا — خیمہ تنبو منزل ڈیرا
حلقہ دورہ گروہ گھیرا — گشت و گزار گزر ہے پھیرا
بار بوجھ انبار ہے تودہ — بھیڑ انبوہی آنتر رودہ
لو ھو خون سیاہی سودا — طحال سپرز تلی مخ گودا
پتہ زہرہ تلخہ صفرا — دشت و بربیاباں صحرا
گھیا کدو کونگلو شلغم — لیس لعاب کف و جھک بلغم
بیج ہے اندر بیرون باہر — باگھ غضنفر شیر ہے ناھر[1]

مغلیہ عہد ہو یا سکھ دور پنجاب میں اردو نصابوں کی تصنیف وتالیف اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ قدیم سے یہاں بطور ذریعہ تعلیم استعمال میں لائی جاتی رہی ہے۔ پنجاب میں نظم کے مقابلے میں نثر نسبتاً کمیاب ہے بلکہ نایاب بھی ہے۔ اس حوالے سے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکرؒ کے چند فقرے نثر میں ہم تک پہنچتے ہیں جسے باب دوم میں نقل کیا گیا ہے۔ پھر

حاجی نوشہ گنج بخش۱۲؎ فارسی اور اردو کے صوفی شاعر جنہوں نے شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کا زمانہ دیکھا، اردو میں بھی گفتگو فرماتے تھے۔ ''رسالہ الاعجاز اور تذکرہ نوشاہی میں ہے کہ آپ نے کہا: جپ کر بول نہیں۔''۱۳؎

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو نثر کا چلن ضرور موجود تھا لیکن بدقسمتی سے دستبردِ زمانہ کے وہ محفوظ نہ رہ پائیں۔ قیاس ہے کہ اگر تھیں بھی تو انہیں فارسی میں منتقل کر لیا گیا ہوگا اور عدم توجہی کی بناء پر اردو نثر محفوظ نہ رہی ہوگی۔ پنجاب میں اردو نثر کی جو قدیم تحریریں ملتی ہیں ان کا پتہ حافظ محمود شیرانی کے توسط سے ''پنجاب میں اردو'' میں ملتا ہے۔ ان میں ایک ''پوتھی سلوتری'' اور دوسری ''رسالہ ہزار مسائل'' ہے۔ دونوں کے مصنفین کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا نہ ہی یہ معلوم ہے کہ پنجاب کے کس شہر میں ان کی تخلیق ہوئی۔ اول الذکر گیارھویں صدی کے اواخر میں کسی غیر مسلم کی کتابت ہے۔ اس کی بابت حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں ''یہ ''فرس نامہ'' ہے جو دس فصلوں اور تیرہ اوراق پر مشتمل ہے۔''۱۴؎ رسالے کی زبان میں عربی فارسی کی نسبت پنجابی خالص لہجے میں اردو الفاظ زیادہ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس اردو نثری رسالے کی عبارت بے ترتیب و بے ربط اور زبان کی صفائی سے بے بہرہ ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

''پوتھی سلوتری کی۔ پچھان ناں گھوڑیاں کا عیب سواب، عمر کا ذات کا روک کا کا سودس بھانت کا ہے:
بھانت پہلی پیدا ہونے والے کھورے کے۔ دوسرے کھورے کے سواونے کی بھانت تیسری پچھاں ناں سوکن اوکن کا۔ بھانت چوتھی پچھاں ناں نحس کا۔ بھانت پنجم پچھاں ناں برساں کا۔ بھانت ششم مل (مول) لینیں کھورے کا۔ بھانت ستی پچھاں ناں ذات کھورے کی کا۔ بھانت آٹھی پچھاں ناں کھصیت (خاصیت) کا۔ بھانت نویں پچھاں ناں روک کا۔ بھانت دسی کرنا علاج کا۔
بھانت پہلی پیدا ہونے کھورے کے۔ اک برہمن اما نام اس کا اسپت تھا۔ اکن ہوتری تھا۔ اکن ہوتر میں دھوانکس کے جو آنکھیں میں برپا تھا۔ تس تے آنسو جو چلے تھے۔ واہی جوا کھ تے آنسو چلتے تھے۔ تس تے کھورا ہوت بھیا۔ باویں آنکھ نے جو آنسو چلتے تھے۔ تس تے کھوری ہوت بھئی۔ پوتر جو اس برہمن کا تھا۔ اس کا نام سالوتر تھا۔ تن پوترا اپنے نوکھیا۔ اک پوتھی کھوریاں کی کرو، جس تے کوں اوکن اور روک اور علاج جانیا وے۔ تس نیں اوپوتھی کدی، آپ نما ہیں نام رکھیا۔''۱۵؎

نثر کی موخر الذکر تصنیف رسالہ ''ہزار مسائل'' اپنی املائی اور صرف ونحو کی وجہ سے تیرہویں صدی ہجری کی بتائی جاتی ہے اس کی عبارت پر فارسی سے ترجمہ کا گمان گذرتا ہے۔ اس کی عبارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہبی تبلیغ کے لیے تصنیف

کیا گیا۔شیرانی نے اس رسالے سے جو عبارت نقل کی ہے ان کے مطابق ۱۲۸۸ھ/۷۲-۱۸۷۱ء کا نوشتہ ہے۔نمونہ ملاحظہ ہو۔

''جب کہ نامہ مبارک نزدیک عبداللہ ابن سلام پہنچا۔شرطیں تعظیم کیاں بجانیا کرنامہ معظم کوں پڑا اور اپنی قدم کو اکٹھی کرکے مضمون نامہ مبارک سنایا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو آخری زمانہ کے پیغمبر تھے ایک نامہ پاس (کذا) بھیجا اور دعوت اپنے دین کی کئی ہے۔لازم ہے کہ ہم سب لوگ ایمان لیاویں اوران کی شریعت اور دین کی پیروی کریں کوئی متفق ہو کر جواب سناؤ۔ان سب نے کہا کہ اے عبداللہ ابن سلام تم سب لوک علما ہمارے سے دانا تر ہیں اور نبیوں کی حقیقت اور ماہیت پر بڑے واقف ہیں۔تمہاری مرضی کے خلاف ہم نہیں کر سکتے۔جو تم فرماویں سب راضی ہیں لیکن یہ خیال ہم کوں آتا ہے کہ کیونکر اپنے دین کو چھوڑیں اوران کے دین کی پیروی کریں۔تب عبداللہ ابن سلام نے کہا: کہ اے لوگو تم سب جانتے ہو کہ تم کو بھیں معلوم ہوگا کہ موسیٰ پیغمبر علیہ السلام نے خبر دیی ہے اور دوسرے پیغمبروں نے بھی خبر دیی ہے اپنی اپنی قوم میں کہتے آئے ہیں کہ ایک نبی آخر زمانہ میں نام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوگا اور جب اس کا زمانہ آوے گا۔سب کا دین چھپ جاویگا اوراسی کا دین مشرف ہوگا اور مشرق تا مغرب تک پھیل جاوے گا اورہم سب کی کتاب اور شریعت منسوخ ہو جاو یگی۔اور دوسرا یہ کہ جو چیزیں ہمارے دین میں حلال ہیں اس کے دین میں حرام ہونگیاں اور جو چیزیں ہمارے دین میں حرام ہیں اس کے دین میں حلال ہونگیاں۔توریت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام اور دوسرے صحیفوں اور نبیوں نے ارشاد فرمایا ہے کہ ان کتابوں کی پیروی کرنے والیوں کو چاہیے کہ اس پیغمبر کی شریعت میں داخل ہو کر ایمان لیاویں اور اپنے دل کوں شمع دین کی سیں روشن کریں۔''[۱۱]

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے مضمون ''پنجاب اور اردو'' میں گجرات میں نثر کے کچھ قدیم نمونوں کا حوالہ دیتے ہیں۔جس کی اردو پر پنجابی اثرات بھی نمایاں ہیں۔''قطب عالم (م-۸۵۷ھ/۱۴۵۳ء) نے حضرت راجو قتال کی پیدائش پر گجرات کے شاہ محمود سے فرمایا:

''بھائی محمود خوش ہو،اساں تھیں وڈا تسا تھیں وڈا ساںڈ ے گھر جلال جہانیاں آیا۔''

ایک اور موقع پر فرمایا

''کیا وہ لوہ ہے کہ لکڑ ہے کہ پتھر ہے''

اسی طرح شاہ قطب عالم کے فرزند شاہ عالم منجھن (م-۸۸۸ھ/۱۴۸۳ء) کے ایک فقرے کا حوالہ بھی دیتے ہیں

جن سے قدیم اردو نثر کے ابتدائی خدوخال اور اس کے مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

"پڑہ ڈو کرے، یعنی نجواں اے پیر ک"

پھر "جمعات شاہیہ" کے ایک جملے کا حوالہ دیتے ہیں

"تساں راجے اساں خوجے، یعنی تو بادشاہ و من وزیر"

دکن کی زبان پر پنجابی کے اثرات سے قدیم اردو کے حوالے سے ایک حوالہ یوں درج کرتے ہیں۔

"حضرت شاہ برہان الدین غریب (م ۷۲۸ھ/۱۳۳۶ھ) سے بی بی عائشہ (بنت بابا فرید گنج شکر؟) نے کہا: "اے برہان الدین ساڈی وھیہہ کہ کیہا بنسدا ہے"

زین خلد آبادی (م ۷۷۱ھ/۱۳۶۹ء) کے ایک فقرے کا حوالہ بھی درج کرتے ہیں

"وہ بستر مرگ پر تھے کہ کسی نے ان کی طبیعت پوچھی جواب دیا: "مجہ مت بلا وو"[۱۱۷]

بلاشبہ پنجاب میں قدیم اردو نثر نظم کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم ملتی ہے۔ نظم میں اردو زبان جس نکھری اور رواں صورت میں نظر آتی ہے اس سے قیاس ہے کہ اردو نثر میں بھی اس کا بہت ذخیرہ رہا ہوگا اور زبان کا یہی رچاؤ اور مزاج نثر میں بھی ہوگا۔ لاہور جو قدیم زمانے سے پنجاب کا دارالحکومت رہا اس حوالے سے مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ چونکہ یہاں طباعت کا کوئی خاطرخواہ انتظام نہیں تھا اس لیے بیشتر نسخے قلمی مخطوطات کی صورت میں محفوظ کیے جاتے۔ جن میں یقیناً اردو نثری مخطوطے بھی ہوں گے لیکن خراب سیاسی حالات اور عدم توجہی سے اکثر قلمی نثری مخطوطے تباہ ہو گئے۔ کیونکہ اگر ہوتے تو حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی جیسے محققین اسے ضرور منظر عام پر لا چکے ہوتے۔

کتابوں کی قلمی کتابت کے حوالے سے مسجد وزیر خان لاہور کا حوالہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ جو درس و تدریس کے ساتھ کتابت کا بھی بہت بڑا مرکز تھی۔ یہاں فارسی اور اردو میں کتابت شدہ شاعری کے بہت سے مخطوطے دستیاب ہیں لیکن ۱۸۵۰ء سے قبل کا کوئی اردو نثری مخطوطہ کا حوالہ مقالہ نگار کے زیر مطالعہ رہنے والی فہارس کتب [۱۱۸] میں نہیں ملا۔ لاہور کی حد تک ۱۸۵۰ء سے قبل اردو نثر کی کوئی تحریر نہ ملنے کی وجہ سے دستیاب شعری مواد سے ہی یہاں بولی جانے اور لکھی جانے والی اردو زبان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ایسی ہی زبان نثر میں بھی استعمال کی جاتی رہی ہو گی جو بدقسمتی سے دستیاب نہیں ہو پائی۔

حواشی

۱) نثر اور نثری اسالیب

۱۔ عابد علی عابد،سید:''اسلوب''،لاہور،مجلس ترقی ادب؛ جون ۱۹۹۶ء(طبع دوم)،ص:۱۳۵

۲۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر:''تاریخ ادب اردو''(جلد اول) لاہور،مجلس ترقی ادب،۲۰۰۵ء،ص:۱

۳۔ حامد حسین:''اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)،لاہور؛ پنجاب یونیورسٹی لاہور،۱۹۷۵ء،ص:۹۲

۴۔ اکرام چغتائی:(ترتیب و تدوین معہ اضافات)''پنجاب میں اردو''،مرتبہ:،لاہور؛سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۰۵ء،ص:۴۷

۵۔ گارساں دتاسی:''مقالات گارساں دتاسی''،(جلد اول) کراچی؛انجمن ترقی اردو پاکستان،۱۹۶۴ء،ص:۲۳۴

۶۔ آزاد محمد حسین،مولانا:''نظم آزاد''،لاہور،مطبع کریمی،۱۹۲۶ء،بار سوم،ص:۲

۷۔ ابو سعید نورالدین،ڈاکٹر:''تاریخ ادبیات اردو''(حصہ اول۔نثر)،لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی؛۱۹۹۷ء،ص:۱۴

۸۔ شیر علی سرخوش:''پنجاب میں اردو اولین نظریہ''،مقالہ مشمولہ''پاکستان میں اردو''(چوتھی جلد)،ص:۶۸

۹۔ محمد صادق،ڈاکٹر:''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، لاہور،مجلس ترقی ادب،۱۹۷۶ء،ص:۱۷۱

۱۰۔ شہاب ظفر اعظمی،ڈاکٹر:''اردو ناول کے اسالیب''،دہلی؛تخلیق کار پبلشرز؛۲۰۰۶ء،ص:۳۰

۱۱۔ عابد علی عابد،سید:''اسلوب''،ص:۱۳۰

۱۲۔ ایضاً،ص:۱۳۲

۱۳۔ ایضاً،ص:۱۳۳

۱۴۔ عبدالقیوم،ڈاکٹر:''حالی کی اردو نثر نگاری''،لاہور،مجلس ترقی ادب،ستمبر۱۹۶۴ء،(طبع اول)،ص:۶۹۱

۱۵۔ ایضاً،ص:۶۹۱

۱۶۔ محمد صادق،ڈاکٹر:''محمد حسین آزاد احوال و آثار''،ص:۱۷۰

۱۷۔ عبداللہ،ڈاکٹر،سید:''اشارات تنقید''،لاہور؛ مکتبہ خیابان ادب،۱۹۷۲ء،ص:۲۷۱

۱۸۔ شہاب ظفر اعظمی،ڈاکٹر:''اردو ناول کے اسالیب''،ص:۲۸

۱۹۔ عابد علی عابد،سید:''اسلوب''،ص:۱۰۷۔۱۰۸

۲۰۔ شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر: ''اردو ناول کے اسالیب''، ص:۳۱

ب) اردو ادب کا نثری سرمایہ (سن ستاون سے پہلے تک)

۲۱۔ ماہرین لسانیات نے اس مقامی پراکرت کی توجیح اپنے اپنے نظریات میں پیش کی ہے کہ یہ کونسی بولی ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے مختلف نام (اپ بھرنش، پنجابی، برج بھاشا، کھڑی بولی، ہریانوی، شورسینی، پالی) بھی دیے ہیں۔ جس پر مزید تحقیق کی گنجائش بھی موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس زبان کی پیدائش کے علاقہ پر بھی اختلافات سامنے آتے ہیں لیکن یہ امر طے شدہ ہے کہ اردو زبان کے وجود کا شعور برصغیر پاک و ہند میں مجاہدین اسلام کے آنے کے بعد ہی ہوا۔

۲۲۔ تنہا، محمد یحیٰ ''سیر المصنفین''، لاہور؛ عالمگیر الیکٹرک پریس، ۱۹ ستمبر ۱۹۴۸ء (جلد اول) ص:۹

۲۳۔ الف۔ د۔ نسیم: ''اردو ئے قدیم اور چشتی صوفیاء''؛ اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۲ء، ص:۱۲

۲۴۔ بقول رفیعہ سلطانہ: ''مسعود سعد سلمان کا دیوان اب تک کی تحقیقات سے اردو کے اولین تحریری آثار کا نقطۂ آغاز مانا گیا ہے''۔ (اُردو نثر کا آغاز و ارتقا ص:۱۱)

۲۵۔ ڈاکٹر الف د نسیم اس کتاب کا املائی تلفظ ''سیل دیوراسو'' لکھتے ہیں (''اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء''، ص:۱۱)

۲۶۔ سلیم فارانی، ڈاکٹر: ''اردو زبان اور اس کی تعلیم'' لاہور؛ ادارہ مطبوعات فارانی، ۱۹۹۰ء (طبع پنجم) ص:۷۱

۲۷۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق نام ''چند بردائی'' ہے (پنجاب میں اردو، مرتبہ: اکرام چغتائی، ص:۱۲۳)، ڈاکٹر الف د نسیم کے خیال میں ''چند بروائی'' ہے (''اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء'' ص:۱۱)، ڈاکٹر گوہر نوشاہی ''چند بردائی'' لکھتے ہیں (پاکستان میں اردو، ص:۳۱۳)

۲۸۔ ڈاکٹر الف د نسیم اسے ''پرتھوی راج راسو'' لکھتے ہیں (اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء، ص:۱۱)، ڈاکٹر گوہر نوشاہی بھی اسی سے اتفاق کرتے ہیں (پاکستان میں اردو، چوتھی جلد، ص:۳۱۳)، جبکہ شیر علی سرخوش ''چندرکوی'' لکھتے ہیں (پاکستان میں اردو، چوتھی جلد، ص:۲۸)

۲۹۔ رفعیہ سلطانہ، ڈاکٹر؛ ''اُردو نثر کا ارتقا'' کراچی؛ کریم سنز پبلشرز، ۱۹۷۸ء، ص:۲۰

۳۰۔ ایوب قادری، ڈاکٹر؛ ''اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ''، لاہور؛ ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء، ص:۱۶

۳۱۔ عبدالحق، مولوی؛ ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کرام کا کام'' کراچی؛ انجمن ترقی اُردو، ۱۹۵۳ء، ص:۷۹

۳۲۔ ایضاً، ص:۸

۳۳۔ سید شاہ زندہ حسین نے اردو نثر (دکنی نثر) میں ''سہاگن نامہ'' عورتوں کے لیے ہند و نصائح کے موضوع پر لکھا۔

۳۴۔ اکرام چغتائی: (ترتیب و تدوین) ''پنجاب میں اردو'' محمود شیرانی حافظ: مرتبہ، ص: ۲۰۷

۳۵۔ ایضاً، ص: ۲۰۷-۲۰۸

۳۶۔ تنہا محمد یحییٰ؛ ''سیر المصنفین'' لاہور؛ عالمگیر الیکٹرک پریس، ۱۹۲۸ء، ص: ۱۷

نوٹ: شیخ فریدالدین گنج شکرؒ کے اسی قبیل کے دیگر اردو جملوں کے لیے ''پنجاب میں اردو'' ''مقالات شیرانی'' کے علاوہ ''اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء'' مصنفہ الف دنسیم؛ ''سیر المصنفین'' (جلد اول) مصنفہ محمد یحییٰ تنہا، ''اردو نثر کا ارتقا'' مصنفہ ڈاکٹر رفعیہ سلطانہ، ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

۳۷۔ شیر علی سرخوش: ''پنجاب میں اردو: اولین نظریہ''، مقالہ مشمولہ پاکستان میں اُردو، (چوتھی جلد)، ص: ۳۷

۳۸۔ حامد حسن قادری؛ ''داستان تاریخ اردو'' کراچی؛ اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء، ص: ۴۳

۳۹۔ ''ڈاکٹر حفیظ قتیل نے اپنی کتاب ''معراج العاشقین کا مصنف'' میں اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا ہے کہ 'معراج العاشقین' خواجہ بندہ نواز کی تصنیف نہیں بلکہ وہ گیارہویں صدی کے آخر یا بارہویں صدی کے ابتدائی دور کے ایک بزرگ مخدوم حسینی کی نثری کاوش ہے (ملاحظہ ہو 'تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' (جلد دوم) گیان چند جین، پروفیسر سیدہ جعفر، نئی دہلی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، ص: ۴۹۶

۴۰۔ مذکورہ تصانیف کے لیے ملاحظہ ہو 'اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء'' مصنفہ الف دنسیم، ص: ۱۰۵
جبکہ حامد حسن قادری نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی ایک اور تصنیف 'معراج نامہ'' کا بھی ذکر کیا ہے (ملاحظہ ہو داستان تاریخ اردو، ص: ۴۰)

۴۱۔ حامد حسن، قادری: ''داستان تاریخ اردو'' ص: ۴۰

۴۲۔ الف۔ د۔ نسیم۔ ''اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء'' ص: ۱۰۹

۴۳۔ تنہا محمد یحیٰی: ''سیر المصنفین'' ص: ۱۹

۴۴۔ الف۔ د۔ نسیم 'اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء'' ص: ۱۱۲

۴۵۔ تنہا محمد یحیٰی: ''سیر المصنفین'' ص: ۲۰

۴۶۔ ایضاً

۴۷۔ بزرگان دین کی نثری تحریروں کے لیے ملاحظہ ہو''تاریخ فرشتہ'' مصنفہ ابو القاسم فرشتہ؛''پنجاب میں اردو'' ''مقالات شیرانی'' (جلد اول) مصنفہ حافظ محمود شیرانی؛ ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاء کا کام'' مصنفہ مولوی عبدالحق؛ ''اردوئے قدیم ۔ دکن اور پنجاب'' مصنفہ شمس اللہ قادری؛ ''اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ'' مصنفہ ڈاکٹر ایوب قادری؛ ''سیر المصنفین'' مصنفہ محمد یحییٰ تنہا؛ ''داستان تاریخ اردو'' حامد حسن قادری، ''اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء'' مصنفہ الف دنسیم؛ ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) مصنفہ ڈاکٹر جمیل جالبی؛ ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' (جلد دوم) مصنفہ گیان چند جین، پروفیسر سیدہ جعفر؛ ''تاریخ ادبیات اردو'' (حصہ اول اردو نثر) مصنفہ ڈاکٹر ابو سعید نورالدین، ''نمونہ منثورات'' مصنفہ احسن مارہروی۔

۴۸۔ نمونہ اقتباس کے لیے ملاحظہ ہو''اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء''، ص:۱۲۱

۴۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر؛ ''اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۸۹

۵۰۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر؛ ''ادب ولسانیات'' کراچی؛ اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء، ص:۲۰۷

۵۱۔ ''تاج الحقائق'' جو اخلاق وتصوف کے بعض مباحث پر مبنی ہے، اس کے وجہی کی تصنیف ہونے پر بھی اختلاف ہے۔ اس کے حق میں مولوی عبدالحق کا مضمون مشمولہ ''رسالہ اردو زبان'' اکتوبر ۱۹۲۴ء اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو جلد اول ملاحظہ ہو جبکہ مخالفت میں ڈاکٹر نورالسعید اختر کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی ''تاج الحقائق از وجہی'' اور ڈاکٹر قیوم صادق کی کتاب ''دکنی غالب ملا وجہی'' ملاحظہ ہو۔

۵۲۔ مولوی عبدالحق کے مطابق فتاحی نے اپنی مثنوی ''دستور عشاق'' کا خلاصہ مقفیٰ و مسجع فارسی نثر میں حسن ودل کے نام سے تحریر کیا جو بہت مشہور رہا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ اردو نثر کا آغاز ترجمہ سے ہوا۔ عہد عالمگیر ۱۰۹۵ھ، خواجہ محمد بیدل نے بھی اس قصہ کو پر تکلف نثر میں لکھا (بحوالہ سیر المصنفین، ص:۳۸)

۵۳۔ ملا وجہی؛ ''سب رس'' لکھنؤ؛ سرفراز قومی پریس، ۱۹۶۲ء، ص:۱۴

۵۴۔ کربل کتھا یا دہ مجلس، ملا واعظ حسین کاشفی کی فارسی کتاب ''روضۃ الشہداء'' کا اردو ترجمہ ہے جو محمد شاہ بادشاہ دہلی کی فرمائش پر کیا گیا۔

بقول احسن مارہروی: ''فضلی تخلص کے ایک شخص کی اردو تصنیف دہ مجلس یا کربل کتھا (کربلا کی کہانی) کا نام پتہ چلتا ہے جو ملا واعظ حسین کاشفی کی فارسی کتاب روضۃ الشہداء'' کا ترجمہ ہے تذکرہ نویسوں نے اس کے نام وحالات میں بڑا اختلاف کیا ہے۔'' (نمونہ منثورات ص:۵۷)

۵۵۔ فضلی، فضل علی؛ ''کربل کتھا'' مرتبین: مالک رام و مختار الدین، دہلی؛ دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۵ء، ص:۱۱۱

۵۶۔ ''سبیل ہدایت'' کو ڈاکٹر جمیل جالبی مثنوی کا دیباچہ قرار دیتے ہیں (تاریخ ادب اردو، جلد دوم، ص: ۹۸۸) جبکہ ڈاکٹر سلیم فارانی ''کلیات سودا'' کا دیباچہ کہتے ہیں (''اردو زبان اور اس کی تعلیم''، ص:۷۹) ڈاکٹر ابو سعید نورالدین (تاریخ ادبیات اردو، حصہ اول نثر، ص: ۵۰)، حامد حسن قادری (داستان تاریخ ادب اردو، ص:۶۲) ڈاکٹر شگفتہ زکریا (اردو نثر کا ارتقا آغاز سے ۱۸۵۷ء تک) میں سودا کے ''دیوان مرثیہ'' کا دیباچہ قرار دیتے ہیں۔

۵۷۔ ابو سعید نورالدین، ڈاکٹر؛ ''تاریخ ادبیات اردو'' (حصہ اول نثر)، لاہور؛ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص:۵۰

۵۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر؛ ''تاریخ ادب اردو'' (جلد دوم) لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۷ء، ص:۹۸۸

۵۹۔ بقول ڈاکٹر سلیم فارانی مذکورہ چاروں رسائل کے قلمی نسخے خانقاہ عمادیہ منگل تالاب شہر پٹنہ کے کتب خانے میں محفوظ تھے۔ (ملاحظہ ہو اردو زبان اور اس کی تعلیم)

۶۰۔ اس کے تفصیلی مطالعہ کے ضمن میں ملاحظہ ہو ''اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ'' مصنفہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء

۶۱۔ سیرت کی اس کتاب کا سن تصنیف ۱۲۱۰ھ/۱۷۹۵ء سے ماقبل کا زمانہ ہے اس کے تین قلمی نسخے حیدرآباد کی سنٹرل لائبریری کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ تفصیل کے لیے ڈاکٹر انور محمود خالد کا پی ایچ ڈی کا مقالہ (غیر مطبوعہ) ''اردو نثر میں سیرت رسول''، ص:۵۹ ملاحظہ ہو۔

۶۲۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ''اردو نثر کے ارتقا میں علماء کا حصہ'' مصنفہ ڈاکٹر محمد ایوب قادری

۶۳۔ اس کے نثری نمونہ کے لیے ملاحظہ ہو ''تاریخ ادب اردو'' (جلد دوم) مصنفہ ڈاکٹر جمیل جالبی، ص: ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹

۶۴۔ یہ فارسی قصہ چار درویش کا ترجمہ ہے۔ فارسی کے اسی قصہ کو محمد عوض زریں نے بھی فارسی میں اختصار کے ساتھ لکھا بعد ازاں اپنے مربی راجہ رام دین کی فرمائش پر اردو میں ترجمہ کیا۔ محمد یحییٰ تنہا مصنف سیر المصنفین کے مطابق اس کا نام بھی نوطرز مرصع ہے۔

۶۵۔ قانون کی اس کتاب کو سدا سکھ لال نے چار جلدوں میں مرتب کیا جس میں ۱۷۹۳ء تا ۱۸۳۴ء تک کے جملہ قوانین مروجہ ممالک مغربی و شمالی شامل تھے۔

۶۶۔ اسلوب کا تعلق چونکہ مخاطب سے بھی ہوتا ہے اس لیے جب مخاطب عوام ہوئے تو سادہ رواں اور عام فہم انداز اپنایا گیا

جبکہ خواص سے طرز تخاطب میں مقفی و مسجع انشا پردازی پر زور دیا گیا۔

۶۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' ص: ۴۹۸

۶۸۔ ''اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' مصنفہ ڈاکٹر تبسم کاشمیری سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں تاریخی چہرن مترا، مرتضی خان، غلام اکبر نصر اللہ، غلام اشرف، بلال الدین محمد صادق، رحمت اللہ خان، غلام غوث، کندن لال، کاشی راج وغیرہ شامل تھے۔

۶۹۔ حامد حسن قادری: ''داستان تاریخ ادب اردو'' ص: ۱۰۳

۷۰۔ سید محمد ایم ۔اے لکھتے ہیں:

''لاہور کی نسبت ہونے سے خیال ہوتا ہے کہ وہ لاہور کے باشندے تھے مگر ان کا مولد اور ان کے آبا ؤ اجداد کا وطن شاہجہاں آباد دہلی تھا اور وہ دہلی کی تباہی کے بعد وہاں کے دیگر شرفاء کی طرح ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے اور لاہور میں توطن اختیار کیا اور آگے چل کر لاہوری کہلائے'' (ارباب نثر اردو، ص: ۲۲۱)

فورٹ ولیم کالج کے تدریسی مقاصد کے تحت اردو ترجمہ ''مذہب عشق (۱۲۱۷ھ)'' میں جو نثر ملتی ہے اس میں ہمیں لاہور کی بول چال کی جھلکیاں نثری سطح پر ملتی ہیں جب فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر گلکرسٹ کے ماتحت شعبہ تصنیف و تالیف قائم ہوا تو پھر کلکتہ گئے اور اردو نثر میں ترجمہ کیا۔ چنانچہ لاہور کی اردو نثر کا اندازہ ہمیں نہال چند لاہوری کی اس تصنیف سے بھی ہوتا ہے۔ گو کہ یہ کتاب لاہور میں نہیں لکھی گئی چونکہ ایک لاہوری باشندے نے لکھی جس کی ذہنی اور لسانی نشو ونما میں لاہور کی فضا کا بھی حصہ ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس تصنیف کی زبان میں لاہور میں بول چال کی زبان کا بھی ضرور حصہ ہوگا۔

۷۱۔ محمد ایم اے، سید: ''ارباب نثر اُردو'' حیدرآباد دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، بار دوم، ۱۹۳۷ء، ص: ۲۲۶ تا ۲۲۸

۷۲۔ ان کا تعلق بھی لاہور سے تھا۔ پیدائش کے ساتھ تعلیم وتربیت بھی لاہور میں پائی۔ چنانچہ ان کی تصنیف و تالیف میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں بھی اغلب ہے کہ لاہور کی زبان کے اثرات ضرور موجود ہیں۔

۷۳۔ محمد ایم ۔اے، سید: ''ارباب نثر اردو'' ص: ۲۵۳

۷۴۔ مذکورہ تمام مصنفین کے نثری نمونوں کے لیے ملاحظہ ہو ''نمونہ منثورات'' ''سیر المصنفین'' ''ارباب نثر اردو'' ''داستان تاریخ ادب اردو'' ''تاریخ ادب اردو''

۷۵۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: ''اُردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' ص: ۴۸۹

۷۶۔ طیبہ خاتون، ڈاکٹر؛ ”اردو نثر کی داستان“ آزاد کشمیر؛ ارسلان بکس، ستمبر ۲۰۰۳ء، ص:۲۳

۷۷۔ ابوالسعید نورالدین، ڈاکٹر: ”تاریخ ادبیات اردو“ (حصہ اول نثر)، ص:۶۲

۷۸۔ عبدالحق، مولوی؛ ”مرحوم دلی کالج“ دہلی؛ انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۹ء، ص:۱۸۲

۷۹۔ انگریزی سے اردو نثر میں ترجمہ کرنے کی باقاعدہ ابتدائی کوششیں اسی کالج میں شروع ہوئیں۔

۸۰۔ ایسی کتب کی فہرست کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق کی کتاب ”مرحوم دلی کالج“ ص:۱۲۹ تا ۱۵۵۔

۸۱۔ احسن مارہروی: ”نمونہ منثورات“ اسلام آباد؛ مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۸۶ء، ص:۲۶

۸۲۔ ابوالسعید نورالدین، ڈاکٹر: ”تاریخ ادبیات اردو“ (حصہ اول نثر)، ص:۷۶

۸۳۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مرتب کردہ ”غالب کے خطوط“ (پانچ جلدوں میں) دہلی؛ غالب انسٹیوٹ ۱۹۸۴-۱۹۹۳ ملاحظہ ہوں۔

۸۴۔ چونکہ سرسید تحریک ۱۸۵۰ء کے بعد شروع ہوئی اس لیے یہاں اس کا تذکرہ نہیں کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ سرسید تحریک سے پہلے لاہور میں اردو نثر کا آغاز اور اس کی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے پھر یہ کہ سرسید کی تحریک کو تقویت لاہور ہی کی علمی و ادبی فضا سے ملتی ہے۔ چنانچہ لاہور میں اردو کے نثری آثار کو سرسید تحریک کی تصنیفی کاوشوں پر فوقیت حاصل ہے۔

نوٹ: اس باب میں ۱۸۵۰ء تک کی اردو نثر کے ارتقا کا اجمالی سا خاکہ پیش کیا گیا ہے کیونکہ اردو نثر کے ارتقا میں ہونے والی ان تمام کاوشوں پر بہت سا تحقیقی کام سامنے آچکا ہے۔

ج) پنجاب میں اردو نثر کے ابتدائی آثار:

۸۵۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ”تاریخ ادب اردو“ جلد اول، لاہور؛ مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۵ء (طبع پنجم)، ص:۲۲

۸۶۔ تاریخ کی کتب سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے مختلف نام ہندی، ہندوی، ریختہ، گجری یا گجرتی، دہلوی، دکنی، اردوئے معلیٰ، ہندوستانی وغیرہ رہے ہیں۔

۸۷۔ البیرونی بحیثیت ماہر فلکیات ہیئت کے مشاہدات کے سلسلہ میں لاہور میں قیام پذیر رہا۔ (بحوالہ: سہ ماہی مجلّہ ”پیغام آشنا“ شمارہ ۴۰، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء، اسلام آباد، ص:۱۳۱)

۸۸۔ اکرام چغتائی: (ترتیب و تدوین مع اضافات) ”پنجاب میں اردو“ از محمود شیرانی، حافظ: لاہور؛ سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۶۳

۸۹۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ”لاہور میں اردو شاعری کی قدیم روایت ۔۱۸۵۷ء تک“، مقالہ مشمولہ ”پاکستان میں اردو“ (چوتھی

جلد)،ص:۳۱۰

۹۰۔ قدیم عہد کی فارسی تصانیف میں سے اردو زبان کے الفاظ اور پھر اردو کے فقرے اور دوہرے جو آٹھویں اور نویں صدی ہجری کی فارسی تصانیف میں ملے انہیں ''مقالات شیرانی'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۹۱۔ فہرست کے لیے ملاحظہ ہو اکرام چغتائی :(ترتیب و تدوین مع اضافات) ''پنجاب میں اردو'' از محمود شیرانی، حافظ: ص:۱۹۱ تا ۲۰۲

۹۲۔ ایضاً،ص:۱۹۳

۹۳۔ پنجابی اور اردو صرف و نحو اور قواعد کی مماثلت کے لیے ملاحظہ ہو حافظ محمود شیرانی کا مضمون ''پنجابی اور اردو'' مشمولہ ''پنجاب میں اردو'' (ترتیب و تدوین مع اضافات) اکرام چغتائی۔

۹۴۔ شیر علی سرخوش: ''پنجاب میں اردو:اولین نظریہ''،مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص:۷۳

۹۵۔ ایضاً،ص:۶۷

۹۶۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر: ''پنجاب اور اردو'' مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص:۱۸۱

۹۷۔ شیر علی سرخوش: ''پنجاب میں اردو:اولین نظریہ'' مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص:۷۰

۹۸۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر: ''پنجاب اور اردو'' مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص:۱۸۲

۹۹۔ باز غہ قندیل: ''پنجاب میں اردو'' مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص:۱۹۶

۱۰۰۔ اس کا ثبوت اردو کی پہلی ادبی تصنیف ملا وجہی کی ''سب رس'' (۱۶۳۵ء) ہے۔جس میں فارسی اسلوب غالب ہونے کے باوجود پنجابی کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔

''بعضے کہتے ہیں کہ خدا کوں اس نظر سوں دیکھنا نا جاسی۔نظر سوں خدا کوں دیکھیں گے تو خدا نظر میں نہ آسی۔'' (''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) ڈاکٹر جمیل جالبی،ص:۶۰۹)

''یوں سب کتاباں کا سرتاج ،سب باتاں کا راج،ہر بات میں سو سو معراج ۔اس کتاب کوں کون بینے پرتے ہلاسی۔اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلاسی نا'' (''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص:۱۸۷)

۱۰۱۔ مذکورہ احباب و شعر کے اردو کلام کے لیے درج ذیل کتب ملاحظہ ہوں:

''تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی؛ ''پنجاب میں اردو'' حافظ محمود شیرانی،مرتبہ: اکرام چغتائی؛ ''تاریخ جلیلہ'' غلام

دستگیر نامی؛مضمون ''پنجاب میں اردو'' پروفیسر قاضی فضل حق؛مشمولہ اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۳۳ء؛ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد- پنجاب)، ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' ڈاکٹر گوہر نوشاہی؛ ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' ڈاکٹر ممتاز گوہر؛ ''انتخاب گنج شریف'' سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش قادری؛ ''پاکستانی زبانوں کا ادب'' حمید الفت ملغانی؛ ''لاہور کا دبستان شاعری'' ڈاکٹر علی محمد خان۔

۱۰۲۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ (۱۲۶۰ھ) لاہور میں لکھا گیا۔

۱۰۳۔ ''بخشائش نامہ'' لکھی ہی لاہور میں گئی۔ملاحظہ ہو (ترتیب و تدوین معہ اضافات) ''پنجاب میں اردو'' از محمود شیرانی، حافظ: اکرام چغتائی: ص: ۳۴۹۔

۱۰۴۔ ان تصانیف کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہوں۔ ''اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں'' ڈاکٹر محمد باقر؛ ''پنجاب میں اردو'' حافظ محمود شیرانی، مرتبہ: اکرام چغتائی، ''تاریخ ادب اردو'' ڈاکٹر جمیل جالبی؛ ''تاریخ جلیلہ'' غلام دستگیر نامی؛ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)

۱۰۵۔ ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول)، ص: ۵۲

۱۰۶۔ حامد حسن قادری؛ ''داستان تاریخ اردو''، کراچی؛ اردو اکیڈمی سندھ، ص: ۳۰

۱۰۷۔ نمونہ کلام میں اردو کے الفاظ کے لیے ملاحظہ ہو ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد-)، ص: ۱۹-۲۰

۱۰۸۔ گیارہویں صدی سے متعلق اردو کا قدیم ترین نصاب جس کا اصل نام ''مطبوع الصبیان'' ہے بالعموم اسے امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن یہ امیر خسرو کی تصنیف نہیں ہے۔تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اکرام چغتائی: (ترتیب و تدوین معہ اضافات) ''پنجاب میں اردو'' از محمود شیرانی، حافظ:

۱۰۹۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول)، ص: ۷۷

۱۱۰۔ اسی سال تیمور شاہ درانی کا اور زمان شاہ تخت نشین ہوا اور لاہور پر لہنا سنگھ اور سوبھا سنگھ قابض تھے۔

۱۱۱۔ محمود شیرانی، حافظ: ''پنجاب میں اردو کی سرگذشت کا ایک فراموش شدہ ورق'' مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، ص: ۲۱-۲۲

۱۱۲۔ انھیں پنجاب کے پہلے اردو اور پنجابی صاحب دیوان شاعر قرار دیا گیا ہے۔ان کی تصنیف ''گنج شریف'' جو دو ہزار چار سو اردو اور چار ہزار فارسی اشعار پر مشتمل ہے۔اردو ادب کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے کہ اکبر، جہانگیر، اور شاہجہاں

کے عہد کے لسانی ادب کے بے شمار الفاظ اس کتاب کی وساطت سے منظر عام پر آتے ہیں۔(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو''انتخاب گنج شریف''حضرت سید حاجی محمد نوشہ گنج بخش؛دارالمورخین،لاہور؛(طبع اول)۱۹۷۵ء)

۱۱۳۔ محمد نوشہ گنج بخش،سید،حاجی:''انتخاب گنج شریف''،لاہور؛دارالمورخین،(طبع اول)۱۹۷۵ء،ص:۲۴

۱۱۴۔ اکرام چغتائی:(ترتیب وتدوین معہ اضافات)''پنجاب میں اردو''از محمود شیرانی،حافظ:ص:۲۹۰

۱۱۵۔ ایضاً،ص:۲۹۰

۱۱۶۔ ایضاً،ص:۲۹۱-۲۹۲

۱۱۷۔ جمیل جالبی،ڈاکٹر:''پنجاب اور اردو''مقالہ مشمولہ''پاکستان میں اردو''(چوتھی جلد-)ص:۱۸۱

۱۱۸۔ ''فہرست مخطوطات شیرانی''مرتبہ:محمد بشیر حسین،ڈاکٹر:ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب،لاہور؛۱۹۶۸ء،۱۹۶۹ء،۱۹۷۳ء(جلد اول،جلد دوم،جلد سوم)

''فہرست مخطوطات شفیع''مرتبہ:محمد بشیر حسین،ڈاکٹر؛پنجاب یونیورسٹی پریس،لاہور؛دسمبر۱۹۷۲ء

''تفصیلی فہرست مخطوطات متفرقہ''مرتبہ:منظور احسن عباسی،پنجاب پبلک لائبریری،لاہور؛۱۹۶۳ء

''فہرست مخطوطات''مرتبین:متین ہاشمی،سید؛ساجد الرحمٰن صدیقی؛مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری،لاہور؛۱۹۷۵ء

''فہرست مخطوطات اردو کتاب خانہ گنج بخش''مرتبہ:عارف نوشاہی،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،لاہور؛۱۹۸۸ء

''مفصل فہرست مخطوطات مشتمل بر ذخیرہ عجائب گھر''مرتبہ:رشید احمد؛عجائب گھر،لاہور؛۱۹۷۱ء(جلد اول)

''مفصل فہرست مخطوطات مشتمل بر فرامین دستاویزات،مراسلات،مکتوبات ومتفرقات''مرتبہ:ایم-اے رشید؛عجائب گھر،لاہور؛۱۹۷۲ء(جلد سوم)

''فہرست مخطوطات مولانا محمد حسین آزاد دہلوی''مخزونہ پنجاب یونیورسٹی،لاہور۔

''فہرست کتب عربی وفارسی اور اردو''مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکار عالی،۱۹۰۰ء

''فہرست مخطوطات اردو''مرتبہ:امام زیدی؛خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری بانکی پور،پٹنہ؛۱۹۶۲ء(جلد اول)

''فہارس مخطوطات''(جلد دوم)(مؤلف)سید جمیل احمد رضوی،اردو اکیڈمی پاکستان،لاہور،۲۰۰۵ء

اُردو نثر اور مرکز لاہور

(۱۸۴۹ء کے بعد کلونیل عہد میں اردو نثر کی ابتدا اور فروغ)

ا) دفتری، انتظامی و عدالتی اردو نثر

ب) انجمن پنجاب اور اردو نثر

ج) تاریخ نویسی

د) نئے اردو سفر ناموں کی نثر

ہ) مذہبی نثر

"انیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر چاروں طرف نظر دوڑایئے تو معلوم ہو گا کہ برصغیر کا سارا نقشہ اور سارا منظر بدل گیا ہے وہ ساری دیسی و بدیسی طاقتیں جو مغلیہ سلطنت کے ڈھیر پر اٹھارویں صدی میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھیں دم توڑ چکی ہیں اور اب انگریز سارے برصغیر کے سیاہ وسفید کا مالک ہے۔"[1]

اس منظر نامے کے نتیجے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے انگریزی سلطنت اور اپنی ملکیت کی توسیع و استحکام کے لیے نیم فوجی و آمرانہ طرز حکومت قائم کیا۔ اس کے لیے مختلف ریاستوں کے ساتھ معاہدوں کا سہارا بھی لیا۔ جس کے ذریعے ایک ایک کر کے برصغیر کے تمام علاقے انگریزی تسلط اور کمپنی کی قلمرو میں شامل ہوتے چلے گئے۔ یوں ہم واضح طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ انیسویں صدی ہی ایسی صدی ہے جس میں صحیح معنوں میں انگریزوں کے قدم جمنا شروع ہو گئے تھے۔ جس کا آغاز انہوں نے اکبر کے دور سے کیا تھا۔ چنانچہ اس کے لیے انگریزوں نے سیاسی، سماجی، انتظامی، اقتصادی، معاشی، لسانی، علمی اور مذہبی سطح پر نہ صرف تبدیلیاں کیں بلکہ ان عوامل کی ترقی کے لیے مزید راستے بھی ہموار کیے۔ ان تمام سطحوں پر نئے خیالات وتصورات کی ایک رو قائم کی۔ جس کا مقصد عوام الناس اور نئے حاکموں کے درمیان خلیج کو کم کرنا اور اپنی حکومت کی مضبوطی کے لیے اپنی حکمت عملی کو اس طرح عملی جامہ پہنانا تھا کہ وہ یہاں بہتر طور پر حکومت کر سکیں۔

یوں تو مشرقی پنجاب میں انگریزوں کی بالواسطہ حکومت اور اثر ورسوخ کا آغاز ۱۸۰۳ء میں دہلی پر قبضہ اور ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ سے معاہدہ کے بعد ہو چکا تھا۔ جس سے انگریزی اقتدار کو بدستور وسعت ملی اور نتیجتاً ۱۸۴۹ء میں سکھ سلطنت کے خاتمے کے ساتھ ہی کمپنی کی حکومت کے زیر انتظام علاقوں میں خاصا اضافہ ہو گیا۔ اب اس کی سرحدیں مغرب میں جمرود اور جنوب مغرب میں سندھ تک پھیل گئیں۔ پنجاب ایسا علاقہ تھا جو سب سے آخر (۱۸۴۹ء) میں انگریزی قلمرو کا حصہ بنا۔ پنجاب کی سطح پر عوام کو جو سب سے بڑا فائدہ ہوا وہ اس خطے میں سیاسی استحکام تھا جو کہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سے اقتدار کے لیے جنگ وجدل اور افراتفری کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کمپنی کی حکومت نے پنجاب کا انتظامی ڈھانچہ مرتب کیا اور لاہور شہر کو مرکز بنا کر ایک وسیع اصلاحاتی اقدامات اور رفاعی نظام ترتیب دیا گیا۔ جس کی منصوبہ بندی اور نگرانی لاہور میں بیٹھ کر کی جاتی۔ انگریزوں نے شہر لاہور میں معیشت، سیاست وثقافت نیز ہر سطح پر نت نئی تبدیلیاں کیں اور اسے وسعت دی جو اس کے لیے نیک فال ثابت ہوئیں۔

"بیرون لاہور تعمیر وترقی کا اصل آغاز ۱۸۴۹ء میں ہوا جب انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا اور شہر کا تمام انتظام وانصرام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ باضابطہ طریقے کے ساتھ مغربی طرز رہن سہن اور معاشرت کے اثرات کا آغاز ہوا۔ انگریزی عہد میں شہر سے باہر چھاؤنی سے ملانے کے لیے

پہلے ٹھنڈی سڑک اور بعد ازاں دیگر سڑکوں کی تعمیر ہوئی۔ مال روڈ کے قرب و جوار میں تعلیمی اداروں، کورٹ، کالج اور سرکاری دفاتر، کے لیے عمارات بنائی گئیں۔ پنجاب یونیورسٹی، لاہور میوزیم، ٹولنٹن مارکیٹ، تارگھر، جی پی او، چیف کورٹس، اسمبلی ہال، گورنمنٹ ہاؤس، لارنس ہال، ایچی سن کالج جیسی اہم بڑی اور منفرد عمارات کی تعمیر نے پہلی مرتبہ لوگوں کو فصیلوں سے باہر نکل کر بیرونی لاہور کی بستی میں رہنے کی ترغیب ـــ جدید تقاضوں سے ہم آہنگ رہائشی کالونیوں کی فراہمی کا آغاز ہوا۔ انگریزی دور میں مسلمانوں کے لیے اسلامیہ پارک، فاروق گنج، گڑھی شاہو اور محمد نگر جیسی بستیاں بسائی گئیں جبکہ ہندوؤں اور سکھوں کے لیے گوالمنڈی، کرشن نگر، رام نگر اور سنت نگر جیسی بستیاں بسائی گئیں۔" [۲]

کمپنی بہادر کے آنے کے بعد جو انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں ان میں انتظامی امور کی بہتری کے لیے سیاسی، مالیاتی اور عدالتی سطح پر بورڈ تشکیل دیئے گئے۔ امن و امان کے لیے ملٹری پولیس اور فرنٹیئر فورس تشکیل دی گئی۔ انہیں جدید آلات حرب سے لیس کیا گیا۔ چھاؤنیوں کا قیام عمل میں آیا۔ اندرون علاقہ کسٹمز ڈیوٹی کا خاتمہ کیا گیا۔ تجارتی روابط کو مضبوط بنانے اور تجارت کی ترقی میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے سڑکوں کی حالت بہتر بنائی گئی۔ دخانی جہازوں اور ریل کے نظام کے ذریعے سفر اور تجارت کو مزید بہتر اور فعال بنایا اور برقی تار کا نظام قائم کیا۔ باری دو آب نہر کی تعمیر اور ڈیرہ جات اور ملتان کی دیگر پرانی نہروں کی مرمت سے نہری نظام کی اصلاح کی گئی۔ ایگری ہارٹیکلچرل سوسائٹی کے ذریعے زرعی معیشت اور جنگلات کی ترقی کے لیے بہتر اقدامات کیے گئے۔ تعلیمی ترقی کی طرف توجہ دی گئی، چھاپے خانے لگائے گئے۔ ڈسپنسریاں، جیل خانہ جات اور دیگر فلاحی عمارتیں تعمیر کی گئیں۔ مذکورہ اقدام سے جہاں امن و امان بحال ہوا وہیں حکومت کے استحکام و مقبولیت اور لوگوں کی ترقی و خوشحالی میں بڑی مدد ملی۔ ان اصلاحات کی بازگشت انیسویں صدی کے وسط میں شائع ہونے والے اخبارات میں واضح سنائی دیتی ہے۔ مثلاً برقی تار کے حوالے سے ۴ جولائی ۱۸۵۴ء کا "کوہ نور" مطلع کرتا ہے کہ "بجلی کی ڈاک کا تار لاہور تک بخوبی لگ گیا اور پرانے توپ خانہ کے ایک مکان میں اس کے کارخانہ کا دفتر قائم ہوا ہے۔ غالب ہے کہ صبح و شام میں اجراء پاوے اور پشاور تک بعد برسات جاری ہوگا۔ سب سامان مہیا ہے۔ تار کے انبار ڈاک خانہ میں لگ رہے ہیں اور پنجاب میں بڑی دھوم ہو رہی ہے۔" [۳]

جیسے جیسے انیسویں صدی آگے بڑھتی چلی گئی ویسے ویسے انگریزی اقتدار کے زیر اثر تبدیلی کے اثرات بھی واضح ہونے لگتے ہیں۔ جو نئے سیاسی، تعلیمی، مذہبی، اقتصادی، معاشی، تہذیبی فکری تصورات کو تشکیل دیتے ہیں، یہ اثرات انیسویں صدی کے نصف دوم میں پنجاب میں بالعموم اور لاہور میں بالخصوص سرعت کے ساتھ پھلتے پھولتے

ہیں۔اس کی ایک وجہ یہ رہی تھی کہ لاہور کا علاقہ ۱۸۵۷ء کے جنگی اثرات سے کافی حد تک محفوظ رہا ہے۔انیسویں صدی کے وسط میں انگریز لاہور پر قابض ہو جاتے ہیں۔ان کی آمد سے تمام شعبہ ہائے زندگی میں جوثمرات وجود میں آتے ہیں انہی میں سے ایک یہ ہے کہ علمی و ادبی سطح پر اُردو نثر کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے اوراس کی ترویج و اشاعت تیزی سے عمل میں آتی ہے۔بالفاظ دیگر صحیح معنی میں فارسی کی بجائے اردو نثر کوفروغ ملتا ہے۔علمی و ادبی روایت لاہور کی ایسی زندہ روایت ہے جس کا آغازمحمودغزنوی سے ہوا۔اور جو بعد ازاں حکمرانوں کی سرپرستی میں پھلتی پھولتی رہی۔حتی کہ آج بھی لاہور میں یہ جاندار روایت روز افزوں ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔

لاہور میں اردو نثر کو جو اہمیت انگریزی اقتدار میں نصیب ہوئی وہ اس سے قبل نہ تھی کیونکہ فارسی زبان بدستورعلمی و ادبی حوالے سے زیادہ مستند، وقیع اورعلمیت کی علامت سمجھی جاتی تھی جبکہ اردو زبان بول چال کی سطح پر مقبول ومعروف تھی۔اس کے ثبوت کے طور پر انگریزوں سے قبل مہاراجا رنجیت سنگھ کے دور کو پیش نظر رکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ فارسی اس وقت تک درباری زبان ہونے کے ساتھ ساتھ خط و کتابت، وقائع نگاری اور فرامین میں استعمال ہونے کے علاوہ علمی و ادبی زبان کے طور پر مستعمل تھی۔جیسے کہ اس دور سے پہلے غزنوی،خلجی اور مغل دور میں علمی و ادبی سطح پر نثر میں فارسی ہی کی روایت نظر آتی ہے۔البتہ اردو شاعری میں اردو زبان زیادہ نکھری ہوئی صورت میں استعمال ہوتی رہی تھی۔ یوں تو فارسی زبان میں علمی و ادبی نثر کی ایک مضبوط روایت پنجاب میں پروان چڑھی ہے جس میں حکمرانوں کی سرپرستی کا بہت عمل دخل رہا ہے۔درحقیقت فارسی زبان کے آغاز وارتقا میں بھی لاہورشہر کو ہی اولیت حاصل رہی ہے۔؎۴ اردونثر کو پروان چڑھانے کا آغاز صوفیاء اور علماء کےتوسط سے ہوتا ہے جبکہ حکومتی سطح پر انگریز اس کی سرپرستی کرتے نظر آتے ہیں۔

لاہور میں انگریزی تسلط سے قبل مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور کے علمی و ادبی سرمایے پرنظر دوڑائیں تو فارسی کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کا چرچا زیادہ رہا جبکہ نثر میں فارسی زبان کو استعمال کیا گیا۔اسی لیے اردوشعری نمونے تو کثرت سے دستیاب ہیں مگر اردونثر کمیاب ہے اس کمیابی کی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ اردو شاعری پر زیادہ اور اردو نثر پر نسبتاً بہت کم توجہ رہی۔شاید اسی لیے کہ لاہور میں اردونثر کے نمونے ۱۸۵۰ء سے قبل کےنہیں ملتے۔دستیاب نثری سرمایے سے معلوم ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ کے دور تک نثر میں فارسی زبان کا ہی رواج رہا ہے۔اس ضمن میں تاریخ وتذکرہ نویسی، تصوف پرمبنی کتب اورخطوط وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔؎۵ بلا شبہ فارسی زبان میں نثری کتب زیادہ تعداد میں لکھی گئیں لیکن ایسا ممکن نہیں کہ اردونثر میں کچھ نہ لکھا گیا ہو۔جو کہ بول چال میں اس وقت مقبول تھی اس کا اندازہ ہمیں اس سے بھی ہوتا ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ انگریزوں سے بات چیت کرتے وقت اردو زبان

استعمال کیا کرتا تھا۔ وہیں ہمیں انگریزوں کا بھی اردو زبان کے بولنے اور سمجھنے کی شد بد رکھنے کا اندازہ ہوتا ہے۔ چونکہ لاہور میں عہد رنجیت سنگھ میں کسی مطبع کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے قلمی کتابت ہی کی جاتی تھی۔ جس کا ذکر لاہور میں تاریخ کی کتب اور مخطوطات کی فہارس ۷؎ سے ملتا ہے۔ مثلاً مسجد وزیر خان ۸؎ میں بدستور قلمی کتابت کے کام کو منظم طور پر کیا جا رہا تھا۔ یہاں بھی فارسی نثر کی کتب کا ذکر کثرت سے ملتا ہے لہٰذا کتب کا ذخیرہ قلمی مخطوطات کی صورت میں ہوتا تھا جو کہ اب بھی لاہور کے مشہور علمی و ادبی خاندانوں، پیروں کے خاندان، فقیر خاندان اور چشتی خاندان کے پاس؛ جامعہ پنجاب میں حافظ محمود شیرانی اور مولوی محمد شفیع کے ذخیرہ کتب اور لاہور میوزیم میں محفوظ ہے ان میں باوجود کوشش کے کوئی اردو نثری کتاب یا نثری نمونہ دستیاب نہیں ہو پایا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ خواص اور عوام میں نثر کی بہ نسبت اردو شاعری ہی کی طرف رجحان تھا۔ عوام میں بہت سے موزوں طبع اردو شعراء اور فارسی نثر نگار ملتے ہیں جن کا ذکر ''لاہور کے دبستان شاعری'' ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' اور ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' میں ملتا ہے لیکن ان کی کسی اردو تصنیف کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ بالفرض اگر مان لیا جائے کہ طبقہ عوام کی اردو نثری تحریروں کو باہتمام محفوظ نہ کیا جاتا ہوگا اس لیے کوئی نثری تحریر نہیں ملتی لیکن اس کے برعکس خواص میں لاہور کے نامور علمی و ادبی خاندانوں میں فقیر خاندان، پیروں کا خاندان اور چشتی خاندان کے ہاں ۱۸۵۰ء سے قبل اردو نثری نمونوں کی دستیابی کی توقع بڑھ جاتی ہے کہ ان کی تحریروں کو خصوصی توجہ کے ساتھ محفوظ کیا جاتا تھا۔ مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیروں کا خاندان جس میں مراد شاہ لاہوری، قلندر شاہ اور سکندر شاہ جیسے شعراء کو لاہور میں اردو زبان کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے فارسی کے ساتھ اردو شاعری کا تو رچا ہوا مذاق ان کے کلام میں موجود ہے لیکن ان کے ہاں بھی اردو نثر کا کوئی نمونہ باوجود تلاش کے نہیں ملا جبکہ اردو شاعری کے بہت سے نمونے ۹؎ دستیاب ہیں۔ پیر مراد شاہ لاہوری کے چوتھے بھائی پیر فرح بخش نے اردو میں نظم لکھی نہ ہی نثر۔ ان کا تمام کلام فارسی میں ہے۔ پیروں کے خاندان اور فقیر خانہ ان کے آپس میں گہرے روابط کا اندازہ ان فارسی اور اردو خطوط سے بھی ہوتا ہے جو منظوم صورت میں ہیں۔ فارسی نثر میں بھی خطوط ہیں لیکن اردو نثر میں تحریر کردہ کوئی خط نہیں مل سکا۔ فقیر خاندان بھی لاہور کا مقتدر علمی و ادبی خاندان ہے۔ فقیر غلام محی الدین نوشہ ثانی کے بیٹے فقیر سید عزیز الدین، فقیر سید امام الدین، فقیر سید نور الدین سبھی فارسی اور اردو زبان کے پرگو شاعر تھے۔ ان کی نثری تحریریں فارسی میں ہیں جبکہ اردو نثر کا کوئی نمونہ ان کے یہاں بھی نہیں ملتا۔ قریشیوں کے خاندان کے مشہور و معروف فرد غلام سرور لاہوری کا بھی خصوصیت سے ذکر ملتا ہے۔ جو کہ اردو اور فارسی زبان کے نامور مؤرخ، تذکرہ نگار و انشاء پرداز کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ فارسی تحریروں سے قطع نظر ان کی اردو نثری تحریریں بھی ۱۸۵۰ء کے بعد کی ہیں۔ چشتی خاندان میں مولوی احمد بخش یکدل اور ان

کے بیٹے مولوی نور احمد چشتی، مولوی محمد علی پر دل چشتی کی بھی اردو نثر میں بہت گراں قدر خدمات ہیں۔ ان اصحاب کے یہاں فارسی نثر تو ملتی ہے لیکن اردو نثر کے نمونے ان کے ہاں بھی ۱۸۵۰ء کے بعد کے ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز گوہر ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' کے باب اول ''تاریخی اور ادبی پس منظر'' میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں معاصر فارسی اور اردو شعراء کا حوالہ دیتی ہیں لیکن وہ بھی اردو نثر کی کمیابی کا گلہ بجا طور پر کرتی نظر آتی ہیں۔ الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب باب کے آخر میں عہد رنجیت سنگھ کے نثری نمونے کے طور پر وہ مولوی احمد بخش یکدل (۱۷۹۷ء- ۱۸۶۷ء) کے گلستان سعدی کے اردو نثری ترجمہ کا حوالہ اس طرح دیتی ہیں کہ وہ ۱۸۵۰ء سے پہلے کا معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ان کا پورا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

''اس دور کے نثری نمونے بہت کم دستیاب ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پنجاب میں صرف شعر کے لیے اردو زبان کا زیادہ رواج تھا لیکن مولوی احمد بخش یکدل نے گلستان سعدی کو جب اپنے پوتے حامد علی چشتی کے لیے نقل کیا تو فارسی اشعار کا کتاب کے حاشیے پر اردو نثر میں ترجمہ لکھا۔ یہ یکدل کی اردو نثر کا نمونہ ہی نہیں بلکہ یہ اس دور کی اردو نثر کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ اس کا ایک نمونہ درج ذیل ہے۔

۱۔ یہ وہ شخص ہے جس کے عشق میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔

۲۔ یار میرے اس کی دوستی میں مجھے ملامت کرتے ہیں پر انہوں نے دیکھا نہیں، اگر دیکھتے تو ملامت نہ کرتے۔

۳۔ یہ وہی ہیں کہ ان کے واسطے رزق معین ہے۔

۴۔ پناہ مانگتا ہوں میں بخدا ایسے فقر سے جو برا حال کرتا ہے۔ ہمسائیگی ایسی سے جو دوست نہ رکھے۔

۵۔ فقر میرا فخر ہے اور فقر میرے سے ہے۔''[9]

حواشی میں جو حوالہ (احمد بخش یکدل، بیاض یکدل خطی (عکسی نقل) کراچی میوزیم) درج کیا ہے[10]۔ جبکہ کتابیات میں مخطوطات کے ضمن میں حوالہ درج ہی نہیں کیا گیا۔ سب سے اہم یہ کہ وہ اس نثری نمونے کے سن کی نشاندہی بھی نہیں کرتیں کہ کس بناء پر وہ اسے عہد رنجیت سنگھ کی نثر کے کمیاب نمونوں میں شمار کر رہی ہیں۔ مقالہ نگار کو ڈاکٹر ممتاز گوہر کے اس بیان سے اختلاف ہے۔ اگرچہ یکدل عہد رنجیت سنگھ میں بحیثیت شاعر اور روزنامچہ نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے لیکن اس دور میں ان کی تمام دستیاب نثری تحریریں فارسی نثر[11] میں ملتی ہیں۔ جبکہ اردو کی دستیاب تحریریں[12] ۱۸۵۰ء کے بعد کی ہیں۔ مقالہ نگار کا ایک اور استدلال یہ ہے کہ اگر بالفرض ڈاکٹر ممتاز

گوہر کی بات کو وقتی طور پر صحیح قرار دے بھی دیا جائے تو یہ اس وقت از خود غلط ثابت ہو جاتا ہے جب حامد علی چشتی کی سوانح میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۸۵۶ء پڑھتے ہیں۔[۱۳] نتیجتاً یکدل کی نثر کے مذکورہ نثری نمونے یقیناً ۱۸۵۶ء سے کہیں بعد کے ہیں۔ اس لیے یکدل کی نثر کے مذکورہ اردو نثری نمونے جنھیں ڈاکٹر ممتاز گوہر رنجیت سنگھ کے عہد کے کمیاب نمونے قرار دیتی ہیں ہرگز عہد رنجیت سنگھ میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ چونکہ یہ نثری نمونے ۱۸۵۶ء کے بھی بعد کے ہیں اور اس وقت اردو نثر کے دیگر بہت سے نمونے بھی اخبارات، رسائل اور کتب کی صورت میں سامنے آ چکے تھے اس لیے یکدل کے اردو نثر کے اس نمونے کو ۱۸۵۰ء کے بعد دستیاب نثر کے نمونوں میں تو شمار کیا جائے گا لیکن رنجیت سنگھ کے دور کے کمیاب نمونے قرار دے کر حوالہ نہیں دیا جا سکتا۔

پھر بھی اغلب گمان ہے کہ اردو نثر میں تھوڑا بہت تو ضرور لکھا گیا ہو گا چونکہ کتب قلمی صورت میں ہوتی تھیں اس لیے خیال کیا جاتا ہے کہ دست برد زمانہ ہو گئیں یا لاہور کے علمی و ادبی خاندانوں کے پاس موجود ادبی دفینوں میں اب بھی گمشدہ یا عدم توجہ اور بے اعتنائی کے باعث برباد ہو گئی ہوں۔ حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور ڈاکٹر گوہر نوشاہی جیسے محققین لاہور اور اس کی علمی و ادبی تاریخ سے بہت لگاؤ رکھنے والوں میں سرفہرست ہیں اس حوالے سے ان احباب کا بہت وقیع کام سامنے آ چکا ہے لیکن ان کے ہاں بھی اردو نثر کی کسی ایسی کتاب یا تحریر کا ذکر نہیں ملتا جو عہد رنجیت سنگھ میں لاہور میں لکھی گئی ہو۔ ہر چند کہ شاعری کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔ سو اس گمان کو بھی تقویت ملتی ہے کہ عہد رنجیت سنگھ میں تحریری سطح پر صرف فارسی نثر تھی اور اردو نثر میں لکھنے کا رواج نہ تھا۔ تحقیق کا در ہمیشہ کھلا رہتا ہے اس کے لیے جستجو اولین شرط ہے لہذا اغلب گمان رکھنا کہ اردو نثر کا کوئی نمونہ کتابی سطح پر نہ سہی کچھ جملوں کی صورت میں ضرور رہا ہو گا، محققین کے لیے بہت ضروری ہے۔ مقالہ نگار کو باوجود کوشش اور جستجو کے ایسی کوئی اردو نثری تحریر نہیں مل سکی۔ اردو نثر کی تاریخ پر مشتمل کتب اور فہارس مخطوطات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مقالہ نگار کا یہ استدلال ہے کہ ۱۸۵۰ء سے قبل لاہور میں اردو نثر تحریری سطح پر موجود نہ تھی۔ لہذا یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ بول چال کی زبان اردو، شعری سطح پر معیاری زبان کا درجہ اختیار کر چکی تھی جبکہ نثر میں فارسی کو ہی استعمال کیا جا رہا تھا۔

اردو نثر کو پیش نظر رکھتے ہوئے جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ شمالی و جنوبی ہند میں پہلے پہل اس کا آغاز و ارتقا ہوتا ہے۔ فارسی کے ساتھ اردو زبان کی ابتدا بھی پنجاب سے ہوئی اور بالخصوص لاہور اس کا مرکز بنتا ہے۔ لاہور میں شاعری کے لئے اردو زبان جبکہ نثر میں فارسی زبان مروج رہی ہے۔ لاہور میں اردو نثر کا صحیح معنوں میں باقاعدہ آغاز و ارتقا انگریز تسلط (۱۸۴۹ء) کے بعد عمل میں آتا ہے۔ انگریز جو دیگر صوبوں میں اردو زبان کو اپنا چکے

تھے، لاہور میں بھی اردو نثر کو فروغ دینے میں انہی نے بنیادی کردار ادا کیا۔ ان کی آمد سے جہاں بہت سے اصلاحاتی اقدامات کیے گئے وہیں علمی و ادبی سطح پر بھی بے پناہ ثمرات وجود میں آئے جن کا جائزہ مختلف پہلوؤں سے لیا جا سکتا ہے جس میں دفتری، انتظامی وعدالتی اردو نثر، مطابع کا قیام، اخبارات و رسائل کا اجراء، محکمہ تعلیم اور درسی کتب، تاریخ شناسی، پنجاب بک ڈپو، مذہبی خیالات کی ادائیگی کے لیے اردو نثر کا استعمال، انجمن پنجاب اور اس کے تتبع میں اردو زبان و ادب کی ترویج وترقی میں دیگر ادبی اور اصلاحی انجمنوں کا قیام اہم ہیں۔

۱) دفتری انتظامی وعدالتی اردو نثر

انگریزی عہد میں ۱۸۵۰ء کے بعد لاہور علم و ادب کے ایک نئے مرکز کے طور پر ابھرتا ہے۔ شاعری کے علاوہ اب اردو نثر پر بھی بالخصوص توجہ دی جانے لگی۔ نیز اس کے فروغ کے لیے کئی اقدامات بھی کیے گئے۔ دہلی کے اجڑنے (۱۸۵۷ء) کے بعد تو لاہور اور بھی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

تاریخی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کے لیے انقلابی سطح پر اقدامات ؎ا انگریزوں ہی نے اٹھائے ہیں۔ گو کہ انہوں نے یہ وقت کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے مفاد میں کیے لیکن اس کا بالواسطہ اور دور رس فائدہ اردو زبان و ادب کو ہوا۔ ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کے وسط تک فارسی سرکاری اور علم و ادب کی زبان کے طور پر رائج رہی ہے۔ انگریزوں نے اپنے اقتدار کے استحکام و دوام کے لیے فارسی کی سرکاری حیثیت کو ختم کرنا چاہا۔ لہذا پہلے انگریزی زبان اور بعد ازاں اس کے نفاذ میں درپیش مشکلات کی وجہ سے اس کی جگہ اردو زبان کو رائج کیا۔ زبان تہذیب و ثقافت کا مظہر ہوتی ہے اس لحاظ سے فارسی مسلمانوں کی ثقافت کا واحد نشان تھی۔ جس کے بولنے اور سمجھنے والوں میں ہندو مسلم کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ چنانچہ انگریزوں نے مسلمانوں کی آخری ثقافتی نشانی ''فارسی زبان'' کو مٹانے کی کوششیں جاری رکھیں جو ان کی حکومتی پالیسی کا حصہ تھیں۔

فارسی زبان کو یک دم منسوخ کرنا اس قدر آسان نہ تھا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کا پہلا اخبار ''جام جہاں نما'' ۲۷ مارچ ۱۸۲۲ء کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی میں کلکتہ سے جاری کیا گیا۔ لیکن لوگ فارسی سے زیادہ مانوس تھے یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں اس کی مانگ کم ہونے کی بناء پر اس کے ناشرین نے یہ اخبار جون ۱۸۲۲ء کے اواخر میں فارسی زبان میں شائع کرنا شروع کر دیا۔ ہر چند کہ ایک سال بعد پھر سے اس نے اردو زبان کی جانب رجوع کیا لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ فارسی کی بجائے اردو کی مانگ میں اضافہ ہوا بلکہ اس کے جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ یورپی باشندے جو اردو کا ذوق رکھتے تھے ان کے لیے پڑھنے کا مواد فراہم کیا جائے۔ چنانچہ فارسی اخبار کو برقرار رکھتے ہوئے ''جام جہاں نما'' کا اردو ضمیمہ شائع ہونے لگا۔ بعد ازاں ضمیمہ بھی بند کرنا پڑا۔ یہ

واقعہ اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ فارسی کو اردو زبان سے تبدیل کرنا انگریزوں کے لیے آسان نہ تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس مسئلے کا حل ۱۸۳۴ء میں فارسی کی بجائے اردو زبان کو سرکاری حیثیت دینے میں تلاش کیا۔ نتیجتاً سرکاری سرپرستی کی بنا پر کئی اردو اخبارات بھی نکلنا شروع ہو گئے۔ [۱۵]

۱۸۳۵ء میں اردو انتظامی اور عدالتی سطح پر ملکی اور دیسی زبان تسلیم ہو کر فارسی کی جگہ سرکاری دفاتر میں بھی استعمال ہونے لگی۔ رفیق یار خان یوسفی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالہ ''عدالتی اور قانونی زبان کی حیثیت سے اردو کی وسعت اور صلاحیت'' میں اردو زبان کے برتاؤ کا نقشہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ''عدالتوں میں ہر سطح پر اردو کے چلن کو عام کرنے کے لیے روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ جس کے نتیجے میں عدالتیں اپنی تمام کارروائی اردو میں انجام دینے لگیں۔ تھانے سے لے کر عدالت عظمیٰ کی سطح تک ہر طرح کی کارروائی اردو میں ہونے لگی۔ رپٹ اردو میں لکھوائی گئی، چالان اردو میں لکھے جانے لگے گواہیاں اردو میں دی جانے لگیں۔ بیانات اردو میں قلمبند ہونے لگے۔ عدالتوں میں بحث اردو میں ہونے لگی۔ فیصلے اُردو میں دیئے جانے لگے۔ غرض یہ کہ دفتری اور عدالتی زبان کی حیثیت سے اردو بہ حسن و خوبی اپنے فرائض انجام دینے لگی۔ وکلاء حضرات بھی اپنے معروضات اردو میں پیش کرتے تھے۔ اس طرح اردو زبان عدالتی کارروائیوں میں خود کفیل ہو گئی تھی حالانکہ قوانین انگریز کے بنائے ہوئے تھے لیکن ان کے بیان کرنے، تشریح کرنے یا ترجمے کرنے میں کوئی مشکل یا دقت پیش نہیں آ رہی تھی۔'' [۱۶]

سرکاری سمن، پروانے، احکامات اور اکثر تجاویز اردو میں تحریر ہونے لگتی ہیں لیکن اس کے باوجود ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۹ء تک اکثر فیصلے اور بیعہ نامے وغیرہ فارسی ہی میں لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قانونی اردو نثر میں اجنبی ترکیبوں اور عربی فارسی الفاظ کی ملاوٹ سے زبان میں صفائی اور سلاست پیدا نہ ہو سکی تھی۔ درحقیقت زبانی ادائے مطلب کے لیے عموماً اردو میں بات چیت کی جاتی تھی مگر کتابیں، مضامین بلکہ چھوٹے چھوٹے رقعوں اور خطوط میں فارسی زبان بدستور لکھی جا رہی تھی۔ نتیجہ یہ کہ فارسی کو یکسر ختم کرنا ہرگز آسان نہ تھا۔ اس سے ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ فارسی زبان کا عہد حکومت ختم ہو رہا تھا اور اس کی جگہ اردو زبان لے رہی تھی لیکن اس عہد کے لوگوں کی رگوں میں فارسی زبان چونکہ خون کی طرح سرایت کرتی تھی اس لیے ان سے فارسی کو جدا کرنا گویا گوشت کو ناخن سے جدا کرنے کے مترادف تھا۔

تعلیمی میدان پر نگاہ دوڑائیں تو انیسویں صدی کی چوتھی دہائی (۱۸۳۳ء) میں میکالے کے تعلیمی کمیشن اور اس کی سفارشات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پالیسی کے ذریعے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر فارسی کی حیثیت کو

کم کرنے کی کوشش کی گئی چنانچہ لارڈ ولیم بینٹنگ کی پیش کردہ قرارداد میں ذریعہ تعلیم انگریزی قرار پایا۔ جس میں کہا گیا کہ ''گورنر جنرل اجلاس کونسل کی یہ رائے ہے کہ حکومت برطانیہ کا بڑا مقصد اہل ہند میں یورپین لٹریچر اور سائنس کی اشاعت کرنا ہے جس قدر قوم مقاصد تعلیم کے لیے مخصوص ہیں وہ صرف انگریزی تعلیم پر صرف ہونی چاہیں۔'' ۱۷ اس سے قبل سرکاری و غیر سرکاری سطح پر مشرقی زبان و علوم کی تعلیم دی جاتی تھی جس کو حکومت کی تائید بھی حاصل تھی۔ اس لیے اس نئی قرارداد پر بہت لے دے ہوئی۔ اس قرارداد کی وجہ سے مدارس میں عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم پر انگریزی زبان حاوی ہو گئی کیونکہ اس قرارداد کا مقصد ہی یہ تھا۔ جس کے مطابق ''۱۸۳۵ء میں لارڈ ولیم بینٹنگ گورنر جنرل نے بہ ترغیب و اتفاق رائے لارڈ میکالے بذریعہ ریزولیوشن یہ تصفیہ کیا کہ اصل مقصد تعلیم اشاعت علوم انگریزی ہے اور مشرقی علوم بے کار ہیں کیونکہ انگریزی تعلیم دینا قرین مصلحت تھا۔'' ۱۸

سرکاری تعلیمی کمیٹی (۱۸۳۵ء) کے قیام سے انگریزی زبان کی فوقیت و عظمت کو تسلیم کر لیا گیا لیکن فارسی کے مقابل اسے فروغ دینا ابھی ممکن نہ تھا لہذا فی الحال اس کے لیے اردو زبان کا انتخاب کیا گیا اور اسے فروغ دینے کے لیے اس کی سرکاری سرپرستی کی گئی۔ یہ تیسرا واقعہ تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ فارسی کو ختم کرنا آسان اقدام نہ تھا۔ چنانچہ نتیجتاً انگریزی کو تعلیمی اور دفتری زبان کے طور پر تسلیم کر لیا گیا اور نچلی سطح (تھانے، کچہری، پٹواری، چونگی، محصول داری) پر اول اردو زبان استعمال میں آتی جبکہ اعلیٰ سطح پر انگریزی زبان کا چلن رہا۔ پنجاب بھی جب انگریزی قلمرو کا حصہ بنا تو یہاں کی سکھ حکومت میں فارسی زبان ہی رائج تھی یہ وہ واحد صوبہ ہے جہاں فارسی زبان کا دور دورہ زیادہ عرصہ رہا اور جو سب سے آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری میں شامل ہوا۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء میں لاہور سمیت پنجاب کے دیگر اضلاع کے دفاتر میں بھی اردو زبان کے نفاذ کا حکم جاری ہوا۔ یہاں یہ امر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اردو کو بطور دفتری زبان کے استعمال کا آغاز و ارتقا بھی پنجاب سے ہوا۔ ۱۹

پنجاب میں انگریزوں کے لیے اس وقت انتظامی بحران پیدا ہو گیا۔ جب انگریزی عدالتوں کے سامنے مقدمات میں انگریزی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے شہادتوں کی پیشی میں مشکلات اور پیچیدگی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ عوام فارسی، اردو اور مقامی بولیاں جانتے اور سمجھتے تھے جبکہ انگریزی سے اتنی شد بد نہ رکھتے تھے۔ جس کی وجہ سے مسائل پیش آنا شروع ہو گئے۔ جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے عدالتوں کے ریڈر معاونت کرتے تھے۔ لیکن ان کی طرف سے کیے جانے والے ترجمے بھی مسائل کا باعث بنتے وجہ یہ تھی کہ بہت سے مقامی الفاظ اور اصطلاحات کا انگریزی میں ترجمہ کرنا محال ہو جاتا تھا۔ پھر یہ کہ انگریزی کی اعلیٰ تربیت کا وسیع پیمانے پر اہتمام بھی اسقدر آسان کام نہ تھا کہ اہل کاروں سے لے کر عوام تک سب کو انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کے مواقع

فراہم کیے جا سکتے۔

چنانچہ مسئلہ کے حل کے لیے ۱۷ مئی ۱۸۴۹ء میں سیکرٹری بورڈ آف ایڈمنسٹریشن جی جے کرسچن کی طرف سے لاہور، لیہ، جہلم کے کمشنروں، پشاور اور ہزارہ کے ڈپٹی کمشنروں، سیشن ججوں اور پہاڑی ریاستوں کے منتظمین کو مراسلہ لکھا گیا۔ جس میں ان سے رائے طلب کی گئی کہ مقامی کارروائی کے لیے نئے مفتوحہ علاقوں میں کونسی زبان استعمال کی جائے۔ مزید یہ کہ بیشتر علاقوں میں چونکہ اردو اور فارسی زبان کا استعمال عام ہے اس لیے کیوں نہ انہی زبانوں کو دفتری امور کے لیے استعمال کیا جائے۔ کمشنر لاہور نے اردو، مسٹر برونگ نے پنجابی، میجر ایڈورڈ نے فارسی کو دفتری زبان بنانے کی تجویز دی۔ ان آراء کو جمع کرنے کا معاملہ بورڈ کے سامنے پیش کیا گیا جس میں سر ایچ ایم لارنس اور جی ایم منسن شامل تھے۔ انہوں نے یہ سفارش کی کہ اردو کو دفتری زبان کی حیثیت سے نافذ کیا جائے لیکن عدالتوں میں بیانات اور گواہیاں فارسی میں بھی لی جا سکتی ہیں۔ پشتو، ملتانی، پنجابی، بولیوں کی حیثیت کو تسلیم کیا جائے گا لیکن ان بولیوں میں پیش کردہ بیانات اور گواہیوں کے مصدقہ اردو ترجمہ کی نقل پریذائیڈنگ افسر کارروائی کے بعد داخل دفتر کرے گا۔ نیز یکم جون ۱۸۴۹ء سیکریٹری بورڈ نے یہ مشورہ بھی دیا کہ لاہور پشاور، ملتان، لیہ، جہلم اور ہزارہ ڈویژن کے لیے اردو زبان کے استعمال کی سفارش کی جائے۔ جواباً ۷ جون ۱۸۴۹ء کو پشاور کے ڈپٹی کمشنر میجر کپٹن لارنس، ۲۷ جون ۱۸۴۹ء کو سندھ بار کے ڈپٹی کمشنر، کمشنر ملتان ڈویژن، ڈپٹی کمشنر ہری پور ہزارہ، ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان نے فارسی ہی کو عدالتی و دفتری زبان رکھنے پر زور دیا جبکہ کمشنر جہلم ڈویژن ایڈورڈ تھارنٹن، ڈپٹی کمشنر ضلع گجرات، ڈپٹی کمشنر شاہ پور، ڈپٹی کمشنر ضلع راولپنڈی، ڈپٹی کمشنر لیہ اور کمشنر لاہور ڈویژن نے اردو زبان کے حق میں فیصلہ دیا۔

کمشنر لاہور ڈویژن نے ۲۸ جون ۱۸۴۹ء کو یہ فیصلہ اس لیے دیا کہ لاہور ڈویژن میں اردو پہلے ہی استعمال ہو رہی تھی۔ چنانچہ یہ سرکاری زبان قرار دیے جانے کی اہل تھی۔ ۱۷ اگست ۱۸۴۹ء کو مذکورہ بالا تمام افسران کی آراء کے پیش نظر بورڈ نے درخواست کی کہ لاہور اور جہلم ڈویژن اور جھنگ، پاکپتن کے اضلاع میں اردو دفتری و عدالتی زبان ہو گی اور پنجاب کے دیگر علاقوں میں فارسی کو حسب دستور قائم رکھا جائے گا۔ سر جان لارنس نے ایک نوٹ تحریر کیا کہ اپریل ۱۸۵۱ء کے ایک حکم نامہ کی رو سے پنجاب کی تمام عدالتوں میں اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی تحریر کیا گیا کہ ہر چند ان علاقوں میں فارسی اور اردو زبانیں یکساں طور پر رائج ہیں لیکن اردو کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ ''لنگوا فرینکا'' یعنی تمام ہم عصر زبانوں میں ممتاز ہے بلکہ ہندوستان کے ہر حصہ میں جہاں اور زبانیں مروج ہیں یہ بھی سمجھی جاتی ہے چونکہ اس زبان کے ذریعہ ہندوستان

کے ہر حصہ میں کام چلایا جا سکتا ہے اس لیے رابطہ کے لیے بہتر زبان یہی ہے۔لہٰذا اردو زبان کے نفاذ سے اس کی ترقی و ترویج میں بھی مدد ملے گی۔ تاریخ شاہد ہے کہ انگریزی اقتدار جس کی ابتدا مدارس، کلکتہ، بمبئی سے ہوئی اس وقت اردو زبان اتنی شستہ اور ترقی یافتہ نہ تھی جیسی انگریزی اقتدار کے بعد ہوئی ۔ اگر ہندوستان کے تمام حصوں میں عام کاروبار کی ضرورتوں کو باحسن خوبی پورا کر سکنے کی صفت اور صلاحیت اردو زبان میں نہ ہوتی تو انگریزوں کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مدارس، بنگال یا گجرات کی بولیوں کو چھوڑ کر خواہ مخواہ اس زبان کو ان پر ترجیح دیتے کیونکہ اجنبیت کے لحاظ سے تو ان کے لیے سب زبانیں یکساں تھیں۔لیکن انگریز حکمرانوں کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ اردو کے مقابلے میں کسی اور مقامی زبان میں تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کی ایسی جامع صلاحیت موجود نہیں ہے۔غرض عدالتوں میں اردو بان رائج ہونے سے مقدمات کے فیصلے بھی اردو زبان میں تحریر کیے جانے لگے۔ یہ فیصلے ہرقسم کے مقدمات پر مبنی تھے۔جن کی تعداد لاکھوں میں بتائی جاتی ہے۔[۲۰]

اردو کے بطور دفتری زبان کے نفاذ میں کئی رکاوٹیں بھی آئیں۔ اردو پنجابی کا مسئلہ ہوا بعد ازاں اردو ہندی قضیہ شروع ہو گیا۔جس نے وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کر لی۔ اردو رومن رسم الخط کی سفارشات پر بھی زور دیا گیا لیکن اس سب کے باوجود اردو زبان ارتقا کی منازل طے کرتی چلی گئی۔ الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے فوراً بعد لاہور میں اردو کا نفاذ ہو گیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۴۹ء اور ۱۸۵۰ء کے دوران جو درخواستیں اور دفتری کار کروائیاں فارسی میں ہو رہی تھیں ان میں سے اکثر کو اردو میں منتقل کیا جانے لگا۔اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نہ صرف سکھوں بلکہ انگریزوں کے ابتدائی دور میں ۱۸۵۰ء تک لاہور میں دفتری زبان فارسی، فرامین اور روبکاروں میں بدستور موجود تھی۔ اس ضمن میں "نقل پروانہ دیگر"[۲۱] ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ یہ نقل پروانہ "موضع رتہ" کی جاگیر کا ہے جس کا نصف سکھوں کے عہد میں پیر قلندر شاہ کی جاگیر میں چلا گیا اور بعد ازاں سرکار انگریزی نے بھی بحال رکھا۔ اس نقل پروانہ کی تاریخ تحریر ۱۸۵۰ء بمقام لاہور کی ہے۔ فارسی کی موجودگی میں اردو نثر کو دفتری کار روائیوں اور درخواستوں میں کس سرعت سے اپنایا جا رہا تھا۔اس کا اندازہ ذیل کے اس مراسلے سے بھی ہوتا ہے جو ۲ جون ۱۸۵۱ء کا تحریر کردہ ہے اور پنڈت اجودھیا پرشاد[۲۲] اسسٹنٹ کمشنر تحصیلدار لاہور کی جانب سے فقیر سید نور الدین محمد بخاری کو دربارۂ عمارات بابت مرمت طلب کے لکھا گیا ہے۔

> "جناب فیض مآب مخدوم و مکرم بندہ فیض بخش فیض رساں جناب فقیر خلیفہ نورالدین صاحب دام اقبالہ بعد گزارش تسلیمات کے التماس یہ ہے کہ منظوری صاحبان صدر ممالک پنجاب پیشگاہ صاحب ڈپٹی کمشنر لاہور سے بنام کمترین حکم صادر ہوا ہے کہ کس قدر مکانات بادشاہی اور مقبرہ جات اور زیارت گاہ اس علاقہ میں لائق مرمت و تعمیر طلب ہیں اور ان کی مرمت ضروری میں کیا خرچ

آئے گا۔ فقط چونکہ عہد سرکار خالصہ میں کام مرمت مکانات سرکاری کا تفویض ملازمان جناب کے تھا اور آپ کو حال جملہ مکانات بادشاہی زیارت گاہ اور مقبرہ اور مسجد کا جو لائق مرمت ہیں بخوبی معلوم ہو گا اس بات سے آپ کی خدمت مبارک میں گذارش کیا جاتا ہے کہ آپ معرفت کار پردازان اپنے کے براہ بندہ نوازی فہرست مکانات و زیارت گاہ وغیرہ معہ نام تعمیر کنندہ و مدت تعمیر بقیہ عہد بادشاہ مشہور حال بنام ایں کہ اور تخمینہ لاگت مرمت حال کے مرمت کرانے بہ معیاد دو روز کے عنایت فرمایئے کہ ہر چہار طرف شہر لاہور کے فلاں فلاں عمارت تعمیر کردہ شاہان سلف واقع ہے اور نیز مکانات زیارت گاہ اندرون شہر جو کہ نامی ہیں ان کا حال سب ارقام فرمایئے مثلاً مسجد وزیر خان، چوبرجی۔۔۔ اور درگاہ ملک ایاز اور دیگر مکانات جو نامی ہوں اور لائق مرمت ہوں ان کا حال مفصل ارقام فرمایئے۔ کمال نوازش آپ کی ہوگی۔"۲۳

اردو کو انتظامی زبان بنانے کیلئے دفتری اردو اصطلاحات پر توجہ دی گئی۔ اگر چہ اس حوالے سے فارسی کو دفتری زبان رہنے کی وجہ سے خاصا دخل رہا لیکن ساتھ ہی انگریزی اور خالص اردو اور ان زبانوں کی باہم آمیزش سے اصطلاحاتی عمل جاری و ساری رہا۔ اس کے لیے تراجم کا سہارا بھی لیا گیا مثلاً کرنل کلارک کمشنر لاہور کی انگریزی کتاب کا ترجمہ "دستور العمل داروغگان ممالک پنجاب دربابِ انتظام پولیس" کے عنوان سے موتی لال (مترجم محکمہ چیف کمشنری پنجاب) نے کیا جو ۱۸۵۷ء میں مطبع پنجابی لاہور سے شائع ہوا۔ دفتری اور قانونی کتب اور ان کے تراجم کی شرحیں بھی منظر عام پر آئیں جو سب سے زیادہ لاہور میں لکھی اور چھاپی گئیں جن کی فہرست درج ذیل ہے۔

"کلید گنج امتحان مال" مصنفہ پنڈت رام پرشاد (۱۸۵۱ء)، پند نامہ عیال داراں (۱۸۵۷ء)، پنجاب کا اردو نقشہ (۱۸۶۰ء) دستور العمل، (مترجم) منشی حکم چند (۱۸۶۱ء)، بیوپاریوں کی پیتک مصنفہ منشی سکھ دیال (۱۸۶۱ء)، تعزیرات کا اردو ترجمہ از مولوی عبدالطیف خان (۱۸۶۱ء)، ۶۲-۱۸۶۱ء پنجاب کے نظم ونسق کی رپورٹ (مترجم) پنڈت اجودھیا پرشاد (۱۸۶۲ء)، قانون دیوانی کا ترجمہ (۱۸۶۲ء)، کلید گنج امتحان قانونی (۱۸۶۲ء)، ضابطہ فوجداری (۱۸۶۲ء)، احکام سرکاری کا خلاصہ از پنڈت سورج بھان (۱۸۶۲ء)، تعلیمی رپورٹ ۱۸۶۲ء مصنفہ کپتان فلر مترجم لالہ رام جی (۱۸۶۲ء)، قانون فوجداری (۱۸۶۲ء)، رہنمائے مجسٹریٹ (اسکیپ وک (Skipwick) کی کتاب کا ترجمہ) ۱۸۶۲ء گنج سوالات، کلید گنج سال گزاری کے قواعد (آرکسٹ کی کتاب کا ترجمہ) ۱۸۶۳ء، آرکسٹ کی کتاب "پنجاب کا قانون دیوانی کا ترجمہ"، قواعد بموجب ایکٹ مالگزاری پنجاب، ہدایت نسبت کمیٹی ہائے لوکل ریٹ، مجموعہ ایکٹ ہائے ۱۸۶۷ء، قانون دیوانی پنجاب (حصہ اول)، مجموعہ تعزیرات ہند، دفتر خانہ تحصیل از سورج بھان، قواعد پٹواریاں، مجموعہ قوانین تعزیرات ہند مترجم منشی عظمت اللہ، ریونیو مینویل

مصنفہ رابرٹ نیڈ ہم کسٹ کا ترجمہ دستور العمل (مترجم) پنڈت سورج بھان ۱۸۷۰ء، قانون رسوم عدالت ہائے ہند مترجم سید محمد لطیف ۱۸۷۰ء، دستور العمل داروغہ (۱۸۷۲ء)، دستور العمل پٹواریاں (۱۸۷۲ء)، ہدایت نامہ زمینداران (۱۸۷۲ء)، ہدایت نامہ مالگزاری (۱۸۷۲ء)، ہدایت نامہ پٹواریاں، مفید مالگزاری (۱۸۷۲ء)، کلید گنج مال (۱۸۷۲ء)، پنجاب کا قانون دیوانی از جی ڈی ٹرملٹ مترجم پنڈت سورج بھان، اصول قانون دیوانی (حصہ دوم)، اصول دستور قانون دیوانی پنجاب (۱۸۷۲ء)، مجموعہ قوانین دیوانی پنجاب مرتبہ لالہ جیون داس، دستور العمل تحصیلداران، دستور العمل جیل خانہ جات مجریہ رابرٹ منٹگمری، رسالہ علم اصول قانون مارکس بلیکسٹن کی تشریحات قوانین انگلستان (مترجم) مولوی محمد حسین، تعلیم پٹواریاں از ٹیک چند (۱۸۷۷ء)، رسالہ علم اصول قانون از ای ڈبلیو پارکر مترجم مولوی محمد حسین (۱۸۸۴ء) کے علاوہ لالہ مدن گوپال[۲۴] نے میونسپل ایکٹ، ایکٹ مرزا عان پنجاب، ایکٹ لگان پنجاب، لوز ایکٹ پنجاب وغیرہ لکھیں۔[۲۵]

دفتری اردو نثر کے لیے پنجاب گزٹ میں بے شمار قواعد وضوابط کے تراجم اور اشتہارات بھی اردو میں شائع کیے جاتے تھے۔ نتیجتاً دفتری، انتظامی وعدالتی سطح پر اس زبان میں کارروائی کرنے کے لئے کوئی دقت نہ رہی تھی۔ یکم مئی ۱۸۵۸ء کو دفتری اردو نثر کی ترویج و اشاعت کے مقصد کے لیے ڈبلیو ڈی آرنلڈ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایما پر پہلا ماہوار اخبار ''سرکاری اخبار'' کے نام سے لاہور سے جاری کیا گیا۔ جو پنجاب بھر میں بے حد مقبول ہوا۔ اس کی ادارت پنڈت دیوان اجودھیا پرشاد کے سپرد تھی۔ ۱۸۶۰ء میں بابو چندر ناتھ متر بھی اس کے ایڈیٹر رہے۔[۲۶] گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ ۷ دسمبر ۱۸۶۳ء میں ''سرکاری اخبار'' کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے۔

> ''اس کے اوپر برطانیہ عظمی کے آلات حرب کا طغریٰ موجود ہے یہ اخبار لاہور میں سرکاری تعلیمی پریس میں چھپتا ہے یہ رسالے کے طور پر چھوٹی فولیو تقطیع میں طبع ہوتا ہے۔ ہر صفحے میں دو کالم ہوتے ہیں۔ پنڈت اجودھیا پرشاد اس کے ایڈیٹر ہیں جو متعدد ہندوستانی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ یہ ہر مہینے کی پہلی کو نکلتا ہے اس بات کو بھی خاص طور پر لکھا گیا ہے کہ اس رسالے کے کاتب کا نام محمد علی خطاط ہے۔''[۲۷]

''سرکاری اخبار''[۲۸] میں ہر مہینے کی خبروں کا خلاصہ، نئے تقرر و تبادلے کی خبریں، اہم فیصلوں کی نقول، منڈیوں کے بھاؤ، سرکاری حکم ناموں کے علاوہ قوانین وقواعد اور اصول وضوابط کا اردو ترجمہ بھی اس میں شائع ہونا شروع ہوا۔ ''شجرہ خاندانی منشی محمد عظیم'' میں اس کی بابت لکھا ہے کہ ''اس کی غرض یہ تھی کہ قوانین احکام سرکاری سے زمیندار واقف ہوں اپر پٹواری و نمبردار کو وہ مفت بھیجا جاتا تھا۔ تقرر و تبدیلی رخصت، ملازمان سرکاری، کارندگان و دیہات اخبارات میں درج کی جاتی تھی''۔[۲۹] یہ دفتری اخبار علمی و ادبی مندرجات کا حامل بھی تھا۔ اس

کے علاوہ اس کے تتمہ میں سرکاری احکامات بھی شائع ہوتے تھے۔ جس کا نام ہی ''تتمہ سرکاری اخبار'' تھا۔ بقول دنا سی ''اسے صوبہ پنجاب کا پولیس گزٹ سمجھنا چاہیے''۔۳۰؎ ''سرکاری اخبار'' دس برس بعد ۱۸۶۸ء میں بند ہو گیا اور یکم جنوری ۱۸۶۹ء ۳۱؎ کو دوبارہ جاری ہو کر جولائی ۱۸۶۹ء میں بند کر دیا اور اس کی جگہ اخبار ''اتالیق پنجاب'' ۳۲؎ کے نام سے ایڈیٹر پیارے لال آشوب اور سب ایڈیٹر مولانا محمد حسین آزاد کی ادارت میں جاری ہوا۔ ۳۰ جنوری ۱۸۶۹ء کے ''اکمل الاخبار'' دہلی میں عقیدت مندانہ نوٹ کے ساتھ اس اخبار کا اشتہار ۳۳؎ شائع ہوا۔ پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد کی کاوشوں نے اس کا ایک معیار قائم کیا۔ جسے ۲۴ اگست ۱۸۶۹ء کا ''پنجابی'' اخبار سراہتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''جس آب و رنگ سے یہ اخبار ان کے اہتمام میں جاری رہا ایک عالم نے دیکھا کوئی دنوں تک قلم خاص سے لکھا جاتا تھا کوئی اخبار اس سے لگاؤ نہ کھاتا تھا۔ مضامین ویسے بھی آبدار مملوانہ فوائد ہوتے تھے۔ ایسے ایسے علمی آرٹیکل دیئے جاتے تھے جو اردو میں کبھی شائع نہ ہوئے تھے اور مرغوب ایسے کہ شاید اب تک بھی اخباروں میں اگر ان کی نقل چھپتی تو عجب نہیں۔ خبریں ویسی ہی تھیں اور دلچسپ ہوتی تھیں کوئی اخبار اس کی ہمسری و برابری مضامین علمی نہ کر سکتا تھا۔ زبان اس کے نہایت اردوئے معلی تھی۔ کوئی کلمہ اس کا ملاحت و لطف سے خالی نہ تھا۔'' ۳۴؎

مزید یہ کہ ''اس اخبار کو یہ فوقیت حاصل تھی کہ یہ کوہ نور کے مقابلے میں حقیقی معنوں میں ایک اچھا اخبار تھا۔ خبروں اور اعلانات کے علاوہ اردو ادب پر مضامین درج ہوتے تھے اور یہ دیہات تک بھی پہنچتا تھا۔'' ۳۵ ۔''سرکاری اخبار'' کے علاوہ اردو نثر میں قانون کا پہلا ماہوار رسالہ ''گنج شائگاں'' (۱۸۶۰ء) بھی لاہور ہی سے جاری ہوا جو بعد ازاں پندرہ روزہ ہو گیا۔ اس میں بھی حکومت کے احکام وقوانین درج ہوتے تھے۔ منشی ہرسکھ رائے اس رسالے کے مالک اور فضل الدین مہتمم تھے اور یہ مطبع کوہ نور سے شائع ہوتا تھا۔ اخبار ''کوہ نور'' میں اس رسالے کے بارے میں جو اعلان شائع ہوتا تھا اس سے اس کی نوعیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

> ''یہ قانونی رسالہ بہ منظوری گورنمنٹ پنجاب مہینے میں دوبار دو حصوں میں چھپتا ہے جس میں ترجمہ فیصلہ جات دیوانی وفوجداری چیف کورٹ اور صاحب فنانشل کمشنر پنجاب کا بہت صحت کے ساتھ مع ترجمہ ایکٹ ہائے کونسل وضع آئین وقوانین ہندوسرکلر (کذا) چیف کورٹ پنجاب و صاحب فنانشل کمشنر بہادر پنجاب صاحب انسپکٹر جنرل پولیس و رجسٹری دستاویزات پنجاب و احکام متفرق گورنمنٹ پنجاب و گورنمنٹ ہند و خلاصہ فیصلہ جات ہائی کورٹ ہائے کلکتہ و الہ آباد و بمبئی و مدارس مع نظایر عدالت العالیہ (کذا) کونسل چاہتا ہے۔'' ۳۶؎

اس رسالے میں مطبع کوہ نور سے شائع ہونے والی قانون کتب کی فہرستیں بھی چھپتی تھیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور رسالہ ''انوار الشمس'' ۳۷ (۱۸۶۷ء) بھی لاہور سے ''گنج شائگاں'' کے ساتھ ہی شائع ہوتا تھا۔ ان دونوں رسالوں کی ادارت پنڈت سورج بھان کے سپرد تھی۔ ''گنج شائگاں'' سے قانونی اور دفتری اردو نثر کو ملنے والے فروغ اور اسلوب کا اندازہ ذیل کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

''ریزرولیوشن

جناب وائسرائے بہادر باجلاس کونسل معافی عطیہ ۱۸۵۹ء کی شرائط پر غور فرما کر اشتہار دیتے ہیں کہ بغاوت کے سرغنہ لوگوں کی معافی کی نسبت جو استثناء تھا وہ اب اٹھا لیا گیا ہے۔ لہذا یہ لوگ اس شرط پر اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے آئیں کہ حکام ضلع کو اپنی واپسی کی اطلاع کر دیں اور آئیندہ کو نیک چلن رہیں مگر ضرور ہے کہ ایسے لوگ جب کبھی اپنے مقام یا ضلع کی حدود سے باہر جانا چاہیں تو اول حکام ضلع کو اس امر کی اطلاع کر دیں۔ قاتلوں اور فوج کے باغیوں کے سرغنہ کی نسبت استثنائے مذکورہ قائم رہے گا اور اشتہار مندرجہ بالا کی کوئی عبارت سابق بادشاہ دہلی کے بیٹے فیروز شاہ کے متعلق نہ ہو گی۔'' ۳۸

قانونی اور عدالتی نثر کا ایک اور نمونہ مولوی محمد حسین کے ترجمہ کردہ رسالہ ''علم اصول قانون'' سے ملاحظہ ہو:

''علم اصول قانون کی حدود علم اخلاق کی حدود کی مانند فقط عمل انسان کی حدود سے معین ہوتی ہے۔ لیکن اگر ہم اس سوال کو مقنن کی عمل نظر سے دیکھیں تو ایک خاص ظاہر حد معین ہو سکتی ہے او ریہ بات کہ مقنن کا عمل نظر کیا ہے، اس وقت بخوبی سمجھ میں آوے گا جب ہم مکافات یا تہدید قانون کے معیار پر بحث کریں گے۔ بنتھم صاحب فرماتے ہیں کہ تمام افعال انسانی کی وجہ محرک یہ بات ہے کہ انسان خوشی کی خواہش رکھتا ہے اور تکلیف و رنج جو کسی طریقہ عمل سے بطور نتیجہ کے پیدا ہوتی ہے مکافات یا تہدید ہوتی ہے انسان سے وہ فعل کراتی ہے۔۔۔'' ۳۹

اردو کی دفتری اور عدالتی دستاویزات کے قدیم نمونے جہاں اردو نثر کی ابتدائی نشوونما اور ترقی کے لیے ماضی کی بنیاد فراہم کرتے ہیں وہیں ان سے اسلوب اور ہیئت کے ضمن میں ہونے والے سابقہ تجربات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں۔ میاں محمد اسلم نے اپنی کتاب ''اردو کے قدیم عدالتی نمونے دستاویزات پنجاب کی روشنی میں'' ۱۸۶۰ء تا ۱۸۶۵ء تک کے مختلف مقدمات اور فیصلوں کے ضمن میں ہونے والی مراسلت کا اندراج کیا ہے۔ جس سے عدالتی اردو نثر میں اس وقت کے رائج اسلوب نگارش کا یہ قدیم نمونہ سامنے آتا ہے:

''جناب عالی

جناب کمشنر بہادر حال دہلی نے منشائے طلب کیفیت جناب جوڈیشل کمشنر بہادر سابق کا درجہ

گزاشت جائداد ازاں خاص فدوی و ازاں مادر فدوی کے ایمائے قرقی کا بہ نسبت اس جائیداد کے تصور کر کے خلاف تحقیقات سابق و حال جناب صاحب ڈپٹی کمشنر و صاحب کمشنر سابق و خلاف آئین مجوزہ گورنمنٹ و احکامات ایکٹ ۲۵ / ۵۷ء و دفعہ دہم ایکٹ ۹ - ۵۹ء خلاف قانون سول کورٹ مجوزہ بندگان حضور و خلاف اشتہار مجریہ جناب ملکہ معظمہ دام اقبالہا رائے اپنی بحضور جوڈیشل کمشنر اس طرح لکھی کہ جس خاندان میں سے کسی ایک سے بھی جرم ہوا ہو سو جائداد اس کے لواحقوں کی قابل ضبطی ہے۔ خداوندا جو رائے صاحب ممدوح محض خلاف قواعد سرکار ہے کس لئے کہ بموجب احکام قوانین سرکار ظاہر ہے کہ باپ کرے تو باپ پاوے اور بیٹا کرے تو بیٹا علاوہ اس کے میری اور میری ماں کو سراپا حق تلفی ہے کس لئے کہ جو جائداد منقولہ و غیر منقولہ قاضی فیض اللہ تخمیناً بقدر چالیس ہزار روپے کی تھی وہ نیلام ہوئی بعض ضبط ہے اس جائداد گزاشت شدہ میں کچھ حق قاضی مذکور نہیں ہے حضور ملاحظہ قبالجات موسومہ فدوی و موسومہ مادر فدوی فرما کر اور نیز تحقیقات سابقہ جناب ڈپٹی کمشنر کی تحقیقات حال صاحب ممدوح و تحقیقات صاحب کمشنر بہادر سابق فرما کر مجھ نا کردہ گناہ کی دادرسی فرمائیں اور فہرست جائداد کی کہ جو بنام قاضی مذکور نیلام ہوئی اور ہنوز مستغرق ضبطی ہے ملاحظہ حضور گزارتا ہوں اور باقی حال عرضی مشمولہ کورغذ مثل معروضہ ۱۵ مئی سن حال جو فدوی نے بحضور جناب جوڈیشل کمشنر گزرانی واضح رائے عالی ہو گا۔ آفتاب حکومت و اقبال تابان رہے اور واضح رائے عالی ہو کہ جائداد میری گزاشت ہوئی وہ اس فہرست سے خارج ہے فقط

عرضے

فدوی محمد یعقوب ساکن دہلی

حال وارد لاہور

معروضہ ۱۸ مئی ۱۸۶۱ء'' ۳۹

دفتری اردو نثر کے اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو دستیاب نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے پہل مغلق تراکیب، پیچیدہ جملے، اور دوراز کار اصطلاحات استعمال کی جاتیں تھیں۔ جو بعد ازاں ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے سادگی اور روانی سے متصف ہوئیں پھر اصطلاحات کے تراجم اور اصطلاحات سازی کے عمل کو بھی جاری رکھا گیا مثلاً ازالۂ حیثیت عرفی، حق شفع، انشائے قبض الوصول، ہنڈی، واجب الادا، ڈاک چوکی، چوکیدار، تھانہ جیسے الفاظ دفتری اصطلاحات اور بول چال کی زبان میں درج بس گئے۔ ایسے مراسلات یا دستاویزات جن کی ترسیل عوام کو کی جاتی تھی ان کا اسلوب قدرے سادہ اور واضح ہوتا تھا۔ اس کے برعکس ایسی دستاویزات، شرحیں، کیفیت نامے اور دفتروں کی باہمی خط و کتابت کی زبان خالص تکنیکی اور اصطلاحات سے مزین ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانوی عہد کے ابتدائی دور میں اردو دفتری اور عدالتی زبان کے طور پر نہ صرف رائج ہوئی بلکہ عدالتی اور دفتری

ضرورتوں اور تقاضوں کو بااحسن طریقے سے پورا بھی کرتی رہی۔ چنانچہ دستیاب ہونے والی قانونی اور دفتری نثری کتب کی بناء پر ڈاکٹر عطش درانی نے احسن مارہروی کی ''تاریخ نثر اردو'' کا یہ دعویٰ بجا طور پر غلط ثابت کیا ہے کہ ۱۸۹۵ء سے قبل پنجاب میں کسی قانونی یا دفتری نثر کا کوئی نمونہ نہیں ملتا۔ قانونی نثر کے ارتقا ہی کا ثمر ہے کہ عہد حاضر میں نمبردار، تحصیلدار، پٹواری، محکمہ مال، محکمہ پولیس کے علاوہ نچلی سطح پر تمام تر عدالتی کارروائی اردو ہی میں ہوتی ہے۔ دفتری اردو نثر بالکل الگ مزاج رکھتی ہے درحقیقت اردو زبان زیادہ تر ادبی طور پر نثر میں برتی گئی ہے۔اس لحاظ سے اس زبان کا عمومی مزاج ادبی ہے۔ چونکہ اس میں شعر و شاعری کا چرچا رہا ہے اس لیے یہ ادبی زبان اپنے مخصوص لب و لہجے اور برتاؤ کے اعتبار سے جذباتی اور شاعرانہ بھی ہے۔

زبان کے محل استعمال سے اس کا مزاج متعین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عدالتی، دفتری، کاروباری اور ادبی حیثیت سے اس کا مزاج مختلف ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہر چند کہ اردو زبان کا عمومی مزاج اور استعمال ادبی ہے لیکن اسکی وسعت کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں عدالتی، دفتری، انتظامی، کاروباری، اخباری امور کو سرانجام دینے کی بھی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔

ب) انجمن پنجاب اور اردو نثر:

۱۸۵۷ء کے بعد لاہور میں اردو زبان و ادب پر خاص توجہ ہوئی اس کے کچھ سیاسی، سماجی اور تعلیمی اسباب تھے۔حکومتی عہدیداران جن کی زیادہ توجہ سماجی، انتظامی اور عسکری معاملات کی طرف تھی جبکہ علم و ادب میں ان کی دلچسپیاں سماجی زندگی اور تاریخ کی جانب تھیں۔ زبان و ادب اور تعلیم سے دلچسپی نظامتِ تعلیم کے حصہ میں آئی۔ چونکہ جنگ آزادی کے تباہ کن ہنگاموں کے باعث تمام ملک میں معاشرتی اور تعلیمی نظام کا شیرازہ منتشر ہو گیا تھا اور عوام الناس انگریزوں سے بدظن و بدگمان ہو چلے تھے اس لیے جیسے ہی انگریزوں نے اقتدار سنبھالا تو اس بگڑے نظام اور بدظنی و بدگمانی کی کیفیت کو دور کرنے کے لیے تمام ملک میں ''انجمن سازی'' کا سہارا لیا تاکہ اطمینان سے حکومت کرسکیں۔ جس میں انہیں بے حد کامیابی بھی ہوئی۔ چنانچہ اول اول بنارس، لکھنؤ، شاہجہاں پور، بریلی اور کلکتہ میں اس قسم کی انجمنیں اور سبھائیں قائم ہوئیں۔

بنیادی طور پر ان انجمنوں کا مقصد مشرق ومغرب بالفاظ دیگر حاکم اور محکوم کے ذہن وفکر کے بُعد کو کم کر کے ہم آہنگی پیدا کرنا تھا۔ انگریز سرکار کی ایماء پر لاہور شہر میں بھی ایک انجمن کا قیام عمل میں آیا جو ''انجمن پنجاب'' کے نام سے مشہور ہوئی یہ نہ صرف پنجاب میں بلکہ ہندوستان کی بھی بہت بڑی انجمن تھی۔ اردو نثر کے ارتقا میں تمام انجمنوں کے مقابلے میں اس انجمن کا کردار بنیادی اور زیادہ فعال رہا ہے۔''انجمن پنجاب'' ادبی دنیا میں

عنوانی مشاعروں جدید اور اردو شاعری کے حوالے سے جانی جاتی ہے لیکن یہاں پر ''انجمن پنجاب'' کے کردار کا احاطہ لاہور میں اردو نثر کے ارتقا میں ممد و معاون ہونے کے حوالے سے کیا جائے گا۔ جس کے علم و ادب پر دور رس اثرات مرتب ہوئے اور اس کی پیروی میں پنجاب کے دیگر شہراں دہلی، راولپنڈی، سیالکوٹ، حصار، امرتسر، گورداسپور اور گوجرانوالہ میں اسی طرز کی انجمنیں قائم ہوئیں۔

یہ خوش بختی بھی لاہور کے حصے میں آئی کہ یہاں سے ''انجمن پنجاب'' جیسی علمی، تعلیمی اور ادبی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس نے انگریزوں کے ذہن میں موجود تعلیمی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، انتظامی اور لسانی نظریات کو کما حقہ پورا کیا۔ اس کے لیے جو بنیادی نظریہ اختیار کیا گیا وہ یہ تھا کہ مشرق و مغرب میں ہم آہنگی کے لیے مشرق کے تہذیبی و علمی ورثے کو بنیاد قرار دے کر اس کی ترویج و ترقی اور اشاعت کے ساتھ ساتھ مغربی علم و ادب سے بھی استفادہ کیا جائے۔ ابتدا میں سرکاری ملازمین اور چند رؤسا کی سرپرستی میں یہ تعلیمی انجمن اپنی خام صورت میں ''سکشا سبھا'' کے نام سے وجود میں آئی۔ بدلے ہوئے حالات اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جن بلند تر مقاصد کی ضرورت تھی ان کے لیے ''انجمن پنجاب'' کا قیام عمل میں آنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ لاہور میں ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو ''سکشا سبھا'' ہی کے مکان پر ایک تاریخی جلسہ میں لاہور کے رؤسا اور علم دوست حضرات شریک ہوئے اور میر مجلس اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنڈت من پھول نے ''سکشا سبھا'' کے خاطر خواہ نتائج نہ دینے پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے کثیر المقاصد بنانے کا عندیہ دیتے ہوئے کہا:

> ''اے صاحبان! ہم کئی برس سے اس فکر میں تھے کہ مثل کلکتہ و لکھنؤ وغیرہ اس شہر میں بھی جو دارالسلطنت پنجاب ہے۔ ایک مجلس، رئیساں نامی گرامی، عالم و فاضل شائق ہر علم و ہنر کے ایسی مقرر کی جائے کہ جس میں تنقیح مطالب مفیدہ پنجاب و ترقی علم و ہنر کے تحریراً و تقریراً عمل میں آ کر بذریعہ چھاپہ منتشر ہوا کرے مگر یہ مطلب ہمارا بدون میسر ہونے ایک زبردست عالم و فاضل۔ وحید عصر کے اب تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔''[۴۱]

اسی جلسہ میں پنڈت من پھول نے علم دوست مستشرق ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹز کا تعارف بھی کروایا جو کہ نئے نئے انگلستان سے لاہور میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل ہو کر آئے تھے اور اس انجمن کے محرک اور روح رواں تھے۔[۴۲] اسی نشست میں پنڈت من پھول کی تجویز پر اس انجمن کا نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب''[۴۳] رکھا گیا جس کے صدر کے طور پر ڈاکٹر لائٹنر کو منتخب کیا گیا۔ سکریٹری شعبہ فارسی کے لئے منشی ہرسکھ رائے (مہتمم اخبار ''کوہِ نور'') اور سکریٹری شعبہ انگریزی کے لیے بابو نوبین چندر رائے کا انتخاب عمل میں آیا۔[۴۴] جبکہ اراکین انجمن میں لاہور، امرتسر، سیالکوٹ، راولپنڈی، گجرات اور بنوں کی سرکاری، علمی اور سماجی شخصیات شامل تھیں۔

یوں ہندوستان کے ہر گوشے سے آنے والے مقامی اور غیر مقامی اہل قلم کی کوششوں سے لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی جو اب سے پہلے دہلی اور لکھنؤ کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں لاہور سے نامزد اولین اراکین کے ناموں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا جنھوں نے انجمن کے جلسوں میں شریک ہو کر اس کے مقاصد کو کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ ان میں مندرجہ ذیل حضرات شامل تھے۔

۱۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور
۲۔ دیوان بیج ناتھ، ای اے سی لاہور
۳۔ فقیر شمس الدین، آنریری مجسٹریٹ لاہور۔
۴۔ نواب عبدالمجید خان، آنریری مجسٹریٹ لاہور۔
۵۔ پنڈت موتی لال مترجم محکمہ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، لاہور
۶۔ ڈاکٹر رحیم خان اسسٹنٹ سول سرجن سپرنٹنڈنٹ میڈیکل کالج لاہور۔
۷۔ ڈاکٹر راماچرن بوس، اسسٹنٹ سول سرجن لاہور۔
۸۔ شیخ فیروز الدین، رئیس لاہور۔
۹۔ محمد برکت علی خان، تحصیلدار لاہور۔
۱۰۔ منشی رادھا کشن، رئیس لاہور۔
۱۱۔ مولوی کریم الدین، ڈپٹی انسپکٹر مدارس لاہور۔
۱۲۔ رائے مول سنگھ لاہور۔
۱۳۔ پنڈت رام دیا دہلوی لاہور۔
۱۴۔ مولوی محمد حسین، نائب سر رشتہ دار ڈائریکٹری پنجاب لاہور۔
۱۵۔ مولوی نیاز حسین، مدرس مدرس تعلیم المعلمین لاہور۔
۱۶۔ مولوی علمدار حسین، مدرس گورنمنٹ کالج لاہور۔
۱۷۔ بابو چندر ناتھ، کیوریٹر محکمہ ڈائریکٹری لاہور۔
۱۸۔ پنڈت امرناتھ، مترجم محکمہ جوڈیشنل کمشنر پنجاب لاہور۔
۱۹۔ منشی ہرگوپال سہائے، سر رشتہ دار محکمہ فنانشل کمشنر پنجاب لاہور۔
۲۰۔ منشی ہرگوپال داس، سر رشتہ دار کمشنری لاہور۔
۲۱۔ بابو برج لعل، لالہ چمن شاہ، پنڈت رادھا کشن، محمد علی اور جسونت رائے (طلباء میڈیکل کالج لاہور)۔[۴۵]

نیز اس جلسے میں پنڈت من پھول کی تجویز پر انجمن کے لیے ایک عمدہ قسم کے کتب خانہ کے قیام کا فیصلہ بھی ہوا۔ جس کا خیر مقدم کیا گیا۔ چنانچہ ڈاکٹر لائٹز، پنڈت من پھول، منشی ہرسکھ رائے، پنڈت رادھا کشن، فقیر شمس الدین خان، پروفیسر ظہور الدین خان، اور اخبار لاہور کرانیکل نے ہفتے بھر کے اندر ایک ہزار اٹھاسی کتب عنایت کردیں۔

انجمن پنجاب کے اغراض و مقاصد یہ طے پائے:

۱۔ ''قدیم مشرقی علوم کا احیاء اور لسانیات، بشریات، تاریخ اور ہندوستان اور ہمسایہ ملکوں کے آثار قدیمہ کے بارے میں تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی۔

۲۔ دیسی زبانوں کے ذریعے عوام میں تعلیم کا فروغ

۳۔ صنعت اور تجارت کی ترقی

۴۔ معاشرتی، ادبی، سائنسی اور عام دلچسپی کے سیاسی مسائل پر تبادلہ خیال، حکومت کے تعمیری اقدامات کو مقبول بنانا، ملک میں وفاداری اور مشترکہ ریاست کی شہریت کے احساس کو فروغ دینا اور عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کے مطابق حکومت کو تجاویز پیش کرنا۔

۵۔ مفاد عامہ کے تمام اقدامات میں صوبے کے تعلیم یافتہ اور بااثر طبقوں کو حکومت کے افسروں سے قریب تر لانا۔''[۴۶]

ہر چند کہ ''انجمن پنجاب'' کے اغراض و مقاصد علمی اور ادبی سے زیادہ سماجی، سیاسی اور معاشی تھے لیکن ڈاکٹر لائٹز کے بقول ''انجمن کا اصلی مقصد یہ ہے کہ اس میں عام مفاد کے مضامین پڑھے جائیں اگر وہ ترویج کے لائق اور پسندیدہ ہوں تو انجمن کے رسالے میں شائع ہوں اور اگر وہ گورنمنٹ کی توجہ کے قابل ہوں تو گورنمنٹ کو بھیج دیئے جائیں۔''[۴۷] انجمن نے جوں جوں ترقی کی توں توں اس کا لائحہ عمل اس بنیادی اور اصلی مقصد کے ساتھ وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ مثلاً

۱۔ ایک نمائندہ صوبائی کونسل کا قیام عمل میں آنا۔

۲۔ ایک دیسی سول سروس کی تشکیل اور اس کے امتحانات کے لیے طریقہ کار میں ترمیمات

۳۔ تعلیمی کانگریس کا قیام

۴۔ صحت و صفائی کے متعلقہ امور

۵۔ مختلف ادبی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر متعدد پمفلٹ یا مضامین شائع کرنا۔

۶۔ زراعت کے متعلقہ مسائل۔
۷۔ ہندوستان بھر میں موجود سنسکرت اور عربی مخطوطات کی حرفی نقل اور ان پر تحقیقی کام اور تجاویز دینا۔
۸۔ لاہور میں صنعتی آرٹ کے سکول کی بنیاد رکھنے کی تحریک۔
۹۔ انسداد دختر کشی [۴۸] اور متعدد دیگر معاملات جن کے متعلق انجمن نے مؤثر تحریک چلائی۔

چنانچہ اس وسیع لائحہ عمل کو عملی صورت دینے کے لیے متعدد کمیٹیاں اور سوسائیٹیاں مثلاً اخبار کمیٹی، ادبی و سائنسی کمیٹی، قانونی کمیٹی، صفائی کمیٹی، صنعتی سوسائٹی، تعلیمی کمیٹی، شاعروں کے اجتماع کی کمیٹی (جس نے نئے طرز کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی) وغیرہ بنائی گئیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ان مقاصد اور اقدامات کے تحت خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور حاکم اور محکوم کے درمیان اعتماد اور اتحاد کا رشتہ بحال ہوا۔ انجمن پنجاب صوبے بھر میں بیداری اور خود آگاہی پیدا کرنے اور جدید علوم کی ترویج میں بے حد مفید ثابت ہوئی۔ مثلاً ''انجمن پنجاب'' نے ملک کے مختلف حصوں میں مذکورہ بالا مقاصد کی حامل انجمنیں قائم کیں۔ مدرسے کھولے، ایک پبلک لائبریری، دارالمطالعہ اور لاء سکول قائم کیا۔ صنعتی نمائشوں کا اہتمام کیا۔ دیسی اور کلاسیکی زبانوں کے متعدد رسالے اور تراجم شائع کیے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عملی طریقہ یہ اپنایا گیا کہ مترجموں، عالموں، ایڈیٹروں اور مؤلفوں کی نقد انعامات سے حوصلہ افزائی کی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ انجمن پنجاب کے قیام کے دوسرے سال سے ہی تصنیف و تالیف کے سلسلہ کا آغاز کر دیا گیا۔ جس کا مقصد ملک کے لیے اردو، ہندی، سنسکرت، پنجابی اور عربی زبان میں مفید لٹریچر تیار کرانا تھا۔ چنانچہ آغا محمد باقر کے توسط سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے چار سالوں میں اردو نثر میں طب، تاریخ، گرائمر اور فلسفہ اخلاقیات کی درج ذیل کتب منصۂ وجود پر آئیں جن میں ''عربی کی گرائمر انگریزی اور اردو میں'' از ڈاکٹر لائٹز ''امراض الصبیان'' از ڈاکٹر رحیم خان ''ریاست راجپوتانہ اندور'' از پنڈت دھرم نارائن، ''تواریخ افغانستان'' از محمد حیات خان، ''جپ جی کا پرانا ارتھ'' از بابو نوبین چندررائے''، ''مارل فلاسفی یعنی اخلاق'' از پنڈت بسنت رام شامل تھیں۔ نیز ممتاز علماء و فضلا سے عام دلچسپی کے موضوعات پر مسلسل لکچروں کا اہتمام بھی کیا گیا اس کے لیے ہفتہ وار علمی مجالس کا انعقاد باقاعدگی سے ہونے لگا۔[۴۹] جہاں علمی و ادبی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے اور ان پر بحث کی جاتی۔ ان مجالس میں طے پانے والے قواعد و ضوابط میں چند ایک کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے کہ ایک طرف اردو زبان و ادب کو پہنچنے والے فائدے کا اندازہ ہو اور دوسری طرف لاہور میں ''مجلسی تنقید'' کی روایت کے پروان چڑھنے کی فضا اور ماحول کو محسوس کیا جا سکے۔

۱۔ جب مضمون ختم ہو جائے صاحب صدر ارباب انجمن سے رائے دریافت کریں۔

۲۔ جب کوئی صاحب گفتگو کریں تو بلا روک یا علامت بے صبری ان کا بیان سننا چاہیے۔

۳۔ دیوان بیج ناتھ کی تجویز پر یہ طے پایا کہ تمام تقریریں دیسی زبان میں ہوں گی جبکہ انگریزی تقریر کا ترجمہ اسی وقت سنایا جائے گا۔

۴۔ انجمن کی تجاویز اور جلسوں میں پڑھے جانے والے مضامین رسالے کی صورت شائع ہوں گے۔ اس رسالے کا نام انجمن کے نام کی نسبت سے ''رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' ہوگا۔

ڈاکٹر صفیہ بانو کی کتاب ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات'' اور آغا محمد باقر کے مضمون ''مرحوم انجمن پنجاب'' کے توسط سے انجمن پنجاب کے جلسوں پر نگاہ ڈالیں تو اس میں پڑھے جانے والے اردو مضامین اور ان کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے کہ پہلا جلسہ ۱۱ فروری ۱۸۶۵ء کو منعقد ہوا۔ جس میں لائٹنر نے صحت و تندرسی کے متعلق ایک مضمون پڑھا جس کا ترجمہ سیکرٹری نے ہندی میں سنایا۵۰ جبکہ محمد حسین آزاد نے بابو شیا ماچرن (ہیڈ کلرک محکمہ تعلیم) کا مضمون پڑھا جو ''حکمائ رواج دینے اور سکھلانے کے اخلاق'' پر لکھا گیا تھا جو انجمن کے پلیٹ فارم پر اردو زبان میں پڑھا جانے والا پہلا مضمون بھی تھا۔

ایک مضمون بابو چندر ناتھ متر کا تھا جس کا موضوع عربوں اور ہندوستانیوں کی ازمنہ قدیم میں سائنس کی ترقی تھا اور اس کا نفس مضمون یہ تھا کہ اہل ہند اور عرب نے کس کس علم میں ترقی کی اور تنزل کیونکر ہوا؟ اور اب ترقی کی امید کیونکر ہوسکتی ہے؟ بالفاظ دیگر اہل مشرق کے علمی انحطاط کے اسباب و علل پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے ان کے تدارک کی تدابیر بیان کی گئیں۔ یہ علمی مضمون ''رسالہ انجمن پنجاب'' فروری مارچ ۱۸۶۵ء کے شمارہ اول میں شائع ہوا۔ ایک مضمون محمد حسین آزاد نے اسلامی اور انگریزی حکومت کے مقابلہ کے موضوع پر پڑھا جبکہ پنڈت من پھول نے اپنے مضمون میں کثرت ازدواج کی خرابیاں بیان کیں۔ اس کے علاوہ اس جلسے میں ایک مضمون مولوی عزیز الدین نے بھی پڑھا۔

۱۷ فروری ۱۸۶۵ء کے جلسے میں محمد حسین آزاد نے ''فراخی شہر و اصلاح مکانات'' پیش کیا۔ ۲۴ فروری ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں جو اردو مضامین پڑھے گئے ان میں اردو کو عربی و فارسی الفاظ کی تخفیف سے سہل بنایا جائے، ہندی کو مثل اردو رواج دیا جائے نیز آزاد نے صنعت و تجارت کے فروغ پر مضمون پڑھا۔ ۳ مارچ ۱۸۶۵ء کے اجلاس میں عربی، فارسی، سنسکرت، اردو اور ہندی زبانوں کے فروغ کے لیے کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ اردو زبان کی کمیٹی کے اراکین میں دیوان بیج ناتھ (سپرنٹنڈنٹ) پنڈت سورج بھان و جمنا پرشاد (سیکریٹری) جبکہ پنڈت من پھول، منشی جیسی رام، منشی ہرسکھ رائے، رائے مول سنگھ، فقیر سید شمس الدین خان، ڈاکٹر رحیم خان، محمد برکت علی اور

مولوی علمدار حسین ممبران میں شامل تھے۔ ۱۹ مارچ ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں مولوی کریم الدین (انسپکٹر مدارس لاہور) اور پیارے لال آشوب نے ڈائریکٹر بہادر کی کتاب ''تواریخ الفنسٹن'' کو معتبر مان کر اس کی روشنی میں اورنگ زیب کے سوانح پر تنقید کی۔ ۲۲ مارچ ۱۸۶۵ء کے اجلاس میں اردو زبان پر بحث لسانی بحث و مباحثہ کیا گیا۔ ۲۴ مارچ ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں مسٹر کوپر (کمشنر لاہور) نے انجمن پنجاب کو انعامی مقابلہ کا پیغام دیا کہ جو کوئی ''احسن طریقہ تعلیم ملک پنجاب'' کے عنوان سے اچھا مضمون لکھے گا پچاس روپے انعام پائے گا۔ اسی نشست میں پنڈت موتی لعل نے ''تواریخ الفنسٹن'' سے ترجمہ ''خصلت اورنگ زیب بادشاہ کا'' تاریخ واقعات ہند کے لیے پیش کیا گیا۔ جسے بہت پسند کیا۔ ۳۱ مارچ ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں انجمن کا اپنا نمائندہ رسالہ ''رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ'' جاری کیا گیا اور مختصر نام رسالہ انجمن پنجاب رکھا۔ جس میں انجمن کے جلسوں کی کاروائیاں اور مضامین طبع ہو کر عوام تک پہنچ سکیں۔ اس رسالے نے عوام میں علمی و ادبی ذوق کو پروان چڑھایا اور مضمون نگاری کی روایت کو فروغ دیا۔ رسالہ انجمن کی کمیٹی میں ڈاکٹر لائٹنر، پنڈت من پھول، منشی ہرسکھ رائے، بابو نوبین چند، رائے مول سنگھ اور بابو چندر ناتھ شامل تھے۔

۱۷ اپریل ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں پنڈت من پھول نے مروجہ تعلیم کے خلاف ایک مضمون پڑھا جس میں دفتروں میں کلرکوں کو از سر نو تعلیم دینے پر زور دیا جبکہ پنڈت من پھول کا دوسرا مضمون اصلاحی طرز کا تھا جس میں ہندوؤں میں شادی بیاہ کے موقع پر آپس میں گالم گلوچ کی رسم بد کی مذمت اور اس کے خاتمہ پر زور دیا۔ آخری مضمون محمد حسین آزاد نے ''ہندوستان کی ترقی وتجارت'' پر پڑھا۔ ۲۹ اپریل ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں مضمون ''نقص طریقہ تعلیم انگریزی در مدرسہ جات سرکاری'' پنڈت من پھول نے پڑھا اور طریقہ انگریزی تعلیم کے نقائص بیان کیے۔ اس کے بعد محمد حسین آزاد نے ایک مضمون درباب راہ و رسم سابق فی ما بین ہنود و اہل اسلام وطریقہ فی مابین اہل ہندو اہل انگلینڈ'' پڑھا جسے بہت پسند کیا گیا۔ ۱۵ ستمبر ۱۸۶۵ء کے جلسہ عام میں ایک مضمون ''زیادتی دروغ گوئی'' پڑھا گیا جبکہ دوسرا مضمون ''پنجابیت کی ضرورت'' پنڈت رادھا کشن کا تھا۔ اس موضوع سے متعلق ایک مضمون حکیم دیوان چند نے بھی لکھا۔ ۱۶/۱۵ مئی ۱۸۶۶ء کے جلسوں میں منشی ہرسکھ رائے نے بالترتیب یہ مضمون پڑھے ''انجمن احسن تدبیر انتظام دوافروشی'' اور ''تدبیر احسن ترقی صحت نفسانی''۔ ۱۴ جولائی ۱۸۶۶ء کو انجمن کے جلسہ میں منشی ہرسکھ رائے نے اپنی کتاب ''مجموعہ موار قوانین امتحان تحصیلداران'' پیش کی تا کہ اسے تحصیلداروں کے نصاب میں پیش کیا جا سکے۔

یکم اگست ۱۸۶۶ء کے جلسہ میں یہ طے پایا کہ انگریزی رسالہ ''آرٹیکل'' منگوا کر اس میں سے عمدہ اور

کارآمد مضامین رسالہ، انجمن میں شائع کیے جائیں۔ ۷ دسمبر ۱۸۶۷ء کو انجمن کا جلسہ ڈاکٹر لائٹز کی زیر صدارت ہوا۔معمول کی کارروائی کے بعد فقیر سید جمال الدین نائب میر منشی گورنمنٹ پنجاب نے ''ترجمہ الفاظ و اصطلاحات علم ریاضی وغیرہ'' پڑھا۔جس پر رائے دیتے ہوئے سب نے اسے پسند کیا۔اسی نشست میں مولوی محمد حسین نے بھی دو مضمون پیش کیے جس میں سے ایک کا عنوان ''ترقی کتب خانہ انجمن'' پر تھا جسے سب نے نہ صرف پسند کیا بلکہ اسے انجمن کے رسالہ میں چھاپنے کی بھی تجویز دی گئی۔۱۴ اپریل ۱۸۶۹ء کے جلسہ میں رشوت ستانی کے انسداد سے متعلق ایک مضمون امین چند (اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) نے پڑھا۔ ''رپورٹ انجمن پنجاب'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ''انجمن کی تعلیمی کمیٹی نے تراجم اور علمی و ادبی مضامین لکھوانے کے لیے بہترین مضمون نگار کے لیے انعام کا اعلان بھی کیا:

> ''۱۸۶۹ء میں دختر کشی کے اسباب اور انسداد پر مضامین لکھے جانے کا اعلان کیا گیا۔کل تیس مضامین موصول ہوئے ان کو انجمن کی سب کمیٹی نے جس میں مولوی علمدار حسین، بابو نوبین چندرائے و بابو چندر ناتھ شامل تھے۔ملاحظہ کیا اور اپنی رائے سے انجمن کو آگاہ کیا۔اس کے موافق انجمن نے صاحبان ذیل کے مضامین قابل انعام قرار دیئے۔(۱) مولوی محمد حسین (۲) پنڈت دھرم نارائن (۳) سید مہدی حسن۔''۵۱

''انجمن پنجاب'' کے ان چند جلسوں میں پڑھے جانے والے مضامین کے عنوانات کے سرسری جائزہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انجمن میں پڑھے جانے والے ان مضامین کا مقصد اخلاق کی تہذیب، مروجہ رسوم قبیحہ کی مذمت کرنا، اور علم و فنون کے حصول کی ترغیب دلانا تھا۔ بالفاظ دیگر اردو نثر میں سب سے پہلے ایسے عنوانات کا انتخاب کیا گیا جن کا تعلق مذہب، اخلاق اور تہذیب سے تھا۔یوں ۱۸۶۵ء سے ہی انجمن کے پلیٹ فارم سے مختلف علوم پر عمدہ مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا۔نیز یہ انجمن کے جلسے ہی تھے جن کے ذریعے عوام کی رائے دریافت کی اور ان کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دی گئی۔۵۲ ''انجمن پنجاب'' کے فعال کردار کے حوالے سے پنڈت شیوناتھ نارائن معتمد ''انجمن تہذیب لکھنؤ'' نے ۱۸۷۱ء میں انجمن کے ایک خاص جلسہ میں ''انجمن پنجاب'' کی بابت اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا جو اخبار انجمن پنجاب ۲۹ دسمبر ۱۸۷۱ء میں چھپی۔

> ''اس انجمن کی مساعی سے بہت سے اہم نتائج برآمد ہوئے ہیں اور اس کے ذریعے سے ترقی کی متعدد راہیں کھل گئی ہیں یہ انجمن دوسری انجمنوں کے لیے ایک نمونہ ہے اور رہنما کا کام دے سکتی ہے ۔۔۔ اگر چہ اس انجمن کے پیش نظر خالص علمی مقاصد ہیں لیکن وہ اقتصادی او رمعاشرتی مسائل سے بھی دلچسپی رکھتی ہے۔اور ان کے متعلق اپنی رائے سے کھلم کھلا حکومت ہند اور خاص کر حکومت پنجاب کو مطلع کرتی رہتی ہے۔یہ انجمن خاص طور پر محکمہ تعلیمات کی تعلیم عامہ پر نظر رکھتی اور وقتاً فوقتاً اسے اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہتی ہے''۵۳

انجمن پنجاب کی اہمیت بدستور قائم رہی۔ چنانچہ ہمیں ۱۸۶۸ء کی رپورٹ کے مطابق انجمن کے عہدیداران اور اراکین میں درج ذیل اصحاب کے نام دکھائی دیتے ہیں۔

۱۔ جناب ڈونلڈ میکلوڈ صاحب بہادر سی بی لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک پنجاب لاہور (پیٹرن)

۲۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر، پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور (صدر انجمن)

۳۔ بیڈن پول صاحب بہادر جج عدالت خفیفہ لاہور (نائب صدر)

۴۔ فقیر سید جلال الدین، بابو نوبین چند رائے (معتمد اعزازی)

۵۔ مولوی محمد حسین آزاد (معتمد اعلیٰ)

۶۔ شیخ نظام الدین (منشی)

۷۔ شیخ کرم الٰہی (اکاؤنٹنٹ و لائبریرین)

۸۔ لالہ گوبند رام خزانچی تحصیل لاہور (تحویلدار خزانہ)[۵۴]

ان عہدیداران کے علاوہ اراکین میں ۲۸ انگریز، ۱۱ نواب اور راجہ، لاہور سے ۹۶ احباب کے علاوہ ۴۱ طلباء جبکہ ملک بھر سے ۱۲۳ افراد شامل تھے۔ ۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۸ء کی رپورٹ کے مطابق انجمن پنجاب کی کارکردگی کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''نصابی کتب کی فراہمی کے لیے یہ اہتمام کیا گیا کہ ادبی اور معاشرتی مسائل پر کتابیں لکھوائی گئیں اور ایک ذیلی کمیٹی بنائی گئی جو مولوی علمدار حسین، بابو نوبین چندرائے، بابو چندر ناتھ پر مشتمل تھی اور اس طرح تقریباً ۳۶۰ مضامین اور کتابیں تیار کی گئیں۔ یہ مضامین اور طویل مقالے حسب ضرورت انجمن پنجاب کے رسالے میں قسط وار شائع ہوتے تھے''[۵۵]

''انجمن پنجاب'' نے تنقیدی آراء میں بھی بہت جلد آپ معتبر مقام بنا لیا تھا اس کا اندازہ ان اردو فارسی کتب اور مضامین سے ہوتا ہے جو ۱۸۶۶ء تا ۱۸۶۸ء گورنمنٹ اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن اور دیگر مصنفین کی جانب سے رائے طلبی اور منظوری کے لیے انجمن کے پاس آئیں۔ ذیل میں اردو کتب اور مضامین اور ان پر دی گئی آراء اور صادر کیے گئے صائب فیصلے ملاحظہ ہوں۔

نام کتاب	نام مصنف	نام صاحب رائے	خلاصہ رائے
کتاب اخلاق	منشی محمد علی	رائے کمیٹی	پسند ہوئی
صرف ونحو اردو	سید مہدی حسن	فقیر سید جمال الدین	پسند ہوئی
نذر آقا	مولوی الفت حسین آمدہ محکمہ ڈائریکٹری	مولوی محمد حسین	پسند ہوئی

اشارات التعلیم	محکمہ ڈائریکٹری	مولوی علمدار حسین	قابل دستور العمل معلمان ہے پسند ہوا۔
مضمون مولوی محمد حسین در جواب وسوالات نقص ہائے ریلوے	آمدہ محکمہ گورنری	ارباب کمیٹی	پسند ہوا
عجائب وغرائب ۵۶	محمد سرفراز خان سررشتہ مہر جمن غربی آمدہ محکمہ گورنری پنجاب	صاحب سیکرٹری	بخوبی صحت اس کی نہیں اور قابل ترویج اطفال نہیں ہے
گلزار ہندی	رائے کنہیا لال، آمدہ محکمہ ڈائریکٹری پنجاب	مولوی محمد حسین سیکرٹری	پسند ہوا
روبکار ضلع لاہور	درباب انتظام جاتری لوگوں کے آمدہ محکمہ ڈائریکٹری	مولوی محمد حسینی سیکرٹری	پسند ہوا
قواعد اردو	آمدہ محکمہ ڈائریکٹری	مولوی محمد حسینی سیکرٹری	بعض بعض جگہ نقص ہیں۔
رسالہ کلاں قواعد اردو	آمدہ محکمہ ڈائریکٹری	مولوی محمد حسینی سیکرٹری	بعض بعض جگہ نقص ہیں۔
منتخبات اردو	آمدہ محکمہ ڈائریکٹری	مولوی محمد حسینی سیکرٹری	پسند ہوئی۔
گلشن اخلاق	منشی بھولا ناتھ - میرٹھ	مولوی علمدار حسین	پسند ہوئی ۔
اخلاق بہادری	منشی بہادر سنگھ فیروز پور از محکمہ ڈائریکٹری	مولوی محمد حسین	پسند ہوا۔
تزکیۃ الاخلاق	رحیم بخش مدرس دہلی آمدہ ڈائریکٹری	مولوی علمدار حسین	عبارت اچھی نہیں ہے۔ ۵۷

''انجمن پنجاب'' کے زیر اہتمام ہونے والے لیکچروں سے بھی اردو نثر میں تنقیدی، لسانی، تاریخی موضوعات کو سمونے کے لیے نئے اسالیب بیان میسر آئے۔ چنانچہ ''انجمن پنجاب'' کے تحت طلباء اور رفاہ عام کے لیے جن لیکچروں کا انتظام کیا گیا ان کی وجہ سے لاہور میں اردو نثر کے ارتقا کا عمل کامیابی سے جاری و ساری رہا اور یہ لیکچر اردو نثر کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوئے۔ آغا محمد باقر کے مطابق اس سلسلہ میں پہلا لیکچر خود صدر ''انجمن پنجاب'' ڈاکٹر لائٹنر نے ''عادات باشندگان ترکستان'' کے موضوع پر دیا۔ مسٹر اسٹن نے دس لیکچر دیے جن میں سے پہلے چار کا موضوع کرہ ارض تھا۔ دوسرے چار آئر لینڈ، انگلینڈ، سکاٹ لینڈ اور ویلز کے جغرافیائی اور تاریخی حالات پر مبنی تھے۔ نواں لیکچر ''احسن طریقہ تعلیم و ترقی علم'' جبکہ دسواں ''لیکچر تمام دنیا کا مختصر حال'' پر دیا گیا۔ لیکچر کے اس سلسلہ کو جاری رکھنے اور اسے زیادہ منظم بنانے کے لیے محمد حسین آزاد جیسے لائق اور قابل شخص کا

تقرر ۵۰ روپے مشاہرہ پر عمل میں لایا گیا۔ اس کے لیے ''کوہ نور'' اخبار میں اشتہار دیا گیا اور لیکچرار کے فرائض اور قابلیت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا کہ ''مضمون علمی بعبارت دلچسپ اردو میں لکھے اور پڑھ کر انجمن میں سنایا کرے اور باشندگان لاہور کو ترغیب دیا کرے اور انگریزی زبان سے آگاہ ہو''۵۸ یہ عبارت اس بات کا ثبوت ہے کہ ان لیکچرز نے نہ صرف اردو نثر کو نکھارا بلکہ یہ انگریزی خیالات سے اخذ و استفادہ کرتے ہوئے اردو نثر کو جدید خیالات سے بھی روشناس کرانے کا سبب بنے۔

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں ۱۸۶۷ء میں محمد حسین آزاد کا باقاعدہ تقرر اس بات کی دلیل ہے کہ آزاد انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ محمد حسین آزاد نے علم و ادب، زبان، فلسفہ، تنقید، سوانح اور سائنس کے موضوع پر جو لیکچر دیئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ سب سے پہلا لیکچر زبان اردو اور اس کی نشو و نما کے موضوع پر بعنوان ''لیکچر درباب اصلیت زبان اردو کی'' تھا اس میں اردو زبان کے آغاز اور اس کے اجمالی ارتقا کے ساتھ اردو نثر اور شاعری کے تغیرات کا احوال بیان کیا ہے۔ یوں ادبی لسانی مباحث کا باقاعدہ آغاز محمد حسین آزاد کے اس مضمون ہی سے ہوتا ہے۔۵۹

۲۔ کلام قواعد اردو

۳۔ ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' (اردو زبان و ادب اور لاہور میں اردو شعری تنقید کی خشت اول)

۴۔ شمس ولی اللہ موحد شاعری اردو

۵۔ احوال بو علی سینا

۶۔ حال شاہ ہدایت شاعر

۷۔ ''شاہ حاتم''

۸۔ افاداتِ ملک الشعراء خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق۔

۹۔ درہم، دینار، روپیہ، اشرفی اور دیگر سکوں پر لیکچر

۱۰۔ زبان سلف میں ہندو عرب و فارس میں اہل فضل نے علوم و فنون میں کس طرح ترقی کی اسے ''لیکچر درباب طرز انشاء فارسی و اردو مروجہ'' میں بیان کیا۔

۱۱۔ مسائل فلسفہ تحقیق و صحیح کیونکر حاصل ہوتے ہیں؟ اور کیا سبب ہوا کہ کتب عربیہ اور فارسیہ کے مصنف اس راستے کو چھوڑ کر دوسرے راستے میں جا پڑے۔

۱۲۔ تفصیل خواص ذاتیہ اجسام معہ بعض اقوال اختلافی فلاسفہ عرب و مسائل علمی طبعی۔

۱۳۔ کشش ارضی و جذب مرکزی، تفصیل و تمثیل اس امر کی کہ کوئی چیز اوپر سے نیچے کیوں گرتی ہے؟[۶۰]

طبعی و سائنسی موضوعات پر مبنی لیکچرز کو عملی تجربات کے ساتھ بیان کیا جاتا۔ جو بعد ازاں ''رسالہ انجمن پنجاب'' میں معہ آلات و تصاویر کے شائع کیے جاتے۔ محمد حسین آزاد نے یوں تو ''انجمن پنجاب'' کے جلسوں میں مغربی خیالات سے متاثر ہو کر شاعری کے نئے تصورات پر متعدد لیکچر دیئے لیکن ۱۵ اگست ۱۸۶۷ء کو جو لیکچر ''نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات'' دیا۔ بلا شبہ جدید ادبی تنقید کا نقطہ آغاز ہے بالفاظ دیگر صحیح معنوں میں اردو شاعری کی باقاعدہ تنقید کی داغ بیل اسی لیکچر سے ہوئی اور جس کی ابتدا لاہور کی اس انجمن کے پلیٹ فارم سے ہوئی۔ اس اعتبار سے یہ لیکچر نہ صرف اہم ہے بلکہ تاریخی حیثیت کا حامل بھی ہے۔ مذکورہ لیکچر میں نئی صورتحال کے پیش نظر اپنے ادب کو نئے تصورات سے مالا مال کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا اور قدیم اردو شاعری کی خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے شاعری میں حقیقت اور اصلیت سے کام لینے پر زور دیا گیا۔ انھی خیالات کا نقش دوم ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء کے لیکچر میں نظر آتا ہے جس میں ایک مثنوی ''موسوم بہ شب قدر'' پیش کی گئی۔

محمد حسین آزاد نے پہلی بار اُردو شاعری کو قدیم روایتی اور عاشقانہ فضا سے نکال کر اسے نئے موضوعات کی طرف متوجہ کیا۔ شاعری کی ماہیت، نوعیت، موضوع، ابلاغ، اثر آفرینی؛ شاعری اور دوسرے فنون لطیفہ کے درمیان تعلق اور فرق؛ شاعر کے کردار اور شاعر کی مقصود و غایت جیسے بنیادی مباحث کا باقاعدہ آغاز کیا۔ آزاد کے تنقیدی خیالات کے مطابق شاعری اپنی ماہیت کے لحاظ سے ودیعت خداوندی ہے جو انسانی صلاحیتوں میں اعلیٰ ترین صلاحیت بھی ہے۔ شاعر اور اس کے کلام کے حوالے سے اپنا نظریہ شاعری بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: ''شعر سے وہ کلام مراد ہے جو جوش و خروش خیالات سنجیدہ سے پیدا ہوا ہے اور اسے قوت قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے۔ خیالات جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبہ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں۔''[۶۱] نیز تخلیق شعر کے لیے جنوں کو بھی لازمہ شاعری قرار دیتے ہیں:

> ''جنون بھی ایک طرح لازمۂ شاعری ہے۔ بعض محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنوں کے یا عاشق کے کہ وہ برادر مجازی اس کا ہے۔ ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی''[۶۲]

شاعری میں قافیے اور موزونیت کے بجائے اثر آفرینی پر زور دیتے ہوئے اثر آفرینی پیدا ہونے کا سبب

الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ ''جب انسان کے دل میں قوت گویائی اور جوشش مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت کا جوش و خروش زیادہ ہوگا اسی قدر کلام پر تاثیر ہوگا''۶۳؎ محمد حسین آزاد کے نزدیک یہی اثر آفرینی شعری ابلاغ کا باعث بنتی ہے جو اسے دیگر فنون لطیفہ کی بہ نسبت زیادہ وسعت سے ہمکنار کرتی ہے اس کے لیے آزاد نے مصوری کی مثال لے کر شاعری کی برتری کو ان الفاظ میں ثابت کیا ہے:

> ''کوئی مضمون، کوئی مطلب کوئی خیال جو انسان کے دل میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہیے تو تکلم سے نقش مدعا کو رنگ تقریر میں لاتا ہے تاکہ ظاہر ہو۔ پس شاعر گویا ایک مصور ہے لیکن نہ وہ مصور کو خر واشتر، درخت و پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے بلکہ وہ ایسا مصور ہے کہ معنی کی تصویر صفحہ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینی فصاحت سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے وہ اشیاء جن کی تصویر مصور نہ کھینچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔''۶۴؎

یہی وہ شعری و تنقیدی نظریات ہیں جن کے ذریعے آزاد نے اس عہد کی کلاسیکی شاعری کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ جس سے وہ رومانیت کے اولین نقیب قرار پاتے ہیں تو ساتھ ہی یہ کہہ کر کہ ''لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبع موزوں رکھتے ہیں اگر زور طبیعت کو علوم اور تواریخ قصص میں صرف کریں تو فائدہ کسب دنیاوی بھی خاطر خواہ دیوے''۶۵؎ ترقی پسندانہ حقائق کی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے۔ یہ انجمن پنجاب ہی کی مرہون منت تھا کہ محمد حسین آزاد کے شعری و تنقیدی نظریات کی تشکیل ہوئی۔ جہاں حال کے شعری نظریات کا بھی ہیولا تیار ہوا۔ جو آگے چل کر مقدمہ شعر و شاعری (۱۸۹۳ء) از الطاف حسین حالی کی صورت میں منظم اور مربوط انداز میں صورت پذیر ہوا۔ چنانچہ زمانی اور فکری لحاظ سے محمد حسین آزاد کو حالی پر فوقیت حاصل ہے کہ سب سے پہلے انہوں نے بدلتے حالات اور تقاضوں کے پیش نظر شعر و ادب کو سماجی زندگی سے ہم آہنگ کیا۔

محمد حسین آزاد نے زبان و ادب کے حوالے سے جو لیکچر دیئے اردو ادبی نثر کو ان سے بے حد فائدہ ہوا۔ آزاد کی معرکہ آراء تصنیف ''آب حیات'' (۱۸۸۰ء) کے معتد بہ حصے ان لیکچرز ہی کے حوالے سے وجود میں آئے۔ آزاد کی وہ تجویز جو انہوں نے ۱۰ جولائی ۱۸۶۵ء کے جلسہ خاص میں دی تھی کہ ''ہفتے میں شنبہ کے دن شام کے وقت مکان سکشا سبھا میں شائقین کا ایک جلسہ ہوا کرے اور اس میں شعراء سلف کا تذکرہ ہوا کرے''۶۶؎ کو عملی شکل آب حیات کی صورت میں ''انجمن پنجاب'' ہی نے دی۔ جس میں اردو زبان کی تاریخ بیان کر کے لسانی تحقیق کا در وا کیا۔ نیز عہد بہ عہد اردو شاعری کی نشوونما اور ارتقائی مراحل کے حوالے سے شعراء کی انفرادی ادبی خدمات

بیان کر کے تاثراتی تنقید کا آغاز کیا۔ ''انجمن پنجاب'' کے یہ لیکچر ہی تھے جس سے محمد حسین آزاد کے زبان و ادب سے لگاؤ کو نکھار ملا اور ان کی بدولت اردو نثر کی قابل قدر ترقی ہوئی۔ محمد حسین آزاد کے بعد منشی کرم الٰہی نے اس عہدے پر فائز ہو کر درج ذیل موضوعات پر لیکچر دیئے:

(۱) فضیلت علم (۲) اثبات واجب الوجود (۳) پیدائش حیوانات
(۴) نباتات ومعدنیات سے صفات خدائے تعالیٰ کا مدلل اثبات (۵) تربیت اطفال
(۶) ورزش بدنی (۷) قبائل مسکرات (۸) نتائج مسکرات
(۹) فوائد علم التواریخ ۷۷ے

ان لیکچرز کی صورت میں اردو نثر میں موضوع اور اسلوب کے حوالے سے بڑے کامیاب تجربے کیے گئے جس سے اردو زبان میں ایک مکمل ادبی زبان بننے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔ پھر جب اورینٹل کالج یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو ایسے مضامین اور لیکچر جو نصاب سے متعلق ہوتے انہیں کمیٹی منظور کر کے کالج یونیورسٹی کے لیے کتابی شکل میں شائع کر دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آب حیات کے بیشتر حصے، نیرنگ خیال کے انشائیہ نما مضامین اور سخندان فارس بھی انہیں لیکچرز کا نتیجہ ہیں جو اورینٹل کالج یونیورسٹی میں نصاب کے طور پر شامل رہیں۔ ڈاکٹر صفیہ بانو کے بقول دیگر حضرات نے درج ذیل کتب اور لیکچر انجمن پنجاب کی اس تحریک کے تحت تیار کیے۔

> ''(۱) اردو گرامر'' تحفہ چشتی از نور محمد (۲) قوعد المبتدی (اردو زبان کی صرف ونحو) از مولوی کریم الدین ۱۲۳ صفحات (۳) انشائے اردو (کتابی شکل میں) (۴) تسہیل الکلام مؤلفہ کپتان ہالرائیڈ ایک ۱۱۰ صفحات (۵) شارع تعلیم (اس میں پرانے طرز تعلیم کے نقائص بیان کیے گئے ہیں اور نئی تعلیم پر آمادہ کیا گیا ہے) حسب الحکم کپتان فلر (۶) مفید الصبیان یعنی خرد افروز حسب الحکم کپتان فلر (۲۵۰ صفحات) (۷) فرہنگ لغات مستعملہ عدالت ہائے گورنمنٹ (کتابی شکل میں) (۸) گرامر بزبان اردو از محمد علی صاحب (۹) شرح الحکمت از الطاف حسین حالی، (۱۰) گرامر بزبان اردو از مولوی محمد علی (۱۱) صرف ونحو از مولوی عبداللہ (۱۲) اشاعت علوم (املاء کے غلط لفظوں کی تصحیح) از نامعلوم (۱۳) نظم کا تاریخی مضمون موسوم بہ حقیقت سخن از سیف الحق ادیب دیباچہ یادگار سخن (۱۴) تواریخ ایام جہالت اردو از مولوی محمد دین (۱۵) ترجمہ ہدایت البلاغت از سید چراغ علی شاہ (۱۶) کچھ حصہ ٹیلر صاحب کی قدیم تاریخ اردو کا (۱۷) سراج الہدیت (لڑکیوں کے تعلیمی نصاب سے متعلق) از سراج بیگم صاحبہ'' ۷۸ے

مقالہ نگار، ڈاکٹر صفیہ بانو کی پیش کی گئی اس فہرست سے متفق نہیں کیونکہ مقالہ نگار کا استدلال ہے کہ ان

میں سے پہلی چھ کتب انجمن پنجاب کی تحریک کے تحت تیار نہیں کی گئی تھیں کیونکہ ''تحفہ چشتی'' از مولوی نور احمد چشتی ۱۸۵۴ء میں ''انشائے اُردو'' بھی مولوی کریم الدین کی تصنیف تھی جو ۱۹۶۳ء میں جبکہ ''تسہیل الکلام'' ۱۸۶۱ء میں ''شارع التعلیم'' ۱۸۶۱ء میں اور مفید الصبیان ۱۸۶۲ء میں تصنیف ہو کر شائع ہو چکی تھیں۔ البتہ دیگر بقیہ تحریریں ''انجمن پنجاب'' کی تحریک کے دوران اس عہد کے ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئیں۔ مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق ''فرہنگ لغات مستعملہ عدالت ہائے گورنمنٹ'' از ڈپٹی غلام نبی خان انجمن قصور کے ''رسالہ'' میں بالاقساط جولائی اگست ۱۸۷۴ء تا اکتوبر ۱۸۷۶ء تک شائع ہوئی۔ الطاف حسین حالی کی ''شرح الحکمت'' بھی دو اقساط میں نومبر ۱۸۷۴ء اور دسمبر ۱۸۷۴ء کے ''رسالہ'' میں چھپی۔ جبکہ نظم کا تاریخی مضمون موسوم بہ حقیقت سخن از سیف الحق ادیب دیباچہ یادگار سخن، جولائی اگست ۱۸۷۴ء میں ''رسالہ'' میں شائع ہوا۔

انجمن پنجاب نے تعلیمی سیاسی، سماجی اور لسانی سطح پر اپنے ارتقائی سفر کو کامیابی سے جاری رکھا۔ اس کا اندازہ ۱۸۸۱-۸۲ء کی رپورٹ سے ہوتا ہے کہ جہاں ہندوستان بھر سے اس کے اراکین میں اضافہ ہوا وہیں پر لاہور کی بہت سی شخصیات کے نام اس لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے لاہور میں علم و ادب کی فضا کو نہ صرف سازگار بنائے رکھا بلکہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس شہر کو مرکز کے طور پر تقویت دی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے اگر یہ علم دوست احباب نہ ہوتے تو علمی و ادبی ترقی کی منازل اتنی سرعت سے طے کرنا آسان نہ ہوتا۔ لہٰذا مقامی اور سرکاری سطح پر ہر طبقہ فکر سے متعلق افراد کے نام جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ کیسی کیسی مقتدر ہستیاں اس سے وابستہ رہیں۔ ان اراکین کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) لیفٹیننٹ گورنر سر ڈونلڈ میکلوڈ (۲) مسٹر ایچسن ڈپٹی کمشنر لاہور (۳) مسٹر برانڈرتھ کمشنر لاہور (۴) مسٹر گریفن (۵) مسٹر الگزانڈ انسپکٹر مدارس (۶) عالم شاہ سید، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور (۷) نواب عبدالمجید خاں لاہور (۸) پنڈت امرناتھ، ہیڈ مترجم چیف کورٹ پنجاب لاہور (۹) مولوی عبدالحکیم کلانوری، اورینٹل کالج لاہور (۱۰) ڈاکٹر سید امیر شاہ اسسٹنٹ سرجن لاہور (۱۱) ڈاکٹر احمد شاہ خاں، ایس پی اینڈ ڈی ریلوے لاہور (۱۲) حکیم احمد علی لاہور (۱۳) وزیر زادہ محمد اکبر خاں، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور (۱۴) حافظ عبدالعزیز، اورینٹل کالج لاہور (۱۵) لالہ بہاری لال ست سبھا لاہور (۱۶) ڈاکٹر ٹی ای بی براؤن، پرنسپل میڈیکل کالج لاہور (۱۷) خان بہادر محمد برکت علی خان لاہور (۱۸) منشی بوٹا مل، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور (۱۹) پنڈت بھگوان داس اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور (۲۰) پنڈت بندری ناتھ لاہور (۲۱) ڈاکٹر ڈبلیو سنٹر، میڈیکل کالج لاہور (۲۲) ایف ایچ کوپ، اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور (۲۳) مفتی چراغ دین لاہور (۲۴) بھائی چڑت سنگھ (ایچ پی اے)

گورنمنٹ کالج لاہور (۲۵) ڈاکٹر ڈبلیو پی ڈکسن، سنٹرل جیل لاہور (۲۶) دیوان داس مل رئیس لاہور (۲۷) پنڈت دیارام، اورینٹل کالج لاہور (۲۸) لالہ درگاہ پرشاد، سوداگر لاہور (۲۹) سر آر ای ایجرٹن کے سی ایس آئی، سی آئی ای، لاہور (۳۰) جی آر ایلسمی سی ایس، کمشنر لاہور (۳۱) سید فضل شاہ لاہور (۳۲) نواب فتح جنگ لاہور (۳۳) مولوی فیض الحسن، اورینٹل کالج لاہور (۳۴) جے آر ای گولڈ سبری، پلیڈر لاہور (۳۵) لالہ گنگا رام، اورینٹل کالج لاہور (۳۶) گوردت سنگھ، نائب میر منشی پنجاب گورنمنٹ سیکرٹریٹ لاہور (۳۷) منشی گلاب سنگھ لاہور (۳۸) ہیڈ پنڈت گورو پرشاد، اورینٹل کالج لاہور (۳۹) بھائی گورمکھ سنگھ اورینٹل کالج لاہور (۴۰) نواب غلام محبوب سبحانی لاہور (۴۱) منشی غلام نبی، ریڈر چیف کورٹ (۴۲) حکیم غلام نبی لاہور (۴۳) زبدۃ الحکماء غلام مصطفی لاہور (۴۴) میر غضنفر علی، تحصیل دار لاہور (۴۵) قاضی خلیفہ حمید الدین لاہور (۴۶) لالہ حکم چند پلیڈر لاہور (۴۷) سوڈھی حکم سنگھ، میر منشی حکومت پنجاب لاہور (۴۸) ڈی سی جے ابیٹسن، سی ایس ڈپٹی کمشنر مردم شماری لاہور (۴۹) پنڈت ایشری پرشاد، مترجم چیف کورٹ پنجاب (۵۰) لالہ جمیعت سنگھ، اکاؤنٹنٹ پی ڈبلیو ڈی لاہور (۵۱) پنڈت جنارھن، اورینٹل کالج لاہور (۵۲) میاں جلال الدین لاہور (۵۳) رائے کنہیا لال، ایگزیکٹو انجینئر سی ای لاہور (۵۴) فقیر سید قمر الدین رئیس لاہور (۵۵) میاں کریم بخش لاہور (۵۶) ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹر ایل ایل ڈی بیرسٹر ایٹ لاء، لاہور (۵۷) جے بی لائل فنانشل کمشنر پنجاب لاہور (۵۸) جے لائٹ فٹ (ایس پی اینڈ ریلوے آڈیٹر) لاہور (۵۹) ٹی سی لیوئس، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور (۶۰) رائے مول سنگھ لاہور (۶۱) رائے میلا رام ٹھیکیدار لاہور (۶۲) ڈاکٹر محمد حسین، لاہور (۶۳) مولوی ابو سعید محمد حسین، لاہور (۶۴) محمد حسین پیرزادہ، اورینٹل کالج لاہور (۶۵) قاضی میر عالم، ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لاہور (۶۶) بھائی میاں سنگھ، لاہور (۶۷) لالہ مایا داس مختار لاہور (۶۸) منشی میراں بخش لاہور (۶۹) مولوی محمد دین، ایچ پی، اورینٹل کالج لاہور (۷۰) نواب نوازش علی خان لاہور (۷۱) بھائی نند گوپال لاہور (۷۲) بابو نوبین چندر رائے لاہور (۷۳) شیخ نانک بخش پلیڈر لاہور (۷۴) لالہ نہال چند، سوداگر لاہور (۷۵) میر نثار علی لاہور (۷۶) پی ایچ پی پاویل، سی ایس ایڈیشنل کمشنر لاہور (۷۷) ای ڈبلیو پارکر، جوڈیشل اسسٹنٹ لاہور (۷۸) پنڈت رکھی کیش، رئیس لاہور (۷۹) شیخ رحیم بخش، سوداگر لاہور (۸۰) لالہ رام چند، مترجم چیف کورٹ پنجاب لاہور (۸۱) ڈاکٹر خان بہادر رحیم خان، آنریری سرجن لاہور (۸۲) لالہ روشن لال مختار، لاہور (۸۳) پنڈت رشی کیش بھٹا چاریہ، اورینٹل کالج لاہور (۸۴) پنڈت رشی کیش شاستری، لاہور (۸۵) سی ایچ سپٹا، بیرسٹر ایٹ لاء، لاہور (۸۶) شیخ سانڈے خاں، رئیس لاہور (۸۷) منشی شمس الدین، مترجم چیف کورٹ لاہور (۸۸) سید فقیر شمس الدین لاہور (۸۹) قاضی شمس الدین لاہور (۹۰) منشی شہامت خان، لاہور (۹۱) پنڈت سکھ دیال، اورینٹل کالج لاہور (۹۲) لالہ ٹھاکر داس، لاہور

(۹۳) سردار اتم سنگھ (۹۴) ریورنڈ ایچ این وائٹ بریسجٹ، پی ایچ ڈی لاہور (۹۵) قاضی ظفر الدین، اورینٹل کالج لاہور (۹۶) میاں عزیز الدین لاہور۔۷۹

یہ بات کسی اعزاز سے کم نہیں کہ لاہور سمیت پنجاب بھر میں تعلیمی، علمی و ادبی ترقی کے لیے عملی کوششیں ''انجمن پنجاب'' ہی کے پلیٹ فارم سے تکمیل پائیں چونکہ انجمن کا بنیادی مقصد مشرقی علوم کو ترویج دینا تھا اس لیے دیسی زبانوں میں امتحان لینے کے لیے کمیٹیوں کا قیام عمل میں آیا نیز عوام کو حصول علم کی ترغیب دینے کے لیے ڈاکٹر لائٹنر نے عوام میں مشرقی زبانوں کے امتحان دینے والوں کی ہمت بڑھانے کے لئے سرٹیفکیٹ، اعزاز و نقد روپیہ کا اعلان بھی کیا۔ اس سے یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ عوام کی توجہ تحصیل علم کی طرف نہ تھی لہذا اس جانب عوام کی توجہ مبذول کرنے کے لیے طرح طرح کے اقدامات کیے جا رہے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۶۶ء سے ۱۸۶۹ء تک ''انجمن پنجاب'' یونیورسٹی کے قیام کی کوششوں میں سرگرداں رہی۔

نتیجتاً انجمن پنجاب ہی بیت العلوم (اورینٹل کالج یونیورسٹی) کا پیش خیمہ ثابت ہوئی جس نے بالواسطہ اور بلاواسطہ اردو نثر کے ارتقا کو تقویت دی۔ نظام امتحان اور اس کی قدغنوں کے باعث ۱۸۶۵ء میں ڈاکٹر لائٹنر نے اس کا خاکہ تیار کیا۔ ان کا موقف تھا کہ اردو و ہندی اس وقت تک متشکل نہیں ہوسکتی جب تک عربی، فارسی اور سنسکرت کی تعلیم کو تقویت نہ ہو۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد مشرقی علوم وفنون و السنہ کا احیاء اور اردو ادب کو فروغ دینے کی تدابیر اختیار کر کے جدید اردو ادب کو وجود میں لانا تھا۔ نیز ''انجمن پنجاب'' اس بات کی بھی شدت سے حامی تھی کہ مغربی علوم کو دیسی زبانوں میں پڑھایا جائے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے روسائے لاہور اور لفٹیننٹ گورنر مک لیوڈ کی مدد سے ۱۸۶۶ء میں ابتدائی طور پر جامعہ مشرقیہ (اورینٹل کالج) قائم کیا جو یونیورسٹی کالج ۸۰ کہلایا۔ کپتان ہالرائیڈ ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب نے ''دہلی سوسائٹی'' دہلی میں ۴ مارچ ۱۸۶۸ء کے اجلاس میں اس یونیورسٹی کے دائرہ کار پر ان الفاظ میں اظہار خیال کیا:

> ''لاہور کی انجمن کا حال میں ایک جلسہ ہوا تھا اس میں یہ قرار پایا کہ پنجاب کے واسطے ایک علیحدہ یونیورسٹی مقرر کی جائے اور اس یونیورسٹی کو تین کام تفویض ہوں اول یہ کہ وہ مثل یونیورسٹی کلکتہ کے امتحان کا کام اختیار کرے یعنی جو لوگ القاب فضیلت کے خواں ہوں وہ ان کا امتحان لیے۔ دویم یہ کہ درس کا کام کرے یعنی مدارس سرکاری میں طلباء کا ایک حد معین تک علم تحصیل کریں اور اگر اس سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو وہ یونیورسٹی میں حاصل کریں اور وہاں ان کے واسطے مدرس مقرر کیے جائیں گے۔ سویم یہ کہ یونیورسٹی تصانیف کو تقویت دے یعنی جو لوگ زبان ہائے مشرق میں کتب تصنیف یا ترجمہ کریں ان کی کتابوں کو ملاحظہ اور امتحان کرنے کے بعد ان کو

انعام دے۔ بشرطیکہ وہ کتابیں پسند آئیں اور مدارس سرکاری میں تعلیم بذریعہ ماسٹروں کی ہوتی ہے۔اس لیے پروفیسر تعلیم کریں گے یعنی ان کا طریقہ فاضلانہ ہو گا۔" ۱؎

۱۲ جولائی ۱۸۶۸ء کو بنظر انتظام اور یورپین کمیٹی کی سفارش پر مدرسہ جامعہ مشرقیہ بند کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حکومت چاہتی تھی کہ مغربی تعلیم کی یونیورسٹی بنے۔ لیکن ڈاکٹر لائٹر کی کوششیں جاری رہیں اور بالآخر ۸ دسمبر ۱۸۶۹ء کو یونیورسٹی کالج کو بیت العلوم کے نام سے اجراء کی اجازت ان شرائط پر مل گئی کہ مجوزہ یونیورسٹی کو ڈگری کی بجائے محض اسناد دینے کا اختیار ہوگا۔ نیز یونیورسٹی کالج کے متعلقہ تدریسی اداروں میں انگریزی زبان و علوم پڑھائے جائیں البتہ بعض مضامین کی تعلیم دیسی زبان میں ہو گی۔ بعد ازاں آگے چل کر ۱۸۸۲ء میں یہی ایک مکمل یونیورسٹی بن گئی۔ اورینٹل کالج یونیورسٹی کے مقاصد پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ اردو نثر کے ارتقا میں یہ کس طرح معاون ثابت ہوئی۔ جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ جہاں تک ممکن ہو پنجاب کی دیسی زبانوں (اردو، ہندی) کے ذریعے یورپین علوم وفنون کو شائع کرنا اور دیسی ادبیات کو ترقی اور وسعت دینا۔
۲۔ مشرقی السنہ (عربی، فارسی، سنسکرت) اور ادبیات کی عمدہ تعلیم کو ہر طرح سے تقویت دینا۔
۳۔ تعلیم عامہ کی نگرانی اور ترقی میں صوبہ ہذا کے اہل قلم اور معزز اشخاص کو سرکاری افسروں کے ساتھ شامل کرنا۔ ۲؎

مذکورہ بالا شق نمبر اول کے تحت اردو نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ اورینٹل کالج یونیورسٹی کی سینٹ کمیٹی ۳؎ میں یہ بھی طے پایا کہ سائنس پر اردو نثر میں جو بہترین رسالہ لکھے گا اسے یونیورسٹی کی جانب سے سالانہ انعام دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ اس لیے ہوا کہ ہندی کی نسبت اردو میں نہ صرف دیگر زبانوں سے الفاظ مستعار لینے کی صلاحیت موجود تھی بلکہ اس میں دیگر زبانوں سے مستعار خیالات بھی بخوبی ادا کیے جا سکتے ہیں۔ چونکہ اورینٹل کالج یونیورسٹی کے نصاب کے لیے کتابیں موجود نہ تھیں اس لیے "انجمن پنجاب" نے ادبی نشستوں کا اہتمام اور بذریعہ اشتہار انعامات کا اعلان کیا۔ نتیجتاً اردو نثر میں پہلی مرتبہ بہترین نصابی اور علمی مضامین فراہم ہوئے۔ جنہیں حسب روایت جلسہ میں پڑھ کر سنایا جاتا۔ صاحب علم تنقیدی آراء سے مستفید کرتے۔ نا قابل اشاعت مضمون رد کر دیا جاتا جبکہ پسند کیے جانے والے مضامین نصاب کا حصہ بنتے۔ چنانچہ اس طرح زبان و ادب سے متعلق علمی و ادبی انشائیوں کے علاوہ انجینئرنگ، طب، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، طبعیات، جیالوجی، کیمیا، معاشیات، قانون، فلسفہ، منطق کے علوم کی علمی کتب اور مضامین کی تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس طرح نئے موضوعات اور نئے اسالیب بیان

سے واقفیت کا موقعہ ''انجمن پنجاب'' ہی کی مرہون منت ملا۔ لسانی اعتبار سے اردو زبان میں نئے نئے الفاظ، اصطلاحات اور اسالیب نصاب میں شامل اور ''رسالہ انجمن پنجاب'' میں شائع ہو کر پورے ہندوستان میں پہنچ جاتے۔ یوں علمی اردو نثر کے سرمایے میں گراں قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ''نثر میں تازہ کاری پیدا کرنے اور نئے تحقیقی و تنقیدی شعور کی بیداری کا سہرا بھی اسی کے سر ہے۔''۴ے نیز ڈاکٹر لائٹنر نے علمی تحقیق اور اس کے ماحصل کی طباعت اور اشاعت کے لیے ریسرچ فیلوز منسلک کر کے تحقیق کی باقاعدہ روایت کی بنیاد ڈالی۔ ادبیات کے مطالعہ کے لیے سیاسی و سماجی پس منظر پر زور دیا گیا، تحقیق و تصنیف میں مواد سازی اور تصنیف و تالیف کو تراجم پر اہمیت دی گئی۔ جس کا مقصد تراجم کی بجائے اصل تصنیف کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر کی ہدایت پر ابتدا میں کالج کے نصاب کے لئے جو کتابیں تیار ہوئیں ان میں محمد حسین آزاد کی فارسی و عربی علمی بصیرت کی عکاس دو کتابیں ''عام اصول صرف ونحو'' اور ''فارسی صرف ونحو'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جن میں اردو زبان کی ساخت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اس کے علاوہ نیرنگ خیال اور آب حیات کو بھی نصاب میں شامل کرلیا گیا۔ جس کا اظہار آزاد نے اپنے ایک خط بنام سید حسین بلگرامی میں اس طرح کیا ہے: ''دفعتاً معلوم ہوا کہ آب حیات اور نیرنگ خیال امتحان یونیورسٹی میں داخل ہو گئی ہیں اور امتحان آغاز مئی پر ہو گا۔ سب نے کہا دونوں کو ضرور چھپوانا چاہیے۔''۵ے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو تصنیفی سلسلہ شروع ہوا اس نے اردو نثر کے ارتقا کو اسلوب اور موضوع ہر دو حوالوں سے بے بہا ترقی دی۔ اس حوالے سے تفصیلات پنجاب یونیورسٹی کی سالانہ رپوٹوں کے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی کی مرتب کردہ تفصیلی رپورٹ بعنوان ''یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی، ادبی اور درسی سرمایہ'' دیکھی جا سکتی ہے۔ اورینٹل کالج یونیورسٹی کے حوالے سے اردو نثر کو ملنے والی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے ۱۸۷۶ء تا ۱۸۸۸ء تصنیف و تالیف اور ترجمہ کی موضوع وار فہرست۶ے ملاحظہ ہو:

نیچر سائنس اور ریاضی	مصنف/مرتب/مترجم
۱۔ سکون سیالات (حصہ اول) اردو ترجمہ از "Besant's Hydrostatics"	پیرزادہ محمد حسین
۲۔ سکون سیالات (حصہ دوم) اردو ترجمہ از "Besant's Hydrostatics"	شیخ انعام علی
۳۔ ''علم ہیئت'' (اردو ترجمہ از Manic's Astronomy)	پیر زادہ محمد حسین
۴۔ ''علم النفس والقویٰ'' اردو ترجمہ از Hamilton's Lectures on Physchology	شیخ انعام علی
۵۔ علم سکون (اردو ترجمہ از Todhunter's Statics)	لالہ آیا رام
۶۔ طبیعی جغرافیہ (اردو ترجمہ از Balandford's Physical Geography)	ایضاً

۷۔ سکون سیالات (اردو ترجمہ از Balandford's Physical Geography) ایضاً

۸۔ علم حرکت (اردو ترجمہ از Elementary Dynamics) بابو ششی بھوشن، مکرجی

۹۔ برقی مقناطیس (اردو) رگھو ناتھ داس

۱۰۔ علم کیمیا (اُردو ترجمہ از Rescoe's Chemistry) ڈاکٹر امیر شاہ

۱۱۔ تدریبات علم طبیعی (اُردو) ایضاً

۱۲۔ علم طبیعی (اردو ترجمہ از Balfour Stewart's Physics) ڈاکٹر امیر شاہ

۱۳۔ علم طبقات الارض (اردو ترجمہ از Page's Gology) سید دلاور علی شاہ

۱۴۔ طبیعی جغرافیہ (اردو ترجمہ از Page's Geography) ایضاً

۱۵۔ مسائل و امثال ریاضی (اردو ترجمہ از Wringley's Examples) ایضاً

۱۶۔ حل ٹرگنومیٹری (اردو) غلام مصطفٰے

۱۷۔ الجبرا (اُردو) ایضاً

۱۸۔ حل جبر و مقابلہ (اردو) یوگی شوناتھ

انجینئرنگ

۱۔ علم المساحت (اردو ترجمہ از Todhunter's Mensuration) لالہ گنگام رام

۲۔ مسالہ تعمیرات (اردو ترجمہ از Lang's Building Materials) ایضاً

۳۔ جرثقیل کا استعمال (اردو ترجمہ از Applied Mechanics by Major Branderth) ایضاً

طب

۱۔ امراض الحبلا و المیلاد (اردو ترجمہ از Midwifery) ڈاکٹر رحیم خان

۲۔ امراض الصابین (اردو) ایضاً

۳۔ امراض نسواں (اردو) ایضاً

۴۔ میڈیکل جورس پروڈنس (اردو) ایضاً

۵۔ ارجوزہ صنایہ در علم طب (اردو) مولوی غلام قادر

۶۔ رسالہ تشریح طب (اردو) مولوی غلام مصطفٰے

۷۔ ادویات مفردات یونانی (اردو) ایضاً

۸۔ آوشادوالی (اردو) — پنڈت جنر دن

قانون

۱۔ Elements of Jurisprudence (انگریزی و اردو ترجمہ) — بابو ششی بھوشن مکرجی
۲۔ Constitutional History of India (اردو ترجمہ) — سید امیر شاہ
۳۔ قدوری (عربی سے اردو ترجمہ) مسلم قانون — مولوی غلام قادر

منطق

۱۔ مخزن الحکمت (اردو) — شیخ انعام علی
۲۔ سلّم (عربی سے اردو) — مولوی غلام قادر
۳۔ مابعد الطبعیات (اردو ترجمہ از Hamilton's Metaphysics) — مولوی محمد دین
۴۔ منطق استقراری (اردو ترجمہ از Fowler's Inductive Logics) — پیرزادہ محمد حسین
۵۔ منطق (اردو ترجمہ از Jovon's Logics) — شیخ انعام علی
۶۔ منطق قیاسی (اردو ترجمہ از Fowler's Deductive Logic) — لالہ آیا رام
۷۔ منطق (اردو ترجمہ از Fowler's Logic) — مدن گوپال

تاریخ وتذکرہ

۱۔ تاریخ کلاں انگلستان (اردو ترجمہ از Green's Larger History of England) — نوبین چندر رائے
۲۔ سنین اسلام کے(حصہ اول و حصہ دوم) اردو (مولوی فیض الحسن، کریم الدین، محمد حسین آزاد کی مدد سے) — ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر
۳۔ تاریخ تیموری مولفہ عرب شاہ (اردو ترجمہ) — مولوی غلام قادر
۴۔ تاریخ متقدمین (اردو ترجمہ از Taylor's Ancient History) — مولوی غلام مصطفےٰ بہ اشتراک لالہ بشن داس
۵۔ تاریخ انگلستان (اردو ترجمہ از Lethbridge's History of England) — مولوی محمد غضنفر
۶۔ تاریخ عرب — ایضاً
۷۔ ایام الاسلام — ایضاً

۸۔	تاریخ جہاں (اردو ترجمہ از Dr. Stulpnagel's Universal History/Hallan's)	شیخ عمر بخش
۹۔	خلاصہ تواریخ انگلستان (اردو ترجمہ از Constitutional History of England)	ایضاً

علم الاقتصاد

۱۔	علم الاقتصاد یا سیاست مدن (اردو ترجمہ از Mrs Fawcett's Political Economy)	پیرزادہ محمد حسین
۲۔	تاریخ علم سیاست مدن (اردو ترجمہ از Mrs Fawcett's Political Economy)	شیخ انعام علی
۳۔	علم انتظام مدن (اردو ترجمہ از Mrs Fawcett's Political Economy)	پنڈت ہرکشن داس
۴۔	اصول سیاسیات مدن (اردو)	پنڈت دھرم نرائن

لسانیات

۱۔	مقدمات الصرف (عربی حرف ونحو انگریزی و اردو میں)	ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر
۲۔	فیض المعنی والبیان ۸ے (اردو)	حافظ عمر دراز

ادبیات (عربی)

۱۔	سبعہ معلقہ (عربی، فارسی، اردو شرح)	مولوی فیض الحسن
۲۔	روضۃ الادبار (اردو) عرب شعراء ادبا کا تذکرہ عربی مآخذ سے	مولوی محمد الدین
۳۔	اطباق الذہب (عبدالمومن اصفہانی کی عربی تصنیف کا اردو ترجمہ مع حواشی)	ایضاً
۴۔	سبعہ معلقہ (اردو ترجمہ)	محمد حسین

ادبیات فارسی

۱۔	اخلاق جلالی (اردو ترجمہ و تلخیص)	مولوی محمد الدین
۲۔	ہدیہ رشیدیہ (اردو ترجمہ)	ایضاً
۳۔	رسال عبدالواسع (اردو ترجمہ)	ایضاً

مذکورہ فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ ابتدا میں زیادہ تر انگریزی کتب سے اردو تراجم پر زیادہ زور دیا گیا۔

۱۸۷۷ء میں کیے گئے اردو تراجم کی مزید تفصیل کے لیے ڈاکٹر انجم رحمانی کا مقالہ برائے پی ایچ ڈی (غیر مطبوعہ) ''برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ'' ملاحظہ ہو۔ محض تصنیف و تالیف کے اس سلسلہ پر ہی اکتفا نہ کیا گیا بلکہ اردو زبان کی ترقی کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جس میں مولوی فیض الحسن، رائے کنیا لال، نواب نوازش علی خان، نواب غلام محبوب سبحانی، ڈاکٹر لائٹنر، ای ڈبلیو پارکر، ڈاکٹر رحیم خان، پیرزادہ محمد حسین، پنڈت امرناتھ، منشی محمد لطیف، مولوی ابو سعید محمد حسین، سوڈی حکم سنگھ، پنڈت ایشری پرشاد، سردار کور دیال سنگھ، وزیراعظم مہدی خان، چیف جسٹس غلام نبی اور میر نثار علی وغیرہ شامل تھے۔ ۷۹

انجمن پنجاب نے عوامی بہبود کی غرض و غایت اور سائنسی و ادبی امور کی ترقی کے ساتھ ساتھ انگریز حکومتی افسران اور مقامی طبقے کے درمیان مفاہمت اور تعاون کو جس کامیابی کے ساتھ نبھایا اس کا اندازہ لفٹیننٹ گورنر سر رابرٹ ایجرٹن کی اس تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۲۸ مارچ ۱۸۸۲ء کے جلسہ میں کی جو انگریز حکمرانوں کے مطلوبہ نتائج کے حصول کے بھی عکاس ہے: ۸۰ الغرض ''انجمن پنجاب'' نے علم و ادب کو عمرانی اور تہذیبی حوالے سے جو ترقی دی وہ کسی کارنامے سے کم نہیں ہے کیونکہ لاہور میں یہی وہ تحریک تھی جس نے ادب برائے زندگی کے نظریے کو پروان چڑھایا اور اس کے ہمہ گیر اثرات ادب اور سماج پر اس طرح رونما ہوئے:

> ''ادیبوں اور شاعروں نے شعوری طور پر ادب کا رشتہ اپنے زمانے کی سیاست اور سماج سے جوڑ کر اجتماعی زندگی کے مسائل کا حل پیش کرنا شروع کر دیا۔ زندگی کی مادی ضرورتوں کو براہ راست قابل توجہ قرار دے کر ارضی زندگی کی ترقی و تکمیل پر زور دیا۔ ادب کے تفریحی و رومانی ذوق کو بدل کر اسے اجتماعی مقاصد سے روشناس کرایا۔ اس ذوق کا رخ تخیلی اور داخلی زندگی سے ہٹا کر واقعیت اور خارجی زندگی کی طرف موڑ دیا اور اس سے اخلاقی، فطری، سماجی، تہذیبی اور مذہبی اصلاح کا کام لیا جانے لگا اور اس طرح اس سے ہمہ گیر کام لینے کے لیے ایک ہمہ گیر اصلاحی تحریک شروع کی۔ ادب میں عمرانی، تہذیبی اہمیت کا اندازہ لگا کر اردو میں مقصدی شعر و ادب کی تخلیق کی روایت قائم کی گئی۔'' ۸۱

نتیجتاً ''انجمن پنجاب'' لاہور نے ایسے نثری ادب کی ترویج و اشاعت کا شوق پیدا کیا جس میں مغربی خیالات کارفرما ہوں اور جو جدید علوم کی تحقیق اور نشر و اشاعت میں بھی معاون ثابت ہوں۔ بلا شبہ ''اس تحریک نے اردو نظم و نثر دونوں کو یکساں متاثر کیا شاعری میں غزل کے تسلط کو اور تنقید و تحقیق میں تذکرہ نگاری کی حاکمیت کو ختم کرنے کی سعی کی انگریزی علوم کے فروغ نے اس تحریک کو قوت و توانائی عطا کی اور یوں نہ صرف لفظ کا نیا استعمال وقوع میں آیا بلکہ طرز احساس و اظہار میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی۔'' ۸۲

رسالہ انجمن پنجاب:۸۳؎

''انجمن پنجاب'' کی کارروائیوں کو ارکان انجمن تک پہنچانے کے لیے ۳۱ مارچ ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں انجمن کا اپنا نمائندہ سہ ماہی رسالہ ''رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب''۸۴؎ جاری کیا گیا اور مختصر نام ''رسالہ انجمن پنجاب'' رکھا گیا۔ جس میں انجمن پنجاب کے جلسوں کی کارروائیاں اور مضامین طبع ہو کر عوام تک پہنچ سکیں۔ اس رسالے نے عوام میں علمی و ادبی ذوق کو پروان چڑھایا اور مضمون نگاری کی روایت کو فروغ دیا۔ رسالہ انجمن کی کمیٹی میں ڈاکٹر لائٹنر، پنڈت من پھول، منشی ہرسکھ رائے، بابو نوبین چندر رائے مول سنگھ، اور بابو چندر شامل تھے۔

''رسالہ انجمن پنجاب'' اگرچہ انجمن کی کارروائیوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے جاری کیا گیا لیکن انجمن میں پڑھے جانے والے اور اس میں شائع ہونے چھوٹے بڑے مضامین اور مقالوں سے اردو میں مضمون نگاری کی صنف کو باقاعدگی اور فروغ ملا۔ ابتداً ''رسالہ انجمن کیے بعد دیگرے مطبع مصطفائی'' لاہور، مطبع مطلع نور لاہور، مطبع متر بلاس لاہور میں چھپتا تھا''۸۵؎ رسالہ انجمن پنجاب میں انجمن کے جلسوں میں پڑھے جانے والے مضامین کے علاوہ لیکچر بھی شائع کیے جاتے تھے جن کا انتظام انجمن پنجاب نے طلباء اور عوام کے لیے کر رکھا تھا۔ مزید یہ کہ اس میں وہ امور جس کی بابت حکومت رائے عامہ دریافت کرنا چاہتی تفصیل سے چھپا کرتے تھے بعد میں جب انجمن نے مشاعرہ کا انعقاد کیا تو اس میں فارسی اردو کی طرحی غزلیں بھی شائع ہونے لگیں نیز دیگر رسالوں سے مضامین افادۂ عام کے لیے شائع کیے جاتے۔ رسالہ اردو زبان میں ہوتا تھا لیکن کبھی کبھی کچھ مواد انگریزی، ہندی گورمکھی میں بھی درج کیا جاتا تھا۔

یوں تو اردو نثر میں مضمون نگاری کا سلسلہ ''کوہ نور'' اور ''خورشید پنجاب'' میں بھی نظر آتا ہے اول الذکر کی نسبت موخر الذکر کے مضامین میں ادبی اور علمی اسلوب کی کارفرمائی زیادہ نظر آتی ہے۔ لیکن ''انجمن پنجاب'' کے اس رسالے میں دیگر موضوعات (علمی، تاریخی، سائنسی، جغرافیائی، معاشی، اصلاحی) پر مبنی مضامین کے علاوہ خالص ادبی مضامین اور ادبی اسلوب نے فروغ پایا۔ اس میں منتخب اور شائع ہونے والے مضامین کے معیار کا اندازہ اس جانچ پرکھ سے لگایا جا سکتا ہے۔

> ''انجمن کا قاعدہ یہ تھا کہ جب مضمون نویس، نیا مضمون یا اس کا خلاصہ انجمن کے سیکرٹری کے پاس بھیج دیتا سیکرٹری اس کو کارکن کمیٹی کے جلسہ خاص میں جو جلسہ عام سے چند دن پہلے منعقد ہوا کرتا۔ ارباب کارکن کمیٹی کے سامنے پیش کر دیتا۔ اگر ارباب کارکن کمیٹی اس کو پسند کر لیتے تو مضمون جلسہ عام میں پڑھنے کی اجازت مل جاتی اور اس کی اطلاع مؤلف کو بھیج دی جاتی۔ جب یہ مضمون جلسہ

عام میں پڑھا جاتا تو ارباب انجمن جناب صدر کی اجازت سے بحث طلب امور پر ضروری بحث کرتے یا اگر کسی کو ضروری معلومات حاصل ہوتیں تو وہ اس کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈال کر ارباب انجمن کی معلومات میں مزید اضافہ کرنے کا فخر حاصل کرتا۔ جب مؤلف اور اس کا مضمون ان تمام مرحلوں سے گزر چکتا تو ارباب انجمن سے اس کے بارے میں رائے لی جاتی۔اگر یہ مضمون سب کو پسند ہوتا تو رفاہ عام کے لیے اسے انجمن کے رسالے میں شائع کر دیا جاتا۔"۸۶

اس طرح انجمن پنجاب کے جلسوں میں پڑھے جانے والے تعلیمی اور ثقافتی مضامین پر سامعین کی رائے لی جاتی اور بعد ازاں ان کو رسالے میں شائع کر دیا جاتا۔ نیز ان میں سے جو مضامین نصاب سے متعلق ہوتے انہیں کمیٹی منظور کر کے اورینٹل کالج یونیورسٹی کے لیے کتابی شکل میں شائع کر دیتی تھی۔ یہ مضامین سائنس، تاریخ، جغرافیہ، سیاست، انجینئرنگ، طب اور علم و ادب وغیرہ پر مشتمل ہوتے۔ مضامین کے علاوہ ان موضوعات سے متعلق انجمن پنجاب میں جو لیکچر دیئے جاتے وہ بھی اس میں شائع ہوتے تھے۔ آغا محمد باقر کے مطابق فروری ۱۸۶۵ء سے ۱۸۶۸ء تک معلومات سے بھرپور ایک سو بیالیس (۱۴۲) مضامین شائع ہوئے ۸۷ جو انجمن اور ارباب انجمن کے ساتھ ساتھ اس دور کی زندگی اور ضرورتوں کی دلچسپ اور قابل قدر تصاویر بھی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کے علاوہ دیگر شہروں اور علاقوں کے اہل قلم کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی اور دیگر اخبارات بھی اس سے مضامین نقل کیا کرتے تھے۔ مثلاً ۱۸۶۸ء میں میرٹھ کے "اخبار عالم" میں "رسالہ انجمن پنجاب" سے مضمون "جانداروں کی ارتقائی زنجیر" نقل کیا گیا۔

"رسالہ انجمن پنجاب" میں سب سے زیادہ مضامین لکھنے والے صاحب طرز انشا پرداز محمد حسین آزاد تھے جنہیں لاہور کے علمی و ادبی ماحول نے وسیع جولاں گاہ دی اور صاحب طرز انشا پرداز کے طور پر ادب کا درخشاں ستارہ بنایا۔ وہ ۱۸۶۷ء میں اس رسالہ کی ادارت پر بھی مامور رہے۔ آزاد سے قبل رسالہ انجمن پنجاب معمولی مضامین کا رسالہ تھا لیکن آزاد کی مساعی نے اسے علمی و ادبی رنگ دے کر بلند پایہ رسالہ بنا دیا۔ مذکورہ بالا دور میں لکھے گئے مضامین کی فہرست عنوانات ۸۸ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ تعلیم، زبان، اخلاق، مذہب اور تہذیب سے متعلق کس قسم کے مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ مضمون نگاروں میں محمد حسین آزاد کے علاوہ پنڈت من پھول، بابو چندر ناتھ متر، منشی دیوان چند، برکت علی خان اور مولوی علمدار حسین شامل تھے لیکن زیادہ تر مضامین مولانا آزاد ہی کی قلم فرسائی کا نتیجہ تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے مولانا آزاد کے مضامین کی فہرست ملاحظہ ہو جن میں اکثر کا موضوع سائنس اور سماجی اصلاح جبکہ بیشتر علمی نوعیت کے مقالے تعلیمی، ادبی اور ثقافتی پہلوؤں سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۱) ارتباط اختلاط اہل ہند یا سلاطین (۲) تحریص وتشویق تحصیل علم (۳) معافی محصول چونگی کتب تجارتی (۴) روئداد مجلس کلکتہ (۵) توسیع شہر لاہور (۶) فضیلت ارتباط و حفظ مراتب احتیاط (۷) اصلاح تعلیم مروجہ (۸) ابتدائے حال زبان عرب اور فرق ترقی مروجہ (۹) تحصیل علم سے مطلب اصلی کیا ہے؟ (۱۰) ترمیم رواج نیلام ہائے مروجہ (۱۱) ہر کام سوچ سمجھ کر احتیاط سے کرنا چاہیے (۱۲) ترغیب تہذیب و اکتساب فنون (۱۳) تنزل خیالات اہل ہند اور تقریر ان کی ترقی ہمت کے لیے (۱۴) تکالیف و اصلاح ریلوے (۱۵) شکایت ترویج کتب مفیدہ کی (۱۶) ترجمہ کتب علمی و ریاضی (۱۷) اجتماع میلہ ہائے ہندوستان (۱۸) آجکل کے تحصیل وتعلیم میں کیا ترمیم کرنی چاہیے (۱۹) طرز انشا فارسی و اردو مروجہ (۲۰) تدبیر رفع افلاس اہل ہند (۲۱) اہل ہند کو اپنے سود و بہبود میں آپ کوشش کرنی چاہیے (۲۲) فوائد تجارت (۲۳) ترقی و تائید تجارت (۲۴) مسائل فلسفہ وطبعی وغیرہ۔

محمد حسین آزاد کی لاہور آمد کے بعد انہی مضامین سے ان کی مضمون نگاری کی صلاحیت نے جلا پائی کہ ڈاکٹر لائٹنر نے اپنے ایک خط میں آزاد کے مضامین کی بابت لکھا کہ ''مولانا کو اپنے موضوعات پر اتنا کامل عبور تھا اور ان میں تنقید کی ایسی قوت موجود تھی جس کی توقع ایک یورپی سکالر سے کی جا سکتی ہے۔''۸۹ اس دور کے اچھا لکھنے والوں میں منشی محمد علی بھی تھے جو سرکاری اخبار میں ملازم تھے۔ انہوں نے ''رسالہ انجمن پنجاب'' (۱) عہد قدیم اور زمانہ حال کی تحصیل میں کیا فرق ہے؟ (۲) کتب مروجہ حال وتحصیل طلبہ حال (۳) صرف وقت (۴) تربیت جسمانی وغیرہ کے موضوعات پر مضامین لکھے جبکہ دیگر مصنفین کے درج ذیل مضامین شامل تھے۔

''دروغ گوئی'' مصنفہ منشی گوپال داس، ''احسن طریقہ تعلیم و مواقعات ترقی علوم'' مصنفہ منشی جمنا پرشاد، ''تدبیر احسن ترقی صحت نفسانی'' مصنفہ منشی ہر سکھ رائے، ''موجبات دروغ گوئی'' ''فضیلت راست بازی وحلم'' اور ''دربیان احوال طریقہ تعلیم سابق و حال'' مصنفہ لالہ رجو لعل، ''ترغیب علو حوصلگی'' مصنفہ فقیر سید جمال الدین، ''فن طبابت'' مصنفہ ڈاکٹر ہادی حسین خان، ''تعلیم نسواں'' اور'' نکاح بیوہ زناں و شادی دختران کمسن'' مصنفہ پنڈت بشمبر ناتھ، ترجمہ اصطلاحات علوم ریاضی وغیرہ مصنفہ فقیر سید جمال الدین، تربیت اطفال مصنفہ منشی کرم الٰہی۔

۱۸۶۸ء سے رسالہ انجمن پنجاب کا انداز بدل گیا۔ ادبی مضامین نے اس کے ادبی معیار اور وقار کو بلند کیا۔ محمد حسین آزاد نے نیچرل شاعری کے حوالے سے اپنے تنقیدی خیالات کا اظہار کیا جو وقتاً فوقتاً ''رسالہ انجمن پنجاب'' میں شائع ہوئے۔ جن میں سے ایک مضمون کا نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

> ''شاعر کو چاہیے کہ طبیعت اس کی زیادہ تر قائل، صاحب قبولیت اور اثر پذیر ہو۔ جس حالت کو بیان کرے اس کا اثر پہلے اس کے دل پر چھا جائے مثل آب رواں کے جو رنگ اس میں پڑ جاتا

ہے وہی اس کا رنگ ہو جاتا ہے اور جس چیز پڑے اسے ویسا ہی رنگ دیتا ہے۔ جب دوسروں کے دل کو نرم کرے گا۔ اگر لوگوں کی طبیعت خوشی کی حالت میں لانی چاہے تو چاہیے کہ پہلے آپ مارے خوشی کے باغ باغ ہو جائے جو کچھ کہنا ہے جب اس کے لیے اپنے دل پر اثر نہیں تو دوسروں پر کیا ہوگا۔" ۹۰

شاعری کی نظری تنقید کے علاوہ اردو شاعروں پر مضامین کا سلسلہ بھی "رسالہ انجمن پنجاب" کی زینت بنتا ہے۔ جس میں شاہ حاتم، مرزا رفیع سودا اور شاہ ہدایت اللہ خان ہدایت وغیرہ پر محمد حسین آزاد نے لکھا۔ محمد حسین آزاد کے ادبی اسلوب نے "رسالہ انجمن پنجاب" کو ایک نیا پن عطا کیا جو موضوع اور اسلوب دونوں حوالوں سے دکھائی دیتا ہے۔ آزاد اپنے ایک مضمون میں اردو زبان کی وسعت کے لیے انگریزی سے ممکنہ الفاظ کا ترجمہ اس طور کرنے پر زور دیا ہے کہ معنی میں اختلاف پیدا نہ ہو سکے۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں:

"بہت سی اصطلاحات و الفاظ کو ترجمہ کر کے جو لفظ مقرر کرنے ہوتے ہیں عند الصواب اہل رائے میں سے مختلف اشخاص نے مختلف الفاظ کے لیے رائے دی بلکہ میں نے اپنے ہی قرار دیئے ہوئے لفظوں کو کئی کئی دفعہ تبدیل کیا۔ اگرچہ فرق باہمی بہت کم ہے مگر پھر بھی اختلاف ہے اب خیال یہ ہے کہ اگر علم مذکورہ میں اور لوگوں نے بلاد مختلف میں کتابیں ترجمہ یا تالیف کیں تو اکثر الفاظ کے لیے اردو کے لفظوں میں اختلاف ہوگا اور اس صورت میں تصانیف علمی میں اختلاط اور تخالف عظیم واقع ہو جائے گا۔ لہٰذا مناسب ہے کہ فہرست اس قسم کے الفاظ اصطلاحی کی مثلاً علم طب کی جو کہ اب میں ترجمہ کرتا ہوں مرتب کی جائے اور علم کے ٹھکانے کے مکانوں میں مثل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ و کلکتہ و ہوگلی و دہلی کالج و آگرہ کالج و جملہ ڈائریکٹری پریسڈنسی ہائے ہندوستان میں لکھ کر بھیج دی جائے کہ یہاں کے علماء مترجمین اسے دیکھ کر اپنی اپنی رائے دیں اور جہاں جہاں کوئی بات قابل اصلاح دیکھیں بے تامل اصلاح فرما دیں۔" ۹۱

محمد حسین آزاد کی یہ کاوشیں بر آئیں اور اردو نثر میں نئی اصطلاحات اور نئے الفاظ نے وسعت پیدا کی۔ اس طرح انگریزی الفاظ کو اردو میں منتقل کرنے کو تحریک دی۔ اس حوالے سے آزاد نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

"اول اسماء آلات اور عناصر وغیرہ کو جو مفرد ہوں باستثناء ان کے مقابلے کے الفاظ کی زبان مروجہ ہندوستان میں موجود ہوں یا جن کے واسطے الفاظ عربی فارسی وغیرہ میں وضع ہو چکے ہوں بجنسہٖ ترجمہ میں رکھے جاویں مثلاً آکسیجن، نائٹروجن وغیرہ بلا ترجمہ رکھے جائیں کیونکہ اگر ان کے واسطے الفاظ خواہ مخواہ گھڑے جاویں تو ان میں شک نہیں کہ سیاق عبارت سے ان کے مطلب کو

پہنچا جاوے خواہ ان کے واسطے فرہنگ جدا لکھی جاوے اور یہ مطلب اسی طور پر ان الفاظ کے مجنس رکھنے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے اس کے علاوہ کیا وجہ ہے کہ اس زبان اردو کو جو غیر زبانوں سے مرکب ہے وسعت نہ دی جاوے حالانکہ اس زبان میں الفاظ زبان غیر کے بلاتکلف داخل ہو سکتے ہیں اس کا مضائقہ نہیں یاں یہ تلاش ایسے الفاظ مل سکیں جو کہ مختصر اور سریع الفہم ہوں ان کی جگہ استعمال کیے جائیں۔" ۹۲

''رسالہ انجمن پنجاب'' نے اردو نثر کو نئے الفاظ و اصطلاحات کے حوالے سے وسعت دینے میں مہمیز کا کام کیا۔ جس کا انداز مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اردو زبان اس اعتبار سے ''رسالہ انجمن پنجاب'' کی منت بار احسان ہے۔ ۱۸۷۰ء میں ''رسالہ انجمن پنجاب'' بند ہو گیا۔ انجمن نے تعلیم کو فروغ دینے کے لیے یکم اپریل ۱۸۷۰ء کو ''ہمائے پنجاب'' جاری کیا جس کا اہتمام پنڈت مکند رام اور ادارت پنڈت گوپی ناتھ کے سپرد تھی لیکن ۱۸۷۱ء میں اس کی جگہ ''اخبار انجمن پنجاب'' نے لے لی جو سولہ صفحات پر مشتمل جمعہ کے روز شائع ہوتا تھا۔ اس کا انگریزی نام The Journal of the Anjaman-i-Punjab تھا۔ اسے بھی بدستور سرکاری سرپرستی حاصل رہی رسالے کا نام انگریزی تھا لیکن مواد اردو میں شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار کے اجراء کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید لکھتے ہیں:

''اس اخبار کا اجراء انجمن پنجاب کی طرف سے ہے اس سے مقصد اصلی یہ ہے کہ ہمارے ہم وطن خیالات انگریزی اور منشائے سرکار اور سرگذشت زمانہ سے واقف ہوں اور سرکار کو دیسی لوگوں کے خیالات ظاہر ہوں تا کہ اس سے حاکم اور محکوم دونوں کو فائدہ پہنچے اور بہبودی ملک ہو اس میں اپنے اپنے موقع پر مضامین مفصلہ ذیل میں درج ہوتے ہیں۔

۱۔ آرٹیکل یعنی جو امور وقتاً فوقتاً غور طلب ہوں ان پر اپنی اور اہل ملک کی رائے۔

۲۔ ایضاً دیگر انگریزی اور دیسی اخباروں کی رائے۔

۳۔ مضامین علمی و بیان عیب وصواب کتب وغیرہ نو تصنیف شدہ

۴۔ حالات ممالک غیر اور ذکر رسم و رواج مختلف اقوام یورپ ایشیا، افریقہ، امریکہ، جواب تک اس ملک کے لوگوں کو معلوم نہیں اور حال ان ممالک کی تاریخ قدیم کا

۵۔ خطوط اور خبریں

۶۔ خلاصہ قوانین و احکامات تبدیلی و تقرری وغیرہ عہدیداران و ملازمان سرکاری

۷۔ اشتہارات مفید عام و مفید خاص''۔۹۳

مذکورہ بالا وہ مقاصد تھے جن کے پیش نظر آئندہ کے مضامین علمی، منقولات، مراسلات، ملکی و بین الاقوامی

مسائل پر اظہار خیال، مختلف واقعات، انگریزی اخبار (پاؤنیر، انڈین پبلک اوپینین، سول اینڈ ملٹری گزٹ) استنبول کے عربی اور فارسی اخبارات سے تراجم وغیرہ اس میں جگہ پاتے۔ اپریل ۱۸۷۱ء کے پرچہ کی بابت سردار عبدالحمید لکھتے ہیں:

> ''یہ رسالے کی ساتویں جلد کا چوتھا نمبر ہے پہلے انجمن کی مختصر کار روائی درج ہے اس کے بعد ایک مضمون بعنوان ''معلومات جدید مقام تختہ بائی واقع سرحد پنجاب'' ڈاکٹر لائٹنر کا درج ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ تختہ بائی میں نمونہ جات سنگ تراشی اور بت وغیرہ زمانہ سلف کے دیوتاؤں کے موجود ہوں گے چنانچہ اسی نیت سے وہاں تشریف لے گئے اور اپنے خیال کو انکشاف کا جامہ پہنایا۔ اس مضمون میں ڈاکٹر صاحب کے اس انکشاف کی پوری کیفیت درج ہے۔ دوسرا مضمون جانوروں کی عقل حیوانی اور ان کے اوضاع کا بیان ہے اسے احمد بخش محافظ کتب خانہ انجمن نے "Spectator" سے ترجمہ کیا۔ آخر میں پندرہ صفات ''اخلاق ناصری'' کے ترجمہ کے ہیں جو بالاقساط اس پرچہ میں شائع ہوتا رہا اور بعد ازاں کتابی صورت میں انجمن ہذا کی طرف سے شائع کیا گیا۔'' ۹۴

''اخبار انجمن پنجاب'' کی اشاعت ۱۹ اگست ۱۸۷۱ء میں ''گارسان دتاسی کا مقالہ'' ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۱ء میں'' شائع ہوا۔ جو مسٹر ڈرمنڈ (Ed.Drummond) کے انگریزی مضمون سے اردو ترجمہ کیا گیا۹۵ نیز اس میں پہیلیاں حل کرنے کی غرض سے پیش کی جاتیں تا کہ پڑھنے والوں کی ذہانت کی جانچ ہو سکے۔۹۶ اخبار انجمن پنجاب انگریزی اخبار ''دی پبلک اوپینین'' سے ایک انگریزی مضمون ''انگریزی راج'' کا ترجمہ اپنی ۱۹ ستمبر ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں شائع کرتا ہے۔ انگریزی سے اردو نثری ترجمہ کا انداز مذکورہ اقتباس سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> ''انگریز دیسی لوگوں کو مراتب اعلیٰ شاید اس وجہ سے نہیں دیتے کہ مبادا وہ سرکار سے سرکش ہو جائیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جب تک حق تلفی رفع ہوتی رہے گی اور انصاف ہوتا رہے گا تب تک ہندوستان میں سرکشی کا ویسا ہی کم خطرہ ہے جیسا کہ سکاٹ لینڈ میں۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا اندیشہ بغاوت اس بات سے کم ہو جائے گا۔ اگر باشندگان کے اسلحہ اتار لیے جائیں گے اور ان کے ساتھ سلوک بد کیا جاوے گا۔'' اگر یہی صورت رہی تو ہندوستان کے لیے ایک زمانہ وہ ہو گا کہ اس کی جنگی حرارت بالکل سرد ہو جاوے گی اور یہاں کے لوگ اپنے ملک کے بچاؤ کے لیے اپنا کلی حصہ دوسرے ملک والوں پر رکھیں گے کیا یہ بات حکمرانوں کے فائدے کی ہے کہ محکوم اس طرح ضعیف کر دیئے جائیں --- یہ بزدلی کی مصلحت ہندوستانیوں کو جنگی علاقوں سے محروم کرنے کی ان کی ساری خوشی کو خاک میں ملا دیتی ہے---'' ۹۷

اس کے علاوہ ''اخبار انجمن پنجاب'' میں دیگر اخبارات پر تنقیدی تبصرے بھی شائع ہوتے تھے مثلاً ۲۸ جنوری ۱۸۷۶ء کا شمارہ ''اخبار عالم'' (میرٹھ) کی بابت اپنی رائے ان الفاظ میں دیتا ہے:

''خط صاف کاغذ شفاف ہوتا ہے مالک و ایڈیٹر محمد وجاہت علی خان ہیں۔ یورپ کی ایسی خبریں جس میں صنعت و ایجاد کا ذکر ہوتا ہے اس اخبار میں زیادہ تر درج ہوتی ہیں لیکن کوئی مضمون خاص ایڈیٹر کی جانب سے نہیں ہوتا۔ البتہ ہر جزو مضمون کے آخر میں رائے ایڈیٹر کی ہوتی ہے۔ خبریں نامہ نگاروں کی بھیجی ہوئی نہیں ہوتی۔ اخباروں سے نقل کر لی جاتی ہیں پہلے گورنمنٹ ممالک مغربی و شمالی واسطے افادہ سررشتہ تعلیم خریدا کرتی تھی لیکن اب موقوف کر دیئے۔ ایڈیٹر صاحب جو رائے لکھتے ہیں وہ صائب اور معقول ہوتی ہے۔'' ۹۸

۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء کے متفرق پرچوں میں موجود مضامین کے موضوعات کا تنوع بتاتا ہے کہ اس میں سائنس، علم و ادب، معاشرہ، جغرافیہ، لسانیات۹۹، اردو، ہندی تنازع پر مباحث، تاریخ، مذہب،۱۰۰ سیاست، معیشت، طب بمعہ معلومات عامہ اور شاعری ۱۰۱ سمیت ہر موضوع۱۰۲ پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس حوالے سے کچھ مضامین کے عنوانات کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جس سے مذکورہ بالا موضوعات کی عکاسی ہوتی ہے۔

''مجموعۂ ہیولیٰ، قانون کشش وحرکت کا بیان، پالا، برف یخ کا بیان، کرۂ باد، بیان چلنے والی ہوا کا، بخارات، ابر و مینہ کا بیان، دریا کا بیان، علم بدیع، ادب، مضمون نویسی کے آداب، علم قیافہ، علم کے واسطے تجربہ ضروری ہے۔ اہل چین کی زبان اور ان کی علمیت کا بیان، شعر وسخن کی اصطلاحات، فوائد علوم مختلف، علم تاریخ، خدا کا ہونا ثابت ہے، حل سوالات علمی، حل سوالات اقلیدس، صحبت کے اثر، فغان مخلوقات، حفظ صحت روحانی، کثرت ازدواج اور اس کے مضر نتیجے، شاعری اور اس کے اصول، مضمون فوائد صبر، سزائے مجرمان، قومی ترقی، آدمی کو کیا کرنا چاہیے۔ فضول خرچی پر موقعہ شادیات، ہمارے تعلیم یافتوں کی حالت، خوشی، نابردہ رنج گنج میسر نمی شود، قومی ہمدردی، اصلاح رسوم، اہل ہنود، چھوٹی عمر کے قیدیوں کے لیے مدارس حرفت، خیرات خانے، مجرموں کی اصلاح، کیونکر ہم ہم پلہ یورپ کے ہو سکتے ہیں؟ فاحشہ عورتوں کے متفرق جگہ شہر میں رہنے سے بہت بڑے نقصانات۔

دریائے نیل کا بیان، وجہ تسمیہ بندر کھمبایت، حالات ملک روس، ملک منگولیا کا حال، حالات قصبہ نجف گڑھ، عبدالکریم پاشا، احمد مختار پاشا، دریائے ڈینیوب، مصلحات بلگیریا، زار روس، ٹرکی کی حالت، مصر کی بھول بھلیاں، حالات حکمائے سلف، دنیا کے سات عجائبات، روئے زمین کی بڑی بڑی معلومات ہرزگووینا کی بغاوت، بغداد استنبول ریلوے، صیغہ زراعت وتجارت، طریقہ طبابت، جو بالفصل جاری ہے کس قدر اور نقصان مریضوں کو اس سے پہنچتا ہے۔ ہیضہ، رعایا کیوں تنگ

دست ہو جاتی ہے۔بعض دیسی مدرسوں کی حالت،ایک پیسے کا ٹکٹ،تخفیف کا مسئلہ، روسائے تعلیم یافتہ میں لکھنے والے ہندوستانی اخبارات، رائل ٹورسٹ"۔۱۰۳

مضامین کے ان موضوعات میں تنوع تو نظر آتا ہے لیکن ان میں ادبی موضوعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب نے جدید مشاعروں کی بنیاد رکھی تو لاہور کی ادبی فضا پر شاعری غالب آ گئی چنانچہ یہ مشاعرے اخبار انجمن پنجاب،ضمیموں کی شکل میں "گلدستہ" کے نام سے شائع کرتا تھا۔اب انجمن کے جلسوں میں جو مضامین پڑھے جاتے وہ انجمن مفید عام قصور کے "رسالہ" میں شائع ہوتے جس کا اجراء اگست ۱۸۷۴ء میں ہوا۔ڈاکٹر صفیہ بانو انجمن پنجاب ہی کی ایک شاخ قرار دیتے ہوئے لکھتی ہیں:

"جلد اول (رسالہ انجمن پنجاب) نمبرا۔ بابت ماہ جولائی و اگست ۱۸۷۴ء رسالہ انجمن مفید عام قصور، یہ سطور اس رسالہ پر موجود ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب انجمن پنجاب کی کارروائیاں لاہور کے بجائے قصور سے مندرجہ بالا نام کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔اس رسالے میں عام طور پر صرف مضامین ہی شائع ہوتے تھے جو مشاعروں کے علاوہ دیگر مجالس میں پڑھے جاتے تھے۔گویا رسالہ انجمن پنجاب کے دو حصے ہو گئے ایک تو بطور ضمیمہ جو کافی ضخیم ہوتا تھا جس میں مشاعروں کی کارروائی درج ہوتی دوسرا حصہ قصور سے جس میں صرف مضامین شائع ہوتے تھے۔"۱۰۴

اس ضمن میں مزید لکھتی ہیں:

"اس کے پہلے صفحے پر "رسالہ انجمن پنجاب در رسالہ قصور" درج ہے یہ حسب معمول انجمن پنجاب کے اجلاسوں کی کارروائیاں اور مضامین شائع کرتا تھا۔مصنفین بھی وہی تھے۔اس ماہ جولائی ، ماہ اگست،ستمبر ،اکتوبر اور نومبر تک یہ پرچہ اسی نام سے شائع ہوتا رہا لیکن اس کے بعد رسالہ نمبر۴ فروری ۱۸۷۷ء جلد نمبر۳ (دو) میں انجمن قصور کا نام نہیں۔اس پر صرف رسالہ انجمن پنجاب لکھا ہے اور جلسوں کی کارروائیاں درج ہیں۔" ۱۰۵

قصور کا علاقہ جسے الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے وقت نظم ونسق کے حوالے سے لاہور میں شامل کر دیا گیا۔ بعد ازاں ۲۴ اکتوبر ۱۸۶۷ء کو اسے میونسپل کمیٹی کا درجہ دے دیا گیا۔"انجمن پنجاب" کے زیر اثر "انجمن مفید عام قصور" قائم ہوئی اور مقاصد میں انجمن پنجاب کی ذیلی شاخ بن کر ابھری اور اپنا تشخص قائم کیا اس کی بابت شیخ اسماعیل پانی پتی کہتے ہیں: "۶۔جولائی ۱۸۷۴ء کو قصبہ قصور، ضلع لاہور میں ایک ادبی، علمی، معاشرتی،تعلیمی اور اصلاحی انجمن کا انعقاد عمل میں آیا۔"۱۰۶ چونکہ قصور لاہور ہی کا ایک قصبہ تھا اس لیے یہاں پر ہونے والی علمی و ادبی ترقی دراصل لاہور ہی کی نیک نامی میں اضافے کا باعث بنی۔"انجمن مفید عام" قصور نے اگست ۱۸۷۴ء ہی

میں اپنا ماہنامہ ''رسالہ'' شائع کرنا شروع کیا۔ چونکہ ابتدا میں انجمن قصور کو اشاعتی ڈیکلریشن نہیں ملا تھا اس لیے انجمن قصور نے پنجاب کے اشاعتی حقوق استعمال کیے۔ عطا الرحمٰن کے مقالہ ''پنجاب کی علمی و ادبی انجمنیں'' اور ''جائزہ زبان اردو (پنجاب)'' کے توسط سے ''رسالہ'' کی فہرست مضامین میں لسانی، سائنسی، تاریخی، تنقیدی، سماجی، قانونی اور ادبی موضوعات کا مطالعہ کیا جائے اور ساتھ ہی گذشتہ صفحات پر اخبار انجمن پنجاب میں ۱۸۷۵ء سے ۱۸۷۹ء کے مضامین کے موضوعات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کریں تو ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے کہ ''رسالہ'' انجمن مفید عام قصور کا پلڑا ادبی مضامین کے حوالے سے بھاری رہتا ہے۔ ۱۸۷۴ء کے بعد اور یہاں تک کہ ۸۲-۱۸۸۱ء کے دوران بھی اخبار انجمن پنجاب میں ادبی کے بجائے عمومی، سماجی اور سائنسی نوعیت کے مضامین ہی زیادہ تعداد میں دکھائی دیتے ہیں۔

مقالہ نگار اپنے مطالعہ سے نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۱ء تک کی جو فہرست مضامین مقالہ ''پنجاب کی علمی و ادبی انجمنیں'' اور ''جائزہ زبان اردو (پنجاب)'' میں دی گئی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انجمن پنجاب کی سرپرستی میں ''رسالہ'' ایک منفرد علمی و ادبی ماہنامہ کی صورت اختیار کر گیا تھا اور اسے یہ انفرادیت لاہور کے اہل قلم نے دی تھی کیونکہ انجمن پنجاب کے بیشتر اراکین کی تحریریں ماہنامہ ''رسالہ'' میں چھپتی تھیں لہٰذا ''رسالہ'' کا مطالعہ اس لیے ناگزیر ہے کہ لاہور کے اہل قلم کے مضامین اسی رسالے کی زینت بنتے رہے۔ چنانچہ اسے بھی لاہور کی علمی و ادبی اردو نثر میں شمار کیا جائے گا۔ ''رسالہ'' کو یوں تو ملک بھر کے مصنفین (جن میں سرسید احمد خان، محسن الملک مولوی چراغ علی، وقار الملک بھی شامل تھے) کا قلمی تعاون حاصل تھا لیکن ان میں سے بیشتر لاہور میں موجود تھے۔ جن میں محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، سیف الحق ادیب، منشی اعجاز نبی، مرزا افضل بیگ، حافظ حبیب اللہ خان، پنڈت حکم چند، مولوی خدا بخش، منشی دوست محمد خان، مولوی خدا بخش، منشی دین محمد، منشی رادھا کشن، سوڈھی حکم سنگھ، عبدالحکیم کلانوری، مولوی غلام اللہ، منشی غلام جیلانی، ڈپٹی غلام نبی خان، بابو فتح چند، مرزا مولوی فتح محمد ملک، مولوی کریم الدین، پنڈت کنہیا لال، مولوی محمد دین، معلم محمد شفیق، ڈپٹی محمد قادر بخش خان، منشی نرائن داس، مولوی ولی اللہ، مرزا نصیر الدین حیدر وغیرہ شامل تھے۔ نیز لاہور سے ہمعصر رسائل و جرائد مثلاً ''آفتاب پنجاب''، ''پنجابی اخبار''، ''اخبار انجمن پنجاب''، ''رہبر ہند''، ''اخبار کوہ نور'' اور ''اتالیق پنجاب'' سے بھی مضامین کو منقولات کے طور پر شائع کیا جاتا تھا۔

''رسالہ'' میں ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۱ء تک شائع ہونے والے مضامین کا مطالعہ اس لیے دلچسپی اور اہمیت کا حامل ہے کہ یہ اہل لاہور کی لکھی ہوئی اردو نثر کے موضوعات اور اسلوب کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے بڑی خوبی

اس رسالے کے علمی و ادبی مضامین تھے۔ جن کے لکھنے والوں میں محمد حسین آزاد سرفہرست تھے۔ چنانچہ محمد حسین آزاد کے بیشتر علمی و ادبی مضامین نے اسی رسالے سے مقبولیت پائی جو بعد ازاں ''آب حیات'' اور ''نیرنگ خیال'' اور ''دربار اکبری'' کا حصہ بنے۔ لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ مولانا آزاد ہی کے مضامین تھے جنہوں نے اردو نثر کو نہ صرف نیا اسلوب بیان دیا بلکہ موضوع کے تنوع اور لغت میں نت نئے الفاظ کا بھی قابل قدر اضافہ کیا۔ لاہور میں اردو نثر کے ارتقا کی سرعت اور ترقی کا اندازہ ''رسالہ'' میں شائع ہونے والے متنوع مضامین کی اس فہرست ۱۰۷ سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ **مولانا محمد حسین آزاد** کے درج ذیل ادبی مضامین ملتے ہیں:

نظم اردو کی تاریخ (نومبر ۱۸۷۴ء)، بقیہ نظم اردو کی تاریخ (دسمبر ۱۸۷۴ء)، زبان اردو (یہ دراصل نیرنگ خیال کا دیباچہ ہے) (مئی ۱۸۷۵ء) زبان اردو (مقدمہ آب حیات کا جزو) (اگست ۱۸۷۵ء)، بقیہ زبان اردو (ستمبر ۱۸۷۵ء)، سکندر اعظم کے سفر ہندوستان کا بیان (ستمبر ۱۸۷۵ء)، بقیہ مضمون زبان اردو (نومبر ۱۸۷۵ء)، زبان اردو (مقدمہ آب حیات کا جزو) (دسمبر ۱۸۷۵ء)، اسلاف ہند کے طور وطریق، (فروری ۱۸۷۶ء)، اطوار ہندوستان (اپریل ۱۸۷۶ء)، عبدالرحیم خان خاناں کا حال (مئی ۱۸۷۶ء)، ''عجیب تذکرہ سلاطین بطور تاریخ''، ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار (نیرنگ خیال)''(جولائی ۱۸۷۶ء) راجہ بیربر کے واقعات اور لطائف (اگست ۱۸۷۶ء)، نیرنگ خیال (جون ۱۸۷۷ء)۱۰۸

سیف الحق ادیب دہلوی جن کے ذہن وفکر کو لاہور کی علمی و ادبی فضا نے جلا دی انہوں نے بے شمار مضامین لکھے چنانچہ ان کے درج ذیل مضامین اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں:

حقیقت سخن، (نظم کا تاریخی مضمون) (جولائی اگست ۱۸۷۴ء)، ''شکر نعمت (علم الاخلاق)''، تذکرہ فضائل ومحاسن مولانا الطاف حسین حالی انتخاب اشعار (دیوان حالی) (ستمبر اکتوبر ۱۸۷۴ء)، تذکرہ نظام رعنا اور ان کے منتخب اشعار (نومبر ۱۸۷۴ء)، انسان کے دل وجسم کا تعلق، برقی روشنی کا بیان (اگست ۱۸۸۰ء)، شالامار باغ کی روشنی پر آرٹیکل (نومبر ۱۸۸۰ء)، اداریہ مشرقی علوم اور اخبار انجمن پنجاب (فروری ۱۸۸۱ء)، مضمون فردوس طوسی کا حال (مارچ ۱۸۸۱ء)، اداریہ اخبار انجمن پنجاب اور ہم (مئی ۱۸۸۱ء)، مسجد قرطبہ کا حال، آدم سے پہلے بھی دنیا میں آدم تھا، شہاب ثقیل یعنی سنگ آسمانی کا بیان، قدیم شہر بابل کی تاریخ، امریکا یعنی دنیا کب اور کیونکر دریافت ہوئی (جون ۱۸۸۱ء)، بخارات کی قدرتی قوت، آفتاب کی روشنی کا بیان، انسانوں کا قدیم الخلقت ہونا، حکمت یا علوم قدیمہ وجدید کا سلسلہ اور ان کی تقسیم، سلطنت چین کی بے نظیر دیوار (جولائی ۱۸۸۱ء)، جزائر مرجان یعنی مونگوں کے عجیب وغریب جزیرے، حکیم سر آئزک نیوٹن کا حال، ''چینیوں کی تربیت اولاد، بیاہ شادی اور تجہیز و

تکفین کی رسمیں''، اجسام روحی وغیرروحی کی تیز روی کا حساب، زگال معدنی یا پتھر کے کوئلہ کا بیان، (اگست ۱۸۸۱ء)، واقعات قابل یاد داشت، زمین ہر ایک ڈیل سے گول ہے، علم ہیئت کا تاریخی حال، زلزلہ دریافت کرنے کی ترکیب، عجائبات بحری، غم اور خوشی سے مرنا، معزول شاہ اودھ کی نئی تصنیف (ستمبر ۱۸۸۱ء) نقشہ اور تصویر کھینچنے کی نئی ترکیب، لوہا سخت کرنے کا طریق، حادثہ جدید، شہد بنانے والی چیونٹیوں کا بیان (اکتوبر ۱۸۸۱ء)، اداریہ ترجمہ وشرح منتخب بوستان، ظرافت کی ظرافت نصیحت کی نصیحت، ایک عجیب وغریب گھنٹہ، انگریزی ایجادوں کا مختصر حال، کرہ ماہ کی حقیقت، آچار ہولناک، عمق بحری کا دریافت ہونا (نومبر ۱۸۸۱ء)

''رسالہ'' میں سیف الحق ادیب کے بعد سب سے زیادہ مضامین **مرزا مولوی فتح محمد بیگ** کے چھپے۔ مرزا صاحب ''رسالہ'' کی ادارت پر بھی مامور رہے۔ اداریوں کے علاوہ ان کے علمی، مذہبی، معاشی، اور معاشرتی موضوعات پر درج ذیل مضامین شائع ہوئے۔

نقشہ توضیح معانی پنجاب (مئی ۱۸۷۵ء)، ترغیب وتحریص علم زراعت (جون ۱۸۷۵ء)، حالات ترقی دولت وتجارت انگلینڈ (جولائی ۱۸۷۵ء)، بقیہ علم زراعت، سلطنت کی حاجت اور مہذب حکومت کی تعریف (اگست ۱۸۷۵ء)، فوائد اتفاق (اکتوبر ۱۸۷۵ء)، اصول فن مناظرہ فصل سوم (نومبر ۱۸۷۶ء)، بقیہ اصول فن مناظرہ فصل سوم (فروری ۱۸۷۷ء)، بقیہ اصول فن مناظرہ فصل سوم (مارچ ۱۸۷۷ء)، بقیہ اصول فن مناظرہ فصل سوم (اپریل ۱۸۷۷ء)، پنجاب کی افسوسناک حالت (مئی ۱۸۷۸ء)، قومی عزت اور ملکی شوکت ترقی صنعت و زراعت پر موقوف ہے (ستمبر ۱۸۷۸ء)، فضیلت کی پگڑی اور طالب علموں کی تلخ زندگانی سے اتفاق (مئی ۱۸۷۹ء)، مذہب اسلام اور مسئلہ (مکمل رسالہ) (نومبر ۱۸۷۹ء)، بدگمانی (اپریل ۱۸۸۰ء)۔

ڈپٹی غلام نبی خان ریڈر چیف کورٹ پنجاب لاہور تھے۔ سرکاری ملازمت اور مصروفیات کے باوجود تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ ڈپٹی صاحب کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے ''صحافت کی ابتدائی تاریخ'' (اپریل ۱۸۷۶ء) کے عنوان سے صحافت کی ابتدائی تاریخ پر اردو نثر میں پہلا تحقیقی طرز کا مضمون لکھا۔ بقول اسماعیل پانی پتی ''یہ صحافت کی تاریخ پر پہلا مضمون ہے اس سے پہلے ہمیں کہیں پر صحافت کے موضوع پر مضمون نہیں ملتا''[۹۰] ''رسالہ'' میں ان کی فرہنگ لغات مستعملہ عدالت ہائے گورنمنٹ (جولائی، اگست ۱۸۷۴ء) تا اکتوبر ۱۸۷۶ء بالاقساط شائع ہوئی۔

مولوی محمد دین جو منشی محبوب عالم چیف ایڈیٹر ''پیسہ اخبار'' کے چچا تھے شعبہ تدریس سے وابستہ ہونے کی

وجہ سے زیادہ تر علمی نوعیت کے مضامین لکھے جو ہمیشہ طلباء کو ذہنی جلا بخشتے رہے ہیں۔ ان مضامین کی تفصیل درج ذیل ہے۔

علم منطق کا تاریخی اور تعلیمی بیان (جولائی ۱۸۷۵ء)، منطق (ستمبر ۱۸۷۵ء)، بقیہ منطق (دسمبر ۱۸۷۵ء) فزیکل جیوگرافی (جغرافیہ طبعی) ترجمہ (فروری ۱۸۷۶ء)، حل سوالات ریاضی (علم حساب، مساحت، جبر ومقابلہ) (فروری ۱۸۷۶ء)، بقیہ فزیکل جیوگرافی (مارچ ۱۸۷۶ء)، بقیہ حل سوالات ریاضی (مارچ ۱۸۷۶ء)، بقیہ فزیکل جیو گرافی (اپریل ۱۸۷۶ء)، بقیہ حل سوالات ریاضی (مئی ۱۸۷۶ء)، بقیہ جغرافیہ طبیعی، حل سوالات ریاضی (جون ۱۸۷۶ء)، علم منطق، علم ریاضی (جولائی ۱۸۷۶ء)، قوت برقی یا کہربائی کا بیان، علم منطق (اگست ۱۸۷۶ء) علم ریاضی (اکتوبر ۱۸۷۷ء)، علم ریاضی (نومبر ۱۸۷۷ء)، مسائل ریاضی (دسمبر ۱۸۷۷ء)، علم حساب (فروری ۱۸۷۸ء)، علم جر ثقیل (فروری ۱۸۷۹ء)، علم جغرافیہ علم ریاضی (اگست ۱۸۷۹ء)، بقیہ علم جغرافیہ علم ریاضی (ستمبر ۱۸۷۹ء)، بقیہ جغرافیہ علم ریاضی (اکتوبر ۱۸۷۹ء)۔

منشی اعجاز نبی منشی ڈپٹی غلام نبی خاں کے بڑے بیٹے تھے۔ تاریخ نویسی سے رغبت رکھتے تھے چنانچہ اس موضوع پر درج ذیل مضامین لکھے۔

نپولین بونا پارٹ یعنی شہنشاہ فرانس کے اوضاع و اطوار کا بیان (فروری ۱۸۷۵ء)، سرگذشت رابنسن کروسو (اپریل ۱۸۷۵ء)، بقیہ سرگذشت رابنسن کروسو (جون ۱۸۷۵ء)

مرزا افضل بیگ: ''رسالہ'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔ علمی اور تعلیمی نوعیت کے مضامین لکھتے تھے جو کہ درج ذیل ہیں:

جیالوجی یا علم خواص ارض (دسمبر ۱۸۷۷ء)، بقیہ (بحث متعلق قوت آبی) (فروری ۱۸۷۸ء)، بقیہ (بحث متعلق قوت آبی) (مارچ ۱۸۷۸ء)، بقیہ (بحث متعلق قوت آبی)(اپریل ۱۸۷۸ء)، بقیہ علم جیالوجی (پہاڑوں، معدنیات) (مئی ۱۸۷۸ء)، بقیہ علم جیالوجی (پہاڑوں، معدنیات) (جون ۱۸۷۸ء)، پہاڑوں کی ساخت اور ان کی اقسام (جولائی ۱۸۷۸ء)، بقیہ پہاڑوں کی ساخت اور ان کی اقسام (اگست ۱۸۷۸ء)

عبدالحکیم کلانوری انجمن پنجاب کے رکن اور یونیورسٹی کالج میں استاد تھے۔ حکمت سے دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ انہوں نے اردو نثر میں با قاعدہ تصانیف تاریخ مجم، انتخاب ناسخ التواریخ اور جلاء القلوب کے علاوہ طب کے موضوع پر مضامین لکھے جو درج ذیل ہیں:

شرح الحکمت (ستمبر اکتوبر ۱۸۷۴ء)، بقیہ شرح الحکمت (نومبر ۱۸۷۴ء)، بقیہ شرح الحکمت (دسمبر

۱۸۷۴ء)۔

منشی غلام جیلانی: چیف کورٹ پنجاب لاہور میں سرکاری ملازم تھے۔ مذہب سے لگاؤ کی بناء پر انہوں نے مذہبی اور اسلامی تاریخ و اقدار کے حامل درج ذیل مضامین تحریر کیے:

علم تاریخ کے فوائد اور مطالب اور ایام جاہلیہ کا ذکر (مئی ۱۸۷۵ء)، حضرت ''محمد رسولؐ کی سوانح عمری کا معتزز بیان'' (جولائی ۱۸۷۵ء)، تذکرہ خلافت امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ (ستمبر ۱۸۷۵ء)، بقیہ سوانح عمری حضرت رسولؐ کا معتزز بیان (نومبر ۱۸۷۵ء)، بقیہ سوانح عمری حضرت رسولؐ کا معتزز بیان (مارچ ۱۸۷۶ء)، ذکر خلافت امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق (جون ۱۸۷۶ء)

پنڈت کنہیا لال نے تاریخ نویسی کے موضوع پر مستقل کتابوں ہنود کی مذہبی تاریخ، تاریخ پنجاب اور تاریخ لاہور کے علاوہ درج ذیل تاریخی مضامین بھی لکھے:

ہنود کی مذہبی تاریخ (نارائن کی غرض پیدائش تک) (ستمبر اکتوبر ۱۸۷۴ء)، بقیہ ہنود کی مذہبی تاریخ (نارائن کی غرض پیدائش تک) (دسمبر ۱۸۷۴ء)، تاریخ الہنود (مارچ ۱۸۷۶ء)، بقیہ تاریخ الہنود (جون ۱۸۷۶ء)

منشی رادھا کشن رئیس لاہور اور ''انجمن پنجاب'' کی لسانی کمیٹی میں زبانِ سنسکرت کے سینئر ممبر تھے، ان کے تحریر کردہ مضامین علمی، تعلیمی اور سائنسی حوالے سے اپنی پہچان رکھتے تھے جو کہ درج ذیل ہیں:

علم فلکیات (دسمبر ۱۸۷۷ء)، علم ہیت کی بحث (مارچ ۱۸۷۸ء)، مسائل طبیعہ متعلق زمین و شمس و قمر و سیارگان (مئی ۱۸۷۸ء)، بقیہ علم مناظر (جون ۱۸۷۸ء)، قمر کا بیان متعلقہ علم ہیت (اکتوبر ۱۸۷۸ء)، مقیاس الہوا کا بیان (جنوری ۱۸۷۹ء)

مولانا الطاف حسین حالی کا بھی ایک مضمون بالاقساط ''رسالہ'' میں چھپا جس کا عنوان تھا شرح الحکمت [۱۰] (نومبر ۱۸۷۴ء)، بقیہ شرح الحکمت (دسمبر ۱۸۷۴ء)

منشی دوست محمد چیف کورٹ پنجاب لاہور میں سرکاری ملازم تھے ان کے دو مضامین ''رسالہ'' میں ملتے ہیں: ''صنعت و حرفت (دسمبر ۱۸۷۶ء)، قانون گورنمنٹ پر لیکچر (مارچ ۱۸۷۷ء)''

سوڈھی حکم سنگھ ممبر تعلیمی کمیٹی انجمن پنجاب تھے انہوں نے قانونی موضوعات پر لکھا جن میں درج ذیل مضامین شامل تھے۔

شرح مطالب قانون (ستمبر اکتوبر ۱۸۷۴ء)، بقیہ شرح مطالب قانون (دسمبر ۱۸۷۴ء)، بقیہ شرح مطالب قانون (فروری ۱۸۷۵ء)، اقسام قانون کی شرح (مئی ۱۸۷۵ء)

برکت علی خان پیشہ کے اعتبار سے ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ بابو نوبین چندر کے یورپ جانے پر ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے سیکرٹری بنے اور مسلمانوں کی تعلیمی معاشرتی اور اخلاقی حالت کی اصلاح کے لیے کوشاں رہے۔ انجمن اسلامیہ لاہور کے بانی اور سرسید احمد خان اور ان کی تحریک کے زبردست حامی و معاون تھے بقول اسماعیل پانی پتی ''لوگ انہیں پنجاب کا سرسید'' کہا کرتے تھے[111] ان کی تحریریں مذہبی رجحانات کی حامل تھیں۔ ''رسالہ'' میں ان کا مضمون ''عورتوں کے حقوق'' (مارچ ۱۸۸۰ء) چھپا۔

مذکورہ اصحاب کے علاوہ منشی نرائن داس نے معاشی اور اخلاقی موضوعات کے حوالے سے ''ترقی صنعت'' (اپریل ۱۸۷۵ء) اور ''فوائد صبر'' (جولائی ۱۸۷۵ء) لکھے۔ مولوی کریم الدین نے کاشت کاری کے موضوع پر ''سہولت کاشتکاران'' (فروری ۱۸۷۵ء) جبکہ لالہ حکم چند (پلیڈر لاہور) نے ''ریاست جے پور کا تاریخی حال'' (ستمبر اکتوبر ۱۸۷۴ء) ''رسالہ'' میں لکھا۔

مندرجہ بالا مضامین کے موضوعات پر غور کریں تو ادبی تحقیقی، تنقیدی، سائنسی، علمی، تعلیمی، تاریخی، مذہبی، اخلاقی، طبی، قانونی، سوانحی کے علاوہ منطق، جغرافیہ اور ریاضی سے متعلق جتنے متنوع موضوعات ہیں اتنے ہی متنوع اسالیب بیان بھی اردو نثر کو میسر آئے جس سے لاہور کی اردو نثر نے وسعت پائی۔ ادھر ''اخبار انجمن پنجاب'' بھی بدستور نکلتا رہا۔ اس میں جو مضامین چھپ رہے تھے ان کی نوعیت عام طور پر سماجی، علمی و تعلیمی اور عوامی امور سے متعلق تھی۔ اس حوالے سے ۸۲-۱۸۸۱ء کی فہرست مضامین ملاحظہ ہو۔ قطع نظر اس سے کہ ادبی موضوعات پر مضامین نہ ہونے کے برابر تھے لیکن اس کے باوجود ۸۲-۱۸۸۱ء کے دوران ''اخبار انجمن پنجاب'' لاہور میں شائع ہونے والے ان مضامین کا یہ تنوع قابل دید ہے جو اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اردو نثر اس قابل ہو گئی تھی کہ اس میں ہر طرح کے موضوع کو بیان کرنے کی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ وہیں پنڈت رشی کیش اور بابو نوبین چندر رائے اردو نثر کے زود نویس کے طور پر ابھرتے ہیں۔

۱۔ ''لندن کا انڈیا میوزیم اور ہندوستان میں مسٹر سی پرڈن کلارک کا مشن'' از صدر انجمن
۲۔ ''علاقہ بنچالہ کے مسائل'' از پنڈت رشی کیش (اورینٹل کالج لاہور)
۳۔ ''کوتوں کا ماخذ'' از پنڈت رشی کیش

۴۔ ''عملی اور عوامی تعلیم'' از بابو نوبین چندر رائے

۵۔ ''بدھ مت اور جین مت'' از پنڈت رشی کیش

۶۔ ''ذات پا'' از پنڈت رشی کیش

۷۔ ''بائی میٹلوم در ساڑھے پندرہ'' از مسٹر ایچ سر نوبچی

۸۔ ''بائی میٹلوم در ساڑھے پندرہ کا دیسی نظریہ'' از بابو نوبین چندر رائے

۹۔ ''ریلوے کے ملازموں کے لیے پراویڈنٹ فنڈ'' از مسٹر ڈبلیو پی اینڈ ریو

۱۰۔ ''ہندوؤں کی زبان جس سے سرکاری سکولوں میں بے اعتنائی برتی جاتی ہے''

۱۱۔ ''کھتری فرقے کی تقسیم'' از مسٹر ڈبلیو کولڈ سٹریم سی ایس

۱۲۔ ''مذہب: یونیورسٹی میں تدریسی مضمون کے طور پر'' از بابو پنچانن مکر جی

۱۳۔ ''ہندوؤں کے تہوار 'ہولی' کا ماخذ'' از پنڈت رشی کیش بھٹا چارجی

۱۴۔ ''سورج کا ساکن ہونا: ویدوں کی روشنی میں'' از بابو نوبین چندر رائے

۱۵۔ ''بچپن کی شادی'' از لالہ چونی لال ایچ اے

۱۶۔ ''دھیگر کھتریوں کی اصلیت'' از پنڈت رشی کیش شاستری

۱۷۔ ''ہندوستانی زراعت'' (اپل کی طرف سے انجمن کو پیش کردہ مقالہ)

۱۸۔ ''کھترے اور ان کی ذیلی تقسیم'' از پنڈت کورو پرشاد

۱۹۔ ''مشرق کے نام نہاد، دھماکہ خیز، علوم'' از بابو پنچانن مکرجی

۲۰۔ ''تعلیم کی ترقی میں رکاوٹیں'' (مڈل سکول کے امتحانات) ایک استاد کے قلم سے

۲۱۔ ''غریبوں کی منظم امداد'' از ڈاکٹر سنٹر

۲۲۔ ''ضلع بجنور میں زرعی ترقی کی روداد'' از پنڈت سری لال

۲۳۔ ''چھوٹی عمر کی شادی: تعلیم نسواں میں رکاوٹ'' از ایف سی سانیال

۲۴۔ ''سرکاری سکولوں میں مذہبی تعلیم'' از بابو نوبین چندر رائے

۲۵۔ ''ہندوستانی ادبیات کی تاریخ کے سلسلے میں البرخت ویبر کے لیکچروں پر تبصرہ'' از پنڈت رشی کیش

۲۶۔ ''پنجاب ناردرن سٹیٹ ریلوے کے حکام کے لیے تجاویز'' از بھائی چرت سنگھ

۲۷۔ ''اُپاپلو سے ''اُپیلو'' کی شناخت'' از پنڈت رشی کیش شاستری

۲۸۔ ''پنجاب میں صحت و صفائی'' از لالہ کاشی رام

۲۹۔ ''صحت و صفائی کے متعلق ہماری ضروریات'' از بابو نوبین چندر رائے

۳۰۔ ''دیسی ادبیات کی تخلیق'' از بابو نوبین چندر رائے

۳۱۔ ''رومن اردو پر حواشی'' (سینٹ کے کچھ اراکین کے قلم سے)

۳۲۔ ''دیسی ریاستوں میں تعلیم'' از بابو پنچانن مکرجی

۳۳۔ ''تعلیمی اصلاحات'' از پنڈت ایشری پرشاد

۳۴۔ ''سینٹ تھامس کالج مری سے ملحق دیسی شرفا کے لڑکوں کے لیے ایک کالج قائم کرنے کی تجویز''

۳۵۔ ''اتحادی کونسلوں کے اختلاط سے آبادی میں اضافہ''

۳۶۔ ''ہندوستان میں انجینئر اور انجینئری کا پیشہ'' از این ای جیننگ سی ای

۳۷۔ ''نچلی ذاتوں کے ضمن میں ہندو قانون سازی''، پنڈت رشی کیش شاستری

۳۸۔ ''جبرائیل کا حال: وہ ملک جہاں ابھی تک کوئی سیاح نہیں پہنچا'' از میر عبداللہ

۳۹۔ ''۱۸۸۱ء کی مردم شماری سے متعلق مسائل'' از ڈی سی جے ابٹسن سی ایس

۴۰۔ ''ہندوستان اور ہمسایہ ممالک کا لسانیاتی نقشہ'' از انجمن

۴۱۔ ''قیصر ہند'' از ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر (مئی ۱۸۷۶ء کی کارگزاری سے اخذ کر کے پھر سے چھاپا گیا)

۴۲۔ ''مسٹر ایم ایس ہاویل کی عربی گرامر پر تبصرہ'' از پیر زادہ محمد حسین

۴۳۔ اعتماد الدولہ فنڈ کی اصلیت کے متعلق مضامین

۴۴۔ ''ڈائریکٹروں کی عدالت سے تعلیمی روبکار کا اقتباس اور اس پر تبصرے''

۴۵۔ ''کیا مہا بھارت کا مصنف ہی شری مد بھاگوت کا مصنف ہے، جیسا عموماً خیال کیا جاتا ہے؟'' از پنڈت گورو پرشاد

۴۶۔ ''ہندوستانی زراعت'' از بابو نوبین چندر رائے

۴۷۔ ''بھاگ پر بودھ'' از پنڈت رشی کیش شاستری

۴۸۔ ''پنجاب میں ایک زراعتی سکول کی ضرورت'' بابو نوبین چندر رائے

۴۹۔ ''پنجاب یونیورسٹی کالج'' از بابو نوبین چندر رائے

۵۰۔ ''پنجاب میں تعلیم نسواں'' از بابو نوبین چندر رائے

۵۱۔ ''ڈیرہ دون میں جنگلات کا سکول'' از بیڈن پاویل سی ایس

۵۲۔ ''پنجاب میں کپاس کی کاشت کی رپورٹ برائے ۸۰-۱۸۷۹ء پر تبصرہ'' از بابو نوبین چندر رائے

۵۳۔ ''کیا سنی مسلمان دنیا کے لیے سلطان ترکیہ ''خلیفہ'' ہیں؟'' از ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر

۵۴۔ ''ہندی کی نئی ابجد'' از بابو نوبین چندر رائے

۵۵۔ ''ہندوستان میں یورپی اور یوریشین لوگوں کے بچوں کی تعلیم'' از بابو نوبین چندر رائے

۵۶۔ ''دیسی ریاستوں میں تعلیم'' از بابو پنچانن مکرجی

۵۷۔ ''لنڈن یونیورسٹی کے امتحانات کا تعارف'' از پروفیسر ٹی سی لیوئس

۵۸۔ ''تعلیمی تجاویز'' از بابو مہیش چندر دت

۵۹۔ ''شال بافی کی صنعت میں استعمال ہونے والے خاکوں، ہندسوں اور رنگوں کی علامات کا تجزیہ مع کلید ہذا وقالین بافی اور ریشمی دھاگے کا حساب'' از ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر

۶۰۔ فلورنس اورینٹل کانگریس کی کارگزاری

۶۱۔ ''سود جاتی'' پر مضمون اور خطوط از لالہ جیون داس، پنڈت رشی کیش، مسٹر ڈی سی ایٹیسن، مسٹر سی ای گلیڈ سٹون پریم ساگر، پنڈت بام دیو وغیرہ

۶۲۔ ''پنجاب کی نمائندہ کونسل'' از ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر

۶۳۔ ''پنجاب کی تعلیمی رپورٹ برائے ۸۱-۱۸۸۰ء'' از بابو نوبین چندر رائے

۶۴۔ ''ہندوؤں کی ذاتوں کی ذیلی تقسیم'' از پنڈت رشی کیش

۶۵۔ ''ہندوستان میں تعلیم: تحقیقات کے لیے خاکہ'' از ریورنڈ جے جے جونسٹن

۶۶۔ ''دیسی سول سروس'' از ڈاکٹر لائٹنر

۶۷۔ ''دیسی نوجوانوں کو انگلستان بھیجنے کے خطرات'' از ڈاکٹر ڈبلیو جی لائٹنر

۶۸۔ ''نمائندہ صوبائی کونسل کے متعلق انجمن پنجاب کے جاری کردہ سوالات''

۶۹۔ ''تعلیمی کمیشن اور انجمن پنجاب'' از ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر

۷۰۔ ''فن لطیف پر ایک مقالہ'' از ایچ بی ڈبلیو گیرک

۷۱۔ ''صنعتی نمائشوں سے حاصل شدہ عملی سبق'' از بی ایچ بیڈن، پاویل سی ایس

۷۲۔ ''سوری فرقہ'' از ایچ بی ڈبلیو گیرک

۷۳۔ ''ہشت نگر میں آثار قدیمہ کی تازہ ترین دریافت'' از ایچ بی ڈبلیو گیرک

۷۴۔ ''ذات پات اور فرقہ جاتی ناموں کی اصلیت اور ان کی چھان بین کی عملی قدر و قیمت'' از ایف آر جی ایس از لیفٹیننٹ آر سی ٹمپل

۷۵۔ ''دریائے سندھ اور نیر کس پر ایک مقالہ'' از کارسٹیفن

۷۶۔ ''حکومت ہند کے آخری میزانیے پر حواشی'' از رائے حکم چند

۷۷۔ ''ملکی یونیورسٹی کے مقاصد اور ضروریات'' از پروفیسر ٹی سی لیوئس ۱۱۲

مذکورہ بالا مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا دشوار نہیں کہ اخبار انجمن پنجاب کا مقصد نہایت وسیع تھا۔ جس میں اہل پنجاب کے اخلاق کی اصلاح؛ قدیم اور فرسودہ رسوم ترک کرنے پر عوامی رائے کو مشتہر کرنا؛ عوام کو مہذب اور شائستہ بنانا؛ جدید علمی ترقیات کی ترغیب دلانا؛ علمی نقطہ نظر کی اصلاح کو فروغ دینا؛ طب اور انجینئرنگ کے مضامین کو اردو میں ڈھالنا؛ توضیحی مقالے اور تبصرے کرنا؛ ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا؛ اردو زبان کو قوم کے اجتماعی فکر کا ترجمان بنانا؛ تعلیمی ترقی کے لیے صوبہ پنجاب میں یونیورسٹی کے قیام کی حکومتی کوششوں سے عوام کو آگاہ کرنا نیز جدید اردو شاعری کو فروغ دینا۔ اس حوالے سے مشاعروں کی روداد اور نظمیں، ضمیمہ ''گلدستہ'' کی صورت میں شائع کی جاتی تھیں۔ پرلطف بات یہ ہے کہ یہ سب مقاصد رواں، سادہ اور عام فہم اردو نثر کو وسیلے کے طور پر استعمال کر کے حاصل کیے گئے۔

''انجمن پنجاب'' لاہور سے انجمن سازی کی ایک نئی روایت ۱۱۳ کی داغ بیل پڑتی ہے جس سے لوگوں میں نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق خود کو ہم آہنگ کرنے کا شعور پیدا ہوا اور مسلمانوں نے اپنی صلاحیتوں اور مضمحل قویٰ کو مجتمع کر کے فلاحی اور علمی و مذہبی شعور کو بیدار کیا۔ ان انجمنوں کے قیام سے اردو نثر کو اس طور فائدہ پہنچا کہ اپنے خیالات اور نظریات کی ترویج و اشاعت کے لیے اپنے رسائل کا اجراء بھی کیا جس کے لکھنے والے عموماً احباب علم و ادب ہی ہوا کرتے تھے۔ ''انجمن پنجاب'' اور اس کی تقلید میں قائم ہونے والی انجمنوں ۱۱۴ کے مقاصد بہت وسیع تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سنوارا اور انہیں تمام شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ یتیموں، بیواؤں کی دیکھ بھال پر توجہ دی؛ عیسائی مشنریوں اور آریہ سماج ہندوؤں کے اسلام اور پیغمبر اسلام پر رکیک حملوں کا تحریری و تقریری جواب دیا؛ مسلمانوں کو علم حاصل کرنے کی ترغیب دی؛ سکول قائم کیے؛ طلباء کے لئے وظائف کا اجراء کیا؛ نومسلموں کو روزگار فراہم کیا؛ اردو زبان کے فروغ اور تحفظ کے لیے جدوجہد کی؛ مساجد کی دیکھ بھال کرنا اور غیر اسلامی روایات کے خاتمہ کا شعور بیدار کیا۔ غرض یہ علمی و ادبی انجمنیں اہل لاہور کی ذہنی ترقی میں بے حد ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

i) انجمن اسلامیہ لاہور:

یہ انجمن ۱۸۶۹ء میں وجود میں آئی جسے انجمن پنجاب کی معاونت حاصل تھی اور اس کے بانی خان بہادر

برکت علی خان تھے جو مسلمانوں کی تعلیمی، معاشرتی اور اخلاقی حالت سوارنے کے زبردست خواہاں تھے۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس انجمن کا قیام عمل میں آیا۔ انجمن کی سرگرمیاں اور کارروائیاں وقتاً فوقتاً ''اخبار انجمن پنجاب''۱۵؎ میں شائع ہوتی تھیں۔

ii) انجمن مفید عام قصور ضلع لاہور:

''انجمن پنجاب'' کے تتبع میں ۲ جولائی ۱۸۷۴ء کو منشی قادر بخش اور منشی غلام نبی کی سرپرستی میں انجمن وجود میں آئی۔ چونکہ الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے بعد قصور نظم ونسق کے حوالے سے لاہور میں شامل رہا ہے اس لیے ''انجمن پنجاب'' کی پیروی میں قائم ہونے والی اس انجمن کو ''انجمن پنجاب'' کی ذیلی شاخ ہی کہا جائے گا۔ ''انجمن مفید عام'' قصور نے اگست ۱۸۷۴ء میں اپنے ''رسالہ'' کا اجراء کیا جس میں انجمن پنجاب میں پڑھے جانے والے مضامین کے علاوہ لاہور کے نامور ادباء کی تحریریں ۱۶؎ اس کی زینت بنتی رہیں۔ اس اعتبار سے اس رسالے کی نوعیت علمی و ادبی تھی۔

iii) انجمن ہمدرد اسلامیہ لاہور ۱۷؎:

اس انجمن کا قیام ۱۸۸۰ء میں نواب صادق حسین خان آف بھوپال کی سرپرستی میں عمل میں آیا۔ بنیادی طور پر اس کا مقصد مسلمان قوم کی ترقی اور مسلمانوں کے خلاف مذہبی جارحیت کا دفاع کرنا تھا۔ اس انجمن نے اپنا ایک رسالہ ''اشاعت السنۃ'' کے نام سے جاری کیا۔ جس میں انجمن کی کارروائیوں کے علاوہ مذہبی نوعیت کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

iv) انجمن حمایت اُردو:

۱۸۸۱ء میں قائم ہونے والی یہ انجمن اردو زبان کے دفاع اور ہندوؤں کی جانب سے ہندی کو بطور سرکاری زبان نافذ کرنے کے خلاف ردعمل کے طور پر وجود میں آئی۔

v) انجمن حمایت اسلام لاہور:

۲۴ ستمبر ۱۸۸۴ء کو اندرون موچی دروازہ لاہور کی سربرآوردہ شخصیات خان بہادر محمد کاظم، حاجی میر شمس الدین، شمس العلماء شمس الدین شائق، خلیفہ حمید الدین، میاں کریم بخش، مولوی غلام اللہ قصوری، خلیفہ عماد الدین، شیخ پیر بخش، مرزا عبدالرحیم دہلوی، مولوی سید احمد دہلوی، مرزا ارشد گورگانی، مولوی احمد دین وکیل، شیخ ایزد بخش، مولوی عبداللہ، مولوی دوست محمد، میاں محمد چٹو، ڈاکٹر محمد دین ناظر، منشی محبوب عالم، بابا نجم الدین، بہادر الدین،

مولوی غلام محی الدین، شیخ عظیم اللہ اور میاں عبدالعزیز کی مشترکہ کاوشوں سے یہ علمی و ادبی و ثقافتی انجمن وجود میں آئی۔ جس کا بنیادی مقصد عیسائیوں کی اسلام مخالف تبلیغ کا سدباب کرنا اور اسلامی ادب کی اشاعت تھا۔ ''انجمن حمایت اسلام'' کے جلسے علمی و ادبی نثر کے فروغ کا باعث بنے۔ اس کو مزید تقویت انجمن کے ہفتہ وار مجلّہ ''حمایت اسلام'' سے ملی۔ اردو زبان و ادب کی تشہیر میں اس انجمن کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے محمد حنیف شاہد لکھتے ہیں:

> ''آزادی سے قبل پنجاب میں اردو کی ترویج و اشاعت کا سب سے بڑا مرکز لاہور اور لاہور کی انجمن حمایت اسلام کے تعلیمی و اشاعتی ادارے اور اس کے سالانہ جلسے تھے۔ یہ سالانہ جلسے اپنی دیگر خصوصیات کے علاوہ اردو کے فروغ اور اشاعت کے بڑے گہوارے تھے جہاں سے ملک بھر کے ممتاز ترین علماء و فضلاء اور مقررین اردو زبان میں اپنے خیالات افکار کا اظہار فرماتے تھے۔ اردو زبان و ادب کا یہ گراں بہا خزانہ سالانہ روداروں اور حمایت اسلام کے پرچوں میں محفوظ ہے۔'' ۱۱۸

انجمن کے مجلّہ ''حمایتِ اسلام'' نے بااحسن خوبی علمی ادبی اور مذہبی خدمت کا فریضہ انجام دیا اور اس حوالے سے اردو نثر کو فروغ ملا۔ نیز انجمن نے علمی اداروں کے قیام کے ساتھ بہت سی اردو کی درسی کتب بھی مرتب کیں۔ ''انجمن حمایت اسلام'' کی علمی و ادبی حیثیت کا اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل علمی و ادبی شخصیات سے ہوتا ہے جنہوں نے انجمن کے جلسوں کو رونق بخشی اور اپنے لیکچرز سے علم و ادب کی خدمت کا فریضہ ادا کیا۔ ان میں سرسید احمد خاں، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولوی نذیر احمد، علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، مولوی محمد عبداللہ ٹونکی، نواب سر ذوالفقار علی کان، شیخ عبدالقادر، مرزا عبدالغنی، مرزا ارشد گورگانی، مولانا ظفر علی خان، خوشی محمد ناظر، غلام بھیک نیرنگ، مولوی احمد دین، خواجہ دل محمد، مولوی اصغر علی روحی، نواب سراج الدین سائل دہلوی، نواب وقار الملک، نواب محسن الملک، خان بہادر برکت علی خان، آغا حشر کاشمیری، جسٹس شاہ دین ہمایوں، سید ناظر حسین ناظم لکھنوی، مولوی سید ممتاز علی، سید سلیمان ندوی، مولانا غلام قادر گرامی وغیرہ شامل ہیں۔ دینی ادب کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی انجمن حمایت اسلام منفرد مقام رکھتی ہے۔ مذکورہ انجمنوں کے علاوہ ''انجمن پنجاب'' کی معاونت اور تقلید میں قائم ہونے والی ان انجمنوں کا ذکر بھی ملتا ہے جن میں سے دو عیسائیوں کی اور دو ہندوؤں کی تھیں۔

Punjab Auxiliary Bible ۱۲۰ ، Punjab Book and Treat Society (1872) ۱۱۹ Society (1872)، ''ست سبھا'' ۱۲۱ ''دھرم ست سبھا'' ۱۸۷۳ء، ''سری گورو سنگھ سبھا ایسوسی ایشن'' ۱۲۲ لاہور، اردو بزم مشاعرہ لاہور (۱۸۸۵ء) ۱۲۳، حکیم شہباز احمد دین کی بیٹھک لاہور ۱۲۴ (۱۸۹۵ء)، انجمن اتحاد لاہور (۱۸۹۷ء) ۱۲۵، بزم قیصری لاہور (۱۹۹۸ء) ۱۲۶، انجمن نعمانیہ ۱۲۷ لاہور، انجمن خدام الدین ۱۲۸ لاہور، انجمن

مسلم نوجوانان ستارہ ہند، انجمن انصار ملت، انجمن مجاہدین اسلام، مسلم اکنامک ایسوسی ایشن۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں لاہور میں قائم مذکورہ انجمنوں نے نہ صرف عوام الناس میں ادب کا صحیح ذوق پیدا کیا اور علم و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں بلکہ اردو زبان اور اردو نثر کو فروغ دینے کے لیے قابل تحسین خدمات بھی انجام دیں۔ بحیثیت مجموعی دیکھیں تو قائم ہونے والی ان علمی و ادبی انجمنوں کے بالعموم دو بنیادی مقاصد تھے؛ اول یہ کہ لوگوں کو مشرقیات کی جانب از سر نو رغبت دلائی جائے اور قدیم علمی و ادبی شاہکاروں کی اشاعت عمل میں لائی جائے، دوم: یہ کہ اردو میں انگریزی کی علمی تصانیف کو منتقل کیا جائے، جس میں انہیں کامیابی ہوئی۔

ج) تاریخ نویسی:

لاہور میں تاریخ نویسی کی روایت ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔ مدت مدید تک یہاں فارسی زبان میں تاریخ نویسی کا کام انجام دیا جاتا رہا ہے۔ اردو زبان میں تاریخ و تذکرہ نویسی کا آغاز بھی پنجاب میں لاہور ہی سے ہوا اور انگریزی عہد میں اس پر بالخصوص توجہ دی گئی۔ انگریز افسران اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ بہتر حکمرانی کے لیے یہاں کے عوام کی تہذیب و تمدن اور ان کی معاشرت کی تاریخ جاننا اشد ضروری ہے چنانچہ انہوں نے پنجاب سے اپنے پہلے رابطے کے لمحے ہی سے لاہور کے عالم حضرات کی مہارت سے فائدہ اٹھانے کا آغاز و ارادہ کیا۔ اس ارادہ کو عملی جامہ پہنانے میں مولوی احمد بخش یکدل، مولوی نور احمد چشتی، مفتی غلام سرور لاہوری، مفتی تاج الدین، تلسی رام، رائے کالی رائے، پیارے لال آشوب، مولوی کریم الدین، محمد حسین آزاد، ڈپٹی محمد حیات خان، سید محمد لطیف، کنہیا لال ہندی وغیرہ نے بنیادی کردار ادا کیا۔ یوں تو ہر عہد میں ایک معقول تعداد میں ایسے عالم لاہور میں موجود رہے ہیں جنہوں نے تاریخ و تذکرہ نویسی اور روزنامچے تحریر کرنے کا فریضہ انجام دیا کیونکہ لاہور کو ہمیشہ سے ہی علمی کام کے لحاظ سے بادشاہان وقت کی سرپرستی حاصل تھی اس حوالے سے بہت سے تاریخی نثری آثار پردہ گمنامی میں اور اردو کی بجائے فارسی زبان میں ہیں۔ محض عہد رنجیت سنگھ میں ''عمدۃ التواریخ'' مصنفہ سوہن لال سوری، ''ظفر نامہ رنجیت سنگھ'' مصنفہ امرناتھ اکبری، ''رنجیت نامہ'' مصنفہ احمد یار مرالوی، ''فتح نامہ ملتان و پشاور یدھ'' مصنفہ گنیش داس پنگل، روزنامچہ مولوی احمد بخش یکدل، تحفۂ یکدل، روزنامچہ فقیر عزیز الدین، روزنامچہ فقیر غلام محی الدین کی فارسی تواریخ منظر عام پر آچکی ہیں جبکہ اردو کی کسی تاریخ کا سراغ رنجیت سنگھ کے عہد تک نہیں ملتا۔ تاریخ و تذکرہ نویسی کا آغاز بھی انگریزوں ہی کی مرہون منت الحاق پنجاب کے بعد ہوا۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنی نوآبادیاتی ریاست کو متفرق انتظامی اور سائنسی حوالوں سے معلومات بہم پہنچانے کے لیے یہاں کے مقامی عالموں کی خدمات حاصل کیں۔ انگریز معلومات کی تلاش میں تاریخ و تذکرہ نویسی کے جن طریقوں کو بروئے کار لائے وہ مغل دربار کی تحقیق کی روایت سے مماثل تھے جن میں مشاہداتی بیانات، روحانی علم الانساب، اخلاقی تعلقات، اور شجرہ ہائے انساب کو اہمیت حاصل تھی۔

تاریخ و تذکرہ نویسی کے لیے ۱۸۶۰ء کی دہائی میں انگریز افسران نے لاہور کی تعمیراتی یادگاروں اور نوادرات کو تحریری ریکارڈ میں لانے کے لیے یادگاری تاریخیں لکھوانے کا آغاز کیا۔ علاوہ ازیں سرکاری سرپرستی میں پنجاب کے بارے میں وسیع پیمانے پر معلومات فراہم کرنے کا کام انگریز سرکار کی خوشنودی اور حصول صلہ کی غرض سے بھی کیا گیا اور بے شمار تصانیف منظر عام پر آئیں۔ ''یادگاری تاریخیں'' تاریخ نویسی کی ایسی قسم تھی جس کے لیے تاریخ نویسوں کو معلومات کے حصول کے لیے نئی منزلیں طے کرنا پڑیں۔ تاریخ کو احاطۂ تحریر میں لانے اور

دوسروں تک پہنچانے کے لیے نئے وسائل کی تلاش کے ساتھ ماضی کو سمجھنے کے قابل بنانے کے لیے نئے نئے حروف تراشنے پڑے۔ تاریخ نویسی میں تذکرہ نگاری کی خصوصیات ہمیشہ سے شامل رہی ہیں۔ نتیجتاً تاریخ و تذکرہ نویسی کے ضمن میں اردو نثر کے عمدہ اور مرتب نمونے وجود میں آئے۔ شہری تاریخ کی روایت چونکہ انیسویں صدی کے پنجاب میں ابھی نئی تھی اس لیے پہلے پہل اسے مانوس ترتیب و نمونے کے مطابق ہی لکھا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ تاریخ و تذکرہ نویسی کی روایت نو آبادیاتی علمی روایات سے ہم آہنگ ہوتی چلی گئی۔ نیز اس کی مدد سے نو آبادیاتی حکومت کے مقرر کردہ نظریاتی مقاصد کے حصول کی کوششیں بھی شروع ہوئیں جس میں انہیں بہت حد تک کامیابی ہوئی۔ چنانچہ انگریزوں نے تاریخ و تذکرہ نویسی کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا۔ کیونکہ ''ان میں دقیق نقطہ یہ تھا کہ نصیحت آموز پیغامات پیش کرنے کے لیے شہر بہت مفید آلہ کار تھے۔ دیہی علاقے سے بڑھ کر شہری علاقے اس قابل تھے کہ وہ پرانی حکومت کے جابرانہ ہتھکنڈے اور نئی حکومت کے مدبرانہ طرز حکومت کے درمیان فرق کو واضح طور پر پیش کر سکیں۔''[۱۲۹] اس کے لیے پنجاب سے متعلق بہت سی انگریزی کتب کے تراجم بھی کیے گئے ان میں ''تاریخ گوشۂ پنجاب'' (۱۸۶۱ء) مترجم پنڈت رائے کشن کے علاوہ سرلیپل گرفن ہنری (Sir Lepel Griffin Henry) کی کتاب ''تذکرہ روسائے پنجاب'' کا نوازش علی نے ۱۸۶۵ء میں اردو ترجمہ کیا۔ ٹی ایچ تھارٹن (T.H.Thorrton) نے بھی (۱۸۶۲ء) "Old Lahore" کے عنوان سے کتاب لکھی جس کا تذکرہ سید محمد لطیف نے اپنی تاریخی کتب میں کیا ہے۔ اس طرح تاریخ و تذکرہ نویسی کا ایک باقاعدہ تسلسل دیکھا جا سکتا ہے جس کی اولین کڑی مولوی نور احمد چشتی کی تصنیف ''یادگار چشتی'' (۱۸۵۸ء) ہے۔

یادگار چشتی:

تاریخ نویسی کے موضوع پر تحریر کردہ مولوی نور احمد چشتی[۱۳۰] کی اہم نثری تصنیف ہے جو ۱۸۵۸ء میں مطبع لاہور کرانیکل سے شائع ہوئی۔[۱۳۱] اس میں پنجاب کے عوام بالخصوص لاہور کی تہذیب و تمدن معاشرت، رسم و رواج کا احاطہ اس وقت کے بہترین اسلوب میں کیا گیا ہے۔ یادگار چشتی ایک ایسا تاریخی آئینہ ہے جس میں انیسویں صدی میں پنجاب کے طبقاتی اور معاشرتی گروہوں کی تہذیب، معاشرت اور ثقافت کی تصاویر دیکھی جا سکتی ہیں۔ افضل حق قرشی کی وساطت دسمبر ۱۸۵۹ء کے ''کلکتہ ریویو'' میں سی یو آچیسن کے تبصرہ سے پتہ چلتا ہے کہ اصل منصوبہ تین جلدوں پر مشتمل تھا۔ جلد اول مسلمانوں، جلد دوم ہندوؤں جبکہ جلد سوم سکھوں کی تہذیب و تمدن کے بارے میں تھی۔ بقول سی یو آچیسن:

"On the whole however we consider the Yadgar-i-Chishtie to be a most valuable contibution to our knowledge of

native manners, customs and modes of thought and we sincerely hope that Maulvie Noor Ahmad Chishti may meat with sufficient encouragement in this literary labour to induce him to complete the original plan of his work by adding Book II on the manners and customs of the Hindoos in the Punjab and Book III ont he manners and cusotms of the Sikhs"۔۱۳۲

چنانچہ یادگار چشتی ایک فرمائشی کتاب ہے جو جارج اوبارنس، ایڈورڈ ہولوٹ اور سی ڈبلیو فورمین کے کہنے پر لکھی گئی جس میں انگریزوں کی خوشنودی کا عنصر بھی موجود ہے۔ اس کتاب کے ذریعے لاہور کی اردو نثر کا ایک بہترین اسلوب ہماری دسترس میں آتا ہے جو غالب کا معاصر اسلوب بھی ہے۔ یو-پی میں غالب نے اردو نثر کو خطوط میں اپنایا تو نور احمد چشتی نے لاہور میں اسے علمی سطح پر برتا اور اظہار و ابلاغ کی خصوصیات پر مبنی رواں سلیس اور عام فہم انداز نگارش وجود میں آیا۔ ''تحقیقات چشتی'' کی نسبت یادگار چشتی کی عبارت اور اسلوب زیادہ رواں ہے۔ نمونہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''کناری باف بھی ایک قوم ہے۔ یہ اول میں ڈھالی لوگوں کا کام ہے بعد ازاں ہر قوم میں سے ان میں کسب شریک ہو گئے۔ یہ لوگ گوٹہ کناری بنتے ہیں جو کوئی غیر قوم ان میں ملنا چاہتا ہے تو وہ ان کی شاگردی کرتا ہے اور یہ بعہد مہاراجا رنجیت سنگھ بہادر سرگباشی جب کوئی شریک یعنی شاگرد بننا چاہتا تھا تو کسی کناری باف کے پاس جاتا تھا اور مبلغ پچیس روپیہ سیل کا دے کر شاگرد ہوتا تھا اور سیل کے معنی یہ ہیں کہ اس میں نصف تو مال سرکار کا ہوتا تھا اور نصف مال برادری کا اور یہ دونوں حصے جمع ہوتے رہتے تھے۔ برس کے بعد سب استادوں نے حساب کیا۔ سرکار کا حصہ تو سرکار نے داخل کیا اور برادری کا حصہ برادری میں کھانا پکا کر تقسیم ہوا بلکہ باغ میں جمع ہوئے اور وہاں کھانا بھی پکایا اور ناچ راگ رنگ بھی کرایا اور جب کوئی شاگرد کام سیکھ چکا اور الگ دکان خود بنانے لگا تو پھر استاد کو کوئی دس کوئی بیس روپے دیتا تھا اور ہمراہ اس کے پوشاک۔ یہ روپیہ بھی نصفا نصفی مال سرکار تھا۔'' ۱۳۳

مختصر تاریخ انگلستان:

ناظم تعلیمات کپتان فلر کے حکم سے ۱۸۷۰ء میں مطبع سرکاری لاہور سے طبع ہوئی۔

رسالہ شمسیہ:

رسالہ شمسیہ شاہان سلف کی سیاسی اور تمدنی تاریخ کی ایک اہم نثری دستاویز ہے جسے ۱۸۶۱ء میں مولوی احمد بخش یکدلؔ نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں تحریر کیا۔مولوی احمد بخش یکدل نور احمد چشتی کے والد اور لاہور کے خاندان چشتی کے اہم شاعر اور نثر نگار تھے۔عربی، فارسی، پنجابی اور اردو زبان پر دسترس کی بناء پر انہیں استاد کا درجہ حاصل تھا۔مولوی احمد بخش یکدل کی بیشتر تصانیف فارسی زبان میں ہیں کیونکہ اس وقت تک علمی و ادبی تصانیف کے لیے بدستور فارسی زبان کے استعمال کا چلن موجود تھا۔اردو زبان کے قبول عام ہونے کے باوجود ترجیحاً فارسی زبان میں ہی لکھنے کا رواج تھا۔انیسویں صدی کے دستیاب اردو کے نثری ادب میں احمد بخش یکدل کا ''رسالہ شمسیہ'' ایک اہم نثری دستاویز ہے۔نیز یہ رسالہ یکدل کی واحد اردو نثری تصنیف بھی ہے کیونکہ بقیہ تمام تصانیف فارسی زبان میں ہیں البتہ چند جملے اردو زبان میں ملتے ہیں جن کا ذکر مقالہ نگار نے ڈاکٹر ممتاز گوہر کے توسط سے کیا ہے۔۱۳۴

مولوی احمد بخش یکدل کی اردو نثری تحریر اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کی انیسویں صدی کے نصف دوم میں جب اردو کے ساتھ فارسی بدستور موجود تھی اسی عہد میں فارسی زبان کے مستند اساتذہ نے اردو نثر کو بھی زبان و بیان کے حوالے سے جلا بخشی۔جو اس بات کی غماز ہے کہ اردو زبان فارسی کے مقابل اہمیت اختیار کر چکی تھی دوسری جانب اردو نثر کی خوش بختی کہ فارسی انشا پرداز مولوی احمد بخش یکدل کی دامن نگاہ کو اپنی جانب مبذول کیا اور ''رسالہ شمسیہ'' وجود میں آیا۔اردو میں اظہار و بیان اور اس کے فصیح و بلیغ ہونے کی صلاحیت کی وجہ سے یکدل نے فارسی کے ساتھ ساتھ اسے اردو میں بھی لکھا۔یہ امر بھی اردو زبان کی مقبولیت کی ایک دلیل ہے کہ فارسی زبان میں درک اور مہارت رکھنے والوں نے بھی اظہار و بیان کے سانچے کے لیے اردو نثر کو استعمال کیا۔یکدل جیسے عالم و فاضل کو وقت نے مہلت نہ دی۱۳۵ ورنہ وہ اردو نثر میں مزید تخلیقی کام سرانجام دیتے۔فقیر شمس الدین کی ایماء اور ان کے نام کی رعایت سے لکھا جانے والا ''رسالہ شمسیہ'' انیسویں صدی کے نصف دوم کا ایک اہم نثری نمونہ ہے جس میں تاریخ نویسی کو موضوع بنایا گیا ہے جیسا کہ اس کے دیباچہ سے ظاہر ہے:

> ''یہ کتاب اس واسطے قید تدوین میں آئی ہے کہ جو مکان زیارت گاہ سلطنت لاہور میں ہیں ان کا حال ابتدا سے انتہا تک لکھوں ـــ اور یہی خیال ہوا کہ شاہان سلف کا حال اور ان کے تولد اور جلوس اور وفات اور مدفن کی کیفیت لکھی جاوے اور یہ بھی ہو کہ جو خاندان وو بسر ونکا ہے اور خوانین بلند مکان کا مذکور اور عمارات قدیم مساجد اور معابد کا حال مشروحاً کتاب میں آوے تو اس میں تین باب ٹھہرے۔چوتھا باب عجائبات اقوال اور افعال نیکوں کا اور قابلوں کا کہ موجب تفنن

طبع ہو ترتیب پایا۔''۳۲؎

تاریخ و تذکرہ نویسی کے علمی موضوع پر لکھتے ہوئے بے بہا معلومات کی ترسیل کے لیے مولوی احمد بخش یکدل نے سادہ اور رواں اسلوب اختیار کیا ہے۔ ہر چند کہ انکے اسلوب بیان میں عربی اور فارسی الفاظ کی مرصع کاری سے کام لیا گیا ہے لیکن ان کا استعمال اس قدر بے تکلفی سے ہوا ہے کہ کہیں بھی روانی میں خلل نہیں پڑتا۔ اسلوب میں ڈرامائی انداز سے پورا منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔لہٰذا جدید اردو نثر میں موضوع اور اسلوب کے حوالے سے انیسویں صدی کے اہم نثری آ ثار کا نمونہ ہے جسے اردو نثر کے ارتقا میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

''نادر شاہ نے خبر پا کر قدم باہر خیمے سے رکھا اور رضاقلی مرزا فرزند کلاں کو واسطے استقبال کے بھیجا۔شاہ نے خیمہ تیار کر کے بہ حسن و زیب چند قدم آگے بڑھ کر اسلام علیکم کہا اور خیر مقدم اور نعم الحبی کہا اور ہاتھ میں ہاتھ لے کر داخل خیمہ ہوئے اور ایک مسند پر دونوں کا اجلاس ہوا۔شاہ نے بہت تعظیم اور تکریم اور مہمانداری کی۔سبحان اللہ! عجب مہمان و عجب میزبان جب محمد شاہ تشریف لائے تو اس وقت جواہر کوہ نور اور دریائے نور دونوں طرف تاج کے سفتہ کر کر باندھ آئے تھے۔ نادر شاہ نے اس کی چمک کی تاب نہ لا کر کہا کہ یہ تاج جو میرے سر پر ہے آپ سر پر رکھ لیں اور یہ تاج جو آپ کے سر پر ہے میرے سر پر رکھ دیں کہ تم ہمارے دینی بھائی ہو اور دستار بدلی اس کا نام رکھا جائے۔ کہتے ہیں محمد شاہ نے سب جواہرات اور خزانے سے ہاتھ دھوئے۔نادر شاہ نے یہ حیلہ ایسا حیلہ کیا کہ محمد شاہ کو کچھ نہ ملے میرے پاس رہے۔ پہلے ہی ایسا داؤ دیا کہ کسی ذی فہم کے ذہن میں نہ آیا تھا۔الغرض دونوں بادشاہ بسواری پالکی داخل قلعہ مبارک شاہجہاں آباد ہو گئے اور قلعہ مبارک میں اور شہر میں آئین بندی ہوئی وہ آتش بازی چلی کہ سو برس کی شب براتوں کا سامان یک جا جمع ہوا اور ساری رات محفل رقص و نشاط اور سرور رہی۔''۳۷؎

اردو نثر کا یہ اسلوب اگر چہ آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل کا ہے لیکن اپنے موضوع اور اسلوب، اپنی فصاحت اور روانی کے حوالے سے آج کی اردو نثر کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔اس سے احساس ہوتا ہے کہ اردو نثر میں علمی و ادبی موضوعات کے بیان کی صلاحیت ڈیڑھ صدی قبل ہی پیدا ہو گئی تھی جو اس کے سرعت سے ارتقا کی بھی دلیل ہے۔

تاریخ گوشہ پنجاب مملکت مالوہ و سرہند:

اس تاریخ کے مؤلف و مرتب پنڈت رائے کشن۳۸؎ تھے۔ یہ کتاب ۱۸۶۱ء میں مطبع پنجابی لاہور سے شائع ہوئی۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کہ ۹۸ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مملکت مالوہ یعنی پٹیالہ و نابھہ اور اس کے گرد و نواح کی ریاستوں کی مختصر تاریخ اور بابا نانک کے عہد سے اس وقت تک کے احوال درج ہیں۔

تواریخ ہند:

تاریخ کے موضوع پر اس کتاب کو حسب الحکم کپتان فلر کے منشی سدا سکھ لال نے ہنری سٹیورٹ ریڈ کی معاونت سے تالیف و ترجمہ کیا جو مطبع پنجابی لاہور سے ۱۸۶۱ء میں طبع ہوئی۔

تاریخ ہندوستان ملقب بہ واقعات ہند:

مولوی کریم الدین نے بطور ڈپٹی انسپکٹر حلقہ لاہور میجر فلر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن کی فرمائش پر ۱۹۶ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ہندوستان کی تاریخ بیان کی ہے جو ۱۸۶۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کی تالیف میں زیادہ تر مواد انگریزی اور ہندوستانی دستاویزات سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت ہی تھی کہ ۱۸۶۶ء[۱۳۹] یہ دوسری بار بھی لاہور سے شائع ہوئی۔ ''واقعات ہند'' ۱۸۶۶ء کے سر ورق پر یہ عبارت تحریر ہے۔

> ''تاریخ ہند جس کو مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر حلقہ لاہور نے کئی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کیا تھا اور ماسٹر رامچند ر سابق مدرس ریاضی ضلع مدرسہ دہلی اور مولوی ضیاء الدین اسسٹنٹ پروفیسر عربی کالج دہلی نے اس کے مقابلہ تواریخ فارسیہ وغیرہ سے کیا۔ مطبع سرکاری لاہور میں باہتمام بابو چندر ناتھ کیوریٹر کے چھپی۔''[۱۴۰]

غالباً یہ تاریخ تواتر سے چھپتی رہی کیونکہ بلوم ہارٹ کی فہرست کتب اردو سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ایک اور اشاعت ۱۸۷۰ء میں گورنمنٹ پریس لاہور سے ہوئی۔ واقعات ہند میں قدیم عہد سے لیکر انگریزی عہد تک کے حالات و واقعات کا مختصر طور پر اس طرح احاطہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی مکمل تاریخ کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ زبان و بیان سلیس اور رواں ہے جس میں کہانی کی طرز کا انداز اپنایا گیا ہے۔ نمونہ عبارت کے طور پر نصیر الدین التمش کی دیانتداری کا واقعہ ملاحظہ ہو:

> ''باوجود بادشاہ ہونے کے کتابت پر گذران کرتا تھا اس بادشاہ کے صرف ایک بیوی تھی۔ تمام مورات خانہ داری کے وہ بیوی انصرام کیا کرتی ایک روز اسی نے عرض کی کہ اے شاہ والا جاہ میں کھانا پکانے سے تنگ آ گئی ہوں اور میری انگلیوں میں پھپھولے پڑ گئے ہیں اگر ایک کنیزہ واسطے کھانا پکانے کے عنایت ہو تو عین کرم ہے۔ بادشاہ یہ بات سن کر بہت رنجیدہ ہوا اور بولا کہ یہ ملک خدائے تعالیٰ کی ودیعت ہے عیش وعشرت کے واسطے نہیں ہے۔ اگر اس میں تصرف بے جا کروں تو قیامت کے دن خدا کو کیا جواب دوں گا تم کو چاہیے کہ بدستور اپنے کاروبار میں مصروف رہو۔''[۱۴۱]

تحقیقات چشتی:

۱۸۶۴ء میں مولوی نور احمد چشتی نے ''تحقیقات چشتی'' کے عنوان سے تخت لاہور کی تاریخ انسائیکلوپیڈیا کی طرز پر تحریر کرنا شروع کی۔ جس میں لاہور کی دینی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلی بار یہ کتاب ۱۸۶۷ء میں مطبع کوہ نور سے طبع ہوئی۔ اس تاریخ کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ یہ شہر لاہور پر لکھی جانے والی سب سے پہلی جامع شہری تاریخ کی اہم دستاویز ہے۔ ''تحقیقات چشتی'' مولوی نور احمد چشتی نے اپنے شاگرد اور اسسٹنٹ کمشنر پنجاب مسٹر ولیم کولڈ سٹریم کی تحریک و تجویز اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تحریر کی۔ جس کا اظہار مولوی نور احمد چشتی اس طرح کرتے ہیں:

> ''اب ان ایام فرصت انجام میں جناب خداوند نعمت، آقائے نامدار عالی وقار قدر دان اہل علم و ہنر، مجموعہ اخلاق برگزیدۂ آفاق، صاحب فیض عمیم جناب مسٹر کولڈ سٹریم عالی جاہ بہادر دام اقبالہ، اسسٹنٹ کمشنر نے اس کمترین کو حکم دیا کہ حالات عمارات و مزارات و مقابر و مساجد نواح لاہور مفصل تحریر کروں۔
>
> اگر چہ یہ کام نہایت دشوار تھا کیونکہ صد ہا سال کے حالات بہم پہنچانے خیلے مشکل تھے اور کمترین کا یہ حوصلہ نہ تھا کہ اس امراہم کو شروع کرے مگر صاحب ممدوح کے عنایات بے غایات نے مجھ کو یہ صلاح نہ دی کہ انکار کروں علاوہ برآں ارادہ صاحب ممدوح الوصف کا بھی محض واسطے رفاہ خاص و عام کے تھا کہ اس کماہی سے ہر ایک متنفس کو آگاہی ہو جاوے اس واسطے فدوی نے باہزار خوشی اس کام کے انجام کے واسطے کمر ہمت باندھی۔'' [۱۴۲]

مقفیٰ و مسجع نثر میں لکھی ہوئی یہ تصنیف اپنی ضخامت کے اعتبار سے ۹۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو مولوی نور احمد چشتی کے روحانی اور جسمانی آباؤ اجداد کے تذکرے سے شروع ہوتی ہے۔ پھر اس کا ابتدائی نصف حصہ تاریخی مسودات سے اخذ کیا گیا ہے جو ان سلاطین کے تاریخ وار ذکر پر مبنی ہے جنھوں نے ۱۰۰۰ء صدی عیسوی سے لے کر برٹش انڈیا کمپنی کے سکھ حکمرانوں سے اقتدار چھیننے تک شہر لاہور پر حکومت کی جبکہ دوسرا حصہ میں شہر اور اس کے اردگرد واقع یادگاروں کا تذکرہ ہے جو مولوی نور احمد چشتی کے اپنے ذاتی مشاہدات، زبانی اور تحریری روایتوں اور شہادتوں کے تجزیہ پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مطابق اس کتاب کی تدوین اور مسودے کی تیاری میں غلام سرور لاہوری نے معاونت کی۔[۱۴۳] ''تحقیقات چشتی'' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں سیاسی کوائف کو ضمناً درج کیا گیا ہے جبکہ کتاب کا موضوع دراصل تاریخی، مذہبی آثار اور پنجاب کی معاشرت سے متعلق ہے جس کی نشاندہی کتاب کے دیباچے میں کر دی گئی ہے۔

> ''اور واضح رائے مہر انجلائے شائقین با تمکین ہو کہ ظاہراً تو یہ کتاب اگر چہ مشعر احوال مقابر بزرگان

> اہل اسلام وغیرہ عمارات وتشریح معابد و مراسم قدیمہ ہنودان لاہور ہے لیکن فی الاصل تواریخ اولیاء اللہ تمام روئے زمین ہے اور حتی الامکان اس میں ہر ایک خانوادہ کا احوال کما حقہ عند التحقیقات کتابی و سماعی جو زبانی اشخاص خاص کے دریافت ہوا درج کیا گیا ہے۔''[۱۴۴]

نور احمد چشتی نے اگر چہ ''تحقیقات چشتی'' میں ایک ڈھیلے ڈھالے سے تاریخ وار خاکے سے کام لیا ہے لیکن ہر حصہ میں یادگار عمارات کے تذکرے میں تاریخ وار ترتیب کو اہم نہیں گردانا۔ کتاب میں جابجا موجود یہ الفاظ ''یہ کہا جاتا ہے کہ'' اور ''میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے'' ظاہر کرتے ہیں کہ بالواسطہ سنی سنائی باتوں پر بغیر تحقیق کے بھی بھروسا کیا گیا ہے مزید یہ کہ مواد کو افراتفری میں ترتیب دینے کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے۔

چنانچہ ''تحقیقات چشتی'' میں لاہور شہر کی عمارات کی ترتیب کا خاکہ سائنٹیفک انداز کی بجائے مذہبی نوعیت کا ہے یہی وجہ ہے کہ سائنسی انداز کی بجائے سماجی تعلقات کا حوالہ استعمال کیا گیا ہے۔ بیشتر ابواب میں غیر مسلم فقیروں کی تباہ شدہ قبروں، باغات، مندروں اور عمارتوں کے علاوہ صوفیاء کرام اور دوسری قدیم قبور کا تذکرہ کیا گیا ہے جہاں تاریخی عمارات کا احوال بیان کیا ہے وہاں ان کے معماروں؛ تعمیر کی وجوہات؛ ان پر قابض خاندان اور وہاں مدفون اشخاص کی تفصیلات پر زیادہ زور بیان صرف کیا گیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایک انگریز نے ابتدائی نظر ثانی کرتے ہوئے اس پر ان الفاظ میں تنقیدی رائے دی:

> ''چشتی کا انسائیکلوپیڈیا'' کا مقصد بہت شاندار ہے اور اگر اس کی اشاعت ثانی کا بندوبست کر لیا جائے تو اسے ایک واقعتاً مفید تصنیف بنایا جا سکتا ہے کتاب غیر ضروری طور پر ضخیم ہے جس میں تنگ چھپائی کے ۱۰۷۲ صفحات ہیں اور بہت غیر اہم مقامات جیسے ان لوگوں کے مقبرہ جات جنہیں دنیا عرصہ پہلے بُھلا چکی ہے اور نا قابل ذکر تکیوں (فقیروں کے استھان) کی تفصیلات شامل کی گئیں ہیں لگتا ہے کہ اسے بھی جلدی میں لکھا گیا ہے اس میں نہ صرف بہت سی گرائمر کی اور دوسری اغلاط ہیں بلکہ چند بیانات کی صحت کمزور ہونے کی بناء پر کوئی سوچ سکتا ہے کہ اسے براہ راست حاصل کی گئی معلومات کی بنیاد پر نہیں لکھا گیا۔ کہیں کسی بھی بیان کی کوئی سند نہیں دی گئی۔''[۱۴۵]

مذکورہ بیان ایک حد تک درست بھی ہے کیونکہ مولوی نور احمد چشتی ''سفرنامہ امین چند'' پر تحقیقی شواہد سے مستفید نہ ہونے کا جو اعتراض [۱۴۶] کرتے نظر آتے ہیں وہ خود ان کی کتاب پر بھی صادر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولوی نور احمد چشتی نے پہلے سے موجود مسودات میں تاریخی حقائق سے استفادہ کرتے ہوئے تحقیقی استخراج سے کما حقہ کام نہیں لیا۔ اس لیے ان کے یہاں بھی تحقیقی تجزیہ کی کمی دکھائی دیتی ہے مثلاً تذکرہ دراحوال حضرت بی بی پاک دامناں''[۱۴۷] میں جو بیان کیا ہے کہ یہ چھ بیبیاں جن میں ایک حضرت علی المرتضیٰؓ کی صاحبزادی اور ہمشیرہ

حضرت عباس موسوم بہ رقیہ المشہور حاج بی بی اور پانچ صاحبزادیاں حضرت عقیل برادر حضرت علی المرتضیٰ بنام بی بی تاج، حضرت بی بی حور، حضرت بی بی نور، حضرت بی بی گوہر، حضرت بی بی شہباز شامل ہیں اور یہ کہ انہوں نے حضرت امام حسینؓ کے حکم پر ہند کی جانب مراجعت کی۔ ان بیبیوں کی لاہور میں تشریف آوری کے حوالے سے مزید جو روایت بیان کی ہے وہ بعید از قیاس ہے لہٰذا اس ضمن میں خاص تحقیق و تدقیق سے کام نہیں لیا گیا اور روایت کو من وعن قبول کر کے احاطہ تحریر میں لے آئے جبکہ یہ واقعہ زیادہ قرین قیاس ہے جسے محمد لطیف ملک نے اپنی کتاب ''اولیائے لاہور'' میں ''تذکرۂ حمیدیہ'' کے توسط سے جس کی تصدیق و تائید انہوں نے مفتی غلام سرور لاہوری، محمد دین فوق اور کنہیا لال سے بھی کی ہے کہ دراصل یہ پانچ بیبیاں سید احمد توختہ ترمذی جو لاہور کے بزرگوں میں قطب یگانہ وغوث زمانہ تھے ان کی صاحبزادیاں تھیں جو والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عابد وزاہد اور صاحب عبادت و ریاضت میں مقام رکھتی تھیں۔ جب چنگیز خان مغل سے شہزادہ جلال الدین خوارزمی نے شکست کھائی اور ہند کی جانب بھاگ آیا تو چنگیز خان کی فوج اس کے تعاقب میں پنجاب میں داخل ہوئی اور تمام ملک پنجاب غارت کر دیا۔ اہل لاہور دو ماہ تک ان سے لڑتے رہے۔ جب شہر فتح ہوا تو افسر فوج نے حکم دیا کہ شہر کے لوگ سب کے سب قتل ہوں کوئی ذی حیوان بھی جانبر نہ ہو۔ چنانچہ ہزاروں انسان اور حیوان قتل ہوئے۔ اس وقت یہ پانچ بیبیاں شہر کے باہر اپنے والد کے مکان اور صومعہ میں موجود تھیں جب مخالفین نے انہیں قتل کرنا چاہا تو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی کہ یا الٰہی! ہمیں پیوند زمین کر لے اور نامحرم مردوں کی صورتیں نہ دکھا۔ چنانچہ دعا قبول ہوئی اور زمین نے انہیں اپنے دامن میں سمو لیا۔ جب مخالفین دیوار توڑ کر مکان میں گھسے تو کوئی ذی روح موجود نہ پایا۔ البتہ زنانہ کپڑوں کے کنارے زمین کے باہر نظر آئے کچھ لوگ یہ کرامت دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اس مزار کی مجاوری اختیار کی۔ محمد لطیف ملک کے مطابق یہ واقعہ قتل و غارت لاہور ۶۱۳ھ میں وقوع پذیر ہوا۔ غلام دستگیر نامی نے بھی اپنی کتاب ''تاریخ جلیلہ'' میں نور احمد چشتی کی بیان کردہ روایت کو مدلل انداز میں رد کرتے ہوئے جو نکات اٹھائے ہیں وہ اس واقعہ کے بعید از قیاس ہونے پر مہر ثبت کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ''تحقیقات چشتی'' میں ''واجب العرض ضروری'' کے عنوان [۱۴۸] سے مولوی نور احمد چشتی کا یہ دعویٰ بھی درست نہیں رہتا کہ غلام سرور لاہوری کا فارسی تذکرہ ''خزینۃ اولیاء'' دراصل تحقیقات چشتی کے مسودوں پر مشتمل ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ''بی بی پاک دامناں'' کے واقعہ کو درست صورت میں تحریر کیا جاتا جس کو مفتی غلام سرور لاہوری نے اپنے تذکرہ میں بیان کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے بھی ثابت کیا ہے کہ نور احمد چشتی کا دعویٰ محل نظر ہے [۱۴۹] مزید یہ کہ ''تحقیقات چشتی'' میں کئی جگہ مفتی غلام سرور لاہوری سے استفادہ کا اعتراف بھی کیا ہے۔

مقالہ نگار کا استدلال ہے کہ مفتی غلام سرور لاہوری نے مولوی نور احمد چشتی کی معاونت نہیں کی ہو گی

کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس میں بزرگان دین کے حوالے سے جو تحقیقی اغلاط دکھائی دیتی ہیں وہ نہ ہوتیں۔ غلام سرور لاہوری جو خود بھی "خزینۃ الاصفیاء" (فارسی) کے عنوان سے حالات اولیاء اللہ تصنیف کر رہے تھے چنانچہ اس میں حضرت بی بی پاک دامناں کے حوالے سے جو روایت بیان کرتے ہیں وہ نور احمد چشتی کی بیان کردہ روایت سے مختلف ہے اور قرین قیاس بھی ہے۔ دوسری بات یہ کہ مولوی نور احمد چشتی نے غلام سرور لاہوری کے پاس جو معلومات تھیں ان سے کما حقہ استفادہ بھی نہیں کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اپنے کیے گئے دعویٰ میں محض اپنی خودستائی کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ نیز نور احمد چشتی نے اپنی اس تاریخ کے لیے "سفرنامہ امین چند" سے بھی استفادہ کیا ہے جس کے حوالے کتاب میں درج کیے گئے مواد میں تو موجود ہیں لیکن کتابیات کے ضمن میں جن کتابوں سے مستفید ہونے کے اعتراف کیا ہے ان میں سفرنامہ امین چند کا ذکر نہیں کیا گیا۔

"تحقیقات چشتی" کے مطالعہ سے احساس ہوتا ہے کہ "یادگار چشتی" (۱۸۵۸ء) لکھتے ہوئے جو اصل منصوبہ تین جلدوں پر مشتمل تھا لیکن تشنۂ تکمیل رہ گیا۔ اسی تشنگی کی تکمیل کی ایک واضح صورت اس کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ "تحقیقات چشتی" لاہور میں اردو نثر کے دستیاب ابتدائی نثری ادب میں ایک قابل قدر کاوش ہے۔ نور احمد چشتی کا ذخیرہ الفاظ بنیادی طور پر فارسی یا عربی سے مشتق ہے اس لیے عربی اور فارسی اسلوب کا اثر نمایاں نظر آتا ہے پھر نور احمد چشتی انگریزی زبان کی بھی شدبد رکھتے تھے اس لیے مغربی اسلوب بیان کی ایک ہلکی سی جھلک بھی اس میں دکھائی دے جاتی ہے۔ تحقیقات چشتی کی اردو نثر عام فہم زبان میں ہے جس میں روانی، سلاست، متانت اور علمیت کے اظہار و ابلاغ کے ساتھ مرقع کشی بھی کی گئی ہے۔ جہاں حکمران شاہی خاندانوں کا ذکر کیا ہے وہاں اسلوب بیان داستانوی طرز اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ نور احمد چشتی کا اسلوب بیان نو آبادیاتی دور کے حالات سے متاثر نظر آتا ہے اس لیے اس عہد کی تحریر میں ایک نئے پن کی ابتدائی مثال بھی بن جاتا ہے۔ اسلوب کی انہی خوبیوں کے لیے "تحقیقات چشتی" سے ذیل میں داستانوی انداز کا نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

> "ایک شخص مسمی خواجہ غیاث کسی عالی خاندان کا بگڑا ہوا قوم تاتار سے محتاج نان شبینہ مع اپنی بیوی کے ہندوستان کی طرف آیا۔ ان ایام میں ان کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ چونکہ خواجہ غیاث اس کا باپ اور ماں حالت افلاس میں مبتلا تھے یہ سوچ کر کہ اس لڑکی کی پرورش کون کرے گا اور کہاں کہاں اس کو لئے پھریں گے لڑکی کو اسی جنگل میں چھوڑ کر آگے چلے آئے مگر پیٹ کی آنچ بری ہوتی ہے ماں اس کی دو قدم آگے چل کر پھر پیچھے دیکھتی رہتی تھی آخر کو آگے نہ چل سکی اور کھڑی ہو کر زار زار رونے لگی۔ یہ حالت اپنی بیوی کی دیکھ کر خواجہ غیاث کا دل بھی امنڈ آیا۔ اس باعث سے لاچار لڑکی لینے کے واسطے پیچھے مڑا جب اس کے پاس پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک

کالا سانپ اس لڑکی کو لپٹا ہوا ہے اس نے دیکھ کر واویلا کیا جس کے باعث سانپ الگ ہو کر درخت پر چلا گیا۔غیاث نے شکریہ ادا کیا اور لڑکی کو اٹھا کر اپنی بیوی کے پاس لے آیا۔"۱۵۰

تاریخی واقعات کے بیان کرنے کی اسی طرز کی تقلید مولانا محمد حسین آزاد اور ماسٹر پیارے لال آشوب کی "قصص ہند" میں کی گئی ہے۔مولوی نور احمد چشتی کو لفظوں سے جگہ کا نقشہ تراشنے پر بھی مہارت حاصل تھی، معمولی سے معمولی جزئیات کو بھی پیش نظر رکھتے، مثلاً شیخ سعدی بلخاری لاہوری کے مزار کی نقشہ کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ مزار حضرت شیخ سعدی لاہوری کی چاہ ہدایت خان کے شرق رویہ ایک چار دیواری قدیمی بڑی بلند بے سقف ہے۔ دروازہ اس کا غرب رویہ مع طاق تختہ چوبی اور دروازہ جنوب رویہ کوٹھہ پختہ مسکونہ فقیر جواب لکھا بلوچ ہے۔اندر اس چار دیواری کے فرش خشتی پختہ اور اس کے لب بام گردنہ چونہ گچ دیوار جنوبی وشمالی وغربی میں نشان دالان بامحراب مع ستوناں ہیں۔ دیوار شرقی میں نشان دالان نہیں۔"۱۵۱

سکھوں کی عملداری میں مختلف تہواروں میں سے بسنت کا میلہ جس طرح منایا جاتا تھا اس لفظی تصویر کشی نے منظر کو متحرک بنا دیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ نمونہ اقتباس:

آمدم برسر مطلب کہ بروز بسنت بعہد عملداری سکھاں مہاراجہ صاحب بہادر کا یہ معمول تھا کہ تمام امیر و رئیس و افواج کو حکم ہو جاتا تھا کہ وردی ولباس اور زین و ہودج و میہائے اسلحہ وغیرہ تمام بسنتی ہوا کرتے اور ہر شخص معنی فاقع اللونہا تسر الناظرین سے لذت گیر ہوا کرتا تھا اور یہاں بمزار پرانوار حضرت خیمہ ہائے بسنتی ایستادہ ہوا کرتے تھے اور در قلعہ تا بمزار پرانوار دو رستہ فوج در لباس بسنتی مجلس جم جاتی تھی اور ماسوا اس کے ہر امیر و رئیس خود مع ملازمین بسنتی پوش ہوا کرتے تھے اور رعایائے شہر زن و مرد میں سے ایسا کوئی کمبخت ہوتا ہو گا کہ پارچہ بسنتی اس روز نہ پہنتا ہو گا ۔۔۔ جب اس طرح فوج جم جاتی تو بوقت دو بجے سواری مہاراجہ کی قلعہ سے نکلتی اور تمام مخلوقات جو منتظر دیدار سرکاری ہوتے تھے جب آواز توپہا و شلک سلامی سنتے تو ہشاش بشاش ہو کر خندہ زن ہوتے۔ جب مہاراجہ کی سواری میلہ میں آتی تو یہ لطف ہوتا تھا کہ اب اس کی یاد میں چشم آب ہو آتی تھی۔کم از کم ساٹھ ستر ہاتھی اور چار پانچ سو گھوڑا بازین ہائے مرصع وتمام ڈیرہ سواران چار یاری اور دو رجمنٹ پیدل اردل جلو میں سوا کرتی ہیں اور شاہ سے گدا تک ہر ایک شخص بسنتی پوش ہوا کرتا تھا بلکہ در و دیوار بھی بسنتی نظر پڑتے تھے اور مہاراج مٹھیاں روپیوں کی بھر بھر کر تصدیق کرتے اور چھینکتے ہوئے تا مزار پرانوار حضرت حسین کے پہنچتے اور بعدہ سواری سے اتر، پا پیادہ ہو، با رادت تمام مع روسائے عالی مقام، پیر برہنہ، خانقاہ کے دروازے سے اندر جاتے تھے۔ پھر

شکل سلامی کی ہوتی تھی۔ پھر گیارہ سو روپیہ نقد مع دو شالہ بسنتی خانقاہ پر نذر چڑھا کر جبیں سائی کے بعد رونق افزائے خیمہ شاہی ہوتے تھے۔ وہاں عرش سے فرش تک تمام بسنتی اشیاء موجود و حاضر ہوتی تھیں۔ پھر حسب معمول خود یعنی ایک بروز دہرہ اور دوسر بروز بسمت تمام ملازمین سے نذریں علی قدر مراتب لے کر باخلعت ہائے فاخرہ پر ایک کو سرفرازی بخشتے تھے۔ اور پھر عطر، عنبر و گلال بطور شروع جشن ہولی اڑتا تھا۔ پھر لالہ رخان حوروش یعنی تمام طوایفان لاہور و امرتسر جو حسب الحکم اس روز وہاں حاضر ہوا کرتی تھیں۔ مجرائے شاہانہ ادا کرکے نوبت بنوبت بتقریب تفریح سرکار راج میں مشغول ہو کر بانعامات گوناں گوں سرفراز ہوا کرتی تھیں اور جو نذر کا روپیہ و اشرفی اس روز مہاراج کی خدمت میں جمع ہوتا تھا وہ بتقریب انعام یوم بسنت خدمتگاران کو تقسیم ہو جاتا تھا بلکہ ماسوا اس کے ایک ایک ماہ کی تنخواہ تمام فوج سواری و پیادہ کو بطور انعام تقسیم ہوتی تھی۔ جب وقت غروب آفتاب قریب ہو جاتا تو پھر سواری مہاراج کی بوضع سابقہ بہ آمد ہوا کرتی تھی اور اسی طرح روپیہ تھیکیاں چھینکتے ہوئے داخل قلعہ ہوتے تھے۔" ۱۵۲

حیات افغانی: ۱۵۳

محمد حیات خان نے اردو نثر میں افغان باشندوں کی ۶۹۶ صفحات پر مشتمل ایک ضخیم تاریخ لکھی جو ۱۸۶۷ء میں لاہور میں مطبع کوہ نور سے شائع ہوئی۔ حیات افغانی تین حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں افغانستان کے جغرافیائی خصائص، قدیم و جدید حدود اربعہ، آبادی کی کیفیت، کانوں، نہروں، درختوں، جانوروں کا احوال، اٹک سے لے کر ایران کی مغربی سرحد تک پھیلے ہوئے مشہور شہروں کا بیان، تجارت اور اس کے فروغ کی تدابیر، تاجروں کے مختلف طبقات، ملکی پیداوار، درآمدات و برآمدات، ذرائع آمدورفت، ذرائع خبررسانی، بیان کرنے کے بعد افغانستان کی ۲۵۰۰ سال قبل کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مختلف زمانوں میں یہاں کے خانوادوں کا تذکرہ، ہندو، یونانی، اور اسلامی خانوادوں بنی امیہ، بنو عباس، سامانی، غزنوی غوری، نادر شاہ کی حکومتوں کا عروج و زوال تفصیلی بیان کیا ہے پھر سکھوں کے تسلط اور انگریزوں کی مشرقی افغانستان کے علاقوں کی فتوحات اور سرکش سرحدی قبائل کا ذکر کیا ہے جو پنجاب کے مغربی علاقوں میں آباد ہیں اور ان پر قابو رکھنے کی تدابیر بتائی گئیں ہیں۔ دوسرے حصے میں افغانستان میں بسنے والے مختلف قبائل کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ ان کی زبان کی ابتدا اور ان کے گروہوں کا ہندوستان، ترکستان، مازندران اور دوسرے ممالک میں جا کر آباد ہونے کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچائی ہیں جبکہ تیسرے اور آخری حصے میں ضلع بنوں کے متعلق تفصیلی تاریخی مواد جمع کیا گیا ہے۔

تحفۃ الہند: ۱۵۴

مولوی عبید اللہ کی تحریر کردہ یہ تاریخ ۱۸۶۸ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

تاریخ مخزن پنجاب:

۱۸۷۰ء میں مشہور تذکرہ نگار و مورخ مفتی غلام سرور لاہوری نے لکھی۔ غلام سرور لاہوری اس دور میں لاہور میں اردو، عربی، اور فارسی کے بہت بڑے عالم تھے۔ انہوں نے ۵۸۸ صفحات پر مشتمل اس ضخیم تاریخ کو پانچ حصوں میں منقسم کرتے ہوئے شہر لاہور، صوفیاء کرام کے مزارات، سکھ دور حکومت کا زوال اور انگریزی عہد کے عروج کے چشم دیدہ واقعات نہایت تفصیل سے قلمبند کیے ہیں۔ معمولی سے معمولی قصبوں کا ذکر بھی اہتمام سے کیا ہے۔ جس سے مفتی غلام سرور لاہوری کی وسعت نظری کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ پنجاب سے متعلق ہر قسم کی معلومات جزئیات کے ساتھ بیان کی ہیں۔ اس پہلو نے اس تاریخ کو خاص بنا دیا ہے۔ اردو نثر میں تاریخ کے موضوع کو سیدھا سادا اسلوب بیان عطا کیا جو علمی اور معلوماتی خصائص پر مبنی ہے مثلاً فقیر خاندان کی ملکیت زیارات کا بیان جزئیات کی تفصیل کے ساتھ ملاحظہ ہو:

> ''ان زیارات عالیات میں گیارہ زیارتیں حضرت خاتم الانبیاء کے متعلق ہیں اول موئے مبارک برنگ سیاہ، دوم: جبہ مبارک، سوم: نقش پنجہ، دست مبارک کالے پتھر پر، چہارم: تاج مبارک برنگ سیاہ، پنجم: نعل چرمی، ایک پاؤں جس کے ساتھ کا دوسرا قلعہ کی زیارت میں ہے۔ ششم: قدم مبارک پتھر پر، ہفتم: موئے مبارک حنائی رنگ، ہشتم: شانہ مبارک، نہم: الغی، دہم: مسواک، یازدہم: پانی پینے کا جام، حضرت عمرؓ ابن خطاب خلیفہ سوم کی صرف ایک تسبیح ہے۔ حضرت علیؓ کے متعلق پانچ زیارات موجود ہیں۔ پہلا: موئے مبارک، دوسرا: جبہ مبارک، تیسرا: تاج، چوتھا: عصائے مبارک، پانچواں: پنجہ مبارک پتھر پر۔۔۔'' ۱۵۵

سنین اسلام (حصہ اول و دوم):

ڈاکٹر لائٹنر نے مولوی کریم الدین اور مولانا آزاد کی مدد سے علم التاریخ پر یہ کتاب لکھی جو ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی جس کے پہلے حصے میں اسلام کی تاریخ مختصر طور پر بیان کرنے کے بعد ان علوم وفنون کا ذکر کیا ہے جن میں مسلمانوں نے ترقی کی جبکہ دوسرے حصے میں فتح بغداد سے اس وقت تک کے تاریخی حالات و واقعات درج کیے گئے ہیں۔

تاریخ آگرہ:

مولوی کریم الدین نے لکھی جو ۱۸۷۲ء میں چھپی۔

بہارستان تاریخ المعروف گلزار شاہی:

تاریخ و تذکرہ کی اس کتاب میں غلام سرور لاہوری نے شاہان و سلاطین و روسائے اسلامی اور سلطنت انگریزی کا مفصل احوال بیان کیا ہے۔ ۶۴۳ صفحات پر مشتمل اور تین حصوں میں منقسم یہ کتاب پہلی بار ۱۸۷۵ء میں لاہور سے طبع ہوئی۔ حصہ اول میں مہاراجگان متقدمین و متاخرین کے حالات درج ہیں۔ دوسرے حصے میں مسلمان سلاطین کے حالات اور ان کی ریاستوں کا ذکر آنحضورؐ کے عہد سے لیکر موجودہ زمانہ تک قلمبند کیے ہیں جبکہ تیسرے حصے میں انگریز حکمرانوں کے حالات ابتدائے سلطنت سے ملکہ وکٹوریہ تک کی تاریخ کا مجمل احاطہ کیا ہے۔ تاریخ و تذکرہ پر مبنی اسی کتاب میں موجود مواد کی تفصیلی مندرجات سردار عبدالحمید کے توسط سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں جس سے تاریخ کے موضوع پر مفتی غلام سرور لاہوری کی تبحر علمی اور اس کے مضامین کی نوعیت کا بھی علم ہوتا ہے۔ کتاب کیا ہے؟ معلومات کا بے بہا خزانہ ہے اس ضمن میں ابواب میں ضمنی تفصیلات ملاحظہ ہوں:

''پہلا حصہ، چمن نمبرا ذکر راجگان متقدمین کا، چمن نمبر ۲ ذکر راجگان ماتحت حکومت ہند - دوسرا حصہ، چمن نمبر ا، رسول کریمؐ کے ذکر میں، نمبر ۲ بنی امیہ، نمبر ۲۳ بنی عباس، نمبر ۴ شاہان بنی امیہ کے بیان میں، جن کی حکومت اندلس میں تھی، نمبر ۵ خاندان موراوی، نمبر ۶ خاندان موحدین، نمبر ۷ خلفائے مصر، نمبر ۸ ملوک طاہریہ، نمبر ۹ سلطنت صفاریہ، نمبر ۱۰ سامانی حکومت، نمبر ۱۱ ملوک خاندان غزنویہ، نمبر ۱۲ سلطنت آل بویہ، نمبر ۱۳ فرقہ اسماعیلیہ فاطمیہ، نمبر ۱۴ خاندان ابو بیہ، نمبر ۱۵ سلاطین فرقہ ملاحدہ، نمبر ۱۶ سلاطین آل سلجوق، نمبر ۱۷ سلاطین خوارزم، نمبر ۱۸ سلاطین آل مظفر، نمبر ۱۹ سلاطین اتا بک، نمبر ۲۰ سلاطین غوریہ، نمبر ۲۲ سلاطین نیم روز، نمبر ۲۳ سلاطین کرت، نمبر ۲۴ سلاطین مغول، نمبر ۲۵ سلاطین شرمداری، نمبر ۲۶ سلاطین خلجیہ، نمبر ۲۷ سلاطین متعلقہ شاہان دہلی، نمبر ۲۸ سادات خصر خانیہ، نمبر ۲۹ سلاطین لودھیہ، نمبر ۳۰ ذکر شاہان بہمنی دکنی، نمبر ۳۱ سلاطین عادل شاہی، نمبر ۳۲ سلطنت نظام شاہیان احمد نگر وغیرہ، نمبر ۳۳ خاندان قطب شاہی کے ذکر میں جو تلنگ میں حاکم تھے۔ نمبر ۳۴ ذکر شاہان برید شاہی جو دکن کے حاکم تھے۔ نمبر ۳۵ خاندان عماد شاہوں کا ذکر، نمبر ۳۶ بادشاہان گجرات کا ذکر، نمبر ۳۷ شاہان غوری کا ذکر، ۳۸ شاہان فاروقی، نمبر ۳۹ بادشاہان بنگالہ وغیرہ کے بیان میں، نمبر ۴۰ سلاطین مشرقی کے ذکر میں جو جونپور کے حاکم تھے۔ نمبر ۴۱ ان بادشاہوں کا ذکر جو سندھ وٹھٹھہ کے حاکم تھے۔ نمبر ۴۲ ان بادشاہوں کے ذکر میں جو ملتان کے حاکم تھے۔ نمبر ۴۳ ان بادشاہوں کا ذکر جو خطہ کشمیر کے حاکم تھے۔ نمبر ۴۴ شاہان خاندان بابریہ کے ذکر میں، نمبر ۴۵ شاہان افغانی جو ہندوستان کے حاکم تھے۔ نمبر ۴۶ سلاطین صفویہ کے ذکر میں جو ایران میں حاکم تھے۔ نمبر ۴۷ سلاطین قرقونیلو کے بیان میں جو تبریز کے حاکم تھے۔ نمبر ۴۸ سلاطین عاق نیلو کے بیان میں۔ نمبر ۴۹ سلاطین قاجار کے ذکر میں جو اب تک ایران کے حاکم ہیں۔ نمبر ۵۰ خاندان جنوق جو خوارزم میں تھے۔ نمبر ۵۱ سلاطین عثمانیہ، نمبر

۵۲ شاہان ابدالی کے ذکر میں، نمبر ۵۳ رؤساء اہل اسلام کے ذکر میں۔ تیسرا حصہ سلطنت انگریزی کے ذکر میں۔ نارمنوں کے ذکر سے ملکہ وکٹوریہ کے عہد تک۔

تاریخ جلسہ قیصری:

تاریخ کے موضوع پر یہ کتاب دراصل ماسٹر پیارے لال آشوب نے ترجمہ کی ہے۔ ۱۸۷۷ء میں دہلی میں دربار منعقد ہوا جس کی روئداد جے ٹالبائز ویلز نے انگریزی زبان میں "History of the Imperial Assemblage" ۱۵۶ کے عنوان سے لکھی۔ جس کا اردو ترجمہ ''تاریخ جلسہ قیصری کے نام سے ۱۸۸۳ء میں لاہور کے سرکاری مطبع سے بابو جتندر ناتھ مترکیوریٹر کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔۱۵۷ اس وقت تک پیارے لال آشوب علمی خدمات کے صلہ میں انسپکٹر مدارس کے عہدے کے لیے منتخب ہو چکے تھے۔ اس تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ۱۰۰۰ء سے قبل راجپوتوں اس کے بعد مسلمانوں اور پھر ۱۶۴۰ء سے ۱۸۷۷ء تک مرہٹوں کے عہد حکومت کے حالات اختصار سے بیان کرنے کے بعد ہندوستان میں انگریزی حکومت کے اقتدار اور حکومت قائم ہونے تک کے واقعات اور دہلی میں منعقدہ دربار کی کیفیت کا احوال قلمبند کیا گیا ہے۔ تاریخ میں تعصب اور جانبداری سے کام لیتے ہوئے ہندوؤں کی حکومت کو نااہل، مسلمان حکمرانوں کو ظالم و جابر اور متعصب قرار دیا ہے پھر مرہٹوں اور سکھوں کی لوٹ بازاری کا ذکر کیا ہے جبکہ آخر میں خود ستائی سے کام لیتے ہوئے انگریز حکومت کی ستائش بیان کرتے ہوئے اسے نیکی کا ایسا فرشتہ کہا گیا ہے جس نے ہر اعتبار سے ہندوستان اور یہاں کے باشندوں کو بے شمار وسائل سے مالا مال کر کے خوشحال بنا دیا ہے۔ مسٹر ویلز رامائن کی تاریخ کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوؤں کے تاریخی واقعات کو فرضی اور من گھڑت قصے قرار دیتا ہے۔ موضوع کے ساتھ ترجمہ کے اسلوب نے اس تاریخ کو زیادہ جاذب نظر بنا دیا ہے اور یہ خوبی انداز بیان میں کہانی پن کی شگفتگی اور برجستگی نے پیدا کی ہے۔ نمونہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''رامائن کی کہانی میں شاعری کو بھی دخل دیا گیا ہے۔ جس عورت کو دشمن پکڑ کر لے گیا ہو اس کو پھر گھر میں رکھنا ہندوؤں کے نزدیک برا ہے اس واسطے شاعر نے سیتا کی عظمت و عفت کی شہادت آگ سے دلوائی ہے یعنی لکھا ہے کہ چتا تیار کی گئی اور سیتا کو آگ کا اواہن کیا یعنی پاک دامنی کی شہادت کے لیے دیوتا کو بلایا پھر آپ جلتی آگ میں ہو بیٹھی اور دیوتا سے اپنی پاک دامنی کی شہادت چاہی۔ اگنی نے بیٹی کی طرح آغوش میں لے لیا اور اپنے زانو پر بٹھائے آگ کے شعلوں میں سے نکل آیا۔ سیتا کو رام کے حوالے کیا اور شہادت دی کہ سیتا شش‌نق ہے۔''۱۵۸

اس تاریخی ترجمہ کے اسلوب نگارش ہی کی بناء پر پیارے لال آشوب کو اتنا کامیاب اردو نثری ترجمہ کرنے پر انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ لالہ سری رام لکھتے ہیں کہ ''ترجمہ دربار قیصری ۱۸۷۷ء مولفہ مسٹر ویلز اس شستہ و بامحاورہ بلکہ برجستہ و دل آویز ترجمہ کے صلہ میں جناب گورنر جنرل بہادر کی طرف سے ایک تمغہ اور ایک جلد مطلا و مذہب مرحمت ہوئی۔''[۵۹]

تاریخ مدینہ ومنورہ کعبہ شریف:

مولوی سید نصرت علی دہلوی قیصرؔ نے لکھی جو ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔

قیصاریہ:

۱۸۷۷ء میں چھپی جسے مولوی سید نصرت علی قیصرؔ نے تحریر کیا۔ اس میں یونان کے بادشاہوں کی مختصر تاریخ، تصاویر کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

گلدستہ شاداب:

سید نصرت علی دہلوی قیصرؔ نے عیسائیوں کے پرانے مقدس مقامات کی تاریخ لکھی ۱۸۷۷ء میں چھپی۔

تاریخ پنجاب:

۱۸۸۳ء میں لکھی جانے والی یہ تاریخ کنہیا لال ہندی کی تصنیف و تالیف ہے۔ پنجاب میں سکھوں کے عہد نیز مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عروج و زوال کی داستان بیان کی ہے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے مطابق ''تاریخ پنجاب'' کو مفتی غلام سرور لاہوری کی مدد اور معاونت سے تحریر کیا:

> ''کنہیالال کی تاریخ پنجاب اور مفتی غلام سرور لاہوری کی تاریخ مخزن پنجاب'' کو اگر ایک ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ مخزن پنجاب کے صفحے کی عبارتیں اور مطالب جوں کے توں کنہیالال کی تاریخ پنجاب میں آ گئے ہیں۔''[۶۰]

ایک طرف یہ بیان اور دوسری جانب لالہ ستیا رام کوہلی اس کتاب سے متعلق لکھتے ہیں: ''یہ کتاب زیادہ تر European Adventure in Northern India مصنفہ سی۔ ڈی گرے کی کتاب پر مبنی ہے''۔[۶۱] مذکورہ بالا بیانات کے باوجود ''تاریخ پنجاب'' سرزمین پنجاب کے حوالے سے ایک مفید اور معلومات افزاء تاریخ ہے۔

تاریخ لاہور:

کنہیا لال جو پیشہ کے اعتبار سے انجینئر تھے لیکن مورخ اور مترجم کے حوالے سے بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب میں لاہور شہر کی تاریخ بیان کی ہے جس میں قدیم عمارات اور اس وقت کے روساء و فضلاء کے متعلق بیشتر معلومات یکجا کردی ہیں۔ یہ کتاب وکٹوریہ پریس لاہور سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی۔ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے جس میں لاہور سے متعلق تاریخی مواد، تحقیقی جستجو کے ساتھ اس طرح بیان کیا ہے کہ اکثر عمارات کا رقبہ تک درج کیا ہے۔ یہی خوبی اسے دیگر تاریخوں سے ممیز کرتی ہے۔

تاریخ پنجاب:

سید محمد لطیف جو شہری تاریخ نویسی میں شہرت رکھتے تھے اور اپنی صلاحیتوں کی بناء پر انگریز سرکار میں وقعت اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ اردو نثر میں انہوں نے ۱۸۸۸ء میں پنجاب کی تاریخ ''تاریخ پنجاب'' کے نام سے تحریر کی۔ یہ تاریخی اور علمی نقطہ نظر سے پنجاب سے متعلق مفید معلومات کے لیے بنیادی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات سے لے کر اسی وقت تک کے تاریخی حالات قلمبند ہیں۔ اسلوب نگارش کے اعتبار سے تاریخ پنجاب کا انداز بیان خالصتاً علمی و تحقیقی نوعیت کا ہے۔

تاریخ لاہور:

سید محمد لطیف نے ۱۸۹۲ء میں چار ابواب پر مشتمل لاہور شہر کی تاریخ لکھی جس میں تحقیق کے ساتھ لاہور سے متعلق تمام ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ ان کی اس تصنیف کا اسلوب بیان بھی علمی و تحقیقی ہے۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں تاریخ و تذکرہ نویسی کی توانا روایت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اردو نثر میں پنجاب کے مختلف اضلاع کی سرکاری سطح پر بہت سی تاریخیں لکھی گئیں جن میں متعلقہ ضلع کے جغرافیائی حالات، تہذیب و تمدن، پیداوار اور وہاں آباد مختلف اقوام کے تاریخی حالات درج کیے گئے چند تاریخیں اس حوالے سے ملاحظہ ہوں۔

تاریخ گجرات[۱۶۲] مرزا محمد اعظم بیگ، تاریخ جہلم (مرتبہ) مرزا محمد اعظم، تاریخ ہزارہ نام مصنف ندارد، تاریخ ضلع گوڑگانواں سید الطاف حسین، تاریخ تحصیل فاضلکا (مرتبہ) محمد عظیم اللہ، تاریخ ضلع منٹگمری، (مرتبہ) منشی بختاور لال، تاریخ پشاور (مرتبہ) بہادر منشی گوپال داس، تاریخ ڈیرہ اسماعیل خان، (مرتبہ) منشی چرنجیت لال، تاریخ ڈیرہ غازی خان[۱۶۳] (مرتبہ) لالہ حکم چند، تاریخ گوجرانوالہ نام مصنف ندارد، تاریخ ضلع روہتک پنڈت مہاراج کشن، تاریخ اجمیر پنڈت مہاراج کشن، مجموعہ تاریخ ریاست ہائے کوہستان پنجاب (مرتبہ) سردار ہردیال

سنگھ، تاریخ سیالکوٹ امین چند، تاریخ بدایوں (مرتبہ) شیخ عبدالحی، تاریخ خاندان نبوی(مرتبہ) نادر علی شاہ، تاریخ تناولیاں(مرتبہ) سید مراد علی، وقائع عمر رابعہ بصری (مرتبہ) نیاز احمد،تاریخ المتقد مین(مترجم) منشی غلام مصطفی ، تاریخ یادگار صوبیدار(مترجم) منشی عبدالغفار، سیر پنجاب (حصہ اول و دوم) رائے کالی رائے ۱۸۶۴ء، منتخب واقعات ہند(مرتبہ) مادھو سروپ ، تاریخ ہند قدیم لاچپت رائے، بست سالہ عہد حکومت سلطان عبدالحمید خان ثانی ۱۸۶۵ء (مترجم) مولوی انشاء اللہ خان، تاریخ خاندان عثمانیہ (دو جلدیں)مولوی انشاء اللہ خان۔

د) نئے اردو سفر ناموں کی نثر :

لاہور میں اردو نثر کے ابتدائی نثری آثار میں سفرنامہ کی صنف سرفہرست نظر آتی ہے۔ درحقیقت سفرنامہ ہی وہ نثری صنف ہے جو سب سے پہلے لاہور میں ترجمہ کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ ورنہ اخبارات کے علاوہ جو نثری کتب ملتی ہیں وہ زیادہ تر دفتری، سرکاری، انتظامی اور مذہبی نوعیت کی تھیں۔ چنانچہ لاہور میں اردو نثر کے ارتقا کا آغاز ادبی حوالے سے سفرنامہ کی صنف سے ہوا۔جس نے ارتقا کے عمل میں بنیادی کردار ادا کیا۔

سفرنامہ صرف حالات و واقعات اور مشاہدات و تجربات کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ سوانحی اور جغرافیائی معلومات کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔اس میں حالات و واقعات سفر کا مربوط اور مکمل بیان ہونے کے ساتھ مثبت یا منفی اثرات جذبات و خیالات کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے اختیار کیا جانے والا دلکش نثری اسلوب اور مشاہدے کی گہرائی کی خصوصیت اسے ادب کے دائرے میں لاتی ہے۔ اس طرح سفرنامہ وہ طرز تحریر اور اسلوب بیان ہوا جس میں انسان یا سیاح اپنے داخلی احساسات کو خارجی حالات کے ساتھ ملا کر اپنی ذہنی، قلبی، اور طبعی کیفیت ظاہر کرتا ہے۔اس کی یہ کیفیت اتنی عمیق ہوتی ہے کہ دوسرے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔سفر نامہ تاریخی اور سماجی اعتبار سے بیک وقت کئی خوبیوں کا حامل ہوتا ہے۔چونکہ مختلف مزاج کے لوگوں کے نظریات کا عکاس ؛ تہذیب وتمدن کے حوالے سے مختلف نفسیاتی عناصر؛ حالات حاضرہ اور وقائع نگاری کی مرقع کشی کرتا ہے اس لیے سفرنامہ تفریحی ومعلوماتی ادب کا ذریعہ بن کر تاریخ ،جغرافیہ ، روزنامچہ ، رپورتاژ اور خاکہ نگاری سے اپنے تارو پود بُنتا ہے۔

انگریزوں کی آمد کے بعد انیسویں صدی میں ذرائع آمد ورفت کی سہولتوں نے اس صنف کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا۔جس سے لوگوں میں سفر کا شوق اور جذبہ پیدا ہوا بعد ازاں یہی شوق اور جذبہ سفر کے تاثرات اور مشاہدات کوسفر نامے کی شکل میں مرتب کرنے کا محرک بھی بنا۔سفر نامہ نے اُردو نثر کوعوام سے قریب کرنے میں نہ صرف معاونت کی بلکہ نثر نگاری کوفروغ بھی دیا چنانچہ سفر نامے کی مختلف اقسام کومشرقی ممالک کے سفر نامے،

مذہبی سفر نامے، یورپ کے سفر نامے اور مقامی سفر نامے کی صورت میں ترتیب دیا جانے لگا۔

''یہ تحفہ کشمیر'':

ڈاکٹر منظور الٰہی ممتاز کے توسط سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میں سفر نامہ کی صنف کی ابتدا فارسی سے اُردو ترجمہ سے ہوئی ۔ فارسی تحریر منشی گنیش لعل کا مارچ تا جون ۱۸۴۶ء کا سفر نامہ کشمیر تھا۔ جو انھوں نے لارڈ ہارڈنگ گورنر جنرل ہند کے دولڑکوں چارلس ہارڈنگ اور کپتان ہارڈنگ کے علاوہ ، لارڈ انفسٹن ، ڈاکٹر واکر اور کپتان ایڈ ورڈلیک کے ہمراہ کیا اور منشی ہر سکھ رائے نے ۱۸۵۱ء میں اسے ''تحفہ کشمیر''[۶۶] کے عنوان سے اُردو ترجمہ کا جامہ پہنایا اور ۱۸۵۲ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع کیا۔ ۸۵ صفحات پر مشتمل یہ سفر نامہ انیسویں صدی کے نصف دوم کی ابتدا ہی میں منظر عام پر آیا مقالہ نگار کے مطابق لاہور کی اُردو نثر کا سب سے قدیم ترین اور اولین دستیاب سفر نامہ ہے۔ سفر نامے میں لدھیانہ سے سری نگر تک کشمیر کی سیر و سیاحت کی روداد کو بیان کرنے کے لیے جو انداز اختیار کیا گیا ہے اس نے اسے سفر نامہ کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ سفر نامہ معلوماتی نوعیت کا ہے جس سے وادی کشمیر سے متعلق مکمل معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ڈاکٹر منظور الٰہی ممتاز کے مطابق ''تزک جہانگیری اور ڈاکٹر برنیئر کے بعد یہ سفر نامہ کشمیر سے متعلق ایسی معلومات فراہم کرتا ہے جو تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔''[۶۷] منشی ہر سکھ رائے کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ترجمہ کے لیے جو اسلوب نگارش اختیار کیا ہے وہ فارسی آمیز ہونے کے باوجود اردو نثر کی روانی میں فرق نہیں آنے دیتا۔ منشی ہر سکھ رائے فارسی زبان پر دسترس رکھتے تھے۔[۶۸] اس وقت جب لاہور میں تخلیقی سطح پر اُردو نثر کا نیا نیا آغاز ہوا تھا اور لوگ ابھی فارسی ہی میں لکھنا پڑھنا پسند کرتے تھے ''یہ تحفہ کشمیر'' میں فارسی الفاظ کا کثرت سے استعمال گراں نہیں گذرتا ۔ مثلاً سری نگر (کشمیر) سے متعلق مصنف کی رائے کا ترجمہ کس قدر خوبصورت شاعرانہ اور قافیہ بند انداز میں کیا گیا ہے:

> '' شہر کشمیر جس کو تمام جہان میں جنت نظیر کہتے ہیں اگر لطافت ہوا اور طراوت صحرا اور جمال صورت اور کمال معنی اونکی جنگل اور آبادی پر نظر کی جاتی ہے تو لاریب جنت نظیر ہے اور اگر یہاں کے باشندگان کی خصلت اور عادت پر نظر کی جاتی ہے تو بغور اونکی بدلباسی اور ناپاکی ظاہراً اور تیرہ دروئی اور لغو پسندی باطنی کے قول پنہاں درونِ پنبہ نگر پنبہ دانہ راست آتا ہے۔۔۔ سخت گیری اور ظلم وستم حاکم وقت سے باوجود کسب و ہنر اعلیٰ تر کے مردم کشمیر نہایت محتاج ہو گیا ہے پوشاک اونکی بہت خراب ہے یعنی چہ زن وچہ مرد صرف ایک کورتہ گلے سے پیر تک پہنے رہتے ہیں۔۔۔ عقل اونکی سراسر پر از فتنہ وفساد ودغل ہے۔ چغل خوری اور بے مروتی وطبع نفسانی میں بے عدیل مگر تیز فہمی اور دستکاری میں بے مثل۔''[۶۹]

جا بجا فارسی الفاظ کے استعمال کے باوجود اُردو ترجمہ ایسا رواں ہے کہ پڑھنے میں کہیں بھی دشواری نہیں ہوتی ۔ چنانچہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے اور پھر یہ کہ اُردو نثر یں یہ ترجمہ ایک سو اٹھاون برس قبل کیا گیا ہے۔ زعفران کی کاشت اور پیداوار کا ذکر کرتے ہوئے دلچسپ اور خوبصورت مرقع کشی کا یہ انداز ملاحظہ ہو:

> ''موضع سم پور پرگنہ پامپور میں ہم نے کریو ہائے زعفران معلوم ہوا کہ زعفران صرف اسی پرگنہ مقام میں پیدا ہوتی ہے۔ طریقہ کاشت اوس کا یہ ہے کہ تخم اوس کا مثل پیاز ہوتا ہے اور آلو یا ادرک کی طرح اوس کو چھوٹی چھوٹی کیاریوں میں بوتے ہیں۔ درمیان پتوں کے ایک شاخ گل وغنچہ کی نکلتی ہے اور ماہ اسوج اور کاتک میں پھول برنگ اودہ گل نافرمان کا سا کھلتا ہے اوس کے بیچ میں زیرہ اور ریشہ برنگ زردہ ہوتا ہے وہی زعفران ہوتی ہے اور ایک مرتبہ بیج بویا جاتا ہے دس بارہ برس تک کو کافی ہوتا ہے کہ مونڈہ کی طرح ہر سال کھلتے رہتے ہیں۔''۱۷۰

ان نثری اقتباسات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں ایک اچھے ترجمہ کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ بہترین ترجمہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہو۔ اگرچہ ترجمہ ثانوی حیثیت رکھنے کے اعتبار سے اصل کے برابر نہیں ہوسکتا لیکن بعض اوقات ایک اچھا ترجمہ اصل سے کہیں زیادہ مقبول اور ہر دلعزیز ہو جاتا ہے۔ منشی ہرسکھ رائے نے ترجمہ رواں اردو نثر میں اس خوبی سے کیا ہے کہ سفر نامہ پڑھتے ہوئے کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہ ترجمہ ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ اس سفر نامہ کی نسبت یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ انیسویں صدی میں لاہور میں یہ پہلا سفر نامہ ہے جس نے اردو نثر میں دیگر زبانوں سے ترجمہ کرنے کی روایت کا بھی آغاز کیا اور اس صنف کو مقبول بنایا۔

سفر نامہ منشی امین چند:

انیسویں صدی کے نصف دوم کی ابتدا ہی سے اردو نثر میں ایک مقامی سفر نامہ ''سفر نامہ منشی امین چند'' کے نام سے لکھا گیا جو مصنف منشی امین چند ۱۷۱ کے گہرے مشاہدے اور مطالعے کا نتیجہ ہے۔ منشی امین چند پنجاب کے رہنے والے اور لاہور میں ٹیکس کلکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے ڈپٹی جوڈیشل کمشنر رابرٹ کسٹ (Robert Cust) کے ہمراہ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۳ء میں ہندوستان کے مختلف شہروں (پنجاب، کشمیر، سندھ، دکن کے بعض علاقے خاندلیں، مالوہ اور راجپوتانہ) کی سیاحت کی اور اپنے سفر کے حالات کو سفرنامہ کی صورت میں قلمبند کیا۔ انگریزی میں اس کا نام Travel in the Punjab ۱۷۲ ہے۔ سفرنامہ کا دیباچہ رابرٹ کسٹ نے لکھا نیز اس کی اشاعت میں بھی امین چند کی معاونت کی۔ دیباچہ پڑھنے سے اس سفرنامہ کو لکھنے کا مدعا بھی معلوم ہوتا ہے

کہ اس کا مقصد طلباء کو ہندوستان کے مختلف مقامات اور عمارات کے کوائف کو اچھی طرح ذہن نشین کرانا تھا۔ رابرٹ کسٹ دیباچہ میں لکھتا ہے:

> ''(لڑکوں) کو خود انہی کے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ پڑھانا چاہیے۔ انہیں دہلی اور بنارس جیسے شہروں، ہمالیہ اور وندھیا جیسے پہاڑوں اور گنگا اور جمنا جیسے دریاؤں کا علم ہونا چاہیے اور پھر دنیا کے کسی ملک میں ایسے قدیم اور عظیم الشان شہر ہوں گے۔ ایسے پرشکوہ دریا اور ایسے شاندار پہاڑ ہونگے۔'' ۱۷۳

تاریخ اور جغرافیہ کی کتب عام طور پر حفظ تو کر لی جاتیں لیکن ان سے پورے طور پر استفادہ نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ سفر نامہ کے ذریعے تاریخ اور جغرافیے سے مکمل استفادے کو ممکن بنایا گیا۔ اس لحاظ سے ''سفر نامہ منشی امین چند'' بھی ایک نصابی کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ ''سفرنامہ منشی امین چند'' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا حصہ و پہلی اشاعت دہلی سے ۱۸۵۴ء میں ''سفرنامہ منشی امین چند پنجاب'' ۱۷۴ کے عنوان سے ہوئی جبکہ دوسری اشاعت مع دوسرے حصے کے ۱۸۵۹ء میں مطبع کوہ نور ۱۷۵ لاہور سے ہوئی۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کے توسط سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے علمی ذخیرہ کتب میں موجود ''سفر نامہ امین چند'' تک رسائی ہوئی جس میں سر ورق سمیت آر کسٹ کے دیباچہ اور ابتدائی چار صفحات نہیں ہیں۔ قلمی روشنائی سے اس پر ''سفر نامہ پنجاب'' ۱۷۶ مصنفہ امین چند، رئیس بجواڑہ، ضلع ہوشیار پور (پنجاب) ۱۸۵۰ء تحریر ہے۔ جو درست معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اس ضمن میں کوئی بھی مکمل حوالہ ایسا دستیاب نہیں ہوا جس سے اس کی تصدیق ہو سکے۔ ۱۷۷ اس کے دیباچہ کا ایک اقتباس اور سفرنامہ کے پہلے صفحہ کے ایک اقتباس کا حوالہ ملتا ہے۔ اولذکر کا حوالہ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب ''اردو ادب میں سفرنامہ'' جبکہ مؤخر الذکر کا حوالہ ڈاکٹر قدسیہ قریشی کی کتاب ''انیسویں صدی میں سفرنامہ'' اور ڈاکٹر ممتاز گوہر کی کتاب ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' میں ملتا ہے جو کہ درج ذیل ہے:

> ''راقم کو خوبی قسمت سے بیچ سال ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۳ء کے ایک ایسا نیک اتفاق سفر کا ہوا کہ اس سیاحت میں بہت سا حصہ ملک ہندوستان کا دیکھا گیا۔ مثلاً تمام شمالی حصہ ہند کا تا بمبئی جانب غرب اور مشرقی حصہ تا بہ کلکتہ و جگن ناتھ اور دریائے سندھ سیر کیا گیا۔ کشمیر کے پہاڑوں سے کراچی تک اور ویسا ہی دریائے گنگا جی مقام رکھی کیش اور ہر دوارے سے تا بہ کلکتہ اور وہاں سے براہ خشکی جگن ناتھ تک۔ لیکن یہ سفر خشکی اور تری کا نہ بآرادہ سرکار تھا نہ برائے کار تجارت اور نہ واسطے تیرتھ جاترا کے، بلکہ صرف بآرادہ تحصیل علم اور حصول واقفیت حال اور ملکوں کے۔ کس واسطے کہ مجھ کو سیاحی کا ایسا شوق پیدا ہوا کہ عہد جلیلہ تحصیل داری کو جو ایک ضلع پنجاب میں تحت حکومت صاحبان بورڈ پنجاب تھا۔ اپنی خوشی و رضامندی چھوڑ کر سفر پر کمر باندھی اور جس جس ملک

جانے کا اتفاق ہوا وہاں کے حالات اور مکانات عجیب وغریب کو جو قابل سیر کے تھے۔بخوبی دل جمعی کے ساتھ دیکھا اور بھی ہر ملک کے باشندوں سے ملاقات حاصل کر کر ان کی راہ و رسم سے واقفیت حاصل کی اور جن مقامات میں گز رمحال تھا ان کو بحصول چٹھیات سفارش ملاحظہ کیا۔غرضیکہ حتی الامکان ہر ایک امر میں بہت سی تحقیقات اور تفتیش کر کر حال ہر ایک قلمبند کیا۔"۸۷؎

منشی امین چند کے مذکورہ بیان اور سفر نامہ کے صفحہ ۸ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سفر کا آغاز انبالہ سے یکم ستمبر ۱۸۵۰ء کو ہوا۔ چنانچہ اس سال اور اگلے دو برس بھی وہ سفر میں رہے اس لیے ممکن نہیں کہ سفر نامہ ضلع ہوشیاپور (پنجاب) سے ۱۸۵۰ء میں چھپا ہو۔ پھر یہ کہ سفر نامہ کے پہلے حصہ کی اولین اشاعت ہی ۱۸۵۴ء میں دہلی میں ہوتی ہے۔ البتہ ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی'' میں ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین کے اس بیان سے جو انہوں نے ''تاریخ ادبیات گارساں دتاسی'' جلد اول ، سے نقل کیا ہے اور امین چند کے حوالے سے ہے اس میں بھی دہلی ۱۸۵۰ء کا ذکر کیا گیا ہے۔جس سے گمان کیا جا سکتا ہے کہ اس سفر نامہ کا کچھ حصہ انگریزی میں ۱۸۵۰ء میں دہلی سے چھپا ہو گا۔ یہاں حواشی بعینہ درج کیا جاتا ہے۔

''امین چند -منشی امین چند، پنجاب کے رہنے والے اور ٹیکس کلکٹر تھے۔۱۸۵۰ء ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۲ء میں آرکسٹ کے ساتھ جو سفر کیا تھا اردو زبان میں اس کو''سفر نامہ'' میں بیان کیا ہے۔ انگریزی میں اس کا نام (Travels in Punjab) ہے۔مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء لاہور ۱۸۵۹ء۔''۷۹؎

مذکورہ اقتباس سے محض ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے بتائے ہوئے سن کی تو تصدیق ہوتی ہے لیکن دیگر کوائف کے حوالے سے کوئی ایسا ثبوت سامنے نہیں آیا جس سے ''رئیس بجواڑہ، ضلع ہوشیار پور (پنجاب) ۱۸۵۰ء'' کے حوالہ کی مکمل تائید ہو سکے۔ پھر گارساں دتاسی کا اپنی تاریخ ادبیات میں سفرنامہ امین کی بابت مطبوعہ دہلی ۱۸۵۰ء لکھنا بھی سمجھ سے بالاتر ہے کیونکہ وہ اپنے خطبات اور مقالات میں کہیں بھی ۱۸۵۰ء کے سن کے حوالے سے سفرنامہ امین چند کا ذکر نہیں کرتے البتہ اس کا اولین ذکر دتاسی اپنے پانچویں خطبہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء میں کرتا ہے۔ لہذا اغلب ہے کہ ۱۸۵۰ء میں یہ سفرنامہ کا کچھ حصہ انگریزی میں ہی چھپا ہو گا اور اردو نثر میں دہلی سے ۱۸۵۴ء میں شائع ہوا اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا ذکر پہلی بار گارساں دتاسی کے پانچویں خطبہ ۱۸۵۴ء میں ملتا ہے۔۸۰؎ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی'' میں دتاسی کی اردو خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے تبصروں کا ذکر کرتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ دتاسی نے ''سفرنامہ منشی امین چند پنجاب'' مطبوعہ دہلی ۱۸۵۴ء پر ۱۸۵۶ء میں پیرس میں تبصرہ بھی کیا۔۸۱؎ چنانچہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ سفر نامہ امین چند کے حصہ اول کی پہلی اردو اشاعت ۱۸۵۴ء ہو گی جو تبصرہ کرتے وقت گارساں دتاسی کے پیش نظر رہی۔

سفر نامہ منشی امین چند کے سفر کی مدت کے ضمن میں بھی متضاد آراء ملتی ہیں ڈاکٹر قدسیہ قریشی اسے ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۴ء تک کا عرصہ بتاتی ہیں۔ سفر نامہ سے اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔ ''راقم کو خوبی قسمت سے بیچ سال ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۴ء کی ایسا نیک اتفاق سفر کا ہوا......'' ۔۱۸۲ ڈاکٹر ممتاز گوہر نے سفر نامہ امین چند سے جو اقتباس پیش کیا ہے اس میں ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۱ء، ۱۸۵۳ء کے سال تحریر ہیں۔ ''راقم کو خوبی قسمت سے بیچ سال ۱۸۵۰ء، ۱۸۵۱ء اور ۱۸۵۳ء کے ایسا نیک اتفاق سفر کا ہوا......'' ۔۱۸۳ جبکہ گارساں دتاسی کے بیان اور ڈاکٹر انور سدید کے مطابق ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۲ء تک کا عرصہ ہے۔

مقالہ نگار نے مذکورہ بالا بحث سے چند نکات اخذ کیے ہیں جو کہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ سفر نامہ منشی امین چند کا عرصہ سیاحت ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۴ء پر مشتمل ہے۔

۲۔ ۱۸۵۴ء میں منشی امین چند نے اردو نثر میں سفر نامہ کا پہلا حصہ لکھا ہو گا جو پہلی بار سفر نامہ منشی امین چند پنجاب کے عنوان سے ۱۸۵۴ء میں دہلی سے چھپا۔ جس کا تذکرہ گارساں دتاسی نے ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء کے خطبے میں کیا اور بعد ازاں ۱۸۵۶ء پیرس میں اس پر تبصرہ بھی کیا۔

۳۔ ۱۸۵۴ء کے بعد منشی امین چند دوسرا حصہ لکھنے پر متوجہ ہوئے ہوں گے جن شہروں سے ان کا گذر محال تھا ان کا احوال خط و کتابت کے ذریعے معلوم کیا ہو گا اور انہیں بھی اس سفر نامے میں شامل کر کے دوسرا حصہ تیار کیا۔

۴۔ سفر نامہ کا دوسرا ایڈیشن مع دوسرے حصہ (اس میں بعض اضلاع ممالک مغربی و اودھ، بنگال و کلکتہ وغیرہ کے حالات درج کیے گئے ہیں) کے ''سفر نامہ امین چند'' کے نام سے ۱۸۵۹ء میں مطبع کوہ نور لاہور اور پنجاب پریس۱۸۴ لاہور سے بیک سال شائع ہوا ہے۔

۵۔ مختلف شہروں کے احوال لکھتے ہوئے حتی الامکان تحقیق و تفتیش کا جو دعویٰ کیا ہے وہ بھی کم و بیش درست نظر آتا ہے کیونکہ یہ سفر نامہ طلباء کے لئے لکھا گیا۔ اس کا دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ نور احمد چشتی نے ''تحقیقات چشتی'' میں اس سفر نامے سے بھی استفادہ کیا ہے۔۱۸۵

چونکہ منشی امین چند تاریخ کے آدمی نہیں تھے اس لیے تحقیق و تفتیش کے باوجود کچھ تاریخی غلطیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہو گی کہ منشی امین چند نے مشاہدے، مطالعے اور خط و کتابت کے علاوہ شنید سے بھی کام لیا۔ ان غلطیوں، جن کی نشاندہی نور احمد چشتی نے ''تحقیقات چشتی'' میں کی ہے مثلاً منشی امین چند ''مسجد وزیر خان'' کی بابت لکھتے ہیں:

''عمارت اس مسجد کی اس شہر میں لاثانی ہے اور گو کہ عمارت اوسکی بہت پرانی ہے لیکن اگر اوس

دیکھو تو تازہ بتازہ نو بنو معلوم ہوتی ہے اور اس کا حال بعض لوگ اسطرح ذکر کرتے ہیں کہ بادشاہ دہلی نے وزیر علیخان کی اہتمام سے اس مسجد کو بنوایا تھا اور جب وہ تیار ہو چکے تو نام اوسکا وزیر خانکی مسجد مشہور ہو گیا۔ آخر جب بادشاہ نی سمجھا کہ میرا نام تو نہ ہوا۔ تب ایک اور مسجد سنہرے بنوائی وہ مسجد محلّہ رڑہ میں واقع ہے اور نام اوسکا بڑا نامی ہے۔"۸۶؎

چنانچہ نوراحمد چشتی، منشی امین چند کے اس بیان کی تردید اور تصحیح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر لالہ صاحب ممدوح ذرہ بھی ادھر توجہ موجہ فرماتے تو ایسی غفلت واقع نہ ہوتی کیونکہ کتب تواریخ شاہان چغتائی بکثرت موجود ہیں اور ذرا سی کوشش سے معلوم ہو سکتا ہے کہ زمانہ نواب وزیر خان مرحوم اور نواب بھکاری خان بانی مسجد طلائی میں ایک سو اٹھارہ سال کا بعد ہے اور سنہری مسجد نواب بھکاری خان بن روشن الدولہ طرہ بازہ خان نے مابین کشمیری و ڈبی بازار تعمیر کرائی۔ وہ محلّہ رڑہ کا حوالہ دیتے ہیں۔"۸۷؎

اس قسم کی تاریخی غلطیوں کے باوجود "سفرنامہ امین چند" معلوماتی نوعیت کا ہے۔ لوگوں کے رہن سہن، تہوار و تقریبات، تاریخ و جغرافیہ کے حوالے سے بہت سی نادر معلومات فراہم کی ہیں۔ مختلف عمارات کے تصویری نقشے مثلاً قطب صاحب کی لاٹ، جامع مسجد، تاج محل اور نقشہ درگاہ سلیم شاہ چشتی قدس سرہ کے علاوہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی تصویر اور شبیہ گرونانک بھی اس سفرنامہ کی زینت بنی ہیں۔

منشی امین چند نے انبالہ، لدھیانہ، جالندھر، ضلع ہوشیار پور، ضلع کانگڑہ، کپورتھلہ، امرتسر، ضلع گورداسپور، لاہور، شیخوپورہ، قصبہ رام نگر، وزیرآباد، سیالکوٹ، شہر جموں، قصبہ اکھنور، گجرات، جہلم، قصبہ سنبھر، قصبہ رجورے، قصبہ سوپیاں، شاہ آباد، اسلام آباد، کشمیر، سری نگر، ڈل پائے آب، قصبہ بارہ مولا، مظفر آباد، ہزارہ، ضلع راولپنڈی، حسن ابدال عرف پنجہ صاحب، اٹک، پشاور، چکوال، کٹاس، پنڈ دادنخاں، ملتان، ڈیرہ جات، سندھ مقام مٹھن کوٹ، سکھر، ستہ نگر، کراچی، کالی شہر، پونا، احمد نگر، قصبہ مالی گاؤں، اندور، اوجین، مالوہ، راجپوتانہ، چتورگڈھ، ضلع اجمیر، شہر پسکر ہے، قصبہ دیگ، بھرت پور، فتح پور سیکری، اکبر آباد عرف آگرہ، شہر کوکل، متھرا، بندرابن، دہلی عرف شاہجہاں آباد تک کے شہروں پر کہیں تفصیلاً اور کہیں مختصراً ان کی تاریخ، جغرافیائی معلومات کے ساتھ وہاں کی مشہور اور یادگار عمارات کا احوال لکھا ہے۔ ان شہروں کی تہذیب و تمدن کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ وہاں کے لوگوں کے مذہبی تصورات، تعلیمی اور معاشی حالات کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تاریخی مقامات و عجائبات کے تذکرے کے ساتھ قدرتی مناظر کی بھی خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ ملک کشمیر کی لطافت اور کیفیت کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہر طرف چمن زار اور عالم بہار دکھائی دیتا ہے ہزاروں جگہہ تو پانی کے چشمے زمین کے نیچے اور پہاڑوں کے بلندی سے نکلتی ہیں۔ باغ اور باغیچہ اسقدر افراط سے ہیں کہ جدہر دیکھو ادوہر ہی ایک گلزار نظر آتا ہے۔ میوہ جات، سیب اور ناشپاتی انگور اخروٹ وغیرہ نہایت کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ اونکی کچھہ قدر و قیمت یہاں نہیں ہے اور جاڑی کی ونوں میں جب برف پڑتی ہے تو البتہ اس ملک میں سروے بہت سخت ہوتی ہے لیکن جب ہمارے ملک میں گرمی کا موسم ہوتا ہے تو اس ملک میں موسم بہار آتا ہے یعنی چیت کی مہنی سے لیکر کاتک کے مہینے تک بہت خوش موسم رہتا ہے۔ یہانکی باشندے تذکرہ کرتے ہیں کہ موسم بہار میں جب نیا شگوفہ نکلتا ہے اور ہزاروں طرح کی پہول شگفتہ ہوتے ہیں تو اس وقت میں یہہ تمام سطح کشمیر کا ایک تختہ چمن بنجاتا ہی کہ کہیں سبزہ کی لہک اور کہیں پہولونکی مہک مردہ تنوں میں جان ڈالتی ہے اور پانی کی نہروں سے دل لہراتا ہے اور سبزہ کی بہار سی دل بہر جاتا ہی اسی باعث سے اسکو کشمیر جنت نظیر کہا جاتا ہی۔"[۱۸۸]

"سفرنامہ امین چند" میں شہروں کے حالات، تہذیب و تمدن، تاریخی عمارات، پہاڑی مقامات، باغات، مذہبی عبادت گاہوں، مسلمانوں کے متبرک، مقدس مقامات، گرجا گھروں کا حال، ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیات کا ذکر اس طور پر کیا ہے کہ وہ لوگ جو ہندوستان کے ان شہروں کے بارے میں واقفیت نہیں رکھتے تھے ان کے لیے یہ سفرنامہ بنیادی معلومات کا حصول بن گیا۔ یہ اس سفرنامے کی اہمیت ہی ہے کہ مولوی نور احمد چشتی نے "تحقیقات چشتی" کے لیے امین چند کے سفرنامہ سے استفادہ کیا ہے۔ نیز خطبات گارساں دتاسی سے معلوم ہوتا ہے کہ منشی راجہ رام نے اپنی کتاب "مجموعہ الفوائد" کے لیے بیشتر معلومات اسی سفرنامہ سے اخذ کیں دتاسی ۴ دسمبر ۱۸۶۵ء کے خطبہ میں لکھتا ہے:

" "مجموعہ الفوائد" مصنفہ منشی راجہ رام نے لکھی جو ہندوستانی مدارس کے لیے لکھی گئی ہے اور اس میں قسم قسم کی مفید معلومات مصنف نے جمع کر دی ہیں۔ اس میں اولاً اکبرآباد (آگرہ) اور اسی صوبے کے بعض حالات دوسرے شہروں کا ذکر ہے نیز کشمیر اور لاہور کا۔ یہ سب حالات امین چند کے سفرنامے سے ماخوذ ہیں۔"[۱۸۹]

منشی امین چند کے مشاہدے اور مطالعے کی گہرائی نے شہروں، قصبوں اور دیہات وغیرہ کی متحرک تصاویر بنا دی ہیں: "قصبہ دیگ" کا حال اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"اس شہر کی چاروطرف پختہ شہر پناہ قلعہ کی شکل پر مبنی ہے اور اوسکی گرد میں چھوٹی چھوٹی برج بنی ہوتی ہیں اور شہر کے درمیان پرانے مکانات اکثر جگہ دیکھی جاتی ہیں کہ بی مرمتی کے باعث سی اوجاڑ ہوگئی ہیں الا ایک مکان مجھی بہون قابل دیکھنی کی ہے واضح ہووی کہ اسمکان مین ایک بڑا

وسیع صحن ہی جسکی درمیان میں چمن لگا ہوا ہی اور تین طرف اس صحن کی دالان در دالان اور نشست گاہیں بنی رہی ہیں اور چوتھی طرف کیسو بہتون کا دالان ہی اس مکان میں تین سو پچاس فوارہ دوجہ بدرجہ لگی ہوئی اور یہ تمام مکان سنگ مرمر اور سنگ سرخ اور سنگ موسی و سنگ زرد و سنگ ابرے سی بنی ہیں اور اونکی عمارت میں ایسی عمدہ رنگا رنگ کی نقش و نگار اور تصاویرات اور طرح طرح کی جالیاں بنا دی ہوئی ہیں کہ اونکو دیکھہ کر چکا چوندی کہاتی ہی اس جاگہہ سات دالان بنام بہون کی مشہور ہیں"۱۹۰؎

''سفرنامہ امین چند'' تاریخ نویسی اور سفرنامہ کا بہترین امتزاج ہے۔جس نے اسے تاریخ کا درجہ بھی دے دیا ہے۔سفرنامہ میں امین چند نے سیاح کی حیثیت سے تاریخ کے ساتھ تاریخی واقعہ،جغرافیائی حالت، وہاں کی آب و ہوا، پیداوار، قدرتی مناظر، دریا، پہاڑ اور جنگل وغیرہ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اسی کے ساتھ لوگوں کی اقتصادی حالت کو بھی بیان کیا ہے کہ وہاں کے لوگوں کا پیشہ کیا ہے؟ کیا کیا چیزیں وہاں بنائی جاتی ہیں یعنی صنعتی لحاظ سے شہروں کی حیثیت کے علاوہ عوام کے ذہنی رجحان کو بھی اپنی نظر میں رکھا ہے کہ آیا وہ صرف کاشتکاری کو فروغ دینا چاہتے ہیں یا تجارت کو یا پھر صنعت کو ترقی دینا چاہتے ہیں۔کم و بیش سفرنامہ میں ان تمام عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔یہی خوبی اسے تاریخ نویسی سے جوڑ دیتی ہے۔اس کے علاوہ ایک اور نثری صنف خاکہ نگاری کے نقوش کی جھلک بھی سفر نامے میں دکھائی دیتی ہے مثلاً منشی امین چند نے مہاراجا رنجیت سنگھ کی شخصیت اور خدوخال کا بھرپور نقشہ کھینچا ہے۔

سفرنامہ امین چند کا اسلوب بیان بھی سلیس، بامحاورہ اور عام فہم ہے۔قدیم اسلوب میں لفظوں کو ملا کر لکھنے کا رجحان تھا یہ خوبی اس سفرنامہ کے طرز بیان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔اس کے باوجود کہ بیشتر لفظوں کو ملا کر لکھا گیا ہے لیکن پڑھتے ہوئے کہیں بھی دشواری پیش نہیں آتی اگرچہ جملے طویل ہیں۔حرف عطف ''اور'' کی کثرت اور تکرار سے جملے جوڑتے چلے جاتے ہیں لیکن لطف یہ ہے کہ اس سے اسلوب کی روانی اور سادگی پر فرق نہیں پڑتا۔ رموز اوقاف میں سے صرف ختمہ کا استعمال کیا گیا ہے اور اس کے لیے چار نقطوں کی علامت (::) استعمال کی ہے۔ پھر یائے مجہول (ے) کی جگہ یائے معروف (ی) کا بکثرت استعمال کیا گیا ہے۔اسی طرح ہائے دوچشمی (ھ) کو ہائے ہوز (چھوٹی ہ) کے ساتھ لکھا گیا ہے۔بعض الفاظ کی املا بھی مختلف ہے مثلاً تیار کو ''طیار'' لکھتے ہیں جبکہ بعض جگہ پر ''کرکے'' کی بجائے ''کرکر'' کا استعمال عبارت میں سقم پیدا کرتا ہے۔''مخفی نہ رہے'' کے الفاظ کچھ جگہوں پر ایسے استعمال کیے ہیں جیسے طلباء کو سمجھانے اور یاد کرانے کے لیے ہی یہ انداز اختیار کیا گیا ہو۔غرض ''سفرنامہ امین چند'' کے اسلوب کی صورت میں لاہور کی اردو نثر کے قدیم اسلوب کا نمونہ ہمارے

سامنے آتا ہے جو انیسویں صدی کے اہم نثری آثار میں سے ایک ہے۔ قصبوں اور شہروں کا احوال بیان کرتے ہوئے ان سے متعلق مفید معلومات باور کرانے کے لیے عام فہم اور رواں اسلوب کا نمونہ عبارت ملاحظہ ہو جس میں ''قصبہ پان پور'' میں زعفران کی پیدائش کا حال بیان کرتے ہیں:

> ''تمام ملک کشمیر میں فقط اسے گانومین زعفران پیدا ہوتی ہے اور جب کاشت کی جاتی ہے تو اوسمیں ندی کا پانی نہیں دیتے صرف بارش پر رکہتی ہیں ماہ کنوار یا کاتک میں اوسکی کونپل زمین سے باہر نکلکر اوسے مہینی میں پہول آجاتا ہے۔ رنگ اوس پہول کا اود نافرمانی سا ہوتا ہی اور وہ ہی زعفران کہلاتا ہے اور جس وقت یہ طیار ہوتا ہے تو حاکم وقت بذات خود یہاں آ کر اور پوجا کروا کر اول اپنی ہاتہہ سے ایک پہول توڑتا ہے تب بعد اوسکی زمیندار لوگ ہاتہہ لگاتی ہیں اور اوسکی کل پیداوار میں سے نصف حق رعایا اور نصف سرکار کا ہے مگر اب مہاراجہ صاحب نصف سے زیادہ لیتی ہیں اور قیمت زعفران اکثر میں روپیہ سیر ہوتی ہے امدنی پیداوار اس جنس کی زیادہ چالیس پچاس ہزار روپیہ سے سالانہ ہے۔''[۱۹۱]

سیر مشرق:

۱۸۷۲ء میں لاہور سے شائع ہونے والے اس سفر نامے کا سراغ بلوم ہارٹ کی 'فہرست کتب اردو' سے ملتا ہے۔ اس کا ذکر "Voyages and Travels" کا عنوان کے تحت کیا گیا ہے جس میں مصنف نا معلوم ہے سفر نامہ ''سیر مشرق'' کے مندرجات کی جانب اس جملے کی مدد سے اشارہ کیا گیا ہے۔

"An account of the customs and habits of the people of various countries of Asia"[۱۹۲]

اس جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ منشی امین چند کے سفر نامہ کے طرز پر لکھا گیا ہو گا جس میں سفر کے دوران بالخصوص براعظم ایشیاء کے مختلف ممالک کے لوگوں کے رسم و رواج کو بیان کیا گیا ہو گا۔

سیر ایران:

محمد حسین آزاد کا مختصر روزنامچہ ایران ہے۔ جو کریمی پریس لاہور سے شائع ہوا۔ مولانا آزاد نے ۱۸۸۵ء میں ایران کا سفر اختیار کیا اور ۱۸۸۶ء میں اپنی واپسی کے بعد ۲۴ جولائی ۱۸۸۶ء کو لاہور کی ''انجمن پنجاب'' میں مختصر اور معلوماتی لیکچر دیئے جس میں اپنے سفر کے حالات بیان کیے۔ ''سفر ایران'' انہی لیکچروں پر مشتمل ہے۔ بظاہر کتابوں کی تلاش جس سے فارسی کی جامع لغت تیار کرنا اس سفر کا مقصد تھا۔ لیکن محمد حسین آزاد کے سوانح

نگاروں۱۹۳ کے مطابق درحقیقت عالم کے بھیس میں برطانوی حکومت کے لیے جاسوسی سے ایران کے سیاسی و اقتصادی اور معاشی حالات سے آ گاہ کرنا تھا۔غرض خواہ کچھ بھی ہو رہی ہو آزاد کا یہ روزنامچہ ان کے سفر کی سچی روداد ہے جس میں ایران کے لوگوں کا رہن سہن، لباس، ان کی خصوصیات اور معمولی معمولی دلچسپیوں تک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔جس سے اس عہد میں ایران کی تہذیبی و سماجی زندگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ وہیں خودمولانا آزاد کی شخصیت کے مختلف عناصر علم دوستی، زبان دانی، جفاکشی،عزم و استقلال،شوخی طبع اور بذلہ سنجی وغیرہ سے بھی شناسائی ہوتی ہے۔ روزنامچہ کی طرز پر اس سفر نامہ میں شیراز، تہران، اصفہان، مشہد، قندھار اور دیگر جگہوں کا احوال دلکش اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔جس میں فارسی الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں۔شہر شیراز کے مختلف رنگ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

> ''شہر شیراز کااب یہ حال ہے کہ وہ عالیشان اورسید ھابازار اور بلند اورفراغ مسجد جو کریم خان ژند نے سو برس پہلے بنائی تھی اگر وہاں سے اٹھا لیں تو اصل شیراز ایک معمولی قصبہ رہ جاتا ہے۔ چند سال ہوئے مشیر الملک نے بھی رفیع الشان مسجداور کارواں سرائے سے پرانے شہرکو نیا کیا ہے۔''۱۹۴

شیراز کی مانند تہران میں علوم وفنون اورتہذیب و شائستگی کی ایک جھلک ان الفاظ کے ساتھ دکھاتے ہیں:

> ''لوگ اسے دارالخلافہ ایران کہتے ہیں لیکن حقیقت میں شاہ کی برکت، ہمت سے آج علوم وفنون، تہذیب اور دولت و اقبال کا دارالخلافہ ہے ۔۔۔ پہلے اصفہان اورقزوین شاہ نشین دارالخلافہ تھے۔ فتح علی شاہ نے مصالح ملکی پر نظر کر کے کوہ دماوند کے دامن میں شہر آباد کیا اوراسے دارالخلافہ قرار دیا۔اس کی آبادی کی عمر ۱۰۰ برس سے زیادہ نہیں ۔۔۔طہران کے بازار پٹے ہوئے اور مسجدیں اور عالیشان مدرسے بھی قدیم شہروں کی طرز پر تعمیر ہیں۔شاہ جمجاہ نے جو سفر یورپ سے آ کر ملک المملکت میں روشنی پھیلائی ہے تو شہر کے باقصر عالیشان بنا کر شمس العمارۃ نام رکھا ہے۔اسی کے پہلو میں مدرسہ الفنون بنایا ہے۔ جسے یونیورسٹی کہنا چاہیے عمارت کی وضع بھی انگریزی طرز پر بنی ہے اس میں فرنچ انگریز اور روس کے مدرس زبانیں اورعلوم وفنون سکھاتے ہیں اور ایران کے نئے تعلیم یافتہ بھی مدرس ہو گئے ہیں''۱۹۵

ان اقتباسات سے جہاں مولانا آزاد کے مشاہدے کی تیزی اور گہرائی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے وہیں سفر نامہ کے مخصوص انداز بیان نے روداد سفر کے چند لیکچروں کو سفر نامے کی صنف میں داخل کر دیا ہے۔

سفر یارقند:۱۹۶

ترجمہ نگاری کی روایت پر عمل کرتے ہوئے انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں منظر عام پر آنے والا یہ

دوسرا سفر نامہ ہے جو ۱۸۷۱ء میں مطبع کوہ نور سے طبع ہوا۔۱۹۷ یہ ٹی۔ ڈی فور سیاتھ (T.D. FORSYTH) کمشنر جالندھر کا سفر نامہ ترکستان ہے۔وہ دسمبر ۱۸۷۰ء میں ایک سرکاری مشن پر یارقند گئے ۔جس کا مقصد سفارتی تعلقات ساز گار بنانا تھا۔ دراصل ۱۸۷۰ء میں ٹی۔ڈی فورسیاتھ کی سربراہی میں مسٹر آر بی شاہ، ابراہیم خان، دیوان بخش، ڈاکٹر بندراسن، محمد یسین منٹو، میر اکبر علی خان، تارا سنگھ، ملک قطب الدین، میجر منٹگمری اور ہری چند وغیرہ پر مشتمل ایک کمیشن تاشقند اور ہندوستان کے درمیان تعلقات کو مضبوط بنانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ واپسی پر ٹی۔ڈی فور سیاتھ نے اپنے اس سفارتی مشن کی رپورٹ پیش کی۔ جسے بے حد پسند کیا گیا اور اس کا ترجمہ اردو زبان میں کرایا۔ گارساں دتاسی کے مقالہ ''ہندستانی زبان و ادب ۱۸۷۲ء میں سے پتہ چلتا ہے کہ سفر کی روداد کی پسندیدگی ہی اس کے ترجمہ کا باعث بنی۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''مسٹر ٹی۔ڈی فورسیاتھ (T.D. Forsyth) کے سفر نامہ یارقند (ترکستان) کا ذکر کر دوں۔ یہ سفر نامہ اہل ہند کو اتنا پسند آیا کہ اس کا اردو ترجمہ لاہور سے شائع ہو چکا ہے۔''۱۹۸ سفرنامہ پر مترجم کا نام درج نہیں اور نہ ہی اس حوالے سے ایسے شواہد میسر آ سکے جس کی بناء پر اس کے مترجم کے نام کا تعین کیا جا سکتا۔ یہ سفرنامہ جو کہ ایک قسم کی کمیشن کی رپورٹ ہے دوستانہ تعلقات، تجارتی روابط اور یارقند کی طرز معاشرت سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے۔ مثلاً چند ہی جملوں میں ترکستان کے چند شہروں کا بھرپور تعارف کرواتے ہوئے لکھا ہے:

> ''کاشغر، یارقند، ختن اور جملہ شہر و قصبات مشرقی ترکستان کے بڑے گنجان آباد ہیں مگر اپنا کوئی کارخانہ نہیں رکھتے اور سوائے خوراک تمام ضروری اشیاء کے لیے بالکل غیر ممالک کی امداد پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ روئی کم پیدا ہوتی ہے مگر عمدہ قسم کے اور چند موٹے قسم کے پارچہ بھی بنے جاتے ہیں۔''۱۹۹

اگرچہ اس پر مترجم کا نام درج نہیں ہے لیکن اس سفرنامہ کے اسلوب بیان کی سادگی اور روانی سے احساس ہوتا ہے کہ وہ زبان اور ترجمہ نگاری کے فن سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ لہذا اس نے اچھا ترجمہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ یارقند کے طرز معاشرت کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> ''اس گھاٹی کے ایک خوشنما مقام میں بانتظار جواب داد خواہ ہم عرصہ تک بیٹھے رہے۔ یہاں ہمیں ایشیائی رسم دستر خوان ادا کرنی پڑی۔ قاسم اخواند بیگی رئیس قصبہ زنجیا کا جو گوما اور ختن کے مابین ۴۰ میل کے فاصلہ پر سڑک پر واقع ہے ہمارے کیمپ میں میوہ جات لے کر ہماری ملاقات کو آیا ہم نے خیمہ کے دروازے تک اس کا استقبال کیا اور پھر خیمہ کے اندر زمین پر فرش کے اوپر یک زانو بیٹھ گئے۔ پھر سامنے ایک دستر خوان بچھایا گیا اور بادام، کشمش، ناکھ، اکھروٹ، انجیر، سیب اور پکی

ہوئی مٹھائی رکھی گئی اور تھوڑے بسکٹ بھی منگوا کر موجود کیے۔غرض جب دسترخوان بخوبی آراستہ ہو گیا تو وہاں کا دستور ہے کہ مہمان اول ایک لقمہ روٹی یا بسکٹ توڑتا ہے۔ہم نے یہ سب کچھ کیا۔"۲۰۰

سفرناموں کے تراجم کا یہ سلسلہ "سفر دارالمصطفیٰ"۲۰۱، "سفرنامہ پروفیسر ویمبری"۲۰۲، "حالات نجد والحسا"۲۰۳ کی صورت میں جاری و ساری رہتا ہے۔نتیجتاً بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو سفر نامہ کو اپنی خشت اول تراجم سے ملی۔

ہ) مذہبی نثر:

انیسویں صدی کے وسط سے ہی لاہور میں ذہنی بے چینی اور داخلی کشمکش اپنے عروج پر تھی۔ یہاں انگریزوں کی آمد سے بیک وقت مغربی و مشرقی تہذیب و اقدار؛ جدید وقدیم نظام تعلیم اور مختلف مکتبۂ فکر کے ساتھ اسلام اور عیسائیت میں بھی کشمکش شروع ہو گئی۔ انگریز لاہور میں جیسے جیسے سیاسی طور پر مضبوط ہو تے گئے ویسے ویسے اپنے تہذیبی و مذہبی اثرات کو بھی پھیلانے کا زیادہ منظم طریقہ اختیار کرتے چلے گئے۔ بالخصوص عیسائی مشنریوں نے اس کام کو بڑے خلوص کے ساتھ انجام دیا اور یہ حقیقت ہے کہ انگریزی تہذیب وتمدن کو لاہور سمیت پنجاب بھر میں پھیلانے میں ان کا بنیادی کردار رہا ہے جس کا اصل محرک یورپ کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان میں عیسائی حکومت کی سرپرستی میں ایک مسیحی کلیسا کی بنیاد رکھی جائے۔ لاہور میں بھی ان کی مذہبی سرگرمیاں جاری رہیں۔تحریر و اشاعت کے ذریعے عیسائی مشنریوں نے اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے اردو نثر کا سہارا لیا۔ اگر چہ اس سے اردو نثر کا دامن وسیع ہوا کہ مذہبی موضوعات کی ادائیگی اور اس کے تقاضوں کو کما حقہ پورا کرنے کی صلاحیت میں اضافہ اور ایک قابل قدر ذخیرہ فراہم ہوا لیکن ان نثری تحریروں کی نوعیت زیادہ تر مناقشانہ تھی۔ اس حوالے سے دیکھیں تو اردو نثر میں مذہبی ادب کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

انیسویں صدی کے نصف اول تک لاہور میں مسلمانوں کے مذہبی ادب کے لیے فارسی اور عربی زبان استعمال کی جاتی رہی اس حوالے سے عہد مغلیہ سے رنجیت سنگھ کے عہد تک جو علماء نظر آتے ہیں ان میں سید عبداللہ لاہوری ، شیخ حمید سنبھلی، حکیم الملک گیلانی ، شیخ سعد اللہ بنی اسرائیلی، شیخ اسحاق کاکو، ملا جمال تلوی، شیخ منصور لاہوری، مولانا علاؤ الدین، شیخ منور لاہوری، شیخ مبارک ناکوری، شیخ معین لاہوری، شیخ موسیٰ حداد، ملا ہادی محمد، مولانا محمد مفتی، مولانا الہ داد لنگر خانی، قاضی صدر الدین لاہوری، ملا ابوالفتح لاہوری، ملا اسحاق کاکر لاہوری، شیخ نعمت اللہ لاہوری، شیخ نور الدین کمبوہ لاہوری، ملا ہاشم کمبوہ، ملا شمس خان کمبوہ لاہوری، ملا بایزید لاہوری، مفتی اسماعیل، ملا حسام الدین لاہوری، ملا عبدالقادر بدایونی، مولانا میر کلاں، مولانا علی احمد نشانی، ملا عبدالسلام لاہوری، میرک شیخ ہروی، ملا سید عبدالخالق، مولوی محمد سید اعجاز، مولوی عبدالحکیم گیلانی، ملا یوسف، مولانا عصمت اللہ، مولانا محمد اسماعیل سہروردی، شیخ محمد طاہر، مولانا ابوالخیر، شیخ جان اللہ، شیخ ابوالکریم چشتی لاہوری، شیخ جان محمد لاہوری، مولوی محمد صدیق لاہوری، مولانا محمد فاضل بدخشی، ملا عبدالسلام دیوی، مولانا عبداللطیف سلطان پوری، ملا یعقوب لاہوری، ملا جمال نیشاپوری، ملا جامی لاہوری، مفتی محمد باقر لاہوری، ملا عبدالحمید لاہوری، حاجی محمد سعید، ملا عصمت اللہ، مولوی نظام الدین، شاہ رضا شطاری، ملا محمد اکرم ولد یحییٰ لاہوری، شیخ عبدالعزیز، شاہ عنایت قادری شطاری، مولانا عابد لاہوری، مولانا شہریار، مولانا محمد صدیق ، حافظ روح اللہ لاہوری، خلیفہ غلام رسول و غلام اللہ، مولوی غلام

فرید، مولوی غلام محی الدین بگوی، مولوی احمد دین بگوی، مولوی غلام محمد بگوی، حفظ ولی اللہ، مولوی حافظ غلام رسول، مولوی محمد دین فوقی، جیسے صاحبان علم نے فقہ منطق، معقولات، منقولات، اصول حدیث، معانی، ادب منطق اور قرآنی علوم کی ہر شاخ پر لکھا۔

جہاں تک عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا تعلق ہے تو وہ عہد مغلیہ سے ہی پروان چڑھنا شروع ہوئیں۔[۲۰۴] عہد اکبر میں ۱۵۹۱ء میں اکبر کی دعوت پر پہلی بار یورپ سے کچھ پادری تبلیغ مذہب کے شوق میں گوا سے لاہور آئے جو جیسوٹ تھے۔ اکبر چونکہ مختلف مذاہب کو جاننے کی جستجو رکھتا تھا اس لئے ان کی خوب آؤ بھگت کی اور ان سے نہ صرف انجیل کے مطالب کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ لاہور میں انہیں اپنے مدارس قائم کرنے کی بھی اجازت دی۔ چنانچہ لاہور میں انہوں نے اپنا ایک مدرسہ قائم کیا جس میں یہ پادری عام تعلیم کے ساتھ پرتگالی زبان بھی سکھاتے تھے۔ ان کا انداز تعلیم مذہب کی بالادستی پر مبنی تھا اور تعلیم کا سارا دارومدار عیسائیت پر منحصر تھا۔ ۱۵۹۴ء میں پادریوں کا ایک اور گروہ لاہور آیا جس نے پہلے سے زیادہ سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ عیسائیت کا پرچار کیا۔ نتیجتاً کچھ لوگوں نے عیسائیت اختیار کر لی۔ یہ سلسلہ بتدریج پھیلتا چلا گیا۔ ابتدا میں ان کی سرگرمیاں تخریب کارانہ اور مناقشانہ انداز کی نہ تھیں یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں لاہور میں ان کا دائرہ اثر نسبتاً محدود رہا پھر سکھ عہد میں بھی مہاراجا کی مذہبی پالیسی کی وجہ سے کوئی خاص اثر ورسوخ حاصل نہ ہو سکا۔ جو الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے بعد حاصل ہوا۔ عیسائی مشنریوں نے اردو زبان کو سیکھا اور اس کے ذریعے اپنی مذہبی سرگرمیوں کو پھیلایا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں مذہبی ادب کا دائرہ محدود تھا اور مذہبی دل آزاری کا باعث بھی نہ تھا لیکن الحاق پنجاب کے بعد جو مذہبی ادب منظر عام پر آیا اس کی نوعیت زیادہ تر مناقشانہ مباحث اور مناظروں کی تھی کیونکہ پنجاب جیسے ہی انگریزوں کے قبضے میں آیا عیسائی مشنریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کھلی چھٹی مل گئی۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۸۷۲ء میں اردو نثر میں صرف مذہبی رسالہ جات کی تعداد ۱۹۵ تھی۔[۲۰۵] عیسائیت کے فروغ کو حکومتی سرپرستی حاصل تھی چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۲ء میں ایڈمنسٹریشن بورڈ کے سربراہ ہنری لارنس کی زیرصدارت سرکاری سرپرستی میں ''چرچ مشن ایسوسی ایشن'' کا قیام عمل میں آیا اور تقریباً ایک عشرہ بعد لاہور میں منعقدہ پنجاب مشنری کانفرنس کے موقع پر اعلیٰ سرکاری حکام اور مشنریوں کی مابین گپ شپ اور باہمی میل جول بھی اس بات کا غماز ہے کہ انگریز حکمران عیسائیت کے فروغ کے کس قدر خواہاں تھے پھر ۲۰ مئی ۱۸۵۶ء میں لندن میں لارڈ سالبری کی زیرصدارت جلسہ میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوستان میں ایک انجمن ''کرسچین ورنیکلر ایجوکیشن سوسائٹی آف انڈیا'' [۲۰۶] (Christian Vernacular Education Society of India) (عیسائی انجمن ہند برائے تعلیم السنہ ملکی) کے نام سے قائم کی جائے جو ہندوستان کے

بڑے بڑے شہروں میں درسگاہیں قائم کرے جن میں عیسائیت کے اصول اس ملک کی زبان میں سکھائے اور کتابیں عیسائی مذہب کو ملحوظ رکھ کر مرتب کی جائیں۔ یہ سوسائٹی ۱۸۵۷ء کے بعد قائم کی گئی۔ انگریز مبلغین عیسائیت کی مقدس کتابوں اور تشریحی رسالوں کا اردو ترجمہ تقسیم کرنے پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ اردو زبان میں وعظ و تلقین بھی کیا کرتے تھے۔ عیسائیت کی مذہبی کتب کے تراجم جن میں ''حیات پال'' پولس) جسے انگریزی میں مسٹر آر کسٹ (Mr. R. Cust) نے لکھا اور اس کا اردو ترجمہ پنڈت سورج بھان اور اجودھیا پرشاد نے کیا جو ۱۸۶۰ء میں لاہور سے چھپا۔۲۰۷ اس قسم کی تبلیغی کتب کو تقسیم کرنے کے علاوہ عیسائی مبلغین نے ملک کے طول وعرض میں کلیسا اور گرجا گھر اور مدرسے تعمیر کیے۔ یہاں تک کہ کیتھولکوں کی طرح ۱۸۷۵ء میں لاہور میں ایک کلب بھی قائم کیا گیا جہاں تعلیم اور دل بہلانے دونوں کا سامان تھا۔۲۰۸ نیز اردو نثر میں عیسائی ادب کو فروغ دینے کے لیے لفٹیننٹ گورنر صوبہ جات شمالی ومغربی نے عیسائی تصانیف کے لیے وظائف مقرر کیے اور عیسائی مشنریوں سے کتب لکھوائی گئیں۔ کتب کی اشاعت کے سلسلہ میں عیسائیوں نے چھاپہ خانہ بھی لگوائے۔ ''پنجاب رلیجس بک سوسائٹی'' قائم ہوئی۔ پادری رابرٹ کلارک اس کے سیکرٹری تھے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس سوسائٹی کا مقصد مذہبی کتب کی اشاعت تھا۔ اس سوسائٹی کی رپوٹوں اور یہاں چھپنے والی کتابوں کا ذکر گارساں دتاسی نے جابجا اپنے مقالات میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور میں سفیر اسقف (جو پوپ کے نائب کے مماثل تھا) متعین کیا گیا۔ جس پر غالباً فرانسس بیرنگ (Francis Baring) کو مامور کیا گیا جو پنجاب میں بطور مشنری رہ چکا تھا۔ اس نئی اسقفی کے قیام کے لیے کلکتہ کے بشپ مل مین کے نام پر مل مین میموریل فنڈ بھی قائم کیا گیا۔

چنانچہ اب عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیاں بے ضرر نہ رہی تھیں۔ دیگر مذاہب کی نسبت اسلام زیادہ اس کی زد میں آیا کیونکہ دونوں مذاہب کی کچھ اصطلاحات، عقائد و ارکان کسی حد تک مشترک اور مماثل تھے۔ لہذا مسلمانوں کو تبدیلی مذہب کے فریب میں مبتلا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ جس میں انہیں کسی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ مذہب کی تبدیلی کی اس کامیابی اور مسیحی ومشنری سرگرمیوں کا اظہار گارساں دتاسی اپنے ''خطبات'' اور ''مقالات'' میں بڑے فخر سے بیان کرتا ہے۔ تبدیلی مذہب کے اقدام کا مقصد مسلمانوں کی دینی حمیت کو زک پہنچانا تھا۔ سیاسی طور پر تو وہ پہلے ہی کامیاب ہو چکے تھے اب مسلمانوں کی دینی تنظیم کو ختم کر کے ان کی رہی سہی سیاسی یک جہتی بھی ختم کرنا چاہتے تھے۔ سرجان میلکم کا یہ بیان اسی بات کی عکاسی کرتا ہے:

> ''اس قدر وسیع سلطنت میں ہماری غیر معمولی قسم کی حکومت کی حفاظت اس امر پر منحصر ہے کہ ہماری عملداری میں جو بڑی جماعتیں ہیں ان کی عام تقسیم ہو اور پھر ایک جماعت کے ٹکڑے مختلف ذاتوں اور فرقوں اور قوموں میں ہوں۔ جب تک یہ لوگ اس طریقہ سے جدا رہیں گے اس وقت

تک غالباً کوئی بغاوت اٹھ کر ہماری قوت کا استحکام متزلزل نہ کرے گی''۲۰۹

نتیجتاً پنجاب میں ریورنڈلی، چارلس فورسٹر، پادری ڈاکٹر کارل فنڈرز، پادری لیفرائے، چارلس ولیم فورمین، این ڈبلیو گارڈن ریورنڈ ٹی-آر کلارک، ٹامس والپی فرنچ، رولینڈ، آر بٹ مین، واٹرلیٹ سٹائن، بوفائین، مسٹر مکفوش، ۲۱۰ ہنری مارٹن، جمیز، پادری عماد الدین، پادری رجب علی، ٹامس ہنٹر، ڈاکٹر جے سی آر یونگ، پادری صفدر علی، پادری رامچدر پٹیالوی اور پادری طالب الدین جیسے عیسائی مشنریوں نے اپنی مذہبی سرگرمیوں کا جال پھیلانا شروع کیا اور اسلام اور ارکان اسلام پر رکیک اور گستاخانہ حملے کیے۔ مسیحی مشنریوں کی ان کارروائیوں کا مقصد مسلمانوں کے اسلامی عقائد و تعلیمات اور مذہبی راہنماؤں پر نقطہ چینی کرنا تھا تاکہ لوگ اپنے آبائی مذہب سے بددل اور ذہنی طور پر مسیحیت قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ لاہور میں ''کوہ نور'' کے سابق مدیر مولوی میاں عبداللہ، ۲۱۱ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ عربی کے پروفیسر مولوی حسن شاہ ۲۱۲ اور ایک مطبع کے مالک سید علی شاہ ۲۱۳ نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا یہاں تک کہ ''لاہور کے ایک بوڑھے فقیر نے بھی بیعت کر لی اور وہ مسجد جس کا وہ متولی تھا پادری آر بیٹمین (R.Bateman) کو دے دی کہ اس میں مشن سکول بنا لے۔''۲۱۴
۱۸۵۷ء کے بعد ڈاکٹر سید عبداللہ مذہبی ادب کے اس رجحان کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس کا سبب کچھ تو یہ ہے کہ اس سے پہلے دور میں عیسائیوں نے کمپنی کی حمایت کے سائے میں تبلیغ عیسائیت کا جو پروگرام بنایا تھا اس کے اثرات دیر تک رہے اور کچھ اس وجہ سے کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد سیاسی سرگرمیوں کے لیے بہت کم گنجائش تھی۔ لہذا ساری توجہ ان مشاغل میں مرکوز ہوگئی''۲۱۵

اس دوران عیسائیت کے موضوع پر اور اسلام کے خلاف اردو میں جو کتابیں منظر عام پر آئیں ان میں ''تفسیر مکاشفات'' مصنفہ پادری عماد الدین جو ۱۸۷۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ ۱۴۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکاشفات یوحنا سے متعلق ہے۔ مکاشفات یوحنا جو ''بہ عہد جدید (انجیل) کے آخری باب کا نام ہے اور حضرت مسیح کے ایک حواری یوحنا کے خواب کی تفصیل پر مشتمل ہے۔''۲۱۶ پادری عماد الدین ہی کی تصنیف ''آثار قیامت''۲۱۷ (۱۸۷۰ء) جس میں قیامت کے روز مردوں کے زندہ ہونے کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے ان کی تین اور کتابیں ''اعجاز القران، تاریخ محمدی (۱۸۶۰ء) اور تحقیق الایمان'' (۱۸۶۷ء) لاہور سے چھپیں اور مذہبی دل آزاری کا باعث بنیں۔ عیسائیت کی مذہبی تعلیم پر مبنی ایک اور کتاب ''حجت الاسلام'' مصنفہ پادری رجب علی و سیموئل جونس ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔ لاہور کے ریورنڈ رابرٹ کلاک نے اردو زبان میں عیسائی مذہب پر مسیحی ادب کی کتب دتاسی کو بھیجیں جن میں ۲۱۴ صفحات پر مشتمل ایک کتاب جو پادری عماد الدین نے لکھی اور ۱۸۷۱ء میں لاہور سے شائع ہوئی جبکہ دوسری کتاب ''تعلیم محمد'' کے نام سے تھی جس کی بابت گارساں دتاسی لکھتا ہے ''عماد الدین

ایک اور دوسری کتاب تعلیم محمد کے نام سے لکھ رہے ہیں اس کتاب کے لکھنے میں بہترین دیسی ماخذ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان کے مسیحی ادب میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تبلیغ و اشاعت کے کام میں ان دونوں کتابوں سے بہت مدد ملے گی۔"۲۱۸ اردو نثر میں عیسائی ادب کو فروغ دینے کے لیے لفٹیننٹ گورنر صوبہ جات شمالی ومغربی نے اپنی جیب سے ہزار، پانچ سو، ڈھائی ہزار اور ساڑھے بارہ سو فرانک کے انعامات اس قسم کی عیسائی تصانیف کے لیے مقرر کیے۔۲۱۹

علاوہ ازیں ۱۸۷۲ء میں ریورنڈ رابرٹ کلارک نے Punjab Book and Treaty Society اور دوسری معاون مجلس بائبل (Auxiliary Bible Society) جو کتاب مقدس کے مکمل یا جزئی ترجمے شائع کرتی، کی سالانہ روداد مرتب کیں ان سے دیسی عیسائی ادب کی ترقی سے عام ادبیات کی ترقی میں خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔۲۲۰ پنجاب ریلجس بک سوسائٹی کی یکم نومبر ۱۸۷۴ء تا ۳۱ اکتوبر ۱۸۷۵ء کی رپورٹ کے مطابق اردو میں ۱۷۹۶ مذہبی کتب شائع ہوئیں۔ پادری کلارک ہی نے ۱۸۷۶ء میں "انجیل متی کی تفسیر" "خزینۃ الاسرار" اور "اعمال حواریین" کی شرح بھی شائع کی۔ اس کے علاوہ جیسکا (Jessica) کی پہلی دعا "Old Man's Home" نامی تمثیلی قصہ کا اردو ترجمہ، Dublin Script Text Book کا ترجمہ "تفصیل کلام" (بائبل کا خلاصہ) پادری کلارک کا برہمو سماج پر لیکچر کا اردو ترجمہ پادری عمادالدین نے "سوال روح و جواب الٰہی" کے عنوان سے کیا جبکہ مسٹر زینکر (Zencher) نے "عیسوی کلیسا کی تاریخ" لکھی۔۲۲۱

عیسائی مشنریوں کے اس فتنے کا مجاہدانہ سدباب کرنے کے لیے حافظ ولی اللہ لاہوری، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی فیروز الدین لاہوری، مولوی سید نصرت علی دہلوی، مولانا فقیر محمد جہلمی، مولانا الفت حسین دہلوی، مولانا رحمت اللہ عثمانی کیرانوی، مولوی رکن الدین، محمد علی بخش، مولانا قاسم نانوتوی، سید ابوالمنصور، مولوی ابو رحمت حسین، مولوی سید عماد علی اور مولوی فتح محمد قصوری جیسے جید علماء حضرات نے بھی فکری مباحثوں اور مناظروں سے ان کو منہ توڑ جواب دیا۔ حافظ ولی اللہ لاہوری جو انیسویں صدی میں پنجاب کے ممتاز ترین علماء میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی علمیت کا اظہار کنہیا لال ہندی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> "یہ ایک شخص عالم معتبر لاہور کے علماء میں سے تھا۔ انگریزی عہد میں اس نے علم پڑھا اور ترقی پائی کہ سب سے گویا سبقت لے گیا۔ مناظرے کے علم میں اس کو یہ استعداد تھی کہ بڑے بڑے پادری عیسائی اس کے روبرو بول نہیں سکتے تھے واعظ نہایت عمدہ کہتا تھا۔ باوجود نابینائی کے خدا نے دل کی روشنی اور عقل کا جوہر اس کو ایسا دیا تھا کہ سب کتابیں اس کی نوک زبان تھیں۔ حکام وقت اس کی عزت کرتے تھے اور عدالت سے فتاویٰ اسی سے طلب کیے جاتے تھے۔" ۲۲۲

حافظ ولی اللہ لاہوری نے ۱۸۶۷ء میں اپنے تحریری مناظرہ ''مباحث دینی'' کے ذریعے پادری عماد الدین کے تحریری مناظرہ کا جواب لکھا۔ ان کا یہ مناظرہ مولوی فقیر محمد جہلمی نے تکملہ اور حواشی کے ساتھ مرتب کر کے مطبع مصطفائی لاہور سے شائع کیا۔ حافظ ولی اللہ لاہور نے اپنی زبانی املا کے ذریعے اردو نثر کو عالمانہ انداز بیان عطا کیا جو سلیس ہونے کے ساتھ ساتھ مربوط بھی ہے۔ مثال کے طور پر ''مباحث دینی'' ان کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:

> ''قرآن شریف میں اخبار غیب بہت سے بیان ہوئے ہیں اور وقوع ان کا متابع قرآن شریف کے ہوتا رہا ہے چنانچہ تفصیل اخبار غیب کی کتاب تصدیق المسیح میں مفصل موجود ہے طالبان حق اسے دیکھ لیں۔ قرآن شریف میں اگلے انبیاء کی خبریں مفصل درج ہیں حالاں کہ آں حضرتؐ نے عمر بھر کسی شخص سے علم حاصل نہیں کیا۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ ضرور یہ تعلیم الٰہی ہے۔'' ۲۲۳

حافظ ولی اللہ لاہوری نے پادری عماد الدین کی ایک اور کتاب ''تحقیق الایمان'' کے جواب میں ''صیانت الاسلام دوستہ الشیطان'' ۲۲۴ (۱۸۷۳ء) اور چالیس صفحات پر مشتمل رسالہ ''ابحاث ضروری'' ۲۲۵ عیسائیوں کے رسالہ ''شکوک کفارہ'' (۱۸۷۴ء) کے جواب میں لکھا جس میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان مذہبی مباحث کو بیان کیا ہے جو ۱۸۷۸ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۷۳ء میں ''دجال مسیح'' مؤلفہ رامچندر پر فتح محمد بیگ نے محققانہ اور مدققانہ تبصرہ کرتے ہوئے کتاب میں کیے گئے اعتراضات کو رد کیا۔ مولانا محمد رکن الدین نے اپنی کتاب ''بطلان اصول مذہب عیسوی'' (۱۸۷۳ء) میں عیسائی تصانیف کے ذریعے عیسائی مذہب کی تردید کی ہے۔ لاہور ہی سے ایک اور باکمال مناظر مولوی سید محمد ابوالمنصور نے بھی ''انعام عالم در جواب آئینہ اسلام'' (۱۸۷۳ء) دو مشنریوں کی کتاب ''آئینہ اسلام'' (مطبوعہ لکھنؤ) کے جواب میں لکھی۔ اس کے علاوہ ایک اور کتاب ''یاد داشت واعظین'' ۲۲۶ مصنفہ مولوی سید نصرت علی دہلوی بھی ''آئینہ اسلام'' کی تردید میں لکھی گئی۔ سید محمد ابوالمنصور کی کتاب پر تبصرہ اور اس کی نوعیت بیان کرتے ہوئے ''اخبار پنجابی'' لکھتا ہے:

> ''انعام عالم در جواب آئینہ اسلام'' اصل میں سمیویل جونس اور رجب علی مشنریوں کی کتاب ''آئینہ اسلام'' کی جو امریکن پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے تردید ہے۔ جو ان مشنریوں نے مسلمانوں میں دو سو پچاس فرقے کیے ہیں اور لکھا ہے کہ شروع اسلام ہی سے یہ حال تھا اور ان کا دعویٰ ہے کہ عیسائی فرقوں کا یہ حال نہیں مصنف نے ان اعتراضات کا مکمل اور فیصلہ کن جواب دیا ہے۔ مشنریوں نے غلط طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان فرقوں میں سے آٹھ خدا کو نہیں مانتے۔ چودہ رسول کو اور پندرہ قرآن کو نہیں مانتے اور اسی طرح سینتیس حلقہ اسلام سے بالکل خارج ہیں۔ مولوی صاحب نے جواب میں اپنے دلائل میں یہ ثابت کیا ہے کہ عیسائیوں میں

اٹھاسی فرقے موجود ہیں جن میں سے چھ روح القدس کو نہیں مانتے، پچیس حضرت عیسیٰ کی الوہیت کے قائل نہیں آٹھ (مسلمانوں کی طرح) حضرت عیسیٰ کے مصلوب ہونے کے قائل نہیں۔ سولہ عہد نامہ قدیم وجدید (یعنی توریت وانجیل) کے آسمانی کتاب ہونے پر ایمان نہیں رکھتے اور باقی پینسٹھ فرقے ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ مصنف نے ان کتابوں کے حوالے دیئے ہیں جن کا مستند ہونا مسلمہ ہے۔ مصنف نے جو محنت برداشت کی ہے اس کی تحسین ہمارا فرض ہے کیونکہ اس کتاب کے لیے انہوں نے مختلف زبانوں کی کتابوں کے حوالے جمع کیے ہیں برخلاف اس کے ''آئینۂ اسلام'' میں جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں صفحات وسطور کی وضاحت نہیں کی گئی ہے لیکن ابوالمصور کی تصنیف میں صفحات، سطور اور جس کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی اشاعت کے سال اور مقام کی بھی تشریح کی ہے اس سے اس تصنیف کی قدروقیمت بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کتاب کو پڑھنے کے بعد مشنری پھر جواب دینے کی جرات نہیں کر سکیں گے اور ہمیں متوقع ہے کہ اس کے بعد وہ مناظرے سے دستبردار ہو جائیں گے۔''[۲۲۷]

۱۸۷۱ء میں لاہور سے ایک اور مناظراتی کتاب ''نغمہ زنبوری'' شائع ہوئی۔ ۱۱۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں پادری عماد الدین اور لکھنؤ کے ایک مولوی کا مباحثہ بیان کیا گیا ہے۔ مناظراتی اور مذہبی ادب نے اسلام کے اصولوں جوکہ توریت اور انجیل سے کہیں زیادہ صائب اور درست اساس پر قائم ہیں ان کی نشرواشاعت کی۔ نتیجتاً بہت سے ہندو اور عیسائی بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے مثلاً لاہور میں مسٹر ملول (Mr.Melvill) مسٹر جانس [۲۲۸] اپنی بیوی سمیت مسلمان ہو گئے۔ راج گڑھ کا راجا اپنی رعایا سمیت مسلمان ہو گیا۔ ایک ہندو نے مسلمان ہوکر اپنا نام محی الدین رکھا اور نومسلموں کی طرح ایک اور کتاب لاہور میں اپنے قدیم مذہب کی تردید میں ''لذت الہند''[۲۲۹] کے عنوان سے لکھی۔

مناظراتی ادب کے سلسلہ میں مولانا الطاف حسین حالی ۱۸۶۸ء میں، پادری عماد الدین کی کتاب ''تحقیق الایمان'' (۱۸۶۷ء) کے جواب میں ''تریاق مسموم'' (۱۸۶۷ء) لکھ چکے تھے۔ ۱۸۷۲ء میں اسی پادری نے ''تاریخ محمدی'' (۱۸۶۰ء) کے نام سے ایک اور کتاب لکھی۔ جس میں آپؐ پر رکیک الزامات لگائے۔ حالی نے فوراً اس کا جواب ''تاریخ محمدی پر منصفانہ رائے'' (۱۸۷۲ء) تحریر کی۔ جو مناظرے کے انداز میں ہے جس میں جذباتی انداز کی بجائے دلائل سے بات کی گئی ہے۔ ۲۵ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں حالی نے اٹھائے گئے اعتراضات کو منطقی حوالوں اور دلیلوں کے ساتھ غلط ثابت کیا ہے۔ جس سے کتاب میں تحقیق کی شان بھی پیدا ہو گئی ہے۔ نمونہ عبارت سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

''کیا یہ بات خیال میں آ سکتی ہے کہ جس شخص نے اس نہایت ناپسند اور حقیر بت پرستی کے بدلے جس میں اس کے ہم وطن مدت سے ڈوبے ہوئے تھے خدائے واحد برحق کی پرستش قائم کرنے سے بڑی بڑی دائم الاثر اصلاحیں کیں۔ مثلاً دختر کشی کو موقوف کیا نشے کی چیزوں کے استعمال کو اور قمار بازی کو جس سے اخلاق کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ منع کیا۔ بہتات سے کثرت ازدواج کا اس وقت رواج تھا۔ اس کو بہت کچھ گھٹا کر محدود کیا۔ غرض کہ کیا ایسے بڑے اور سرگرم مصلح کو ہم فریبی ہی ٹھہرا سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کی تمام کارروائی مکر پر مبنی تھی۔'' ۲۳۰

الطاف حسین حالی[۲۳۱] نے ۱۸۷۲ء ہی میں ۲۲ صفحات پر مشتمل ایک اور مذہبی کتاب ''شواہد الالہام'' کے نام سے لکھی جس میں نے الہام اور وحی کی ضرورت پر عقلی دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے نیز مثالوں کے ساتھ منطقی نتائج اخذ کرتے ہوئے عالمانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اسی زمانے میں ایک اور عالم مولوی سید عماد علی نے مسلمانوں کی مذہبی بیداری کے لیے نہایت وقیع اور قابل قدر کام ''تفسیر القرآن'' (۱۸۷۳ء) لکھ کر سرانجام دیا۔ گارساں و تاسی اپنے مقالہ ''ہندوستانی زبان و ادب'' میں اس کی بابت خبر دیتے ہوئے لکھتا ہے:

''لاہور میں مولوی سید عماد علی کی تفسیر قرآن کی طباعت شروع ہو گئی ہے۔ یہ کام بہت قابل قدر ہے کیونکہ یہ پہلی بار ہے کہ اردو میں مسلمانوں کی مقدس کتاب کی واقعی تفسیر شائع ہو رہی ہے اب تک صرف تراجم موجود تھے جن میں کہیں کہیں حاشیوں پر تشریح دی جاتی تھی۔ اس کتاب کی اشاعت بھی مسلمانوں کی بیداری کی نشانی ہے............ زیر نظر کتاب میں پہلے تو اصل آیات ہیں پھر ان کا لفظی ترجمہ (لفظی لیکن صاف اور واضح) زبان میں اور پھر تفسیر جس میں بحث اور ضروری تشریحات داخل ہیں۔'' ۲۳۲

لاہور میں مسلمانوں کی مذہبی سرگرمیوں میں مولوی سید نصرت علی دہلوی نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے نہ صرف مذہبی تصانیف لکھ کر مسلمانوں کو دین اسلام کے شعور سے بہرہ مند کیا بلکہ عیسائی مشنریوں کی تصنیفی سرگرمیوں کا بھی دانداں شکن جواب دیا۔ چنانچہ رد نصاریٰ میں ''تصحیح التاویل'' اور ''افہام و الخصام'' (۱۸۷۶ء) (دونوں کتابیں عماد الدین کی کتاب ''تفسیر مکاشفات'' کا جواب میں) ''رقیمۃ الوجود'' (پادری صفدر علی کے عیسائی مذہب کی حقانیت پر ''نیاز نامہ'' ۱۸۶۹ء کا جواب) لحن داؤدی (پادری عماد الدین کی کتاب ''نغمہ زبور'' کی تردید) ''یادداشت واعظین'' (کلکتہ کے دو عیسائیوں کی کتاب آئینہ اسلام کی تردید) ''مشلاق فی رد تہذیب الاخلاق'' (اس میں حضرت عیسیٰؑ کے جسمانی طور پر آسمان پر جانے کی تردید کی ہے) حرزجان (انبالہ کے عبداللہ ارتہام (Artaham) کی تالیف موسومہ ''رسالہ'' کا جواب) اعزاز قرآن (نو عیسائی ہندو رام چند کی اعجاز قرآن کا

جواب دیگر) ''میزان المیزان'' (پادری فنڈر PFANDER کی میزان الحق کا جواب) کے علاوہ ''مناظراتی طرز کی کتاب'' عقوبۃ الضالین'' (عیسائیوں کے بودے اور کمزور جوابات پر مسلمانوں کے قصے)، ''احسان الدلیل فی معلومات تورات والانجیل'' اور کلمۃ الحق (انجیل کے الہامی کتاب ہونے اور حضرت عیسیٰ سے متعلق کتاب) تحریر کر کے مذہبی خدمت کا فریضہ ادا کیا۔۲۳۳

اسی عہد میں حافظ ولی اللہ لاہوری کے معاصر مولوی محمد دین فوقی نے بھی مذہبی حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں اور دین و مذہب کی روشنی کو پھیلائے رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔اس حوالے سے ان کی قابل قدر تصانیف میں ''روضۃ الابرار'' ''روضہ الادبار'' ''تفسیر فتح العظیم و بتہاں الصنائع'' ''شرع محمدی'' ''بستان محمدی'' ''رسالہ درعلم منطق و فلسفہ و تاریخ ایام الجاہلیۃ'' شامل ہیں۔ان کا انداز بیان نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔''روضۃ الابرار'' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں اپنے صاحب درس ہونے کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''مسجد گیلانیاں واقعہ بلدہ لاہور میں، میں طلبہ کو درس دیتا تھا اور مسلم العلوم جو منطق کی کتاب ہے پر طلبہ کے سامنے تقریر کر رہا تھا کہ میر عبدالقادر اندرابی معہ اپنے فرزند میر عبدالغنی اور اپنے برادر زادہ سید نور الدین کے موجود تھے۔اسی وقت ایک خضر صورت مسجد میں آئے۔میری تقریر سن کر بڑی مسرت ظاہر کی اور بزبان کشمیری میر اندرابی مرحوم سے کہا اس لڑکے کی تقریر سے فضلائے کشمیر کی تقریروں کی خوشبو آ رہی ہے۔یہ نوجوان انشاءاللہ روز بروز ترقی کرے گا۔''۲۳۴

مذہبی ادب بارے آگاہی انیسویں صدی کے اخبارات سے بھی ہوتی ہے جن میں ''اخبار پنجابی'' ''رسالہ انجمن پنجاب'' ''اتالیق ہند'' اور دیگر اخبارات شامل ہیں مثلاً ''اتالیق ہند'' خبر شائع کرتا ہے کہ ''مرزا فتح محمد بیگ مشہور واعظ دین اسلام پر ایک رسالہ تیار کر رہے ہیں جو مسلمانوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگا اور اسلام کے صحیح اصول ان لوگوں کو یاد دلائے گا جو فضول خیالات اور جاہلانہ عقائد کے چنگل میں پھنسے ہوئے ہیں اور تعصبات پر پرورش پا رہے ہیں۔''۲۳۵

مذہبی علماء کے قافلے میں خلیفہ حمید الدین، مولوی نور احمد چشتی، مولوی حافظ سعد الدین، مولوی حسام الدین، مولوی غلام قادر، مولوی غلام محمد بگوی، حافظ روح اللہ لاہوری، مولوی غلام فرید، مولوی احمد دین بگوی، حافظ غلام رسول اور مولوی ممتاز علی وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے عیسائی پادریوں کی اسلام مخالف سرگرمیوں پر بند باندھا۔انھی کاوشوں میں حافظ ولی اللہ لاہوری کے تلامذہ بھی شد و مد سے شریک تھے جن میں منشی سراج الدین، منشی محمد اسماعیل، میاں عبدالعزیز، مولوی الٰہی بخش، مولوی محمد فتح محمد ہوشیارپوری، منشی عبدالکریم لاہوری محض چند ایک

نام ہیں۔

مذکورہ بالا احباب نے نہ صرف تحریر وتقریر سے عیسائی پادریوں کو قدم قدم پر شکست دی بلکہ غیر مسلموں میں مذہب اسلام کی صحیح سوجھ بوجھ بھی پیدا کی۔ مذہبی و مناظراتی ادب سے جہاں مذہبی بیداری پیدا ہوئی وہیں اردو نثر میں موضوعات اور اسلوب کی بھی نئی راہیں متعین ہوئیں جس سے اردو نثر کو مزید ترقی ملی۔

انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں اردو نثر میں مذہب پر سب سے زیادہ کتب وجود میں آئیں۔ پنجاب میں یہ کتب مسلمانوں، وہابیوں، قادیانیوں اور آریہ سماج کے درمیان قلمی جنگ کا بھی نتیجہ تھیں۔ ان کے بنیادی موضوعات تقابل قرآن و وید، حیات نبیؐ قرأت فاتحہ خلف امام، رفع یدین، آمین بالجہر، نور بشر، جمعیت حدیث، ختم نبوت وغیرہ تھے۔ الحاق پنجاب کے بعد مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کی جانب سے پہلے ہی سے اپنے مذہب و عقائد پر جارحانہ حملوں کا سامنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی متعصب اور بنیاد پرست ہندو بھی مسلمانوں کو اپنی مذہبی جارحیت کا نشانہ بنانے لگے۔ اس مقصد کے لیے آریہ سماج تنظیم (۱۸۷۵ء) کا قیام ہوا اور جلد ہی ۱۸۷۸ء میں پنجاب اس کا مضبوط گڑھ بن گیا۔ ایسے حالات میں مذہبی ادب کی تخلیق کو مزید تقویت ملی۔ انیسویں صدی کے نصف دوم کے اواخر میں جو مذہبی کتب ۲۳۶ مصنفہ شہود پر آئیں ان میں سے چند کے نام درج ذیل ہیں:

معجزہ حضرت امام جعفر صادق (میاں امیر)، ستارہ محمدی (محی الدین)، اسلام کی پہلی کتاب سے گیارہویں کتاب تک (مولوی رحیم بخش)، آفتاب محمدیؐ (فقیر محمد)، اخبار الاسلام (عبدالسلام و غلام محمد)، ہدایت المومنین (عبدالعزیز)، مرغوب احمد (نصیر الدین)، ضروریات دین (غلام محمد خان)، توضیح دلائل (غلام دستگیر)، واقعات بابا حضرت فرید الدین گنج شکر (پیر محمد حسین)، مفتاح الغیب (فقیر شہاب الدین)، نصوح المومنین فی حسن البیت والیقین (محمد فضل الدین)، گلدستہ دھرم شاستر (شیو نرائن)، پنج ارکان اسلام (سید حامد شاہ)، تحصیل المنال و اصلاح حسن المقال (مولوی مشتاق احمد)، مظہر اسلام (غلام اللہ)، مجموعہ زینت القاری (محمد عنایت احمد)، روضۃ الاصفیا وقصص الانبیاء (محمد طاہر)، مجموعہ اسرار نہانی (ملک ہیم راج)، کتاب تعویذات اردو (سید محمد صدیق حسن)، شریعت کا آرا (فتح محمد)، اسلام کا ملکی اور عدالتی انصاف (سید محمد حسین)، مسئلہ الہام (منشی جیون داس)، تحفۃ المتقین (محمد حافظ الدین)، منہاج غرہ (نصیر الدین سلیمان)، رسالہ بطلان تثلیث (محمد چراغ الدین)، فقہ محمدو فقہ احمدیہ حصہ اول (محی الدین)، رد تناسخ (نور الدین)، تشہید فی ضرورت ثبوت تقلید مصنف مولوی (مشتاق احمد)، الکلام المبین فی بیان تجہیز تکفین (سید رحمت علی) انور نعمانیہ (مولوی محمد فضل الدین) انوار محمدی (مولوی غلام مصطفیٰ) ذکر الحکیم (ابو الحکیم خانؒ) ازالہ اوہام حصہ اول و دوم (مرزا غلام احمد ملعونؒ) گیڈر نامہ (سعید اللہؒ) تعلیمات رحمانی

(مولوی عبداللہ شاہ)، نور اسلام (مولوی محمد حسن علی)، مباحثہ دینی (الٰہی بخش)،سفر سعادت اردو رسالہ اصول حدیث اردو (فقیر اللہ)، تحقیق الاسلام (مولوی غلام نبی)، تائید آسمانی در رد نشان آسمانی (منشی محمد جعفر)، ارکان خمسہ (سید ابوالقاسم)،تحفۃ المحسنین (مولوی محمد احسان)، ہدایت المہدین (نواب قطب الدین)، ستہ ضروریہ اوررسالہ اقتصاد فی ضیاد (محمد عبیداللہ)، لیکچر مسلمانوں کی نماز پر (محمد صدیق حسن)، کشف الالتباس (مولوی محمد حسین)، انہدام قادیانی و اظہار فریب قادیانی (محمد سعد اللہ)، الاخوت (خوشی محمد)، برکات الدعا، حجۃ الاسلام اور انوار الاسلام (مرزا غلام احمد ملعون)، تصدیق الاسلام از تورات و انجیل (مولوی غلام نبی) کتاب تعلیم محمدی (پادری عماد الدین)، سعادت الدارین فی اطاعت الوالدین (مولوی الٰہی بخش)، زیارت قبور (مغیث الدین)، رسالہ اظہار الہدیٰ (سید اکرام حسین)، مصباح الاسلام فی دفع الاوہام، مدح رحمانی اور قصص الکاملین (حافظ خلیل الرحمٰن)، تصدیق الاسلام (ڈاکٹر لٹینر)، رسالہ جلالیہ (سید کرم حسین)، توزین الاقوال اورترجمۃ القرآن (پادری عماد الدین)، تقدیس الرسول الطعنہ المجہول،الوہیات مسیح اور تثلیث کا رد اور عیسائیوں کی دین داری کا نمونہ (مولوی فیروز الدین)، ہماری افسوسناک حالت (لالہ گنگا رام)، اسلام (فتح محمد خان)، ترجمان وہابیہ (سید محمد صدیق)، کاشف الرہون (مولوی عبدالکریم)، نصیحت الاسلام (سید الطاف علی)، اسرار الاسلام اورالہام فطرت (غلام حیدر)، خصائل النبیؐ (مولوی ثناء اللہ)، دولت عقبیٰ (بابو عبدالقادر خان)، شف الوراء (محمد مبارک علی)، تحفہ شمیم (ہندو مذہب پر تبصرہ) (پنڈت شیو نرائن شمیم)، شرع محمدی (چار جلدوں میں) (مفتی محمد عبداللہ ٹونکی) کے علاوہ غوث الاعظم سید عبدالقادر جیلانی کی مشہور کتاب "غنیۃ الطالبین" کا اردو ترجمہ فقیر سید شہاب الدین نے کیا اور "محسن اعظم و محسنین" (حضور اکرمؐ اور اصحاب کبار کے حالات زندگی) کرنل فقیر سید وجیہہ الدین نے لکھی۔

حواشی

۱۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد سوم) لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۰

۲۔ سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر، ص: ۱۳۰ - ۱۳۱

۳۔ عبدالسلام خورشید: ''صحافت پاکستان و ہند میں'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص: ۱۱۸

۴۔ ملاحظہ ہو فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ، فارسی ادب کی تاریخ مصنفہ ڈاکٹر ظہور احمد ''پاکستان میں اردو''، ''تاریخ ادبیات مسلمان پاک و ہند'' (فارسی ادب)

۵۔ اس کے لیے فارسی ادب کی تاریخ کی کتب، ''تاریخ جلیلہ'' مصنفہ غلام دستگیر، ''اذکار قلندری'' مصنفہ قلندر شاہ، ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' مصنفہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' مصنفہ ڈاکٹر ممتاز گوہر، ''نقوش لاہور نمبر'' فہرست مخطوطات شیرانی، فہرست مخطوطات شفیع، فہرست مخطوطات عجائب گھر مرتبہ رشید احمد ملاحظہ کی جائیں۔

۶۔ ''فہرست مخطوطات شفیع'' مرتبہ ڈاکٹر محمد شبیر حسین، میں فارسی کے علاوہ جن اردو مخطوطات کا ذکر کیا ہے ان میں سے چند کی کتابت لاہور میں ہوئی۔ مثلاً ''دیوان فغان'' ۱۸۳۷ء/ ۱۲۵۳ھ (ص:۵۴۹) مثنوی سحر البیان (ص: ۵۵۰) اور فارسی تاریخ ''تاریخ پنجاب'' مصنفہ مفتی تاج الدین تک کی کتابت بھی تیرہویں صدی ہجری کے اواخر میں ہوئی۔ کتب کی قلمی کتابت کی روایت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۴۹ء سے قبل لاہور میں کوئی مطبع نہ تھا۔ مخطوطات کی فہرستیں دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کون سے مخطوطات بعد ازاں طباعت کے مرحلے سے گذرتے ہیں ان کی طباعت کی تاریخیں بھی ۱۸۴۹ء کے بعد کی ہیں۔

۷۔ ''فہرست مخطوطات شیرانی'' اور ''فہرست مخطوطات شفیع'' میں بیشتر ایسے مخطوطات ہیں جن کی طباعت مسجد وزیر خان میں ہوئی۔

۸۔ تفصیل کے ملاحظہ ہو ''پنجاب میں اردو'' ''اذکار قلندری'' ''تاریخ جلیلہ'' ''تاریخ ادب اردو (جلد دوم) ''لاہور کا دبستان شاعری''۔

۹۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص: ۴۷

۱۰۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' میں اس کا حوالہ ص: ۲۹۱ پر اس طرح درج کرتے ہیں ''گلستان سعدی مع روزنامچہ۔ بخط یکدل مملوکہ نیشنل میوزیم لائبریری، کراچی، گوہر نوشاہی بھی اس کے سن کا حوالہ درج نہیں کرتے۔

۱۱۔ ''مسرت نامہ'' ''روزنامچہ یکدل'' ''واسع باری'' ''دیباچہ دیوان سبحان اللہ حقیر، سوانح عمری مخدوم علی

ہجویری، رسالہ چہار خانوادہ، انشاء یکدلؔ ، رسالہ شمسیہ، تحفہ یکدل، وغیرہ ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' مصنفہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی۔

۱۲۔ (i) بیاض کالم اردو بخط یکدلؔ مکتوبہ ۱۸۵۸ء، (ii) رسالہ شمسیہ: بخط یکدلؔ جو کہ فارسی زبان ہی ہے لیکن اس کا دیباچہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں لکھا۔ یہ رسالہ ۱۸۶۱ء کا ہے۔ (iii) بیاض اشعار: اردو بخط مصنفہ ۱۸۶۲ء، (iv) دیوان غزلیات اردو ۱۸۶۶ء ان کی تفصیل کے لیے بھی ملاحظہ ہو ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''۔

۱۳۔ ملاحظہ ہو ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''۔

ا) دفتری، انتظامی و عدالتی اردو نثر:

۱۴۔ فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج کا قیام، اردو لغت کی کتابوں کی تیاری، اردو کو سرکاری زبان قرار دینا اور دفتری و عدالتی کارروائی اردو زبان میں کرنا، مختلف صوبوں میں محکمہ تعلیم کا قیام وغیرہ۔

۱۵۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''صحافت پاکستان و ہند میں'' مصنفہ عبدالسلام خورشید، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء

۱۶۔ رفیق یار خان یوسفی: ''عدالتی اور قانونی زبان کی حیثیت سے اردو کی وسعت اور صلاحیت'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) کراچی، جامعہ کراچی، ۱۹۹۳ء، ص: ۶۵

۱۷۔ شگفتہ زکریا، ڈاکٹر؛ ''اردو نثر کا ارتقا''، لاہور، سنگت پبلشرز، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۱۳

۱۸۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ''حالی کی اردو نثر نگاری'' لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول، دسمبر ۱۹۶۴ء، ص: ۲۲

۱۹۔ اس کا اندازہ اس ضمن میں ہونے والی خط و کتابت سے ہوتا ہے اس کے لیے ملاحظہ ہو: The Development of Urdu as Official Language, Lahore, 1849-1974

۲۰۔ ان مقدمات کے فیصلوں کی اردو نثری تحریروں کے لیے ملاحظہ ہو رفیق یار خان یوسفی کا مقالہ ''عدالتی اور قانونی زبان کی حیثیت سے اردو کی وسعت اور صلاحیت'' اور ''اردو کے قدیم عدالتی نمونے دستاویزات پنجاب کی روشنی میں'' مصنفہ میاں محمد اسلم

۲۱۔ فرح بخش فرحت، پیر: ''اذکار قلندری''، لاہور، حمایت اسلام پریس، ۱۹۵۷ء، ص: ۱۶-۱۷

۲۲۔ پنڈت لالہ اجودھیا پرشاد دہلی کے رہنے والے تھے، اجمیر کالج کے تعلیم یافتہ اور انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ دلی کالج میں مدرس ہو گئے۔ دہلی ورنیکلر، ٹرانسلیشن سوسائٹی کے لیے ''علم مساحت'' اور ''رسالہ ہیئت'' کا ترجمہ کیا۔ لاہور کے تحصیلدار اور ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن اور ''سرکاری اخبار'' (یکم مئی ۱۸۵۸ء) کے کیوریٹر اور مترجم بھی رہے۔ انگریز حاکموں نے انہی کے ذریعے ۱۸۵۰ء میں لاہور شہر کی مردم شماری کی جس کے مطابق اس وقت لاہور شہر کی آبادی پچاس ہزار تین سو پانچ تھی۔

۲۳۔ ایم اے رشید (مرتبہ) ''مفصل فہرست مخطوطات'' (جلد سوم) مشتمل بر فرامین، دستاویزات، مراسلات، مکتوبات و متفرقات، لاہور، عجائب گھر، ۱۹۷۲ء، ص: ۳۷

۲۴۔ رائے بہادر لالہ مدن گوپال، پیارے لال آشوب کے چھوٹے بھائی اور دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ بیرسٹر ہوکر لاہور آئے۔ پنجاب کے قابل وکیل خیال کیے جاتے تھے نیز کئی قانونی کتب کے مصنف بھی تھے

۲۵۔ یہ فہرست ''پنجاب میں اردو اور دفتری زبان'' مصنفہ عطش درانی، پنجاب گزٹ ۹ اپریل ۱۸۷۴ء، مقالات اور خطبات گارساں دتاسی۔ ''صوبہ شمالی و جنوبی کے اخبارات'' مصنفہ عتیق صدیقی ''جائزہ زبان اردو'' (مرتبہ) عبدالحمید، تعلیقات خطبات گارساں دتاسی، مصنفہ ڈاکٹر سلطان محمود حسین، کی مدد سے تیار کی گئی ہے۔

۲۶۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: ''تعلیقات گارساں دتاسی'' لاہور، مجلس ترقی ادب طبع اول دسمبر ۱۹۸۷ء، ص: ۲۹۶

۲۷۔ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ اول) کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء ص: ۳۵۴

۲۸۔ ''سرکاری اخبار'' کی نوعیت کی بابت دتاسی نے اپنے خطبات یکم دسمبر ۱۸۶۲ء، ۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ء، ۴ دسمبر ۱۸۶۵ء، ۳۰ دسمبر ۱۸۶۶ء میں کافی روشنی ڈالی ہے۔

۲۹۔ امداد صابری: ''اردو کے اخبار نویس'' (جلد اول)، دہلی، چوڑی والان، ۱۹۷۳ء، ص: ۲۶۲

۳۰۔ گارساں دتاسی، خطبات گارساں دتاسی (جلد اول)، (طبع دوم)، ۱۹۷۹ء، ص: ۳۵۴

۳۱۔ ۳۰ جنوری ۱۸۶۹ء کے اکمل الاخبار دہلی میں اس اخبار کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ پیارے لال آشوب اردو مولانا آزاد کی ادارت میں جاری ہوا۔ (''اردو کے اخبار نویس'' (جلد اول) مصنفہ امداد صابری، ص: ۳۷۶

۳۲۔ ''اتالیق پنجاب'' کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا میں ''اردو نثر کی ترقی میں مطابع، اخبارات و رسائل کا کردار''

۳۳۔ اشتہار کے لیے ملاحظہ ہو ''اردو کے اخبار نویس'' (جلد اول) مصنفہ امداد صابری، ص: ۳۷۶

۳۴۔ ایضاً، ص: ۳۷۷

۳۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف'' کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۱۵

۳۶۔ ''کوہ نور''، لاہور، شمارہ نمبر ۲، جلد ۳۹، ۱۸۸۷ء، ص: ۱۴

۳۷۔ اس میں سرکاری قوانین و احکام کا اردو ترجمہ اور عدالتوں کے فیصلے نقل کیے جاتے۔ ملاحظہ ہو تاریخ صحافت اردو، مصنفہ امداد صابری (جلد دوم)

۳۸۔ عطش درانی، ''پنجاب میں اردو اور دفتری زبان'' لاہور، نذیر سنز، سن ندارد، ص: ۱۷

۳۹۔ ایضاً ص: ۱۹

۴۰۔ میاں محمد اسلم: ''اردو کے قدیم عدالتی نمونے دستاویزات پنجاب کی روشنی میں'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی

زبان، ۱۹۹۱ء، ص: ۸۱-۸۲

ب) انجمن پنجاب اور اردو نثر:

۴۱۔ آغا محمد باقر: ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص:۱۲۲

۴۲۔ ڈاکٹر صفیہ بانو کے بقول سررشتۂ تعلیم کے منتظم اعلیٰ کرنل ہالرائیڈ نے ڈاکٹر لائٹنر کو اس انجمن کو قائم کرنے کی ہدایت کی تھی۔ ملاحظہ ہو ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات''

۴۳۔ انگریزی میں اس کو Society for the diffusion of useful knowledge in Punjab کہتے تھے بعض سرکاری رپورٹوں اور انجمن کے رسائل میں اسے مختصر اور عام پسند نام ''انجمن پنجاب'' کے نام سے پکارا گیا۔ ہندو لوگ اس انجمن کو ''سکشن سبھا'' یعنی حلقۂ تعلیم کے نام سے پکارتے تھے (ملاحظہ ہو خطبہ ۴۔ دسمبر ۱۸۶۵ء مشمولہ ''خطبات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)

۴۴۔ بابو نوبین چند کے یورپ جانے کے بعد ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب میں ان کے فرائض برکت علی خان نے سنبھالے۔

۴۵۔ یہ فہرست اراکین آغا محمد باقر کے مضمون ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' لاہور ۱۹۷۰ء سے لی گئی ہے۔

۴۶۔ اشفاق احمد: (مترجم) ''انجمن پنجاب کے مقاصد اور قواعد'' مشمولہ ''صحیفہ'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۰، جولائی ۱۹۶۸ء، ص: ۷۸

۴۷۔ آغا محمد باقر: ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' ص: ۱۲۶

۴۸۔ اس حوالے سے ۱۸۶۹ء میں اس موضوع پر مضامین لکھنے اور ان پر انعام دیئے جانے کا اعلان کیا گیا کل ۳۰ مضامین موصول ہوئے۔ اس حوالے سے انجمن پنجاب کی رپورٹ ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

۴۹۔ ان مجالس اور منعقدہ لیکچرز کی کارروائیوں کا ذکر ''سرکاری اخبار'' اخبار ''کوہ نور'' اور ''پنجابی اخبار'' میں ملتا ہے۔

۵۰۔ مقالہ نگار کی رائے میں یقیناً یہ ترجمہ بابو نوبین چند نے ہندی میں پڑھا ہوگا کیونکہ وہ شعبہ انگریزی کے ۱۸۷۴ء تک سیکرٹری رہے۔ گارساں دتاسی کے خطبات اور مقالات ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ بابو نوبین چند ہندی میں بھی مہارت رکھتے تھے جبکہ ڈاکٹر صفیہ بانو نے بابو نوبین چند کے نام کا حتمی تعین نہیں کیا۔

۵۱۔ خواجہ عبدالوحید: (مرتب) ''جائزہ زبان اردو پنجاب'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص:۱۲۲

۵۲۔ اس قسم کی بہتری کے حوالے سے محمد حسین آزاد کی تحریر کردہ انجمن پنجاب کی ۱۸۶۷ء کی وہ رپورٹ ملاحظہ کی جاسکتی ہے جو آغا محمد باقر نے اپنے مضمون ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ مقالات منتخبہ اورینٹل کالج

میگزین کے صفحہ ۱۴۱ پر دی ہے۔

۵۳۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' حصہ۔۔۔کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۴ء، ص: ۲۶۵

۵۴۔ آغا محمد باقر: ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' ص: ۱۷۴

۵۵۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر: ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات'' کراچی، کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء، ص: ۲۱۰

۵۶۔ دتاسی کے خطبات سے بھی کتب پر ہونے والے مباحث کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی بابت اپنے خطبہ ۲ دسمبر ۱۸۶۷ء میں لکھتا ہے:

> ''عجائب و غرائب کے متعلق لاہور کی انجمن میں خوب بحث رہی ایک جماعت کا خیال تھا کہ یہ کتاب اس لائق نہیں ہے کہ اس کو مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے۔ وجاہت علی نے اس کی بہت مبالغہ آمیز توصیف لکھی ہے'' (خطبات گارساں دتاسی (حصہ دوم) ص: ۱۶۹)

۵۷۔ آغا محمد باقر: ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' ص: ۱۳۶ تا ۱۳۸ ملاحظہ ہو۔

۵۸۔ ایضاً، ص: ۱۶۹

۵۹۔ مضمون کی عکسی نقل کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا ضمیمہ نمبر ۱

۶۰۔ یہ تفصیل آغا محمد باقر کے مضمون ''مرحوم انجمن پنجاب'' اور ڈاکٹر صفیہ بانو کی کتاب ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات'' سے لی گئی ہے۔

۶۱۔ آزاد، محمد حسین مولانا: ''نظم آزاد''، لاہور، مطبع کریمی، بار سوم، ۱۹۲۶ء، ص: ۸

۶۲۔ ایضاً، ص: ۵

۶۳۔ ایضاً، ص: ۱

۶۴۔ ایضاً، ص: ۲

۶۵۔ ایضاً، ص: ۷

۶۶۔ آغا محمد باقر: ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' ص: ۱۷۱

۶۷۔ ایضاً، ص: ۱۷۴

۶۸۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر: ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات'' ص: ۳۹۳، ۳۹۴

۶۹۔ یہ فہرست مضمون ''انجمن پنجاب'' (دوسری قسط) مترجم: اشفاق انور مشمولہ ''صحیفہ'' جنوری ۱۹۶۸ء سے مرتب کی گئی ہے۔

۷۰۔ اورئینٹل کالج یونیورسٹی لاہور کے ضمن میں ہونے والی کاوشوں کا ذکر خطبات گارساں دتاسی ۳ دسمبر ۱۸۶۶ء، ۱۸۶۷ء، ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء اور مقالات گارساں دتاسی ۱۸۷۰ء، ۱۸۷۱ء، اور ۱۸۷۲ء کے علاوہ رسالہ ''اتالیق پنجاب'' میں بھی ان کاوشوں کا ذکر ہوتا رہا ہے۔ تفصیلات کے لیے تاریخ یونیورسٹی اورئینٹل کالج لاہور (مرتبہ) ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور جدید اردو ٹائپ پریس، ۱۹۶۲ء بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

۷۱۔ امداد صابری: ''اردو کے اخبار نویس'' (جلد اول)، دہلی، چوڑی والان، ۱۹۷۳ء، ص: ۳۶۶

۷۲۔ رضیہ نور محمد: ''اردو زبان و ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء، ص: ۳۹۴

۷۳۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۲ء'' مشمولہ ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)

۷۴۔ شفیق انجم، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ'' اسلام آباد، پورب اکادمی، طبع اول، فروری ۲۰۰۸ء، ص: ۱۸

۷۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف'' کراچی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۶۵ء، ص: ۳۴۲

۷۶۔ اردو کے علاوہ فارسی ہندی، پنجابی اور سنسکرت زبان کی کتب تفصیلی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو: غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: ''پنجاب تحقیق کی روشنی میں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء، ص: ۲۱۶ تا ۲۲۵

۷۷۔ جلد اول ۱۸۷۱ء میں شائع ہوئی۔ اردو نثر کی اس کتاب میں اسلامی تاریخ اور ادب کا خلاصہ نہایت سلیس اور شستہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔

۷۸۔ یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر فائض المعانی والبیان یا فائز المعانی والبیان کے نام سے ملتا ہے۔

۷۹۔ اشفاق انور: (مترجم) ''انجمن پنجاب کے مقاصد اور قواعد'' (پہلی قسط) مشمولہ ''صحیفہ'' شمارہ ۴۰، جولائی ۱۹۶۷ء، ص: ۹۵

۸۰۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر: ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات'' ص: ۴۰۲

۸۱۔ ملاحظہ ہو ''انجمن پنجاب'' (آخری قسط) مترجم اشفاق انور، مشمولہ ''صحیفہ''، جولائی ۱۹۶۸ء، ص: ۵۹

۸۲۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں'' کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت سوم، ۱۹۹۶ء

رسالہ انجمن پنجاب

۸۳۔ گارساں دتاسی اسے ''رسالہ انجمن لاہور'' کے نام سے یاد کرتا ہے (ملاحظہ ہو خطبہ، ۷ دسمبر ۱۸۶۸ء)

۸۴۔ یکم اپریل ۱۸۷۰ء کو رسالہ کی جگہ انجمن پنجاب نے ہفت روزہ ''ہمائے پنجاب'' مولانا محمد حسین آزاد کی ادارت میں جاری کیا۔ ایک سال بعد ۱۸۷۱ء میں ''ہمائے پنجاب'' کی جگہ ''اخبار انجمن پنجاب'' کا اجراء ہوا۔ محمد حسین آزاد کے علاوہ پیر زادہ محمد حسین، سید محمد لطیف اور منشی نثار علی شہرت اس کی ادارت پر مامور رہے۔

۸۵۔ محمد حنیف شاہد : (مرتب) ''اصلیت زبان اردو'' (مقالہ) مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، ص:۵۰

۸۶۔ آغا محمد باقر: ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' ص:۱۶۲۔۱۶۳

۸۷۔ ۱۸۶۸ء تک ''رسالہ انجمن پنجاب'' کے ۳۲ نمبر شائع ہو چکے تھے۔

۸۸۔ فہرست مضامین کے لیے آغا محمد باقر کا مضمون ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' ص: ۱۶۴ تا ۱۶۶ ملاحظہ ہو۔

۸۹۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: ''کاروان صحافت'' کراچی ''انجمن ترقی اردو''، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۷

۹۰۔ مسکین حجازی، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو صحافت'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، مئی ۱۹۹۵ء ص:۱۵۹

۹۱۔ ایضاً، ص: ۱۶۳

۹۲۔ ایضاً، ص: ۱۶۴

۹۳۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: ''صحافت پاکستان و ہند میں''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء ص: ۲۵۵

۹۴۔ خواجہ عبدالوحید: ''جائزہ زبان اردو (پنجاب)''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء ص: ۱۲۴ – ۱۲۵

۹۵۔ گارساں دتاسی : ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) ص: ۱۶۴

۹۶۔ ایضاً، ص: ۲۳۱

۹۷۔ مسکین حجازی، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو صحافت'' ص: ۲۳۱

۹۸۔ امداد صابری: ''اردو کے اخبار نویس (جلد اول)'' ص: ۳۵۲

۹۹۔ ۵ جون ۱۸۷۴ء کے اخبار انجمن پنجاب میں مضمون ''اردو کی جوانی یا زندگی'' ملاحظہ ہو۔

۱۰۰۔ ۵ جنوری ۱۸۷۳ء کا اخبار انجمن پنجاب ملاحظہ ہو۔

۱۰۱۔ ۸ مئی ۱۸۷۴ء کا اخبار انجمن پنجاب ملاحظہ ہو۔

۱۰۲۔ مثلاً فحش نگاری پر پنڈت کشن لال کا مضمون ''مقیاس فحش'' دو اقساط میں بالترتیب ۲ فروری اور ۲۰ فروری ۱۸۷۴ء شائع ہوا۔

۱۰۳۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: ''صحافت پاکستان و ہند میں'' ص: ۲۵۶-۲۵۷

۱۰۴۔ صفیہ بانو، ڈاکٹر: ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات'' ص: ۱۶۵

۱۰۵۔ ایضاً، ص: ۲۰۸

۱۰۶۔ عطا الرحمٰن: ''پنجاب کی علمی و ادبی انجمنیں (انجمن مفید عام قصور)'' کراچی، نیو مجاز پریس، ۱۹۹۷ء، ص:۱۱۰

۱۰۷۔ یہ فہرست ''جائزہ زبان اردو (پنجاب)'' مرتبہ خواجہ عبدالوحید، ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف'' مصنفہ ڈاکٹر اسلم

فرخی اور ''پنجاب کی علمی و ادبی انجمنیں (انجمن مفید عام قصور) مصنفہ عطا الرحمٰن کے توسط سے تیار کی گئی ہے۔

۱۰۸۔ ان مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۷۴ء سے ۱۸۷۷ء تک آزاد نیرنگ خیال ، آب حیات اور دربار اکبری جیسی تصانیف کا ڈول ڈال چکے تھے۔

۱۰۹۔ عطاء الرحمٰن : ''پنجاب کی علمی و ادبی انجمنیں'' ص: ۱۳۸

۱۱۰۔ نثر عاری زبان کے فعل اور نتیجہ کے امتیاز پر ایک نہایت با محاورہ اور شستہ مضمون ہے۔

۱۱۱۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص: ۹۲۳

۱۱۲۔ یہ فہرست ''صحیفہ'' شارہ نمبر ۴۰ جولائی ۱۹۶۷ء کے صفحہ نمبر ۸۸ تا ۹۲ سے لی گئی ہے۔

۱۱۳۔ گارساں دتاسی کے خطبہ ۷ دسمبر ۱۸۶۸ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی روایت کی پیروی میں لاہور میں انوکھی اور دلچسپ انجمن ''انجمن حیوانات'' بھی قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ دنیا کے مختلف ممالک کے حیوانات کے نمونے جمع کیے جائیں اور ان کے خصائل و عادات کا مقابلہ اور تحقیق کی جائے۔

۱۱۴۔ انجمن پنجاب کے قیام کے بعد ہندوستان بھر میں اس کی ذیلی شاخیں قائم ہوئیں جن میں ''اسلامی انجمن'' اجمیر، ''انجمن اسلامیہ'' ہوشیار پور (پنجاب)، ''انجمن تہذیب'' کانپور، ''انجمن تہذیب'' بنگلور، دھرم سبھا، سناتن دھرم سماج، ''انجمن خیر خواہ ملک'' نور پور ضلع کانگڑہ، ''انجمن رفاہ عام'' قصبہ حاجی پور ضلع مظفر پور، ''انجمن تہذیب'' ضلع الہ آباد، ''انجمن فلاح اسلام'' سہاگ پور ضلع ہوشنگ آباد وغیرہ شامل تھیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقالات گارساں دتاسی) جبکہ پنجاب اور سرحد کے بڑے شہروں میں یہ انجمن قائم ہوئیں۔ ''انجمن فیضان عام'' گوجرانوالہ (۱۸۶۶ء)، ''مجلس اخلاقیہ امرتسر'' امرتسر، اس کا رسالہ ''مجلس اخلاقیہ'' نکلتا تھا۔ ''انجمن پشاور'' پشاور، نے اپنا اخبار ''انجمن پشاور'' جاری کیا، ''انجمن ہزارہ'' (۱۸۷۹ء) ہزارہ میں قائم ہوئی۔ امرتسر ہی میں ایک اور ''انجمن ہمدردی اسلامیہ امرتسر'' (۱۸۸۰ء) میں قائم ہوئی اور ماہوار رسالہ ''اشاعت السنّت'' جاری کیا۔ (ملاحظہ ہو جائزہ زبان اردو (پنجاب))

۱۱۵۔ اس کے لیے ''اخبار انجمن پنجاب'' کی ۴ اپریل ۱۸۷۳ء، ۳ اگست ۱۸۷۳ء، ۲ اکتوبر ۱۸۷۳ء کی اشاعتیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

۱۱۶۔ تفصیلات کے لیے مقالہ ہذا میں ''رسالہ انجمن پنجاب'' کا حصہ ملاحظہ ہو۔

۱۱۷۔ انجمن ہمدرد اسلامیہ لاہور کے اراکین کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو مضمون ''انجمن پنجاب'' مشمولہ ''صحیفہ'' جنوری ۱۹۶۸ء

۱۱۸۔ محمد حنیف شاہد: ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' لاہور، کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، جولائی ۱۹۷۶ء، ص: ۴۳

۱۱۹۔ ان کی بابت ملاحظہ ہو دتاسی کا مقالہ ''ہندوستان زبان وادب ۱۸۷۳ء''

۱۲۰۔ ایضاً

۱۲۱۔ اسے انجمن پنجاب کی معاونت حاصل تھی۔ اس انجمن کے خاص کارپرداز منشی بہاری لال تھے۔ اس سبھا کا مقصد ہندوؤں کی مذہبی اصلاح کے ساتھ علمی وادبی ترقی پر زور دینا تھا۔ ست سبھا کے اراکین کی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو مضمون ''انجمن پنجاب'' مشمولہ صحیفہ جنوری ۱۹۶۸ء

۱۲۲۔ اسے بھی انجمن پنجاب کی معاونت حاصل تھی اس کے اراکین کی فہرست کے لیے بھی مضمون ''انجمن پنجاب'' مشمولہ صحیفہ جنوری ۱۹۶۸ء ملاحظہ ہو۔

۱۲۳۔ حکیم احمد شجاع (لاہور کا چیلسی، ص ۴۲) اس بزم کی بناء کا سن ۱۸۸۵ء تحریر کرتے ہیں بعد ازاں اسی کتاب کے صفحہ ۱۷ پر ۱۸۹۵ء لکھتے ہیں جبکہ ڈاکٹر ممتاز گوہر (پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء ص ۲۰۴) اور رانا سہیل اپنے ایم فل کے مقالہ (غیر مطبوعہ) ''لاہور کی ادبی مجالس، بیسویں صدی میں قیام پاکستان تک'' میں اس بزم مشاعرہ کی بناء ۱۸۹۰ء قرار دیتے ہیں۔

۱۲۴۔ یہ لٹریری کلب نامور ادباء اور شعراء کا مسکن تھی جنہوں نے لاہور میں علمی وادبی فضا کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔

۱۲۵۔ خان احمد حسین خان کی قائم کردہ یہ بھی بزم مشاعرہ ہی تھی لیکن ۱۹۰۲ء میں مضامین پڑھنے کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ جس میں خان احمد حسین خان نے اپنا مضمون ''تہذیب نسواں'' پڑھا اور اسی موضوع پر مولوی سید ممتاز علی نے لیکچر بھی دیا۔

۱۲۶۔ انجمن مشاعرہ تھی۔ مشاعروں میں پڑھا جانے والا کلام انجمن کے ماہنامہ رسالہ ''سخن'' میں شائع ہوتا۔

۱۲۷۔ یہ انجمن چند مدارس کی تنظیم تھی جن میں دینی تعلیم اردو زبان میں دی جاتی تھی۔

۱۲۸۔ اس انجمن کے مہتمم مولوی احمد علی تھے اس انجمن کے ذمہ اسلامی عقائد سے متعلق اردو رسائل طبع کرنا تھا۔

ج) تاریخ نویسی

۱۲۹۔ سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر، لاہور، فکشن ہاؤس، جنوری ۲۰۰۲ء، ص: ۵۲

۱۳۰۔ نور احمد چشتی لاہور کے مشہور چشتی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جن کے ہر عہد میں شاہی دربار سے تعلقات رہے۔ پنجاب میں انگریزی دور شروع ہونے کے بعد لاہور میں انگریزوں کو فارسی اور اردو پڑھانے پر مامور رہے۔ اردو نثر کے مشاق ادیب کے طور پر اپنی پہچان بنائی۔ تحقیقات چشتی کے پیش لفظ میں تقریباً دو ہزار انگریز طلباء کو تعلیم دینے کا دعوی کیا گیا ہے۔ علم و فضل کی بناء پر چشتی صاحب کو انگریز سرکار میں

اثر ورسوخ حاصل تھا۔ ان کی اردو اور فارسی تالیفات میں تحفہ چشتی، تحقیقات چشتی، عجائبات چشتی اور خیالات دانش وغیرہ بھی انگریز افسران کی فرمائش اوران کے فائدے کے لیے وجود میں آئیں۔

۱۳۱۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر (پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا، ص ۸۱) ڈاکٹر گوہر نوشاہی (لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات، ص ۲۳۸) کے مطابق یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں جارج اوبارنس کے پاس خاطر لکھنے کا آغاز ہوا اور ایڈورڈ ہولوٹ اور ڈبلیو فورمین کی تشویق پر مکمل ہو کر ۱۸۵۸ء میں مطبع لاہور کرانیکل سے شائع ہوئی جبکہ افضل حق قرشی (تحقیقات چشتی مقدمہ) میں اس کا سن اشاعت کتاب کے ترقیمے کی مدد سے ۱۸۵۹ء مطبوعہ مطبع لاہور کرانیکل بتاتے ہیں ساتھی ہی یہ بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس کے سرورق پر ۱۸۵۸ء مطبوع لکھا ہے۔

۱۳۲۔ فضل حق قرشی: دیباچہ ''تحقیقات چشتی'' از مولوی نور احمد چشتی، لاہور، الفیصل، مئی ۱۹۹۳ء، ص: ۱۴۔

۱۳۳۔ نور احمد چشتی، مولوی: ''یادگار چشتی'' مرتبہ: گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء، ص: ۱۳۵

۱۳۴۔ ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا حصہ اردو نثر اور مرکز لاہور۔

۱۳۵۔ مولوی احمد بخش یکدل، ۲-نومبر ۱۸۶۷ء کو وفات پا گئے۔

۱۳۶۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء، ص: ۱۷۹

۱۳۷۔ ایضاً، ص: ۲۲۷-۲۲۸

۱۳۸۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی''، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول، ۱۹۸۷ء، ص: ۲۳۴

۱۳۹۔ ایضاً، ص: ۲۴۴

۱۴۰۔ امداد صابری: ''تاریخ صحافت'' (جلد اول)، دہلی، چوڑی والان، ۱۹۵۳ء، ص: ۱۸۶

۱۴۱۔ ایضاً، ص: ۱۸۷

۱۴۲۔ نور احمد چشتی: ''تحقیقات چشتی''، ص: ۳۸

۱۴۳۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''، ص: ۲۳۲

۱۴۴۔ نور احمد چشتی: ''تحقیقات چشتی''، ص: ۳۹

۱۴۵۔ ''تاریخ'' لاہور نمبر، ص: ۵۹

۱۴۶۔ ملاحظہ ہو مقالہ ہذا میں ''سفرنامہ امین چند''

۱۴۷۔ نور احمد چشتی: ''تحقیقات چشتی''، ص: ۱۵۹

۱۴۸۔ ایضاً، ص: ۴۱

۱۴۹۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''، ص: ۲۳۳

۱۵۰۔ نور احمد چشتی: ''تحقیقات چشتی''، ص: ۹۲

۱۵۱۔ ایضاً، ص: ۵۶۹

۱۵۲۔ ایضاً، ص: ۳۵۹-۳۶۰

۱۵۳۔ غالباً یہ وہی کتاب ہے جس کا ذکر آغا محمد باقر نے اپنے مضمون ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''منتخبہ مقالات اورینٹل کالج میگزین'' میں تواریخ افغانستان کے نام سے کیا ہے۔ یہاں اس بارے میں تفصیلی معلومات خطبات گارساں دتاسی حصہ دوم سے لی گئی ہیں۔

۱۵۴۔ سلطان محمود حسین، سید: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی''، ص: ۲۷۴

۱۵۵۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، ص: ۹۸۷

۱۵۶۔ خورشید ادا پیکر: ''رائے بہادر ماسٹر لالہ پیارے لال آشوب دہلوی'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء، ص: ۷۹

۱۵۷۔ امداد صابری: ''حیات آشوب'' دہلی، یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۶ء، ص: ۱۶۰

۱۵۸۔ امداد صابری: ''حیات آشوب''، ص: ۱۶۱

۱۵۹۔ لالہ سری رام: ''خمخانہ جاوید'' جلد اول، لاہور، مطبع منشی نولکشور، سن ندارد، ص: ۸۳

۱۶۰۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''، ص: ۱۱۳

۱۶۱۔ نقوش، لاہور نمبر، ص: ۹۸۳

۱۶۲۔ ۱۸۷۱ء میں لاہور سے چھپی۔

۱۶۳۔ ۱۸۷۶ء میں وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

۱۶۴۔ یہ تاریخ رائے کالی رائے نے اپنے بھائی تلسی رام کے ساتھ مل کر ۱۸۶۶ء میں لکھی۔

۱۶۵۔ یہ تاریخ ۱۸۹۴ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

د) نئے اردو سفرناموں کی نثر:

۱۶۶۔ منظور الٰہی ممتاز: ''اردو سفرنامے تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) لاہور، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۹ء، ص: ۶۱۱

''صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات'' مصنفہ محمد عتیق صدیقی میں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہونے والی فہرست میں اس سفرنامہ کا نام ''تحفہ کشمیر'' (۱۸۵۲ء) دیا گیا ہے نہ کہ ''یہ تحفہ کشمیر''۔

نوٹ: مقالہ نگار کے مطابق سفر نامہ کی صنف کی ابتدا ''کوہِ نور'' لاہور کے اوراق پر ۱۸۵۱ء میں نواب پیر ابراہیم خان کے ''سفرنامہ مصر'' سے ہو چکی تھی۔ چونکہ ۱۸۵۱ء کا فائل نہیں ملسکااس لیے اس سفرنامے کے مندرجات کی بابت معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۶۷۔ منظور الٰہی ممتاز: ''اردو سفرنامے تحقیقی وتنقیدی جائزہ''، ص: ۱۳۴۰

۱۶۸۔ فارسی زبان میں مہارت ہی کی بناء پر ''انجمن پنجاب'' (۱۸۶۵ء) میں شعبہ فارسی کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔

۱۶۹۔ منظور الٰہی ممتاز: ''اردو سفرنامے تحقیقی وتنقیدی جائزہ''، ص: ۶۱۳

۱۷۰۔ ایضاً، ص: ۶۱۲

۱۷۱۔ گارساں دتاسی کے خطبہ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء اور مقالہ ''ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۳ء سے امین چند کی علمی و سماجی سرگرمیوں کا بھی پتہ چلتا ہے کہ کتب کی اشاعت میں بھی دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ یوسف علی خان کا سفرنامہ یورپ اور ''فرماں روائے اندور کی سیاحت'' جیسے سفرناموں کے شائع کرنے والے امین چند ہی تھے۔ نیز ۱۸۷۳ء میں انہی کی مساعی سے اجمیر (راجپوتانہ) میں ایک انجمن ''رفاہ عام'' قائم کی گئی جس کا انگریزی نام ''سوشل ایسوسی ایشن'' تھا۔

۱۷۲۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی'' لاہور، مجلس ترقی ادب، دسمبر ۱۹۸۷ء، ص: ۲۶۵

۱۷۳۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب میں سفرنامہ'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، سن ندارد، ص: ۵۵۳

۱۷۴۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی''، ص: ۲۹

۱۷۵۔ عبدالوحید، خواجہ: (مرتب) ''جائزہ زبان اردو'' (پنجاب)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول ۲۰۰۵ء، ص: ۱۰۹

نوٹ: ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب میں سفرنامہ'' (ص: ۳۶۷) اور ڈاکٹر قدسیہ قریشی ''اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں'' (ص: ۱۲۰) میں بھی مطبع کوہ نور ۱۸۵۹ء ہی کا حوالہ ملتا ہے۔

۱۷۶۔ ''جائزہ زبان اردو'' پنجاب (ص: ۱۰۹) نور احمد چشتی ''تحقیقات چشتی'' (ص: ۶۹۱)، ڈاکٹر قدسیہ قریشی ''اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں'' (ص: ۱۲۰)، ڈاکٹر ممتاز گوہر ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' (ص: ۸۳) میں اسے ''سفرنامہ امین چند'' ہی کے عنوان سے یاد کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب میں سفرنامہ'' (ص: ۵۵۳) میں اس کا نام ''سفرنامہ منشی امین چند'' لکھتے ہیں۔

۱۷۷۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی بیگم ڈاکٹر ممتاز گوہر نے ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' میں جو حوالہ دیا ہے وہ بھی ۱۸۵۹ء مطبوعہ پنجاب پریس لاہور کا ہے نہ کہ ۱۸۵۰ء کا۔ ملاحظہ ہو ص: ۱۰۳

۱۷۸۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء، ص: ۸۳-۸۴

۱۷۹۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی''، ص: ۲۶۵

۱۸۰۔ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ اول) کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت ثانی، ۱۹۷۹ء، ص: ۱۸۶

۱۸۱۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی''، ص: ۲۹

۱۸۲۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر: ''اردو سفرنامہ انیسویں صدی میں'' لکھنؤ، نصرت پبلشرز، ۱۹۸۷ء، ص: ۱۲۰

۱۸۳۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا''، ص: ۸۳

۱۸۴۔ ایضاً، ص: ۱۰۳

۱۸۵۔ اس کے لیے ملاحظہ ہوں ''تحقیقات چشتی'' کے صفحات ۶۹۱، ۷۶۹

۱۸۶۔ امین چند: ''سفرنامہ پنجاب'' ہوشیار پور پنجاب، ن–ن، ۱۸۵۰ء، ص: ۷۳-۷۴

۱۸۷۔ نور احمد چشتی، مولوی: ''تحقیقات چشتی'' لاہور، الفیصل، مئی ۱۹۹۳ء، ص: ۷۶۹

۱۸۸۔ امین چند: ''سفرنامہ پنجاب''، ص: ۱۲۱ – ۱۲۲

۱۸۹۔ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ دوم)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت ثانی ۱۹۷۴ء، ص: ۳۶-۳۷

۱۹۰۔ امین چند: ''سفرنامہ پنجاب''، ص: ۲۷۵

۱۹۱۔ ایضاً، ص: ۱۱۷-۱۱۸

192. Salimal-din Qureshi: (compiled) "Catalogue of Urdu in the India office library 1800-1920 (supplementary to James Fuller Blumhardt's catalogue of 1900)" London, the British library board, second edition, 1991, P:210

۱۹۳۔ ڈاکٹر محمد صادق (محمد حسین آزاد احوال و آثار) ڈاکٹر محمد اسلم فرخی (محمد حسین آزاد حیات و تصانیف)

۱۹۴۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر: ''اردو سفرنامے بیسویں صدی میں'' ص ۱۵۴

۱۹۵۔ ایضاً، ص ۳۰۹

۱۹۶۔ ڈاکٹر انور سدید اس کا ذکر ''سفرنامہ فورسیاتھ'' کے نام سے کرتے ہیں (اردو ادب میں سفرنامہ، ص: ۶۸۱)

۱۹۷۔ یہ سفرنامہ ۱۸۷۲ء میں سررشتہ تعلیم اودھ کے لیے مطبع نولکشور سے بھی شائع کیا گیا۔

۱۹۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) ص: ۲۰۴

۱۹۹۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر: ''سفرنامے انیسویں صدی میں''، ص: ۱۵۲

۲۰۰۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب میں سفرنامہ''، ص: ۶۸۱

۲۰۱۔ کپتان رچرڈ فریڈرک برٹن Richard Frederick Burton کے سفرنامہ Pilgrimage to Al-Madina and Macca کا اردو ترجمہ مولوی انشاء اللہ خان انشاء نے کیا۔ (اردو سفرنامے انیسویں صدی میں)

۲۰۲۔ پروفیسر آرمینس ویمبری کے وسط ایشیا، سمرقند، بخارا، ہرات، تہران اور قسطنطنیہ کی روداد سفر ہے جسے منشی محبوب عالم نے ترجم کیا۔

۲۰۳۔ میجر ولیم بلگریو کی وسط شرق عرب کی سیاحت پر مبنی ہے جسے غالباً مولوی انشاء اللہ خان نے ترجمہ کیا۔ (اردو ادب میں سفرنامہ)

ہ) مذہبی نثر:

۲۰۴۔ اس کی تفصیلی روداد کے لیے ملاحظہ ہو ''فرنگیوں کا جال'' مصنفہ امداد صابری، علی محمد شیر میوات'' دہلی، ۱۹۷۹ء

۲۰۵۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۸۶

۲۰۶۔ ایضاً، ص: ۱۲۸

۲۰۷۔ ایضاً، ص: ۳۰۳

۲۰۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، طبع دوم، ۱۹۷۵ء، ص: ۲۲۶

۲۰۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر؛ فیاض محمود، سید: ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' (نویں جلد) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء، ص: ۵۸۸

۲۱۰۔ مذہبی قسم کا انگریز جو لاہور کے نارمل سکول کا ناظم تھا اس نے عماد الدین کو توریت، انجیل اور مذہبی جدل کی کتب کا مطالعہ کرنے میں مدد دی جس سے عماد الدین (مولوی کریم الدین کے بھائی) نے مسیحیت کا مذہب قبول کیا۔ (خطبات دتاسی، ۷ دسمبر ۱۸۶۸ء)

۲۱۱۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) ص: ۴۰۴

۲۱۲۔ ایضاً، ص: ۴۰۵

۲۱۳۔ ایضاً، ص: ۲۳۱

۲۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۲۹

۲۱۵۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید: ''اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶'' لاہور، مکتبہ خیابان ادب، (طبع اول) ۱۹۶۷ء، ص: ۶۵

۲۱۶۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) ص: ۸۸

۲۱۷۔ ایضاً

۲۱۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) ص: ۴۷۰

۲۱۹۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) ص: ۴۱۸

۲۲۰۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ ''ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۳ء'' مشمولہ ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)

۲۲۱۔ گارساں دتاسی، مقالات گارساں دتاسی (حصہ دوم)، ص: ۵۴۴

۲۲۲۔ کنہیا لال ''تاریخ لاہور'' لاہور، وکٹوریہ پریس، ۱۸۸۴ء، ص: ۷۵

۲۲۳۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا''، ص: ۱۱۵

۲۲۴۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) ص: ۳۹۲

اسی کتاب کا نام ''جائزہ زبان اردو (پنجاب)'' (مرتبہ) خواجہ عبدالوحید میں ''حیانت الانسان عن دوسۃ الشیطان'' تحریر کیا گیا ہے (ص: ۱۵۰)

۲۲۵۔ ''جائزہ زبان اردو (پنجاب)'' میں نام ''ابحث ضروری'' لکھا ہے۔

۲۲۶۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) ص: ۴۷۴

۲۲۷۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) ص: ۳۹۲-۳۹۳

۲۲۸۔ ایضاً (جلد دوم) ص: ۱۲۰

۲۲۹۔ ایضاً (جلد اول) ص: ۳۹۳

۲۳۰۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ''حالی کی اردو نثر نگاری'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۴ء، ص: ۸۰

۲۳۱۔ مولانا حالی جب لاہور پہنچے تو ان کا انداز تحریر مذہبی رنگ لیے ہوئے تھا۔ ادبیت نہ ہونے کے برابر تھی۔ لاہور میں پنجاب بک ڈپو، سر رشتہ تعلیم اور انجمن پنجاب سے منسلک ہونے کے بعد نئے رجحانات اور اثرات نے ان کے خیالات کو مزید وسعت دی۔ یہ لاہور کی ادبی فضا ہی کا اثر تھا کہ بعد ازاں ان کی جتنی بھی تصانیف منظر عام پر آئیں ان میں ادبی رنگ غالب رہا اور وہ زبان و ادب سے متعلق تھیں۔

۲۳۲۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول) ص: ۳۲۲-۳۲۳

۲۳۳۔ دتاسی نے ''پنجابی اخبار'' لاہور ۹ نومبر ۱۸۷۶ء کی اشاعت سے یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں (دیکھیے مقالات دتاسی جلد دوم، ص: ۴۷۶ - ۴۷۷)

۲۳۴۔ ''نقوش'' (لاہور نمبر) ص: ۵۳۶

۲۳۵۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) ص: ۱۹۳

۲۳۶۔ کتب کی یہ فہرست ''جائزہ زبان اردو (پنجاب)'' سے مرتب کی گئی ہے۔

کلونیل دور کی درسی کتب

اور اردو نثر

ا) محکمہ تعلیم

ب) پنجاب بک ڈپو

ا) محکمہ تعلیم:

اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر عدالتی اور دفتری امور میں رائج کرنے جیسے اقدامات نے اردو زبان کو ایک بنیاد فراہم کی یہی وجہ تھی کہ اسے باقاعدہ سرکاری و دفتری اور عدالتی زبان کے طور پر ابھارنے اور استعمال میں لانے کے لیے تعلیمی نظام نے اس کی بنیادوں کو مزید مستحکم کیا۔ اس کی تائید ہولرائڈ ڈائریکٹر تعلیمات، لاہور کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں "میرا خیال ہے جب تک اردو عدالتی زبان ہے لوگ عام طور پر اس کی تحصیل کے واسطے کوشش کریں گے"[۱] انگریز حکومت نے سیاسی و انتظامی امور میں مسائل اور مشکلات کو دور کرنے کے لیے تعلیم کی جانب توجہ دی۔ "۱۸۵۴ء کا ووڈ ڈسپیچ"[۲] برطانوی سرمایہ دار نو آبادیاتی ریاست کے مفادات کا بہترین عکاس تھا جس کے نتیجے میں مرکزی اتھارٹی کے زیر اہتمام تمام صوبوں کے لیے محکمہ تعلیم تشکیل دیے گئے۔

ہر صوبہ میں محکمہ تعلیم کا قیام مختلف اوقات میں ہوا اور وہاں تعلیم کی ترقی یا تنزلی کے اسباب مختلف رہے ہیں۔ فتح پنجاب سے قبل ایسٹ انڈیا کمپنی (جو ایک اور نئے صنعتی نظام معیشت وطرز معاشرت کا نمائندہ تھی) کے افسران برصغیر میں اپنے اقتدار کو توسیع اور طول دینے کے لیے ایک سطح پر فوجی مہم جوئی کے ذریعے نئے علاقوں پر قابض ہو رہے تھے۔ دوسری جانب ایسے ادارے قائم کیے جا رہے تھے جو کمپنی کے اقتدار اور قبضہ کو بقاو دوام بخشیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب پر قبضہ تک کمپنی کا اقتدار مستحکم ہو چکا تھا۔ لہذا پنجاب میں بھی ایک نوآبادیاتی سرمایہ دارانہ نظام معیشت و معاشرت کو رائج کیا گیا جس سے لاہور سب سے زیادہ متاثر ہوا۔

الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) سے قبل لاہور سمیت پورے پنجاب میں مدارس کا نظام چل رہا تھا۔ جن میں عربی، فارسی اور سنسکرت زبان ذریعہ تعلیم تھیں۔ مسلمانوں کا اپنا منظم اور مربوط نظام تعلیم تھا۔ جس میں مساجد علم کا مرکز ہوا کرتی تھیں ان مساجد کے ساتھ مدرسے اور مکتب کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ ان مکاتب میں مسلمان اور ہندو دونوں ہی فارسی کی تعلیم ہندو اور مسلم اساتذہ سے حاصل کرتے تھے جبکہ مدرسوں[۳] میں علماء درس دیا کرتے تھے۔ ۱۸۴۹ء سے قبل لاہور تحصیل علم کے حوالے سے مشہور تھا اس کا اندازہ ہمیں اس بات سے ہوتا ہے کہ خان بہادر ارسطو جاہ رجب علی[۴] (۱۸۰۱ء - ۱۸۹۹ء) کو ضلع لدھیانہ کی تحصیل جگراؤں سے بارہ برس کی عمر میں حصول علم کے لیے لاہور بھیجا گیا۔

لاہور کے مدارس و مکاتب میں مسلمانوں کو ان کے متداول علوم کی تعلیم عربی اور فارسی زبان میں دی جاتی تھی۔ لاہور شہر کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ۱۸۵۰ء میں ہونے والی مردم شماری سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جس میں

روایتی تعلیم کی درسگاہوں کی تعداد کچھ اس طرح بیان کی گئی ہے۔ ''اس وقت شہر میں ایک سو فارسی سکول، چھتیس عربی سکول، چوالیس عربی مشترکہ سکول اور اڑتیس شاستری سکول تھے۔''۵ انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرنے اور لاہور کو مرکز بنانے کے بعد اپنا نظام تعلیم نافذ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں ہر چند کہ برطانوی نوآبادیاتی حکام نے ۱۸۳۵ء ہی میں اپنے نظام تعلیم کے خدوخال متعین کر دیئے تھے جس کے مطابق سرکاری تعلیم کا مقصد ہندوستان میں مغربی علوم و سائنس کی اشاعت اور آئندہ سے ملک کی سرکاری زبان بھی انگریزی ہو گی۔اس قرارداد کے نتیجہ میں طلباء کے وظائف دیسی مدرسوں اور مشرقی کتب کی اشاعت کی سرکاری امداد ختم کر دی گئی اور یہ سفارش کی گئی کہ ''ان اصلاحات کے نتیجے میں حاصل ہونے والی رقوم کو مقامی آبادی کو انگریزی ادب اور سائنسی علوم انگریزی زبان کے ذریعے سکھانے کے لیے استعمال کیا جائے۔''۶ کمپنی کے سرمایہ دارانہ نظام معیشت و معاشرت کی بقا و فروغ ایسے ہی تعلیمی نظام پر قائم تھی جو انہیں نوآبادیاتی نظام حکومت و معیشت کو چلانے کے لیے کارکن اور افرادی قوت فراہم کرے۔ میکالے کے الفاظ میں ایسے افراد چاہیے تھے جو ''رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر فکر و مذاق اور دل ودماغ کے اعتبار سے انگریز ہو''۷ صاحب علم اصحاب نے انگریزوں کے اس ارادے کو بھانپ لیا تھا چنانچہ ''ایک مشہور اہل الرائے کے الفاظ میں اس نظام سے فقط ایسے اشخاص پیدا ہوئے جو محض سرکاری دفتروں میں ریلوے اسٹیشنوں پر کلرک کی حیثیت سے کام کرسکتے تھے مگر ان میں حقیقی علمی و ادبی استعداد نہ تھی''۸

ان اقدامات کا اثر یہ ہوا کہ ایک طرف مکتب اور مدرسے اجڑ گئے اور وہاں عربی و فارسی کی تعلیم منقطع ہو گئی۔ دوسری طرف اردو کے فروغ کے امکانات روشن ہو گئے کیونکہ اردو کو اس انگریزی نظام تعلیم کا مرکزی مضمون قرار دیا گیا۔اس نئے تعلیمی نظام کے نفاذ کے ضمن میں ہونے والی خط وکتابت ۹ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کوششوں کا آغاز ۱۸۵۳ء میں ہوا چونکہ اردو کو ورنیکولر زبان کی حیثیت حاصل تھی اس لیے حکومت پنجاب نے ورنیکولر نظام تعلیم رائج کرنے کی سفارش کر دی لہذا لاہور (پنجاب) میں ۱۸۵۶ء میں جب محکمہ تعلیم قائم ہوا تو اردو ہی کو بہتر ذریعہ تعلیم ورنیکولر قرار دیا گیا۔تعلیمی نظام کی بہتری کے لیے سکول کھولے گئے پہلے سے موجود تعلیمی اداروں کو سرکاری فنڈز دیئے گئے۔اس سلسلہ میں ٹھوس اقدامات کی تجویز دی گئی۔ مثلاً تعلیم کے ذریعہ تدریس کے ساتھ درسی کتب کی تیاری اور ان کی اشاعت کا بندوبست؛ مقابلے کا امتحان کا اردو میں ہونا اور مختلف ٹیسٹ اردو میں تیار کرنا۔ ان اقدامات سے تعلیمی سرگرمیوں میں تیزی آئی۔ ''لارڈ لارنس نے اپنی ایک ابتدائی رپورٹ میں تحریر فرمایا ہے کہ فی الحال جو بڑا مقصد کہ ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم اردو زبان میں دی جائے اور سب سے

پہلا کام یہ ہے کہ عام لوگوں کو ہمارے علوم کے آسان اور ابتدائی اصول انہی کی زبان میں سکھائے جائیں۔ اس زمانہ میں جبکہ ترجموں کا عام ہونا ممکن ہے"۔۱۴ چنانچہ تعلیم کی نشر واشاعت کے ساتھ ہی اردو نثر کی نشر واشاعت میں بھی تیزی آئی۔ تمام مدارس میں ذریعہ تعلیم اردو تھی جبکہ بعض مڈل سکولوں میں انگریزی اختیاری تھی۔ گویا غالب عنصر "اردو" کی تدریس کا تھا۔ یوں نظامت تعلیم نے اردو زبان و ادب اور تعلیم سے دلچسپی کا بھرپور اظہار کیا اس کے لیے ۱۸۵۷ء کے اوائل میں بک اینڈ ٹرانسلیشن ڈیپارٹمنٹ قائم کیا گیا۔ محکمہ تعلیم اور پنجاب بک ڈپو کے قیام سے دو ایسے پلیٹ فارم استعمال کئے گئے جہاں سے اردو کی ادبی نثر کے رواج کا نہ صرف آغاز ہوا بلکہ اسے فروغ دینے کے لیے مؤثر اقدامات بھی کیے بعد ازاں ۱۸۷۷ء میں درسی کتب کو نصابی سطح پر زیادہ منظم و مربوط بنانے کے لیے ٹیکسٹ بک کمیٹی کا قیام بھی اسی سلسلے کی بنیادی کڑی تھی۔

انگریز اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لیے یو۔پی سے قابل اور تجربہ کار صاحب علم افراد کو لاہور لائے۔ جن میں بیشتر دہلی کالج کے قابل اساتذہ اور ہونہار فارغ التحصیل طلباء شامل تھے۔ جن کی تعلیم وتربیت قدیم و جدید علوم سے ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہیں بدلتی ہوئی اقدار کا احساس بھی تھا جس نے انہیں زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ لاہور میں انگریزوں کو نئے علمی و ادبی ماحول کو سازگار بنانے اور اس کی ترویج و اشاعت کے لیے ایسے ہی اصحاب کی ضرورت تھی جن میں منشی ہرسکھ رائے، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولوی کریم الدین، منشی درگاہ پرشاد، پنڈت اجودھیا پرشاد، محمد حسین آزاد، میر نثار علی شہرت، پنڈت من پھول، مولوی ضیاء الدین، سیف الحق ادیب، پنڈت موتی لال، ڈاکٹر مکند لال، پنڈت شیونرائن، منشی مرزا بیگ خان دہلوی، مولوی امو جان ولی، مرزا اشرف بیگ، مولوی محمد یوسف، ماسٹر چندولال، مولوی محمد سعید دہلوی، مرزا بیگ خان دہلوی، مرزا ارشد گورگانی وغیرہ کے علاوہ مولانا الطاف حسین حالی بھی شامل تھے۔ یہی وہ قابل اور ذہین لوگ تھے جن میں سے بیشتر نے دہلی کالج کی آغوش میں تربیت پائی تھی۔ انہی نے پنجاب بک ڈپو اور محکمہ تعلیم کی سرپرستی میں اردو نثر کی گراں قدر خدمات کا فریضہ ادا کیا۔ جس سے اردو نثر میں قابلِ قدر سرمایہ وجود میں آیا۔ یہی وہ وقت تھا جب لاہور کی اردو نثر کے ارتقا میں نیا رنگ شامل ہو رہا تھا جس پر ادب کی چھاپ واضح نظر آتی ہے کیونکہ اس رنگ آمیزی سے قبل اردو نثر عدالتی، دفتری اور صحافتی سطح پر استعمال کی جا رہی تھی۔ عدالتی اور دفتری اردو نثر سے قطع نظر صحافتی حوالے سے لکھی جانے والی نثر نے اردو میں ادبی نثر کے لیے راستے ہموار کرنے کے لیے جو نمایاں کردار ادا کیا وہ ناقابل فراموش ہے۔

مذکورہ بالا اصحاب کے لاہور آنے سے اردو نثر کی صحیح معنوں میں نشوونما ہوئی اور اسے فروغ ملا۔ یہ تمام

اصحاب درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ تھے نیز انگریزی زبان میں مہارت رکھنے کی وجہ سے انگریزی سے اردو تراجم کے حوالے سے شہرت رکھتے تھے۔ انہی کی اردو نثری خدمات کی وجہ سے لاہور میں اردو نے علمی و ادبی زبان کا درجہ پایا۔ چنانچہ بجا طور پر ان اصحاب کا نام لاہور میں جدید اردو نثر کے بانیوں میں لیا جاتا رہے گا۔ بلا مبالغہ ان ادباء نے اردو نثر میں وسعت اور ترقی کے ایسے امکانات روشن کیے جن کے سہارے آج بھی اردو نثر ترقی کی منازل کامیابی سے طے کر رہی ہے۔ اس سب کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سرکاری سطح پر انہیں فلر، ہالرائیڈ اور لائٹنر جیسے علم دوست احباب کی سرپرستی میسر نہ آتی تو شاید اتنی جلد یہ ترقی ممکن ہی نہ ہو پاتی۔

۱۸۵۷ء کے سانحے کے بعد دبستان دہلی کے بہت سے شعراء اور ادبا نے لاہور کی صورت جائے عافیت اور اپنے لیے نئی جولاں گاہ کو تلاش کر لیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بالعموم پنجاب اور بالخصوص لاہور زیادہ متاثر نہ ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں ادبی سرگرمیاں اپنی رفتار سے جاری و ساری رہیں۔ گارساں دتاسی اپنے ۵۔مئی ۱۸۵۹ء کے خطبہ میں لکھتا ہے "صوبہ پنجاب فساد سے بے تعلق رہنے کی وجہ سے وہاں ادبی اشاعت میں خلل نہیں پڑا میرے دوست سید عبداللہ نے حال میں میرے پاس ایک فہرست دو سو مختلف مطبوعات کی بھیجی ہے جو لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔"[۱۱] یہ سرگرمیاں حاکم انگریز مربیان اور مذکورہ ادبا کی معاونت سے جاری رہیں۔ جن میں سے کچھ کو انگریز حکام لے کر آئے تھے اور بعض جو خود دہلی سے ہجرت کر آئے تھے۔[۱۲] انہوں نے انگریز سرکار تک رسائی حاصل کی اور اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ حکام نے بھی ان اصحاب ذوق کی سرپرستی اور مالی امداد دے کر نہ صرف انہیں اپنا ہمنوا بنا لیا بلکہ انہوں نے جو کچھ مساعی کیں انہیں اپنے نام سے شائع کیا۔ اس طرح اردو نثر کے ارتقا کے پس پردہ انگریز اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل کرتے چلے گئے۔

ہجرت جو ارتقا کا استعارہ ہے اردو نثر نے بھی اس سے قوت کشید کی۔ چنانچہ انہی ادبا کی لاہور آمد دبستان لاہور کا سنگ بنیاد قرار پائی اور لاہور ایک مستحکم ادبی روایت کا امین بنا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ نے جہاں تاریخ کا رخ یکسر بدلا وہیں لاہور میں اردو نثر کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ دتاتریہ کیفی نے بجا طور پر پنجاب سے بالعموم اور لاہور سے بالخصوص اس تعلق کو بیان کیا ہے۔

> "بدیہی واقعہ یہ ہے کہ پنجاب ان خطوں میں ہے جنھیں اردو سے خصوصیت ہے اردو کی ترقی و توسیع میں پنجاب کا جو مہتم بالشان حصہ ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ تصانیف و تالیف اور تراجم وغیرہ کی تعداد جو یہاں سے ہر سال اشاعت پاتی ہے۔۔۔ اُردو ادب اور تہذیب انشاء کے باب میں پنجاب کے شعراء اور اہل قلم کا بڑا حصہ ہے۔"[۱۳]

یوں تو لاہور میں ۱۸۵۶ء میں محکمہ تعلیم کا قیام عمل میں آچکا تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اس کی کارکردگی قدرے متاثر ہوئی۔ جبکہ محکمہ تعلیم کی اصل کارکردگی اور ترقی ۱۸۵۷ء کے بعد ہی شروع ہوئی۔ گارساں دتاسی اسی بات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتا ہے: ''شورش عظیم کے باعث اس سر رشتے کی ترقی رک گئی لیکن اب امن و امان قائم ہونے کے بعد تعلیم کو فروغ شروع ہو گیا ہے۔ بااین ہمہ سنہ ۱۸۶۰ء تک صرف ابتدائی تعلیم (ورنیکلر مدارس) کی طرف توجہ دی گئی۔ اس تاریخ کے بعد تعلیم کا خیال پیدا ہوا۔''[۱۴]

لاہور کا محکمہ تعلیم ہی ایسا محکمہ تھا جس نے اردو کے نثری ادب میں بڑھ چڑھ کر اپنی خدمات پیش کیں۔ ۱۸۶۴ء میں لاہور میں جدید تعلیم کا اہم تعلیمی ادارہ گورنمنٹ کالج لاہور کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس کے پہلے پرنسپل انگریز مستشرق ڈاکٹر لائٹنر تھے۔ سرکاری سطح پر محکمہ تعلیم کے افسران میجر اے آر فلر، کرنل ڈبلیو آر ایم ہالرائیڈ اور لائٹنر ایسے مستشرقین نے لاہور میں ادبی سرگرمیوں کو تیز کرنے میں مذکورہ مصنفین کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ باہمی اشتراک سے کتب بھی لکھیں۔ اس سے اردو کی لسانی تحریک کو بھی خاص طور پر بڑا فائدہ پہنچا۔ خصوصاً فلر اور ہالرائیڈ نے اردو زبان کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تعلیمی مدارس میں تدریسی مقاصد کے لیے درسی کتب کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا اور نصاب مرتب کیے۔ اس کے لیے قدیم اور نایاب کتب کی طباعت کے علاوہ نئی کتب لکھوانے پر بھی زور دیا۔ کیونکہ اس وقت انگریز ماہرین کے خیال میں قدیم طریقہ تعلیم ذہنی نشوونما کے لیے موزوں نہ تھا۔ ان کے نزدیک یورپین طریقہ تعلیم سے ہی بچوں کی ذہنی ترقی جلد عمل میں آ سکتی تھی۔ قدیم طریقہ تعلیم اور تدریسی سرمایے کے بارے میں گارساں دتاسی لکھتا ہے:

> ''سات سال کی عمر میں بچے کو لکھنا سکھایا جاتا ہے۔ استاد تختی پر حروف اور الفاظ لکھتا ہے۔ بچہ اس کے نیچے نقل کرتا ہے۔ چند ماہ بعد ''خالق باری'' حفظ کرائی جاتی ہے۔ خالق باری ایک چھوٹی سی منظوم لغت ہے جس میں فارسی الفاظ کے معنی اردو میں ہیں اس کے چند ماہ بعد کریما اور پند نامہ سعدی کی باری ہوتی ہے۔ آٹھ سال کی عمر میں استاد بچے کو صبح گلستان اور شام بوستان پڑھانا شروع کرتا ہے۔ سعدی کی یہ کتابیں ایران، ترکی کی طرح ہندوستان میں بھی بطور کتب مستند پڑھی جاتی ہیں۔ اگر ضرورت ہو تو استاد گوشمالی بھی کرتا ہے۔
>
> بارہ سال کی عمر میں عام طور پر نظامی کا سکندر نامہ پڑھایا جاتا اور اس کے ساتھ انشاء کی مشق کرائی جاتی اس عمر میں تھوڑی سی عربی بھی شروع کر دی جاتی لیکن اس کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ فارسی اردو تحریروں میں جو عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کے معنی سے واقفیت حاصل ہو --- بچہ جب تعلیم ختم کر کے مدرسے سے نکلتا ہے تو فارسی ادب سے واقفیت حاصل ہو جاتی

ہے۔ چند اشعار اور کہاوتیں یاد ہوتی ہیں۔تھوڑی بہت ریاضی بھی آ جاتی ہے لیکن جغرافیہ اور تاریخ میں وہ بالکل کورا ہوتا ہے۔فلسفہ یا سائنس کے بارے میں وہ ایک حرف نہیں جانتا۔ ہندوؤں کی پاٹ شالا میں بھی یہی حالت ہے۔"[۵]

مستشرقین نے اس طریقہ تعلیم میں اصلاح کی۔ گارساں دتاسی نے جابجا اپنے خطبات میں میجر فلر کی اردو زبان و ادب سے دلچسپی اور اس کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔اپنے ۴۔دسمبر ۱۸۶۵ء کے خطبہ میں فلر کی اردو زبان سے دلچسپی اور ادب کی توسیع کے لیے کاوشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "انہیں خاص ہندوستانی زبان کے ساتھ دلچسپی ہے۔ آپ نے ہندوستان کی متعدد قدیم و نایاب کتابیں طبع کرائی ہیں اور خود بھی نئی کتابیں اسی زبان میں لکھی ہیں اور لکھوائی ہیں--- بلکہ ساتھ ہی ایک ہندوستانی ماہوار رسالہ بھی شائع کراتے ہیں۔"[۶] فلر ۱۸۵۶ء میں ناظم تعلیمات پنجاب ہوئے۔ دراصل برطانوی دور میں تعلیمی میدان میں جتنی بھی ترقی ہوئی اس میں میجر فلر کی انتھک محنت کا نمایاں حصہ ہے۔فلر ہی نے تعلیم نسواں پر توجہ دی۔فلر کے دور میں ہونے والی تعلیمی ترقی کا اندازہ ان شاندار سالانہ تعلیمی رپوٹوں سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے بحیثیت ناظم تعلیمات پنجاب کے لکھیں۔فلر نے مقامی زبان و ادب کی توسیع و ترقی کے لیے آزادانہ فضا ہموار کی۔اردو نثر میں بہت سی کتابیں اور رسائل خود شائع کیے اور دوسروں سے بھی لکھوائے۔ اس کے لیے فلر نے لیفٹیننٹ سرڈی میکلوڈ کی سربراہی میں ایک کمشن بھی قائم کیا۔جس نے مفید اور بلند پایہ نثری کتب لکھوائیں نیز اپنی انگریزی تالیفوں کا اپنی نگرانی میں ترجمہ بھی کروایا۔

۱۸۶۸ء میں میجر اے آر فلر کی راولپنڈی کے قریب نالے میں ڈوبنے سے ہونے والی ناگہانی موت کے بعد کرنل ہالرائیڈ کو سررشتہ تعلیم کا ناظم تعلیمات بنا دیا گیا۔ اول اول ہالرائیڈ کا تقرر ۱۰ جنوری ۱۸۵۴ء کو درجہ اول کے افسر کی حیثیت سے ہوا۔ پنجاب کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن بھی رہے۔ ہالرائیڈ ،میجر فلر کے عہد نظامت میں ناظر مدارس (۱۸۵۷ء تا ۱۸۶۷ء)اور فلر کی عدم موجودگی (۱۸۶۷ء) میں قائم مقام ناظم کے فرائض انجام دیتے رہے۔ ہالرائیڈ کا تقرر شعبہ تعلیم کے علاوہ اردو نثر کے لیے بھی نیک فال ثابت ہوا۔ ہالرائیڈ نے اپنے عہد نظامت میں اردو زبان و ادب کی سرپرستی اور حمایت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ رکھا۔اردو زبان روانی اور بلاتکلف بولنے کی استعداد رکھتے تھے۔ ان کی کتب "قواعد اردو،تسہیل الکلام، یا آسان ہندوستانی (مرتبہ)،مسلّم الادب، ہالرائیڈ کا اردو زبان و ادب سے لگاؤ کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ہالرائیڈ کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا عہد اس لحاظ سے بھی خاص طور پر اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے بے شمار کتابیں طلباء مدارس کے لیے انگریزی سے

اردو ترجمہ کرائیں اور اردو زبان کو تراجم کے ذریعے وسعت اور فروغ دیا۔ نیز پنجاب حکومت نے اردو اخبار ''پنجاب گزٹ'' ان کی زیر نگرانی جنوری ۱۸۷۳ء [۱۷] میں جاری کیا۔ دراصل اردو کے نصاب مرتب کرنے کا باقاعدہ آغاز انہی کے دور میں ہوا اور اسے مزید بہتر بنانے کا اندازہ دناسی کے اس بیان سے ہوتا ہے:

''حکومت پنجاب ان کتابوں اور طرز نگارش کی طرف سے غافل نہیں ہے جو مدرسوں کے نصاب میں داخل ہیں۔ ایک کمیٹی اس لیے مقرر کی گئی ہے کہ ان کتابوں کی جانچ کرے اور ان میں سے جو ناقص ہوں ان کی اصلاح کرے اور جو کتابیں ناقص قرار دی جائیں گی ان کی جگہ دوسری کتابیں تجویز کرے جو ناظم تعلیمات مرتب کرائے گا۔'' [۱۸]

سید احمد دہلوی ''محاکمہ مرکز اردو'' میں ہالرائیڈ کی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''کرنل ہالرائیڈ صاحب بہادر نے ڈائریکٹری کا چارج لیتے ہی دہلی کے اہل کمال کو نہایت اعزاز سے وہاں بلا لیا اور سررشتہ تعلیم کی اردو تصانیف کو ایسا مانجھا کہ دہلی کی اصلی اور ٹکسالی زبان کا لطف آ گیا۔'' [۱۹] اگرچہ اردو نصاب (جو کہ منظوم صورت میں ہوتے تھے [۲۰]) کا سلسلہ سولویں صدی سے ملتا ہے لیکن اردو کو باقاعدہ زبان کی حیثیت دے کر اسے تعلیمی تقاضوں کے پیش نظر مرتب ہونے والے اردو کے نصاب برطانوی دور سے ہی ملتے ہیں جو زیادہ تر نثری صورت [۲۱] میں ہیں۔ اس سلسلہ میں کرنل ہالرائیڈ کے زمانہ میں نہ صرف تیزی آئی بلکہ باقاعدگی بھی نظر آتی ہے۔ اس کا احساس اس رپورٹ سے بخوبی ہوتا ہے جو ہالرائیڈ نے بحیثیت ناظم تعلیمات پنجاب کے ہر سال شائع کیا کرتے تھے جس میں پورے سال میں تصنیف ہونے والی اردو کتب اور مطبوعات کی فہرست بھی شامل کی جاتی۔ مثلاً دناسی کے خطبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۶۷ء تا ۱۸۶۸ء میں انہوں نے لاہور، دہلی اور لدھیانہ سے شائع ہونے والی ۱۵۲ کتابوں کی فہرست دی جس میں اردو کی ۱۱۹ تصانیف کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہالرائیڈ کے عہد نظامت میں اردو کتب کی اشاعت میں ہونے والی اس ترقی کو سرسید نے اپنی تقریر بمقام لاہور ۱۸۸۸ء میں سراہتے ہوئے کہا:

''میرے نزدیک نہ صرف پنجاب میں بلکہ شمال و مغربی اضلاع اور اودھ کو بھی کرنل ہالرائیڈ صاحب کا شکرگزار ہونا چاہیے انہوں نے جس قدر کتابیں چھاپی ہیں۔ میں ان کے ایک ایک فقرہ کی تعریف کرتا ہوں انہوں نے بڑا کام کیا ہے مگر جانتے ہو اس کے کرنے والے کون ہیں وہی دلی والے (آزاد اور حالی) اگر تلوار ایک اناڑی کے ہاتھ میں ہو تو کچھ کام نہیں کرتی یہ صرف ہالرائیڈ صاحب کے ہاتھ میں تھی جنہوں نے اس سے اچھے اچھے کام لیے۔'' [۲۲]

درسی کتب کے فروغ کے لیے ہالرائیڈ نے ایک انعامی مقابلے کے سلسلہ کا آغاز کیا۔ جو درحقیقت اردو

نثر ہی کے فروغ کا باعث بنا۔ خطبات گارساں دتاسی ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۶۸ء کے اوائل میں ہالرائیڈ نے یہ اعلان کیا کہ ۳۱ مارچ ۱۸۶۹ء کو اردو تصانیف کا ایک مقابلہ عمل میں آئے گا[۲۳]۔ اعلان کے مطابق چار مختلف موضوعات پر بہترین تصانیف لکھ کر اول، دوم، اور سوم انعامات حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اول آنے پر ایک ہزار روپیہ انعام کا اعلان کیا گیا تھا۔ موضوعات درج ذیل تھے۔

۱۔ عام اصول صرف ونحو

۲۔ فارسی صرف ونحو

۳۔ تاریخ ہند سے متعلق ایسی کہانیاں جن میں اہم واقعات اور مشاہیر کے مفصل حالات کا تذکرہ کیا گیا ہو

۴۔ اقلیدس کے ایک حصہ کا اردو ترجمہ

یہ انعامی مقابلہ مندرجہ ذیل دو نکات کے ساتھ مشروط تھا:

اول: تصانیف کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہو۔ اس کے لیے حتی المقدور عربی، فارسی تراکیب محاورات کے استعمال سے اجتناب کیا جائے۔

دوم: منتخب ہونے والی تصانیف محکمہ تعلیم کی ملکیت شمار کی جائیں گی نیز محکمہ کو حق ہو گا کہ وہ انہیں ضروری تغیر و تبدل کے ساتھ طباعت کے زیور سے آراستہ کرے۔

اس اقدام کے نتیجے میں فلر اور بعد ازاں ہالرائیڈ کی سرپرستی اور خصوصی دلچسپی کی بناء پر مولوی کریم الدین، پیارے لال آشوب، محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی، موتی لال، مولوی ضیاء الدین وغیرہ کی کاوشوں سے جو درسی اور تعلیمی نثری کتب وجود میں آئیں ان کی تفصیلات میں جانے سے قبل ان دستیاب کتب کا ذکر کرتے ہیں جو ۳۱ مارچ ۱۸۶۹ء کو ہالرائیڈ کے اعلان کے ردعمل میں ظہور میں آئیں۔ اس ضمن میں تین فارسی، قواعد جبکہ دو قصے مذکورہ معیار پر پورا اترے جن کے نام ملتے ہیں۔

۱۔ ''جامع القواعد فارسی'' مصنفہ مولوی کریم الدین[۲۴]

۲۔ ''اصول فارسی'' مصنفہ مولانا الطاف حسین حالی[۲۵]

۳۔ ''فارسی قواعد'' مصنفہ مولانا محمد حسین آزاد[۲۶]

۴۔ ''کنز الفوائد'' مصنفہ مولوی سعید احمد دہلوی[۲۷]

۵۔ ''خیالات کلیان بہ موسوم بہ مراۃ العقل'' مصنفہ منشی کلیان رائے[۲۸]

اس مقابلہ ہی کے ضمن میں ''قصص ہند'' (حصہ دوم) مصنفہ محمد حسین آزاد کا تذکرہ بھی کیا جاتا ہے جو کہ مقالہ نگار کے خیال میں درست نہیں ہے۔''قصص ہند'' کا کم ازکم اس مقابلے سے تعلق نہیں رہا لہذا یہاں اب تک پائی جانے والی اس غلط فہمی کا ازالہ کرنے اور شواہد اور دلائل کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے درست حقائق کو سامنے لانے کی کوشش کی جائے گی کیونکہ اس بارے قطعی اور حتمی بات کہیں بھی نہیں ملتی۔

ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق اردو کتب میں محمد حسین آزاد کی اردو نثری تصنیف ''قصص ہند''(حصہ دوم) بھی انعام کی حقدار قرار پائی لیکن اس پر کتنا انعام ملا اس بارے میں کچھ شواہد نہیں دیئے اور یہ کہ مذکورہ کتاب انعامی موضوعات کے سلسلہ نمبر۳ سے متعلق ہے جو ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی۔''قصص ہند'' تاریخ سے متعلق کہانیوں اور اہم واقعات و مشاہیر کے تفصیلی حالات سے متعلق لکھی جانے والی نصابی کتب میں سے ایک تھی۔''قصص ہند'' کی دستیاب قدیم اشاعت (۱۸۷۲ء) کو پیش نظر رکھیں تو سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

قصص ہند

حصہ دوم

پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں تالیف ہو کر لاہور کے سرکاری مطبع میں چھاپا گیا۔

۱۸۷۲ء

اس سررشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے

تعداد جلد ۱۴۰۰

شروع ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۷۱ء ختم ۲۵ جولائی سنہ ۱۸۷۲ء'' ۲۹

اب ذرا اس کے سن تصنیف کے حوالے سے مختلف بیانات ملاحظہ ہوں۔ جن میں ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' میں اس کا سن تصنیف ۱۸۶۸ء لکھا ہے۔۳۰ ڈاکٹر محمد صادق بھی ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' میں ۱۸۶۸ء ہی سے متفق ہیں۔۳۱ جبکہ ڈاکٹر اسلم فرخی اس کا سن تحریر ۱۸۶۹ء اور اشاعت ۱۸۸۳ء بتاتے ہیں۔۳۲ ساتھ ہی یہ کہ کتاب ''مقابلے'' میں ایک مضبوط امیدوار کے طور پر شامل رہی۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ بھی ڈاکٹر اسلم فرخی کے دیئے گئے سن تصنیف سے متفق دکھائی دیتے ہیں اور اپنے مضمون ''قصص ہند کا قضیہ'' میں اس کے مکمل ہونے کا سن ۱۸۶۹ء لکھتے ہیں۔۳۳ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ نے مذکورہ سن ڈاکٹر اسلم فرخی اور سرورق سمیت دیگر معلومات خلیل الرحمٰن داؤدی کی مرتب کردہ ''قصص ہند'' مجلس ترقی ادب سے لی ہیں جس کا حوالہ حواشی میں

موجود ہے لیکن وہ ان بیشتر معلومات کا تذکرہ حوالے کے بغیر ایسے کرتے ہیں جیسے یہ معلومات خود ان کی کاوش کا نتیجہ ہیں جو تحقیق کی اخلاقیات کے منافی ہے۔

مقالہ نگار خلیل الرحمٰن داؤدی کے دیئے گئے سرورق کی عبارت سے متفق ہے کہ کتاب ۱۸۷۲ء میں ۱۸۸ صفحات پر مشتمل پہلی بار اشاعت کے مرحلے سے گذری اور یہ کہ اس کے سن تصنیف کا زمانہ ۱۸۷۲ء ہے لیکن اس پر مولانا محمد حسین آزاد کا نام نہیں دیا گیا۔ یہ امر طے شدہ ہے کہ کتاب مولانا محمد حسین آزاد کی ہی تصنیف کردہ ہے لالہ سری رام ''خمخانہ جاوید'' میں لکھتے ہیں کہ ''کرنل ہالرائیڈ صاحب ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے جناب آزاد سے قصص ہند کا دوسرا حصہ لکھوایا جو مصنف کی اعلیٰ زبانی و لیاقت کی شہادت دے رہا ہے۔''[۳۴]

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مطابق ابتدائی دو طباعتوں ۱۸۷۲ء کے علاوہ ۱۸۷۳ء پر بھی محمد حسین آزاد کا نام بطور مصنف درج نہیں[۳۵] لیکن اس ضمن میں کوئی دلیل یا حوالہ نہیں دیا۔ جبکہ ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق حصہ دوم کی اشاعت اول پر آزاد کا نام بھی درج نہیں تھا لیکن بعد کے ایڈیشن میں ان کا نام درج ہو گیا۔[۳۶] یہ بعد کا ایڈیشن کونسا تھا اس کی نشاندہی وہ بھی نہیں کرتے۔ اس بیان کی روشنی میں ۱۸۷۳ء کے ایڈیشن پر مولانا آزاد کا نام درج تھا۔ قصص ہند کی دوسری اشاعت یعنی ۱۸۷۳ء پر ''انڈین میل'' بتاریخ ۳ فروری ۱۸۷۳ء میں اس پر تبصرہ شائع کیا جسے گارساں دتاسی نے بنیاد بنا کر اپنے مقالہ ''ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۳ء میں'' میں لکھا ہے کہ ''لاہور کالج کے مولوی محمد حسین آزاد نے محکمہ تعلیمات پنجاب کی سرپرستی میں قصص ہند کا دوسرا حصہ پیش کیا ہے جس میں اہم ترین شخصیتوں کے حالات حکایات کے طور پر بیان کیے ہیں اور شستہ پیرائے میں تیکھی اور بہت اچھی اردو میں قلمبند کیے ہیں۔[۳۷] اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۷۳ء میں جو اشاعت ہوئی ہو گی اس پر آزاد کا نام ضرور درج ہو گا کیونکہ اس کے بغیر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ''مولوی محمد حسین نے محکمہ تعلیمات کی سرپرستی میں قصص ہند کا دوسرا حصہ پیش کیا'' پھر اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی مقابلہ کے لئے نہیں بلکہ محکمہ تعلیم کی سرپرستی میں لکھا گیا۔ مقالہ نگار کی دسترس میں ۱۸۷۳ء کی اشاعت نہیں آ سکی لیکن دتاسی کے مذکورہ بیان سے تصدیق ہوتی ہے کہ اس اشاعت پر آزاد کا نام درج تھا۔ ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء کے تذکرہ کے ساتھ ۱۸۷۸ء کی نویں اشاعت مقالہ نگار کو میسر آئی جس پر مولانا محمد حسین آزاد کا نام درج ہے اس کی لوح کی عبارت اس طرح ہے:

قصص ہند

حصہ دوم

مرتبہ مولوی محمد حسین صاحب پروفیسر عربی لاہور

حسب الحکم

جناب میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر

مدارس ممالک پنجاب وغیرہ

لاہور کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال کیوریٹر کے

زیر اہتمام سے چھپی

۱۸۷۸ء

اس سر رشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے۔'' ۳۸

مقالہ نگار کے مطابق غالبًا یہی عبارت ''قصص ہند'' کے دوسرے ایڈیشن (۱۸۷۳ء) پر ہو گی اور ابتدائی اشاعت پر آزاد کا نام نہ ہونے کی وجہ یہ رہی ہو گی کہ چونکہ درسی کتب محکمہ تعلیم کی ملکیت تصور کی جاتی تھیں نیز محکمہ اس میں ضروری تغیر و تبدل کرنے کا بھی مجاز تھا اس لیے یہ محکمہ کی صوابدید پر تھا کہ وہ ان کتب کو جس طرح مرضی چھاپیں۔ پھر ۱۸۷۸ء کی اشاعت کے سرورق کے پیش نظر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا کہنا ہے کہ پہلی بار آزاد کا نام بطور مرتب کے شائع ہوا۔ درست نہیں رہتا کیونکہ دتاسی کے بیان کے مطابق ۱۸۷۳ء کی اشاعت پر آزاد کا نام درج تھا۔ دوسری طرف ۱۸۷۲ء، ۱۸۷۳ء اور ۱۸۷۸ء کے دستیاب شواہد سے ڈاکٹر اسلم فرخی کے اس بیان کی بھی نفی ہو جاتی ہے کہ ''قصص ہند- حصہ دوم (۱۸۶۹ء) میں لکھی گئی۔ ۱۸۸۳ء میں شائع ہوئی۔'' ۳۹

اس تمام بحث کی روشنی میں بعض تصریحات کی ضرورت ہے۔ ''قصص ہند'' اگر ۱۸۶۸ء میں ہونے والے اعلان کے مطابق ۱۸۶۸ء کی تصنیف مان لی جائے تو پھر اس کا ذکر گارساں دتاسی کے ۱۸۶۹ء کے خطبہ میں کم از کم ہونا چاہیے تھا کیونکہ دتاسی اپنے خطبات میں سال بھر میں چھپنے والی اہم تصانیف اور ان پر ملنے والے انعامات کا بالخصوص تذکرہ کیا کرتا تھا۔ گارساں دتاسی ۳۱ مارچ ۱۸۶۹ء کو ہونے والے تصنیفی کتب کے مقابلے کے موضوعات کا ذکر تو کرتا ہے جس کے مندرجات کی تیسری شق سے قصص ہند مطابقت بھی رکھی ہے لیکن انعامی مقابلے میں شرکت اور انعام کے حوالے سے اس کتاب کا تذکرہ نہیں کرتا۔ قصص ہند کا اولین ذکر مقالات گارساں دتاسی (جلد اول) کے مقالہ ''ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۳ء میں'' ملتا ہے۔ ۴۰ جبکہ اس سے قبل ۱۸۷۰ء، ۱۸۷۱ء، ۱۸۷۲ کے مقالات میں اس کا ذکر نہیں کرتے۔ اس لیے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ ''قصص ہند'' مقابلے کے مندرجات سے مطابقت رکھنے کے باوجود انعامی مقابلے کے لیے نہیں لکھی گئی اور نہ ہی اس پر انعام ملا۔ دتاسی کے مقالات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۳۱ مارچ ۱۸۶۹ء کے بعد بھی اردو کتب کی تصنیف و تالیف کی حوصلہ افزائی کے

لیے انعامات اور معاوضوں کا سلسلہ جاری رہا۔ چنانچہ۱۸۷۲ء کے مقالہ میں لکھتے ہیں: ''ہندوستانی میں کارآمد کتابیں تالیف کرانے کی ہر طرف ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے لیے جو انجمن قائم ہے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ہندوستانی زبان میں لکھنے والے مصنفین کو پانسو، تین سو اور ڈیڑھ سو روپے کی رقمیں ان کی کتابوں کے معیار اور ضخامت کے لحاظ سے بطور معاوضہ دی جائیں۔''[۴۱] گارساں دتاسی اس ضمن میں مزید لکھتا ہے:

> ''حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ جو لوگ ہندوستانی زبان میں (اردو میں یا ہندی میں) فلسفہ، تاریخ، سیاست یا سائنس وغیرہ پر کوئی کتاب تالیف کریں گے انہیں ان کی محنت کا معاوضہ دیا جائے گا۔ بشرطے کہ کتاب کا طرز بیان دلکش اور عام فہم ہو اس کی بھی اجازت ہوگی کہ کتاب نظم میں لکھی جائے یا نثر میں۔ اگر کوئی چاہے تو ایسے موضوع پر قلم اٹھائے جو بالکل خیالی ہو بشرطے کہ اس میں کوئی بات ایسی نہ آنے پائے جو اخلاقی نقطہ نظر سے گری ہوئی ہو یا فرقہ وارانہ اغراض کے لیے لکھی گئی ہو۔ ۱۸۷۱ء اور ۱۸۷۲ء میں ہندی اور اردو کی ۲۲ کتابیں کمیشن نے پسند کیا جو خاص اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ان کتابوں کے مصنفین کو ۸ مئی ۱۸۷۲ء الہ آباد میں لیفٹیننٹ گورنر نے انعامات تقسیم کیے۔ بعض نے معقول رقمی معاوضہ قبول کیا۔ بعض نے اپنی کتاب حکومت کے خرچ پر طبع کرانے کی خواہش ظاہر کی اور بعض نے یہ کہ ان کتابوں کے نسخوں کی ایک خاص تعداد حسب ضرورت حکومت مدارس کے لیے خرید لے۔''[۴۲]

اس حوالے سے گارساں دتاسی نے جن چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں قصص ہند کا ذکر نہیں ملتا۔ چنانچہ قصص ہند نہ تو کسی مقابلے کے لیے اور نہ ہی انعام کی غرض سے لکھی گئی۔ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ یہ ۱۸۶۹ء میں مکمل ہوئی تو اس کا ذکر دتاسی کے ۱۸۷۰ء اور ۱۸۷۱ء کے مقالات میں نہ سہی ۱۸۷۲ء کے اس مقالہ میں تو ''قصص ہند'' کا ذکر آنا چاہیے تھا جس میں بہترین کتابوں پر حکومت کی طرف سے ۸ مئی ۱۸۷۲ء کو انعامات دیئے گئے اور اگر ۱۸۶۹ء میں کتاب مکمل ہو بھی چکی ہو تو اس کے ۱۸۷۲ء میں چھپنے کی کیا وجوہ تھیں۔ جبکہ مطابع کے قیام سے مکمل ہونے کے بعد بروقت طباعت کا مسئلہ بھی نہ رہا تھا۔ حکومت تو ایسی کتابوں کو اپنی سرپرستی میں شائع کراتی تھی۔ اس پہلو پر کسی بھی صاحب الرائے نے روشنی نہیں ڈالی۔ لہٰذا ۱۸۷۲ء کی اشاعت کے سرورق پر یہ جملہ ''شروع ۲۵ دسمبر ۱۸۷۱ء ختم ۲۵ جولائی ۱۸۷۲ء'' درست معلوم ہوتا ہے جو سال تصنیف اور سال اختتام کی نشاندہی کرتا ہے۔ ان نکات کی بناء پر مقالہ نگار یہ نتائج اخذ کرتی ہے:

۱۔ ''قصص ہند'' حصہ دوم کسی مقابلے کے لیے نہیں لکھی گئی۔ اس کی تصدیق اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ

اس سلسلہ کی پہلی کتاب ''قصص ہند'' (حصہ اول) مصنفہ پیارے لال آشوب بھی تاریخ کے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔ اس کا پہلا سن اشاعت بھی ۱۸۷۲ء ہے لیکن جہاں کہیں بھی کسی مقابلے یا انعام کا تذکرہ آتا ہے وہاں اس کا تذکرہ بھی نہیں ملتا۔ چنانچہ قصص ہند حصہ اول پیارے لال آشوب کو اور حصہ دوم محمد حسین آزاد کو لکھنے کے لیے تفویض کیا گیا۔[۴۳] دونوں کتابیں پہلی بار ۱۸۷۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ نیز یہ معمول کی درسی و تدریسی ضروریات کے پیش نظر لکھوائی گئیں۔ کسی انعام یا مقابلے سے ان کے کسی تعلق کے شواہد نہیں ملے۔

۲۔ مقالہ نگار کا استدلال ہے کہ ''قصص ہند'' کے موضوع اور اسلوب بیان کا مطالعہ کریں تو اس کا متن اس بات کی دلیل ہے کہ اگر یہ کسی انعامی مقابلے کی غرض سے لکھی گئی ہوتی تو یقیناً انعام کی حقدار قرار پاتی اور اس کا تذکرہ دیگر انعام یافتہ کتب میں ضرور کیا جاتا کیونکہ اس عرصہ میں محمد حسین آزاد محکمہ تعلیم کے افسران پر اپنی علمیت کی دھاک بیٹھا چکے تھے لیکن اس کے باوجود مقابلے اور انعام کے حوالے سے ایسا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہو سکا۔ لہذا اس سے بھی یہ خیال تقویت پاتا ہے کہ ''قصص ہند'' محکمہ تعلیم کی درسی ضروریات یعنی طلباء کو تاریخی معلومات بہم پہنچانے کے لیے تحریر کی گئی۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے محکمہ تعلیم کے انگریز افسران نے اعلیٰ اذہان اور صلاحیتوں کے مالک قابل اور تجربہ کار احباب کو محکمہ تعلیم میں ملازمت پر مامور کیا ہوا تھا۔

۳۔ قصص ہند ۲۵ جولائی ۱۸۷۲ء کو مکمل ہونے کے بعد اسی سال پہلی بار شائع ہوئی اس لیے اس کا تذکرہ گارساں دتاسی نے بھی اپنے ۱۸۷۳ء کے مقالہ میں کیا ہے۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کے مطابق ''پنجاب گورنمنٹ گزٹ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۲ء میں قابل فروخت مطبوعہ کتب کی فہرست میں قصص ہند حصہ اول و دوم دونوں دستیاب تھیں۔''[۴۴] نیز مقالہ نگار کو پنجاب گزٹ بتاریخ ۹ اپریل ۱۸۷۴ء کی جو فہرست کتب دستیاب ہوئی ہے اس میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ یہ بھی دلیل ہے کہ ۱۸۷۳ء میں بھی ''قصص ہند'' چھپی ہو گی۔

۴۔ محمد حسین آزاد نے یہ کتاب ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب میجر ہالرائیڈ کے حکم سے محکمہ تعلیم کی سرپرستی میں لکھی۔ جس کی تصدیق سرورق کے علاوہ لالہ سری رام اور گارساں دتاسی کے بیان سے ہوتی ہے۔

۵۔ یہ کتاب محکمہ تعلیمات پنجاب کی سرپرستی میں لاہور کے سرکاری مطبع سے چھپی۔

۶۔ نصابی کتب کے سلسلہ میں بے حد مقبول درسی کتاب تھی۔

۷۔ کتاب کی ایک اور اشاعت ۱۸۷۶ء کا تذکرہ دتاسی کے مقالہ ۱۸۷۶ء میں بھی ملتا ہے۔

۸۔ کتاب کا موضوع ''تاریخ'' ہے جس کو قصے کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ غالباً یہی محققین کے لیے اس مغالطے کی وجہ رہی ہے کہ کتاب ۳۱ مارچ ۱۸۶۹ء کے مقابلے کے لیے دیئے جانے والے مندرجات کی تیسری شق سے مطابقت رکھنے کی بناء پر اس مقابلے کے لیے لکھی گئی ہو گی۔

۹۔ کتاب ''قصص ہند'' تاریخ اور تخیل کے امتزاج سے واقعات کو عمدگی اور بہترین اسلوب میں بیان کرنے کے باوجود اس پر کسی انعام کا تذکرہ نہیں مل سکا۔

۱۰۔ ''قصص ہند'' چونکہ تین مختلف حصوں پر مشتمل ہے جس کا حصہ اول اور سوم پیارے لال آشوب کیوریٹر پنجاب بک ڈپو کا تحریر کردہ ہے اور حصہ دوم محمد حسین آزاد کی تحریر ہے اس لیے ان تینوں حصوں کو بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ میجر ہالرائیڈ نے تاریخ کے موضوع پر ان سے یہ کتابیں لکھوائیں یوں انہیں فرمائشی کتب کہا جائے گا۔ جس میں ہندوؤں کی تاریخ، اسلامی تاریخ، اور انگریزی تاریخ کی صورت تینوں اقوام کی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ تینوں حصے گو کہ مربوط و مفصل تاریخ پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف چیدہ بادشاہوں کے کارناموں کو تاریخی قصوں کی صورت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ طالب علموں کا تاریخ اور تاریخی مشاہیر سے ایک بھرپور تعارف ہو سکے تاکہ ان میں تاریخ سے آشنائی اور دلچسپی کا عنصر پیدا ہو جائے اور یہی اس کتاب کا اصل مقصد تحریر تھا۔

۱۱۔ ''قصص ہند'' (حصہ دوم) کی زبان سادہ اور عام فہم ہے جس میں فارسی الفاظ اور تراکیب کم استعمال ہوئی ہیں۔

۱۲۔ کتاب پر مرتب کا لفظ اس لیے لکھا گیا کہ تاریخی واقعات اور مشاہیر کا تذکرہ تاریخی کتب میں پہلے سے موجود ہے لیکن محمد حسین آزاد نے کہانی کی طرز پر انہیں اپنے منفرد اسلوب میں ترتیب دیا ہے۔

قصص ہند (حصہ دوم) محکمہ تعلیم کے لیے لکھی جانے والی کتب میں خاص اہمیت کی حامل تھی۔ جس میں غزنوی سلطنت کی ابتداء سے نادر شاہ کے حملے تک کے معدودے چند بادشاہوں کے کارنامے اور تاریخ کو قصے کہانی کی صورت میں بیان کیا ہے۔ ہر چند کتاب کا مقصد نوعمر طلباء کو اہم تاریخی مشاہیر سے روشناس کرانا تھا لیکن اس کے اسلوب کی دلکشی، سادگی اور پرکاری نے اسے دلچسپ ادبی نثر کی کتابوں میں صف اول میں لا کھڑا کیا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق کا کہنا درست ہے:

> ''اگلے وقتوں کی عجیب و غریب فضا انسانی فطرت کی سچی عکاسی، قصے کا قدرتی ارتقا، شگفتہ اور غیر ضروری آرائش سے پاک عبارت یہ باتیں ''قصص ہند'' کو اردو میں منفرد تصنیف بنا دیتی ہیں۔

آزاد کالاابالی تخیل جو ان کی دوسری تصانیف میں مخل انداز ہوتا ہے یہاں اعتدال اور ضبط سے بروئے کار آیا ہے یہی سلجھا ہوا تخیل ہے جس نے اس کتاب کوفنی حیثیت سے اتنا وقیع بنادیا ہے۔"۴۵

اردو نثر میں تاریخ نگاری کا آغاز کرنے والوں میں محمد حسین آزاد سرفہرست ہیں۔ لاہور میں اردو تاریخ نگاری کی ترغیب تعلیمی ضرورت کے تحت ہالرائیڈ نے دلائی اور اس کو پیارے لال آشوب نے حصہ اول اور سوم جبکہ مولانا آزاد نے حصہ دوم کی صورت میں عملی جامہ پہنایا۔ دونوں کتابیں ۱۸۷۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آئیں۔ آشوب نے سیدھا سادا شستہ اور آزاد نے محاکاتی اسلوب اپنایا۔ چنانچہ تخیل اور محاکات نگاری سے عمدہ کام لے کر آزاد نے مسلمانوں کے عہد حکومت کے جن منتخب واقعات کو بیان کیا ہے ان کی تصاویر من وعن قاری کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس میں آزاد نے جو پیرایہ بیان اختیار کیا ہے تاریخ کی کتب کے لیے سقم قرار دیا جا سکتا ہے کیونکہ عام طور پر تاریخی کتب کے لیے مورخ ایسا اسلوب اختیار نہیں کرتا۔ آزاد نے ''قصص ہند'' طالب علموں کے لیے لکھی اور بحیثیت مدرس کے وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ وہ کون سا طریقہ کار ہو سکتا ہے جس کے ذریعے نوعمر طالب علم اردو نثر میں پورے ذوق وشوق کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ دلچسپی سے کر سکتے ہیں۔ تاریخ جیسے خشک موضوع میں تاریخی شخصیات کی مرقع کشی اور واقعات میں تخیل اور محاکات کی گنجائش پیدا کر کے آزاد نے ''قصص ہند'' کی صورت میں ایک فلم چلا دی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ آزاد محض واقعات کے مجموعہ کو تاریخ نہیں سمجھتے تھے اس لیے انہوں نے تاریخ نویسی کا ایک نیا معیار مقرر کیا جس میں تحقیق، تجسس اور تنقیدی سے زیادہ جذباتی ردعمل بھی دکھائی دیتا ہے۔ جس سے تاریخی حقائق کے بیان میں شعریت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ آزاد کی کامیابی بھی ہے اور انفرادیت بھی جس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ ''قصص ہند'' میں داستانوی طرز انداز اپناتے ہوئے استعارے کے استعمال سے منظر نگاری میں بڑی بے ساختگی اور برجستگی کے ساتھ دلکشی و دلاویزی کا عنصر کس خوبصورتی سے پیدا کیا ہے ملاحظہ ہو:

''عمارت کی شان وشوکت دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ ستونوں پر گنبدی چھت۔ بیضۂ عنقا کی طرح دھری تھی کہ ہر ستون ایک ڈال سنگ مرمر کا تراشا ہوا تھا اور سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ پچی کاری کی گل کاری چین کے نقش ونگار مٹاتی تھی اور کندن کی ڈلک ستاروں پر آنکھ مارتی تھی۔ بیچوں بیچ میں ایک جڑاؤ زنجیر لٹکتی تھی۔ اس میں سونے کا چراغ دن رات دھڑ دھڑ جلتا تھا۔ خدا جانے کن وقتوں سے اسی طرح روشن چلا آتا تھا۔ جس کی قسمت میں آج کے دن اس آندھی سے گل ہونا لکھا تھا۔"۴۶

محمد حسین آزادلفظوں سے شاعرانہ اسلوب میں مصوری کرتے ہوئے متحرک تصاویر بناتے چلے جاتے ہیں۔ ''قصص ہند'' کے کسی بھی صفحہ کا مطالعہ کریں یہ خصوصیت ہر جا نظر آئے گی۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ولی عہد چھپر کھٹ میں پڑا تھا۔ وزیر زادہ دوڑا آیا اور کہا لو میاں پروانے اٹھو تمہاری شمع نے آ کر محل کو روشن کر دیا۔ شہزادہ حیران ہو گیا۔ جب وزیر زادے نے قسم کھا کر کہا تو اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور کلاہ جواہر نگار جس پر ہما کے پروں کی کلغی لگی تھی تکیے پر سے اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دی۔''[۴۷]

''خدا کی قدرت ہے کہ وہ میدان جس میں صبح تک اہراہیم کا نقارہ بجتا تھا۔ خیمے سراچے، سرا پردے کھڑے تھے نشان لہراتے تھے۔ بازار لگے تھے دوپہر تک ہو کا میدان ہو گیا اور زمین و آسمان سے بابر بابر کی صدا آنے لگی۔ جنھوں نے رستمی اور اسفند یاری کے دعوؤں سے تلواریں باندھی تھیں سب فنا ہو گئے اور جو بچے بھیس بدل بدل کر نکل گئے۔''[۴۸]

عالمگیری لشکر کی دکن روانگی کی دھوم دھام بیان کرتے ہوئے لفظوں سے رنگا رنگ متحرک تصویر بنانے کا ملکہ ملاحظہ ہو:

''غرض لشکر شاہی نے نشان چڑھایا اور دکن کو روانہ ہوا۔ سب سے پہلے ایک ہاتھی پر علم اژدھا پیکر پیچھے اس کے ہاتھیوں پر ہندوستان کا ماہی مراتب اپنی ولایت کے طوغ وعلم، برنجی اور فولادی نقارے اور دمامے بعد ان کے ہزاروں ہاتھی ہودج عماری سے سجے سونڈوں میں فولادی زنجیریں لئے گلے میں ہیکلیں پیشانیاں شفق شام کی طرح رنگین اسی پر سنہری، روپہلی ڈھالیں، زربفت کی جھولیں پاؤں تک لٹکتی کسی پر ہودج، کسی پر عماری، ریشمی اور کلابتونی رسّوں سے کسی، گردنوں پر مہاوت جن کے گلے میں زربفت کی کرتیاں، سروں پر جوڑے دار پگڑیاں، کمر میں کٹار، ایک ہاتھ میں گجباگ، ایک میں آنکس جھومتے جھامتے چلے جاتے تھے۔ آگے پیچھے چرکٹے سانٹے مار، بھالے بردار، برچھیت، باندار فلیتے سلگائے بھاگے جاتے تھے۔ پھر ہزاروں سواروں کے پرے سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے بہادر نوجوان ترک افغان، حبشی، راجپوت، دو دو تلواریں باندھے، فولادی خود سر پر دھرے کمر میں قرولی اور کٹار، پشت پر گینڈے کی ڈھال چار آئینے سجے، کہنیوں تک دستانے چڑھے ہاتھ میں سات گز کا برچھا، نگاہوں سے خون ٹپکتا، موچھوں کو تاؤ دیتے، گھوڑے اڑاتے چلے جاتے تھے پھر ہزاروں سانڈنیاں خوش رفتار کہ جن کے سو سو کوس کے دم، ان پر بانکے راجپوت لال لال پگڑیاں باندھے زرد انگرکھے پہنے، آبی بانات کے پاجامے چڑھائے ہتھیار لگائے مہاریں اٹھائے۔ جب یہ گذر گئے تو سواری کے خاص خاصے نظر آئے۔

عربی، ترکی، عراقی، یمنی، کاٹھیاواڑ کے دکنی چاندی سونے کے بھاری بھاری ساز کسی پر جڑاؤ زین دھرا کسی پر چارجامہ کسا۔ قچریاں اور پاکھریں پٹھوں پر پڑی ...... جن میں قاقم وسمور کی جھالر کلابتوں کے پھندنے گلے میں سراگائے کی چوڑیاں لٹکتی سر پر کلغیاں طلائی اور نقرئی ریشمی باک ڈور میں سائیسوں کے ہاتھوں میں الیل کرتے اور چوکیاں بھرتے جاتے تھے۔''[۹۴]

محمد حسین آزاد کی قدرت بیان قصص ہند (دوم) میں ان کی دیگر کتب کی طرح اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے جس میں تصنع بناوٹ آرائش نظر نہیں آتی بلکہ عبارت کا پرشکوہ آہنگ، الفاظ کا دروبست، واقعات کی ترتیب میں نظم وضبط اور رمز و کنائے سے پیدا ہونے والی قادر الکلامی اسے اردو نثر کا بہترین شاہکار بنا دیتی ہے۔ اس حوالے سے ذیل کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''راجہ نے بھی باہر نکل خوب خوب مقابلے کیے۔ جان ہاروں نے ملک کے نام پر جانیں قربان کیں مگر کہاں تمام ہندوستان کا تاج دار کہاں چتوڑ کا باجگزار۔ جو ان جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے مارے گئے۔ بڑے بڑے سردار کٹ گئے۔ جب سب سے آس ٹوٹ گئی تو ایک بیٹا باقی تھا۔ اسے بلا کر کہا کہ اے فرزند! جو کچھ یہاں ہم پر گذرے گی آثار اس کے نمودار ہیں۔ اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے کسی طرف کو نکل جاؤ کہ نسل تو قائم رہے بعد اس کے پدمنی کو سامنے بلایا اور دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ ہر چند کہ وہ عورت تھی مگر بڑی رمز شناس تھی۔ اس نے اسی وقت صندل کی لکڑیاں منگا کر سات چتائیں چنوائیں۔ تمام خاندان کی عوارتیں اور بڑے بڑے ٹھاکروں اور سرداروں کی بیبیاں جو خاوندوں اور خاندان کے نام سے آگے جان کو کچھ مال نہ سمجھتی تھیں سب آئیں۔ سر سے پاؤں تک چادریں اوڑھے گھونگھٹ نکلے۔ پھولوں کی ایک ایک مالا گلے میں، رام رام کے سمرن کرتی چتاؤں کے گرد کھڑی ہوئیں اور خلقت کا ہجوم ہو گیا۔ جس وقت چتاؤں کو آگ دی اور شعلے بلند ہوئے دلوں سے دھوئیں اور خلائق سے ایک غل اٹھا۔ ہر ستونتی لاج کی ماری ایک ایک سے آگے بڑھتی تھی۔ اپنی آبرو اور مردوں کی فتح کی دعا کرتی تھی اور پروانے کی طرح اس بھڑکتی آگ پر گر کر آن کی آن میں جل مرتی تھی۔

جب اس ہمت مردانہ سے کہ جس پر ہزار ہزار جوان مردوں کو صدقے کر ڈالیے عورتوں نے یہ ساکھا کیا تو سب کا دل زندگی سے بے زار ہو گیا۔ راجہ رہے سہے رفیقوں کو لے کر اول قلعے کے میدان میں کھڑا ہوا۔ دل غم سے پانی پانی تھا اور نگاہوں سے خون ٹپکتا تھا۔ مگر نہ آنکھ سے آنسو نکلتا تھا نہ منہ سے بات نکلتی تھی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے رخصت ہوا۔ سب سے آگے راجہ اور پیچھے تمام جانثار جن میں سپاہی اور سردار سب برابر رہے تھے۔ قلعے سے باگیں اٹھائے

نکلے اور ان گنتی کی جانوں کی گٹھڑی کر کے لشکر شاہی کے دربار میں دے مارا۔''۵۰؎

محمد حسین آزاد نے تخیل کو تعقل سے ہم آہنگ کرتے ہوئے جو خوبصورت پیرانہ بیان اختیار کیا ہے اس میں سادگی، رنگینی، تشبیہ، استعارہ، تلازمہ، تجسیم کاری اور الفاظ کا آہنگ، پر اثر بیان سبھی کچھ موجود ہے۔ جس نے ''قصص ہند'' کو ایک تمثیل کی حیثیت دے دی ہے۔ طریقہ درس و تدریس میں تصاویر ابلاغ کے ضمن میں اہم کردار ادا کرتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ابتدائی درسی کتب میں تصاویر سے مدد لی جاتی تھی۔ بیشتر درسی کتب باتصویر ہوا کرتی تھیں۔ محمد حسین آزاد کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لفظوں سے پیکر تراشی کا کام اس خوبصورتی سے کیا کہ جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصاویر دکھا دی ہیں۔

غرض واقعات کا اچھوتے انداز میں بیان اور دلاویز اسلوب نگارش نے ''قصص ہند'' کو تصاویر کا خوبصورت مرقع بنا دیا ہے جو طلباء اور ادبی ذوق وشوق رکھنے والوں کے لیے معلومات کا سرمایہ اور حظ اٹھانے کا منبع ہے۔ تاریخ جیسے موضوع میں تعقل کے ساتھ تخیل کی کارفرمائی کی وجہ سے تاریخی حقائق کی تحقیق و تدقیق کا پہلو کہیں کہیں مجروح ہوا ہے مثلاً پدمنی اور علاؤ الدین کے فرضی قصہ، محمود غزنوی کو لٹیرا دکھانا ور راجپوتوں کے کردار کو مثالی بتانا وغیرہ اس کے باوجود آزاد نے اس کتاب میں ادب اور افادیت کو ہم آہنگ کر کے اسے ادبی نثر کا شاہکار بنا دیا ہے۔ ایسے میں آغا محمد باقر کا کہنا بالکل بجا ہے:

> ''قصص ہند میں تاریخ ہند کے مشہور مشہور واقعات نہایت زور دار عبارت میں لکھے ہیں یہ کتاب طلباء میں بے حد مقبول ہے اس کے بے شمار ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بچے اس دلچسپ واقعات سے لطف اٹھاتے اور ادبی مذاق کے لوگ اس کی طرز تحریر کے عاشق ہیں جملوں کا توازن، عبارت کی چستی، الفاظ کی شان اور پر زور طرز تحریر سے اس کو تاریخی کتابوں میں نہایت ممتاز حیثیت حاصل ہے۔''۵۱؎

تصنیفی انعامی مقابلوں کے علاوہ درلیس کتب کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ کو زیادہ منظم اور مربوط بنانے کے لیے ٹیکسٹ بک کمیٹی (۱۸۷۷ء) کی بنیاد رکھی گئی۔ بعد ازاں ۱۸۸۲ء - ۱۸۸۱ء میں اس کمیٹی تشکیل جدید کی گئی جس کے تحت مختلف مضامین وموضوعات کے علمی، ادبی اور تحقیقی معیار کو بہتر سے بہتر بنانے کیلئے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی نے آٹھ سب کمیٹیاں۵۲؎ مقرر کیں جو اس ادارے کی کاوشوں کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

چنانچہ میجر فلر اور بعد ازاں میجر ہالرائیڈ کی سرپرستی میں تصنیف و تالیف کے مرحلے سے گذرنے والی ان درسی اور نصابی کتب کا جائزہ لینا ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ ان درسی اور نصابی کتب سے جہاں تعلیمی ضروریات پوری

ہوئیں وہیں اردو نثر میں بے بہا اضافہ ہوا۔ اسی ذریعے سے اردو نثر کو ادبی نثر کا درجہ بھی ملا۔ یہ بالکل ایسا ہی معاملہ تھا جیسے فورٹ ولیم کالج میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کو اردو سکھانے کے لیے نصاب کی ضرورت کو تراجم سے پورا کیا گیا اور اردو نثر کو فروغ مل گیا۔ ویسے ہی لاہور میں محکمہ تعلیم کے تحت انگریزوں نے مقامی لوگوں پر اپنا اعتماد اور اعتبار جمانے اور انہیں اپنا ہمنوا کے لیے پنجاب بک ڈپو کی صورت میں علمی تراجم کی روایت کو مستحکم کیا تو ساتھ ہی جدید اور سائنٹفک اصولوں کے پیش نظر درسی کتب لکھوائیں چونکہ اس وقت تک فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور دیگر انفرادی کاوشوں کی وجہ سے اردو نثر اتنی ترقی کر چکی تھی اور اس کا دامن اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ اب اس میں نصابی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے درسی کتب لکھوائی جاتیں۔ یہ وہ وقت تھا جب لاہور میں اردو زبان شعروشاعری کے دائرے سے آگے بڑھ کر نثر کی صورت میں باقاعدہ تعلیم وتصنیف کا ذریعہ بن رہی تھی۔ اس مرحلے کو بااحسن طریقے سے پورا کرنے کے لیے یو پی سے اہل علم اصحاب کو لاہور لایا گیا جو دہلی کالج کے پروردہ ہونے کے ساتھ درس وتدریس سے دلچسپی رکھتے تھے اور اس شعبہ سے وابستہ تھے۔ درحقیقت یہ اصحاب مشرقی و مغربی علوم کا ایسا امتزاج تھے جو انگریزوں کے نقطۂ نظر کو بخوبی سمجھتے اور ان کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسی ہی درسی کتب تخلیق کر سکتے تھے جیسی کہ انگریز چاہتے تھے۔ ایسے ہی اصحاب کے لاہور آنے کی وجہ سے اردو نثر نے ارتقا کے اگلے مرحلے پر قدم رکھا۔ جہاں اس میں ادبیت کا رنگ بھی شامل ہوا۔ اس ادبی رنگ میں دہلی کی روزمرہ زبان اور محاورے کے رچاؤ نے لاہور میں اردو نثر کے ایک نئے دبستان کی بنیاد کو پروان چڑھایا۔ الغرض اردو نثر کی ترقی میں تیزی انہی نصابی کتب کی وجہ سے عمل میں آئی۔ یہ اردو کی نصابی اور درسی کتب ہی نہ تھیں بلکہ اردو کا وہ نثری سرمایہ تھیں جو لاہور میں ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے تخلیق پایا اور لاہور کو اردو زبان اور اردو نثر کا دبستان بنانے میں اہم اور فعال کردار ادا کیا۔ اس کا اندازہ ذیل کی نصابی کتب سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

تحفۂ چشتی:

۱۸۵۴ء میں لاہور میں تصنیف پانے والی پہلی اردو قواعد ہے۔ جسے مولوی نور احمد چشتی نے لکھا اور مطبع لاہور گزٹ ۵۳ؐ سے شائع کیا۔ صرف ونحو کے موضوع پر اردو میں فنی نثر پر لکھا جانے والا ایک مختصر رسالہ ہے۔ جسے پادری جان ہنٹر مارسن کی خوشنودی کے لیے لکھا گیا۔ مولوی نور احمد چشتی چونکہ انگریزوں کو اردو پڑھایا کرتے تھے اس لیے انگریزوں کو اردو زبان سکھانے کے حوالے سے یہ گرامر لکھی۔ اگر چہ اس کی علمی وادبی حیثیت نہیں لیکن لاہور میں بزبان اردو لکھی جانے والی پہلی قواعد ہونے کی وجہ سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں علم قواعد اور تشریح اضافت وغیرہ کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ''جائزہ زبان اردو پنجاب'' سے اس کے مندرجات معلوم ہوتے ہیں کہ یہ

مختصر رسالہ چھ فصول اور تعلیم پر منقسم ہے۔ ہر فصل میں بعض تعلیمات ہیں جس میں کسی اور طرح کی ترتیب مفقود ہے مثلاً پہلی فصل کے ضمن میں تعلیم پہلی تردید کے بیان میں، تعلیم دوسری حرف و شرط کے بیان میں، تعلیم تیسری حروف استثناء کے بیان میں ۔ تعلیم چوتھی مرکب کے بیان میں ۔ فصل دوم، تعلیم پہلی اضافت کے بیان میں، تعلیم دوسری مضاف اور مضاف الیہ کے بیان ہیں، عموم اور خصوص مطلق کی نسبت سے۔ فصل تیسری، علامت اضافت کی ہندی میں، فصل چوتھی فارسی میں عطف کی علامت، ''وْ'' اور اردو میں ''اور'' ہے۔ فصل پانچویں، مصدر کے بیان میں، فصل چھٹی، مصدر کی دو قسمیں: (۱) لازم (۲) متعدی۔ فصل ساتویں، جو چیزیں مصدر، سے مشتق ہوتی ہیں۔ صفت پہلی، ماضی مطلق کے بیان میں، تعلیم پہلی ماضی قریب کے بیان میں، تعلیم دوسری ماضی بعید کے بیان میں، تعلیم تیسری تذکر و تانیث کے بیان میں، تعلیم چوتھی ماضی استمراری کے بیان میں ۔ تعلیم مضارع کی بحث میں۔ تعلیم فعل امر کے بیان میں۔ تعلیم اسم فاعل کے بیان میں۔ تعلیم اسی مفعول کے بیان میں ۔ فصل، اسم آلت کے واسطے۔ تعلیم مفید واسطے معلوم کرنے مونث اور مذکر کے۔ فصل لازمی، متعدی کا فرق ''نے'' کے ساتھ فصل، قواعد جمع مونث، مذکر وغیرہ ۔ علم قواعد سکھانے کا عام فہم طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے اور ایک ایک اصطلاح کی وضاحت کر دی گئی ہے اس حوالے سے یہ دو اقتباسات ملاحظہ ہوں:

تعلیم چوتھی

مرکب کے بیان میں اور مرکب وہ ہے جو دو یا زیادہ سے حاصل ہو اور وہ دو قسم پر ہے اول مرکب مفید معلوم کرنا چاہیے کہ مرکب مفید وہ ہے کہ سکوت اس پر صحیح ہو اور سامع کو اس سے خبر یا طلب حاصل ہو جاوے اور اسی کو جملہ اور کلام بھی کہتے ہیں اور کلام میں وہ نسبت جو درمیان دو کلموں کے ہے اسی طرح پر ہوتی ہے کہ بسبب اسی کے سکوت صحیح ہوتا ہے اور اس کو اسناد کہتے ہیں پس وہ کلمہ کہ جس کی اسناد کسی کی طرف پھریں اسی کو مسند کہتے ہیں اور جس کی طرف مسند ہو اس کو مسند الیہ کہتے ہیں۔۔۔''۵۴؎

تعلیم

''۔۔۔اُردو کے محاورے میں ہر ذی روح کی آواز کا الگ الگ نام مقرر ہے کہ اگر سوا اس کے استعمال میں لاوے تو موجب تضحیک کا ہوتا ہے چنانچہ آدمی بولتا ہے ہاتھی چنگھاڑتا ہے۔ شیر گرجتا ہے، گھوڑا ہنہناتا ہے، شتر بلبلاتا ہے، بیل ڈکراتا ہے، کتا بھونکتا ہے، گدھا رینکتا ہے، کوا قاقا کرتا ہے، کبوتر غٹ غوں غٹ غوں بق بو بق بو کرتا ہے، کویل کوکتی ہے، مچھر مکھی بھن بھناتے ہیں، بھنورا گونجتا ہے اور چڑیا چہچہاتی ہے، بلبل کے پھول کے اوپر لوٹنے اور بولنے کو مراغہ کہتے ہیں۔''۵۵؎

قواعد المبتدی:

مولوی کریم الدین ۵۶ نے اردو صرف و نحو پر ''قواعد المبتدی''(۱۸۵۷ء) کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ یہ نو آموزوں کو اردو زبان سکھانے کے لیے لکھا گیا۔ جو بعدازاں متعدد بار طبع ہوا۔۵۷ بقول مولوی کریم الدین:

> ''طالب علمان مبتدی کے واسطے حسب الحکم جناب مستطاب مسٹر آرنولڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، ممالک پنجاب، لکھا گیا۔مطبع کوہ نور لاہور محلّہ کی دروازہ حویلی منشی ہرسکھ رائے پروپرائیٹر میں باہتمام منشی نولکشور منیجر و غلام محمد پرنٹر و علی بخش پبلشر کے چھپا۔ سنہ طباعت ۱۸۵۷ء، صفحات ۱۲۲۔''۵۸

مولوی کریم الدین نے یہ رسالہ اس وقت تالیف کیا جب وہ آگرہ کالج میں اردو کے مدرس تھے۔لاہور میں ان کی آمد سے قبل ان کی تصانیف کو لاہور میں درسی کتب کے طور پر پذیرائی حاصل تھی۔چونکہ رسالہ لاہور سے چھپا اور یہاں کے درسی نصاب میں شامل تھا اس لیے اس کے بابت جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ بعدازاں کریم الدین کی دیگر بہت سی کتب درسی نصاب کا حصہ بنیں۔اس سے خود مولوی کریم الدین کے ذہنی ارتقا اور ان کی خدمات کو بھی سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔لاہور میں ان کا علمی و ادبی تعارف پہلے پہل اسی رسالے کے توسط سے ہوا۔ان کی انہی صلاحیتوں کو پہچانتے ہوئے محکمہ تعلیم کے انگریز افسران انہیں لاہور لے آئے۔ رسالہ دو ابواب اور ایک خاتمے پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں علم صرف کے بارے میں بتایا گیا ہے جو ۸۷ صفحات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے میں علم نحو کو ۳۰ صفحات پر بیان کیا ہے۔خاتمے میں ترکیب کرنے کا طریقہ کار بتایا گیا ہے۔اس رسالے کے بارے میں کریم الدین نے جو کچھ لکھا ہے وہ نہ صرف اردو زبان بلکہ اردو نثر میں ہونے والی ترقی کا بھی غماز ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''چوں کہ گلکرسٹ صاحب نے ایک رسالہ صرف میں بڑی کوشش اور محنت سے لکھا تھا اور واقع میں وہ چھپا تھا مگر بعض بعض جا سے وہاں حاجت کچھ بڑھانے یا گھٹانے کی تھی ان مقامات کو درست کر کے پہلے باب میں وہی رسالہ لکھا گیا اور دوسرے باب میں علم نحو کے مسائل ضروری آپ کتب اردو اور اس زبان کے تتبع کر کے بندہ ہیچمدان کمترین کریم الدین مدرس اول اردو، کالج آگرہ نے لکھی۔ امید ناظرین سے یہ ہے کہ جب اس رسالے کو بنظر انصاف ملاحظہ فرمائیں گے تو صرف نحو فارسی یا عربی کے تتبع ہو کر نہ دیکھیں بلکہ محاورات اردو کو سوچ کر اس کے مسائل مستعملہ کو جو اس زبان میں جاری ہیں دیکھیں اور بسبب اس کے کہ سکھلانا اس کتاب کا ان نو آموزوں کو منظور ہے جو پہلے سے اصطلاحات علم نہیں جانتے ہیں لہذا ان کو آسان ہونے

کے واسطے وہ ڈھنگ جو مشکل پسند لوگ اختیار کرتے ہیں چھوڑ کر بہت آسان طور سے بیان کرتا ہوں اس واسطے ان چند اصطلاحوں کے معنی بھی بتلانے پہلے پڑھنے اس کتاب کے بہت ضروری ہیں سو لکھتا ہوں۔"[۵۹]

تذکرہ المشاہیر:

۱۸۶۰ء میں طلبہ مدارس پنجاب کے لیے حسب الحکم ناظم تعلیمات کپتان فلر کے شائع ہوا۔ تذکرہ چھ ابواب پر منقسم ہے۔ باب اول میں زمانہ قدیم کے نامور اصحاب کا ذکر ہے۔ باب دوم یونانیوں کے بیان پر مشتمل ہے۔ باب سوم میں رومیوں کی تاریخ کا تذکرہ، باب چہارم میں متاخرین کا ذکر، باب پنجم میں مشرقی ممالک کے نام اور ان کی تاریخ بیان کی گئی ہے جبکہ باب ہشتم میں علماء اور فضلاء کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

درنتت وفادار سنگھ اور گدر سنگھ:

مدرسہ کے بچوں کے لیے لکھی گئی اس کتاب کے مصنف لالہ رام دیال ہیں۔ یہ قصہ ۱۸۶۰ء میں ۲۴ صفحات پر طبع ہوا۔[۶۰]

منتخبات اُردو:

اس کتاب کی صورت میں مولوی کریم الدین نے ۱۶۲ صفحات پر نظم ونثر کا انتخاب کیا جو کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب کے لیے مرتب کی گئی اس میں الف لیلیٰ اور تحفۃ الاخوان الصفاء کے بعض حصے شامل ہیں۔ جو تمثیل کا رنگ لیے ہوئے ہیں اس کے علاوہ گلستان اور اخلاق جلالی کے اقتباسات بھی دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۶۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔

مختصر تاریخ ہندوستان:

ناظم تعلیمات کپتان فلر کے حکم سے ۱۸۶۰ء میں باہتمام اجودھیا پرشاد مطبع سرکاری لاہور سے شائع ہوئی۔

جغرافیہ عمومی:[۶۱]

میجر فلر کی ہدایت پر پنجاب کے مدارس کے لیے ۱۸۶۱ء میں لاہور سے ۱۳۴ صفحات پر شائع کیا گیا۔

تسہیل الکلام:

اس کتاب کے مؤلف کپتان ہالرائیڈ ہیں۔ ۱۱۰ صفحات پر مشتمل یہ کتاب انگریزی سیکھنے والے طلباء کے لئے لکھی گئی جو ۱۸۶۱ء میں مطبع مصطفائی لاہور سے شائع ہوئی۔

تشہیر ظہوری/تشریح ظہوری:

مولوی کریم الدین نے ملا ظہوری کی "سہ نثر" کی شرح اردو نثر میں لکھی ہے۔ ۱۱۴ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۸۶۱ء میں کپتان فلر ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب کے حکم سے اور باہتمام پنڈت اجودھیا پرشاد مہتمم کے مطبع سرکاری میں شائع ہوئی۔

تواریخ ہند:

فائدہ طلباء مدارس احاطہ پنجاب کے لیے حسب الحکم جناب کپتان فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب وغیرہ کے لئے لکھی گئی اور ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔

جغرافیہ ہند (حصہ اول):

فائدہ طلبا مدارس احاطہ پنجاب کے لئے حسب الحکم کپتان فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب وغیرہ کے لئے لکھی گئی اور ۱۸۶۱ء میں مطبع سرکاری واقع لاہور سے شائع کی۔

مبادیٔ الحساب (حصہ اول و دوم):

کپتان فلر کے حکم سے ۱۸۶۱ء میں مطبع سرکاری لاہور سے شائع ہوئی۔

شارع التعلیم:

۱۸۶۱ء میں یہ کتاب بھی کپتان فلر ناظم تعلیمات کے حکم پر لکھی گئی اور مطبع پنجابی لاہور سے شائع ہوئی۔ اس میں پرانے طرز تعلیم کے نقائص بتانے کے علاوہ لوگوں کو انعام اور ملازمت کا لالچ دے کر ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سکول میں داخل کروائیں نیز کتابوں کی مختصر فہرست بھی دی گئی ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ کون کون سی کتابیں پہلے اور کس طریقہ پر پڑھائی چاہئیں۔

منتخبات انوار سہیلی (اردو/ فارسی):

۱۰۵ صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۸۶۱ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہوئی جس میں مولوی کریم الدین نے انوار سہیلی کے کچھ حصوں کا خلاصہ تحریر کیا ہے۔

جغرافیہ پنجاب:

یہ جغرافیہ مولوی کریم الدین کا تحریر کردہ ہے جو انہوں نے میجر فلر کے کہنے پر لکھا اور لاہور سے بالترتیب چار مرتبہ ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۳ء، ۱۸۶۴ء، ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔[۶۲]

کریم اللغات:

کریم اللغات فارسی لغت ہے۔اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں فارسی وعربی الفاظ کے معنی اردو میں بھی موجود ہیں۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ مدارس میں اردو کے ساتھ فارسی بھی لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جا رہی تھی۔اسی لیے جب کتب کے مقابلے کی بات کی جاتی تو اس میں فارسی کتب کو بھی شامل کیا جاتا۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اردو کے ساتھ فارسی تصنیف و تالیف کے سلسلہ کو ہنوز پسند کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ساتھ فارسی زبان و ادب کا سرمایہ بھی تخلیق ہوتا رہا۔مولوی کریم الدین کی تالیف کردہ یہ لغت اسی کی ایک مثال ہے جو ۱۸۶۱ء میں تیار ہوئی اور ۱۸۶۲ء میں انارکلی پریس لاہور سے شائع ہوئی۔۶۳ مولوی کریم الدین زبان کی لغت کے حوالے سے اہمیت اور مقصد تالیف بیان کرتے ہوئے اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''چونکہ حاصل ہونا کسی زبان کا بدون واقف ہونے صرف ونحو اور لغت کے ہو نہیں سکتا اور معنی زبان دانی کے بھی یہی ہیں کہ ان زبان کی لغت سے آشنائی تمام حاصل ہو، بلحاظ اس کے جو دیکھا جاتا ہے تو کوئی کتاب لغت کی مدارس پنجاب کے لڑکوں کے پاس ایسی نہیں ہے جس سے وے خود معنی الفاظ نامعلوم نکال کر اپنی ترقی اس زبان میں پیدا کریں۔ اس لیے جناب میجر فولر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب نے مجھ کمترین کریم الدین کو جو صاحب ممدوح کے دفتر میں عہدہ سررشتہ داری پر نامزد ہے ارشاد فرمایا کہ ایک ڈکشنری زبان فارسی کی ایسی طیار کر جس میں سب الفاظ ان کتابوں کے آجاویں جو سرکاری اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔''۶۴

چونکہ لغت میں فارسی اور عربی الفاظ کے معنی اردو میں بھی ہیں جو مدارس پنجاب کی درسی کتب میں مستعمل تھے۔اس لحاظ سے کریم اللغات نہ صرف لاہور بلکہ پنجاب میں بھی اردو زبان کی ''پہلی لغت'' ہے۔۶۵

مفتاح القواعد:

مولوی کریم الدین نے سداسکھ لال کی انگریزی قواعد کا ترجمہ اردو نثر میں مفتاح القواعد کے نام سے ۱۸۶۲ء میں کیا۔

مفید الصبیان یعنی خرد افروز:

یہ کتاب ۳۰۵ صفحات پر مشتمل بچوں کے لیے سبق آموز حکایات پر مبنی ہے جو کپتان فلر کے حکم پر لکھی گئی اور مطبع سرکاری لاہور سے ۱۸۶۲ء میں طبع ہوئی۔

قصہ دھرم سنگھ زمیندار: ۶۶

یہ درسی اور اخلاقی قصہ ناظم تعلیمات کپتان فلر کے حکم پر طلباء کے لئے لکھا گیا۔ دس صفحات پر مشتمل یہ

مختصر قصہ اجودھیا پرشاد کے زیر اہتمام مطبع سرکاری لاہور سے ۱۸۶۲ء میں طبع ہوا۔

پند سود مند: ۶۷

۱۸۶۲ء میں منشی محمد عظیم کے زیر اہتمام مطبع پنجابی لاہور سے شائع ہونے والی اس کتاب کے مصنف بھی مولوی کریم الدین ہیں۔۲۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں قدیم و جدید مصنفین کے ڈیڑھ سو مقولے نقل کیے گئے ہیں۔علاوہ ازیں اس میں سو کے قریب وہ نصیحتیں بھی شامل ہیں جو حکیم لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھیں۔موضوع کی نوعیت ہی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ نصاب تعلیم میں شامل تھی۔مثال کے طور پر چند ضرب المثال ملاحظہ ہوں:

''اپنا رکھ، پرایا چٹ
انگلی پکڑتے، پہنچا پکڑا
اپنی ران کھولے اور آپ ہی لاجوں مرے
اپنی گلی میں کتا بھی شیر ہے
اوچھے کی پیت، بابو کی بھیت
اوسوں (شبنم) پیاس نہیں بجھتی
احمد کی پگڑی محمود کے سر
ایک اور ایک گیارہ'' ۶۸

انشائے اردو:

مولوی کریم الدین کی خطوط نویسی کے موضوع پر لکھی جانے والی یہ کتاب ۱۸۶۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔۶۹ مولوی کریم الدین اس کی اہمیت اور غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انشاء کے معنے لغت میں لکھنا اور پیدا کرنا ہے اور اصطلاح میں وہ فن ہے جس سے طریق لکھنے خطوط اور کاغذات مروجہ معاملات دنیاوی اور دفاتر سرکاری کا معلوم ہو پس اردو میں ایسے انشاء جو کاغذات مروجہ مابین عوام اور دفاتر سرکاری کے سکھلانے کی متکفل ہو۔آسان ترکیب کی مرتب نہ ہوتی تھی۔اس لیے حسب الحکم جناب میجر فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب کے بندہ کریم نے درمیان جنوری ۱۸۶۳ء کے یہ کتاب تیار کی اور اس لئے کہ بچوں کو اس کا نام بآسانی یاد رہے۔انشائے اردو نام رکھا ہے۔'' ۷۰

اس کتاب میں خط و کتابت سے متعلق ضروری اور مفید معلومات بیان کی گئی ہیں۔مکتوب نگاری کے

حوالے سے عمر، رشتے اور مرتبے کے لحاظ سے استعمال ہونے والے ایسے القاب و آداب درج کیے گئے ہیں جو اردو میں استعمال کیے جاتے ہیں مثلاً شیخ،سید، خان،مغل،منشی اور پنڈت وغیرہ۔کتاب چار حصوں میں منقسم ہے پہلے حصے میں خط نویسی کے ایسے نمونے دیئے ہیں جو ہم عمر اور ہم مرتبہ لوگوں کے درمیان ہونی چاہیے۔حصہ دوم میں عرائض نویسی کے نمونے دیئے ہیں۔تیسرے حصے میں دفاتر اور عدالتوں کے لئے لکھے جانے والے خطوط کے نمونے خصوصی القاب و آداب کے ساتھ درج کیے ہیں جبکہ چوتھے حصے میں کاروباری خطوط کے نمونے دیئے گئے ہیں۔تدریسی نقطہ نظر سے لکھی گئی اس نثری کتاب کا مقصد بچوں میں خط لکھنے کی صلاحیت پیدا کرنا تھا۔

زبدۃ الحساب:

اجودھیا پرشاد نے علم حساب کا مکمل رسالہ تحریر کیا جو ۱۸۶۳ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

تسہیل القواعد:

مولوی کریم الدین نے اردو صرف و نحو کے موضوع پر یہ کتاب نئی طرز پر لکھی جو پنجاب کے مدرسوں میں نصاب کے طور پر رائج رہی۔گارساں دتاسی کے خطبات سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۸۶۳ء میں چھپی۔

مفتاح الارض:[۱]

مولوی کریم الدین نے میجر فلر ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم کے کہنے پر ۱۸۶۳ء میں ۱۳۲ صفحات پر مشتمل جغرافیہ کے موضوع پر یہ کتاب لکھی[۲] اور جو لاہور سے شائع ہوئی۔

مفتاح النعیم:

۱۸۶۴ء میں چھپنے والی اس کتاب میں اصول انشاء کے اندراج کے ساتھ خطوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔ اس میں چھوٹے اور مختصر خطوط کے نمونے ایسے اسلوب میں دیئے گئے ہیں جو طوالت اور لفاظی سے پاک ہیں۔ یہی اس کتاب کا حسن ہے۔

تسہیل التعلیم:

ڈاکٹر انجم رحمانی کے مطابق ابتدائی مدرسوں کے واسطے پہلی جماعت کے لیے مبتدیوں کی تعلیم کے لیے اردو کا سب سے پہلا قاعدہ جو پنجاب میں انگریزی اقتدار کی ابتداء کے بعد لکھا گیا جس کی اشاعت ۱۸۶۴ء میں ہوئی۔[۳] اسے کپتان فلر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایما پر لکھا گیا اور مطبع سرکاری سے باہتمام بابو چندر ناتھ چھاپا گیا تھا۔تسہیل التعلیم ایک باتصویر قاعدہ تھا جس میں مختلف عنوانات مثلاً گھوڑا، بیل، بھیڑ، بکری اور ہرن

کے تحت مختلف بیانیہ اقتباسات کے علاوہ ایک حرفی، دوحرفی اور سہ حرفی الفاظ کے سبق بھی دیے گئے۔ تصاویر کے ذریعے جدید طریقہ ہائے تدریس کو متعارف کرایا گیا۔ ڈاکٹر انجم رحمانی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں ''زبان دانی پر زور ہے مفردات سے مرکبات اور مرکبات سے جملے اور جملوں سے پیرے اور پیروں سے مضمون کی طرف بڑھنے کے منطقی طریقے سے تدریس کا اہتمام ہے۔''۴۷

آشوب نامہ:

قصہ کی افادیت اس کی مقصدیت اور اس میں حقیقت یا واقعیت نگاری پر مبنی قصوں میں پہلا نام ''آشوب نامہ'' کا ہے جو ۱۸۶۴ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس میں دو بھائیوں بھگوان داس اور گوپال داس کے حال کو مختصر قصہ کی صورت میں تحریر کیا گیا ہے۔ یہ قصہ نایاب ہے اور باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہو پایا۔ لہذا مذکورہ چند ایک معلومات ہی مل سکی ہیں۔

قصہ پنجاب سنگھ:

مذکورہ قصہ ۱۸۶۴ء میں مولوی کریم الدین نے کپتان فلر کی فرمائش پر تصنیف کیا۔ اس پر یہ عبارت تحریر ہے:

> ''حسب الحکم جناب کپتان فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب وغیرہ واسطے درس دہی طلباء پنجاب کے بجائے کتب وفادار سنگھ کے جس کا درس آئندہ سے موقوف ہوا۔ مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر حلقہ لاہور نے تصنیف کیا۔ سند طباعت ۱۸۶۴ء مطبع سرکاری لاہور۔ صفحات ۵۲۔''۵۷

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ قصہ پنجاب کے اسکولوں میں بطور نصاب رائج ہوا کیونکہ ۱۸۶۴ء میں مولوی کریم الدین نے جو ''اردو زبان کے امتحان کا نصاب'' مرتب کیا اس میں یہ قصہ بھی شامل تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ میٹرک کے طلباء کے نصاب میں شامل تھا۔ قصہ اصلاح کے مقصد کو پورا کرتا ہے جس میں دو گہرے دوستوں دھیان سنگھ اور پنجاب سنگھ کا قصہ بیان کیا ہے۔ اس قصے کے ذریعے بچوں کو جہل، نافرمانی اور حرص سے بچنے کی اخلاقی تلقین پر مبنی سبق موجود ہیں تاکہ یہ خامیاں جو انسان کے لیے رنج کا باعث بنتی ہیں نہ بنیں۔ اس کے ساتھ حلم، خوش اخلاقی اور مروت جیسی خوبیوں کو اجاگر کیا گیا ہے کہ یہ خوشی کا موجب بنتی ہیں۔ لہٰذا اس قصہ کے ذریعے ان خوبیوں کو اختیار کرنے کی اخلاقی تلقین کی گئی ہے۔

مخزن طبعی: ۶۷

مولوی خواجہ ضیاء الدین خان ۷۷ جو علم طبعیات میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ میجر فلر ڈائریکٹر سر رشتہ

تعلیم پنجاب کی فرمائش پر اصول علم طبیعات کو دو حصوں میں بیان کیا۔ حصہ اول ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ''اصول علم طبعی'' کے نام سے جبکہ حصہ دوم : ''مخزن طبعی'' ۱۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جو ۱۸۶۴ء میں لاہور سے طبع ہوئے۔ گارساں دتاسی اپنے خطبہ ۵ دسمبر ۱۸۶۴ء میں اس کی بابت لکھتا ہے:

> ''پنجاب کے ناظم سررشتہ تعلیمات نے مجھے ان ہندستانی کتابوں کی ایک فہرست بھیجی ہے جو ابھی حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔۔۔ان کتابوں میں لاہور میں حسب ذیل طبع ہوئی ہیں۔
>
> ا۔ فلسفہ فطرت کے اصول پر ایک کتاب ''اصول علم طبیعی'' ہے اس کی دوسری جلد کا نام ''مخزن طبیعی'' ہے جس میں علم الطبیعات کے اصول بیان کیے گئے ہیں۔''[۸۷]

اس سے ایک بات سامنے آتی ہے کہ دونوں کتابیں ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئیں۔ اصول علم طبیعی میں علم جرثقیل اور علم ہیئت کا بیان ہوا ہے جبکہ دوسری جلد ''مخزن طبیعی'' علم ہوا، پانی، مناظر اور علم حرارت کے بیان پر مشتمل ہے۔ اس کتاب سے اردو نثر کی وسعت اور ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس خوبی سے اردو نثر سائنسی موضوعات مثلاً علم ہوا، پانی، مناظر اور علم حرارت کو بیان کرنے کے قابل ہو رہی تھی۔ مثال کے طور پر ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ارباب بصیرت پر ظاہر ہو کہ جن اجسام میں کشش اتصال اس قدر کم ہے کہ ان کے اجزاء بغیر محسوس ہوئے مزاحمت کے متحرک ہو سکتے ہیں ان کو سیال کہتے ہیں۔ اجسام سخت اور اجسام سیال میں بڑا فرق یہی ہے کہ اجسام سخت کے اجزاء کو کشش اتصال متصل اور پیوستہ رکھتی ہے۔''[۹۷]

جوہر عقل:

یہ عزیز الدین خان کا تحریر کردہ قصہ ہے جو میجر فلر کی ہدایت پر پلگرمس پراگرس (Pilgrim's Progress) کے طرز پر اردو نثر میں لکھا گیا۔ قصہ کی عبارت نثر و نظم دونوں پر مشتمل ہے جو کہ تمثیل کی صورت میں پہلی بار مطبع پنجابی لاہور سے ۱۸۶۴ء[۸۰] میں طبع ہوا۔ مقالہ نگار کے پیش نظر ۱۸۸۵ء کی اشاعت ہے جس کے سر ورق کی عبارت اس طرح درج ہے:

جوہر عقل

تصنیف منشی عزیز الدین سر رشتہ دار محکمہ ڈائرکٹری مدارس

پنجاب

حسب فرمائش مصنف

۱۸۸۵ء

مطبع مفید عام لاہور میں باہتمام منشی گلاب سنگھ چھپی

۹۴ صفحات پر مشتمل یہ مسلسل قصہ پہلی باقاعدہ اور مکمل تمثیل ہے جو بچوں کی ضرورت کے پیش نظر لکھا گیا۔ اس تمثیل کی بابت منشی عزیز الدین اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ماہ فروری سنہ ۱۸۶۴ء کو وقت رات کے مجھ کو خیال آیا کہ صدق و کذب کے باب میں ایک قصہ ایسے ڈھنگ سے لکھنا چاہیے کہ عشق سے خالی اور تکلف سے معرا ہو مگر مضمون اوس کا ایسا دلچسپ ہو کہ طبعیت آدمی کی جس طرح کتب عشق انگیز کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے اس طرح اس کے پڑھنے اور سننے کی طرف راغب ہو جائے اور اس میں مضمون ہنسی کی ہنسی اور عبرت کی عبرت ہو۔"[۸۱]

دیباچہ کے مذکورہ اقتباس میں قصہ پن کے حوالے سے منشی عزیز الدین خان کے تنقیدی خیالات سے آگاہی ہوتی ہے وہیں یہ احساس بھی ہوتا ہ کہ انیسویں صدی میں بدلتے ہوئے حالات نے اردو نثر میں قصہ لکھنے کا رنگ ڈھنگ کس طرح بتدریج موضوع اور اسلوب کے حوالے سے بدلنا شروع ہوا۔ جدید تنقیدی شعور نے افسانوی ادب کو جلا بخشی۔ یہی وجہ ہے کہ قصوں میں حقیقی زندگی کی عکاسی کو اہمیت دیتے ہوئے اسے زندگی سے قریب کیا گیا۔ بالفاظ دیگر ''ادب برائے زندگی'' کے نظریے کے تحت تمثیل نگاری کا سہارا لے کر معاشرتی زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اس سے اصلاح کا کام لیا گیا۔

چونکہ ''جوہر عقل'' میں سچ اور جھوٹ کو قصہ نگاری کے قالب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ بھی ایک مقصدی اور اصلاحی تمثیلی کہانی ہے جو سلیس، سادہ اور رواں انداز بیان کی حامل ہے۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ اس میں سلطان دل کے ملک سعادت پر شیطان رہزن کا بیٹا کذب جو بظاہر خوبصورت ہونے کی وجہ سے اپنی خوبصورتی اور اپنے مشیر فریب اور حیلہ، تہمت کی مدد سے قبضہ کر لیتا ہے لیکن جب سلطان دل کا سپہ سالار صدق آتا ہے تو وہ کذب کے بہروپ کو بے نقاب کر کے اس کی اصلیت سامنے لاتا ہے۔ چنانچہ کذب پر مقدمہ چلتا ہے اور وہ کیفر کردار تک پہنچتا ہے۔ یوں بظاہر قصہ صدق و کذب کا مقدمہ نظر آتا ہے لیکن منشی عزیز الدین خان نے اس ضمن میں بعض معاشرتی برائیوں مثلاً بے وقوفی، کیمیاگروں کی دھوکہ بازی، نجومیوں کا مکر، بے جا رسومات، بازیوں کے عیوب اور زیورات کے نقصانات وغیرہ پر مفصل طور پر اس طرح سے روشنی ڈالی ہے کہ درپردہ ان خرابیوں کی اصلاح ہو جائے۔ ''جوہر عقل'' میں دیگر تمثیلوں مثلاً ''خط تقدیر'' یا ''نیرنگ خیال'' وغیرہ کی طرح موضوعاتی ابواب بندی نہیں کی گئی بلکہ مسلسل قصہ کی صورت میں اسے تحریر کیا گیا ہے جس سے اس میں قصہ پن کا احساس دیگر تمثیلوں کی نسبت زیادہ پایا جاتا ہے۔ ابتداء ہی سے قصہ قاری کی توجہ اپنی جانب اس طرح مبذول کرتا ہے:

"جب سلطان دل نے قالب انسانی میں تخت نشین ہو کر ملک سعادت میں جلوس اقبال فرمایا تو اس کے مقابل میں شیطان نام راہزن نے جسم شیطانی میں شیطنت کی سلطنت پر تغلب ادبار کر کے دعوی سلطنت کیا یہ راہزن نہایت مکار اور گرگ کہن تھا اکثر اوقات حیلہ و تلبیس واسطے تباہی و تسخیر سلطنت سلطان دل کے اٹھاتا مگر سلطان دل کے ملازموں میں ایک ایسا شخص سپہ سالار و منتظم ریاست جوانمرد و تنومند نہایت زیرک ملقب بنام صدق موجود تھا کہ اسکی تدابیر معقول اور نیک نیتی کے سبب سے سلطان دل کو غنیم کے مکر و فریب سے کچھ خوف نہیں تھا اور رعایا برایا سلطان دل کی اس منتظم ریاست کے اخلاق ظاہری و باطنی سے ایسی راضی تھی کہ اپنی زندگی و آرام اسی کے دم پر منحصر سمجھتی تھی۔"۸۲؎

قصہ کی ترتیب اور واقعات کے منطقی ربط سے پلاٹ کی با قاعدہ جھلک ملتی ہے۔ قصہ کے افراد، قوا اور حواس انسانی، اخلاقی صفات پر مبنی تمثیل کے انداز میں بیان کیے گئے ہیں۔ جس سے کردار نگاری زیادہ جاندار اور اس قدر واضح ہو جاتی ہے کہ "اگر اس کے کرداروں کو انسانی نام دے دیئے جائیں تو یہ حقیقی قصہ معلوم ہونے لگے۔"۸۳؎ پھر سلطان دل کا کذب کی خوبصورتی سے دھوکا کھانا اور فریب حیلہ کے مکر میں پھنس جانا اور خادمہ بیوقوفی کی وجہ سے لوگوں کا جہالت سے نہ نکلنا۔ عین فطرت انسانی سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ایک کامیاب تمثیل ہونے کے ساتھ افسانوی خصوصیات کی حامل بھی ہے چنانچہ افسانے اور ناول کا خمیر ایسے ہی قصوں سے اٹھایا گیا۔

نصیحت کا کرن پھول:

مولانا محمد حسین آزاد کی یہ تصنیف محکمہ تعلیم سے وابستگی کا نتیجہ نظر آتی ہے۔۸۴؎ جو تعلیم نسواں کی اہمیت اور اسے فروغ دینے کے لیے ۱۸۶۴ء میں لکھی گئی۔ اس سے قبل بھی ۱۸۶۱ء میں مولانا آزاد لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کے لیے "آئینہ صحت" کے نام سے کتاب لکھ چکے تھے جو اس موضوع سے ان کی دلچسپی کی عکاس ہے۔ حکومت کی جانب سے پسند کیے جانے اور انعام کی حقدار قرار پانے کے باوجود "آئینہ صحت" عدم توجہی اور حوصلہ افزائی نہ ہونے سے منظر عام پر نہ آسکی۔ ڈاکٹر فرخی کے مطابق مذکورہ عبارت سے اس کی بس نشاندہی ملتی ہے۔

"کتاب "آئینہ صحت" مصنفہ محمد حسین آزاد کی پیش کی ہوئی"

حکم ہوا

کتاب مذکور کو بذریعہ حکم ہذا سائل کے پاس بھیج کر لکھا جائے کہ کتاب مفید معلوم ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سائل نے بصلاح ارباب کمیٹی سکھشا سبھا لاہور سے واسطے تعلیم مکاتب زنانہ واقع لاہور، امرتسر تصنیف کی ہے۔ پس وہی صاحب کمیٹی اس کو چھپوا دیں گے اس وقت ہم واسطے انعام

کے گورنمنٹ میں رپورٹ کریں گے۔

تحریر ۱۶ جنوری ۱۸۶۲ء''۸۵

''آئینہ صحت'' کے بعد ''نصیحت کا کرن پھول'' بھی تعلیم نسواں کی خاطر لکھی گئی۔ محمد ابراہیم نے اس کتاب کی تمہید میں اسے ۱۸۶۴ء کا تحریر کردہ قصہ قرار دیا ہے کہ اس کے مسودے کے آخر میں پنڈت من پھول کے قلم سے یادداشت مورخہ ۱۲ جون ۱۸۶۴ء لگی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکام وقت کی ایما پر تعلیم نسواں کی ترقی کی غرض سے یہ کتاب مولانا آزاد سے لکھوائی گئی تھی۔ خود مذکورہ قصہ کے متن میں ''چدرہ ماہ دسمبر ۱۸۶۴ء''۸۶ کے حوالہ سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس قصہ کا سال تصنیف ۱۸۶۴ء ہے لیکن یہ کتاب بیالیس برس بعد مولانا آزاد کے بیٹے محمد ابراہیم نے شائع کی۔ کتاب کے عنوان ''نصیحت کا کرن پھول'' کی نسبت ڈاکٹر اسلم فرخی کا کہنا ہے کہ ''اس کا مقصد ایک طرف پنڈت من پھول کی خوشنودیٔ مزاج حاصل کرنا تھا جو لیفٹیننٹ گورنر کے میر منشی تھے۔''۸۷

''نصیحت کا کرن پھول'' کے قصہ کے پلاٹ میں تعلیم نسواں کی نسبت ایک میاں (مرزا شریف) اور اس کی بیوی کے درمیان ہونے والی دلچسپ گفتگو سے کہانی کا تاروپود بنادیا گیا ہے۔ تعلیمی نقطۂ نظر سے رواں اردو نثر میں لڑکیوں کے پڑھنے کے لیے مفید اور عمدہ کتاب ہے۔ جس میں آسان اور سیدھے سادے فقرے، روزمرہ بول چال کے انداز میں تعلیم نسواں کی اہمیت ایک کہانی کی صورت میں بخوبی بیان کیا ہے۔ یہ بیانیہ انداز میں ایک سیدھا سادا قصہ ہے لیکن اس کا نتیجہ معنویت سے بھرپور ہے۔ جس میں ایک ایرانی سوداگر (مرزا شریف) کے گھر بیٹی (سعیدہ) پیدا ہوتی ہے جبکہ اس کی بیوی اولادِ نرینہ کی خواہش رکھتی ہے۔ بیٹی کی پیدائش پر وہ رنجیدہ ہو جاتی ہے جس پر مرزا شریف اسے سمجھاتا ہے کہ خدا کی دین پر رنجیدہ خاطر نہیں ہونا چاہیے۔ بیٹی بھی بیٹے جیسی ہوتی ہے۔ اصل چیز تعلیم و تربیت ہوتی ہے۔ مرزا شریف بیوی کو اس انداز میں سمجھاتا ہے:

> ''بیٹے میں کیا ہے جو بیٹی میں نہیں ہے ہاں بزرگوں کی لیاقت اور تربیت شرط ہے مجھے تو اب سفر درپیش ہے اس واسطے کچھ نہیں ہو سکتا۔ لیکن تم یہاں موجود ہو سعیدہ کو تربیت کرو اور اسے پڑھاؤ لکھاؤ انشاء اللہ یہی تمہارے واسطے فرزند ہے۔ بی بی سن کر ہنسنے لگی اور کہا کہ صاحب تمہیں کچھ خبر ہے بھلا لڑکیاں بھی کہیں پڑھی لکھی ہوتی ہیں؟ مرزا نے کہا کہ خیال کرو جن ماں باپ کی اولاد لڑکا انہیں کی اولاد لڑکی۔ جیسے ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک، ہوش، حواس اس کے ویسے ہی اس کے پھر کیا معنی کہ لڑکا تو پڑھے اور لڑکی لکھ پڑھ نہ سکے۔ مگر بڑی خرابی یہ ہے کہ اس بیچاری کے حال پر کوئی توجہ نہیں کرتا اس واسطے کام کاج جو ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے تو وہ کر لیتی ہے پڑھنا لکھنا جو عقل اور سمجھ سے تعلق رکھتا ہے اس سے معذور رہ جاتی ہے۔''۸۸

جب سعیدہ کچھ سمجھدار ہوتی ہے تو مرزا شریف کو چین کے سفر پر جانا پڑتا ہے جس پر بیوی آزردہ ہو کر کہتی ہے کہ اگر خدا نے بیٹی کی بجائے بیٹا دیا ہوتا تو خط و کتابت کے ذریعے خیریت لکھتا اور دریافت کرتا رہتا اس پر مرزا شریف پھر سے بیوی کو سمجھاتا ہے کہ بیٹی بھی یہ کام کر سکتی ہے اور اسے عورتوں کی تعلیم کے متعلق بتاتا ہے۔یہاں لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق دو نقطہ نظر سامنے آتے ہیں اول: قدیم اور دوم: جدید۔اولذکر کی عکاسی بیوی کی باتوں سے ہوتی ہے جس میں لڑکیوں کو پڑھانا معیوب سمجھا جاتا ہے اور موخر الذکر کی ترجمانی مرزا شریف کے خیالات کرتے ہیں جس میں وہ تعلیم نسواں کی اہمیت کو دلائل سے ثابت کرتے ہوئے بیوی کو ان الفاظ میں قائل کرتا ہے:

> ''اگر تم کو علم ہوتا اور کتابیں پڑھتیں تو اگلے پچھلے لوگوں کا حال معلوم ہوتا تو جانتیں کہ کیسی کیسی صاحب علم اور سگھڑ بیباں گزری ہیں دور کیوں جاؤ اب ہماری ولایت میں چل کر دیکھو ہزاروں مستورات پڑھی لکھی موجود ہیں تمہیں یاد نہیں تبریز سے جو میرے پاس خط آتے تھے ان میں میری والدہ مرحومہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا پرچہ ہوتا تھا۔دیکھو کیا خوشخط اور شیریں قلم لکھتی تھیں۔بی بی نے کہا: مرد تو اس واسطے پڑھتے ہیں کہ ان کی گذران کا یہی وسیلہ ہے۔عورتوں کو کیا ضرور ہے اللہ مردوں کو ان کے سر پر قائم رکھے۔کیا خدا نہ کرے انہیں نوکری کرنی ہے۔مرزا نے کہا: یہ تو تم سچ کہتی ہو کہ انہیں لکھنے پڑھنے کی نوکری نہیں کرنی لیکن حقیقت میں علم فقط روٹی ہی کمانے کے لیے نہیں بلکہ خدا کی خدائی اور بندہ کی بندگی بغیر علم کے دل پر کھلتی نہیں۔''۸۹؎

مرزا شریف یہیں پر بس نہیں کرتا بلکہ بیوی کو علم کے فوائد باور کرانے کی کامیاب کوشش کرتا ہے اور بیوی سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

> ''کتابیں پڑھتے ہیں اس میں حالات اور سرگذشتیں اگلے لوگوں کی دیکھتے ہیں ہر ایک بات کی نیکی بدی میں اوروں کا تجربہ دیکھ کر ان کی عقل اصلاح پاتی ہے اور پختگی حاصل ہوتی ہے لیکن عورتوں گھروں کی بیٹھنے والیوں کو یہ بات تو نہیں حاصل ہو سکتی۔البتہ ایک رستہ علم کا ہے اس کے وسیلے سے اگر چاہیں تو گھر بیٹھی تمام جہان کی سیر کریں۔''۹۰؎

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بیٹی کی تعلیم کے لیے ادیب النساء نامی استانی رکھی جاتی ہے اور مرزا شریف سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔دوران سفر وہ مختلف شہروں ، دہلی، لاہور، کلکتہ، پٹیالہ، بنارس وغیرہ کے حالات اپنی بیٹی کو خط میں لکھتا رہتا ہے۔بنارس شہر کا حال بیان کرتے ہوئے ایک بات سے بے حد متاثر ہوتا ہے اور اپنی بیٹی کو علم کی ترغیب دلانے کے لیے خط میں لکھتا ہے اور وہاں کی ایک مجلس علمی کے تحت عورتوں کے مکتب کے قیام کے بارے میں آگاہ کرتا ہے۔سعیدہ اس سے بہت متاثر ہوتی ہے اور ماں سے اصرار کرتی ہے کہ اپنے یہاں بھی

مکتب کا سلسلہ شروع ہونا چاہیے۔ ماں بیٹی کی بات مان جاتی ہے اور محلے کی لڑکیاں اس مکتب میں تعلیم پانے لگتی ہیں۔ سعیدہ کی اپنے باپ کے ساتھ خط وکتابت جاری رہتی ہے۔ خطوط بظاہر واقعات سفر کی روداد پر مبنی ہوتے تھے لیکن ان سے سعیدہ کی معلومات میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ مرزا شریف چین پہنچ کر وہاں کے حالات بھی لکھتا ہے۔ چین میں اپنے تمام کاموں سے فراغت پا کر واپسی کا سفر کرتا ہے اور کامل پانچ برس بعد خیریت سے گھر پہنچتا ہے۔ بیٹی جوان ہو چکی ہوتی ہے اس کے پڑھنے لکھنے کا شہرہ ہوتا ہے اس کے اچھے پیغام آنا شروع ہوتے ہیں جس پر اس کی شادی اکبر آباد کے ایک رئیس کے بیٹے مبارک حسین خان کے ساتھ طے پاتی ہے۔ شادی پر مرزا شریف نہ تو فضول خرچی کرتا ہے اور نہ ہی کوئی فضول رسم ادا ہونے دیتا ہے۔ سعیدہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش وخرم رہنے لگتی ہے اور یوں اس قصے کا اختتام ہو جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے قصے کے ضمن میں 'مثنوی' کی صورت میں نظم کی پیوندکاری بھی کی ہے۔ درسی کتب کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس وقت جتنی بھی درسی ونصابی کتب لکھی جاتی تھیں ان میں نثر کے ساتھ نظم کا حصہ بھی شامل کیا جاتا تھا۔

بظاہر قصہ تمثیلی صورت میں آغاز سے اختتام تک چلتا رہتا ہے جس میں یکسانیت کی کیفیت بھی ملتی ہے لیکن اس قصے کی تمام تر خوبی اسکے موضوع اور انداز بیان پر منحصر ہے چونکہ اس زمانے میں ہندوستان بھر میں لڑکیوں کی پڑھائی کے لیے مناسب انتظام نہیں تھا۔ ۱۸۶۱ء میں بالخصوص تعلیم نسواں پر توجہ دی جانے لگی۔ اس لیے اس زمانے میں تعلیم نسواں کی اہمیت کو اجاگر کرنے کے لیے جو معلومات اس میں دی گئی ہیں یقیناً قابل قدر ہیں۔ اس حوالے سے ریل کی ساخت، زمین کا جغرافیہ، جہازوں کی شکل، موتیوں کا دریاؤں سے نکلنا اور شادی بیاہ کی رسموں پر دلیل سے روشنی ڈالنا وغیرہ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اس قصے کے ذریعے مولانا آزاد نے سماج میں موجود ناپسندیدہ خیالات مثلاً بیٹی کی پیدائش کو معیوب سمجھنا، لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دینا، لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کرنا؛ کم علمی اور جہالت کی وجہ سے تعویذ گنڈوں کو ہی تمام پریشانیوں کا حل سمجھنا وغیرہ کی اصلاح کی ہے۔ کہانی میں جہاں تعلیم نسواں کی اہمیت بیان ہوئی ہے وہاں پر مولانا آزاد نے انگریزی عملداری میں ہندوستان کو پہنچنے والے ثمرات کو بھی سراہا ہے جس کا ایک مقصد اس وقت انگریز سرکار کی خوشنودگی حاصل کرنا بھی تھا اور یہ خصوصیت تقریباً ہر درسی کتاب میں پائی جاتی تھی چنانچہ مولانا آزاد پٹیالہ شہر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''چونکہ رستہ میں تین عملداریاں برابر ہندوستانی تھیں سڑک کا نشاں تک نہ تھا۔ گاڑی کے ہچکولوں سے بدن شل ہو گیا۔ رستہ میں سرا کا نام نہ تھا۔ گاؤں پہنچ کر کبھی کسی ٹوٹی پھوٹی دکان میں کبھی فقیر کے تکیے میں، کبھی کسی مسجد میں اترنا پڑتا۔ کھانے کی بڑی دقت اٹھائی کہ سوار کر کرکے آئے اور

گھن کھائی دال کے کوئی چیز نہ تھی سو بھی کہیں ملی وہ بھی نہیں اور اگر ملی تو پکانے والا کوئی نہیں اس حالت میں سرکار انگریزی کی عملداری یاد آتی تھی اور بے اختیار دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔ جب گاڑی ریت میں پھنس جاتی تو سڑک پختہ اپنی سرکار کی یاد آتی تھی ۔ رستہ میں اگر رات کو چلنے کا ارادہ کرتا تو اگوے کے بغیر ایک قدم اٹھانا نا مناسب ہوتا تھا۔ وہ بات کہاں کہ سڑک سیدھی صاف مثل کہکشاں بنی ہوتی ہے۔"[۹۱]

قصہ کا موضوع اصلاحی ہے جس میں بنیادی طور پر مکتب کی سطح پر لڑکیوں کی تعلیم کی تبلیغ و اشاعت پر داستانوی انداز میں زور دیا گیا ہے۔ مرقع کشی مولانا آزاد کے اسلوب کا خاص وصف ہے جو اس ناول میں بھی نمایاں ہے۔ "پیکن یعنی تخت گاہ چین کا حال" کی لفظی تصویر ملاحظہ ہو:

"بازار اور راستے سیدھے اور کشادہ بیچ میں نہر جاری ہے چوری چکاری کے بندوبست کے لیے حکم ہے کہ رات کو کوئی شخص بغیر روشنی کے نہ نکلے۔ شہر کے بیچوں بیچ میں ایک بڑا تالاب ہے اس کا طول ایک کوس اور عرض اس سے کچھ کم ہے بہت عمدہ اور خوبصورت بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف بید مجنوں کے درخت ہیں۔ بیچوں بیچ میں ایک مندر نہایت خوشنما بنا ہوا ہے اور عمارت میں بڑی بڑی صنعتیں اور کاری گری کام میں لائے ہیں۔ سنہری، روپہلی اور رنگ آمیزی کی گلکاری سے جڑاؤ اور مرصع کاری کو مات کر دیا ہے۔"[۹۲]

"نصیحت کا کرن پھول" کا بغور مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے قصہ میں ایک ناول کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ بالکل ویسی ہی جیسی کہ ہمیں ڈپٹی نذیر احمد کے ہاں نظر آتی ہیں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا آزاد کی اس تصنیف میں ناول اپنی خام صورت میں موجود ہے اس اعتبار سے مولانا آزاد کو اولیت حاصل ہو جاتی ہے کہ اصلاحی نقطہ سے پہلے پہل انہوں نے "نصیحت کا کرن پھول" کی صورت میں ناول لکھا۔ جس کو بنیاد بنا کر بعد ازاں ڈپٹی نذیر احمد نے ناول نگاری کی۔ گو کہ مولانا آزاد نے ڈپٹی نذیر احمد کی طرح بالخصوص اس طرح کی کہانیاں تواتر کے ساتھ نہیں لکھیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مولانا آزاد حال اور مستقبل کی بجائے ماضی سے والہانہ محبت اور لگاؤ رکھنے والے انسان تھے۔

"نصیحت کا کرن پھول" میں پلاٹ بھی ہے کردار نگاری، مکالمہ نگاری، جزئیات نگاری، منظر نگاری، مخصوص نقطہ نظر، دلچسپ انداز بیان سبھی کچھ موجود ہے۔ کہانی میں خط و کتابت کی تکنیک استعمال کی گئی ہے جو کہ لدھیانہ، پٹیالہ، لاہور، کلکتہ، آگرہ، بنارس، انبالہ اور چین کے سفر کے دوران لکھے گئے۔ مقالہ نگار کے خیال میں مولانا آزاد

اس ناول کی تکنیک کے اعتبار سے ڈاکٹر گریگری کے ناول جس کا ترجمہ پنڈت موتی لال نے "طلسم فرہنگ" یعنی سحر جلدل کے نام سے کیا۔ اس سے متاثر نظر آتے ہیں کیونکہ اس ناول میں بھی مختلف موضوعات کو خطوط کی تکنیک میں بیان کیا گیا ہے۔ پنڈت موتی لال کے ترجمہ شدہ ناول کی نشاندہی عظیم الشان صدیقی نے کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یقیناً یہ ۱۸۶۴ء سے قبل شائع ہوا ہوگا۔ کیونکہ محمد حسین آزاد کا "نصیحت کا کرن پھول" ایک ایسا ہی ناول ہے جو اس کی تکنیک اور موضوع سے بے حد مماثلت رکھتا ہے جبکہ اسلوب بیان کے حوالے سے مولانا آزاد نے داستانوی انداز اختیار کیا ہے جس سے دلچسپی کا عنصر برقرار رہتا ہے مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> "ایک شخص مرزا شریف نام سوداگر پیشہ ایران سے وارد ہندوستان ہوا۔ آدمی نیک نیت اور خوش معاملہ تھا جیسی نیت ویسی برکت چند روز میں بہت سا نفع حاصل ہوا۔"۹۳
>
> "سیر کرنے والے ملک خیال کے اور تماشا دیکھنے والے زمانہ حال و استقبال کے بیان کرتے ہیں جب مرزا شریف سارے عزیزوں اور دوست آشناؤں سے رخصت ہو کر روانہ ہوا۔۔۔"۹۴

زبان و بیان میں تشبیہہ استعارہ سے گریز کرتے ہوئے بہت آسان اور سیدھی سادی زبان کو روزمرہ اور محاورے سے مزین کیا ہے۔ اس ضمن میں چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

> "اچھوں کے اچھے ہوتے ہیں"۹۵
>
> "ہونہار بروا کے چکنے پات"۹۶
>
> "کنوئیں کے مینڈک کو آسمان اتنا ہی دکھائی دیتا ہے جتنا کنوئیں کا منہ ہے"۹۷
>
> "آرام کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جبکہ انسان پر مصیبت پڑتی ہے"۔۹۸

"نصیحت کا کرن پھول" میں کرداری ناول کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے کیونکہ مرزا شریف کا کردار واعظ اور ناصح کا کردار ہے۔ اس کی گفتگو سے جہاں قصے کی مقصدیت یا غرض و غایت پوری ہوتی ہے وہیں ایک خامی بھی نظر آتی ہے کہ بعض جگہ پر اس کی طویل گفتگو سے اصل قصہ ناپید ہو جاتا ہے مجموعی طور پر "نصیحت کا کرن پھول" اپنی مقصدیت کو پورا کرتے ہوئے ناول کی قدرے خام لیکن اولین نقوش کی حامل کتاب ہے۔

اردو زبان کے امتحان کا نصاب:

اسے کپتان فلر اور مولوی کریم الدین نے مرتب کیا اور ۱۸۶۴ء میں مطبع پنجابی سے شائع کیا۔ میٹرک کے طلبہ کے لیے لکھا گیا یہ نصاب حصہ نثر و نظم پر مبنی تھا۔ حصہ نثر ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے جس کے مندرجات میں (ا)

انتخاب قصہ پنجاب سنگھ (۲) انتخاب الف لیلہ (۳) انتخاب آثار الصنادید جبکہ حصہ نظم ۶۲ صفحات پر ہے جس میں سودا، آتش اور ناسخ کے کلام سے انتخاب کیا گیا ہے۔

خط تقدیر:

مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس حلقہ لاہور نے ۱۸۶۴ء ۹۹ کے درمیان یہ قصہ نثر میں مخلوط بہ نظم کپتان فلر کے حکم پر تصنیف کیا اور مطبع سرکاری لاہور سے پہلی ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔ مقالہ نگار کے پیش نظر ''خط تقدیر'' کی پہلی اشاعت ہے جس کے سرورق کی عبارت درج ذیل ہے:

خط تقدیر

حسب الحکم

جناب کپتان فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر

پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب کے

مولوی کریم الدین

ڈپٹی انسپکٹر مدارس

لاہور نے

درمیان ۱۸۶۴ء تصنیف کیا اور ۱۸۶۵ء

مطبع سرکاری واقع لاہور میں باہتمام بابو چندر ناتھ متر کیوریٹر کے چھپا۔

اخلاقیات کے موضوع پر تحریر کیے گئے اس قصہ میں ناول اور تمثیل نگاری کے عناصر کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ ہر چند کہ ڈاکٹر محمود الٰہی اسے اردو کا پہلا اصلاحی ناول۱۰۰ قرار دیتے ہیں لیکن درحقیقت یہ تمثیل نگاری کے زیادہ قریب ہے۔ جس میں غیر مجسم کو مجسم بنا کر پیش کیا جاتا ہے بالفاظ دیگر حیوان یا غیر ذی روح کرداروں کے بجائے اخلاقی اور سماجی محاسن وعیوب اور اقدار کو کردار کی شکل دے کر معاشرتی پس منظر کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ ''خط تقدیر'' ایسا ہی ایک اخلاقی قصہ ہے جو تمثیلی انداز لیے ہوئے ہے۔ اس میں ایسے واقعات ہیں جو قرین قیاس ہیں ان واقعات کے ذریعے یہ باور کرایا گیا ہے کہ تدبیر کے بغیر تقدیر کا لکھا ہوا پورا نہیں ہوتا۔ لہذا محض تقدیر پر بھروسا کر کے بیٹھ رہنا اور تدبیر نہ کرنا بہت بڑی حماقت ہے۔ جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اگرچہ قصہ تمثیلی صورت میں طلباء کی اخلاقی تربیت اور ان کے شوق کو پیش نظر رکھتے ہوئے تصنیف کیا گیا لیکن

درحقیقت اس نے لاہور میں اردو نثر میں تمثیل نگاری کی روایت کو تقویت دی۔ یوں تو اردو نثر میں تمثیل نگاری کا آغاز ملا وجہی کی ''سب رس'' سے ہو چکا تھا اور بعد ازاں اس تمثیلی رجحان کا اظہار داستانوں اور قصوں میں غیر ذی روح کرداروں کی شکل میں ہوتا رہا لیکن لاہور میں لکھی گئی اردو نثر میں تمثیل نگاری کا آغاز ''جوہر عقل'' مصنفہ منشی عزیز الدین خان، اور ''خط تقدیر'' سے ہوتا ہے۔

خط تقدیر کا تمثیلی قصہ گیارہ ابواب پر مشتمل ہے جن کی تفصیل اس طرح سے ہے:

پہلی سیر: اس میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ جب آدمی تدبیر سے لاچار ہو جاتا ہے تو حیران اور پریشان ہو کر حواس باختہ رہتا ہے۔ اس وقت اس کی عقل درست نہیں ہوتی۔

دوسری سیر: اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ بچے کو علم سیکھنے پر کس طرح محنت کرنی چاہیے اور چلن اس کا کیا ہونا مناسب ہے پھر اگر روزگار درکار ہو تو سوداگری، نوکر، ہنر زراعت یہ طور کمانے کے ہیں جونسا پیشہ چاہیے اختیار کرے۔

تیسری سیر: دربار تقدیر - ممالک مشورہ باشندگان دنیا کے خصائل بلحاظ ان ملکوں کے اور قدرت خدا کا ظہور اور تقدیر اور تدبیر کا بیان کہ وہ کیا شے ہے۔

چوتھی سیر: طالب تقدیر کا عیش اڑانا، اس میں دکھایا ہے کہ جب انسان کو بغیر محنت کے دولت ملتی ہے تو وہ کس طرح برباد کرتا ہے۔

پانچویں سیر: اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ بخت اور اتفاق کو مانتے اور تدبیر کو کچھ نہیں جانتے وہ خطا کرتے ہیں اور جو بے تدبیری سے دولت کو خرچ کرتے ہیں آخر کو انجام ان کا خراب ہوتا ہے۔

چھٹی سیر: اس میں دکھایا گیا ہے کہ تدبیر ہی بگڑ جانے کا نام تقدیر کا بگڑنا ہے اور دولت اور حسن اور علم روز ازل سے کن کو ملے ہیں۔ بہت لوگوں نے بیہودہ پیشہ بنا کر دنیا کے لوگوں کو بہکانے کے لیے طریق ایجاد کیے ہیں ایسے لوگوں سے بچنا چاہیے ان کی تعلیم میں خرابی ہے۔

ساتویں سیر: اس میں یہ دکھایا ہے کہ انسان کے دل پر جو خدا کی طرف سے فیضان ہوتا ہے وہ انسان کو برائی سے بچنے کی درست تدبیر بتاتا ہے۔

آٹھویں سیر: فوائد علم کی کیا وجہ ہے جو ہندوستانی لوگ یورپ والوں کے برابر یا ہنر میں نہیں ہو سکتے۔ انگریزی سیکھنے کی ترغیب؛ سفر کرنا اور تعصب سے بچنا چاہیے تاکہ جلد ہی روشن دل ہو جائیں۔ (اس سیر میں سوال و جواب کی صورت میں فوائد علم بتائے گئے ہیں)۔

نویں سیر: حضرت سکہ کا دربار اس میں زر کا بیان ہے اور خست اور شراب خوری کی برائی، کفایت شعاری کی تعریف، خوشی حاصل کرنے کے طور کا بیان کیا ہے۔

دسویں سیر: خوبصورتی کا بیان شعراء کی تشابیہ۔

گیارہویں سیر: بادشاہی دربار میں عقل کا جانا دلیل معقول کا لانا۔ ملکہ تقدیر سے پھر ملوانا۔

مذکورہ تمام ابواب میں حسب ضرورت مثنوی، غزل، بیت، فرد کی صورت میں شعری پیوند کاری سے قصہ میں تاثیر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر باب میں مختلف موضوعات بچپن کی تعلیم و تربیت، چال چلن، تدبیر سے لاچاری، تقدیر کا کارنامہ، فضول خرچی، علم کے فوائد، یورپ کے علم و ہنر کی برتری، ہندوستانیوں کی پسماندگی، انگریزی تعلیم کی اہمیت اور برتری، بے تعصبی، کفایت شعاری، عقل کی چالاکی وغیرہ کو مدنظر رکھ کر مستان شاہ کے ذریعے قصہ بیان کیا ہے۔ اور عقل، تقدیر، چترائی، خوشی، تدبیر، دولت، خوبصورتی یا فیضان آمدنی، کفایت شعاری اور خرچ کو مجسم بنا کر ان تمثیلی کرداروں کے ذریعے قصہ کوئی کی منازل طے کی ہیں۔ قصہ کے تمام کردار اپنے عمل سے اپنی پہچان اور وضاحت کرتے ہیں مثلاً یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''چترائی نے جھٹ پٹ بن بنا چوٹی کنگھی کر کپڑے بدل چھل چھبلا اپنی شکل اور ہی بدل باتمیا زتمام ٹھیک چال چل آہستہ آہستہ خراماں خراماں شادمان و فرحان اوس مستانہ کے پاس جا کر اوسکے کان کے پاس موہنہ لگا کر چپکے سے یہہ کہدیا کہ جس کے تم طالب دیدار ہو اور جسپر تم مفتون ہو اوس نے مجکو بھیجا ہے اور یہہ پیغام دیا ہے کہ اگر ہمکو تو حقیقت میں چاہتا ہے اور دل سے ہمارا شائق ہے اور سچا ہمارا عاشق ہے تو بھی تیرا امتحان ہے کہ عقل جو کوتوال جہان ہے اوس سے اپنا سب ماجرا جو تجھ پر گذرا ہو بیان کر ساری حقیقت کھول دہر بادشاہ اسملک کا بہت بڑا دانا اور رحیم ہے نہایت رعایا پرور مہربان اور کریم ہے کیا عجب ہے جو کوتوال تیری حقیقت حال وزیر تک پہنچا دے اور وزیر بادشاہ کیخدمت میں پوست کندہ عرض کرے اور سناوے اور بادشاہ کو تیری غربت اور کلفت پر رحم آوے پھر وزیر کو حکم ہو تو تیرا سب دردوالم ہو پر یہہ شرط ہے کہ ذرا تفاوت نکرا ہو بہو سب قصہ جو تجپر بیتا ہے یا اب گذر رہا ہے بے تامل ابتدا سے انتہا تک کھ سنانا آگے تیری تقدیر ہے یہی میرے اور تیرے ملنے کی تدبیر ہے یہہ سنتے ہی مستان شاہ ہوشیار ہو گئے کہنا کہنے کو تیار ہو گئے باچھیں کھل گئیں سب کدورتیں دلکی دہل گئیں۔''[۱۰۱]

مستان شاہ اپنی کہانی اس طور عقل کے گوش گذار کرتا ہے:

> ''غریب پرور حال مختصر اس مجنونکا یہہ ہے کہ نام بند یکا طالب تقدیر ہے گھر کا دولتمند ہے نہ فقیر

ہے غریب آدمیکا بیٹا ہوں نوکری کا پیشہ کرتا ہوں حالت صبیامین جب بندہ کو ہوش آیا تو والد نے علم سکھلایا بچہ پن میں علم سیکھنے پر ایسا دھیان لگایا کہ چند سال میں اپنے ہمعصرون پر سبقت لیجا کر بڑا نام پایا میرے ہم مکتب لڑکے مجھسے سیکھنے آیا کرتے میرے ہمسبق ہمیشہ مجسے پڑھتے میرے سب اوستاد مجسے خوش رہتے ہر سال بعد امتحان کے انعام پاتا حکام کی نظروں میں سب سے اول سماتا اخلاق میرے ایسے تھے کہ ماںباپ تو خوش رہتے ہی تھے ہمسایہ کے پڑوسی قرب و جوار کے محلے والے جومجکو جانتے تھے نیکی مین مانتے تھے۔۔۔ میرا عمل بچپن سے اس نصیحت پر رہا کہ سبق یاد کر لینا اور پچھلا پڑہا ہوا نہ بہلانا وقت پر جب میرے بزرگ اجازت دیں تب کہانا کہانا بد صحبت میں نہ جانا ٹھیک دس بجے مدرسہ پہنچنا اور سبق چونکہ پہلے ہی سے یاد کرکے لیجاتا تہا اس لیے لڑکون میں سب سے اول نمبر پاتا تہا وقت تعلیم کے ایسا دہیان لگا کر پڑہتا جو لفظ نیا پایا اوس معنی اپنی زبانمیں لکھہ لیتا اور اوسی جگہ یاد کر لیتا۔''۲۰۱

یوں قصہ میں منطقی استدلال، عقلی دلائل اور حقیت نگاری کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے وہ تمثیلی ہے جس کے ذریعے تعلیم و تربیت کی اہمیت بھی اجاگر کی ہے۔ مجموعی طور پر قصہ کی فضا آغاز سے اختتام تک تمثیلی رہتی ہے اور تمثیل نگاری کے اس رجحان کو ناول کی طرف بڑھتے ہوئے شعور کی قریبی کڑی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس قصہ میں بھی انگریزوں کی آمد کے ثمرات بیان کیے گئے ہیں

''وہ زمانہ اب گیا جبکہ مسافرلوگ دہاڑے لٹا کرتے اور صدہا آدمی بکرونکی طرح کٹا کرتے اب وہ زمانہ نہیں ہے جس میں کوئی مسافر یا تاجر بدون بدرقہ یا سپاہ کے سفر نہ کرسکتا تہا ذرا قدم شہر کے باہر نہ ہر سکتا تہا۔ انگریزوں نے ایسی راہ صاف کی ہے کہ دنیا کو غارت گری سے معاوف کی ہے اس زمانہ میں اگر کوی مسافر جنگل میں سونا اچھالتا چلا جاوے تو کوئی بھی اوسکے سامنے نہ آوے۔''۲۰۳

لاہور کی اردو نثر میں ''خط تقدیر'' مقصدی، اصلاحی تمثیلی قصہ ہونے کے ساتھ ایک اور حیثیت سے بھی اہمیت کی حامل ہے اور یہ اہمیت اس قصہ کے دیباچہ کی ہے جو اردو فکشن کی تنقید میں نقش اول کی حیثیت رکھتا ہے اگر چہ مولوی کریم الدین کا مقصد فکشن کی تنقید لکھنا نہیں تھا لیکن ان کے ذہن میں جو خیالات اور تصورات پرورش پا رہے تھے جنہیں دیباچہ میں پیش کیا گیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو افسانوی ادب کو تنقیدی نگاہ سے بھی پرکھ رہے تھے۔ اس عہد میں موجود فکشن کی روایت کے پیش نظر جو نیا تنقیدی معیار مولوی کریم الدین متعارف کروا رہے تھے وہ نئے حالات اور جدید تقاضوں کا ہی نتیجہ تھا کیونکہ انیسویں صدی میں بدلتے ہوئے حالات اور جدید علوم کی روشنی نے ذہنوں کو جلا بخشی وہیں انسانی شعور میں پختگی آئی، محض خیال آرائی کی بجائے حقیقت نگاری کو

اہمیت دی جانے لگی۔ چنانچہ تمثیل نگاری کی صنف نے خط تقدیر کی صورت میں جنم لیا اور اس کے دیباچے سے لاہور میں اردو فکشن کی تنقید کا آغاز ہوا۔ جو اس عہد میں ادب اور شعور کے فطری تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ ''خط تقدیر'' کے دیباچے میں مولوی کریم الدین نے قصہ گوئی کے بدلتے ہوئے رجحان کے بارے میں جن جدید تنقیدی خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ملاحظہ ہوں:

> ''مدت سے دل میں یہہ امنگ تھی کہ تقدیر و تدبیر کا مضمون بطور قصہ لکھا جاوے بشرطیکہ مخالف کسی مذہب اور خلاف رائے اہل فلسفہ کے بھی نہو اور جو باتیں اوس میں درج ہون وے اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی ایسی طرحکے ہون جنکا اثر طبع انسان پر ہوکے بہت نیک نتیجہ پیدا کریں اور کہانی ایسی طور پر ہو کہ جو شخص پڑہے یا سنے اوسکو خیال ہو کہ یہہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے اور زبان اوس قصہ کی اردو خالص اور سلیس اور محاورات دلچسپ روزمرہ ٹہیک اشعار حسب موقع قابل یاد رکھنے کے ہوں تاکہ اس زمانہ کے طلباء کو شوق نئی تصنیف کرنے اور مضامین حقیقیہ لکھنے کی ترغیب ہو مگر ابتدائی قصوںکی روش اور اطوار کو چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے ---- چونکہ اونکو (قدیم قصہ نگاروں) خوب یقین تھا کہ قصے خوانی سے صرف یہی فائدہ ہے کہ غمگین کا دل بہلے اور ناشاد کی خاطر ناشاد ہو سواء اس کے اور کچھ غرض تصنیف قصہ سے نرکھتے تھے بلکہ وہ فائیدہ عظیم قصہ خوانیکا جو کہ اب متاخرین نے سمجھہ لیا ہے اونکے خیالمین بھی نہ آتا تھا اس لیے نہایت جہوٹی باتیں اپنی طبعیت سے اختراع کیکن پر قصہ نویسی کے نتیجے اہم اور غرض اعظم کیطرف اونکا ذہن نہ گیا وہ یہہ تہا کہ جسطرحپر قصہ خوانی سے دل بہلتا ہے اور آدمی کا غم ٹلتا ہے اوسیطرح طبائع انسانی بھی اوس قصہ کا ایسی طرحپر ہو جایا کرتا ہے کہ جس روشکی باتیں اوس کہانیمین درج ہوتی ہیں اونکے مطابق پڑہنے اور سننے والوںمین ایسی عادات پیدا ہو جاتی ہین کہ اونکو ہرگز خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم میں عادات بد یا نیک پیدا ہو گئی ہین یا آنکہ اس کہانیکا یہہ اثر ہمپر ہو گیا ہے۔''[۴۰]

مذکورہ بالا تنقیدی خیالات کا بغور مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ مولوی کریم الدین اپنے عہد میں جدید ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار کر رہے تھے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ قصہ میں ''جو باتیں اسکیں درج ہوں وے اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی ایسی طرحکے ہوں جنکا اثر طبع انسانی پر ہو'' تو درحقیقت وہ قصہ کہانی کو مقصدیت اور اصلاح کے آلہ کار کے طور پر استعمال کرنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ بالفاظ دیگر افادی ادب کی بات کر رہے تھے پھر جب یہ کہتے ہیں کہ ''کہانی ایسی طور پر ہو کہ جو شخص پڑہے یا سنے اوسکو خیال ہو کہ یہہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے'' تو وہ حقیقت نگاری پر زور دیتے ہوئے ادب برائے زندگی کے نظریہ کو بیان کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ قصہ نگاری کے اصلاحی مقصدی اور حقیقی زندگی پر مبنی عناصر کی اہمیت واضح کر رہے تھے جسے بیسویں صدی کی چوتھی

دہائی میں ترقی پسند تحریک نے اپنا واضح منشور بنایا۔ اس کے اولین نقوش اس دیباچہ کی صورت میں انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں مولوی کریم الدین بیان کر رہے تھے۔ روش عام سے ہٹ کر چلنا یعنی روایت سے بغاوت کرنا رومانیت کا طرہ امتیاز ہے۔ جوان تنقیدی خیالات میں بھی موجود ہے جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''ایشیائی قصوںکی روش اور اطوار کو چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے۔'' تو ان کے خیالات میں رومانیت کی کارفرمائی بھی اس حد تک نظر آتی ہے کہ روش عام سے بغاوت کرتے ہوئے یہ قصہ تحریر کر رہے ہیں اور پھر کس خوبی سے چند جملوں میں قصہ نگاری کی پوری روایت پر تنقید کر ڈالی ہے۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ ''قصہ نویسی کے نتیجے اہم اور غرض اعظم کی طرف اونکا (قدیم قصہ نگاروں) ذہن نہ گیا وہ یہہ تھا کہ جسطرح قصہ خوانی سے دل بہلتا ہے اور آدمی کا غم ٹلتا ہے اوسیطرح طبائع انسانی پر اثر بھی اوس قصہ کا ایسی طرح ہوجایا کرتا ہے کہ جس روشکی باتیں اوس کہانمیں درج ہوتی ہیں اونکے مطابق پڑہنے اور سننے والوںمیں ایسی عادت پیدا ہو جاتی ہیں کہ اونکو ہرگز خبر بھی نہیں ہوتی کہ ہم مین عادات بد یا نیک پیدا ہوئی ہین یا آنکہ اس کہانیکا یہہ اثر ہمپر ہو گیا ہے۔''یعنی کہانی چونکہ انسانی فطرت پر اثر کرتی ہے اس لیے اسے بہترین آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جانا چاہیے۔مولوی کریم الدین قصہ نگاری کی روایت سے بغاوت ضرور کرتے ہیں لیکن روایتی قصہ نگاری میں ''دل کے بہلنے'' اور ''غم کے ٹلنے'' کی اہمیت و افادیت کے معترف بھی ہیں۔ یوں وہ یکسر روایت کو رد نہیں کرتے بلکہ اس کی مثبت باتوں کو بدلتے حالات اور جدید نظریات سے ہمکنار کرتے ہیں لہٰذا ان کے تنقیدی خیالات میں اعتدال بھی ہے۔

بلاشبہ اردو میں افسانوی تنقید کا آغاز اس دیباچے ہی سے ہوتا ہے۔ جس میں جدید تنقیدی شعور کا احساس واضح ہے جو تمثیل نگاری میں اساسی اہمیت رکھتا ہے جبکہ ناول میں بھی ان خیالات کی اہمیت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایک لمحے کے لیے تنقید کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ تذکرے، تبصرے اور تقریظ شعری و لسانی تنقید کی صورت میں موجود رہے ہیں جبکہ اردو فکشن میں تنقید کی روایت تقریباً معدوم تھی۔ جو تھوڑی بہت دکھائی دیتی ہے اس کی حیثیت رائے سے زیادہ نہ تھی، البتہ اردو نثری قصوں مثلاً ''سب رس''، نوطرز مرصع، باغ و بہار، داستان امیر حمزہ، فسانہ عجائب، عجائب القصص کے دیباچے میں تنقیدی اشارے ضرور موجود رہے ہیں۔لیکن اس مربوط صورت میں نہیں جیسے ''خط تقدیر'' کے دیباچے میں بیان ہوئے ہیں۔ ابتداً تخلیق کار ہی نقاد کے فرائض انجام دیتا نظر آتا ہے اس طرح تخلیق کے بطن سے ہی تنقید نے جنم لیا۔ چنانچہ درحقیقت لاہور میں اردو نثر میں فکشن کی تنقید میں جدید خیالات اور پختہ تنقیدی شعور موجود تھا۔ جس کا نقطہ آغاز ''خط تقدیر'' کا دیباچہ ہے جس کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں مولوی کریم الدین نے قدیم طرز کے قصوں پر موضوع اور اسلوب پر دو اعتبار سے تنقید کرتے ہوئے

ان سے نہ صرف بے زاری کا اظہار کیا ہے بلکہ نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ کہانی کی بنیاد انسانی تجربات و مشاہدات پر رکھی جائے تا کہ اس کا اثر طبع انسانی پر ہو اور اس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہو سکے۔ بالفاظ دیگر افسانوی ادب میں مقصدیت کی بات کرتے ہوئے ادب برائے زندگی کی بات کی گئی ہے۔

بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر مولوی کریم الدین کے ذہن میں نشوونما پانے والے جدید خیالات نے بھانپ لیا تھا کہ ایسے قصے اور کہانیوں سے اجتناب کیا جائے جن میں پڑھنے اور سننے والوں کو اپنی زندگی اور اپنا معاشرہ دکھائی نہ دے۔ اسی لیے ڈاکٹر محمود الٰہی کا یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ ''خط تقدیر'' کے دیباچے میں انہوں نے قصہ نگاری کے فن پر جو کچھ لکھا ہے اسے روایتی قصہ نگاروں کی پہلی شدید مخالفت اور نئے طرز کے قصوں کو رواج دینے کی پہلی شعوری کوشش سے تعبیر کرنا غلط نہ ہو گا۔''۱۵۵ اس حوالے سے دیکھیں تو مولوی کریم الدین ۱۸۶۲ء میں ادب میں حقیقت نگاری کی بات کرتے نظر آتے ہیں اور قصوں کو حقیقی زندگی اور معاشرے کا عکاس بنانے پر یقین رکھتے ہیں۔ نیز قصہ خوانی کی اہمیت بتاتے ہیں کہ یہ انسان کو خوشی اور انبساط کے ساتھ بصیرت اور بصارت بھی بخشتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی مرتبہ کریم الدین کے ہاں قصہ کی افادیت و مقصدیت کا احساس؛ مقصد کو فن کے سانچوں میں ڈھالنے؛ ہمہ گیر موضوعات کا انتخاب کرنے؛ قصہ کی بنیاد اخلاق و اطوار اور تجربات انسانی پر رکھنے کا شعور ملتا ہے۔ مولوی کریم الدین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قصہ چونکہ انسانی طبع پر اثر پذیر ہوتا ہے اس لیے اس سے معاشرے اور انسان کو بدلنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اس طرح افسانوی ادب کو انسان او رمعاشرے کے جذبات اور خیالات کی تطہیر کا ذریعہ بتایا ہے جو کتھارسس کا کام بھی کرتا ہے۔ معاشرے اور انسان کو بدلنے والی یہ تبدیلی کیا اور کیسی ہونی چاہیے؟ اس نقطہ کو بنیادی حیثیت دیتے ہیں۔ اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ''خط تقدیر'' کے قصے کا تانا بانا بنا ہے اور اپنے مذکورہ خیال کو عملی صورت دی ہے۔ کریم الدین عام انسان کو کہانی کا موضوع بنانے پر زور دیتے ہیں جس کی زندگی کا ایک بڑا حصہ احتجاج اور احتیاج کی نذر ہو جاتا ہے۔ جہاں ہر قدم پر مسائل کا سامنا رہتا ہے اور ان کے حل کے لیے انسان کی عقل اور تدبیر کام آتی ہے۔ افسوس! کہ اپنے عہد کے سماجی تہذیبی اور فکری پس منظر سے گہری واقفیت کی بنا پر جن پختہ تنقیدی خیالات کو کریم الدین نے دیباچہ میں بیان کیا ہے۔ اس کا مکمل عملی نمونہ ''خط تقدیر'' میں پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ اردو نثر میں دیباچہ ''خط تقدیر'' میں پہلی بار افسانوی تنقید میں انقلاب آفرین اور مدلل وضاحت کے ساتھ بات کی گئی ہے۔ اس حوالے سے مولوی کریم الدین فکشن میں پہلے باضابطہ نقاد کے طور پر بھی اپنی شناخت کرواتے ہیں۔ لہٰذا اردو افسانے کی تنقیدی تاریخ اور ارتقا کے تناظر میں ''خط تقدیر'' کا دیباچہ نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

تکریم ظہوری:

یہ کتاب مولوی کریم الدین کی تالیف کردہ ہے جو ۱۸۶۵ء میں کپتان فلر کے حکم سے طبع ہوئی۔ یہ تمیز اللغات مولفہ مولوی نیاز حسین کے طرز کی لغت ہے جس میں مولوی کریم الدین نے ''نثر دوم ظہوری'' کی تشریح کی ہے اور درسی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے اصل میں جو مترادف الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے معنی کی بھی توضیح پیش کی ہے۔ اس کے سرورق پر درج ذیل عبارت درج ہے۔

''حسب الحکم کپتان فولر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن مدارس ممالک پنجاب وغیرہ کے مولوی کریم الدین ڈپٹی انسپکٹر مدارس حلقہ لاہور نے طالب علمان پنجاب کے واسطے ۱۸۶۵ء میں تصنیف کی اور باہتمام بابو چندر ناتھ متر کیوریٹر و مہتمم کے مطبع سرکاری میں طبع ہوئی'' صفحات ۹۰ [۱۰۶]

تحریر اقلیدس:

یہ ۱۸۶۵ء میں مصنفہ بابو چندر ناتھ متر نے مدارس کے لیے لکھی۔ [۱۰۷]

اردو کا قاعدہ: [۱۰۸]

پنڈت رام دیال نے ۲۶ صفحات پر مشتمل اردو کا قاعدہ لکھا جو مطبع کوہ نور سے ۱۸۶۵ء میں شائع ہوا۔

تمیز اللغات:

مولوی نیاز حسین کی تالیف کردہ اس لغت میں عربی کے مترادف الفاظ کے اردو معنی اس طرح دیئے گئے ہیں کہ الفاظ کا معنوی فرق واضح ہو گیا ہے۔ یہ لغت ۱۸۶۵ء میں لاہور سے کپتان فلر کے حکم سے طبع ہوئی۔ [۱۰۹]

اشارات التعلیم:

۱۸۶۶ء میں جب مولوی کریم الدین حلقہ لاہور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے تو انہوں نے حسب منظوری گورنمنٹ پنجاب لاہور کے انسپکٹر مدارس سی ڈبلیو ڈبلیو الیگزینڈر کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ''اشارات التعلیم'' [۱۱۰] کے نام سے کیا۔ دراصل الیگزینڈر نے متعدد انگریزی کتب کی مدد سے ایک انتخاب کیا تھا۔ جس میں مرڈک اور ڈاکٹر اسٹو کی کتب سے زیادہ مدد لی گئی تھی۔ مولوی کریم الدین کا اردو ترجمہ ۲۸۹ صفحات پر مشتمل مطبع مطلع نور لاہور سے چھپا۔

جغرافیہ ہند (حصہ دوم):

واسطے طلباء مدارس احاطہ پنجاب کے حسب الحکم میجر فلر صاحب بہادر ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب وغیرہ ۱۸۶۶ء مطبع سرکاری لاہور باہتمام بابو چندر ناتھ متر چھپا۔

تعلیم المبتدی کا سلسلہ اور اردو کی پہلی کتاب[۱] ؛ اردو کی دوسری کتاب؛ اردو کی تیسری کتاب؛ اردو کی چوتھی کتاب:

مذکورہ کتب محمد حسین آزاد کی وہ باتصویر ریڈریں ہیں جو انہوں نے نومبتدیوں کے لیے میجر ہالرائیڈ کی ایما پر لکھیں۔ ان کتب پر مولانا آزاد کا نام تحریر نہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ محکمہ تعلیم اس بات کا مجاز تھا کہ وہ کتاب کو کسی بھی تغیر و تبدل کے ساتھ شائع کر سکتا تھا۔ یہی وجہ بنی کہ اس پر مولانا آزاد کا نام نہ آسکا ورنہ اسلوب بولتا ہے کہ یہ کتابیں آزاد ہی کی ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلا کہ محکمہ تعلیم سرورق پر کبھی مصنف، یا مرتب کا نام دیتا اور کبھی نہ دیتا۔ نہ دینے کی صورت میں سرپرستی کرنے والے محکمہ تعلیم کے انگریز افسر کا نام دے دیا جاتا، ایسا بھی ہوا کہ اولین اشاعت پر مصنف یا مرتب کا نام نہ دیا اور اگلی اشاعت پر دے دیا گیا۔

مولانا محمد حسین آزاد دہلی سے ہجرت کرتے ہوئے ۱۸۶۱ء کے اوائل میں لاہور پہنچے۔ ملکی تعلیم سے دلچسپی کی بنا پر ۱۸۶۴ء میں ماسٹر پیارے لال آشوب اور پنڈت من پھول کے توسط سے محکمہ تعلیم میں ملازمت اختیار کی۔ یہیں سے آزاد کی درسی، علمی و ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ مولانا آزاد لاہور آنے سے قبل ۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۰ء تک کا عرصہ جگراؤں میں رجب علی شاہ ارسطو جاہ کے بچوں کی تعلیم و تدریس پر مقرر رہے اس لیے وہ بچوں کی تعلیم اور ان کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے اردو کی پہلی کتاب اور اردو کی دوسری کتاب تحریر کیں تو تخیل، تعقل اور تجربے کے مراحل کی نشاندہی کرتے ہوئے بچوں کی دماغی نشوونما اور ان کے غوروفکر کے لیے نئی راہیں کھول دیں۔ آغا محمد باقر کے توسط سے پتہ چلتا ہے کہ "۱۸۶۷ء سے لے کر ۱۸۶۹ء تک مولانا بچوں کے لیے اردو کی ریڈریں تیار کرتے رہے۔"[۲]

جے ایف بلوم ہارٹ کی فہرست اردو کتب سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کی پہلی کتاب کا چھٹا اور ساتواں ایڈیشن جبکہ اردو کی دوسری کتاب کا چھٹا ایڈیشن ۱۸۷۰ء میں مطبع سرکاری سے شائع ہوئے۔[۳] جس پر مصنف کا نام نہیں ہے۔ اس سے مبتدیوں کے اس سلسلہ کتب کی مقبولیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۸۷۰ء ہی میں ان کی اشاعت چھٹے ساتویں ایڈیشن تک پہنچ گئی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق آزاد نے تعلیمی تصانیف کے دو سلسلے قدیم اور جدید مرتب کیے۔ سلسلہ قدیم اردو کی پہلی کتاب اور اردو کی دوسری کتاب پر مشتمل ہے۔ جس کا تذکرہ محکمہ تعلیم کی دستاویز بتاریخ ۲۵ ستمبر ۱۸۸۵ء میں ملتا ہے لیکن اس سلسلہ کی کوئی کتاب دستیاب نہیں جبکہ سلسلہ جدید اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب، اردو کی تیسری کتاب، اردو کی چوتھی کتاب پر مشتمل ہے۔[۴] مذکورہ کتب پر آزاد کا

نام تحریر نہ ہونے کا گلہ ڈاکٹر اسلم فرخی نے بھی اس طرح کیا ہے کہ ''آزاد کی ان کتابوں نے ملک گیر شہرت حاصل کی لیکن ان کے ساتھ سب سے بڑا ستم یہ ہوا کہ ان کی یہ محنت ان کے نام سے شائع نہ ہوئی بلکہ ان کتابوں پر پنجاب کے ناظم تعلیمات ہالرائیڈ کا نام دیا گیا اور یہ عبارت لکھی گئی:

Edit by Colonel W.R.M. Holroyd-DPI Punjab with the aid of Native Scholar.

مرتبہ کرنل ہالرائیڈ ناظم تعلیمات پنجاب بداعانت ملکی علما''۱۱۵

ایسا اکثر ہوا کرتا ہو گا کہ تصنیف مقامی مصنف سے لکھوائی جاتی جبکہ نام محکمہ تعلیم کے افسران کا دیا جاتا اس بات کی سند کے طور پر رائے ایل سنجھے مول صاحب (Rai L. Sanjhi Mull Sahib) نے ''ڈائریکٹر، پروفیسر اور ریاضیاتی مسئلے سے متعلق'' جو روداد بیان کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے:

> ''سال ۱۸۶۷ء میں ایک تکلیف دہ واقعہ رونما ہوا۔ جس کا مجھے اب بھی بہت افسوس ہے ہوا کچھ یوں کہ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن (Director Public Instruction) نے پروفیسر کرنیک کو ریاضی کے انتہائی مشکل نوعیت کے سوالات بھیجے۔ پروفیسر صاحب نے مجھے حکم دیا کہ ان کو حل کروں میں نے ایسا ہی کیا اور انہوں نے میرے تمام حل شدہ سوالات سوائے آخری سوال کے غور سے پڑھے اور ڈائریکٹر کو بھیج دیئے۔ آخری سوال انہوں نے یہ سوچتے ہوئے غور سے نہ دیکھا کہ یہ بھی درست ہی ہو گا۔ ڈائریکٹر نے ان سوالات کو اپنے نام سے چھپوا لیا۔ مگر بدقسمتی سے میرا حل کردہ آخری جواب غلط نکلا اور اس کے باعث کچھ انگریزی اخباروں نے ڈائریکٹر پر سخت نکتہ چینی کی اس کے نتیجہ میں ڈائریکٹر پروفیسر صاحب سے خفا ہو گئے اور انہیں لکھ بھیجا کہ وہ اگلے روز کالج آئے گا اور دیکھے گا کہ پروفیسر نے آخری سوال کس طرح حل کیا۔ اسی دن پروفیسر زرد چہرے اور پریشان کن موڈ میں کالج آئے میں نے پوچھا سر! کیا مسئلہ ہے آپ اتنے پریشان نظر آتے ہیں'' انہوں نے کہا ''اس سوال کو غلط حل کرنے کی وجہ سے ڈائریکٹر مجھ پر ناراض ہے'' اور پھر انہوں نے مجھے تفصیل بتائی میں نے دوبارہ اس آخری سوال کو حل کرنے کی کوشش کی اور میرا جواب اس مرتبہ درست نکل آیا۔ پروفیسر یہ دیکھ کر بہت خوش ہوا مگر وہ یہ بھی سوچ رہے تھے کہ ڈائریکٹر کو کس طرح جواب دیا جائے۔ میں نے کہا ''استادِ محترم، آپ ساری ذمہ داری میرے سر تھوپ دیں اور یوں آپ بچ جائیں گے''۔ انہوں نے جواب دیا ''میں ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ یوں تو تم اپنی مالی امداد سے محروم ہو جاؤ گے'' اسی لمحے ڈائریکٹر اندر داخل ہوا اور پروفیسر سے کہا کہ وہ اس سوال کو حل کرے مگر وہ ایک بوڑھے اور شکستہ آدمی ہونے کے باعث دم بخود رہے۔ میں یہ دیکھتے ہی فوراً اٹھا اور سوال کو ٹھیک طرح سے حل کر دیا۔ میں نے

کہا:"یہ میں ہی تھا جس نے یہ سوال غلط حل کیا تھا لہٰذا صرف میں ہی قصوروار ہوں نہ کہ پروفیسر صاحب جنھوں نے اب اسے درست حل کر دیا ہے۔ میں آپ سے معافی کا طلب گار ہوں" ڈائریکٹر یہ سن کر مسکرایا اور یہ کہتے ہوئے کہ "آئندہ خیال رکھنا" چلا گیا۔"[۱۶]

اس واقعہ سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کی ان درسی کتب کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہو گا کہ لکھیں آزاد نے اور اس پر ہالرائیڈ کا نام دے کر مولانا آزاد کے لیے "Native Scholar" کا لفظ استعمال کیا گیا ہو گا۔لہٰذا مذکورہ درسی کتب کے اسلوب سے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ یہ Native Scholar آزاد ہی تھے۔

اب ڈاکٹر انجم رحمانی کا یہ اعتراض کہ ۱۸۶۷ تا ۱۸۶۹ء کے تین سالہ عرصہ میں اتنی تعداد میں درسی کتب کی تکمیل آزاد کے بس کا روگ نہ تھیں۔[۱۷]لیکن مقالہ نگار کا استدلال ہے کہ اس دور میں مولانا آزاد کی اردو علمی و ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ زور وشور سے جاری تھا۔جس کا آغاز لاہور میں ۱۸۶۴ء سے ہو چکا تھا۔ پنجاب بک ڈپو کی مصروفیات کیساتھ، آئینہ صحت، نصیحت کا کرن پھول، سرکاری اخبار، رسالہ انجمن پنجاب، اتالیق پنجاب کی ایڈیٹری اور ان رسائل میں مضامین کی کثرت اس بات کی عکاسی ہے کہ تین سال کے دوران میں ان درسی کتب کی تخلیق مولانا محمد حسین آزاد کے لیے کچھ ایسی ناممکن بات بھی نہ تھی۔

محمد حسین آزاد نے اردو نثر میں ان درسی کتابوں میں ادب اور سائنس کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔حیوانات اور نیچر کے موضوعات تاریخی اور جغرافیائی معلومات کو مشاہدے اور تجربے کی کارفرمائی سے صحیح معنوں میں ذہن کو بیدار کرنے کے ساتھ اخلاقی تلقین بھی کی ہے۔مولانا آزاد سائنٹیفک طریقہ کار کو دلچسپ حکایاتی انداز سے ہم آہنگ کر کے تعلیم دینے کے قائل نظر آتے ہیں۔ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق انگریزوں کی تعلیمی پالیسی کا اندازہ بھی ان درسی کتب کے تعارفی نوٹ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو ابتدائی اشاعتوں کے سرورق پر موجود تھا لیکن بعد کی اشاعتوں سے خارج کر دیا گیا مقالہ نگار کے خیال میں اس دور میں تعلیمی نصب العین کے ساتھ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کس طرح درسی کتب کی وجہ سے اردو نثر میں موضوعات اور اسلوب میں نکھار اور بہتری آئی اور اسے فروغ ملنا شروع ہوا۔ جو مستقبل میں ادبی نثر کی بنیادیں استوار کرنے کا باعث بنا۔ یہ تعارفی نوٹ نہ صرف ان درسی کتب کی بلکہ عمومی لحاظ سے محکمہ تعلیم کے تصنیف و تالیف کے مطمعٔ نظر کو بھی واضح کرتا ہے:

"اردو کی پہلی دوسری تیسری کتابوں میں دو باتوں کا بڑا خیال رکھا ہے۔اول تو عبارت ایسی ہو کہ لڑکے آسانی سے پڑھنے لگیں۔ دوسرے ابتداء میں ان چیزوں کا بیان ہو جو ہر وقت آنکھوں کے

سامنے ہوتی ہیں اور بیان اس طرح ہو جس کے پڑھنے سے ان چیزوں کے باب میں سوچنے سمجھنے کی عادت پڑے تاکہ جب نئی چیزیں دیکھیں تو آگے غور کرنے کا رستہ دلوں میں پیدا ہو۔ اس طرح آہستہ آہستہ حیوانات، نباتات، معدنیات کا علم حاصل کریں۔ زراعت اور دنیا کے کاروبار کی مفید مفید باتیں معلوم ہوں اور قدرتی ظہور مثلاً صبح، شام، سورج، چاند، ہوا، ابر، مینہ، برف وغیرہ کے حالات روشن ہوں اور لڑکے سمجھنے لگیں کہ موسم کیوں بدلتے ہیں دن اور رات کیوں گھٹتے بڑھتے ہیں؟ بادل کیونکر بنتے ہیں؟ مینہ کیوں برستا ہے؟ ہوا کیوں چلتی ہے؟ اس کے علاوہ جو ملک نہیں دیکھے ان کے حالات آسان آسان بیانوں میں بتائے جائیں۔

بیان کا ڈھنگ ایسا رکھا ہے جس سے لڑکوں کو راستی کی طرف توجہ ہو اور نیک اور پاکیزہ باتوں کی محبت دل میں بیٹھے ان سب کتابوں میں بہت سی تصویریں ہیں کہ آپ اپنے بیان کی حالتیں دکھاتی ہیں۔ یورپ کا بچہ بچہ فقط تصویر کے دیکھنے سے بہت سی باتیں سمجھ جاتا ہے اور جو لوگ سفر نہیں کرتے وہ گھر بیٹھے تصویروں ہی سے ملکوں کی اصل کیفیت معلوم کر لیتے ہیں لیکن اکثر اہل ہند کو تصویر کی باریکیاں سمجھنی ایسی مشکل ہے جیسے غیر زبان کی کتابیں ایک بیل یا گھوڑے، کتے کا صاف صاف خاکہ کھینچا ہو تو فقط اتنا پہچان لیتے ہیں کہ یہ اس جانور کی تصویر ہے اگر وہ کسی جگہ کی تصویر ہو تو اتنا نہیں بتا سکتے کہ اس میں زمین کہاں ہے؟ پانی کہاں ہے؟ بادل کونسا ہے؟ پہاڑ کون سا ہے؟ کس کس قسم کے درخت ہیں؟ کیا یہ چیز پاس ہے؟ کیا دور ہے؟ جب یہاں بھی یورپ کی طرح بچوں میں تصویروں کا رواج ہو جائے گا تو سب اس طرح سمجھنے لگیں گے اور اس کا لطف اٹھائیں گے۔ عبارت صاف اور صحیح پڑھنے کے واسطے ان باتوں کی رعایت رکھی ہے ایک ایک لفظ الگ الگ لکھا ہوا ہے۔ اپنے اپنے موقع پر وقف کی علامتیں دی ہیں۔ املا میں تمیز رکھی ہے لفظوں پر کہیں کہیں اعراب دیئے ہوئے ہیں مگر اعرابوں کے قاعدے ایسے باندھے ہیں کہ جہاں اعراب نہیں لکھے وہاں بھی سمجھ میں آتے ہیں گویا سارے حرفوں پر اعراب آ گئے ہیں۔"[۸۸]

اردو کی پہلی کتاب میں روزمرہ زندگی کے ایسے باتصویر مناظر اور ماحول کو پیش کیا گیا ہے جن سے ہم سب واقفیت رکھتے ہیں۔ نیز اس میں مانوس اشیاء کو متحرک صورت میں اس دلکش انداز سے بیان کیا ہے کہ ان اشیاء سے اجنبیت کا عنصر بالکل محسوس نہیں ہوتا۔ اردو کی پہلی کتاب کے چند عنوانات سے ہی اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے مثلاً

۱۔ ماں کی محبت	۲۔ کھانا پک رہا ہے۔
۳۔ لڑکا مدرسہ جاتا ہے	۴۔ لڑکے کھیل رہے ہیں
۵۔ مولوی صاحب کا گھوڑا	۶۔ پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں

۷۔ کسان ہل جوت رہا ہے ۸۔ یکے کی سواری

۹۔ درزی کپڑے سی رہا ہے ۱۰۔ بنئے کی دکان

۱۱۔ جلاہا کپڑے بن رہا ہے

چنانچہ زندگی کے روزمرہ مناظر کو اس طرح پیش کیا ہے جس کا عام زندگی میں بچہ مشاہدہ کرتا ہے اور انہی مانوس مناظر کو لفظوں کے ذریعے پڑھنے اور بیان کرنے کی تربیت پاتے ہوئے وہ سیکھنے کے اولین مرحلے تخیل سے تعقّل کی اگلی منزل پر پہنچتا ہے۔ اردو کی دوسری کتاب مختصر سی ہے جس کے موضوعات جانور، درخت، وقت اور موسم ہیں جبکہ اردو کی تیسری کتاب میں دودھ پلانے والے جانور، پرندے، درخت کے موضوعات کے علاوہ تاریخی شخصیات، لطائف و حکایات مثلاً امیر ناصر الدین غزنوی، سلطان محمود غزنوی، ظہیر الدین بابر، انا کی جاںنثاری، پرتاپ کی بہادری وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ اردو کی چوتھی کتاب کے موضوعات میں جانوروں کا بیان، پرندوں کا بیان، کیڑوں کا بیان اور درختوں کا بیان شامل ہیں۔

محمد حسین آزاد نے ان کتب پر کتنی محنت اور توجہ دی اس حوالے سے خود ان کا بیان یہ ہے کہ ''یہ کام بڑا مشکل تھا۔ بوڑھا ہو کر بچہ بننا پڑا شب و روز اسی خیال میں رہتا تھا کام کرنے کا زمانہ اور تمام دماغی صلاحیتیں اسی کام میں صرف ہو گئیں جب کہیں جا کر بچوں کے لیے یہ کھلونے تیار ہوئے۔''[۱۱۹] اسی طرح ایک اور جگہ ان کا یہ کہنا کہ ''بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سررشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انہوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک انسان خود بچہ نہ بن جائے تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب نہیں لکھ سکتا پھر انہیں بار بار کاٹنا، بنانا، لکھنا اور مٹانا۔ بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا پھرتے چلتے جاگتے سوتے، بچوں ہی کے خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔''[۱۲۰] محمد حسین آزاد کے ان بیانات کی روشنی میں ڈاکٹر انجم رحمانی کا وہ اعتراض اپنی اہمیت کھو دیتا ہے کہ ''عرصہ تین سال میں ۱۸۶۷ء تا ۱۸۶۹ء آٹھ اردو، سیاحت، حساب، جغرافیہ وغیرہ کی کتابوں کی تکمیل محمد حسین آزاد کے بس کا روگ نہ تھا۔''[۱۲۰]

یوں تو موضوع کے اعتبار سے چاروں درسی کتب میں یکسانیت نظر آتی ہے لیکن محمد حسین آزاد کا کمال یہ رہا ہے کہ انہوں نے مختلف عمر کے بچوں کی ذہنی ساخت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے لیے موزوں اور خوبصورت تصاویر کے ذریعے مفید معلومات کا اہتمام کیا۔ معنوی اور صوری ہر دو اعتبار سے یہ نئی اور انوکھی طرز کی کتابیں تو

تھیں ہی وہیں ان میں ایک نئی بات رموز اوقاف کا سائنٹفک استعمال بھی دکھائی دیتا ہے جو اس سے قبل تقریباً مفقود تھا۔ ان درسی کتب کے لیے مولانا آزاد نے سیدھا سادا حقیقی زندگی سے قریب تر اسلوب اختیار کیا ہے ان کے کردار روزمرہ کی زبان استعمال کرتے نظر آتے ہیں کہ کہیں بھی عبارت کی تفہیم میں مشکل نہیں ہوتی۔ چونکہ مولانا آزاد یہ کتابیں بچوں کے لیے لکھ رہے تھے اس لیے یہاں انہوں نے اپنے رومانوی اسلوب کی بجائے ایسا طرز اپنایا جو بچوں کے سیکھنے اور سمجھنے میں معاون ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتب میں بیان کردہ کہانی نما عبارتیں مختصر اور چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل ہیں۔ ان کتب کی اردو نثر میں قافیے کے استعمال سے آہنگ پیدا کرتے ہوئے سادہ اور سلیس انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اردو کی پہلی کتاب کے سبق ''ماں کی محبت'' سے اردو نثر کا یہ اقتباس بطور نمونہ ملاحظہ ہو جس میں تمثیلی اور مصورانہ انداز بیان کی وجہ سے اثر آفرینی کا عنصر در آیا ہے:

> ''ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے باپ حقہ پی رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ آنکھیں کھولے پڑا ہے۔ انگوٹھا چوس رہا ہے۔ ماں محبت بھری نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے اور پیار سے کہتی ہے میری جان وہ دن کب آئے گا کہ میٹھی میٹھی باتیں کرے گا بڑا ہوگا۔ سہرا بندھے گا۔ دولہا بنے گا۔ دلہن بیاہ کر لائے گا۔ ہم بڈھے ہونگے تو کھائے گا آپ کھائے گا ہمیں کھلائے گا۔''[۱۲۲]

اسی طرح ''کھانا پک رہا ہے'' سے لفظی تصویر کشی اور جزئیات نگاری کا نمونہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دیکھنا بیوی آپ بیٹھی پکا رہی ہے ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے دھوئے دھائے برتن صندوق پر چنے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا کسی میں چاول، پھکنی، دبینا، پانی کا لوٹا پاس ہے آٹا گندھا رکھا ہے چاول پک چکے ہیں۔ نیچے اتار کر رکھے ہیں دال چولہے پر چڑھی ہے آپ پاس بیٹھی ہے کہ آگ بجھ نہ جائے یا دال جل نہ جائے۔''[۱۲۳]

مولانا آزاد نے ان درسی کتب میں ادبی نثر کی وہ شان پیدا کی جو انہی سے مخصوص ہے۔ اردو نثر پر ان کا یہ احسان ہے۔ جس کی پیروی آگے چل کر اسماعیل میرٹھی اور مولوی ممتاز علی جیسے تعلیمی مصنفین نے کی اور بہترین درسی کتب، اردو کا پہلا قاعدہ، اردو کی پہلی کتاب، اردو کی دوسری کتاب، اردو کی تیسری کتاب، اردو کی چوتھی کتاب، اردو کی پانچویں کتاب کی صورت میں لکھیں جبکہ مولوی ممتاز علی نے ''اردو کا قاعدہ'' کے علاوہ پرائمری، مڈل، اور اپر مڈل جماعتوں کے لیے نصابی سلسلے مرتب کیے۔ حکیم احمد شجاع کا مولانا آزاد کی تحریر کردہ درسی کتب کی نسبت یہ کہنا درست ہے کہ ''یہ بات بلاخوف وتردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے لکھے ہوئے نصاب کے بعد اس

سلسلہ میں جو کچھ بھی لکھا گیا وہ انہیں کی دکھائی ہوئی راہ کی پیروی ہے مگر کسی سے وہ بات بن نہ آئی جس کی طرح وہ ڈال چکے تھے۔''۱۲۴ مجموعی طور پر ان درسی کتب کی زبان نہایت سادہ، مطالب آسان اور انداز تحریر دلچسپ ہے۔ اسلوب کی سادگی اور دلچسپی کی وجہ سے بچے آسانی اور شوق سے استاد کی مدد کے بغیر آگے کا سبق پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ چنانچہ محمد حسین آزاد کی ان کتابوں سے قبل ایسی آسان اور دلکش کتابیں طلباء کے لیے اس صورت میں موجود نہ تھیں۔

رسوم ہند:

۱۸۶۸ء میں چھپنے والی یہ تصنیف ۱۸۶۴ء میں میجر فلر ناظم تعلیمات پنجاب کے قائم کردہ کمیشن کی تالیفی خدمات کا نتیجہ ہے۔ سرڈی میکلوڈ (Sir D. Mecloed) کی سربراہی میں قائم ہونے والے اس کمیشن ۱۲۵ کا مقصد اردو زبان میں اعلیٰ درجے کی تصانیف تیار کروانا تھا۔ گارساں دتاسی کے خطبہ ۷ دسمبر ۱۸۶۸ء سے پتہ چلتا ہے کہ ''رسوم ہند'' کی تالیف وترتیب کا کام کمیشن کے زیر اہتمام ۱۸۶۴ء میں لاہور میں شروع ہوا۔ گارساں دتاسی اپنے اسی خطبے میں ''رسوم ہند''۱۲۶ کے موضوع، اسلوب بیان اور اس کی تیاری میں شامل افراد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''کپتان ڈبلیو آر ایم ہالرائیڈ نے ''رسوم ہند'' کا پہلا جز واز راہ کرم مجھے بھیجا ہے اس کتاب میں اہل ہند کے مذاہب اور ان کے مختلف فرقوں کا اختصار سے حال بیان کیا گیا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے عقائد پر تبصرہ ہے اور لطائف و حکایات کے ذریعے بالخصوص شمال ہند کے باشندوں کی خانگی زندگی اور ان کے عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی ہے۔ رسوم ہند کی تالیف و ترتیب کا کام لاہور میں ۱۸۶۴ء میں شروع ہوا۔ جبکہ سرکاری طور پر ایک کمیشن اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ ہندوستانی زبان میں اعلیٰ درجے کی تصانیف تیار کرائی جائیں۔ اس کمیشن کے صدر سرڈی میکلوڈ (D. Mecload) تھے جو آجکل صوبہ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہیں۔ رسوم ہند کے تاریخی حصے کی زبان اور اس کا طرز تحریر سادہ ہے اتنا سادہ جو کسی بھی مشرقی زبان میں ممکن ہے اس کتاب کے مکالموں کی زبان اس قسم کی ہے جو آجکل زیر بحث لوگوں کے طبقوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس کتاب کی تالیف میں کپتان ہالرائیڈ کے ساتھ ایک ہندو شریک تھے جو نارمل اسکول کے ناظر اول ہیں اور دہلی کالج کے عربی کے ایک مسلمان پروفیسر نے بھی اس کام میں مدد دی۔ ان کے علاوہ اور دوسرے اہل علم دیسی لوگ بھی شریک تھے۔''۱۲۷

مذکورہ بیان ایک اہم معاصر شہادت ہے جس میں چند توجہ طلب نکات ہیں: (۱) یہ کہ ''رسوم ہند'' کی تصنیف وتالیف کا کام ۱۸۶۴ء سے شروع ہوا جبکہ ۱۸۶۸ء میں تکمیل کے مراحل میں پہنچ کر شائع ہوئی۔ (۲) سر

رشتہ تعلیم پنجاب کے زیر اہتمام ۱۸۶۸ء میں شائع ہو کر نصاب تعلیم کا حصہ بنی۔(۳) کتاب کا موضوع چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب، عقائد، خانگی زندگی، اور اخلاق و عادات کا احوال بیان کرنا تھا اس لیے دو طریقہ کار اختیار کیے گئے ایک خالص علمی بیانیہ اور دوسرا حقیقت نگاری پر مبنی افسانوی انداز اپناتے ہوئے کہانی کی ہیئت استعمال کی۔جس سے یہ تدریسی نصاب کے لیے ایک مفید اور کارآمد کتاب ثابت ہوئی۔(۴) ''رسوم ہند'' کی اردو نثر کے ذریعے قومی اتحاد کو بھی بروئے کار لایا گیا۔ بعدازاں ''قصص ہند'' میں بھی یہ خصوصیت نظر آتی ہے۔(۵) کتاب کی تیاری میں کپتان ہالرائیڈ کے ساتھ جو ہندو شریک تھے وہ کون تھے؟ اس حوالے سے تحقیقی شواہد ماسٹر پیارے لال آشوب کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو۱۸۶۴ء میں دہلی سے لاہور آ چکے تھے اور سر رشتہ تعلیم کے کیوریٹر کے عہدے پر فائز تھے۔اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لاہور پہنچنے پر پہلا کام ہی پیارے لال آشوب نے اس کتاب کی تصنیف کی تیاری میں معاونت کا کیا۔''رسوم ہند'' کا موضوع ایسا تھا جس کے لیے کسی قابل ہندو کی ضرورت تھی جسے آشوب نے باحسن خوبی پورا کیا۔ چنانچہ خلیل الرحمٰن داؤدی کے مطابق (دستیاب نسخہ ۱۸۸۶ء)اس کے اولین تین باب ۱۔ ہندوؤں کی ذاتوں کا بیان ۲۔ ہندوؤں کی مذہبی باتوں کا بیان ۳۔من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ پیارے لال آشوب کے تحریر کردہ ہیں جبکہ مقالہ نگار کا استدلال ہے کہ ''رسوم ہند'' کے ابتدائی چار ابواب پیارے لال آشوب کے ہیں جن میں چوتھا باب خوشحال چند اور ہیرا، دولت رام اور مونگا، کروڑی مل اور گنگی کا قصہ بھی شامل ہے۔ کیونکہ دونوں قصوں کا اسلوب بیان بہت مماثلت رکھتا ہے۔ واقعات کو بیان کرنے کا انداز ایک سا ہے۔ البتہ ایک فرق ضرور ہے کہ من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ، خوشحال چند اور ہیرا، دولت رام اور مونگا کروڑی مل اور گنگی'' کے قصہ کی نسبت زیادہ مربوط اور منظم پلاٹ پر مبنی ہے۔جس میں افسانہ نگاری کے تمام لوازمات کامیابی سے نبھائے گئے ہیں جبکہ دوسرے قصہ میں پلاٹ بہت ڈھیلا ڈھالا ہے۔

چونکہ کتاب میں ''مسلمانوں کی مذہبی باتوں کا باب'' بھی شامل ہے اس لیے گارساں دتاسی نے اس کی تیاری میں دہلی کالج کے عربی کے پروفیسر کا ذکر کیا ہے لیکن نشاندہی نہیں کی۔ مقالہ نگار کے مطابق دہلی میں عربی کے مذکورہ پروفیسر مولوی ضیاء الدین تھے۔ جو دہلی کالج کے تربیت یافتہ اور زمانہ طالبعلمی میں پیارے لال آشوب اور ڈپٹی نذیر احمد کے ہم عصر و ہم جماعت رہ چکے تھے اور عربی، مذہبی و غیر مذہبی علوم کا درس دیتے تھے۔میجر فلر ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب کی ایماء پر لاہور تشریف لائے اور درس و تدریس کا تجربہ رکھنے کی بناء پر محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گئے۔میجر فلر ہی کی فرمائش پر مخزن طبیعی (۱۸۶۵ء)، اصول علم طبیعی (۱۸۶۷ء) اور ''قواعد اردو'' کے علاوہ ''فوائد ضیاء'' (اردو کی گرامر) بھی تصنیف کی۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر فلر ان کی علمیت کے قائل تھے۔

چنانچہ ''رسوم ہند'' میں ''مسلمانوں کی مذہبی باتوں'' کے باب کی تیاری میں مولوی ضیاء الدین نے مدد دی اور یہی باب ہے جس میں دیگر اہل قلم نے بھی معاونت کی ہو گی جن میں مولوی کریم الدین اور مولانا محمد حسین آزاد بھی شامل رہے ہوں گے۔۱۲۸ ''رسوم ہند'' میں مسلمانوں کے مذہبی حصہ میں یہ جملے وقتاً فوقتاً درج کیے گئے ہیں مثلاً ''اہل اسلام کی کتابوں میں لکھا ہے''، ''مسلمانوں کی کتابوں میں لکھا ہے''، ''مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہے'' جو ان واقعات کے مستند ہونے کی جانب اشارہ ہیں پھر یہ اقدام اس لیے بھی کہا گیا کہ ''رسوم ہند'' بیک وقت ہندو مسلم طلباء کے لیے لکھی گئی۔ اس حصے میں مولانا آزاد کی معاونت بھی حاصل رہی ہو گی۔ ''رسوم ہند'' کے ضمن میں ڈاکٹر اسد اریب کا بھی یہ کہنا ہے کہ ''پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایماء سے یہ سلسلہ شروع ہوا اس میں مولانا آزاد نے بھی حصہ لیا۔ اس کی نثر مولانا آزاد کی تحریر کردہ ہے مواد کچھ ماسٹر پیارے لال کا دیا ہوا ہے''۔۱۲۹ چونکہ مولانا آزاد سر رشتہ تعلیم سے وابستہ تھے اس لیے اس کتاب کی تیاری میں معاونت ضرور کی ہو گی اور ''رسوم ہند'' میں مولانا آزاد کے حصہ کی نشاندہی بھی کی جا سکتی ہے۔

اگر چہ ڈاکٹر اسد اریب نے ''رسوم ہند'' میں مولانا آزاد کے تحریر کردہ نثری اقتباسات یا حصوں کی قطعیت کے ساتھ نشاندہی نہیں کی لیکن مقالہ نگار اپنے مطالعہ کی بناء پر یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ ''جہاں آراء بیگم اور محمد یوسف، گیتی آراء اور محمد جمیل الدین کا قصہ'' اور پانچویں باب کی پہلی فصل ''بعض پیغمبروں کا مختصر حال جو قرآن، حدیث اور مسلمانوں کی تاریخی کتابوں کے موافق ہے'' میں ''حضرت محمدؐ'' ''حضرت ابوبکرؓ، حضرت عثمانؓ، کے احوال میں لکھے گئے یہ الفاظ ''سنی مسلمانوں کی کتابوں میں۔۔۔'' ''سنیوں کی کتابوں میں لکھا ہے''،''سنیّوں کی کتابوں میں مذکور ہے۔۔۔''اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ مذکورہ حصے مولانا محمد حسین آزاد کے تحریر کردہ ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد میں عملی زندگی کے برعکس تحریری سطح پر شیعہ ہونے کے باوجود مذہبی تعصب سے بالاتر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریری سطح پر مسلک کے حوالے سے نہایت معتدل خیالات رکھتے تھے۔۱۳۰ لہٰذا خیالات کا یہ اعتدال ان حصوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ بالا جملوں سے اگر ان جملوں ''اہل اسلام کی کتابوں میں لکھا ہے'' ''مسلمانوں کی کتابوں میں لکھا ہے'' ''مسلمانوں کی کتابوں میں مذکور ہے'' سے کڑی ملائی جائے تو یہاں یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ یہ انداز تحریر ایک ہی شخص کا ہے اور وہ مولانا محمد حسین آزاد ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اسد اریب کی دوسری بات کہ مواد کچھ ماسٹر پیارے لال کا دیا ہوا ہے درست معلوم نہیں ہوتی۔ کتاب کے متن کے پیش نظر یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ مواد بہت کچھ ماسٹر پیارے لال آشوب کا تحریر کردہ ہے کیونکہ آشوب کی تحریر کو ''ہندوؤں کی ذاتوں کا بیان'' ''ہندوؤں کی مذہبی باتوں کا بیان'' اور قصہ ''من سکھی اور سندر سنگھ'' اور

''خوشحال چند وغیرہ'' کے مقابل رکھ کر دیکھیں تو انداز بیان میں بے حد مماثلت دکھائی دیتی ہے۔لہٰذا مواد پیارے لال آشوب کا دیا ہوا ہی نہیں بلکہ انہیں کا تحریر کردہ بھی ہے۔جس کی طرف گارساں دتاسی نے بھی اشارہ کیا ہے اور لالہ سری رام نے ''خمخانۂ جاوید''، امداد امام صابری نے ''حیات آشوب'' اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسے محقق نے بھی ''مرحوم دہلی کالج'' میں یہ بیان کیا ہے کہ ابتدائی نصف حصہ ماسٹر پیارے لال آشوب کا تحریر کردہ ہے۔

مولانا آزاد ہی کے حوالہ سے رسالہ ''راوی'' کے ''آزاد نمبر'' سے ایک خط کا حوالہ دینا بھی ناگزیر ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ ''رسوم ہند'' میں مولانا آزاد کا بھی حصہ ہے۔ یہ بات محمد خلیل الرحمٰن نے ڈاکٹر صادق کو جوابی خط میں لکھی کہ ''میری رائے ناقص میں ان کا بڑا کارنامہ رسوم ہند کا اسلامی حصہ اور اردو کی پہلی کتاب وغیرہ کا سلسلہ ہے۔میرا عقیدہ ہے کہ رسوم ہند میں جو ناول ہے وہ بہترین ہے''۔[۱۳۱] مولانا محمد حسین آزاد سے محمد خلیل الرحمٰن کا تعلق مولانا آزاد کے بیٹے آغا ابراہیم کی وساطت پیدا ہوا۔ ان کی مذکورہ رائے سے بھی اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ''رسوم ہند'' کا اسلامی حصہ مولانا آزاد کا تحریر کردہ ہے۔ نیز ''رسوم ہند'' میں جس کہانی کا ذکر ناول کہہ کر کیا گیا ہے۔ وہ مقالہ نگار کے مطابق ''جہاں آراء بیگم اور محمد یوسف، گیتی آراء بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصہ'' ہے جو ناول کے ابتدائی نقوش پر مبنی ایک افسانہ ہے۔ پہلے دو قصے پیارے لال آشوب کے تحریر کردہ ہیں۔ اگر اس قصے کو مولانا آزاد کا تحریر کردہ تسلیم کر لیا جائے تو آشوب اور مولانا آزاد اردو نثر میں اولین افسانہ نگار ہونے کا اعزاز بھی حاصل کر لیتے ہیں جنہوں نے ''رسوم ہند'' میں ان قصوں کے ذریعے افسانہ نگاری کے فن کو متعارف کرایا اور ناول نگاری کا بیج بھی بویا۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری سے یہ بات معلوم ہوئی ہے[۱۳۲] کہ مذکورہ خط میں ''رسوم ہند'' کی بابت انہوں نے آغا محمد باقر کے بیٹے سلمان باقر سے استفسار کیا تو ان کا کہنا یہ تھا کہ خاندان میں اس بارے کہا جاتا رہا ہے کہ ''رسوم ہند'' میں مولانا آزاد کا بھی حصہ ہے لیکن کس قدر اور کس نوعیت کا اس بارے میں معلوم نہیں۔ لیکن مقالہ نگار کو جو خارجی اور داخلی شواہد میسر آئے ہیں ان کی روشنی میں اس بات کو قبول کرنے میں ہرگز تامل نہیں ہونا چاہیے کہ ''رسوم ہند'' میں مولانا آزاد کا بھی حصہ ہے۔ قصہ نگاری کی سطح پر مقالہ نگار کا تجزیہ یہ ہے کہ ''جہاں آراء بیگم اور محمد یوسف، گیتی آراء بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصہ'' پڑھنے سے احساس ہوتا ہے کہ یہ مولانا آزاد کا تحریر کردہ ہی ہے کیونکہ ان کی تصنیف ''نصیحت کا کرن پھول'' (۱۸۶۴ء) اور مذکورہ قصے کے اسلوب میں بے حد مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں جگہ دہلی شہر سے مصنف کی محبت، انگریزوں کی عملداری میں اناپالہ شہر میں امن و امان کا ذکر، دہلی کی ڈھلی ڈھلائی روزمرہ اور محاورہ بندی کی زبان، انگریزی عملداری کی تعریف، اس کے ثمرات اور انگریزوں کی

خوشنودی حاصل کرنے کا انداز یکساں ہے۔ لہٰذا دونوں قصوں میں ایسے مشترک حصے ایک ساتھ رکھ کر دیکھنے سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ قصہ بھی مولانا آزاد کا ہی تحریر کیا ہوا ہے۔ پھر وہ قصہ نگاری کا جدید تنقیدی شعور بھی رکھتے تھے۔[۱۳۳] محکمہ تعلیم سے وابستہ ہو کر علمی خدمات انجام دے رہے تھے۔ محکمہ تعلیم کی جانب سے مصنفین کو ہدایات ہوتی تھیں کہ وہ درسی کتب کے لیے سادہ، آسان اور رواں زبان استعمال کریں۔ ''نصیحت کا کرن پھول'' اس قائم کردہ معیار پر پوری اترتی ہے اور یہی معیار مذکورہ قصے میں بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے پیش نظر ''رسوم ہند'' کی دو اشاعتیں ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۳ء ہیں۔ ۱۸۶۹ء کی اشاعت کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے۔

رسوم ہند

حسب الحکم

جناب کپتان ہال رائڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر

اف پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب

۱۸۶۹ء

مطبع سرکاری میں چھپی

سرورق کی اس عبارت کے بعد ابتدائی ۱۶ صفحات نہیں ہیں جبکہ صفحہ ۱۷ تا ۳۰ انتہائی شکستہ حالت میں علیحدہ ہو گئے ہیں۔ اس حصے میں ہندوؤں کی ذاتوں اور مذہبی باتوں کا بیان کیا گیا ہے جو ۱ تا ۴۰ صفحات پر مبنی ہے۔ اس کے بعد ایک اور لوح آتی ہے جو اس طرح ہے:

رسوم ہند

قصہ منسکھی اور سندر سنگھ

۱۸۶۹ء

مطبع سرکاری میں چھپا

یہ قصہ الگ صفحات رکھتا ہے جو صفحہ ۱ سے شروع ہو کر صفحہ ۷۹ پر ختم ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۸۰ خالی ہے۔ اس کے بعد اگلی لوح کے سرورق کی عبارت ہے جس پر یہ مرقوم ہے:

رسوم ہند

قصہ خوشحال چند وغیرہ

۱۸۶۹ء

مطبع سرکاری میں چھپا

یہ قصہ بھی الگ صفحات کا حامل ہے جو ا تا ۱۳۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ صفحہ ا پر قصہ کا مکمل عنوان ''خوشحال چند اور ہیرا'' دولت رام اور مونگا، کروڑی مل اور گنگی کا قصہ'' درج ہے۔ صفحہ ۱۳۲ خالی ہے۔ اس کے بعد پھر ایک لوح ہے جس پر یہ لکھا ہے۔

رسوم ہند

مسلمانوں کی مذہبی باتوں کا

بیان

۱۸۶۹ء

مطبع سرکاری میں چھپا

یہ حصہ بھی اپنے الگ صفحات ا تا ۱۴۴ رکھتا ہے اور تین فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل: پیغمبروں کے مختصر حال پر مبنی ہے جو صفحہ ا تا ۱۲۲ پر محیط ہے۔ دوسری فصل: مسلمانوں کے عقائد اور اعمال صفحہ ۱۲۲ تا ۱۴۱ پر جبکہ تیسری فصل: اہل اسلام کی ذاتوں کا بیان صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۴ پر مشتمل ہے۔ آخر میں جہاں آراء بیگم اور محمد یوسف گیتی آراء بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصہ'' ہے۔ اسکے صفحات بھی الگ ہیں تاہم یہ لوح کے بغیر ہے۔ مذکورہ نسخے میں اس قصہ کے ا تا ۹۰ صفحات ہیں جبکہ بقیہ موجود نہیں ہیں کہ جس سے پتہ چل سکے کہ یہ کل کتنے صفحات پر مبنی تھا۔ صفحہ ۹۰ پر آخری

> ''یہہ شخص محمد یوسف ہی تھا اور اسنے بھی غدر کے زمانے میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائی تھیں اس کا رسالہ انگریزوں کے ساتھ گیا تھا مگر وہ باوجود مصیبتوں کے سرکار انگریزی کے ساتھ رہا۔''[۱۳۴]

بعد کی اشاعت سے معلوم ہوا ہے کہ یہ قصے کا تقریباً اختتام ہی ہے۔ خلیل الرحمٰن داؤدی کے مطابق ''یہ قصہ صفحہ ۹۲ پر ختم ہو جاتا ہے۔''[۱۳۵] چنانچہ ''رسوم ہند'' کل پانچ حصوں پر مشتمل ہے جو اپنی الگ لوح اور علیحدہ صفحات رکھتے ہیں۔ مقالہ نگار کو بھی یہی قدیم ترین اشاعت دستیاب ہو پائی ہے جبکہ اس کے بعد ۱۸۷۳ء کی اشاعت بھی ملی ہے جس کے سرورق کی ایک ہی لوح ہے اس کے بعد تمام حصوں پر ان کے عنوانات درج کیے گیے ہیں۔ ۱۸۷۳ء کی اشاعت کی تفصیل درج ذیل ہے:

رسوم ہند

۱۸۷۳ء

مطبع سرکاری لاہور میں چھپی

اس سر رشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے

دفعہ ششم تعداد جلد ۷۰۰

''رسوم ہند'' چونکہ ایک سے زیادہ مصنفین کی کاوشوں کا نتیجہ تھی اس لیے کسی کا نام مصنف کے طور پر نہیں دیا گیا۔ ویسے بھی جو کتابیں محکمہ تعلیم تیار کرواتا تھا ان پر مصنف کا نام مرقوم کرنے یا نہ کرنے کا مکمل اختیار محکمہ تعلیم کی صوابدید پر منحصر تھا۔ درسی کتاب ہونے اور موضوع کے اعتبار سے اس کتاب نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور متعدد بار شائع ہوئی۔ اس کا اندازہ ۱۸۸۶ء میں اس کی پندرھویں اشاعت سے ہوتا ہے جس کا حوالہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے اپنے دیباچہ میں دیا ہے:[۱۳۶]

''رسوم ہند'' کے متن کے موضوعات پر توجہ دیں تو معلوم ہوگا کہ اس میں مشہور تاریخی قصے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہب اور ان کی ذاتوں سے ہے۔ مزید برآں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اسلاف کا احوال بیان کیا ہے۔ رسوم ہند کے یہ حصے دونوں مذاہب کے افراد کے لیے معلومات افزاء ہیں۔ جنہیں سلیس رواں مگر دلچسپ پیرایہ بیان میں ادا کیا گیا ہے مثلاً یہ دو اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''ہندوؤں کی پرانی کتاب رگ وید میں لکھا ہے کہ برہمن لوگ برہما جی کا منہ، چھتری ان کے بازو اور ویش ان کی رانیں ہیں اور شودر ان کے پاؤں سے نکلے ہیں اور اس جگہ منہ سے بولنے والا یعنی اچھا، بُرا بتانے والا، بازو سے لڑنے والا، رانوں سے قوت دینے والا اور پاؤں سے

خدمت کرنے والا مراد ہے مگر دھرم شاستر اور پرانوں میں اس طرح سے بیان کیا ہے کہ ہندوؤں کی چاروں ذاتیں حقیقت میں برہما جی کے جسم ہی سے پیدا ہوئی ہیں۔''۱۲۷

''جس زمانے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام پیدا ہوئے اس زمانے میں بابل اور سوادعراق کا بادشاہ نمرود تھا۔ کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیدا ہونے سے پہلے ہی نمرود نے خواب میں دیکھا کہ ایک ستارہ نکلا ہے اور وہ بڑھتے بڑھتے اس قدر روشن ہوگیا کہ آفتاب بھی اس کے آگے ماند معلوم ہونے لگا اس نے معبروں سے اس خواب کی تعبیر پوچھی انہوں نے بیان کیا کہ تھوڑے عرصے میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جس کی بزرگی اور عظمت کے آگے تیری شان وشوکت بالکل جاتی رہے گی اور تیرا ملک و دین سب برباد ہو جائے گا۔''۱۲۸

علاوہ ازیں جو تین قصے ہیں وہ اردو نثر میں افسانہ نگاری کا نقطہ آغاز بھی ہیں۔ ان قصوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں رائج مذہبی، تاریخی، تمدنی رسوم کی روایاتی شرح نئے اسلوب اور منطقی استدلال کے ساتھ کہانی کے تاروپود میں بیان کی گئی ہے۔ پلاٹ، فنی شعور وتکنیک کا احساس، کردار نگاری اور مکالموں کی نفاست ان قصوں کی نمایاں خوبیاں ہیں۔

پہلے دو قصے ماسٹر پیارے لال آشوب کے تحریر کردہ ہیں۔ ان قصوں میں انہوں نے شعوری کوشش کی ہے کہ یہ جنوں، بھوتوں پریوں اور روایتی شہزادوں اور شہزادیوں کے خیالی معاشقوں سے پاک ہوں۔ چنانچہ تخیلاتی دنیا سے نکل کر حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے کہانی میں پہلی بار غریبوں اور عام انسانوں کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔۱۲۹ طرز تحریر بھی روایتی قصوں سے بالکل جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ دونوں قصوں کی بنیاد حقیقی، فطری واقعات اور مشاہدات پر رکھی گئی ہے۔ اس ضمن میں کوشش کی گئی ہے کہ پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ ہندوستان کی طرز معاشرت ، رسم و رواج اور ملکی حالات کو پیش کیا جائے۔ ان قصوں میں معاشرت اور تہذیب و تمدن کی بالکل اسی طرح حقیقت نگاری سے عکاسی کی گئی ہے جو بیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک کے تحت لکھے جانے والے افسانوں کا طرہ امتیاز بنی۔ غرض افسانہ نگاری کی ابتدائی شکل اپنی خام صورت میں انہی قصوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے انہیں اردو نثر میں افسانہ نگاری کا نقش اول قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔ دونوں قصے مقصدیت کے تحت لکھے گئے جن کے ذریعے ہندوانہ رسم و رواج اور ان کے معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا تعارف کرانا مقصود تھا۔ پیارے لال آشوب نے فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل کے لیے کہانی کا پیرایہ اس طور استعمال کیا ہے کہ ایک شعوری کاوش کے نتیجے میں کہانی کو حقیقی زندگی کے ساتھ ایک گہرے رشتے میں پرو دیا ہے۔

پھر قصہ گوئی کے لیے ایسا دلکش اور بے تکلف انداز بیان اختیار کیا ہے کہ قصہ نگاری کے فن پر کہیں بھی مقصدیت حاوی نہیں ہونے پائی جس سے احساس ہوتا کہ شاید مقصدیت کا پرچار کیا جا رہا ہے۔ آشوب نے ایک کامیاب فنکار کی طرح مقصدیت کو فن کے پردے میں پوشیدہ رکھا ہے کہ قاری دلچسپی کے ساتھ کہانی پڑھتا چلا جاتا ہے اور قصے سے جو ہندوؤں کی مذہبی و معاشرتی رسوم سے مزین ہیں اس طرح واقفیت حاصل کر لیتا ہے کہ کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ مصنف کا اصل مقصد و مدعا انہی سے متعارف کرانا تھا۔ یہی ماسٹر پیارے لال آشوب کی کامیابی ہے جو قصے کے انداز بیان میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ قصہ ابتداء سے آخر تک فطری اور حقیقی انداز میں اپنا رنگ دکھاتا ہے۔ اور یہ فطری رنگ قصے کے کرداروں کی پیش کش سے اور چوکھا ہو جاتا ہے۔ کرداروں کے مکالمے نہایت فطری انداز میں اپنا مکمل تعارف بھی کرواتے ہیں کہ ان کی جذباتی اور فکری زندگی عیاں ہو کر قاری کے سامنے آ جاتی ہے۔

''من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ'' دو کرداروں کی محبت کا سیدھا سادا اور خوبصورت افسانہ ہے جس میں حسب موقع اشعار کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ جو اس دور میں لکھے جانے والے قصوں کا عام چلن تھا۔ قصہ میں یتیم من سکھی جو اپنے چچا سجان سنگھ اور چچی چندر کور کے پاس رہتی ہے۔ پندرہ برس کی عمر میں سندر سنگھ، نامی نوجوان سے بیاہ دی جاتی ہے۔ سندر سنگھ گھر داماد بن کر سسرال میں کھیتی باڑی کے جملہ کام سنبھال لیتا ہے۔ من سکھی کا چچا سجان سنگھ توہم پرست اور عقیدے کا کمزور ہونے کی وجہ سے ایک سادھو کے مکروفریب میں آ جاتا ہے جو اسے دولت کو دوگنا کرنے کا لالچ دیتا ہے۔ جس پر سندر سنگھ، سجان سنگھ کو سادھو کی چال سمجھاتا ہے لیکن وہ سادھو کی باتوں میں آ کر سندر سنگھ سے نالاں ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ سسرال میں رہتا ہے اس لیے سجان سنگھ اسے منحوس اور نکھٹو کہہ کر طعن و تشنیع کا نشانہ بناتا رہتا ہے۔ جس سے بالآخر وہ تنگ آ کر غیرت کے مارے دیہات سے باہر فوج میں روزگار کی تلاش میں نکل جاتا ہے اور یہیں سے میاں بیوی کی دائمی اور فطری محبت دائمی جدائی میں بدل جاتی ہے۔ واقعات میں یہی موڑ نقطہ عروج (کلائمکس) ہے ایک عرصہ بعد سندر سنگھ اس وقت واپس آتا ہے جب اسے خبر ملتی ہے کہ من سکھی اپنے چچا اور چچی کے ہمراہ گنگا اشنان کے لیے آئی ہوتی ہے۔ اس موقع پر سادھو بھی وہیں موجود ہوتا ہے جو دھوکے سے سجان سنگھ سے زیورات کی گٹھری ہتھیا لیتا ہے پھر بھی لالچ کم نہ ہونے پر سجان سنگھ کے کمسن بیٹے موہن کے ہاتھ کے کڑوں کے لیے اسے اغواء کر لیتا ہے۔ عین اسی وقت من سکھی کو خبر ہو جاتی ہے۔ جس پر وہ چیختی چلاتی سادھو کے پیچھے بھاگتی ہے۔ سادھو من سکھی کی کنپٹی پر اس بے دردی سے سونٹا مارتا ہے کہ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔ اس دم سندر سنگھ واپس لوٹ رہا ہوتا ہے جب یہ ماجرا دیکھتا ہے تو سادھو کا پیچھا کرتا ہے اور

زیوارت کی گٹھری اور موہن کو بازیاب کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پھر سندر سنگھ من سکھی کو ہوش میں لاتا ہے لیکن وہ جانبر نہیں ہوسکتی اس کی موت سندر سنگھ کو شکستہ کر دیتی ہے کہ وہ من سکھی کی محبت میں گھل گھل کر بالآخر جان دے دیتا ہے۔ اس طرح محبت کرنے والے میاں بیوی، طعنہ زنی، زیور ڈُگنا کرنے کی لالچ، سادھو کی بربریت اور مکروفریب کی وجہ سے دردناک انجام کو پہنچتے ہیں اور یوں یہ المیہ افسانہ اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔

اس مختصر کہانی میں مکمل فنی شعور کا احساس پایا جاتا ہے۔ پلاٹ میں واقعات کا تانا بانا خالص دیہاتی ماحول میں بُنا گیا ہے جو من سکھی اور سندر سنگھ کی محبت کے گرد گھومتا ہے۔ افسانے کی ابتدائی سطور پڑھتے ہی قاری خود کو ادھیر پور گاؤں کے اسی قدرتی ماحول اور فضا کا حصہ تصور کرتا ہے جہاں اس کی ملاقات قصے کے کرداروں سے ہوتی ہے جو قصے کی دلکشی اور دلچسپی کی ایک دلیل ہے۔ افسانے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے۔

> ''ایک دفعہ بہار کے موسم میں جبکہ جاڑا گزر گیا اور جنگل میں طرح طرح کے بیل بوٹے اور رنگ رنگ کے پھول کھلنے لگے۔ ادھیر پور گاؤں میں سیتلا کا بڑا میلا ہوا۔ وہاں کی تمام عورتیں اور مرد ہاتھوں میں پجا لیے اپنے اپنے گھروں سے باہر نکلے۔ رستے میں ہم عمر لڑکیاں آپس میں ہنستی بولتی سیتلا کے سہیلے گاتی جاتی تھیں۔ ان میں ایک اہیر کی لڑکی جس کا نام من سکھی تھا، اپنے چچا سجان سنگھ نمبردار اور چچی چندر کور کے ساتھ گھر سے باہر نکلی اسی وقت ان کا پروہت گیان چند مشر بھی اپنی بیٹی پاربتی کو ہمراہ لیے۔ ماتا جی کی پوجا کرنے ان کے ساتھ ہوا۔ من سکھی نے پاربتی کو دیکھتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دونوں کی باتیں ہونے لگیں۔
>
> اس میں پاربتی نے کہا۔ ''من سکھی! تیرے بیاہ کو تو پانچ برس ہو گئے ہوں گے اور تو بھی ۱۵ برس کی ہوئی۔ اب گونا کب ہوگا؟
>
> اس نے جواب دیا ''اب کے بیساکھ میں بتا دیں گئے''
>
> پھر پاربتی نے کہا ''جی جی'' تیرا بترا تو بڑا سندر ہے''
>
> یہ بات سن کر من سکھی مسکرائی اور کہنے لگی ''ہاں جی جی! میں نے بھی اسے کئی بیر چھپ چھپا کر دیکھا تھا، مجھے بھی اس کی صورت بھلی لگی تھی''[۱۴۹]

یوں کہانی کا آغاز فطری انداز سے ہوتا ہے جو ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا ایک منطقی استدلال کے ساتھ منطقی انجام کو جا پہنچتا ہے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب نے واقعات کے انتخاب کو حقیقت سے قریب کرتے ہوئے اس میں ہندو رسم و رواج ، گنگا اشنان کے میلے کی ہما ہمی، سادھوؤں کی شعبدہ بازی اور دھوکہ دہی کو نہایت فنکارانہ بصیرت کے ساتھ پیش کیا ہے کہ تمام ضروری جزئیات کے ساتھ وہ منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً سندر

سنگھ اور من سکھی کی شادی کی رسم کا منظر ملاحظہ ہو۔

> "جس روز گونے کا مہورت نکلا، اس روز نمبردار نے گیان مشر کو بلوایا۔ اس نے آتے ہی چوک لپوایا اور اس پر ایک طرف آٹے سے نوخانے بنا کر ان میں چاول رکھ دیے اور ایک مٹی کی ڈلی لے کر اس پر کلاوا لپیٹا۔ پھر دلہا دلہن کو دو پٹروں پر بٹھایا اور اس مٹی کی ڈلی کو گنیش اور نو خانوں کو نوگرہ قرار دے کر پوجا کرائی اور رولی، چاول، پھول، پان، بتاشے اور پیسے ان پر چڑھا دیے پھر گیان چند نے لڑکے کے دوپٹے اور لڑکی کی اوڑھنی کا ایک سرا لے کر دونوں کو ملایا اور اس میں چھالیہ کی ڈلی، چاول اور ایک ٹکا رکھ کر گرہ باندھ دی اس کے بعد پٹا پھیر کی رسم ہوئی اور پٹڑوں کو جن پر دلہا دلہن بیٹھے ہوتے تھے بدل دیا۔ جس وقت نائی نے پٹڑوں کے بدلنے کے لیے اٹھایا تو پاربتی جو وہاں کھڑی ہوئی تھی اس سے کہنے لگی "دیکھ رے! یہ پٹڑے آپس میں ٹکرا ویں نہیں، جو ایسا ہو تو من سکھی اور جیجا میں سدا کھٹا پٹی رہے گی۔"[۱۳۱]

افسانے میں واقعات کی منطقی ترتیب نے پلاٹ کا احساس پیدا کر دیا ہے جو دیگر قصوں میں اس قدر چابکدستی سے نہیں نبھایا گیا۔ قصے میں کردار نگاری اس طور کی گئی ہے کہ انسانی نفسیات جذبات، احساسات اور تاثرات کے واضح نقوش فطری انداز سے کہانی کا حصہ بنتے ہیں۔ مثلاً سجان سنگھ کا دولت کے لالچ میں آنا ایک عام انسانی فطرت ہے اور چندر کور کا اپنے بیٹے سے محبت کرنا عین ماں کی ممتا کے مطابق ہے۔ اسی طرح سندر سنگھ کی غیرت، خود داری جرات اور بہادری، بیوی سے محبت، من سکھی کی شوہر پرستی، معصومیت ، وفا شعاری سے یہ دونوں کردار قاری کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ پھر سادھو کا کردار بھی اس کی مکاری کو بے نقاب کرتا ہے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب نے من سکھی اور سندر سنگھ کے درمیان ہونے والی اس گفتگو سے ان کی محبت اور ان کے کرداروں کی کتنی فطری اور سچی تصویر کشی کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "سندر سنگھ نے کہا "تیرے چاچا کے گھر میں رہنے سے مجھ کو بڑی لاج آئے ہے اور تو بھی دکھی رہے ہے، اس لیے میں نے یہی سوچا ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں"
> اس بات کو سنتے ہی من سکھی چلا اٹھی اور بولی اے تو مرے بابا جی! تجھ میں یہ گن تھے! تو میرے دھنی کو مجھ سے بچھاڑنے آیا تھا! تیرا ستیاناس جائے، آگ لگاؤں تیری جٹا میں، پھوک دوں تیرے سونے چاندی کو"۔ پھر سندر سنگھ س کہنے لگی "کیا تو چلا جائے گا اور مجھے چھوڑ جائے گا؟ دیکھ میں کہے دوں ہوں جو ایسا کیا تو میری صورت ہی کو ترستا پھرے گا۔ بس دیکھ لی تیری پریت جو پیٹھ دیئے جائے ہے۔" سندر سنگھ نے من سکھی سے کہا "تو ہی بتا اب میرا یہاں رہنا کیسے ہو

> سکتا ہے؟ کیا تو اس بات کو اچھا جانے ہے کہ تیرے چاچا کے روز روز کے طعنے مہنے سہوں، دھرکار ہے میرے ایسے رہنے پر! نام کو تو میں جمائی تھا پر تیرے چاچا نے تو کتے کے برابر بھی آدر نہ دیا۔ اب میں یہاں رہ کر کیا کروں؟ میرا یہاں سے جانا تجھے بھی اچھا ہو گا۔ دیکھ تو بھگوان کیا کرے ہے، کیسے دلدر پار ہووے ہیں۔ بہت سا روپیہ کماؤں گا اور تیرے واسطے اچھے اچھے گہنے اور اوڑھنیاں بھیجوں گا اور تھوڑے دنوں پیچھے تجھے بھی اپنے پاس بلا لوں گا۔
>
> من سکھی نے کہا "جو تو جائے ہے تو مجھے تھوڑا سا بس دیتا جا اور اپنے ہاتھ سے میری کفن کاٹھی کرتا جا، پھر جہاں تیرے من میں آوے چلا جائیو" یہ کہہ کر پکار اٹھی "ہے دھرتی ماتا! جو تو پھٹ جائے تو میں تجھ میں ابھی سما جاؤں۔"[۱۴۲]

ماسٹر پیارے لال آشوب نے کرداروں کو جو زبان دی ہے وہ اپنی سادگی اور سلاست کے باوجود بے حد دلنشین ہے کہ افسانے میں زبان کی حلاوت اور چاشنی کا لطف بھی آتا ہے یہی وجہ ہے کہ قاری کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ کب مقصد کہانی میں داخل ہو جاتا ہے۔ پورے کا پورا قصہ مجموعی تاثر کے اعتبار سے ایک لڑی میں پرویا ہوا ہے۔ قصے کا اختتام بھی نہایت مؤثر انداز میں کیا گیا ہے۔ جب سندر سنگھ رخصت ہوتے ہوئے من سکھی کی سہیلی پاربتی سے گفتگو کرتا ہے ایک ایک لفظ خلوص اور درد دل کی زبان بن جاتا ہے:

> "یہ سن کر سندر سنگھ نے کہا "میں تجھے کہاں تک سمجھاؤں تو تو جانے ہے مجھ کو تیری بہن سے کیسی پریت تھی میرا جینا تو اس کے ساتھ تھا اب بھگوان نے اسے اٹھا لیا" بس اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر وہ کہنے لگا "پاربتی میں کیا کروں؟ میرا دل میرے بس میں نہیں ہے تیری بہن کی صورت آٹھ پہر من میں بسی رہے ہے مجھے نہ دن کو چین نہ رات کو نیند اور اس گاؤں میں جس جس چیز کو دیکھتا ہوں مجھے سب اس کی یاد دلاویں ہیں۔ اس بن سارا جگت اجاڑ دکھائی دے ہے" ہر چند پاربتی نے اس کی تشفی کی مگر اس نے ایک نہ سنی اور دوسرے روز صبح کے وقت گٹھڑی مٹھری باندھ چلنے کو تیار ہوا اور چلتے وقت موہن کو گود میں اٹھا کر پیار کیا اور ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھ کر کہا "جو تجھے جان کے برابر رکھے تھی وہ تو مر گئی۔ اب تو اسے اور مجھے یاد رکھیو" اور پھر پاربتی کو بلا کر کہا "لے رام رام پاربتی --- جہاں تو اسے یاد کرے وہاں مجھے بھی یاد کر لیجو اب میرے جینے کا بھی کچھ بھروسا نہیں۔"[۱۴۳]

ماسٹر پیارے لال آشوب نے اس سیدھے سادے قصے میں نہایت جاندار سیرت نگاری، فنی ہنر مندی اور فطری مکالمہ نگاری سے کام لیا ہے کہ تمام کرداروں کے نقوش قاری کے ذہن پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ ہندو

تہواروں، میلوں، مندروں وغیرہ کا ذکر بھی متحرک اور دلکش انداز میں کیا ہے۔ کامیاب افسانہ نگاری کی خشت اول کے اس اولین زندہ نثری قصے کے بارے میں پروفیسر حمید احمد خان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''من سکھی اور سندر سنگھ کے قصے میں وحدت معنوی کی وجہ سے ایک نئی شان پائی جاتی ہے۔ وہ بنیاد جس پر اس لاجواب قصے کی ادبی وحدت قائم ہے من سکھی اور سندر سنگھ کی محبت ہے۔ یہی وہ محور ہے جس کے گرد اول سے آخر تک قصے کے تمام واقعات پھیلتے، چکر کھاتے اور سمٹتے ہیں۔''[۱۴۴] پلاٹ، کردار نگاری، ضروری جزئیات، اختصار، وحدت تاثر، نکتہ عروج، مصنف کا نقطہ نظر افسانے کے سبھی لوازمات اسی قصے میں موجود ہیں۔ افسانہ نگاری کا پختہ شعور حقیقت نگاری کے ساتھ اس افسانے میں موجود ہے۔ اس لحاظ سے ماسٹر پیارے لال آشوب بجا طور پر اردو نثر میں اولین اور کامیاب افسانہ نگار بھی کہے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان کی تمام تر توجہ انتظامی اور علمی امور کی جانب مبذول رہی لیکن اگر وہ سنجیدگی کے ساتھ باقاعدہ افسانہ نگاری کی صنف پر توجہ دیتے تو بے حد نام کماتے۔

''رسوم ہند'' میں ماسٹر پیارے لال آشوب کا دوسرا افسانہ ''قصہ خوشحال چند اور ہیرا، دولت رام اور مونگا، کروڑی مل اور گنگی کا قصہ'' ادبی اور فنی لحاظ سے من سکھی اور سندر سنگھ کے قصہ سے کسی طرح کم نہیں۔ اس افسانے کی کہانی تین نسلوں کی داستان پر مبنی ہے۔ البتہ کہانی میں مرکزی وحدت کا عنصر قدرے کمزور ہے کیونکہ واقعہ کے منتشر اجزاء کی شیرازہ بندی بخوبی ممکن نہیں بنائی جا سکی۔ مذکورہ قصہ طویل مختصر افسانے کی ذیل میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔ ہندو معاشرت اور تہذیب کی عکاسی نہایت سادہ اور آسان اسلوب میں کی گئی ہے۔ افسانے کی وہی تکنیک ہے جسے بیسویں صدی میں فنکارانہ مہارت سے قرۃ العین نے ''آگ کا دریا'' اور عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' جیسے لازوال ناولوں میں استعمال کیا۔ اس طرز کی ابتداء دراصل انیسویں صدی میں اپنی خام صورت میں اسی قصے میں کی جا چکی تھی اور یوں یہ اعزاز بھی لاہور کی نثر کو جاتا ہے جس نے نئے تجربات کو بھی فروغ دیا۔

قصے کا پلاٹ ایک ہی خاندان کی تین نسلوں کے گرد گھومتا ہے جس میں ہندوانہ معاشرت اور رسوم کو واقعات کی صورت کہانی میں پرو دیا گیا ہے۔ قصے کا پلاٹ اگرچہ ڈھیلا ڈھالا ہے لیکن حالات و واقعات کو اس طور بیان کیا گیا ہے کہ ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ نظر آتے ہیں۔ یہی افسانے کی فنکارانہ خوبی ہے۔ قصے میں دیہات کی بجائے شہر کی فضا استعمال کی گئی ہے جو دہلی شہر سے متعلق ہے۔ جس میں غدر کے واقعات کو بھی پیش منظر کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ نیز اشعار بھی فطری انداز سے قصے کا حصہ بنائے گئے ہیں۔ کہانی میں نہال چند اور اس کا بیٹا خوشحال غریب سے امیر ہو جاتے ہیں۔ خوشحال چند اپنے بیٹے دولت رام کی شادی نہایت دھوم دھام سے کرتا ہے۔ جب دولت رام کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اس کا نام کروڑی مل رکھا جاتا ہے۔ نوعمری میں اس کی بھی شادی کر

دی جاتی ہے اسی زمانے میں غدر کا سانحہ رونما ہو جاتا ہے۔ مینا (کروڑی مل کی دایہ جس نے اس کی پرورش کی ہوتی ہے) کا شوہر تیج رام غدر کے دوران کچھ انگریزوں کو پناہ دیتا ہے جس کا صلہ انہیں امن ہونے کے بعد انگریز سرکار کی جانب سے انعام کی صورت ملتا ہے۔ یوں افسانے کا طربیہ اختتام ہو جاتا ہے۔ تین نسلوں کی کہانی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پوری ہندو معاشرت کا جیتا جاگتا مرقع سامنے آجاتا ہے۔ افسانے میں کردار نگاری نہایت فطری انداز سے کی گئی ہے۔ مکالمے کرداروں کی ذہنی سطح اور ان کی سوچ کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ کہانی میں ارتقا کا عمل بدستور موجود رہتا ہے۔ جزئیات کے استعمال اور منظر نگاری کے فن کو بھی خوب نبھایا گیا ہے اس افسانے کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ مقصدیت (ہندوؤں کی طرز معاشرت اور رسوم کا بیان) کا عنصر غالب آ گیا ہے جس نے افسانے کی وحدت کو قدرے مجروح کیا ہے۔ اس کے باوجود پوری کہانی میں بدستور قصہ پن موجود رہتا ہے اور یہی اس افسانے کی کامیابی قرار دی جا سکتی ہے۔

آخری قصہ ''جہاں آراء بیگم اور محمد یوسف، گیتی آراء اور محمد جمیل الدین کا قصہ'' بنیادی طور پر انہی کرداروں پر مشتمل ایک سیدھا سادا مگر دلچسپ قصہ ہے۔ اس کے پلاٹ کا تانا بانا مسلمانوں کے مذہبی عقائد، طریقہ عبادات، مذہبی رسومات، تہذیب و معاشرت، مشرقی شرم و حیا اور مشرقی روایات سے بنا گیا ہے۔ قصے کے پلاٹ میں منطقی تسلسل کے ساتھ واقعات کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ مذہبی عقائد اور رسومات نہایت چابکدستی سے افسانے کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس حوالے سے زندہ و متحرک تصویروں نے قصہ کے مقصد کو بخوبی پورا کیا ہے۔ قصہ کا بیان زیادہ تر جہان آراء بیگم اور محمد یوسف کے گرد گھومتا ہے۔ قصہ کی ابتداء نہایت عمدگی سے کی گئی ہے کہ آغاز ہی سے تجسس کی فضا قاری کی دلچسپی کو بڑھاتی ہے اور وہ ان کرداروں اور ان پر بیتی واردات کو جاننا چاہتا ہے۔ ذرا یہی ابتدائی سطور ملاحظہ ہوں:

> ''ایک روز کا ذکر ہے کہ کسی جگہ آندھی بڑے زور وشور سے آ رہی تھی، درختوں میں ہوا سنسنا رہی تھی۔ چاروں طرف کالی گھٹا چھا رہی تھی۔ بادلوں میں بجلی خوب آب وتاب دکھا رہی تھی۔ لوگوں کی نظروں میں موت کا سما پھر رہا تھا غیر موسم کی گھٹا سے سب کے دلوں پر فکر کا بادل گھر رہا تھا۔ اسی جگہ سڑک کے کنارے پر ایک آباد سرا تھی جو نہایت پختہ اور خوش نما تھی۔ معمول کے مواقق وہاں بہت سے مسافر آئے ہوئے تھے مگر اس حادثے سے گھبرائے ہوئے تھے۔ سرا کے ایک کونے میں چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا اس کے اندر کسی کوٹھڑی میں ایک شخص بے ہوشی کی حالت میں پلنگ پر پڑا ہوا تھا اس کے سرہانے دونوں طرف مامائیں مونڈھوں پر بیٹھی ہوئی رومال ہلا رہی تھیں اور دو خوبصورت لڑکیاں جہاں آراء بیگم اور گیتی آراء بیگم چپکے چپکے باتیں کر کے رنج و مصیبت کو بھلا رہی

> تھیں۔ ایک دوسرے کو خدا کی یاد دلا رہی تھیں، تسلی کی باتوں سے دل کے غنچۂ پژمردہ کو کھلا رہی تھیں۔ باہر کسی اور مکان میں ان کے نوکر چاکر تھکے ماندے پڑے ہوئے تھے۔ پالکی، گھوڑا، رتھ اور بہل وہیں کھڑے ہوئے تھے۔''۱۴۵

کہانی بڑے منطقی انداز میں بڑھتی ہے اور آہستہ آہستہ کہانی کی پرتیں کھلنا شروع ہوتی ہیں اور پتہ چلتا ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں پڑا یہ شخص، ناصر الدین، ایک شریف زادہ ہے جو دہلی شہر کا نامور رئیس، ذات کا شیخ، بڑا خاندانی اور معزز آدمی ہے اپنی لیاقت اور کارگزاری کے باعث ضلع نور پور کے پرگنے عجیب آباد کا تحصیلدار ہو کر کامل تیس برس بعد پنشن لے کر واپس دہلی کا رخت سفر باندھے ہوئے ہے۔ اس کے ساتھ اس کی بیٹی جہاں آراء اور بھتیجی گیتی آراء ہے جس سے اولاد کی طرح بے حد محبت کرتا ہے۔ اس کی نسبت ناصر الدین ہی کے بیٹے جمیل الدین سے طے پا چکی ہے۔ جمیل الدین جو پہلے سے ہی دہلی میں اپنے چچا فیض الدین کے پاس رہ کر تحصیل علم کر رہا ہے۔

فیض الدین اور جمیل الدین دہلی میں ان سب کا استقبال کرتے ہیں۔ ناصر الدین کچھ عرصہ بعد بیماری کی شدت سے وفات پا جاتا ہے۔ مرنے سے قبل اپنے بھائی فیض الدین کو اپنی اولاد کی خاطر داری کی وصیت کرتا ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین میں اسلامی اور مذہبی روایات کو تفصیل سے اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ قصے سے الگ معلوم نہیں ہوتیں۔ اسی طرح جہاں آراء بیگم کی خالہ زاد بہن مریم کا ہدیہ اور اس کے بھائی رحمٰن بخش کی بسم اللہ کی رسم، نماز، روزہ کا تفصیلی بیان بھی فطری انداز لیے ہوئے۔ اسی رسم میں سید گھرانے کی دل افروز بیگم نامی خاتون جہاں آراء کو اپنے بھائی محمد یوسف کے لیے پسند کر لیتی ہے جو سرکار انگریزی میں اپنی قابلیت اور لیاقت کی بناء پر انبالے میں چھوٹی ہی عمر میں رسالے کا جمعدار ہو گیا تھا۔ ان کے خاندان کی سرکار انگریزی میں بڑی عزت تھی۔ بسم اللہ کی رسم کو کہانی کے اس موڑ کے ساتھ مصنف نے بڑی فنکارانہ چابکدستی سے جوڑا ہے اور کہانی تسلسل کے ساتھ جاری رہتی ہے۔ افسانے میں دہلی کی روزمرہ زبان کی چاشنی اس میں مزید رنگ بھرتی ہے۔ جب دل افروز اپنے بھائی محمد یوسف سے جہاں آراء بیگم کی بابت ذکر کرتی ہے تو مشرقی رکھ رکھاؤ اور گفتگو کی شائستگی ملاحظہ ہو:

> ''بھائی! تم جانتے ہو ناصر الدین خان اور فیض الدین خان کے بزرگوں سے ہمارے بزرگوں کی راہ و رسم اور قرابت چلی آتی ہے۔ دیکھو وہ لوگ کیسے خاندانی ہیں، عزت والے مقدور والے، غرض ہر طرح سے اچھے ہیں۔ بزرگوں کی ملاقات کے علاوہ تم بھی تو لڑکوں بالوں سے واقف ہو، باہر دیوان خانے میں جایا کرتے ہو سب سے ملتے رہتے ہو اور عورتوں کو تو میں ہی دیکھ چکی

ہوں۔ بس کیا تعریف کروں، کچھ کہا نہیں جاتا۔ جو تجویز میں نے سوچی ہے خدا کرے پوری ہو جائے اور وہ لوگ مان بھی لیں۔ بھائی! وہی لڑکی جہاں آراء جس کی خوبیوں کا ذکر میں گھر میں کرتی رہتی ہوں اسی بات کی ہے، صورت شکل کی کیا تعریف بیان کروں! بس یہ جی چاہتا ہے کہ اسے بیٹھی دیکھا کروں، رنگ جیسے انار کا دانہ، نقشہ بہت درست، آنکھیں کٹورا سی، ناک ستواں، آگے قد کو دیکھو تو ویسا ہی اچھا بات کرتے وقت منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ اخلاق اور عادتیں سب خوب نکھڑ ویسی ہی، دسوں انگلیاں دسوں چراغ''۔[۱۴۶]

مشرقی روایات کے ساتھ شادی کے معاملات طے پا جاتے ہیں۔ نکاح اور شادی کے موقع پر ہونے والی تمام رسمیں اور استعمال ہونے والی اشیاء کا تمام ضروری جزئیات کے ساتھ بڑی خوبصورتی سے احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ سب قصے میں رچی بسی محسوس ہوتی ہیں۔ کہانی میں دلچسپی کے عنصر کو برقرار رکھنے کے لیے شادی کے موقعہ پر دل افروز بیگم کے گلے کی کنٹھی کے گم ہونے کا واقعہ فطری انداز میں بیان کیا ہے کیونکہ ایسے موقعوں پر اکثر ایسا ہو جایا کرتا ہے۔ جہاں آراء بیگم کی شادی سے فراغت پا کر اس کا بھائی جمیل الدین اپنے استاد مولوی فخر الدین کی ترغیب پر اپنے حج کے شوق کو پورا کرنے کا قصد کرتا ہے۔ ایسے موقعہ پر جو انسانی احساسات اور جذبات دامن گیر ہوتے ہیں اسے مصنف نے عین انسانی فطرت کے مطابق بیان کر کے افسانے میں فطرت نگاری کا عنصر اجاگر کیا ہے۔

''چند روز کے بعد وہ اپنے دو نوکروں سمیت عرب کی طرف روانہ ہوا۔۔۔جمیل الدین کو بھی کبھی اپنی بہن اور کبھی چچا اور چچی کا دھیان آتا کبھی اس کے دل میں اس کی منسوبہ گیتی آراء اور بچپن میں دونوں کے ایک جگہ رہنے کا خیال گزرتا۔ اسی طرح وہ رستے میں سب کو یاد کرتا تھا مگر کعبے کا شوق اور حج کا ثواب ہر دم اس کے دل کو شاد کرتا تھا۔''[۱۴۷]

جمیل الدین کی روانگی کے بعد جب جہاں آراء بیگم اور محمد یوسف رخصت ہونے لگتے ہیں تو فطری جذبات نگاری سے کام لیکر دل کو پُرخلوص تسلیاں دی گئیں ہیں۔

''اس مفارقت سے سب ہی آزردہ خاطر تھے مگر گیتی آراء کو اس امر کا بہت قلق تھا۔ جہاں آراء بھی اس سے مل کر چشم پر آب ہوئی اور حسرت اور افسوس کی باتیں کرنے لگی'' پھر بولی ''بوا مجھے تمہاری جدائی سے بہت رنج ہے مگر کیا کروں مجبور ہوں، کچھ کر نہیں سکتی ہوں۔ خیر جو خدا کی مرضی ہے وہی بہتر ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ تھوڑے ہی عرصے میں ملیں گے آگے خط بھی آدھی ملاقات ہے جلدی جلدی بھیجتے رہیں گے۔ میں تمہارے پاس اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا علیحدہ خط بھیجا کروں گی تم بھی جو کچھ حال ہو آپ ہی لکھ بھیجا کرنا۔''[۱۴۸]

کہانی کامیابی سے آگے بڑھتی ہے کچھ عرصہ انبالے میں رہنے کے بعد محمد یوسف کے رسالے کو شاہجہاں پور جانے کا حکم ہوتا ہے۔ ملازمت کی یہ مجبوری دونوں میاں بیوی میں وقتی مفارقت کا باعث بنتی ہے۔ میاں بیوی کی اس مفارقت کی دل گرفتگی اور رخصت ہونے کو مشرقی محبت کے رکھ رکھاؤ کی سچی منظر کشی کرتے ہوئے فطری خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ''آخر روانگی کے ایک دن پہلے جب رات کو دونوں کھانا کھا چکے اور تنہائی کا وقت آیا تو محمد یوسف نے جہاں آراء بیگم سے کہا، ''بیگم مجھے تمہاری جدائی کا بہت رنج ہے مگر کیا کروں؟ مجبور ہوں سرکار کا حکم ہے، تعمیل ضرور ہے اس قدر اداس کیوں ہوتی ہو؟ دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔ تم ابا جان کے پاس چند روز رہو، میں بھی تھوڑے عرصے میں دہلی آنے کی کچھ تدبیر کروں گا اور تمہیں بھی بلا لوں گا۔
>
> جہاں آراء جس کے دل پر غم کی گھٹا چھا رہی تھی اور آنکھوں سے مینہ کی جھڑی لگ رہی تھی خاوند کی باتیں سن کر بولی ''صاحب! تمہیں کسی کے دل کی کیا خبر ہے، ان تسلی کی باتوں سے کیا فائدہ؟ ملاقات جب ہی ہو گی جب خدا کی مرضی ہو گی۔ دل کیوں بھاری کرتے ہو؟ تمہارے کڑھنے سے میری چھاتی پھٹی جاتی ہے۔''
>
> رات بھر دونوں میں اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں، صبح کی اذان ہونے سے پہلے دونوں اٹھے، تھوڑی دیر بعد نماز پڑھی خدا کی درگاہ میں ایام مفارقت کے دور ہونے اور زمانہ مواصلت کے قریب ہونے کی دعا کی۔ محمد یوسف نماز اور وظیفے سے فارغ ہو کر بولا۔ لو بیگم! خدا حافظ! جہاں آراء نے کہا ''خیر اللہ نگہبان ہے''۔[۴۹]

اسی اثناء میں دہلی میں غدر ہو جاتا ہے کہانی کے اس موڑ پر انگریزوں کی طرف داری کرتے ہوئے ان کی عملداری اور اطاعت و فرمانبرداری کو بجا اور غدر کو ناحق قرار دیا گیا ہے اور جنگ آزادی کے مفسدہ کے مذہبی لڑائی کے تاثر کو زائل کیا گیا ہے۔ انگریز سرکار کی عملداری کے جواز اور فوائد اور ثمرات کو مولوی فخر الدین کی علمی باتوں سے جائز ثابت کیا ہے۔ فیض الدین جو انگریزوں کا مخالف ہوتا ہے، مولوی فخر الدین اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے:

> ''تمہارے دل میں کیا خیال خام سمایا ہے کیوں الجھتے ہو؟ دیکھو ان باتوں سے باز آؤ، تمہیں انگریزوں کے وقت میں کون سی تکلیف تھی۔ جو اس طرح جلی بھنی باتیں کرتے ہو؟ انہوں نے تو ایسا آرام دے رکھا تھا کہ اب سب یاد کرتے ہیں خصوصاً مسلمانوں سے بہت ہی ملے جلے رہتے تھے۔ اور انہیں بڑے بڑے عہدے دیتے تھے علاوہ اس کے ان کی عملداری میں سب لوگ اچھی

طرح دل جمعی اور فراغ بالی سے مذہبی رکن ادا کرتے تھے کسی ضروری بات میں حرج نہ تھا۔ کیا تم اس لڑائی کو مذہبی لڑائی جانتے ہو؟ دین اسلام کی ترقی کا باعث سمجھتے ہو؟ اگر یہ خیال کرتے ہو تو تمہارا گمان باطل ہے ۔۔۔ دیکھو ہندوستان کے تمام مسلمان سرکار انگریزی کے امن میں ہیں اور شرع کے موافق کوئی مستامن ان لوگوں سے جن کے امن میں ہے۔ مذہبی لڑائی نہیں کر سکتا۔ چنانچہ فتاویٰ درمختار اور ہدایہ اور عالمگیری میں لکھا ہے کہ جو مسلمان غیر مذہب والوں کی عملداری میں امن سے رہے اسے ان کے خون یا مال سے تعرض کرنا حرام ہے۔"[۱۵۰]

فیض الدین جو وقتی طور پر تو اثر لیتا ہے مگر بادشاہ کی جانب سے بڑا منصب عطا ہونے پر لڑائی کا بہت اہتمام کرتا ہے اور بالآخر سر پر گولی لگنے سے جان کی بازی ہار دیتا ہے۔ یہاں سے حالات و واقعات میں المیاتی موڑ آتا ہے۔ گیتی آراء اور اس کی چچی نجم النساء اس خبر سے جہاں آراء کی خیریت کی فکر سے غم و الم میں مبتلا ہوئیں حالات کے اس طرح پریشان ہونے سے مولوی فخر الدین کی صلاح پر مولوی صاحب کی سربراہی میں جہاں آراء بیگم کے پاس انبالہ کی طرف کوچ کیا۔ جو انگریزوں کی عملداری میں پرامن علاقہ تھا۔ لیکن دہلی سے روانگی اور راستے میں گوجروں کی لوٹ مار سے بچتے اور ان سے مقابلہ کرتے ہوئے اس مختصر سے قافلے میں مولوی فخر الدین، دو نوکر اور نجم النساء کا بچہ اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ یہاں پر انسانی بے کسی و بے بسی کی تصویر کشی کرتے ہوئے ناامیدی کے بجائے بیم ورجا کی کیفیت کو برقرار رکھا ہے۔ بیٹے کی موت کے غم میں مرنے سے قبل نجم النساء کی گفتگو ملاحظہ ہو:

"تقدیر میں یہ صدمے اٹھانے تھے ظالموں نے میرے لخت جگر عبدالرحمٰن کو اس بے رحمی سے مارا۔ اس کا باپ پہلے ہی مر چکا تھا اب مجھے اپنے مرنے کا تو افسوس نہیں ہے تمہاری تنہائی کا بہت خیال ہے تم ایسے وقت میں صبر و استقلال سے رہنا، ہرگز نہ گھبرانا، اللہ تعالیٰ سب مشکلیں آسان کر دے گا وہ بڑا کریم و کارساز ہے۔"[۱۵۱]

گیتی آراء اپنی دڈا کے ہمراہ جیسے تیسے مصیبتیں اٹھا کر جہاں آراء بیگم کے پاس انبالے پہنچتی ہے۔ وہاں پتہ چلتا ہے کہ محمد یوسف کی بھی کچھ خبر نہیں کہ کہاں ہے؟ دہلی پر انگریزوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد ادھر جمیل الدین حج سے واپس آتا ہے۔ اپنے عزیز و اقارب اور استاد کی تلاش میں نکلتا ہے۔ دہلی میں دل افروز بیگم کے شوہر شیخ افضل احمد انگریز سرکار کا بہت خیر خواہ تھا اس لیے امن سے رہا۔ اس سے جمیل الدین کو تمام احوال معلوم ہوتا ہے یہاں خوب خاطر داری ہوئی اور حج کا احوال بیان ہوتا ہے۔ سفر حج اور مناسک حج کی جزئیات بالتفصیل مگر دلچسپ انداز میں اس طرح سرگذشت بیان کی گئی ہے کہ قاری بھی جمیل الدین کے ہمراہ رہتا ہے۔ جمیل

الدین نے انگریزوں سے جائیداد واگزار کرانے، عزیزواقارب کو بلانے اور دہلی میں رہنے کی اجازت لی۔ پھر بہن جہاں آراء کو خبر کی۔ جو سب کے لیے خوشی کی خبر تھی، اب بس محمد یوسف کی فکر باقی تھی۔ دیوان حافظ سے فال نکالی جاتی ہے مضمون مطلب کے موافق آتا ہے۔ چند روز بعد محمد یوسف انگریزوں کے ساتھ اپنی وفاداری ثابت کر کے واپس لوٹتا ہے۔ یہاں موقع کی مناسبت سے خوبصورت فضا بندی سے کام لیا گیا ہے۔

> ''آخر ایک دن بہار کے موسم میں جہاں آراء اور گیتی آراء دونوں اپنے گھر کے چمن میں کرسیوں پر بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں اور اس وقت وہاں عجب سماں تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، فوارے چھوٹ رہے تھے کہ اتنے میں ایک خوبصورت نوعمر آدمی فوج کی وردی پہنے، ہتھیار باندھے، بے باک اندر چلا آیا۔'' ۱۵۲؎

محمد یوسف کی واپسی پر خوشی کا دور لوٹ آیا۔ پورا خاندان جمیل الدین کے پاس دہلی روانہ ہوتا ہے۔ جہاں جمیل الدین کا نکاح گیتی آراء سے ہونے کے بعد سب ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں۔ یوں ڈرامائیت سے بھرپور قصہ مختلف اتار چڑھاؤ سے گذرتا ہوا اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ قصہ جس میں المیہ اور طربیہ عناصر بھی ہیں جو واقعات کا فطری اور منطقی نتیجہ کی بناء پر پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کے مذہبی عبادات و رسوم، اعتقادات کو اس کامیابی سے قصہ میں پرو دیا ہے کہ کہیں بھی احساس نہیں ہوتا کہ قصہ انہی مقاصد کے تحت لکھا گیا ہے۔ جو مصنف کی کامیابی ہے۔ اگرچہ افسانے کی خام صورت ہے لیکن افسانہ نگاری کے فن میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ انہی ابتدائی مراحل سے گذر کر افسانہ نگاری کی صنف اپنا اعتبار قائم کرتی ہے۔

اپنی خام صورت لیکن منظم اور مربوط انداز میں لکھے گئے ان قصوں کو جنہیں افسانہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ ان کی موجودگی میں یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو نثر میں افسانہ نگاری کی صنف کا آغاز بھی لاہور ہی سے ہوتا ہے نہ کہ بیسویں صدی کی اولین دہائی میں سجاد حیدر یلدرم (مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ)، پریم چند (دنیا کا انمول رتن) یا راشد الخیری (نصیر اور خدیجہ) سے کیونکہ افسانہ نگاری کی روایت ۱۸۶۴ء میں لاہور میں شروع ہو چکی تھی۔ یلدرم، پریم چند اور راشد الخیری کے قرار دیئے جانے والے اولین افسانوں کو دیکھیں تو ان کے ہاں بھی کہانی پن خام صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ ۱۵۳؎ چونکہ مذکورہ ادبا نے افسانہ نگاری پر سنجیدگی سے توجہ دی اور افسانہ نگار کے طور پر اپنی پہچان کروائی اس لیے ان پر زیادہ توجہ دی گئی اور ناقدین نے ان کو اولیت دینے کی کوششیں کیں۔ جبکہ ''رسوم ہند'' کے قصوں کو یلدرم، پریم چند اور راشد الخیری کے ابتدائی افسانوں کے ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو ادبی اور فنی لحاظ سے کسی طور پر کم نہیں ہیں۔ اگر کمی ہے تو صرف یہ کہ ان قصوں کے لکھنے والوں نے باقاعدہ افسانہ نگاری کی

جانب توجہ نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ افسانے خاص مقاصد کے حصول یعنی ہندو اور مسلمان طلباء کو اپنی طرز معاشرت اور مذہبی و سماجی رسم و رواج سے شناسائی اور ان سے متعلق کہانی کے ذریعے مفید معلومات دینے کے لیے لکھے گئے تھے۔ جس کے لیے کہانی کا پیرا یہ ہی بہترین آلہ کار تھا۔ انیسویں صدی کے نصف دوم میں لاہور میں لکھے جانے والے ان قصوں کو فن کے معیار پر پرکھیں تو بھی ہمیں مایوسی نہ ہوگی۔ لہٰذا اردو نثر میں افسانہ نگاری کی اولین کونپلیں لاہور ہی کی ادبی فضا میں لگائی گئیں۔ یوں لاہور کی اردو نثر کو یہ فخر بجا طور پر حاصل ہے کہ افسانہ نگاری کا آغاز بھی اسی سرزمین سے ہوا۔ افسانوی ادب کی تاریخ میں پہلی بار ان قصوں کا پلاٹ تخیل اور تمثیل نگاری کی پر تکلف فضا سے نکل کر حقیقت نگاری سے اس طرح ہمکنار ہوا کہ اس میں رچ بس گیا۔ اس کے لیے طرز ادا اور اسلوب کی یہ تبدیلی نہ صرف افسانے کے آغاز اور اس کی ارتقائی منزل کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضوں کے پیش نظر ذہنی و تہذیبی انقلاب کی بھی آئینہ دار ہے۔

''رسوم ہند'' کے مذکورہ قصے آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل کے ہیں لیکن اپنی زبان و بیان کے اعتبار سے بلاشبہ کسی بھی ترقی پسند افسانہ کے مقابل رکھے جا سکتے ہیں۔ افسانے کو مغربی اثرات کی پیداوار قرار دیا جاتا ہے جبکہ ''رسوم ہند'' کے یہ قصے اور اسی طرح کے دیگر قصے[۵۴] جو افسانے کی ابتدائی اور خام صورت تھی خالصتاً عصری تقاضوں کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ افسانہ نگاری کی روایت لاہور میں مذکورہ قصے کہانیوں کی صورت میں پہلے ہی سے موجود تھی جسے بعد ازاں مغربی اثرات نے مزید نکھارا۔

اُردو کی تیسری کتاب:

یہ کتاب ماسٹر پیارے لال آشوب کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو نے میجر ہالرائیڈ کے کہنے پر تصنیف کی اور پہلی بار ۱۸۶۸ء میں سرکاری مطبع لاہور سے شائع ہوئی۔ مقالہ نگار کے پیش نظر اس کی چھٹی اشاعت ۱۸۷۶ء ہے جس کے سرورق کی عبارت اس طرح ہے۔

اُردو کی تیسری کتاب

مرتبہ

ماسٹر پیارے لال صاحب کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو گورنمنٹ پنجاب

حسب الحکم

جناب میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب

لاہور

کے سرکاری مطبع میں بابو چندر ناتھ متر قائمقام

کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی

۱۸۷۲ء

اس سر رشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے

دفعہ ۲ تعداد جلد ۵۰۰۰ قیمت ۴

ماسٹر پیارے لال آشوب اعلیٰ درجے کے صاحب فہم، سخن شناس اور علم دان تھے۔ دہلی کالج میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے تھے۔ محکمہ تعلیم پنجاب نے ان کی علمی قدر دانی کرتے ہوئے انہیں دہلی سے لاہور اپنے شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ کر لیا اور ۱۸۶۸ء میں پنجاب بک ڈپو کے کیوریٹر کا عہدہ تفویض کیا۔

اردو کی تیسری کتاب، نصابی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو ۸۴ صفحات پر مشتمل ہے جس میں دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تاریخی سبق، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، ڈھکوسلے، شعراء و حکماء اور علماء کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا سبق ''اردو زبان کی حقیقت'' کے بیان پر ہے اور دوسرا ''حکیم سقراط کا حال'' جبکہ تیسرا ''ارسطو کا حال'' پر مبنی ہے۔ معلوماتی مضامین میں ''فرانسس بیکن صاحب کا حال'' ''ذکر والمیک مصنف رامائن کا''، ''قطب صاحب کی لاٹھ''، ''مصر کی مثلث نما چوپہل میناروں کا بیان''، ''روضہ ممتاز محل''، ''چین کی دیوار اور نہر کا بیان''، ''انگلستان کا دارالخلافہ''، ''چینیوں کی رسم و رواج کا حال'' وغیرہ کے علاوہ ''دو کتوں کا قصہ'' بھی شامل ہے۔ جو قصہ سنڈفورڈ مرٹن سے لیا گیا ہے اور اس کے ذریعے اخلاقی سبق دیا ہے کہ جو اپنی زندگی کاہلی اور سستی میں کاٹتے ہیں ان سے ہمت اور دلیری کا بھروسا رکھنا محض خطا ہے جبکہ محنت اور تربیت سے ناچیز اور بے حقیقت بھی اکثر اچھی اور کام کی بن جاتی ہیں۔ گارساں دتاسی اسے کپتان ہالرائیڈ کی سرپرستی میں لکھی گئی ''قواعد اردو'' (۱۸۷۰ء) کے دوسرے ایڈیشن (۱۸۷۱ء) کے حصے قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے:

> ''کپتان ہالرائیڈ (Holroyd) کی تصانیف یا ان کی سرپرستی میں لکھی ہوئی کتابوں میں قواعد اردو'' قابل ذکر ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن ابھی حال میں شائع ہوا ہے اور اس کے ۱۲۵۰ نسخے طبع کیے گئے ہیں۔ کتاب ہشت ورقی تقطیع کے ۱۴۴ صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کے دوسرے اور تیسرے حصے (اردو کی تیسری کتاب) میں ہندوستانی زبان کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اس زبان میں کس قدر خوبیاں موجود ہیں اور اس کے لکھنے والوں کی طرز تحریر میں کس

قدر فصاحت اور بلاغت پائی جاتی ہے۔ بعد ازاں اسی کتاب میں کچھ پہلیاں اور نسبتیں ہیں۔ بعض نظمیں بھی ہیں۔ پھر پرندوں کے حالات انگریزی سے خواجہ ضیاء الدین نے ترجمہ کیے ہیں۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، بیکن، نیوٹن، فارسی شاعر فردوسی اور سنسکرت کے شاعر والمیکی (مصنف رامائن) کی سوانح عمریاں ہیں۔ بعد ازاں (سرسید احمد خان) نے دہلی کے مشہور آثار قدیمہ پر سلسلہ مضامین لکھا ہے اور اسی طرح مصر کے اہرام اور چین کی دیوار اور چینیوں کے رسم و رواج پر بھی مضامین ہیں۔ نیز دیگر انتخابات ہیں۔"[۱۵۵]

گارساں دتاسی کے مذکورہ بیان سے پتہ چلتا ہے کہ "اردو کی تیسری کتاب" مختلف ایڈیشن کی صورت میں شائع ہوتی رہی نیز اس میں پیارے لال آشوب کے ساتھ خواجہ ضیاء الدین کی ترجمہ کردہ تحریریں بھی اس کتاب کا حصہ بنیں۔ یوں "اردو کی تیسری کتاب" "قواعد اردو" میں اسی کے ایک حصہ کے طور پر اس میں بھی چھپی۔ واقعات کے بیان میں پیارے لال آشوب نے جس سادگی اور سلاست سے کام لیا ہے اس نے اردو نثر کو کس قدر شفاف اور شگفتہ بنا دیا ہے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔

"احاطہ کی چار دیواری میں طاق بنی ہوئی ہیں اور چاروں طرف سنگ سرخ کا ایک ایک دروازہ ہے۔ بڑی دروازی پر جو روضہ میں جانے کا رستہ تھی۔قرآن کی آیتیں کھدی ہوئی اور بیل بوٹی بنی ہوئی ہیں۔ اس دروازے میں سی کئی سیڑھیاں اتر کر باغ میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ باغ بھی ایسا گلزار ہے کہ اس کی آرائش کی ستائش نہیں ہوسکتی۔ اس کی خوشبو پودوں کی بہار اور میوہ دار درختوں کی قطار، اور روشوں کی تراش کا لطف کیا بیان کیا جائی! روشوں پر سنگ سرخ کا فرش اور بیچ میں سنگ مرمر کا ایک پاکیزہ حوض ہے حوض کی اندر فواری لگی ہیں اور اس کی گرد سرو کی درخت کھڑی ہیں ۔۔۔حوض سے آگی بڑھکر کئی سیڑھیاں چڑھکر ایک شطرنج نما چبوترہ پر پہنچتی ہیں ۔اور اس کی اوپر ۳۱۳ فیٹ مربع سنگ مرمر کا ایک اور چبوترہ دیکھتی ہیں ۔اس چبوتری دیوار میں ایک سنگ مرمر کا زینہ ہی۔ اور چاروں گوشوں پر ۳۱۳ فیٹ بلند چار مینار سرکشیدہ کھڑی ہیں اور اسی چبوتری کی بیچوں بیچ ۱۸۶ فیٹ مربع میں خاص روضہ کی عمارت ہی۔ روضہ کی سقف پر سنگ مرمر کا گنبد ۸۰ فیٹ اونچا چلا گیا ہی۔ اور اس کی چوٹی پر بشکل ہلال ایک طلائی کلس چمکتا ہی۔ بڑی گنبد کی گرد چار چھوٹی برج اور ہیں ۔اور ان سی اس کی زیبائش اور بھی زیادہ ہوگئی ہے۔اس روضہ کی مغربی اور مشرقی سمت میں نیچی کی چبوتری پر دو خوش قطع اور ہم شکل عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک مسجد ہی۔ اور دوسری اس کا جواب ۔۔۔گنبد کے اندر جا کر ۔ درودیوار پر گلزار ۔ بلکہ نگار خانہ کی بہار نظر آتی ہی۔ جابجا عقیق و یشب ولاجورد وغیرہ قیمتی پتھروں کی پھول نہایت خوش

اسلوب بنائی ہیں۔ اور پھولوں کی پنکھڑیوں میں تیس تیس رنگ کی پتھر لگائی ہیں۔ اور پھر جوڑ اس خوبی سی ملائی ہیں کہ ناخن پھیرتی سی ان کی صفائی میں سرموفرق نہیں معلوم ہوتا۔ ان پھولوں کی سوا دروں۔ اور محرابوں۔ اور دیواروں پر جگہہ جگہہ سنگ اسود کی پچی کاری سی قرآن شریف کی آیتیں کندہ ہیں۔ کہتی ہیں کہ اس مقبری میں اسیطرح پورا قرآن کھدا ہوا ہی۔ گنبد کی وسط میں سنگ مر مر کا ایک جالی دار کٹہرا لگا ہوا ہی۔ اور اس میں جہاں جالی نہیں ہی۔ وہاں وہی بیش بہا پتھروں کی عجب گلکاری ہی۔ ہر گل ایک مرقع اور کاریگر کی استادی کا نمونہ ہی۔"[۱۵۶]

اس نمونہ عبارت میں "روضۂ ممتاز محل" کی منظر کشی کرتے ہوئے جزئیات نگاری کے لیے لفظوں کا چناؤ قابل دید ہے۔ جس سے اس روضہ کی جیتی جاگتی تصویر نگاہوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ کتاب میں بعض الفاظ کی املا قدیم طریقے پر ہونے کے باوجود اسلوب کی شگفتگی، دلاویزی، سلاست اور زبان کی شیرینی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً دو کتوں کے قصے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"کہیں کسی غریب چرواہی کو دو پلی اس قسم کی کتوں کی ہاتھ لگ گئے کہ جو قد اور دلیری میں مشہور ہیں۔ اسنی ان میں سی ایک تو اپنی گانو کی زمیندار کو جو بہت بڑا آدمی تھا اور شہر میں رہتا تھا نذر دیا اور ایک کو اپنے پاس رکھا۔ زمیندار نی اپنی کتی کا نام موتی رکھا اور چرواہی نے اپنی کتی کا نام شیرا رکھا۔ زمیندار موتی کو اپنی باورچی خانہ میں بھیجدیا۔ وہاں خانساماں خدمت گار اس کے ساتھ کھیلا کرتی اور وہ بھی دم ہلا ہلا کر ان کا منہ چاٹا کرتا تھا۔ دن بھر اسکو باورچی خانی سے روٹی اور کباب کے ٹکڑی کھانی کو ملا کرتی۔"[۱۵۷]

سُلّم الادب:

یہ کہانیوں کا مجموعہ، نثر و نظم کے نمونہ پر مشتمل نصاب کی کتاب ہے جو عربی زبان کے امتحان کے لیے تھی۔ اس کا ترجمہ اور مشکل الفاظ کی تشریح اردو زبان میں کی گئی ہے۔ ہالرائیڈ کی مرتب کردہ یہ درسی کتاب ۱۸۶۹ء میں چھپی۔

مختصر تواریخ انگلستان:

۱۸۶۹ء میں کپتان ہالرائیڈ کے کہنے پر یہ تاریخ، پنجاب کے مدارس کے لیے لکھی گئی۔ اس کے سرورق کی عبارت ملاحظہ ہو:

مختصر تواریخ انگلستان

طلباء مدارس احاطہ پنجاب کے لیے

حسب الحکم

جناب کپتان ہالرائیڈ صاحب بہادر

ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن ممالک پنجاب وغیرہ

۱۸۶۹ء

مطبع سرکاری واقع لاہور میں چھپی۔

۳۹ صفحات پر مشتمل یہ کتاب درسی تقاضوں کے پیش نظر لکھی گئی۔ جس میں تاریخ کے موضوع اور تاریخی کتب کی اہمیت بیان کرتے ہوئے انگلستان کی تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد یہاں کے مقامی لوگوں کو انگریز حکمرانوں سے روشناس کرانا تھا کہ رعایا سے قربت کا ایک تعلق پیدا کیا جائے۔ تاریخ کی اس کتاب میں انگلستان کے پہلے راجہ اجبرٹ سے لیکر ملکہ وکٹوریہ تک کے عہد کا نہایت مختصر احوال بیان کیا گیا ہے اور جس میں انگلستان میں ہونے والی سیاسی، معاشرتی اور لسانی ترقی کا خاکہ بھی کھینچا گیا ہے۔ اسلوب بیان کی سادگی، روانی اور فصاحت نے تاریخ جیسے موضوع کو دلچسپ بنا دیا ہے مثلاً تاریخ کے مطالعہ کی رغبت دلاتے ہوئے کس قدر دلاویز پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے ملاحظہ ہو:

> ''تواریخ کی پڑھنی کا بہترین نتیجہ یہہ ہی۔ کہ مختلف قوموں اور بادشاہوں کی اصل حقیقت اور ان کی بڑھتی گھٹنی کی کیفیت اس علم کی وسیلی سی دریافت ہوتی ہی۔ اسکی سوا آدمی کو عقل آتی ہی اور طبعیت کو ایک طرح کی فرحت اور خوشی پیدا ہوتی ہی۔ دیکھو جس قوم یا شخص سی ہمکو کچھ واقفیت ہو۔ اسکی تاریخ پڑھنی سی یہہ باتیں زیادہ تر حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً جو ہماری دوست ہیں یا کسی نوع کا تعلق ہم سی رکھتی ہیں۔ جب انکی کوئی بات ہماری کان میں پڑی گی۔ بیشک دل اسکی سنی کو چاہی گا۔ خواہ اسمیں کچھ ہمارا مطلب ہو یا نہو علی ہذا القیاس جو اگلی راجا یا بادشاہ ہندوستان میں ہو گئی ہیں انکی قصی اور واقعات سنی کو سب چھوٹی بڑونکا جی چاہتا ہی یہاں سے ہم کو یقین ہی کہ تاریخ انگلستان (جس میں وقت کی حاکموں صاحبان انگریز کا مذکور ہی) ناظرین کو بہت مرغوب ہو گی۔ خصوص اسواسطی کہ یہہ قوم زمین کی ایک ایسی گوشہ دور دراز سی آئی ہی۔ جسی اہل ہندنی کبھی بھی نہ سنا تھا۔''[۱۵۸]

قواعد اردو:

خواجہ ضیاء الدین کی تالیف کردہ یہ کتاب ہالرائیڈ نے لکھوائی جو ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی۔۱۵۹ اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔۱۶۰

اردو کی پہلی کتاب:

ابتدائی جماعتوں کے لیے بنیادی کتاب۱۶۱ ہے اس کے سروق کی عبارت درج ذیل ہے:

اردو کی پہلی کتاب

پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں تالیف ہوکر

لاہور

کے مطبع سرکاری میں چھاپی گئی

۱۸۷۱ء

اس سررشتے کی بے اجازت کوئی

نہ چھاپے

۳۶ صفحات پر مشتمل کتاب جس میں کُل ۱۱۵ اسباق اور ۱۷ لطیفے ہیں۔ ابتداء میں اعراب کے ساتھ حروف تہجی سکھانے کے بعد دو حرفی لفظوں کے جملے بتائے گئے ہیں۔ جو سبق ۱ سے ۵ تک ہیں، سبق ۶ تا ۱۲ سہہ حرفی لفظوں کے جملوں پر، سبق ۱۳ تا ۱۷ چو حرفی لفظوں کے جملوں پر، سبق ۱۸ اور ۱۹ پانچ حروف کے لفظوں پر جبکہ سبق ۲۰ چھ حروف کے جملوں پر مبنی ہے۔ دو حرفی لفظوں کے جملے بنانے کی مشق اس طرح کرائی گئی ہے۔

"یا رب! اس کی آس ہی۔ سب سچ ہی۔ غم مت کر۔ مت ڈر۔ دِق مت کر۔ دل پر غم ہی۔ وہ بِلی پُر ہی۔ دم مت دی۔ غل مت کر۔ دن کم ہی۔ دم تو لو۔ ہم سی مت لڑ۔ دل سی سن۔ یہہ حق ہی۔ وہ بد ہی۔ نَیل پر چل۔ لب پر مت لا۔ آہ مت کر۔ یہہ سن لو۔ وہ بدبو ہی۔"۱۶۲

لطائف کی صورت میں شگفتہ مزاح بھی کتاب کا حصہ ہے مثلاً یہ لطیفہ ملاحظہ ہو:

"اکبر نے بیربر سی پوچھا۔ کہ لڑائی کی وقت کیا کام آتا ہی؟ بیربر نی کہا۔ کہ جہاں پناہ، اوسان۔ بادشاہ نی کہا۔ ہتیار اور زور بھی تو کہہ۔ بیربر نی کہا۔ کہ جہاں پناہ! اگر اوسان ہی خطا ہو جائی تو ہتیار اور زور کس کام آئی گا۔"۱۶۳

قصص ہند (حصہ اول):

ماسٹر پیارے لال آشوب کی مرتب کردہ یہ درسی کتاب میجر ہالرائیڈ ڈائریکٹر تعلیمات ممالک پنجاب کے حکم سے تین حصوں میں لکھی گئی۔ حصہ اول اور حصہ سوم کا کام ماسٹر پیارے لال آشوب کے سپرد ہوا جو اس وقت پنجاب بک ڈپو میں قائم مقام کیوریٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے جبکہ جلد دوم محمد حسین آزاد نے لکھی۔ ''قصص ہند'' کا سن تصنیف معلوم نہیں ہو سکا لیکن یہ پہلے پہل حصہ دوم کے ساتھ ۱۸۷۲ء میں سرکاری مطبع لاہور سے شائع ہوئی۔ جس کا تذکرہ پنجاب گورنمنٹ گزٹ ۱۲ ستمبر ۱۸۷۲ء کی قابل فروخت کتب میں بھی ملتا ہے۔ بعدازاں اس کی متعدد اشاعتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ بھی ایک مقبول نصابی کتاب کا درجہ رکھتی تھی۔ ''قصص ہند (حصہ اول)'' دیسی زبانوں کے مدارس کی چوتھی جماعت کے نصاب میں شامل تھی۔ ''قصص ہند (حصہ اول)'' کی ترمیم شدہ چوتھی اشاعت کے سرورق پر یہ الفاظ مرقوم ہیں:

قصص ہند

مرتبہ

لالہ پیارے لال صاحب قائمقام کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو پنجاب

حسب الحکم

جناب میجر ہالرائیڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر مدارس ممالک پنجاب

ترمیم ہو کر

لاہور کے سرکاری مطبع میں باہتمام

ماسٹر پیارے لال قائمقام کیوریٹر کی چھپا

۱۸۷۴ء

اس سررشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے[۱۶۴]

مذکورہ اشاعت سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ ۱۸۷۲ء کی ترمیم شدہ اشاعت ہے لیکن یہ ترمیم کس اشاعت کے بعد ہوئی اس کا پتہ نہیں چل سکا کیونکہ ۱۸۷۴ء کی اشاعت کا نسخہ ہی دستیاب ہو پایا ہے۔ اس سے قبل کا کوئی نسخہ نہیں ملا۔ ۱۸۷۴ء کے بعد اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوئی ہو گی۔ اس کا سراغ ۱۸۷۸ء کی اشاعت سے ملتا ہے۔ البتہ سرورق پر ''کیوریٹر کا قائمقام'' ہونا نہیں لکھا۔ ۱۸۷۸ء کی لوح کی عبارت درج ذیل ہے:

قصص ہند

حصہ اول

مرتبہ ماسٹر پیارے لال کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو پنجاب

حسب الحکم

جناب میجر ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ

لاہور

کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال کیوریٹر کے اہتمام سے چھپا

۱۸۷۸ء

اس سر رشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے۔[۱۶۵]

''قصص ہند'' (حصہ اول) کی ابتداء میں قدیم ہندوستان کے سرسری تذکرہ کے ساتھ رام چندر جی، کورو، پانڈو اور سکندر اعظم یونانی کا نسبتاً تفصیلی ذکر کیا ہے۔ابتدائی چند صفحات پر تاریخ ہند کا خلاصہ اس عمدگی اور دلچسپی سے بیان کیا گیا ہے کہ مبتدی اور منتہی دونوں کے لیے یکساں دلچسپی کا عنصر موجود ہے۔اس میں پہلے ہندوؤں کی نسل اور ذاتوں کا بیان ہے۔پھر ہندوؤں کی علمی اور ذہنی ترقی کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح انہوں نے ہندوستان میں مختلف علوم وفنون مثلاً علم ہیئت، ریاضی، طب اور شاعری کو درجہ کمال تک پہنچایا اور سنسکرت زبان کو نکھارا لیکن آخر میں بتاتے ہیں کہ یہ تمام کمالات ایک حد تک پہنچ کر رک گئے اور پھر ان میں تنزل آتا چلا گیا۔ اس کے بعد فارس کے بادشاہ دارا گشتاسپ اور سکندر اعظم کے حملے کا ذکر آتا ہے۔عربوں کا سندھ اور مامون الرشید کا ہندوستان پر حملہ کرنا، محمود غزنوی کا حملہ، مسلمان بادشاہوں کے حالات، شہاب الدین غوری، قطب الدین ایبک، خاندان خلجی اور تیمور کے بعد مغلیہ دور کا ذکر آتا ہے۔''قصص ہند'' (حصہ اول) میں پیارے لال آشوب نے اردو نثر میں فصیح وسلیس، شستہ، صاف اور مؤثر زبان کے استعمال کو رواج دیا۔کتاب کو پڑھنے سے یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ زبان آج سے ایک سوسینتیس سال پہلے کی زبان ہے۔تاریخی واقعات کا بیان، داستانوی طرز پر اس طرح کرتے ہیں گویا ہم ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔جس میں تحیر وتجسس کا عنصر بدستور موجود رہتا ہے مثلاً

> ''اگلے زمانے میں شہر دہلی سے ساٹھ میل کے فاصلے پر شمال مشرق کی جانب گنگا کے کنارے ایک شہر ہستناپور آباد تھا اور وہاں چندر بنسی خاندان کے راجہ راج کرتے تھے۔''[۱۶۶]

> ''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کوئی سوداگر ایک نادر گھوڑا فیلقوس کے پاس لایا اور ۲۵ ہزار روپیہ اس کا

> مول کیا۔ بادشاہ سکندر اور اپنے سرداروں کو ساتھ لے کر گھوڑے کے امتحان کے واسطے میدان میں گیا۔"۱۶۷

"قصص ہند (حصہ اول) کی سب سے بڑی خوبی اس کا اسلوب بیان ہے جس نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس اسلوب نگارش کو برتنے کی وجہ یہ تھی کہ طلباء تاریخ کو ذوق وشوق سے پڑھیں۔ بیان کی خوبصورتی کے اسلوب کے تمام لوازم کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے طلباء کے ذہنی معیار سے ہم آہنگ کیا گیا ہے۔ مثلاً سکندر اعظم کی ایشیائی فتوحات کو محاکاتی اسلوب میں کس قدر خوبصورتی سے بیان کیا ہے ملاحظہ ہو:

> "منجدھار میں پہنچ کر دیوتاؤں اور دیویوں کے نام پر ایک سانڈ قربان کیا اور جب کنارہ نزدیک آیا تو اپنا نیزہ خشکی پر پھینک دیا۔ اور اس سے یہ شگون لیا کہ ایشیاء پر قبضہ ہوگیا کنارے پر اتر کر شہر ٹرائے کی راہ لی اور وہاں پہنچ کر ان دلاوروں کے مقبروں کی جنہوں نے اس میدان میں جانبازیاں کی تھیں جن کے کارناموں کی تفصیل ہومر کی کتاب الیڈ میں مندرج ہے۔ زیارت کی اس عرصے میں داراشاہ فارس کے جرنیل اس کے روکنے کے واسطے لشکر جرار لے کر دریائے گرینی کس پر آ پڑے جب سکندر وہاں پہنچا تو دریا کا عمق اور زور زیادہ دیکھا اور ساحل جس پر دشمن کی فوج پڑی تھی بہت ناہموار پایا۔ شام بھی نزدیک تھی۔ اس سبب سے ایک جرنیل نے جو بڑا آزمودہ کار تھا اس سے کہا کہ اس وقت دریا کے پار جانا اور حملہ کرنا مناسب نہیں مگر سکندر نے کچھ خیال نہ کیا اور یہ جواب دیا کہ ہلس پونٹ کو عبور کرکے اس چھوٹے سے دریا پر اٹکنا اچھی خال نہیں ہے۔ یہ کہہ کر گھوڑا دریا میں ڈال دیا اور سواروں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ سامنے سے دشمن نے تیر برسانے شروع کیے اور دریا کے تلاطم نے بھی اس کو کئی بار غوطے دیے مگر وہ دیوانوں کی طرح جوش میں بھرا ہوا آگے بڑھا چلا گیا۔ کنارے پر پہنچ کر اس کو صف آرائی کی مہلت نہ ملی اور دونوں فوجیں نمٹ پٹ ہوگئیں۔ سکندر کی سپر اور مرصع کلغی سے اس کو پہچان کر دشمن کی فوج کے ایک غول نے آگھیرا اور دو جرنیلوں نے نیزے اور تیر کے اس پر کئی وار کیے ان حملوں میں اس کا جوش جوڑ کے مقام پر کھل گیا اور خود بھی چھلنی ہوگیا مگر جسم کو کچھ آسیب نہ پہنچا۔ اور اس نے دونوں جرنیلوں کو اپنے ہاتھ سے خاک میں ملایا۔ اتنے ہی میں سکندر کی باقی فوج دریا سے گذر کر آ پہنچی اور اس کو دیکھ کر فارس کی فوج بھاگ نکلی۔ اس معرکے میں یونانیوں نے جو فارس کی فوج میں داخل تھے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور شجاعت کی داد دی۔ مگر آخر کو کھیت سکندر ہی کے ہاتھ رہا۔"۱۶۸

چونکہ یہ کتاب درس نصاب میں شامل تھی اس لیے اس میں بھائی چارے کا اخلاقی درس بھی دیا گیا ہے

اس حوالے سے انوکھا طرز اختیار کرتے ہوئے انگریزوں اور ہندوؤں کو ایک ہی نسل یعنی آریائی نسل سے منسوب کیا ہے۔ جس کا مقصد انگریزوں کے بارے میں پائے جانے والے شکوک و شبہات، اختلافات اور اجنبیت کو دور کرنا، مفاہمت کی فضا سازگار بنانا اور ان پر اعتماد دلانا بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح بھی انگریز حکمرانوں کے مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے معاونت کی گئی۔ اس سے حکام اور مقامی لوگوں بالخصوص آنے والی نسل کی مغائرت کو کم کرنے اور انہیں بہترین مددگار بنانے میں مدد ملی ہوگی اور اس کام کے لیے سب سے بہترین ذریعہ یہی درسی کتب تھیں۔ مثلاً کتاب کی ابتداء ہی میں رواں اور سلیس اسلوب نگارش میں بھائی چارے کا اخلاقی درس کا انداز ملاحظہ ہو:

> ''فرنگستان میں جتنی نامور قومیں اگلے زمانے میں گذریں اور جو مشہور قومیں اب موجود ہیں ان کی اور ہندوؤں کی نسل کا سلسلہ ایک ہی اصل سے جا ملتا ہے۔ یعنی اہل یونان اور اہل روما اور اہل جرمنی اور انگریز اور فرانسیسی اور ہندو سب ایک ہی قوم کی شاخیں ہیں اور جو فرق ان میں اب پایا جاتا ہے وہ آب و ہوا کے اختلاف اور مختلف ملکوں میں آباد ہونے کا نتیجہ ہے۔ مگر ہندوؤں کو اہل فارس کے ساتھ سب قوموں سے زیادہ مناسبت ہے۔ جن لوگوں نے سنسکرت اور فارس کی قدیم زبان بہت تحقیق کے ساتھ حاصل کی ہے ان کو ہندوؤں اور فارسیوں کے ایک ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ زبان کے علاوہ ان دونوں قوموں کے قدیم مذہب میں بھی بہت مشابہت پائی جاتی ہے اور دونوں کا رنگ ڈھنگ بھی ایک ہی سا ہے اوپر کے بیان سے صاف پایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں اور انگریزوں کا اجتماع ایک خاندان کی مدت کی دو بچھڑی ہوئی شاخوں کا ملاپ ہے اور دونوں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''[۱۹]

''قصص ہند'' (حصہ اول) چونکہ اس زمانے میں نصابی کتب میں شامل تھی اس لیے نہایت آسان زبان اور دلچسپ پیرایہ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ پڑھنے کو تاریخی واقعات نئے نہیں بلکہ وہی پرانے ہیں لیکن طرز بیان ایسا اپنایا گیا ہے جس سے تاریخ جیسا خشک مضمون بھی دلچسپ بن گیا ہے۔ تاریخی واقعات کے ضمن میں حسب موقعہ جذبات نگاری سے بھی کام لیا ہے مثلاً ذیل کا یہ منظر ملاحظہ ہو جس میں کورو کی خوشی اور دروپدی کی آہ و زاری کو بیان کیا جا رہا ہے:

> ''غرض کھیل شروع ہوا اور دنا کے پاسے نے پھر دریودھن ہی کو جتایا کورو خوش ہو ہو کر ناچنے اور بغلیں بجانے لگے اور پانڈو شرمندہ ہو مرگ چھالا پہن بی بی کو ساتھ لے بنوں کو روانہ ہوئے دروپدی بہت روئی اور بال بکھیر کر یہ کہتی چلی کہ آج سے یہ بال یونہی بکھرے رہیں گے اور اس

وقت سیٹے گے کہ جب بھیم اپنے ہاتھ دو ہساسن کے خون سے رنگے گا۔ اور انہی ہاتھوں سے ان کو باندھے گا۔''۱۷۰

پیارے لال آشوب نے جذبات نگاری کے ساتھ جا بجا منظر نگاری کی بھی نہایت عمدہ مثالیں پیش کی ہیں۔ اس زمانے میں جب اردو نثر فروغ پا رہی تھی اس میں محاکاتی اسلوب کے ذریعے جو ایک نیا انداز نظر آتا ہے وہ اردو نثر کا نکھرا ہوا روپ ہے۔ جسے محمد حسین آزاد نے بام عروج پر پہنچایا۔ چنانچہ جذبات و محاکات نگاری کے علاوہ مکالمے بھی نہایت فطری انداز میں اسطرح پیش کیے گئے ہیں کہ ڈرامائیت کا عنصر پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً سکندر اعظم اور فیلقوس کے درمیان یہ مکالمہ ملاحظہ ہو:

''فیلقوس اس کی سرکشی اور بدرکابی دیکھ کر سوداگر پر بہت خفا ہوا۔ اس وقت بے ساختہ سکندر کی زبان سے یہ کلمہ نکلا کہ افسوس! کیا عمدہ گھوڑا بے تمیزی سے کھوئے دیتے ہیں۔ فیلقوس اس کی بات خیال نہ لایا۔ مگر جب بار بار اس کو یہی کہتے سنا تو اس کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ تو بڑوں پر طعن کرتا ہے اور اپنے تئیں ان سے بہتر سمجھتا ہے۔ سکندر نے کہا: بے شک اس گھوڑے کو قابو کرنے کی لیاقت تو ان سے زیادہ رکھتا ہوں۔ فیلقوس نے کہا: کہ اگر تجھ سے اس گھوڑے پر نہ چڑھا گیا تو بتا کیا ہاریگا؟ جواب دیا کہ گھوڑے کی قیمت۔۔۔''۱۷۱

ہر چند کہ ''قصص ہند'' (حصہ اول) کوئی بلند پایہ تاریخی کتاب نہیں ہے کیونکہ اس میں تحقیقی اور مستند حوالے نہیں ہیں بلکہ وہی تاریخی واقعات ہیں جو دیگر تاریخوں میں پائے جاتے ہیں لیکن ماسٹر پیارے لال آشوب کا کمال یہ ہے کہ ان واقعات میں قصے کہانیوں کی سی دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ انہوں نے لاہور کی اردو نثر میں تاریخ نگاری کے حوالے سے اس میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ اس سے قبل تاریخ نویسی پر جو کتابیں۱۷۲ اردو میں لکھی گئیں ان کا اسلوب خالصتاً علمی و تاریخی ہے جبکہ مولانا آزاد کے ساتھ ماسٹر پیارے لال آشوب نے بھی پہلے پہل تاریخ نگاری میں شگفتہ اسلوب اور دلچسپ انداز اختیار کیا۔

تاریخ انگلستان:

ماسٹر پیارے لال آشوب نے ''تاریخ انگلستان کلاں'' کے نام سے انگریزی سے اردو نثری ترجمہ کیا۔ کتاب کے دو حصے ہیں: حصہ اول میں اہل روما کے حملے سے ملکہ الزبتھ کے زمانے تک کے حالات درج ہیں اور یہ حصہ ۴۴۸ صفحات پر مشتمل ہے؛ جبکہ حصہ دوم میں خاندان اسٹولرٹ سے ملکہ وکٹوریہ تک کی سلطنتوں کے حالات

مرقوم ہیں، یہ حصہ ۳۴۴ صفحات کی ضخامت رکھتا ہے۔ ماسٹر پیارے لال آشوب دہلی کالج کے علمی و ادبی ماحول کے پروردہ، انگریزی زبان پر عبور رکھتے تھے۔ لاہور آ کر محکمہ تعلیم سے منسلک ہوئے اور علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔ ماسٹر پیارے لال آشوب جب پنجاب بک ڈپو کے کیوریٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تو اس ملازمت کے دوران کرنل ہالرائیڈ کی زیرنگرانی انگریزی کتب کا اردو ترجمہ کیا۔ انہی میں سے ایک کتاب ''تاریخ انگلستان کلاں'' تھی جو پہلی بار ۱۸۷۲ء میں طبع ہوئی اس کے دستیاب ایڈیشن کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے:

> ''لالہ پیارے لال صاحب کیوریٹر گورنمنٹ سنٹرل بک ڈپو نے انگریزی سے ترجمہ کیا۔ حسب الحکم میجر ہالرائڈ ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب مطبع سرکاری لاہور میں سنہ ۱۸۷۹ء میں چھاپی۔''[۳۷۱]

کتابی صورت سے قبل یہ تاریخ قسط وار ماہوار رسالہ ''اتالیق پنجاب'' میں چھپتی رہی۔[۳۷۲] اس اعتبار سے مارچ ۱۸۷۰ء کا پرچہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جس میں تاریخ انگلستان کا کچھ حصہ درج ہے۔ ''اتالیق پنجاب'' وہ ماہوار رسالہ تھا جو ''سرکاری اخبار'' کی جگہ یکم فروری ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ تاریخی، علمی، معلوماتی مضامین سے مزین یہ رسالہ پیارے لال آشوب ہی کی زیر ادارت شائع ہوتا رہا۔ ''تاریخ انگلستان کلاں'' میں انگریزی تہذیب و تمدن کو پرلطف انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ معلومات کے اس ذخیرہ میں دلچسپی کا عنصر قائم رہتا ہے۔ قصہ کہانی کا طرز انداز اختیار کرتے ہوئے انگلستان کے مذہب، مختلف بادشاہوں کے طرز حکومت اور ان کے عہد سے متعلق دلچسپ معلومات، طبقاتی تقسیم، مختلف تعزیرات نیز عدل و انصاف، حصول علم کے شوق، مشاغل اور مختلف تہواروں کا ذکر کرتے ہوئے انگریزوں کے بہت سے روشن اور تاریک پہلو واضح کیے گئے ہیں۔ پیارے لال آشوب نے یہ ترجمہ رواں، سلیس اور شستہ انداز میں اس طرز سے کیا ہے کہ کہیں بھی گمان نہیں گذرتا کہ یہ ترجمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ دلی کی جیتی جاگتی زبان کو اس میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جس نے لاہور میں اردو نثر کو الفاظ، انداز اور لہجے کے حوالے سے رونق بخشی۔ تاریخی مواد اور زبان و بیان کے حوالے سے اس کتاب کا مقابلہ کسی بھی معیاری تاریخی کتاب سے کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کے موضوع پر مبنی اس کتاب میں علمی اسلوب کا سیدھا سادا مگر دلچسپ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو نثر میں خالص علمی اور تاریخی موضوعات کو ہلکے پھلکے دلچسپ انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ جس کی عملی صورت اس ترجمہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ قدیم زمانے میں انگلستان کے مذہب کی حالت زار کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کلٹ کے پیشوائے وین ڈروئڈ کہلاتے تھے اور جزیرہ مونا جواب آئیکل کے نام سے مشہور ہے ان کا بڑا معبد تھا۔ یہ لوگ درخت "بلوط" کی بہت تعظیم کرتے تھے اور چونکہ اس کو یونانی زبان میں "ڈروس" کہتے ہیں اس سے اس کا نام بھی ڈروئیڈ ہو گیا۔ یہی پیشوا معلم اور واضع قانون اور شاعر بھی تھے۔ نیچے نیچے سفید جامے پہنتے تھے اور لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے تھے اور اسی وضع سے ان میں اور ان کے مقلدوں میں امتیاز ہوتا تھا۔ یہ لوگ تناسخ اور آواگون کے قائل تھے۔ اور خدا کی وحدانیت کی تلقین کرتے تھے مگر سانپ اور آفتاب و ماہتاب اور بلوط کو قابل تعظیم سمجھتے تھے اور زن و مرد کی قربانی کرتے تھے۔ جولئس قیصر نے لکھا ہے کہ یہ لوگ درختوں کی ٹہنیوں کے بڑے بڑے کھانچے سے بنا کر ان میں آدمیوں کو بھر کر آگ لگا دیتے تھے۔ جو لوگ چوری اور کسی علت میں ماخوذ ہوتے تھے ان کی قربانی دیوتاؤں کے زیادہ مقبول سمجھ کر پہلے ان ہی کو جلاتے تھے اور مجرم ہاتھ نہ آتے تھے تو بے گناہوں کو بھی پھونک دیتے تھے۔"۱۷۵

بادشاہ ایلفرڈ سنہ ۸۷۱ء کے زمانہ میں ایمانداری اور دیانت داری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ "اس بادشاہ کا ایسا رعب تھا کہ اس کے وقت میں انگلستان میں یہ مثل مشہور تھی کہ جس کا جی چاہے سونے کا زیور سڑک کے کنارے درختوں پر لٹکا دے چور کی مجال نہیں جو اس کو چھو سکے۔"۱۷۶ اسی طرح اس بادشاہ کے عہد میں وقت معلوم کرنے کے ایک دلچسپ طریقہ کے بارے میں بتایا ہے کہ "اس وقت میں گھڑیاں اور گھنٹے نام کو بھی نہ تھے مگر وقت کے اندازے کے واسطے ایک ایسی شمع روشن رکھتا تھا جو بیس منٹ میں ایک انچ پگھل جاتی تھی۔"۱۷۷ ماسٹر پیارے لال آشوب کی "تاریخ انگلستان" سے معلوم ہوتا ہے کہ ہنری اول کے زمانہ میں طلبہ حصول علم کے لیے انگلستان سے ہسپانیہ جا کر مسلمانوں سے طب اور ریاضی کے علوم سیکھتے تھے جبکہ ہنری ہشتم کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ مغلیہ خاندان کے رنگیلے شاہ جیسا مزاج رکھتا تھا۔ آشوب نے ہندوؤں کے تہوار ہولی کو ان کے بڑے دن کے کھیل کے حوالے سے اس طرح بیان کیا ہے کہ جیسے یہ ان کا ایجاد کردہ ہے۔ یہ مناسبت اس انداز سے بیان کی ہے:

"اس وقت گویا سب کو اجازت تھی کہ جو مسخرا پن چاہیں اور جس طرح کا روپ چاہیں بھریں۔ انگلستان کے کل باشندے بادشاہ سے فقیر تک عجیب عجیب لباس پہن کر اور چہرے لگا کر بہروپئے بن جاتے تھے اور لوگوں کو ہنساتے تھے اور جن لوگوں کو چہرے میسر نہ ہوتے تھے وہ اپنا منہ ہی کالا کر لیتے تھے۔ ہر محلّہ میں ایک "شاہ بدعملی" بنایا جاتا تھا اور یہ حاکم بے فکروں کا لشکر جن کی سبز اور زرد پوشاکوں پر فیتے پڑے رہتے تھے اپنے اپنے ہمراہ لئے ہوئے گلی گلی غل مچاتے اور ڈھول بجاتے پھرتے تھے اور بعض اوقات اسی ہیئت سے گرجا میں نماز کے وقت بھی چلے جاتے تھے یہ لوگ بیشتر بکروں اور ہرنوں اور سانڈوں کے چہرے پہنتے تھے اور اکثر بدن پر کھالیں بھی پہن لیتے تھے تاکہ

پورے حیوان نظر آئیں۔ بڑے بڑے بہروپ ہنری ہشتم کے دربار میں بھرے جاتے تھے۔"۱۷۸

تاریخ نگاری کے موضوع پر مبنی یہ ترجمہ جس انداز سے کیا گیا ہے اس سے گمان گذرتا ہے کہ یہ کتاب بھی طلباء کے نصاب کے لیے لکھی گئی ہوگی جس کا مقصد یہاں کے لوگوں کو انگریزی تاریخ و تہذیب سے روشناس کرانا اور حاکم و محکوم کی اجنبیت کو کم کرنا تھا۔ اس بات کی سند اس حوالے سے بھی ملتی ہے کہ: "پیارے لال آشوب جو دہلی کے نارمل سکول کے پرنسپل ہیں سرکاری طور پر اردو میں انگلستان کی تاریخ لکھ رہے ہیں یہ تاریخ Student Theme کی وضع اور طرز پر ہوگی۔ جسے کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔"۱۷۹ اس بیان سے جہاں یہ پتہ چلتا ہے کہ "تاریخ انگلستان کلاں" طلباء کے نصاب کی تیاری کا ایک حصہ تھی وہیں یہ انکشاف بھی ہوتا ہے کہ ماسٹر پیارے لال آشوب یہ تاریخ اس وقت تحریر کر رہے تھے جب وہ دہلی نارمل سکول میں پرنسپل تھے اور یہ فریضہ وہ ۱۸۶۴ء میں لاہور آنے سے قبل سرانجام دے رہے تھے۔ جبکہ ماسٹر پیارے لال آشوب کا یہ ترجمہ ماہوار رسالہ "اتالیق پنجاب" یکم جنوری ۱۸۷۰ء کے پرچہ سے بالاقساط شائع ہوتا رہا اور پہلی بار کتابی صورت میں ۱۸۷۲ء میں چھپا۔ اس سے مقالہ نگار نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ "تاریخ انگلستان کلاں" چونکہ ایک ضخیم تاریخ ہے اس لیے یہ ممکن ہے کہ وہ لاہور آنے سے پہلے ہی اس کے ترجمہ کا آغاز کر چکے تھے۔ پنجاب بک ڈپو اور لاہور کی علمی وادبی فضا ہی کا اثر تھا کہ تاریخ کی یہ کتاب جلد مکمل ہوکر منظر عام پر آئی اور اردو نثر کو پھلنے پھولنے میں مدد دی۔ ماسٹر درگاہ پرشاد نادؔر نے "تاریخ انگلستان کلاں" پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے پیارے لال آشوب کے بہترین مترجم ہونے پر انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے:

> "تاریخ سلطنت انگلشیہ کی دو جلدیں دیکھو کس رنگ ڈھنگ کی اردو میں تیار ہوئی جس کے مترجم جناب کمالات مآب علوم پناہ فنون دستگاہ ماسٹر پیارے لال صاحب میر مترجم سررشتہ ہذا میں جو عرصہ سے گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب کے کیوریٹر ہو گئے ہیں اور ترجمے کے کام میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔"۱۸۰

مبادی علم جیولوجی:

مولانا الطاف حسین حالؔی نے ۱۸۷۲ء میں قیام لاہور کے دوران ایک عربی کتاب کا اردو ترجمہ "مبادی علم جیولوجی" کے نام سے کیا جو ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں علم جیولوجی کی تعریف وتشریح اور اس علم کے ارتقا کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی بابت حالی لکھتے ہیں:

> "لاہور میں ایک عربی کتاب کا جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی اردو ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب

یونیورسٹی کو دے دیا، چنانچہ ڈاکٹر لائٹر کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شائع کر دیا۔''[۱۸۱]

جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس میں زمین کی تاریخ اور اس کا آغاز، دنیا کا ازلی ہونا یا نہ ہونا جیسے مباحث کا بیان کیا گیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ زمین پر انسانی وجود کچھ بہت مدت سے نہیں ہے اور نہ ہی کوئی چیز کرہ ارض پر ازلی وجود کی حامل ہے۔ نیز مختلف اصحاب کی آراء بھی دی گئی ہیں۔ ترجمہ کرتے ہوئے جس طرح ابواب بندی کی گئی ہے اس کی بابت میں ڈاکٹر عبدالقیوم لکھتے ہیں:

> ''باب اول میں حرارت مرکزی مرتفعات ارض، دوسرے میں طوفان عام کی کیفیت اور اس کے سبب وغیرہ سے بحث کی گئی ہے اور تیسرے میں عملیات کا بیان یعنی نظریات کی بحث ہے اور ہر ایک دور کے طبقات بیان کیے گئے ہیں پھر ہر ایک طبقے کی علامتیں پھر اراضی کے مفید مادے اور ان کے دریافت کرنے کے طریقے لکھے گئے ہیں حتیٰ کہ ان نتائج تک کا بیان ہے جو اس فن کی تحقیقات پر مرتب ہوئے ہیں۔''[۱۸۲]

نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

> ''اس دور کا زمانہ ضرور ہے کہ نہایت طویل ہونا کہ پرت تھوڑا تھوڑا منجمد ہو کر بالکل سخت ہو جائے اور اس طرح داخلی حرارت کا نفوذ اس کے سبب سے بتدریج کم ہوتے ہوئے بالکل مسدود ہو جائے اور وہ وقت آن پہنچے کہ بالکل بخارات متصاعدہ خفت حرارت کے سبب پگھل پگھل کر اور سطح زمین پر مجتمع ہو ہو کر بڑے بڑے یا چھوٹے چھوٹے دریا اور حوض بن جائیں۔''[۱۸۳]

اخلاق باری:[۱۸۴]

شیودیال سنگھ کی تحریر کردہ یہ کتاب اردو میں انگریزی زبان کی مفصل گرائمر ہے۔ پنجابی مورخہ ۲۱ دسمبر ۱۸۷۲ء میں اس کا تعارف کرایا گیا ہے۔

سخندان فارس:

یہ مولانا محمد حسین آزاد کا لسانی مسائل پر متفرق مقالات کا مجموعہ ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد نے ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۴ء میں فارسی زبان و ادب کے موضوع پر لیکچر دیئے اور سخندان فارس وجود میں آئی۔ حصہ اول ۱۸۷۲ء میں طبع ہوا جس میں دو لیکچر ہیں جن میں بہت سی مثالیں دے کر یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی ایک ہی قدیم زبان کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں۔ یوں پہلی بار اردو نثر میں لسانی حوالے سے علمی لیکچروں کا

آغاز بھی محمد حسین آزاد نے کیا۔ یہ لاہور کی اردو نثر میں علم لسانیات پر پہلی باقاعدہ تصنیف ہے جس میں ہند ایرانی تقابلی لسانیات کو لغات اور زبانوں کی فلسفیانہ تحقیقات؛ زبان کی تعریف کرتے ہوئے علم لسانیات کی افادیت اور الفاظ کی سرگذشت و مبادلے؛ حروف تہجی کی مختصر تاریخ اور ان کی صوتی تبدیلیوں اور مخارج پر بحث کرتے ہوئے بتایا ہے کہ زبان ایک جیتی جاگتی متحرک شے ہے۔ جو قدرتی طور پر نشوونما اور تغیر و تبدل کی منزلوں سے گزرتی ہے۔ الفاظ اور ان کے تلفظ اور مفاہیم میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات کچھ الفاظ مر بھی جاتے ہیں۔ آزاد کے خیال میں زبان کو تقویت ان عناصر سے ملتی ہے کہ زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے۔ (۱) قوم کا ملکی استقلال (۲) سلطنت کا اقبال (۳) اس کا مذہب (۴) تعلیم و تہذیب''۱۸۵ محمد حسین آزاد نے اردو نثر میں لسانی مباحث کو نئے خیالات اور موضوع کے ساتھ ادا کرنے کی صلاحیت تفویض کی۔ تقابلی لسانیات اور الفاظ کی تحقیق کی جانب توجہ مبذول کروائی۔ لاہور میں اُردو نثر میں علم لسانیات کے آغاز کا سہرا بھی مولانا محمد حسین آزاد کے سر جاتا ہے۔

''سخندان فارس'' کے دوسرے حصے کی اشاعت ۱۹۷۰ء میں آغا محمد ابراہیم کے اہتمام سے ہوئی۔ اگرچہ مولانا آزاد نے یہ لیکچر ۱۸۷۴ء میں دیئے تھے لیکن بوجوہ چھپ نہ سکے لیکن مولانا آزاد کے سوانح نگار بتاتے ہیں کہ ۱۸۸۷ء میں مولانا آزاد نے اس مجموعہ کی نظر ثانی کی تھی ۔ سخندان فارس حصہ دوم مندرجہ ذیل گیارہ لیکچروں پر مشتمل ہے۔

۱۔ فارس قدیم کی تاریخ
۲۔ ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات
۳۔ زبان فارس نے اسلام کے بعد کیا کیا رنگ بدلے
۴۔ فارس کی زبان مروجہ میں دوسرا انقلاب
۵۔ قدمائے فارس کے اصول شرعی اور رسوم عرضی
۶۔ اسلام کے بعد اہل ایران کے آداب و رسوم اور رہنے سہنے کے طریق
۷۔ ہر ایک سرزمین اور اس کے موسموں کی بہار انشاء پردازی پر کیا اثر کرتی ہے۔
۸۔ زبان فارسی کا اندازہ اور زبانوں کے انداز سے کیا نسبت رکھتا ہے۔
۹۔ زبان عربی سے مل کر زبان فارسی نے کیا رنگ بدلے۔
۱۰۔ فارسی پر ہندوستان میں آ کر کیا کیا رنگ چڑھے۔

۱۱۔ نظم فارسی کی تاریخ

مذکورہ متفرق موضوعات میں ملک ایران کی آب و ہوا اور تہذیب و معاشرت نے وہاں کی شاعری اور نثر پر جو اثرات ڈالے ہیں ان کی تفصیلات کا احاطہ مثالوں کے ساتھ ان لیکچروں میں کیا گیا ہے۔ ان تمام میں ایک بنیادی نقطہ یہ نظر آتا ہے کہ تہذیب کے دیگر شعبوں کی طرح زبان پر بھی قدرتی اور معاشرتی ماحول کا اثر پڑتا ہے۔ جس سے یہ نظریہ بطور نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان ادب کی اصل روح کو کامل طور پر اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اس کے پس منظر میں موجود قدرتی اور معاشرتی ماحول سے پوری طرح واقفیت حاصل نہیں کر لیتا۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

''کسی زبان کی نکتہ فہمی کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ اور ملکی حالات اور اہل ملک کے عادات و اطوار سے بخوبی واقفیت نہ ہو۔۔۔ وہ جن استعاروں اور تشبیہوں سے مرصع ہے ان کی بنیاد ضرور کسی نہ کسی خصوصیت ملکی پر ہے جس میں ملک کی حالت، سرزمین کی صورت، لوگوں کی ریت و رسوم، رہنے سہنے کے دستور، ملاپ جلاپ کے طریقے، طرز لباس، نشست و برخاست کے قاعدے وغیرہ وغیرہ سب کو دخل ہے اور انہی کی بنیاد پر وہ نمکین محاورے اور رنگین استعارے، چبھتے ہوئے اشارے، کھٹکتے ہوئے کنائے قرار پاتے ہیں جو ان کی انشاء پردازی کو اور زبانوں کی فصاحت سے الگ جلوہ دے کر روشن اور ممتاز دکھاتے ہیں۔''[۱۸۶]

مزید کہتے ہیں:

''غور کرو تو کسی قوم کی تحقیقی حالت اور حقیقی لیاقت اور طبیعت کی اصلیت ہمیں نہیں معلوم ہوتی اور تاریخ بھی ہمارے پر تصدیق اور یقینی نقش نہیں کرتی۔ ہاں جو باتیں خود ان کے منہ سے نکلی ہیں اور کتابوں میں لکھی گئی ہیں اگر وہ ہاتھ آجائیں تو ان کے سارے کاروبار اور حالات و خیالات گویا اقراری تصدیق کو پہنچ جاتے ہیں۔''[۱۸۷]

''سخندان فارس'' کے اس عالمانہ اور محققانہ انداز نے اردو نثر کو موضوع کی وسعت سے ہمکنار کرتے ہوئے نظری تنقید کے ساتھ پہلی بار عملی تنقید سے بھی متصف کیا۔ لہٰذا سخندان فارس کو اردو نثر میں باقاعدہ عملی تنقید کا بھی نقش اول قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس ضمن میں ''اعجاز خسروی'' پر عملی تنقید کا نمونہ ملاحظہ ہو:

''۶۸۸ صفحے کی موٹی کتاب ہے مگر اول سے آخر تک ابہام، مراعات النظیر، تضاد وغیرہ وغیرہ، صنائع بدائع میں لغت بازی اور حجت بازی کا مینہ برس رہا ہے۔ اس دھواں دھار میں تاریخی آگاہی، اخلاقی تاثیر، علمی مسائل، مذہبی ہدایت کچھ نظر نہیں آتی لفظوں ہی لفظوں میں ساری دنیا

تمام ہے۔"۱۸۸؎

اسی طرح سہ نثر ظہوری پر تنقیدی رائے ملاحظہ ہو:

"اس صدی میں انشاء پردازی کے عالم میں بہت سے مخلوق پیدا ہوئے جو عجیب الخلقت ہیں یعنی چند کتابیں لکھی گئیں کہ علمی، تاریخی کوئی مطلب کتابی ان میں نہیں پھر بھی کتابیں ہیں۔ ایک ان میں سے سہ نثر ظہوری ہے۔"۱۸۹؎

اگرچہ مولانا محمد حسین آزاد نے سخندان فارس میں قدیم و جدید ایرانی ثقافت و معاشرت کو چشم دید قرار دیا ہے لیکن وہ ۱۸۷۲ء تا ۱۸۷۴ء سے پیشتر ایران گئے ہی نہ تھے۔ البتہ ۱۸۶۵ء میں پنڈت من پھول، منشی فیض بخش پشاوری اور کرم چند نند رام کے ہمراہ خفیہ سیاسی مشن پر وسط ایشیاء کی سیاحت پر گئے اور ۱۸۶۷ء فروری کے آخر یا مارچ کے اوائل میں لاہور واپس آ گئے۔ چونکہ حکومت ہند کی جانب سے اس سیاحت کو صیغہ راز میں رکھنا تھا اس لیے واپسی پر مولانا آزاد نے ظاہر کیا کہ وہ ایران تشریف لے گئے تھے۔ اس بات کے پیش نظر ڈاکٹر محمد صادق کا استدلال بے حد وقیع ہے کہ سخندان فارس میں وسط ایشیاء کی سیاحت کے مشاہدات کو ایران سے منسوب کر دیا ہے۔ مولانا آزاد کی اس غلطی کی نشاندہی سخندان فارس سے ہی کرتے ہیں:

"ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اسی ملک میں تھا برفیں پڑ رہی تھیں دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا۔ دریائے جیحوں رستے میں ملا اس پار سے اس پار تک ایک تختہ آئینے کا تھا۔ شتری اور اپنی قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے۔"

کہاں ایران اور کہاں جیحوں جو ایران سے کالے کوسوں دور خجند اور کوکان کے شمال سے ہوتا ہوا بحر ارال میں گرتا ہے۔"۱۹۰؎

ڈاکٹر محمد صادق اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے جو نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں، وہ صائب اور درست ہے:

"آزاد سے تقریباً اسی سال پہلے انگلستان کے سفیر مقیم ایران مالکم نے تاریخ ایران پر دو ضخیم جلدوں میں ایک نہایت خیال افروز اور پُر از معلومات تصنیف مرتب کی تھی۔ سخندان فارس کی ترتیب و تدوین کے وقت یہ تاریخ آزاد کے پیش نظر تھی اور ایران کے بارے میں ان کے بہت سے اہم بیانات اسی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ "سخندان فارس" میں عام طور پران کا ترجمہ کر دیا گیا ہے۔ صرف ایک دو جگہ ان مطالب کو اپنی زبان میں پیش کیا گیا ہے ان انکشافات کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہر وہ اطلاع جو مالکم کی کتاب میں درج نہیں براہ راست وسط ایشیاء سے متعلق ہے اور ہر وہ اطلاع جو وسط ایشیاء سے متعلق نہیں مالکم کی کتاب سے لی گئی ہے۔"۱۹۱؎

مقالہ نگار کے خیال میں ایسا ہونا اس لیے بھی بعید از قیاس نہیں کیونکہ مولانا محمد حسین آزاد دیگر زبانوں سے خیالات کو اخذ و ترجمہ کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ''نیرنگ خیال'' کی مثال بھی ہمارے سامنے ہے۔ لیکن اس کے باوجود سخندان فارس کی اہمیت محض اس لیے کم نہیں ہو جاتی کہ اخذ و ترجمہ ہے بلکہ انیسویں صدی کے نصف دوم کے اس دور میں جب لاہور میں اردو نثر اپنے ارتقائی مرحلے میں تھی مولانا محمد حسین آزاد نے ''سخندان فارس'' کے موضوع اور انداز نقد سے اسے تقویت اور ترقی دی۔

نگارستان فارس:

ایران اور ہندوستان کے فارسی شعراء رودکی سے لے کر واقف بٹالوی تک کا تذکرہ ہے جس میں ان کے حالات زندگی اور کلام کے نمونے درج ہیں۔ ڈاکٹر اسلم فرخی بتاتے ہیں کہ آغا محمد طاہر کے مطابق یہ کتاب ''آب حیات'' کے ساتھ ساتھ لکھی گئی تھی اور اس کا زمانہ تصنیف ۱۸۷۲ء سے پہلے کا ہے۔ لیکن اس دور میں شائع ہو کر منظر عام پر نہ آ سکی۔ ۱۹۲۲ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ چونکہ ''نگارستان فارس'' انیسویں صدی کے نصف دوم کی نثر سے تعلق رکھتی ہے اس لیے اس عہد میں اس کی اہمیت ضرور بنتی ہے۔ جس میں فارسی شعرا کے تذکرہ کو ادبی تاریخ کا رنگ دینے کی کوشش کی ہے۔

مقالہ نگار کا استدلال ہے کہ تذکرہ اور تاریخ کے حوالے سے آزاد کی تمام تر صلاحیتیں چونکہ ''آب حیات'' پر مرکوز تھیں اس لیے ممکن ہے کہ اس تذکرہ پر توجہ نہ دے سکے۔ پھر اس تصنیف کا محرک نصابی بھی ہوسکتا ہے جس کا تذکرہ آزاد نے اپنے ایک خط میں کیا ہے:

> ''مجھے ایک اور مشکل پیش آئی۔ صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج نے مجھے فرمایا کہ آب حیات اور نیرنگ خیال کو ہم نے اپنے کالج اور نارمل اسکولوں کی پڑھائی میں بھی داخل کر دیا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ جس طرح اس میں تاریخ زبان اردو کی آپ نے لکھی ہے ایسی ہی تاریخ اور تحقیق زبان فارسی کی ہو کہ اسے فارسی کے کورس میں داخل کر دیں۔''[۱۹۲]

مخزن حکمت:

مفتی غلام سرور لاہوری کہ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ زمانہ سلف کے حکماء کے مختصر سوانح اور ان کے اقوال پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ ظہور اسلام کے بعد کے حکماء اور ان کے اقوال پر مشتمل ہے جبکہ تیسرے حصہ میں بعض بادشاہوں کے حالات اور ان کے اقوال کی صورت میں حکایات اور پند و نصائح درج کیے گئے ہیں جو طلبہ کے لیے بہت مفید ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۷۳ء میں طبع ہوئی۔

طب رحیم:

۱۸۷۳ء میں ڈاکٹر رحیم خان نے اردو نثر میں طب کے موضوع پر یہ کتاب لکھی۱۹۳؎ جو لاہور کے میڈیکل کالج میں داخلِ نصاب ہوئی۔ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں علم طب پر سائنٹفک بحث کی گئی ہے جبکہ دوسرے حصے میں بیماریوں کے اسباب و علامات اور ان کا علاج بیان کیا گیا ہے جو انگلستان میں کیا جاتا ہے۔ نیز اس کتاب پر اخبار پنجابی نے اپنی ۱۷ جنوری ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں تبصرہ بھی شائع کیا۔

نیرنگ خیال:

لاہور میں لکھی جانے والی تمثیلی نثر ''جوہر عقل'' اور ''خط تقدیر'' نے دیگر مصنفین کو بھی تمثیل نگاری کی طرف متوجہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۶۴ء میں جب میجر فلر ناظم تعلیمات پنجاب کی سرپرستی میں درسی کتب کی تیاری کے سلسلہ میں پنجاب میں ایک کمیشن کا قیام عمل میں آیا تو ناظم تعلیمات نے مولانا محمد حسین آزاد کی توجہ اس جانب مبذول کروائی تو انہوں نے بھی تمثیلی قصے ''نیرنگ خیال'' کے نام سے ۱۸۷۴ء کے لگ بھگ تصنیف کیے۔ جو دو حصوں پر مشتمل ہیں۔ پہلا حصہ ۱۸۸۰ء میں چھپا۔ جس میں دیباچہ ''ایک ابتدائیہ اور آٹھ مضامین شامل ہیں جبکہ حصہ دوم۱۹۴؎ میں پانچ مضامین ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق کے بقول ''مولوی خلیل الرحمٰن کے مطابق اس کے حصہ اول کے مضامین انجمن پنجاب کی نشستوں پڑھے گئے۱۹۵؎ جو مضامین انجمن میں پڑھے جاتے تھے وہ ''رسالہ'' انجمن مفید عام، قصور میں چھپتے تھے۔ اس حوالے سے رسالہ انجمن مفید عام قصور کے مئی ۱۸۷۵ء، جولائی ۱۸۷۶ء اور جون ۱۸۷۷ء کے شمارے دیکھے جا سکتے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ ''نیرنگ خیال'' کے مضامین ''انجمن پنجاب'' میں پڑھے گئے۔ ''نیرنگ خیال'' بطور نصاب امتحان، یونیورسٹی میں داخل رہی۔ نیرنگ خیال جس کی حیثیت قصہ سے زیادہ مضامین کی ہے۔ اس کے حصہ اول و دوم کے مضامین میں ''آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا؟''، ''سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ''، ''گلشن امید کی بہار''، ''سیر زندگی''، ''انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا''، ''علوم کی بدنصیبی''، ''علمیت اور ذکاوت کے مقابلے''، ''جنت الحمقا'' ''خوش طبعی''، ''نکتہ چینی''، ''مرقع خوش بیانی''، ''سیر عدم'' اور ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار'' شامل ہیں۔ ان مضامین میں انسانی خصائل کو مشخص کیا گیا ہے۔ تمام مضامین رمزیہ اور تمثیلی انداز میں لکھے گئے ہیں جو اخلاق کی کسی نہ کسی قدر کو پیش کرتے ہیں۔ تقریباً ہر مضمون میں قصہ پن موجود ہے جس سے افسانوی رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ مثلاً ''سیر زندگی'' کا آغاز اس طرح سے کرتے ہیں۔

''ایک حکیم کا قول ہے کہ ''زندگی ایک عطیہ ہے'' اور اس عالم میں جو رنگا رنگ کی حالتیں ہم پر گذرتی

> ہیں یہی اس کے تماشے ہیں۔لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے۔اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے۔"۱۹۶

ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق یہی وجہ ہے کہ بعض نقادوں نے نیرنگ خیال کے مضامین کو اردو افسانے کا نقطہ آغاز قرار دیا ہے اور چونکہ "نیرنگ خیال" میں مولانا آزاد کی قصہ گوئی اپنے عروج پر ہے اس بناء پر انہیں اردو کا اولین افسانہ نگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ ضرور کہ مولانا آزاد کے ذہن میں قصے کہانیوں کے حوالے سے دور جدید کا مخصوص رجحان حقیقت پسند افادی ادب زیادہ واضح ہو گیا تھا۔جس کا ثبوت "نیرنگ خیال" کے دیباچہ کے اس اقتباس سے بھی ملتا ہے:

> "حق تو یہ ہے کہ مجھ نا قابل کو ایسے موقع پر قلم اٹھانا ان مضامین کو ذبح کرنا ہے لیکن اب وہ زمانہ بھی نہیں ہے کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں۔ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں یا پریاں اڑائیں، دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔اب کچھ اور وقت ہے اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے۔علوم وفنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی چاہیں جو صاف شفاف تصویریں رسوم واخلاق کی ہماری بزم کلام میں سجائیں ان سے جو ہمارے داغ دھبے ہیں سب نظر آئیں۔"۱۹۷

مقالہ نگار کا استدلال یہ ہے کہ داستانوی انداز لیے ہوئے ایسے مضامین ہیں جن میں انشائیہ کی جھلک بھی نمایاں ہے پھر مولانا آزاد اس سے قبل پیارے لال آشوب کے ہمراہ افسانوی طرز کی کہانی کا آغاز کر چکے تھے۔۱۹۸ سچ اور جھوٹ، امید اور زندگی، علوم اور شہرت وغیرہ کے موضوعات پر لکھے گئے ان مضامین میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو زندہ اور متحرک کردار کی صورت میں پیش کرتے ہوئے ان کے معاملات ترقی وتنزلی کو احوال وسرگذشت کے طور پر بیان کیا ہے۔اس سرگذشت میں ربط وتسلسل، منطقی استدلال، حقیقت پسندی کے ساتھ ساتھ کردار نگاری کا فنی شعور بھی موجود ہے جس نے افسانوی رنگ پیدا کر دیا ہے۔

جہاں بانو بیگم نقوی "تاریخ ادب اردو" کے حوالے سے اپنا خیال ظاہر کرتی ہیں کہ اس تصنیف کی "ترغیب ڈاکٹر لائٹنر نے دلائی تھی۔"۱۹۹ شیخ عبدالقادر بھی یہی بات کہتے ہوئے "نیرنگ خیال" کو ٹھیٹھ یونانی نمونے پر سب سے پہلی تمثیل قرار دیتے ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر محمد صادق اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق جانسن، ایڈیسن اور اسٹیل کے انگریزی مضامین سے اخذ وترجمہ کا نتیجہ ہیں۔۲۰۰ جو درست بھی ہے کیونکہ یہ مضامین ایڈیسن کے نیم افسانوی انداز اور جانسن کے بلند آہنگ اسلوب بیان کا کامیاب امتزاج ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے سب سے پہلے انگریزی

تمثیلی انشائیوں اور ان کے مآخذ کو مدمقابل پیش کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام مضامین انگریزی سے ترجمہ کیے گئے ہیں۔[۱] ”نیرنگ خیال“ میں خود مولانا آزاد کا یہ اعتراف اس پر مہر ثبت کرتا ہے کہ ”میں نے انگریزی انشا پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ شوق روشن کیا ہے۔“[۲] مزید یہ کہا کہ ”زبان انگریزی بھی مضامین عاشقانہ، قصہ و افسانہ اور مضامین خیالی سے مالامال ہے مگر کچھ اور ڈھنگ سے اس کا اصل اصول یہ ہے کہ جو سرگذشت بیان کرے اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے اور نشتر اس کا دل پر کھٹکے۔“[۳] یہی وہ جوہر ہے جو مولانا آزاد کی ہر تصنیف میں موجود ہے۔ مولانا آزاد کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ترجمہ کو تخلیق کا درجہ دے دیا ہے۔ جو ”نیرنگ خیال“ کی بہت بڑی خوبی ہے۔ مولانا آزاد کی ترجمہ نگاری کے فن پر قدرت اور دسترس ہی کی بناء پر مولوی محمد خلیل الرحمٰن جیسے صاحب علم نے یہ کہہ دیا کہ نیرنگ خیال آزاد کی اوریجنل تصنیف ہے اور وہ اپنی ذہانت کی بناء پر ایسے ایسے نیرنگ خیال دسیوں لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔[۴] جو مولانا آزاد کی فنکارانہ چابکدستی کی ایک دلیل بھی ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق کی مرہون منت آج یہ امر طے شدہ ہے کہ ”نیرنگ خیال“ انگریزی سے تراجم کا نتیجہ ہیں۔ جس کا اولین اشارہ ۱۸۸۰ء میں مولانا حالی نے ”نیرنگ خیال“ پر تبصرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں دیا تھا:

> ”اب تک اکثر علوم کی کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں طبیعات، کیمسٹری، طلب، فلسفہ، منطق اور ریاضی کی تمام فروعات، ہیئت وحرکت وسکون وغیرہ بہ قدر ضرورت ہماری زبان میں موجود ہیں۔ بہت ضروری تاریخیں اور کچھ ناول بھی ترجمہ ہوئے۔ جغرافیے بھی لکھے گئے۔ مگر مغربی شاعرانہ خیالات کی جھلک آج تک ہندوستانیوں نے نہیں دیکھی تھی، ”نیرنگ خیال“ پہلی کتاب ہے جس نے اس سربستہ قفل کو کھولا ہے۔“[۵]

جہاں ”نیرنگ خیال“ کے ذریعے اردو نثر مغربی خیالات سے روشناس ہوئی وہیں تمثیل نگاری کے ساتھ انشائیہ کی صنف کی جھلک بھی اپنی خام صورت میں وجود میں آئی اور مولانا محمد حسین آزاد نے ترجمہ کے ذریعے اسے اردو نثر میں متعارف کرایا۔ بالفاظ دیگر انہوں نے تمثیل کو انشائیہ کی صنف میں بیان کیا۔ انشائیہ کے عناصر میں کردار نگاری، تخیل کی بلند پروازی، طنز وظرافت، اور شگفتہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ انشائیہ پرداز کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ انشائیہ میں ذاتی عنصر کو داخل کر کے اپنی لطافت بیان سے شخصیت کے آئینے میں زمانے اور حیات و کائنات کی جھلکیاں دکھانے میں کامیاب رہے۔ انشائیہ میں ٹھوس عالمانہ مضامین کی گنجائش نہیں کیونکہ اس کے لیے لطافت اولین شرط ہوتی ہے۔ انشائیہ نگار عالم یا فلسفی کی حیثیت سے اپنے خیالات پیش نہیں کرتا بلکہ پند ونصیحت،

درس و اخلاق اور فلسفہ کی گہرائی کو سبک بنانے کے لیے لطائف، طنز و مزاح اور لطافت زبان کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقیر سے حقیر شے کی اہمیت اور حسن کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہتا ہے۔ اس میں انسانی عقل و فراست سے زیادہ جذبات سے تخاطب ہوتا ہے جو قاری کے لیے خاص روحانی مسرت کا باعث بنتا ہے۔ مولانا آزاد کے مضامین کا مطالعہ مذکورہ معیار پر پورا اترتا ہے۔ لہذا ''نیرنگ خیال'' کے مضامین تمثیل نگاری، داستانوی انداز اور انشائیہ نگاری کا خوبصورت امتزاج قرار پاتے ہیں۔ نیز تمثیلی انداز میں لکھے گئے انشائیہ طرز کے ان مضامین میں ڈرامائی عناصر کی کارفرمائی بھی دیکھی جا سکتی۔ اس ضمن میں مولانا الطاف حسین حالی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ''آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذبات انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں اور خصائل انسانی کے فطری خواص ایسے مؤثر اور دلکش پیرائے میں بیان کیے جس سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔''[۱۰۶]

غرض ''نیرنگ خیال'' کی تمثیل نگاری بہت سے اثرات کا نتیجہ ہے۔ جس میں ''خط تقدیر'' از مولوی کریم الدین، ''جوہر عقل'' از عزیز الدین، مشہور انگریزی کتاب پلگرامس پروگرس[۱۰۷]، ایڈیسن، جانسن، اسٹیل، اسپنسر اور یونان کے خیالی قصے وغیرہ شامل ہیں۔ اس حوالے سے خود مولانا آزاد کا بیان دیکھیں تو وہ مبہم انداز میں لکھتے ہیں کہ ''یہ چند مضمون جو لکھے ہیں نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں ہاں جو کچھ کانوں سے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا ہاتھوں سے اسے لکھ دیا۔''[۱۰۸] اس بیان سے دو باتیں پتہ چلتی ہیں۔ اول یہ کہ ترجمہ دوسروں کی زبانی سنا اور دوم اس ترجمے کو اپنے پیرایہ بیان میں ڈھال لیا۔ اب یہ ترجمے انہوں نے کسی کی زبانی سنے اس بارے میں حتمی کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد انگریزی زبان سے اچھی طرح واقف تھے۔ گورنمنٹ کالج کی تاریخ کے اس جملے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ''پروفیسر صاحب (آزاد) کو یہ بھی شوق تھا کہ وہ اپنے انگریزی جاننے والے تلامذہ سے کارآمد مغربی خیالات اخذ کرتے اور انہیں اپنے سرور آگیں اور پرکیف طرز میں ڈھال لیتے۔''[۱۰۹]

پنڈت شیونرائن آربی کے کہے ہوئے یہ جملے بھی مزید متشرع کرتے ہیں کہ مولانا آزاد کو انگریزی زبان پر کس قدر دسترس تھی کہ ''پروفیسر صاحب کو اپنے انگریزی جاننے والے شاگردوں سے مغربی نظریات مستعار لینے کا اور بعد ازاں اپنے دلکش اور خوش مزاج الفاظ میں ڈھالنے کا بڑا شوق تھا اور ایسا کرنے میں وہ بلاشبہ اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔''[۱۱۰] اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نیرنگ خیال کے تمام مضامین انگریزی سے اخذ و ترجمہ کا نتیجہ ہیں اور مطالب کو ایک زبان سے دوسری زبان میں حیرت انگیز طور پر منتقل کیا گیا ہے۔[۱۱۱] لہٰذا ہم اسی نتیجے پر

پہنچتے ہیں کہ لاہور میں اُردو نثر میں انگریزی ادب کے خیالات کو پہلے پہل مولانا آزاد ہی نے اپنی ان تحریروں میں سمویا اور اُردو نثر کے دامن کو وسعت دی مولانا الطاف حسین حالی بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ" مغربی خیالات کی جھلک تک نیرنگ خیال سے قبل نظر نہیں آتی اور یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں علم انشاء کی ترقی اور ایک نیا راستہ نکلا ہے"[۱۴۲] مولانا آزاد نے مغربی خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے یہ پیغام دیا کہ اہل قلم اُردو زبان کے علاوہ مغربی زبان کے خزانوں کو بھی تصرف میں لائیں۔ جو خود مولانا آزاد کے انگریزی زبان پر عبور رکھنے کی ایک دلیل ہے۔ چنانچہ "نیرنگ خیال" کے دیباچے میں زمانہ اور اہل زمانہ کو جس قسم کے ادب کی ضرورت ہے اور جو انقلاب وقت کا تقاضا بھی ہے۔ ان کے اس تنقیدی شعور کی جھلک اس کتاب میں نمایاں ہے۔ نیز ان مضامین کے ذریعے مغرب کی پیروی اور نئے نظریوں کی ترویج و اشاعت کی گئی ہے۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> "تماشا گاہِ عالم میں جو اہل نظر ایک نگاہ سے میدانِ ماضی اور ایک سے حال و استقبال کی سیر دیکھ رہے ہیں انھیں صاف نظر آرہا ہے کہ ملک عنقریب آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا چاہتا ہے۔ نئے نئے علوم ہیں نئے نئے فنون ہیں سب کے حال نئے ہیں دل دل کے خیال نئے ہیں عماریں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں۔ رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں اس طلمات کو دیکھ کر عقل رسا حیران ہے مگر اسی عالم حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے سوِلزیشن (تہذیب) کی سواری شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانے کو جھاڑ بُہار رہا ہے اور جس حال میں ہے اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے ـــ زبان اُردو کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے جنہوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے۔ یہ مفلس زبان علمی الفاظ میں تو اس لیے تہی رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی افسوس یہ ہے کہ عام مطالب کو ادا کرنے میں بھی مفلس ہے ـــ جو کچھ ہے وہ اتنا ہے کہ فارسی کے پروں سے اڑی، لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی۔ اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور ہے۔ مضامین عاشقانہ، گلگشت مستانہ، نصیبوں کا رونا، امید موہوم پر خوش ہونا۔ امراء کی ثناء خوانی، جس پر خفا ہوئے اس کی خاک اڑائی البتہ ان رنگوں میں اس نے لطافت اور نازک خیالی کو اس درجے تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا۔ اس قسم کے الفاظ و مطالب کا عمدہ ذخیرہ اس کے پاس ہے۔ فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں جن کے خیالات باریکی اور نازکی، عبارت میں جگنو سے اڑتے نظر آتے ہیں لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں۔ ایسی ماں کا دودھ پی کر اُردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا؟"[۱۴۳]

الغرض تمام مضامین میں زندگی کے مختلف رنگ اور انگ موجود ہیں۔ بیشتر مضامین میں خوابوں اور رویا کا انداز اختیار کرتے ہوئے حق و باطل کی کشمکش کو بیان کیا ہے جو انسان اور طلسماتی ہستیوں کے بہروپ میں نظر آتے ہیں۔ لیکن ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار''۲۱۴ ایک دوسرا ہی رنگ لیے ہوئے ہے جزئیات کے ساتھ منظر نگاری کی گئی ہے جسے تشبیہات و استعارات سے مزین کیا ہے مثلاً شاہان مغلیہ، سعدی اور ابو الفضل کے ساتھ ساتھ ہندوستانی باکمال شعراء کا تذکرہ اس مضمون کا نچوڑ ہے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

> ''تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا ان لوگوں میں بھی کوئی بھی مرقع بغل میں دبائے تھا کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا انہیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کرکے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ ہندوستانی شاعر تھے چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص جو بات کرتا ہے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے کوئی نہ کوئی اٹھا لیتا تھا۔ وہ مرزا رفیع سودا تھے۔ میر بدماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحربیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ انشاء اللہ خان قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم ذی وقار متقی و پرہیز گار، دم میں ڈاڑھ چٹ بنگ کا سونٹا کندھے پر۔ جرأت کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر جب وہ میٹھی آواز سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل جاتے تھے۔ ناسخ کی گلکاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری کی اس عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش بیانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے جرأت کی طرف دیکھتے جاتے تھے --- ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انہوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر ملک الشعراء کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیئے کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔''۲۱۵

لاہور میں اردو نثر کا یہ وہ نمونہ ہے جب اردو زبان ادبی سطح پر ابھی ابتدائی حالت میں تھی۔ مولانا آزاد نے اسے ترقی دی اور نئے نئے الفاظ، تراکیب، محاورات اور پرانے الفاظ کو نئی معنویت کے ساتھ اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے نیا اور اچھوتا اسلوب بیان دے کر مشکل خیالات اور غیر مانوس کیفیات کو کمال خوش اسلوبی اور روانی سے ادا کرتے ہیں کہ اس عہد میں اردو زبان کی کم مائیگی کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ نتیجتاً ''نیرنگ خیال''

میں مولانا آزاد نے بطور ایک کامیاب مترجم کے اردو زبان میں اظہار بیان کے نئے سانچے کو متعارف کرواتے ہوئے زبان کو نہ صرف وسعت دی بلکہ نئے نئے امکانات اور تقاضوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔

مجالس النساء:

اصلاح کے نظریہ سے تعلیم نسواں کے موضوع پر مولانا الطاف حسین حالی کا تحریر کردہ ایک قصہ ہے جو انہوں نے قیام لاہور۲۱۶ کے دوران ۱۸۷۴ء میں تصنیف کیا اور مطبع محمدی لاہور سے شائع ہوا۔۲۱۷ مقالہ نگار کے پیش نظر اس کی تیسری اشاعت ہے جس کے سرورق کی عبارت درج ذیل ہے:

مجالس النساء

حصہ اول

جسکو مولوی الطاف حسین حالی مدرس

مدرسہ انگلو عربی دہلی نے عورتوں کی تعلیم

کے لیے تصنیف کیا

سررشتہ تعلیم پنجاب کے ڈائرکٹر جناب

لفٹنٹ کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر کے

حکم سے

لاہور کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال

کیوریٹر کے اہتمام سے چھاپا گیا

۱۸۸۱ء

اس سررشتے کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے

دفعہ ۳ تعداد جلد ۷۰۰ قیمت ۶/۴ روپے

یہ ایک اصلاحی قصہ ہے جس میں "مراۃ العروس" کی طرح کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ جس میں کہانی تعلیم نسواں اور ان کی اخلاقی و معاشرتی تربیت خصوصاً خانہ داری کے باب میں تحریر کی گئی ہے۔ اسی بناء پر مجالس النساء ایک عرصہ تک اودھ اور پنجاب کے مدارس نسواں میں نصاب کے طور پر رائج رہی۔ کتاب کی پسندیدگی کے حوالے سے ۱۸۷۵ء میں حکومت کی جانب سے لارڈ نارتھ بروک کے ہاتھ سے چار سو روپے (ایک ہزار فرانک) کا انعام بھی ملا۔۲۱۸ کتاب کا لکھنا اور انعام کا ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ انگریز حکام کے نزدیک لاہور میں تعلیمی مقاصد

کے لیے مولانا الطاف حسین حالی مستند حیثیت رکھتے تھے۔اس بات کی تصدیق ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے بھی ''حالی کا ذہنی ارتقا'' میں ''مکاتیب حالی'' کے اس خط کے حوالے سے کر دی ہے جس میں ڈائریکٹر تعلیمات کے خط کے جواب میں حالی نے مڈل سکولوں کے فارسی نصاب پر بحث کی ہے۔

تعلیم الاطفال کی ضرورت و اہمیت کے پیش نظر لکھی جانے والی اس کہانی کو ناول کی صورت میں تحریر کیا گیا ہے۔ جو دو حصوں اور نو مجلسوں یعنی ابواب پر مشتمل ہے اور ہر مجلس اپنی جگہ مکمل ہے۔ قصہ کو ابواب بندی میں منقسم کر کے بات مکمل کرنے کا رجحان ''خط تقدیر'' کے بعد ''مجالس النساء'' میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ پہلے حصہ میں عورتوں سے متعلق جبکہ دوسرے حصہ میں مردوں سے متعلق، تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی مسائل کی بابت تمام اچھی اور مفید باتوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ ''مجالس النساء'' میں مولانا الطاف حسین حالی نے اس زمانے کے علوم اور کتابوں مثلاً گلستان و بوستان، اخلاق محسنی، عیار دانش، تحریر اقلیدس، کلیلہ و دمنہ، جغرافیہ، تاریخ، نسخ و نستعلیق وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قصہ کے پلاٹ میں کہانی کی بنت ابتداء ہی سے نہایت فطری انداز میں ہوتی ہے۔ جس میں بوڑھی جہاندیدہ خاتون آتو جی، زبیدہ اور عباس کی کہانی بڑے سادہ اور دلاویز انداز میں اس طرح بیان کرتی ہیں کہ بغیر الجھے قصہ جزئیات اور اپنی پوری روانی کے ساتھ بتدریج آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جس میں کہانی در کہانی یعنی داستانوی انداز کی خوبی سے کام لیا گیا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر چار بڑے کردار ہیں جن میں آتو جی، محمودہ بیگم، اس کی ماں اور مریم زمانی شامل ہیں۔ پہلی مجلس میں علم کی اہمیت و افادیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دوسری مجلس میں حصول تعلیم میں معاون دلچسپ طریقوں کا ذکر ملتا ہے کہ بچوں کو کھیل کھیل میں کس طرح اخلاقی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ تیسری مجلس میں فضول رسم و رواج اور توہم پرستی کا بیان کیا گیا ہے۔ چوتھی مجلس امور خانہ داری سے متعلق ہے۔ پانچویں مجلس میں معاشرتی زندگی اور خاندانی تعلقات اور روابط کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ چھٹی مجلس جو کہ پچھلی پانچ مجلسوں کی نسبت طویل ہے اس میں انگریز حکومت کی برکات، عادات، اطوار اور روزگار کا بیان ہے جبکہ ساتویں مجلس میں سید عباس کے پرورش پانے کا احوال بتایا گیا ہے اور آٹھویں مجلس میں مکتب اور قدیم طرز تعلیم کا ذکر کیا ہے۔ آخری اور نویں مجلس میں قصہ کا اختتام سید عباس کی شادی پر ہو جاتا ہے۔ یوں اس سبق آموز اصلاحی قصہ میں تقریباً تمام گھریلو مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

تمام قصہ میں جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان کا تعلق روزمرہ انسانی زندگی سے ہے مثلاً حیاء، غیرت، سلیقہ مندی، صبر وتحمل، بردباری، قناعت، فرمانبرداری اور چستی جیسے جواہر کو سراہا ہے اور اس کی ترغیب دلائی ہے جبکہ سستی، کاہلی، لڑائی جھگڑا، غیبت و بدزبانی، زبان درازی، جھوٹ، کام چوری، غصہ وغیرہ کی مذمت کی ہے۔ دراصل مولانا

حالی نے نیکی کے نقوش اجاگر کرنے کے لیے بدی کی تصویر کشی سے گریز کرتے ہوئے نیکی کو ہی اس کی اصل صورت میں زیادہ خوبصورت اور پرکشش انداز سے پیش کیا ہے۔ قصے میں جن معاشرتی مسائل کو بیان کیا گیا ہے ان پر سماجی ڈھانچے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے چنانچہ قصہ کو اخلاق کی تربیت کے آلہ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اس کے لیے مولانا حالی نے معلمانہ انداز کی بجائے دردمند ناصحانہ اسلوب اختیار کیا ہے جس سے کہانی میں قصے کی کیفیت پر اکثر مقصدیت کا اظہار غالب آ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کہانی کے فنی تقاضے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ قصہ کو دلچسپ بنانے کے لیے جابجا حکایات اور چٹکلوں سے بھی کام لیا ہے لیکن واقعات کی ترتیب اور تسلسل میں نظم وضبط کو اس کامیابی سے ملحوظ رکھا ہے کہ کہانی ایک واضح مقصد کے ساتھ اختتام پذیر ہو جاتی ہے۔ اصلاح وتفریح کے اس امتزاج میں روزمرہ، آسان اور عام فہم، سیدھی، سادی مثالوں اور بامحاورہ زبان نے قصہ میں ادبی چاشنی پیدا کر دی ہے۔ اس حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ”ہے ہے لوگو، اشراف زادیوں نے کیسا لکھنا پڑھنا چھوڑ دیا۔ کیسی ان گھروں پر جہالت چھا گئی۔ کیسا الٹا زمانہ آ گیا محمودہ بیگم! ذرا سوچنے کی بات ہے ہمارے ملک کے ہندو مسلمان جو اشراف کہلاتے ہیں سب کے ہاں قدیم سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ بیٹی کو کچھ پڑھائیں یا نہ پڑھائیں پر بیٹے کو ضرور پڑھواتے ہیں کیا غریب اور کیا امیر ہر شخص اپنی بساط کے موافق بیٹے کی تعلیم میں ضرور کوشش کرتا ہے۔ پر میں نہیں جانتی اس ملک کی برکت کہاں اڑ گئی؟ جب دیکھا یہی دیکھا کہ سو میں سے دو چار بچے جو ایسے ہی صاحب نصیب اور ہونہار ہوئے وہ تو لکھ پڑھ کر کسی قابل ہو گئے اور باقی وہی کو دن کے کو دن رہے۔ ہاں اب کر کے سرکاری مدرسوں میں پڑھنا لکھنا بے شک زیادہ ہو گیا ہے پر آدمیت سی چیز وہاں بھی جم جم آتی ہے۔“[۲۱۹]

”مجالس النساء“ میں کردار بھی واضح ہیں اور ان کے مکالموں میں سادگی، روانی اور فطری اقدار سے کام لیا گیا ہے۔ یہ خوبی قصہ کے آغاز ہی سے دکھائی دیتی ہے۔ حالی نے کرداروں کو صفاتی کردار بنا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ قصے کو کہیں سے بھی پڑھنا شروع کریں کردار کو اس کی گفتگو سے بآسانی پہچانا جا سکتا ہے۔ مکالموں میں روزمرہ زبان کا اس سادگی سے استعمال کیا ہے کہ قصے میں تاثیر کی خوبی پیدا ہو گئی ہے۔ زبان و بیان کے حوالے سے ڈاکٹر عبدالقیوم بجا فرماتے ہیں کہ ”عورتوں کی زبان اور لب و لہجے میں سیدھے سادے مگر قابل قبول طریقے سے ”تعلیم و تربیت کا ایک نصاب“ مکالمے کی شکل میں پیش کر دیا ہے جو اپنے عہد کی معاشرتی تاریخ بھی ہے، زنانہ الفاظ، مثلوں، کہاوتوں کی مختصر لغت بھی ہے۔“[۲۲۰] حالی عورتوں کے بچپن سے وفات تک کے تمام مدارج کی منظر

کشی کس قدر رواں اور روزمرہ اسلوب میں بیان کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

''دنیا نے ان کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ جس دن پیدا ہوئیں سارا کنبا یا تو بیٹے کی امید پر خوشیاں منا رہا تھا یا بیٹی کا نام سنتے ہی ایک ایک کے منہ پر اداسی چھا گئی۔ ماں باپ ہیں تو اداس ہیں۔ بھائی بہن ہیں تو اداس ہیں۔ خالہ، پھپھی، نانی، دادی، اپنا بیگانہ آیا گیا جو سنتا ہے ٹھنڈے سانس بھر کر رہ جاتا ہے۔ یوں ظاہر میں کوئی خوشی کی صورت بنا لے تو کچھ کہی نہیں جاتی پر خوشی سی چیز سو سو کوس نہیں۔ پھر جب برس ڈیڑھ برس کی ہوئیں اور اپنی بھولی بھالی صورت اور پیاری پیاری باتوں سے ایک ایک کا جی لبھانے لگیں تو اماں، باوا، خالہ، پھپھی، کی مامتا کچھ جوش میں آئی، پر بیٹوں کے برابر اب بھی ان کی جان عزیز نہ ہوئی۔ بیٹوں کے نام غصے میں بھی لیا تو ''اللہ آمین'' کر کے لیا۔ ان کو پیار میں بھی پکارا تو ''موئی مرنے جوگی'' غارت گئی، کہکر پکارا پھر جب ہوش سنبھالا اور اس قابل ہوئیں کہ ماں کی، باپ کی تربیت سے آدمی بنیں اور دین دنیا کی بھلائی سے خبردار ہوں۔ ماں باپ نے ان سے اپنی خدمت لینی شروع کی اور کوئی سلوک ایسا نہ کیا جس سے وہ ان کی احسانمند ہوتیں۔ پکانا، ریندھنا، ان کو اس لیے سکھایا کہ ماماں رکھنے کی ضرورت نہو۔ سینا پرونا اس لیے سکھایا کہ ورزی یا مغلانی کو سلائی دینی نہ پڑے۔ چھٹی سے لیکر بسملہ تک اور منگنی سے لیکر چوتھی تک جتنی شادیاں کیں وہ اپنے نام کے لیے کیں۔ جہیز میں جو کچھ دیا وہ دنیا کے دکھاوے کو دیا۔ ایک پڑھنا لکھنا ایسی چیز تھا جو دنیا اور آخرت میں ان کے کام آتا۔ سو ماں باپ نے اس کو ہوا تک نہ لگنے دی اور یہ سمجھا کہ اول تو ان کے پڑھانے لکھانے سے ہم کو کچھ فائدہ نہیں دوسرے یہ پڑھنے لکھنے میں رہیں گی تو گھر کے کام دھندے کون کرے گا۔ پھر جب بیاہی گئیں اور ایک غیر شخص کے پالے پڑیں تو وہاں میکے سے بھی زیادہ دکھ اٹھانے پڑے۔ ساری عمر کاٹنی تو درکنار رہی وہاں ایک ایک گھڑی کاٹنی دشوار ہوگئی۔ ساس کو یا تو یہ چاؤ لگ رہا تھا کہ کب بہو آئے اور کب بیٹے کا گھر آباد ہو یا بہو کے آتے ہی سو غیروں کی ایک ہوگئی۔ نندوں کو یا تو آٹھ پہر بھائی کے نام کی تسبیح تھی یا بھابی کی صورت سے بیزار ہوگئیں۔ خاوند کا دل بھی جیسا چاہیے ویسا نہ ملا کیونکہ اول تو چودہ پندرہ برس کی جان کو بیاہ کا ایسا چاؤ ہی کیا تھا۔ دوسرے ماں بہنوں کی نگاہ بیوی کی طرف سے پھری ہوئی دیکھی۔ آگے بیوی میں کوئی ایسا جوہر نہ پایا۔ جو سب کو چھوڑ کر اسی کا ہو رہتا۔ غرض بیگانی بیٹی کی کسی نے خریداری نہ کی۔ اب رہی اولاد، سو جس ماں کی حقیقت باپ کے گھر میں یہ ہوگی اس کی عظمت، اس کی بزرگی، اس کا ادب اولاد کے دل میں کیا خاک ہوگا۔''[۲۲۱]

''مجالس النسا'' اور ''نصیحت کا کرن پھول'' کے قصہ میں ایک مماثلت نظر آتی ہے کہ دونوں میں طبقہ

نسواں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے مقصد کا احاطہ کیا گیا ہے اور انگریزی حکومت کی ستائش اور اسکی برکات کا تذکرہ اس طرح کیا گیا ہے کہ رفاہ عامہ کے کام ہوں یا علم کی ترقی انہیں انگریز حکمرانوں ہی کی مرہون منت قرار دیا ہے۔ جو ان حالات میں درست بھی ہے لیکن قصے میں اس طور ذکر کرنے کا مقصد انگریز حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنا تھا جس میں کامیابی بھی ہوئی۔

''چند ہم عصر'' میں مولوی عبدالحق نے مولانا الطاف حسین حالی کا جو خاکہ تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو زبان میں اعلیٰ درجے کے ناول اور ڈرامے لکھنے کی خواہش رکھتے تھے اور اس بات پر افسوس کرتے تھے کہ یورپین زبانوں سے بہترین ناول اور ڈراموں کا ترجمہ نہیں کیا گیا کہ وہ نمونے کا کام دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ناول اور ڈرامے کے حوالے سے ان کے دماغ میں جو تصور تھا وہ ''مجالس النساء'' کی صورت میں تشکیل پذیر ہوا کیونکہ اس قصے میں ناول کے ساتھ ساتھ ڈرامائی عناصر بھی نمایاں ہیں۔ آتو جی اور زمانی بیگم کے درمیان مکالموں کی برجستگی اور زبان کے رکھ رکھاؤ کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''آتو جی آداب
برخوردار بوڑھ سہاگن بیگم یہ تمہارے ساتھ اور کون ہیں؟
ہیں تو آتو جی۔ آپ نہیں جانتیں۔ میری سہیلی ہیں۔
اَے! کون ہیں؟ مریم زمانی؟
حضرت بندگی
بھلا بیٹا! بہت سی عمر میاں جیئے، بچے جیئں۔ بوا تم کہاں؟
جی میں ابھی آ کے اتری ہوں۔
آؤ بیوی بیٹھ جاؤ۔ کہو مزاج تو اچھا ہے؟
حضرت خدا کا شکر ہے۔
بچے اچھے ہیں۔
سب آپ کو دعا کرتے ہیں۔
مرزا پاس سے خط پتر آتا ہے؟
جی ہاں! دسویں پندرھویں آتا رہتا ہے۔
احمد مرزا کو مکتب میں بٹھا دیا؟
جی مکتب میں بیٹھے تو اسے بہت دن ہوئے۔
بوا! اللہ رکھو اب اس کی عمر کیا ہو گی؟
جی اسے چاند دیکھے اٹکنا برس لگے گا۔۲۲۲

چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی نے ناول اور ڈراما لکھنے کی اس خواہش کی تسکین اس قصے کو لکھ کر پوری کی۔ جس میں ناول کی خوبیوں کے ساتھ ڈرامائیت بھی موجود ہے۔ چونکہ اعلیٰ ناول یا ڈرامے کے حوالے سے کوئی نمونہ سامنے نہ تھا۔ اس لیے ''مجالس النساء'' ناول کی خام صورت میں سامنے آتی ہے۔ اس نے لاہور میں اردو ناول کی ابتداء و ارتقا کے حوالے سے ادبی فضا کو سازگار بنایا اور اردو نثر میں ناول کی صنف کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئی۔

تعلیم النساء: مولوی کریم الدین نے ۱۸۷۴ء میں لکھی۔

انگریزی زبان کس طرح بولنا اور لکھنا چاہیے:

میجر ہالرائڈ ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم (جو اردو، فارسی اور عربی سے واقفیت رکھتے تھے) نے اردو میں ایک کتاب لکھی جو ۱۸۷۴ء میں خط نستعلیق میں لاہور سے چھپی۔ ۲۲۳ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے کہ اس کتاب کا مقصد انگریزی زبان کو سیکھنے کے لیے ایک آسان اور نیا قاعدہ بنانا تھا۔

قصص ہند (حصہ سوم):

تاریخ کے موضوع پر قصص ہند کا یہ تیسرا حصہ انگریزی سے چیدہ تاریخی کتب سے ماخوذ تراجم پر مبنی ہے۔ جس میں لارڈ کلائیو سے سر ہنری لارنس اور نکلسن تک کے حالات درج کیے گئے ہیں۔ اس کے سرورق کی عبارت اس طرح تحریر کی گئی ہے:

قصص ہند

حصہ سوم

مرتبہ مترجمان سر رشتہ تعلیم پنجاب

حسب الحکم

جناب میجر ہالرائڈ صاحب بہادر

ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب، لاہور

کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال آشوب کے اہتمام سے چھپا ۱۸۷۵ء ۲۲۴

''قصص ہند'' (حصہ سوم ۱۸۷۵ء) اس کی اولین اشاعت ہے کیونکہ اس سے قبل اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا۔ اس حوالے سے ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء کے پنجاب گزٹ میں ۱۵ مارچ ۱۸۷۴ء تک چھپنے والی کتب کی فہرست میں بھی اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلی بار اس کی اشاعت ۱۸۷۵ء ہی میں عمل میں آئی۔ اس حصے کے سرورق پر ''مترجمان'' سے احساس ہوتا ہے کہ اس حصے کی ترتیب میں سر رشتہ تعلیم کے مترجمین نے حصہ

لیا ہو گا۔ لالہ سری رام نے ''خمخانہ جاوید''، مولوی عبدالحق نے، ''مرحوم دلی کالج''، دتاتریہ کیفی نے ''دلی کالج اُردو میگزین نمبر'' اور امداد صابری نے ''حیات آشوب'' میں ''قصص ہند'' (حصہ سوم) کو پیارے لال آشوب ہی سے منسوب کیا ہے۔ جبکہ خلیل الرحمٰن داؤدی نے قصص ہند کو مرتب کرتے ہوئے اس کے تعارف میں بغیر کسی دلیل کے اسے پیارے لال آشوب کی تالیف تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کتاب میں کوئی دیباچہ یا پیش لفظ نہیں ہے۔ جس سے اس کے مترجمان کی وضاحت ہو سکے۔ چونکہ یہ خالصتاً آشوب کی تالیف نہیں ہے اس لیے جب وہ اپنی تصنیف و تالیف کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں قصص ہند (حصہ سوم) کا ذکر نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں ''ایک ماہوار رسالہ جس میں مضامین علمی کے سوا اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ جاری کیا اس کا نام اتالیق پنجاب رکھا گیا۔ جب تک میں ڈاکٹر صاحب کے دفتر میں ترجمے کے کام پر مامور رہا اسی رسالے کا اہتمام کرتا رہا اور نیز یہ کتابیں لکھیں۔ (۱) اُردو کی تیسری کتاب (۲) قصص ہند حصہ اول (۳) تاریخ انگلستان (۴) تاریخ زمانہ قدیم (۵) جغرافیہ طبعی وغیرہ''۲۲۵ مقالہ نگار کا استدلال ہے کہ اگرچہ اس پر کسی نام کی صراحت نہیں کی گئی لیکن شواہد پیارے لال آشوب ہی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کیونکہ پیارے لال آشوب دہلی کالج کے پروردہ، فارسی اور اردو کے ساتھ انگریزی زبان میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ اسی لیے ان کو دلی سے لاہور لایا اور خاص طور پر پنجاب بک ڈپو میں کیوریٹر کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ جو ان کی قابلیت اور صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ہر چند کہ انگریز حکام بہت سے احباب کو یو۔پی سے لاہور لائے لیکن اس عہدے کے لیے آشوب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص موزوں نہ تھا کیونکہ آشوب انگریزی زبان پر دسترس رکھتے تھے اور پنجاب بک ڈپو میں کتابوں کا ترجمہ کرنے کے علاوہ پنجاب ہائیکورٹ کے ہیڈ مترجم کی حیثیت سے دستاویزات کے اردو ترجمہ کا کام بھی انھی کے سپرد تھا۔ ۱۸۷۲ء میں ''تاریخ انگلستان کلاں'' کا بھی انگریزی سے اُردو ترجمہ کر چکے تھے۔ ان کی انگریزی دانی کے حوالے سے اخبار ''پنجابی'' ۲۴ اگست ۱۸۶۹ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ ''ماسٹر صاحب کی لیاقت انگریزی ماشاء اللہ وہ ہے کہ سینکڑوں اسناد میں حکام انگریزی نے صاف لکھا ہے کہ ہنیوں میں اس لیاقت و استعداد کا انگریزی داں ہم نے نہیں دیکھا''۔۲۲۶ لہٰذا گمان گزرتا ہے کہ پیارے لال آشوب اس وقت سر رشتہ تعلیم سے وابستہ تھے۔ ان کے ساتھ جو دیگر مترجمین شامل رہے ہوں گے ان میں آشوب کا کردار بنیادی رہا ہو گا۔ چونکہ اس کام میں سررشتہ تعلیم کے دوسرے مصنفین بھی شریک تھے اس لیے قصص ہند (حصہ سوم) پر آشوب نے اپنا نام نہیں لیا اور نہ ہی اسے اپنی تصانیف کی فہرست میں شمار کیا ہے۔ مقالہ نگار کے خیال میں مترجمان میں دوسرا نام خواجہ ضیاء الدین کا ہو سکتا ہے کیونکہ ان کی ''قواعد اُردو'' کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں آشوب کی ''اُردو کی تیسری کتاب'' بھی شامل تھی اور اس میں خواجہ ضیاء الدین نے پرندوں کے حالات انگریزی سے اُردو ترجمہ کیے تھے۔ نمونہ عبارت ملاحظہ ہو:

"منگمری صاحب سابق لیفٹنٹ گورنر بہادر لکھتے ہیں کہ ہنری لارنس اور نکلسن ہندوستان میں اپنا مثل نہ کہتے تھے ۔ اگر نکلسن جیتا رہتا تو ہندوستان کا سپہ سالار ہوتا ۔ چستی چالاکی ۔ جانفشانی ۔ پیش بینی ۔ فکر صائب اور پرلے درجہ کی بہادری جتنی خوبیاں فتح مند سپہ سالاروں میں ہونی چاہیں اسکی ذات میں سب جمع تھیں ۔ مشکل کو مشکل اور خطرہ نہ جانتا تھا ۔ جس قدر میں نے اس کو زیادہ دیکھا اسی قدر زیادہ اچھا پایا ۔ سرحد کے علاقوں میں انگریزی عملداری کا سکہ بٹھانے میں اس نے وہ کچھ کیا ہے کہ کسی سے نہ ہو گا اور پنجاب میں وہ نام پایا ہے کہ کبھی کوئی نہ پائیگا ۔[۲۲۷]

واقعاتِ ہند:

یہ کتاب لالہ بھیرون پر شاد نے لکھی جو ہندوستان کی مکمل تاریخ ہے ۔ ایجوکیشنل پریس لاہور سے ۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی ۔[۲۲۸]

نصابِ ضروری:

خدابخش نے اشعار کی فارسی اور اُردو لغت تیار کی جو ۱۸۷۵ء میں طبع ہوئی ۔ اس کا ایک اور ایڈیشن ۱۸۷۸ء میں بھی شائع ہوا ۔[۲۲۹]

فائض البیان: [۲۳۰]

یہ حافظ عمر دراز فائض[۲۳۱] کی تصنیف ہے جو ۶۰ صفحات پر علم معانی و بیان کے بارے میں مختلف اسباق پر مشتمل ہے ۱۸۷۷ء میں مطبع پنجابی لاہور سے چھپی ۔[۲۳۲] یہ ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے ۔ یہ رسالہ پنجاب یونیورسٹی کے نصاب میں ۱۸۸۴ء تا ۱۹۱۲ء تک شامل رہا ۔

فائض المعانی:

صرف و نحو پر مشتمل قواعد و انشاء کی کتاب حافظ عمر دراز فائض نے تحریر کی ہے جو ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی ۔

قواعد اُردو:

یہ محکمہ تعلیم کے سلسلہ درسی نصاب کے ضمن میں لکھی جانے والی قواعد ہے جسے میجر ہالرائڈ کے حکم سے لکھا گیا ۔ مقالہ نگار کے پیش نظر یہ ۱۸۷۹ء کی اشاعت ہے کتاب کے سرورق پر یہ عبارت درج ہے ۔

قواعد اُردو

حسب الحکم

جناب میجر ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائرکٹر مدارس ممالک پنجاب وغیرہ لاہور

کے سرکاری مطبع میں ماسٹر پیارے لال کیوریٹر کے اہتمام سے چھپی

۱۸۷۹ء

اس سر رشتہ کی بے اجازت کوئی نہ چھاپے"

۱۱۶ صفحات کی یہ مختصر قواعد دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ صرف کے علم پر ہے جبکہ دوسرا حصہ نحو کے علم پر مبنی ہے۔ جس میں گردانیں صیغے، اسماء اور تمام متعلقہ اصلاحیں وغیرہ شامل ہیں۔ قواعد کی اس کتاب کی افادیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۸۷۹ء میں یہ اس کی ۲۰ ویں اشاعت تھی۔

"قواعد اُردو" ہی کے نام سے ۱۸۸۶ء میں مطبع مفید عام لاہور سے ایک اور کتاب شائع ہوئی جس کا مصنف معلوم نہیں ہو سکا۔ یہ کتاب بھی صرف کے موضوع پر ہے لیکن سبق میں کہیں کہیں موضوع سے ہٹ کر بچوں کے لیے ہنسنے ہنسانے کی باتیں بھی کی گئی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مزاح کا عنصر علمی کتب کا بھی حصہ رہا ہے۔ مثلاً یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> " بہن بسور رہی تھی کہ بھائی آیا۔ اس نے کہا دیکھو بوا وہ ہنسی آئی وہ ہنسی آئی ماتھے پر آئی، نیچے اتر کر ناک میں آئی اے لو ہونٹوں پر آئی دیکھو مسکرائی ہو۔ بہن بھائی کی یہ باتیں سن کر ہنس پڑی۔ بڑے چھوٹوں کو یوں ہنسا دیا کرتے ہیں"۔۲۳۳

آب حیات:

۱۸۸۰ء ۲۳۴ میں لاہور سے شائع ہونے والی مولانا محمد حسین آزاد کی ایسی تصنیف ہے جس میں سوانح نگاری ۲۳۵، تذکرہ نویسی، ادبی تاریخ اور تنقید نگاری کی خصوصیات بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے اسے انوکھا اور جدید طرز کا پہلا تذکرہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا یہ کہنا بھی درست ہے کہ " آب حیات میں تذکرہ نگاری براہ راست تاریخ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے ان میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو کسی قدیم ادبی تاریخ سے توقع کی جاسکتی ہے"۔۲۳۶ آب حیات میں تاریخ زبان اُردو، ہندی، فارسی انشاء پردازی، تاریخ نظم اُردو پر خوب عالمانہ اور شاعرانہ بحث کی گئی ہے۔ جس میں جانفشانی اور عرق ریزی سے کام لیا گیا ہے۔ "مکتوبات آزاد" سے پتہ چلتا ہے کہ یہ یونیورسٹی کے نصاب امتحان میں شامل تھی۔۲۳۷ آب حیات خاص تنقیدی حیثیت کی حامل ہے جس سے نہ صرف باقاعدہ فن تنقید بلکہ تاریخی احساس کے ساتھ ادب کے مطالعہ کے ذوق کا آغاز بھی ہوا۔ اس سے قبل تنقید میں اردو شعرا کے تذکرے نظر آتے ہیں جو محض جذباتی دلچسپی کی بناء پر یا جواب الجواب کی صورت میں وجود میں آئے یا پھر شعرء کے کلام پر تقریظیں، تبصرے اور دیباچے نظر آتے ہیں جن میں

تنقید اور ادب کے ہلکے اور مدھم نقوش موجود تھے۔ جبکہ ''آب حیات'' میں واضح تنقیدی شعور کے ساتھ زبان و ادب کے بارے میں بھی ایک نقطہ نظر ملتا ہے ۔ آزاد نے شعراء کے حالات اور کلام کے علاوہ اردو تنقید میں تاریخی احساس ، شاعر کی شخصیت ، اس کے عہد اور ماحول کا ذکر بھی کیا ہے۔ نیز ''آب حیات'' کے سرورق کی یہ عبارت بھی اس بات کی عکاس ہے کہ یہ ''مشاہیر شعرائے اُردو کے سوانح عمری اور زبان مذکور کی عہد بہ عہد ترقیوں اور اصلاحوں کا بیان'' ہے ۔ ایک عرصہ تک مولانا آزاد کی تنقیدی آراء کو مستند خیال کیا جاتا رہا ہے۔ کیونکہ ''ان کا ذاتی احساس اتنا نازک اور تیز تھا کہ ان کی بعض تنقیدی آراء کو ابدی حیثیت حاصل ہوگئی''۔۲۳۸ اگر چہ آج بوجوہ تحقیقی غلطیوں کے پہلے سی وقعت حاصل نہیں ہے لیکن پھر بھی اس کی اہمیت مسلمہ ہے۔ اس حوالے سے بابائے اردو مولوی عبد الحق کا یہ کہنا بالکل بجا ہے:

> ''آزاد مرحوم کی آب حیات اپنی بعض واقعاتی غلطیوں کے باوجود اُردو زبان میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے ۔ تاریخ کی حیثیت سے نہ سہی افسانے کی حیثیت سے اسے دیکھئے اس کی زبان اور اس کا اسلوب بیان اسقدار شستہ ورفتہ ، سلیس اور پاکیزہ اور دلچسپ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ آزاد مرحوم کا یہ کیا کم احسان ہے کہ اس نے سب سے پہلے تاریخ ادب لکھنے کا ڈول ڈالا اور ہمیں یہ خیال سجھایا۔''۲۳۹

''آب حیات'' کے مقصد تصنیف کی بابت مولانا آزاد اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''کیا یہ تھوڑے افسوس کا موقع ہے کہ ہمارے بزرگ خوبیاں بہم پہنچائیں انھیں بقائے دوام کے سامان ہاتھ آئیں اور اس پر نام کی زندگی سے بھی محروم رہیں۔ بزرگ بھی وہ بزرگ کہ جن کی کوششوں سے ہماری ملکی اور کتابی زبان کا لفظ لفظ اور حرف حرف گراں بار احسان ہو۔ ان کے کاموں کا اس گم نامی کے ساتھ صفحہ ہستی سے مٹنا بڑے حیف کی بات ہے جس مرنے پر ان کے اہل وعیال روئے وہ مرنا نہ تھا۔ مرنا حقیقت میں ان باتوں کا مٹنا ہے جس سے ان کے کمال مر جائیں گے اور یہ مرنا حقیقت میں سخت غم ناک حادثہ ہے۔''۲۴۰

مولانا آزاد نے شعرا کے حالات و کلام اور زبان و ادب کے بارے میں جو تنقیدی خیالات بیان کیے ہیں وہ جدید رجحانات سے ہم آہنگ ہیں۔ یہ مولانا آزاد ہی تھے جنہوں نے لاہور میں اُردو نثر میں جدید ادب کا موضوع اور اسلوب ہر دو سطح پر سنگ بنیاد رکھا ۔ ''آب حیات'' کے ذریعے لسانی تحقیق کا دروا کیا۔ نیز اُردو زبان کا فارسی زبان سے مستفید ہونا اور اس کی رنگینی اور تخیلی انشاء پردازی کی تقلید سے اردو زبان کو پہنچنے والے نقصان کی

جانب سب سے پہلے مولانا آزاد ہی نے توجہ دلائی۔ چنانچہ تنقید میں سادگی اور اصلیت کے جوہر پیدا کیے اور بھاشا کے سادہ فطری اور پر زور انداز بیان سے مقابلہ کرتے ہوئے اُردو نثر کی اصلاح کی ضرورت سمجھائی۔ بھاشا اور فارسی انشا پردازی کے امتزاج سے ایک نیا اور بے مثال اسلوب بیان پیش کیا ہے۔ لہذا نہ صرف اُردو نثر کی بلکہ اردو شاعری کی اصلاح کا فریضہ بھی ''آب حیات'' نے بخوبی نبھایا ہے۔ ''نظم اُردو کی تاریخ'' میں لکھتے ہیں:

> ''ارباب زمانہ نے متفق اللفظ کہہ دیا کہ اُردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں اور ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اسے کون دھوئے اور کیوں کر دھوئے۔ ہاں، یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے۔ جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کنارے پر قابض ہو گئے ہیں۔ ان کی ہمت آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے گی اور اس داغ کو دھوئے گی بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں سے بھر دے گی۔''[۴۴۱]

یہ لاہور کا علمی و ادبی ماحول ہی تھا جس نے مولانا آزاد میں اس تصنیف کے لیے ذوق وشوق پیدا کیا اور وہ اس کتاب کے لیے مواد فراہم کرنے لگے۔ انھیں پرانے تذکروں کی کم مائیگی اور جدید تقاضوں کے ساتھ اپنے عہد کے بدلتے ہوئے ادبی ذوق کا پوری طرح احساس تھا یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تنقیدی شعور کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> '' اس کے علاوہ نئے تعلیم یافتہ جن کے دماغوں میں انگریزی لالٹینوں سے روشنی پہنچتی ہے وہ ہمارے تذکروں کے اس نقص پر حرف رکھتے ہیں کہ ان سے کسی شاعر کی زندگی کی سرگذشت کا حال معلوم ہوتا۔ نہ اس کی طبیعت اور عادت واطوار کا حال کھلتا ہے نہ اس کے کلام کی خوبی اور صحت وسقم کی کیفیت کھلتی ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے معاصروں میں اور اس کے کلام میں کن کن باتوں میں کیا نسبت تھی۔ انتہا یہ کہ سال ولادت اور سال وفات تک بھی نہیں کھلتا۔۔۔ غرض خیالات مذکورہ بالا نے مجھ پر واجب کیا کہ جو حالات ان بزرگوں کے معلوم ہیں یا مختلف تذکروں میں متفرق مذکور ہیں، انھیں جمع کر کے ایک جگہ لکھوں اور جہاں تک ممکن ہو اس طرح لکھوں کہ ان کی زندگی کی بولتی چالتی۔ پھرتی چلتی تصویریں سامنے آن کھڑی ہوں۔ اور انھیں حیات جاوداں حاصل ہو۔''[۴۴۲]

شعرا کو حیات جاوداں بخشنے کے سلسلے کا آغاز دراصل انجمن پنجاب کے جلسوں ہی سے ہو چکا تھا۔ اس طرح ''آب حیات'' کی داغ بیل درحقیقت انجمن پنجاب کے جلسوں میں پڑی۔ ۱۰ جولائی ۱۸۶۵ء کے جلسہ میں مولانا آزاد نے تجویز پیش کی کہ'' ہر ہفتے میں شنبہ کے دن شام کے وقت مکان سکشا سبھا میں شائقین کا جلسہ ہوا

کرے اور اس میں شعرا سلف کا تذکرہ ہوا کرے۔"۳۴۳ یہ تجویز متفقہ طور پر منظور ہوئی لیکن اسی عرصہ میں مولانا آزاد نے ترکستان کا سفر اختیار کیا اور تجویز پر عمل نہ ہو سکا۔ سفر سے واپسی آکر انھوں نے اپنی تجویز کو عملی صورت دی اور ۱۸۶۷ء میں زبان اُردو کی تاریخ اور نشوونما، اصلیت زبان اُردو، نظم اور کلام موزوں کے باب میں خیالات ، ولی ، حاتم اور ہدایت پر مضامین پڑھے جو بعدازاں مناسب تبدیلیوں کے بعد "آب حیات" کا جزو بنے۔ پہلے پہل "آب حیات" کے متفرق اجزاء "رسالہ" انجمن مفید عام قصور میں شائع ہوئے۔۳۴۴ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا آزاد کے ذہن میں "آب حیات" جیسی تصنیف لکھنے کا خیال عرصہ دراز سے موجود تھا۔ جسے بعد ازاں انھوں نے مربوط اور منظم صورت دی ۔"آب حیات" کو جہاں پذیرائی ملی وہیں اس پر دانستہ یا دانستہ فرو گذاشتوں ۳۴۵ کی وجہ سے اخبارات میں تنقید بھی کی گئی ۔ مثلاً اشاعت اول میں مومن اور میر ضاحک کا تذکرہ نہیں کیا گیا تھا۔ جس پر کتاب کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ ۱۸۸۳ء میں مولانا آزاد نے ان فروگذاشتوں کو دور کیا۔

"آب حیات" کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اُردو شعرا کا تذکرہ ، ادبی تاریخ اور تنقید کے ساتھ اُردو نثر میں ادبی تحقیق کا نقش اول بھی ہے۔ اگرچہ اس میں تحقیقی خامیاں ہیں لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس عہد میں ماخذ اور معلومات کے ذرائع محدود تھے تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ایسا ہونا فطری تھا۔ اس زمانے میں مولانا آزاد نے جو کچھ لکھا وہ اپنے زمانے کے علمی رجحانات اور تحقیق کے مطابق تھا۔ لہٰذا خامیوں کے باوجود برج بھاشا کا لسانی نظریہ، برج بھاشا پر عربی و فارسی اثرات اور دونوں کی انشاپردازی کا موازنہ اور نظم اُردو کی تاریخ کے حوالے سے "آب حیات" کی حیثیت ادبی تحقیق میں مسلم ہے۔

جہاں تک "آب حیات" کے اسلوب نگارش کا تعلق ہے تو اس کا اسلوب بیک وقت اس کی خامی اور خوبی بھی ہے۔ خامی اس لیے تذکرے اور تاریخ کے لیے سنجیدہ علمی انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے جو قدرے خشک بھی ہوتا ہے۔ جبکہ خوبی یہ کہ قطع نظر تحقیقی غلطیوں کے تمثیلی انداز اور متحرک تصاویر اور ڈرامائی کیفیت نے اس میں ادبیت کی ایسی شان پیدا کی ہے جو افسانوی ادب کا خاصا قرار پاتی ہے لہٰذا عام ادبی تاریخ کی کتب کی نسبت دلچسپی کا عنصر اس کی خوبی بن جاتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے دلکش جملے، خوبصورت تراکیب ،تشبیہات و استعارات ، شیریں اور مترنم انداز بیان، مرقع نگاری ، ڈرامائیت اور نکھری ہوئی دہلی کی زبان نے اسلوب بیان کو شگفتگی ، شوخی ، رنگینی ، حسن اور دلکشی سبھی کچھ بخش دیا ہے۔ اسلوب کی یہی خوبصورتی اس اقتباس میں ملاحظہ ہو:

"فلک تیر حوادث کا ترکش اور کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے۔ اگر عاشق کا تیر آہ اس کے سینے کے

پار جاتا ہے پھر بھی زحل منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی کہ عاشق کی صبح مراد ہو ۔ باوفا شمع عشق کے تپ میں سراپا جلتی ہے اس کی چربی گھل گھل کر بہتی ہے مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا ۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحری کبھی آ کر کافور دیتی ہے اور کبھی بتا شیر ۔ شمع کا دل اس لیے بھی گداز ہے کہ شب زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گر یباں چاک کرتی ہے پنجۂ آفتاب فلک کے سبز گھوڑے پر سوار کرن کا تاج زرنگار سر پر رکھے شفق کا پھریرا اڑاتا ہوا اپنے حریف شاہ انجم کی فوج کو پریشان کر کے فتح یاب آیا ہے۔''[۲۳۶]

فارسی انشاپرداز کے مقابلے میں بھاشا کے انشاپرداز کا سلیقہ بتاتے ہوئے کیسا خوبصورت رومانوی اسلوب اختیار کرتے ہیں جو اس کی خوبی ہوتے ہوئے تنقیدی اسلوب کے حوالے سے اس کی خامی بھی بن جاتا ہے۔

''درختوں کے جُھنڈ چھائے ہیں ۔ گھن کے پتے ہیں ۔ ان کی گہری گہری چھاؤں ہے ۔ جامن کی ٹہنیاں آم کے پتوں میں گھچڑی ہورہی ہیں ۔ کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے ۔ عشق پیچے کی ٹہنیاں گلروندے پر ایسی چھائی ہیں جیسے سانپ لہرا رہے ہیں ۔ کسی ٹہنی پر بھونرے کی آواز ۔ کسی میں مکھیوں کی جھنجھناہٹ الگ ہی سماں باندھ رہی ہے''۔[۲۳۷]

بھاشا اور فارسی کے بعد انگریزی میں انشا پردازی کے عام اصول بیان کرتے ہوئے ادب برائے زندگی یا الفاظ دیگر افادی ادب کے حوالے سے جو تنقیدی اسلوب اختیار کیا ہے ملاحظہ ہو:

''اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا کہ انھوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا اور رنگ سے لہکتا تھا مفت ہاتھ سے پھینک دیا ۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر اور اظہار اصلیت ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسب لفظی کے ذوق وشوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے اور اصل مطالب کے ادا کرنے میں بے پروا ہوگئے ۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا اور نوبت یہ تھی کہ اگر کوشش کریں تو فارسی کی طرح پنج رقعہ اور مینا بازار یا فسانہ عجائب لکھ سکتے ہیں لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کرسکتے جس سے معلوم ہوتا جائے کہ واقعہ مذکور کیوں کر ہوا اور کیوں کر اختتام کو پہنچا اور اس سے پڑھنے والے کو ثابت ہو جائے کہ روئداد وقت کی اور صورتحال معاملے کی ایسی ہو رہی تھی کہ جو کچھ ہوا اسی طرح ہو سکتا تھا ۔ دوسری صورت ممکن نہ تھی اور یہ نہ تو ناممکن ہے کہ ایک فلسفے یا حکمت اخلاق کا خیال رکھیں ۔ جس کی صفائی کلام لوگوں کے دلوں کو اپنی

طرف لگائے اور اس کے دلائل جو حسن بیان کے پردے میں برابر جلوہ دیتے جاتے ہیں وہ دلوں سے تصدیق کے اقرار لیتے جائیں اور جس بات سے روکنا یا جس کام پر جھونکنا منظور ہو اس میں پوری پوری اطاعت سننے والوں سے لے سکیں ۔ یہ قباحت فقط نازک خیالی نے پیدا کی کہ استعارہ وتشبیہ کے انداز اور مترادف فقرے تکیہ کلام کی طرح ہماری زبان پر چڑھ گئے ۔ بے شک ہمارے متقدمین اس کی رنگینی اور نزاکت کو دیکھ کر پھولے مگر نہ سمجھے کہ یہ خیالی رنگ ہمارے اصلی جوہر کو خاک میں ملانے والا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ آج انگریزی ڈھنگ پر لکھنے میں یا ان کے مضامین کے پورا پورا ترجمہ کرنے میں ہم بہت قاصر ہیں''۲۴۸؎

شعرا کے بارے میں مولانا آزاد کی آراء بہت صائب ہیں شعراء کے سلسلہ وار جائزے نے ''آب حیات'' کو اردو شاعری کی پہلی مکمل اور مبسوط تاریخ بنا دیا ہے۔ جس میں تاثراتی تنقید کا ایک نیا ڈھنگ اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ مثلاً میر تقی میر کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

''میر صاحب کی زبان شستہ، کلام صاف، بیان ایسا پاکیزہ جیسے باتیں کرتے ہیں دل کے خیالات کو جو کہ سب کی طبیعتوں کے مطابق ہیں محاورے کا رنگ دے کر باتوں باتوں میں ادا کر جاتے ہیں اور زبان میں خدا نے ایسی تاثیر دی ہے کہ وہی باتیں ایک مضمون بن جاتی ہیں اس واسطے ان میں بہ نسبت اور شعراء کے اصلیت کچھ زیادہ قائم رہتی ہے بلکہ اکثر جگہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا نیچر کی تصویر کھینچ دی ہے یہی سبب ہے کہ دلوں پر زیادہ اثر کرتی ہیں وہ گویا اُردو کے سعدی ہیں۔''۲۴۹؎

مولانا آزاد کی تاثراتی تنقید میں اکثر و بیشتر وضاحت، تشریح و تحلیل، سنجیدگی اور الفاظ و خیالات کی ہم آہنگی پر ان کے جذبات غالب آجاتے ہیں۔ جس سے ان کے تنقیدی مباحث کو نقصان پہنچا تا ہے۔ تذکرہ، ادبی تاریخ، تنقید و تحقیق اور خاکہ نگاری کی خوبیوں کی حامل ''آب حیات'' نے اُردو نثر میں شاعرانہ اور دلکش اسلوب کی ایک نئی داغ بیل ڈالی اور اس انشاپردازی کے نئے اسلوب نے اسے لازوال بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ''آب حیات'' لاہور میں لکھی جانے والی اُردو نثر کا شاہکار نمونہ ہے جس کے بارے میں مولانا شبلی نعمانی نے مولانا آزاد کی وفات پر ندوہ کے ماتمی جلسہ میں کہا: ''آج جس شخص کا ماتمی جلسہ ہے اس کی اس تصنیف کو میں نے ۱۸ مرتبہ پڑھا ہے''۔۲۵۰؎

* علم سکون:

آیارام۲۵۱؎ کی تحریر کردہ یہ درسی کتاب اقلیدس، جبر و مقابلہ و علم مثلث سے متعلق ہے۔ پہلی بار کب شائع ہوئی معلوم نہیں ہو سکا۔ ۱۸۸۰ء مطبوعہ انجمن پنجاب لاہور کی اشاعت دستیاب ہوئی ہے۔ خالص علمی موضوع پر مبنی

اس کتاب کے بارے میں مصنف لکھتا ہے:

"اس کتاب میں ہم جرثقیل بیانیہ کی اصول لکھے ہیں ہم یقین کرتے ہیں کہ طالب العلم اقلیدس جبرو مقابلہ وعلم مثلث سی واقف ہو گا۔ ہر ایک طاقت میں جو ایک ذرہ پر عمل کرتی ہو تین باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے ۔ اول مقام انفعال طاقت یعنی طاقت کی اثر کرنیکا مقام دوئم سمت طاقت یعنی وہ سمت جس میں طاقت ذرہ کو حرکت دینے کی قابلیت رکھتی ہی ۔ تیرا مقدر طاقت"۔۲۵۲

اس کتاب کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو نثر انیسویں صدی کے نصف دوم میں ہی اس قابل ہو چکی تھی کہ اقلیدس، جبر ومقابلہ اور علم مثلث کے خالص علمی رموز کو بیان کر سکتی تھی ۔ متعلقہ موضوع کی اصطلاحات کا استعمال اور عبارت کی صفائی کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو جس میں ان طاقتوں کا بیان کیا گیا ہے جو ایک ہی سطح پر عمل کرتی ہیں:

"طاقتوں کا ایک نظام جو ایک ہی سطح میں ایک جسم مصمت پر عمل کرتا ہو ساکن ہوگا۔ بشرطیکہ انکی مقیاس القوتوں کے حاصلجمع جبریہ اسی طرح کی کسی دو نقطوں کے گرد صفر کے برابر ہو اور ان طاقتوں کی اجزاء منفصلہ کی حاصلجمع جبریہ جو کہ ان دونوں نقاط کے خط درمیانی کے متوازی منفصلہ کی جاویں برابر صفر کے ہو۔ کیونکہ اگر طاقتوں کا نظام ساکن نہ ہو تو وہ یا تو ایک مفرد حاصل کے برابر ہوگا یا ایک جفت کی مگر اس صورت میں طاقتوں کا نظام جفت کے برابر نہیں ہو سکتا کیونکہ تب تو ان کی مقیاس القوتوں کی حاصلجمع اسی سطح میں کسی نقطہ کے گرد صفر کے برابر نہیں ہو سکتی ۔ اور نہ طاقتوں کا نظام کسی مفرد حاصل کی برابر نہیں ہو سکتی۔ اور نہ طاقتوں کا نظام کسی مفرد حاصل کی برابر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں مقیاس القوتوں کی حاصل جمع جبریہ صاف ان نقاط کے لحاظ سے جو انکی حاصل کی خط میلان میں ہوں برابر صفر کے ہوگی بس اس خط کی سمت میں عمل کرے گا۔ جو دونوں نقاط مفروضہ کو وصل کرتا ہے مگر یہ بات ہم فرض کر چکے ہیں کہ ان طاقتوں کے اجزا منفصلہ کی حاصلجمع جبریہ اسی خط کے متوازی صفر کے برابر ہے پس اسی خط کی سمت میں کوئی حاصل عمل نہیں کر سکتا دیکھو حدود ۴۴ اور ۵۴ پس طاقتوں کا نظام ساکن ہونا چاہیے"۔۲۵۳

دربار اکبری:

محمد حسین آزاد نے "آب حیات" کی تکمیل کے بعد "دربار اکبری" کی تصنیف شروع کی جو ۱۸۸۹ء میں مکمل ہوئی۔ "آب حیات" کے بعد مولانا آزاد کی یہ دوسری تصنیف تھی جس پر مولانا آزاد نے محنت شاقہ سے کام لیا ۔ اس کا اندازہ میجر بلگرامی کے نام ان کے مکاتیب سے لگایا جا سکتا ہے ۔ ۸۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل "دربار اکبری" شہنشاہ اکبر کے عہد کی ضخیم تاریخ ہے۔ اس کتاب کا بھی ابتدائی خاکہ "انجمن پنجاب" کے تحت پڑھے جانے والے

مضامین کی صورت میں تیار ہوا ہے۔ بعد ازاں جو ''رسالہ'' انجمن مفید عام قصور کے شمارے مئی ۱۸۷۶ء اور اگست ۱۸۷۶ء میں خانِ خاناں اور بیرم سے متعلق شائع بھی ہوئے۔''دربار اکبری'' میں شہنشاہ اکبر کی حیات اور کارناموں کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جو معلومات کا بے بہا ذخیرہ ہے۔ نیز اس میں شہنشاہ اکبر کے امراء اور مصاحبین کے حالات بھی دلچسپ انداز سے تفصیلاً بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی بابت ڈاکٹر محمد صادق کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ'' آزاد کو جتنی دلچسپی سیاسی معاملات سے ہے اتنی ہی عمرانی، اقتصادی اور مذہبی مسائل سے بھی ہے اور وہ زیر نظر عہد کے ادبیات، تفریحات، مذہبی حالات، ایجادات اور معاشرتی زندگی پر معلومات فراہم کرتے ہیں''۔[۱۵۳] ''دربار اکبری'' میں شہنشاہ اکبر کا دورِ حکومت اسکی شخصیت، اخلاق و خصائل اور حالات و واقعات جیتی جاگتی صورت میں دیکھے جا سکتے ہیں:

''اس کی طبیعت کا رنگ ہر عہد میں بدلتا رہا بچپن کی عمر کی پڑھنے کا وقت تھا کبوتروں میں اڑایا۔ ذرا ہوش آیا تو کتے دوڑانے لگے اور بڑے ہوئے تو گھوڑے بھگانے اور باز اڑانے لگے۔ نوجوانی تاج شاہانہ لے کر آئی۔ بیرم خان وزیر صاحب تدبیر مل گیا تھا۔ یہ سیر و شکار اور شراب و کباب کے مزے لینے لگے۔ لیکن ہر حال میں مذہبی اعتقاد سے دل نورانی تھا۔ بزرگانِ دین سے اعتقاد رکھتا تھا۔ نیک نیتی اور خدا ترسی بچپن سے مصاحب تھی۔ طلوع جوانی میں آکر کچھ عرصہ تک ایسے پرہیزگار نماز گزار ہوئے کہ کبھی کبھی خود مسجد میں جھاڑو دیتے تھے اور نماز کے لیے آپ اذان کہتے تھے۔ علم سے بے بہرہ رہے مگر مطالب علمی کی تحقیقات اور اہل علم کی صحبت کا شوق اتنا تھا کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ ہمیشہ فوج کشی اور مہموں میں گرفتار تھا اور انتظامی کاروبار کا ہجوم تھا۔ سواری شکاری بھی برابر جاری تھی مگر وہ علم کا عاشق علم و حکمت کے مباحثوں اور کتابوں کے سننے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔ یہ شوق کسی خاص مذہب یا خاص فن میں محبوس نہ تھا۔ کل علوم اور کل فنون اس کے لیے یکساں تھے۔ ۲۰ برس تک دیوانی، فوجداری بلکہ سلطنت کے مقدمات بھی علمائے شریعت کے ہاتھ میں رہے۔ جب دیکھا کہ بے لیاقتی اور جاہلانہ، سینہ زوری ترقی سلطنت میں خلل انداز ہے تو آپ کو سنبھالا۔ اس عالم میں جو کچھ کرتا تھا امرائے تجربہ کار اور معاملہ فہم عالموں کی صلاح سے کرتا تھا۔ جب کوئی مہم پیش آتی یا اثنائے مہم میں کوئی نئی صورت واقع ہوتی یا کوئی انتظامی امر آئین سلطنت میں جاری یا ترمیم ہوتا تو پہلے امرائے دولت کو جمع کرتا۔ ہر شخص کی رائے کو بے روک سنتا اور سناتا اور اتفاق رائے صلاح واصلاح کے ساتھ عمل درآمد کرتا۔''[۱۵۴]

جس انداز سے مولانا محمد حسین آزاد نے اکبر کی شخصیت اور اس کے عہد کی تاریخ کا احاطہ کیا ہے اس سے ان کی شہنشاہ اکبر سے والہانہ محبت اور پسندیدگی مترشح ہے۔ مولانا آزاد کی انشاپردازی کی گلکاریاں یہاں بھی اپنی رنگینی عبارت اور مرقع کشی کے ساتھ دکھائی دیتی ہیں۔ ''دربار اکبری'' میں حسب سابق قصے کہانیوں، لطائف

کے ساتھ پندو نصائح کا انداز اختیار کرتے ہیں قصے اور کہانیاں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دانائی اور حکمت شناسی کے رموز سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ ''دربار اکبری'' میں مولانا محمد حسین آزاد کی شخصیت کا پرتو جابجا دکھائی دیتا ہے۔ اکثر مقامات پر براہ راست طرز تخاطب اختیار کرتے ہوئے قاری کو اپنے خیالات اور مافی الضمیر سے آگاہ کرتے ہیں مثلاً مذہبی رواداری کی بابت اپنے نقطۂ نظر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ اصلاحی رنگ صاف دیکھا جا سکتا ہے وہیں انگریزوں سے متاثر ہونے اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کا احساس بھی ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''مذہب کے معاملہ میں ایک میرا خیال ہے خدا جانے احباب کو پسند آئے نہ آئے ذرا خیال کر کے دیکھو، اسلام ایک، خدا ایک پیغمبر ایک، سنی شیعہ کا اختلاف ایک، منصب خلافت پر ہے۔ جس واقعہ کو آج کچھ کم ۱۳ سو برس گزر چکے ہیں۔۔۔ اس معاملہ کو اس قدر طول دینا کہ قوم میں ایک فساد عظیم کھڑا ہو جائے۔ چار آدمی بیٹھے ہوں تو صحبت کا مزہ جاتا رہے۔ کام چلتے ہوں تو بند ہو جائیں دوستیاں ہوں تو دشمنی ہو جائیں۔ قوم کی اتحادی قوت ٹوٹ کر چند در چند ٹکڑے پڑ جائیں۔۔۔ دنیا میں ایسے نافہم بے خبر بہت ہیں کہ بات تو نہیں سمجھتے مذہب کا نام آیا اور آپے سے باہر ہو گئے۔ بھلا دنیا کے معاملات میں مذہب کا کیا کام ہم سب ایک ہی منزل مقصود کے مسافر ہیں۔ اتفاقاً گزرگاہ دنیا میں یک جا ہو گئے ہیں۔ راستہ کا ساتھ ہے۔ بنا بنایا کارواں چلا جاتا ہے۔۔۔ ہمدردی سے کام بناتے چلو گے تو ہنستے کھیلتے رستہ کٹ جائے گا۔۔۔ مذہب کے معاملہ مین انگریزوں نے خوب قاعدہ رکھا ہے ان میں بھی دو فرقے ہیں اور ان میں سخت مخالفت ہے۔ پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک۔ دو دوست بلکہ دو بھائی بلکہ کبھی میاں بیوی کے مذہب بھی الگ الگ ہوتے ہیں وہ ایک گھر میں رہتے ہیں۔ ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ ہنسنا، بولنا، رہنا، سہنا سب ایک جگہ، مذہب کا ذکر بھی نہیں۔ اتوار کو اپنی اپنی کتابیں اٹھائیں ایک ہی بگھی میں سوار ہوئے باتیں چیتیں کرتے چلے۔ ایک کا گرجا رستے میں آیا وہاں اتر پڑا دوسرا بگھی میں بیٹھا اپنے گرجا کو چلا گیا۔۔۔ گھر پہونچے اس نے اپنی کتاب میز پر رکھ دی اس نے اپنی میز پر۔ پھر ہنسنا، بولنا کاروبار اس کا ذکر بھی نہیں کہ تم کہاں گئے تھے اور وہاں کیوں نہ گئے تھے جہاں ہم گئے تھے۔ آزاد! کہاں تھا اور کہاں آن پڑا۔ کجا ابوالفضل اور فیضی کا حال کجا سنی شیعہ کا جھگڑا''۔[۲۵۶]

''دربار اکبری'' میں محمد حسین آزاد ایک مورخ اور ایک سوانح نگار کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں لیکن تاریخ اور سوانح نگاری کے لیے جس سنجیدگی کی ضرورت ہے وہ مفقود نظر آتی ہے کیونکہ اکثر و بیشتر حالات و واقعات کے بیان میں ان کے جذبات غالب آجاتے ہیں۔ اس جذباتی انداز نے تاریخ و سوانح نگاری کے جوہر کو زک پہنچائی ہے۔ پھر مولانا آزاد مورخ سے زیادہ انشاء پرداز اور ادیب تھے اس لیے انھوں نے اپنے ادیبانہ مزاج

اور اسلوب سے تاریخ کو افسانہ اور ناول بنا دیا ہے۔اگر چہ اس میں اکبر کے عہد کے حالات و واقعات کا تذکرہ کیا ہے لیکن انداز بیان ایک مورخ جیسا نہیں انھوں نے حقائق اور تاریخ کے واقعات کو داستان کی مانند دلچسپ اور رنگین بنا دیا ہے۔''دربار اکبری'' اس لحاظ سے اہمیت کی حامل ہے کہ اس نے لاہور میں اُردو نثر میں تاریخ اور سوانح نگاری کی روایت کو پروان چڑھایا اور اسے وسعت سے ہمکنار کیا۔ اُردو نثر میں کچھ درسی کتب ایسی ہیں جن کا سن اشاعت قطعیت کے ساتھ نہیں ملتا لیکن اپنے موضوع کے اعتبار سے۱۸۶۵ء تا ۱۸۸۰ء کے زمانے کی شمار کی جاسکتی ہیں۔ان میں درج ذیل کتب کا حوالہ ملتا ہے۔

تاریخ انگلشیہ: محکمہ تعلیم پنجاب نے کالیز کی ''ہسٹری آف برٹش'' کا ترجمہ کرایا۔ Todhunter کی کتاب Statistics for Biginners کا اُردو ترجمہ پنجاب یونیورسٹی کالج لاہور کے لیے کیا گیا۔

علم نحو: آیا رام ۔بی۔اے کی تالیف کردہ ہے جو انجمن پنجاب پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

فوائد ضیا: یہ اُردو کی گرامر ہے جسے مولوی ضیاء الدین نے تحریر کیا ہے۔

رسالہ اصول برقی و مقناطیسی: لالہ رگھوناتھ داس نے یہ رسالہ پنجاب یونیورسٹی کالج کی طرف سے ترجمہ کیا۔

مختصر جغرافیہ کرہ ارض: حافظ عبد الرحمٰن کی تصنیف کردہ یہ کتاب بھی ایجوکیشن پریس لاہور سے شائع ہوئی ۔

واقعہ سکندر اعظم : یہ کتاب ایجوکیشنل پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

واقعہ راجہ رام چندر: یہ کتاب ایجوکیشنل پریس لاہور سے شائع ہوئی۔

گلشن علم اُردو: مولوی غلام حیدر نے تالیف کی اور قادری پریس لاہور سے طبع ہوئی۔

علم حرکت: پنجاب یونیورسٹی کالج نے ایس ایم مکرجی سے یہ کتاب لکھوائی ۔

ہندوستانی بات چیت: یہ کتاب میجر ہالرائڈ نے لکھی جو ایجوکیشنل پریس لاہور سے شائع ہوئی ۔

جغرافیہ ہند: لالہ سدا سکھ لال کا تحریر کردہ یہ جغرافیہ جو ایجوکیشنل پریس لاہور سے شائع ہوا۔

مذکورہ درسی کتب کے علاوہ مختلف علوم وفنون پر چھپنے والی مندرجہ ذیل علمی اور سائنسی کتابوں (جن میں سے بیشتر کی نوعیت درسی ہے) نے بھی لاہور میں اردو نثر کے ارتقا میں فعال کردار ادا کرتے ہوئے اسے موضوع اور اسلوب کے تنوع سے ہمکنار کیا:

ریاضی و شماریات:

۱۔ ''جبر ومقابلہ'' از مولوی محمد کریم بخش ،لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۱ء

۲۔ ''زبدۃ الحساب'' از منشی رجب علی، لاہور، مطبع کوہ نور، ۱۸۷۳ء

۳۔ ''نکات الحساب'' از درگاہ پرشاد، لاہور، مفید عام پریس، ۱۸۸۰ء

۴۔ ''حل جبر و مقابلہ'' از مولوی غلام مصطفیٰ، لاہور، مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۸۱ء

۵۔ ''حل علم مثلث'' از مولوی غلام مصطفیٰ، لاہور، مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۸۲ء

۶۔ ''تحریر اقلیدس'' از سی آر کک، لاہور، مفید عام پریس، ۱۸۸۹ء

۷۔ ''اقلیدس کی پہلی کتاب'' از منشی بھوشن مکرجی، لاہور، مفید عام پریس، ۱۸۹۷ء

۸۔ ''جبر و مقابلہ'' از کولک ناتھ چڑجی، لاہور، مفید عام پریس، ۱۹۰۰ء

۹۔ ''اقلیدس کی تیسری کتاب'' پنجاب محکمہ تعلیم، لاہور، مفید عام پریس، سن ندارد

علم کیمیا:

۱۔ ''کتاب علم الکیمیا'' از راسکو مترجم سید امیر شاہ، لاہور، مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۷۹ء

۲۔ ''علم کیمیا کا ابتدائی رسالہ'' از راسکو، مترجم، گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب، لاہور، رائے صاحب منشی گلاب سنگھ، سن ندارد۔

۳۔ ایضاً، ۱۸۹۶ء

طبیعات:

۱۔ ''اصول برقی مقناطیسی'' از لالہ رگناتھ، لاہور، مطبع پنجابی، ۱۸۷۴ء

۲۔ ''تدریبات علم طبعی'' از ڈاکٹر سید امیر شاہ، لاہور، کارپرداز مطبع انجمن لاہور، ۱۸۷۹ء

۳۔ ''علم حرکت'' از بابو ششی بھوشن، لاہور، مطبع انجمن لاہور، ۱۸۷۹ء

حیوانیات:

۱۔ ''زینت الخیل'' از منشی محمد مہدی، لاہور، مطبع کوہ نور، سن ندارد

۲۔ ''علم تشریح حیوانات خانگی'' از سید مہابت شاہ گیلانی، لاہور، انوار احمدی پریس، ۱۹۰۰ء

جغرافیہ و موسمیات:

۱۔ ''جام جہاں نما'' (تیسری جلد) محکمہ تعلیم پنجاب، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۱ء

۲۔ ''جغرافیہ ہند'' محکمہ تعلیم پنجاب، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۶ء

۳۔ ''جغرافیہ ہند'' محکمہ تعلیم پنجاب، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۸ء

۴۔ ''جغرافیہ طبعی'' ہالرائڈ مترجم گورنمنٹ بک ڈپو، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۹ء

۵۔ ''جغرافیہ طبعی'' از ہنری بلانفرڈ، لاہور، گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب، ۱۸۷۹ء

۶۔ ''جغرافیہ پٹیالہ'' از گنیش لعل، لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۱ء

۷۔ ''جغرافیہ پنجاب'' لاہور، سرکاری پریس، ۱۸۸۲ء

۸۔ ''مختصر جغرافیہ عالم'' از ایچ بلوک مین مترجم محمد الدین، لاہور، مفید عام پریس، ۱۸۸۳ء

۹۔ ''مختصر جغرافیہ عالم'' از ایچ بلوک مین، لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۳ء

۱۰۔ ''مختصر جغرافیہ عالم'' گلاب سنگھ، لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۳ء

۱۱۔ ''مفید عام جغرافیہ پنجاب'' لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۴ء

۱۲۔ ''خلاصہ جغرافیہ طبعی'' مترجم سریش چندر، لاہور، مفید عام پریس، ۱۸۸۶ء

۱۳۔ ''مفتاح الارض'' گلاب سنگھ، لاہور، مفید عام پریس، ۱۸۸۶ء

۱۴۔ ''جغرافیہ ہند'' لاہور، گوبند پرکاش، ۱۸۸۶ء

۱۵۔ ''رسالہ انواع حقیقت'' مترجم جیا رام، لاہور، مفید عام پریس، ۱۸۸۶ء

۱۶۔ ''جغرافیہ، امرتسر کے ضلع کا جغرافیہ'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۸۶ء

۱۷۔ ''جغرافیہ پنجاب'' گلاب سنگھ، لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۶ء

۱۸۔ ''مختصر جغرافیہ پنجاب'' گلاب سنگھ، لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۷ء

۱۹۔ ''اردو فسٹ جاگرفی'' مترجم گلاب سنگھ، مطبع مفید عام، ۱۸۸۷ء

۲۰۔ ''مختصر جغرافیہ ہند'' گلاب سنگھ، لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۷ء

۲۱۔ ''امیر الجغرافیہ'' از منشی امیر چند، لاہور، اسلامیہ پریس، ۱۸۸۹ء

ارضیات:

۱۔ ''مبادی علم جیولوجی'' از مولانا الطاف حسین حالی، لاہور، ۱۸۸۳ء

نفسیات:

۱۔ ''رسالہ علم النفس و القویٰ'' از انعام علی، لاہور، مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۸۵ء

طب:

۱۔ ''امراض الصبیان'' از رحیم خان، لاہور، مطبع محمدی، ۱۸۶۷ء

۲۔ ''رسالہ چند امراض مواشی ہند'' از رحیم خان لاہور، مطبع کوہ نور، ۱۸۷۱ء

۳۔ ''طب شتران'' از سردار شاہ گیلانی، لاہور، احمد پریس، ۱۸۹۹ء

۴۔ ''رسالہ ہائی جین یعنی قواعد حفظان صحت'' از برج لعل گھوس، لاہور، کریم بخش، ۱۹۰۰ء

سیاسیات:

۱۔ ''آپ بیتی مہاتما گاندھی'' مترجم حامد قریشی، لاہور، کتابستان اردو، ۱۹۰۰ء

۲۔ ''خراج اسلام'' از مرتضی احمد خان، لاہور، تاج کمپنی، ۱۹۰۰ء

صنعت و حرفت:

۱۔ ''فیشن پوڈر، فیشن کریم'' کریم بخش شاہ ولی تاجران کتب، لاہور، ۱۹۰۰ء

تعلیمات:

۱۔ ''اشارات التعلیم'' از الیگزینڈر، مترجم مولوی کریم الدین، لاہور، مطبع مطلع نور، ۱۸۶۶ء

۲۔ رپورٹ کالج علوم مشرقی، لاہور، لاہور کالج علوم مشرقی، ۱۸۷۸ء

۳۔ ''اردو خط و کتابت کی پہلی کتاب'' لاہور، رفاہ عام سٹیم پریس، ۱۸۹۹ء

فلسفہ و منطق:

۱۔ ''منطق استخراجی'' از رے، مترجم علی گوہر، لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۸۹۹ء

۲۔ ''رسالہ منطق استقرائی'' محمد حسین، لاہور، مطبع انجمن پنجاب، سن ندارد۔[۱۵۷]

تعلیمی، نصابی اور درسی ضروریات کے لیے یہ جو کتابیں شائع ہوئیں انہوں نے اردو نثر کے لیے ایک نئی راہ ہموار کی۔ محکمہ تعلیم کے انگریز افسران نے مقامی مصنفین کی حوصلہ افزائی کی ان سے کتابیں لکھوائیں اور اپنے ماہرین تعلیم کو موقع فراہم کیا کہ وہ اس کام میں مقامی ادبا کا ہاتھ بٹائیں۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی میں اس طرز کی بیشتر کتابیں جو محکمہ نے شائع کیں محکمہ تعلیم کے کسی نہ کسی انگریز افسر کے اشتراک عمل سے وجود میں آئیں یا پھر اس کی ''فرمائش'' ''حکم'' اور ''ایماء'' پر لکھی گئیں۔ محکمہ تعلیم کی ترغیب اور تحریک پر وجود میں آنے والی ان درسی کتب کا مقصد طلباء کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کرنا تھا۔ جس میں انہیں زبان، تاریخ اور معاشرت کی تعلیم دی گئی۔ اس کے ساتھ ایسی کتابیں بھی تصنیف و تالیف کی گئیں جن کے ذریعے مختلف علوم و فنون کی تعلیم دی گئی۔ انہی درسی کتابوں نے قصے کہانیوں کی صورت میں تفریح طبع کا سامان بھی فراہم کیا۔ ایک بات جو تمام درسی کتابوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ ہے کہ نئی نسل کی ذہنی، فکری اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا پہلو نمایاں ہے۔

ب) پنجاب بک ڈپو:

میجر فلر کے عہد نظامت اور کیپٹن ہالرائیڈ نے بحیثیت ناظر مدارس مختلف موضوعات پر انگریزی، عربی اور فارسی سے اردو ترجمہ کے لیے ۱۸۵۷ء کے اوائل میں لاہور میں بک اینڈ ٹرانسلیشن ڈیپارٹمنٹ قائم کیا۔ جو پنجاب بک ڈپو کہلایا۔ جس میں جملہ سرکاری مطبوعات کی طباعت بھی کی جاتی تھی۔ یہاں ہونے والے تراجم کی زبان کی درستی کے لیے سررشتہ تعلیم کے ناظمین کو ایسے فاضل اہل زبان کی ضرورت پڑی جو یہ فریضہ بخوبی انجام دے سکیں۔ اس مقصد کو پورا کرنے کی غرض سے یو پی سے مولوی کریم الدین ، پیارے لال آشوب، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، منشی درگا پرشاد نادر، مولوی سید احمد دہلوی، مولوی امو جان ولی، مرزا اشرف بیگ خان اشرف، مرزا ارشد بیگ گورگانی، مولوی احسان علی، مولوی محمد سعید، پنڈت موتی لال، ماسٹر چندولال، خواجہ ضیاء الدین، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد یوسف، مرزا بیگ خان دہلوی، وغیرہ کو اس کام کے لیے لاہور لایا گیا۔ جن میں سے بیشتر کا تعلق دہلی کالج سے تھا۔ جہاں علمی تراجم کے لیے ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام جدید اردو نثر کی داغ بیل پڑ چکی تھی۔ دلی کالج نے اپنی مطبوعات، تراجم، تصانیف اور رسائل کی بدولت اس دور کے نوجوانوں پر مغربی علوم کے در کھول دیئے تھے۔ لہذا دلی کالج سے تعلق رکھنے والے ان اصحاب نے لاہور آ کر فکرو احساس میں زبردست انقلاب پیدا کیا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب کو پنجاب بک ڈپو کا کیوریٹر مقرر کیا گیا۔ مذکورہ بالا اہل علم احباب میں سے کچھ ترجمہ کرنے پر مامور تھے اور بعض ترجمہ شدہ کتابوں کی اردو عبارت کو روزمرہ اور محاورہ کے مطابق درست کیا کرتے تھے۔ یہاں ہونے والے تراجم سے یقیناً اردو نثر کو بہت فائدہ ہوا ہو گا کیونکہ دلی کے ان اہل زبان حضرات نے لاہور میں ان تراجم کی صورت میں اردو نثر کی نوک پلک کو سوارنے کا فریضہ انجام دیا۔ یوں لاہور میں اردو نثر نے ترقی کی ایک اور منزل طے کی۔ جو اس کے ارتقا میں کارگر ثابت ہوئی۔ ماسٹر درگا پرشاد اپنی تالیف ''گلدستہ نادر الاذکار'' میں لکھتے ہیں:

> ''سبحان اللہ جل شانہ، آج کل حکام کی قدر دانی سے زبان اردو بہ سر معراج ہے اس زبان میں تصنیف وتالیف کا وہ سلسلہ جاری ہوا ہے کہ جس کا مافوق ہونا معلوم بلکہ اس کی نظر کتب سابقہ میں بھی معدوم ظاہر ہے کہ پنجاب کے سررشتہ تعلیم میں چند فاضل خاص اسی کام پر ممتاز ہیں کہ عمدہ عمدہ مضامین انگریزی سے اردو ترجمہ کریں۔''[۴۵۸]

پنجاب بک ڈپو میں چونکہ علمی اور درسی کتب کی تیاری بذریعہ تراجم اور ان کی عبارت کو درست کرنے کا کام کروایا جاتا تھا اس حوالے سے ایک انگریزی کی گرائمر کا سراغ ملتا ہے جو ہالرائیڈ کی تصنیف کردہ ہے اور اس

کے اردو سرورق کی عبارت اس طرح ہے:

> ''ترمیم شدہ انگریزی کی پہلی کتاب
> جسے کرنل ہالرائڈ صاحب بہادر ڈی او ایل
> سابق ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب نے مبتدیوں کے فائدے کے لیے تصنیف کیا۔
> رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز لاہور ۱۸۷۰ء، وقعہ ۱''۔۵۹؎

اس کتاب میں انگریزی زبان میں پیش لفظ تحریر کیا گیا ہے جس میں ہالرائیڈ نے ان اصحاب کا ذکر کیا ہے جن سے اس کتاب کے اردو حصہ کو درست کروایا گیا۔ انگریزی عبارت کا ترجمہ اس طرح ہے:

> ''میں مولوی سید احمد صاحب کا جو ایک قابل مشرقی عالم ہیں بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کے دوسرے حصہ کی اردو عبارت کا بغور مطالعہ کیا اور بے شمار ترامیم سے نوازا۔ میں مولوی احسان علی صاحب جو کہ قابل عالم ہیں کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میری اس طرح کی مدد کی جب میں کتاب کا پہلا حصہ لکھ رہا تھا۔''۶۰؎

چونکہ مولوی سید احمد دہلوی کا ذکر کیا جا رہا ہے جو پنجاب بک ڈپو میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر تھے اس لیے گمان گذرتا ہے کہ اس کتاب کی درستی بھی پنجاب بک ڈپو میں عمل میں آئی ہو گی۔ نیز اس سے پنجاب بک ڈپو میں کام کرنے والے ایک اور صاحب علم احسان علی کے نام کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مقالہ نگار کا گمان ہے کہ وہ مقامی صاحبان جو انگریزی زبان پر عبور رکھتے ہوں گے وہ پنجاب بک ڈپو سے کسی نہ کسی طور منسلک رہے ہوں گے کیونکہ یہ اصحاب ایسے ہیں جنھیں انگریز سرکار اور بالخصوص سررشتہ تعلیم میں بھی اہمیت حاصل تھی۔ ان میں پنڈت اجودھیا پرشاد، پنڈت سورج بھان، خواجہ ضیاء الدین، منشی حسین اور پنڈت موتی لال وغیرہ کا ذکر اس حوالے سے کرنا بے جا نہ ہو گا۔ انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے کے لیے جو طریقہ کار اپنایا گیا اس کا جائزہ لیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ اردو نثر کو رواں اور سلیس بنانے کیلیے کس قدر ر مانجھا اور کتنی محنت سے اسے نکھارا گیا ہے کہ اپنی نکھری ہوئی صورت میں یہ علمی، ادبی، تاریخی، جغرافیائی، سائنسی، تحقیقی، تنقیدی ہر طرح کے موضوعات کو اس کے مناسب حال اسلوب بیان میں ادا کرنے کے قابل ہوئی پنجاب بک ڈپو کے تحت ہونے والے تراجم کے طریقہ کار کو سید احمد دہلوی ا سطرح بیان کرتے ہیں:

> ''کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کرنل ہالرائیڈ صاحب بہادر نے اپنے سررشتہ کی کتابوں کا ترجمہ کس طریقہ سے ٹھیٹ اردو میں کرایا۔ اگر نہیں معلوم تو ہم سے سن لیجیے ہم بھی یہ کام بک ڈپو کے نائب

مترجم رہ کر کر چکے ہیں وہ اول تو انگریزی دانوں سے جس کتاب کا ترجمہ مقصود ہوتا کراتے جب وہ کر چکتے تو ایسے دہلوی اہل زبان کو دیتے جو مطلق انگریزی نہیں جانتے اور فرماتے کہ اس کو اپنی بول چال کے موافق بنا دو۔ انگریزی سے اکثر ترجمے رائے بہادر ماسٹر پیارے لال صاحب یا ماسٹر چندو لال صاحب یا مولوی محمد یوسف مرحوم کیا کرتے ان کی نظر ثانی کبھی مولانا آزاد، کبھی خواجہ ضیاء الدین صاحب مرحوم کبھی خواجہ الطاف حسین حالی مدظلہ العالی کبھی مولوی مرزا اشرف بیگ خان، کبھی مولوی محمد سعید صاحب کبھی بندہ سید احمد کبھی مرزا ارشد گورگانی، کبھی سیف الحق ادیب، کبھی مرزا بیگ خان دہلوی وغیرہ کیا کرتے تھے۔"[۲۶۱]

سید احمد دہلوی کے اس بیان اور ان کی کتاب "محاکمہ مرکز اردو" سے پنجاب بک ڈپو میں ترجمہ اور زبان کی درستی کے طریقہ کار اور مترجمین کی بابت تو ذکر ملتا ہے لیکن ترجمہ شدہ کتب کا تذکرہ کہیں نہیں کیا گیا۔ مذکورہ احباب میں سے چند ایک پر ہونے والے تحقیقی وتنقیدی مقالات اور تاریخ کی کتابوں میں آنے والے حوالوں سے بھی اس بارے میں کوئی وضاحت یا براہ راست معلومات نہیں ملتیں۔ یہ بات اب تک تاریکی میں ہے کہ پنجاب بک ڈپو نے کون سی اور کس قسم کی کتابوں کا ترجمہ کرایا کیونکہ پنجاب بک ڈپو کا ذخیرہ کتب محفوظ نہیں ہے اور نہ ہی اس سے متعلق واضح معلومات دستیاب ہو پائی ہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ کون سے تراجم تھے جو یہاں کیے گئے اور ان کی زبان کی درستی واصلاح عمل میں لائی گئی۔

مقالہ نگار کو تحقیق وجستجو سے اس ضمن میں صرف چند ایک تراجم ہی سے متعلق معلومات دستیاب ہو پائی ہیں۔ جن سے احساس ہوتا ہے کہ پنجاب بک ڈپو میں علمی اور تاریخی کتب کے تراجم کیے جاتے تھے اور ان تراجم کے ذریعے مدارس کے طلباء کے لیے کتب فراہم کی جاتیں۔ مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پنجاب بک ڈپو میں انگریزی سے اردو تراجم کے علاوہ دیگر زبانوں مثلاً عربی، فارسی سے بھی تراجم کیے جاتے تھے۔

پنجاب بک ڈپو میں کیے جانے تراجم میں "مخزن الطبیعات" (۱۸۶۵ء) از مولوی ضیاء الدین، "مبادی علم جیولوجی" (۱۸۷۲ء) از مولانا الطاف حسین حالی، ماسٹر پیارے لال آشوب کی "تاریخ انگلستان کلاں (۱۸۷۲ء) اور تاریخ جلسہ قیصری (۱۸۸۳ء)، مولوی کریم الدین کی زبدۃ الحساب (۱۸۷۹ء) اور "جغرافیہ پنجاب" (۱۸۷۹ء)، لائٹنر کی "دردستان (۱۸۷۷ء) کے نام لیے جاتے ہیں۔

مزید برآں ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتبہ کتاب "اردو میں سائنسی اور علمی کتابیں" سے علم کیمیا پر ایک کتاب "علم کیمیا کا ابتدائی رسالہ راسکو، مترجم گورنمنٹ بک ڈپو، پنجاب، لاہور" کا حوالہ ملتا ہے جس پر مترجم کا نام اور سن

ندارد ہے۔ راسکو کی غالباً اسی کتاب کا ترجمہ سید امیر شاہ نے ''کتاب علم الکیمیا'' کے عنوان سے کیا جو مطبع انجمن پنجاب سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ راسکو کی علم کیمیا کا ابتدائی رسالہ کا ترجمہ ۱۸۷۹ء یا اس سے قبل ہوا ہو گا۔ جبکہ مترجم کے نام معلوم نہیں ہو سکا۔ عین ممکن ہے کہ اس موضوع پر لکھنے والے سید امیر شاہ ہی ہوں۔ جغرافیہ اور موسمیات کے موضوع پر دو کتب جن میں سے ایک میجر ہالرائیڈ کی ہے اس کا تذکرہ بھی بغیر مترجم کے نام سے کیا گیا ہے۔ پہلی کتاب ''جغرافیہ طبعی'' ہالرائیڈ مترجم گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب، لاہور جو سرکاری مطبع سے ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی جبکہ دوسری ''جغرافیہ طبعی'' ہنری بلانفرڈ، مترجم، لاہور، گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب لاہور ۱۸۷۹ء'' کا حوالہ ملتا ہے۔ ان کتب کے حوالوں سے ایک بات ضرور سامنے آتی ہے کہ پنجاب بک ڈپو میں ترجمہ شدہ کتابوں پر اصل مصنف کا نام تو درج ہوتا تھا لیکن مترجم کا نام تحریر نہیں کیا جاتا تھا۔ پنجاب بک ڈپو میں ہونے والے تراجم کی نوعیت کا اندازہ اکمل الاخبار، دہلی ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء میں شائع ہونے والے اس اشتہار سے بھی ہوتا ہے۔

> ''اشتہار ایک کتاب مصنفہ جناب میجر ہالرائڈ صاحب بہادر ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب جس کے نام کا ترجمہ وتحریر وتقریر انگریزی ہوتا ہے عنقریب گورنمنٹ بک ڈپو پنجاب یعنی کتب خانہ سرکاری لاہور کی طرف سے شائع ہو گی۔ اس کتاب میں زبان انگریزی کو حاصل کرنے اور اس کے الفاظ کا صحیح صحیح تلفظ جاننے کے لیے ایک نئی اور آسان ترکیب بتائی گئی ہے۔ طبع اول میں اردو بحروف نستعلیق اور انگریزی ہو گی اور آئندہ انگریزی اور زبانوں کے ساتھ بھی چھاپی جائے گی اس کتاب کا پہلا حصہ چھپ رہا ہے۔
>
> تحریر ۱۸ اپریل ۱۸۷۴ء
>
> پیارے لال قائم مقام کیوریٹر سنٹرل بک ڈپو پنجاب''۔[۲۶۲]

مقالات اور خطبات گارساں دتاسی سے بھی پنجاب بک ڈپو کے تحت ہونے والے تراجم کی بابت براہ راست کوئی ذکر نہیں ملا۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ گارساں دتاسی نے اپنے مقالہ ۱۸۷۶ء میں لاہور سے جن انگریزی کتب کے تراجم کی اشاعت کے اعلان کا حوالہ دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ تراجم کہاں سے کرانے کا اعلان ہوا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تراجم پنجاب بک ڈپو میں ہوئے ہوں کیونکہ بیشتر ایسی ہی کتب کے تراجم کیے جاتے تھے۔ ان انگریزی کتب کے نام یہ ہیں:

"Brain's Mental Science

Fowle Logics

Taylor's Ancient History

Huxley's Physiology"[۲۶۳]

پھر ''مقالات گارساں دتاسی ''(جلد اول) کی وساطت مرزا اشرف بیگ خان اشرف کی بابت چند معلومات ملتی ہیں جو دتاسی نے ''پنجابی اخبار'' لاہور شمارہ ۲ مئی ۱۸۷۳ء سے لی ہیں۔ مرزا اشرف بیگ خان اشرف کا ذکر کرتے ہوئے ان کی جن کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اغلب ہے کہ وہ پنجاب بک ڈپو ہی کی خدمت کا نتیجہ ہوں۔ گارساں دتاسی لکھتے ہیں:

''اشرف علی اشرف (سید عبدالفتاح) کا جو اس زمانے کے مشہور ترین شعراء میں شمار ہوتے ہیں اور اپنی مادری زبان ہندوستانی کے علاوہ عربی، فارسی، اور انگریزی میں مہارت کامل رکھتے ہیں ان کی (اشرف علی اشرف) کی تصانیف کی تعداد انیس بتائی جاتی ہے اور سب کی سب سر رشتہ تعلیمات بمبئی نے مدرسوں کے درس میں شامل کی ہیں، میں صرف ان کتابوں کا ذکر کروں گا جو اردو میں لکھی گئی ہیں ''مخزینہ دانش'' پانچ جلدوں میں ''کلید دانش'' ''تائید الحق''، ''تحفہ محمدیہ''، ''صد حکایات'' ''خلاصہ علم جغرافیہ'' ''تاریخ افغانستان'' ''تاریخ انگلستان'' اور ایک قواعد انگریزی موسوم بہ رسالہ تعلیم السان فی لغات انگلستان''۔۔۔اشرف الانشاء تصنیف کی۔ جن کا شمار بہترین کتابوں میں ہوتا ہے اور جس میں انھوں نے اپنے تخلص کی رعایت رکھی ہے۔ یہ کتاب محض خطوط نویسی کے آئین سکھانے تک محدود نہیں ہے جیسا کہ اس قسم کے نام کی اکثر کتابوں کا حال ہے بلکہ نظم و نثر ہر دور کے فن تحریر پر ایک جامع کتاب ہے جس میں عروض اور بلاغت دونوں پر جامع بحث کی گئی ہے۔ اس کے بعد ''اشرف اللغات'' شائع کی جو ہندوستانی، فارسی، عربی اور انگریزی کی لغت ہے۔''[۲۶۴]

مقالہ نگار کا قیاس ہے کہ ''خلاصہ علم جغرافیہ'' ''تاریخ انگلستان'' قواعد انگریزی موسوم بہ رسالہ تعلیم السان فی لغات انگلستان'' اور ''اشرف اللغات'' پنجاب بک ڈپو ہی کی مرہون منت وجود میں آئی ہوں گی۔

چونکہ پنجاب بک ڈپو کے حوالے سے خاطر خواہ معلومات دستیاب نہیں ہو پائیں اس لیے مقالہ نگار نے اپنے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کی بناء پر ایسی کتب کا ذکر کیا ہے جن کے بارے میں گمان گذرتا ہے کہ ان کا تعلق پنجاب بک ڈپو سے ہو سکتا ہے۔ ایسی ہی ایک کتاب ''طلسم فرہنگ'' یعنی سحر جلدل ہے جو دراصل ڈاکٹر گریگری کا انگریزی ناول ہے جسے پنڈت موتی لال دہلوی نے ترجمہ کیا۔ پنڈت موتی لال جو دہلی کالج کے تعلیم یافتہ اور انگریزی فارسی اور اردو زبان میں مہارت رکھتے تھے ۱۸۵۰ء میں بورڈ آف ایڈمنسٹریشن لاہور کے فارسی مترجم مقرر ہوئے اور کئی سال پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی رہے اپنی قابلیت کی بناء پر انہیں انگریز سرکار میں وقعت اور اختیار حاصل تھا۔ زمانہ طالبعلمی سے ہی علمی ذوق و شوق رکھتے تھے۔ پنڈت موتی لال کا انگریزی میں قابلیت رکھنا اور علمی

و ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ پنجاب بک ڈپو سے بھی کسی نہ کسی سطح پر متعلق رہے ہوں گے۔ کیونکہ پنجاب بک ڈپو کو دو طرح کے لوگوں کی ضرورت تھی ایک وہ جو انگریزی سے اردو ترجمہ کریں اور دوسرے وہ جو ترجمہ شدہ کتابوں پر زبان کے حوالے سے نظر ثانی کریں اور پنڈت موتی لال اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں قابلیت رکھتے تھے۔ اسی لیے سررشتہ تعلیم سے بھی ان کی وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔۲۶۵؎ انگریزی سے اردو تراجم کے حوالے سے ان کی دلچسپی زمانہ طالبعلمی ہی سے تھی۔ اس حوالے سے مولوی عبدالحق کی کتاب ''مرحوم دہلی کالج'' سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پلوٹارک کے تذکرہ کا اردو ترجمہ کرنے کے علاوہ دو کتابیں سمریزم کے موضوع پر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں۔۲۶۶؎ مقالہ نگار کو عظیم الشان صدیقی کی کتاب ''اردو ناول کا ارتقا'' کے توسط سے معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے گریکری کے ناول کا ترجمہ ''طلسم فرہنگ'' کے نام سے کیا جو دوسری مرتبہ ۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس ناول میں خط کی تکنیک کو برتا گیا۔ جس کی تقلید مولانا محمد حسین آزاد کے ناول ''نصیحت کا کرن پھول'' (۱۸۶۸ء) میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جو پنجاب بک ڈپو میں انگریزی سے ترجمہ شدہ اردو کتب پر نظر ثانی کیا کرتے تھے۔ اسی لیے قیاس ہے کہ ترجمہ شدہ ناول ۱۸۶۴ء سے قبل سے شائع ہوا ہوگا۔ مزید برآں اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ پنڈت موتی لال جس قسم کا علمی و ادبی مشغلہ رکھتے تھے انہوں نے ناول کا ترجمہ پنجاب بک ڈپو کے تحت کیا ہو اور کی زبان کی درستی مولانا آزاد کے ہاتھوں پنجاب بک ڈپو میں ہوئی ہو یا ان کی نظر گذری ہو اور وہ ناول کی تکنیک سے متاثر ہوئے ہوں۔ تبھی انہوں نے اپنے ناول ''نصیحت کا کرن پھول'' میں خطوط کی تکنیک استعمال کی۔ علی ہذا القیاس ان وجوہات کی بناء پر پنڈت موتی لال کے ترجمہ شدہ ناول ''طلسم فرہنگ'' کو پنجاب بک ڈپو کے تحت ہونے والے تراجم میں شمار کیا گیا ہے۔

پنجاب بک ڈپو نے ماسٹر پیارے لال آشوب کی کیوریٹری میں فعال کردار ادا کیا۔ آشوب جو خود ترجمہ کے اسرار و رموز سے بخوبی آگاہ تھے۔ پنجاب بک ڈپو کے کیوریٹر کے عہدے کے لیے موزوں انتخاب تھے کیونکہ آشوب اس عہد کے بہت بڑے انگریزی دان بھی تھے۔ دلی کالج میں ان کا خاص مضمون انگریزی تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب نہ صرف انگریزی زبان بخوبی جانتے تھے بلکہ گوڑ گاؤں میں ہیڈ ماسٹر کی ملازمت کے دوران طلباء کی نفسیات سے بھی واقف تھے۔ چنانچہ انگریزی سے اردو تراجم کے اس قدیم طریقہ کی اصلاح کی جو عام طور پر انگریزی سکولوں میں رائج تھا۔ جس میں ان تراجم سے طلباء کو بہت کم فائدہ پہنچتا اور وہ عموماً فقروں کا مطلب سمجھنے سے قاصر رہتے تھے۔ لہٰذا اس کے لیے تراجم کو بامحاورہ کرنے کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ مگر اس میں بھی طلبہ کو لفظوں اور محاوروں کے الگ الگ معنی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ یہ دونوں نقائص آشوب کے پیش نظر تھے۔ یہی وجہ

ہے کہ انہوں نے ترجمے کا ایک نیا قاعدہ ایجاد کیا جس سے اردو نثر کا بہت بھلا ہوا۔ یہ نیا قاعدہ کیا تھا۔ جسے انگریز حکومت اور سر رشتہ تعلیم نے سراہا۔ خود آشوب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

> میں نے ترجمے کا وہ طریقہ اختیار کیا جس کو ھملیونیم سسٹم کہتے ہیں اس طرح ترجمہ کرنے سے طلبہ کو بامحاورہ ترجمہ کرنا بھی آ جاتا ہے اور کوئی انگریزی لفظ یا محاورہ ایسا نہیں رہ جاتا جس کو لڑکے سمجھ نہ سکیں۔ یہ طریقہ افسران سر رشتہ تعلیم کو بہت پسند آیا تو میں نے انگریزی کی پہلی کتاب کا ترجمہ اس طریق پر کر کے طبع کرایا اور افسران سررشتہ تعلیم نے اس کی قدر دانی اور میری عزت افزائی کی اور اس کے صلے میں گورنمنٹ عالیہ سے مجھے انعام بھی عطا ہوا۔''۲۶۷

ماسٹر پیارے لال آشوب کے تراجم کی قدر افزائی ہی تھی کہ ڈائریکٹر تعلیمات نے انہیں ''سرکاری اخبار'' کا ایڈیٹر بھی مقرر کیا۔ اس اخبار کے لیے نہایت فاضل انگریز مضامین لکھا کرتے تھے جو طلباء کے لیے بے حد مفید اور معلومات افزا ہوتے۔ آشوب ان کا اردو ترجمہ کر کے اخبار میں شائع کر دیتے۔ علاوہ ازیں پنجاب ہائیکورٹ کی دستاویزات کے تراجم کرنے کے لیے ہیڈ مترجم کے عہدے پر بھی مامور رہے۔ علمی اور تعلیمی امور سے دلچسپی اور ان پر توجہ کی غرض سے ہیڈ مترجمی کے عہدے سے علیحدگی اختیار کر لی اور پنجاب بک ڈپو کے کیوریٹر کے فرائض انجام دیتے رہے۔

امداد صابری کے مطابق ۱۸۶۹ء میں ماسٹر صاحب پنجاب بک ڈپو میں ملازم ہوئے۲۶۸ تو اپنے دوستوں کو دہلی سے وہیں کھینچ لیا۔ مولانا الطاف حسین حالی، مرزا اشرف بیگ خان اشرف، مولانا اموجان ولی، منشی درگا پرشاد نادر، مولوی سید احمد صاحب، مولف فرہنگ آصفیہ، مرزا ارشد گورگانوی کو بک ڈپو میں ملازمت دلوانے کا باعث ماسٹر صاحب ہی تھے۔ پیارے لال آشوب، مولوی کریم الدین، الطاف حسین حالی، خواجہ ضیاء الدین خان، مرزا اشرف بیگ خان اشرف اور موتی لال کی چند ایک تصانیف کا سراغ ملتا ہے لیکن منشی درگاہ پرشاد نادر، مولوی سید احمد دین، مولوی امو جان ولی، مرزا ارشد بیگ گورگانی، ماسٹر چندولال، مولوی سیف الحق ادیب، مولوی محمد یوسف، مرزا بیگ خان دہلوی وغیرہ کی ترجمہ کردہ کتب فی الحال پردہ اخفا میں ہیں۔ باوجود کوشش کہ ان کی کسی کتاب کی نشاندہی نہیں ہو سکی۔ البتہ ۱۹ اپریل ۱۸۷۴ء کے پنجاب گزٹ سے ایک فہرست کتب۲۶۹ (انگریزی، عربی، فارسی سے ترجمہ) دستیاب ہوئی ہے جو پیارے لال آشوب کیوریٹر پنجاب بک ڈپو کے زیر اہتمام گورنمنٹ سنٹرل بک ڈپو سے شائع ہوئیں۔ اغلب ہے کہ فہرست میں شامل کتب پنجاب بک ڈپو کی خدمات کا نتیجہ ہیں۔ یہ پنجاب بک ڈپو ہی تھا جس کے زیر اثر بہت سے ادیبوں کے ذہن و فکر کو جلا ملی اور انگریزی ادب سے شناسائی بھی ہوئی مثلاً مولانا الطاف حسین حالی پنجاب بک ڈپو لاہور میں اپنے چار سالہ قیام کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک آسامی مجھ کو مل گئی جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اردو میں ہوتے تھے ان کی عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہوگئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی۔"[۴۷]

قیام لاہور کے زمانہ میں حالی پنجاب بک ڈپو سے منسلک ہو کر ہی انگریزی ادب وتنقید سے ان ترجموں کے ذریعے واقف ہوئے جن کی عبارتوں کی اصلاح ان کے سپرد تھی۔ نتیجتاً لاہور کے اس علمی و ادبی ماحول نے حالی کے تنقیدی شعور اور فکر کو وسعت دی۔ جو بعد ازاں مقدمہ شعروشاعری (۱۸۹۳ء) کی صورت میں ظہور پذیر ہوئی۔ پھر محمد حسین آزاد نے بھی انگریزی زبان و ادب سے واقفیت پنجاب بک ڈپو میں ہی حاصل کی۔ انگریزی سے متاثر ہو کر اپنے جدید خیالات کا اظہار انجمن کے لیکچرز اور "نیرنگ خیال" میں واضح طور پر کیا ہے جو سررشتہ تعلیم کے علاوہ پنجاب بک ڈپو سے منسلک ہونے کا نتیجہ ہیں۔

انگریزوں کی لاہور آمد اور پنجاب بک ڈپو کے قیام سے اردو نثر پر انگریزی زبان کے اثرات بھی مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جس کا باقاعدہ آغاز دو سطح پر ہوا۔ پہلا پنجاب بک ڈپو کے تراجم کے ذریعے ہوا کیونکہ پنجاب بک ڈپو کے قیام کی بدولت جہاں اردو نثر براہ راست انگریزی سے متاثر ہوئی وہیں اس میں ذخیرہ الفاظ وتراکیب اور انداز بیان میں بھی وسعت آئی۔ ہر چند کہ پنجاب بک ڈپو سے ترجمہ شدہ کتب سے متعلق بالواسطہ محدود معلومات ملتی ہیں لیکن جن کتب کا سراغ ملتا ہے ان میں انگریزی الفاظ وتراکیب استعمال ہو کر اردو زبان کا حصہ بنے۔ یہ اثرات پنجاب بک ڈپو سے منسلک تمام اصحاب کی دیگر تحریروں میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا مقالہ نگار کا اغلب خیال ہے کہ لاہور میں اردو نثر انگریزی زبان سے پہلے پہل اسی پنجاب بک ڈپو میں شناسا ہوئی۔ جہاں اول بار انگریزی زبان کے مزاج و اسلوب کو سمجھا گیا ہوگا اور انگریزی سے مختلف موضوعات کے اردو نثری تراجم نے نئے اسالیب کا راستہ دکھایا ہوگا۔ اس حوالے سے دوسری سطح پر اخبارات کی اشاعت اور ترسیل نے انگریزی خیالات اور زبان کو پھیلانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ چنانچہ ٹکٹ، اسٹامپ، بیرنگ، پریذیڈنٹ، پنشن، اپیل، مجسٹریٹ، ووٹ، بیلٹ، کلکٹر، ڈپٹی کلکٹر، پارلیمنٹ، گزٹ، وارنٹ، جج، ہائیکورٹ، کمپنی، ڈائریکٹر، ممبر، بل، ایڈیٹر، نوٹ، کالم، پریس، لیتھو، ریل، اسٹیشن، ٹکٹ کلکٹر، سگنل انجن، سوشل، پولیٹیکل، اسپیچ، اسٹیج، سیکرٹری، کالج، کمیٹی، پلیٹ فارم، اسکول، کونسل، بورڈ، ٹرسٹی جیسے بے شمار الفاظ اردو زبان کا حصہ بن کر اردو نثر کے نئے اسلوب کو وضع کر رہے تھے۔ اس سے دو طرح کی اردو زبان وجود میں آئی جس کا اثر اردو نثر پر بھی پڑا۔

> ''ایک دیسی اردو ہے اور دوسری وہ اردو ہے جو انگریزی اثر سے پیدا ہوئی ہے۔ دیسی اردو کو ہندوستان کے شہروں کے باشندے اور شرفاء و امراء بولتے ہیں یہ دیسی اردو نہایت صاف ستھری، سادہ اور ایسی فطری ہے کہ مطالب ادا کرنے کے لیے بہت سے لفظوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن انگریزی اثر سے جو اردو نکلی ہے وہ عجیب وغریب ہے اور زمانہ حال کی پیداوار ہے۔۔۔ یہ زبان سرکاری قواعد وضوابط اور احکام کا ترجمہ کرنے اور اخبارات کے ذریعے وجود میں آئی ہے اس نئی زبان کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں کہ اس کے جملے بہت طویل ہوتے ہیں اور پڑھنے والوں کو پریشانی میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس زبان میں آپ کو خالص ہندوستانی زبان کے فقروں کی ساخت کہیں نظر نہیں آئے گی۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ اسماء و صفات عوامل، فعل فاعل مفعول اور ضمائر اور دوسرے متعلقات جملہ دور دور اور آپس میں بے تعلق سے ہوتے ہیں لفظوں کی ترکیبیں عجیب وغریب اور غیر فطری ہوتی ہیں۔ جملوں کی ترتیب اور الفاظ کا تعلق اس قدر مصنوعی ہوتا ہے کہ مشکل سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ لکھنے والا کیا کہنا چاہتا ہے۔ حکومت کے احکام کے ترجمے اور اخباروں کی خبریں اس اسلوب اور طرزِ تحریر کے ذریعے پیش کی جاتی ہیں جو ذوقِ سلیم کو سخت ناگوار ہوتا ہے۔''۲۷۱

گارساں دتاسی کی مذکورہ رائے اپنی جگہ درست ہے کیونکہ اردو کا انگریزی کے ساتھ اختلاط ابتدائی سطح پر ایسا ہی رہا ہے لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اردو نثر نے اپنے ارتقا کے ساتھ ایسے انگریزی الفاظ کو بلاتکلف اپنے اندر سمو لیا جو ادائے خیال میں ضروری اور معاون ہو سکتے تھے اور جس سے تحریر میں دلکشی بھی پیدا ہوئی اور ناگواریت کا اثر جاتا رہا۔ رضیہ نور محمد کے مطابق پنجاب بک ڈپو کے زیر اہتمام ہونے والے تراجم کا سلسلہ ۱۸۸۳ء-۱۸۸۴ء میں پنجاب بک ڈپو کے بند ہونے پر ختم ہو گیا۔۲۷۲ نیز اس کے بند ہونے کی وجوہات بھی سامنے نہ آ سکیں۔ لیکن ''امپیریل پیپر'' لاہور کی ۲۷ اگست ۱۸۸۷ء کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب بک ڈپو ۱۸۸۴ء کے بعد بھی موجود تھا اور نصابی کتب کی دستیابی میں سررشتہ تعلیم کی معاونت کیا کرتا تھا۔ چنانچہ یہ خبر ملاحظہ ہو:

> ''اس میں کیا شک ہے کہ ہماری یونیورسٹی کا انتظام بھی نرالا ہے چنانچہ ایف اے کے لیے جو انگلش کورس مقرر ہیں حالانکہ امتحان نزدیک آ گیا ہے مگر طلباء کو ابھی تک نہیں مل سکے۔ ''پوئٹری فار دی ینگ'' تو بصد مشکل طلباء کے ہاتھ لگی مگر اس قدر نہیں کہ کل طلباء کو تسلی ہو سکیں۔ لائف کا تو ابھی تک پتہ نہیں ملا۔ بک ڈپو والے کہتے ہیں کہ انڈیا میں یہ کتاب نہیں ہے حیرانی کی بات ہے کہ ایسی کتاب جس کا ہندوستان میں ملنا مشکل ہے کیوں مقرر کی جاتی ہے۔ طلباء کیا پڑھیں گے کیا امتحان دیں گے۔۔۔ سوائے افسوس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔''۲۷۳

اس طرح پنجاب بک ڈپو کا ہمہ جہت کردار سامنے آتا ہے چنانچہ یہ محض ایک طباعت خانہ ہی نہ تھا بلکہ انگریزی کتب اور مضامین کے تراجم اور ان تراجم کی زبان و بیان کی اصلاح کے ساتھ نصاب کی فراہمی میں بھی مدد ومعاون تھا۔اس اعتبار سے پنجاب بک ڈپو کا اردو نثر کے ارتقا میں فعال کردار نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

حواشی:

۱۔ مصطفیٰ علی بریلوی، سید: ''پنجاب میں انگریزوں کی لسانی پالیسی''مقالہ مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص: ۶۷۷

۲۔ سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر،ص: ۲۱۷

۳۔ مشہور مدارس میں مدرسہ دائی لاڈو، درس میاں وڈھڈایا، مدرسہ میانی صاحب، مدرسہ خیر گڑھ، مدرسہ ابوالحسن خان ترہتی،مدرسہ شیخ بہلول، مدرسہ ملا فاضل قادری، مدرسہ ملا خواجہ بہاری، مدرسہ وزیر خان، مدرسہ نور ایمان والی مسجد، مدرسہ موراں کی مسجد، مدرسہ لال مسجد لاہور (ان کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہونقوش لاہور نمبر،''تاریخ لاہور''، مصنفہ کنہیا لال ہندی ، ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''، مصنفہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ''لاہور کی یادیں'' ، مصنفہ اے حمید)

۴۔ بعدازاں ارسطو جاہ دلی کالج میں تحصیل علم کے بعد اسی کالج میں ریاضی کے استاد ہو گئے۔۱۸۳۰ء میں ملازمت ترک کرنے اور مختلف ملازمتیں کرنے کے بعد لاہور میں سرہنری لارنس اور سرجان لارنس کے رفیق کار یعنی میر منشی گورنر پنجاب رہے۔خدمات کے صلہ میں ارسطو جاہ کا خطاب اور جگراؤں میں جاگیر عطا ہوئی۔ (مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہومحمد حسین آزاد''حیات و تصانیف'' مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی،ص: ۱۲۰ تا ۱۲۲)

۵۔ سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر،ص: ۲۰۷

۶۔ ایضاً،ص: ۲۱۶

۷۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: ''صحافت پاکستان و ہند میں''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء،ص: ۱۳۱

۸۔ محمد صادق، ڈاکٹر:''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول نومبر ۱۹۷۶ء،ص: ۳۹

۹۔ Urdu as Official Language by Nazir Ahmad Chaudhary ملاحظہ ہو۔

۱۰۔ محمد حسین:''اردو ناگری کی بحث:صوبہ پنجاب میں''(۲)مقالہ مشمولہ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)،ص: ۳۷۶

۱۱۔ ''خطبات گارساں دتاسی''(حصہ اول)،کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت ثانی،۱۹۷۹ء،ص: ۲۵۰

۱۲۔ ان میں سرفہرست مولانا محمد حسین آزاد ہیں جو لاہور میں جدید اردو نثر کے ہیرو بھی ہیں۔

۱۳۔ کیفی، برجموہن، پنڈت: ''منثورات'' دہلی، دریا گنج ۱۹۴۰ء، ص: ۳۰۰۔۳۰۱

۱۴۔ گارساں دتاسی، ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ دوم) کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۴ء، ص: ۴۸

۱۵۔ ایضاً، ص: ۱۵۳

۱۶۔ ایضاً، ص: ۲۷

۱۷۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: ''حواشی وتعلیقات گارساں دتاسی'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص: ۳۲۶

۱۹۔ سید احمد دہلوی، مولوی: ''محاکمہ مرکز اردو'' دہلی، شمسی پریس، ۱۹۱۱ء، ص: ۱۵

۲۰۔ ''خالق باری''، ''فرح الصبیان'' وغیرہ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ''پنجاب میں اردو'' (ترتیب و تدوین مع اضافات) اکرام چغتائی۔

۱۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت دوم، ۱۹۶۴ء، ص: ۳۶۳

۲۱۔ انگریزی عہد میں خصوصاً نثر کو نصابی سطح پر رواج ملا۔ یہی وجہ تھی کہ نصابی سطح پر نظم کی کمی کو محسوس کیا گیا تو انجمن پنجاب کے مشاعروں کی مدد سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔

۲۲۔ ''نقوش'' لاہور نمبر، فروری ۹۶۲ء، ص: ۹۵۳

۲۳۔ اس قسم کے اعلانات بعد میں بھی کیے جاتے رہے۔ مثلاً حکومت کی جانب سے فلسفہ تاریخ سیاست یا سائنس پر دلکش طرز زبان اور عام فہم کتاب تالیف کرنے پر معاوضہ کا اعلان کیا گیا۔ (ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۲ء ''مشمولہ مقالات گارساں دتاسی'' کے ص ۲۰۶) ایسا ہی ایک انعامی مقابلے کا اعلان عیسائی ادب کی اشاعت کے لیے بھی کیا گیا۔ ملاحظہ ہو (''ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۳ء'' مشمولہ مقالات گارساں دتاسی، (جلد اول)، ص: ۳۲۱)

۲۴۔ یہ کتاب درجہ اول پر رہی اور ہزار روپے انعام کی حقدار قرار پائی۔ (مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ''صحیفہ'' شمارہ نمبر ۴۰، جولائی ۱۹۶۷ء)

۲۵۔ یہ کتاب بھی ۱۸۶۸ء میں انعام کی غرض سے لکھی گئی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''حالی کی اردو نثر نگاری'' مصنفہ ڈاکٹر عبدالقیوم، ''نقوش'' لاہور، نومبر ۱۹۵۳ء، ''حالی کا ذہنی ارتقا'' مصنفہ ڈاکٹر غلام مصطفی خان۔

۲۶۔ مولانا محمد حسین آزاد کو اس پر دوسو روپے کا انعام ملا۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف'' مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی، ''راوی'' آزاد نمبر ۱۹۸۳ء

۲۷۔ ایک اصلاحی تمثیلی قصہ ہے جس پر مولوی سید احمد دہلوی کو بھی انعام دیا گیا۔ (ملاحظہ ہو، خطبات گارساں دتاسی)

۲۸۔ سفرنامہ کے انداز میں لکھا گیا تمثیلی قصہ جس پر سو روپے کا انعام ملا ۱۸۷۰ء میں چھپا (ملاحظہ ہو ''اردو ناول

کا ارتقا'' مصنفہ ڈاکٹر عظیم الشان صدیقی)

۲۹۔ آزاد، محمد حسین، ''قصص ہند'' (مرتبہ) خلیل الرحمٰن داؤدی، لاہور، مجلس ترقی ادب، سن ندارد

۳۰۔ فیاض محمود، سید: عبادت بریلوی، ڈاکٹر (مرتبین) ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' (نویں جلد) لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۷۲ء، ص: ۳۱۵

۳۱۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص: ۳۶

۳۲۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات وتصانیف'' کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۶۵ء، ص: ۲۰۷

۳۳۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر: ''قصص ہند کا قضیہ'' مضمون مشمولہ تحقیقی جملہ ''الماس'' شعبہ اردو شاہ عبدالطیف یونیورسٹی خیر پور، سندھ، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۲۷

۳۴۔ سری رام، لالہ، ''خمخانہ جاوید'' (جلد اول) دہلی، مخزن پریس، ۱۳۲۵ء، ص: ۳۳

۳۵۔ حامد بیگ، مرزا، ڈاکٹر: ''قصص ہند کا قضیہ'' مشمولہ تحقیقی مجلّہ ''الماس''، ص: ۲۲۷

۳۶۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: محمد حسین آزاد ''حیات و تصانیف''، ص: ۲۱۵

۳۷۔ گارساں دتاسی، ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، ص: ۳۲۴

۳۸۔ یہ اشاعت پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

۳۹۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف''، ص: ۲۰۷

۴۰۔ ملاحظہ ہو ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۴ء (طبع دوم)، ص: ۳۲۴

۴۱۔ ایضاً (جلد اول) ص: ۲۰۵

۴۲۔ ایضاً (جلد اول) ص: ۲۰۶

۴۳۔ ''خمخانہ جاوید'' سے پتہ چلتا ہے کہ محمد حسین آزاد ۱۸۶۴ء میں محکمہ تعلیم کے دفتر میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے بعد ازاں ڈائریکٹر سر رشتہ تعلیم میجر فلر کے بعد کرنل ہالرائیڈ نے قدردانی فرما کر ان کا مشاہرہ ۷۵ روپے کر دیا تھا۔ چنانچہ تصنیف و تالیف اور نظر ثانی کے فرائض انجام دیتے رہے اسی لیے ان کی بیشتر کتابیں محکمہ تعلیم کی علمی ضروریات کا نتیجہ ہیں۔

۴۴۔ تحقیقی مجلّہ ''الماس''، ص: ۲۲۶

۴۵۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص: ۱۶۱

۴۶۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''قصص ہند'' (حصہ دوم)، لاہور، پبلشرز منشی گلاب سنگھ، ۱۹۴۱ء، ص: ۱۸

۴۷۔ ایضاً (حصہ دوم) ص: ۴۴

۴۸۔ ایضاً،ص: ۵۹

۴۹۔ ایضاً،ص: ۱۴۱-۱۴۲

۵۰۔ آزاد،محمد حسین: ''قصص ہند'' لاہور، بک ٹاک، ۲۰۰۶ء،ص: ۳۶-۳۷

۵۱۔ آغا محمد باقر: ''تاریخ نظم و نثر اردو''، لاہور، شیخ مبارک اینڈ سنز، ۱۹۵۰ء،ص: ۹۳

۵۲۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،ص: ۲۳۳

۵۳۔ عبدالوحید، خواجہ: ''جائزہ زبان اردو پنجاب''،ص: ۱۰۷ جبکہ عطش درانی کے بقول (پنجاب میں اردو اور دفتری زبان''،ص: ۱۲) یہ مطبع پنجابی سے ۱۸۵۶ء میں منشی محمد عظیم نے شائع کی۔ مقالہ نگار کے مطابق مطبع پنجابی سے اس کتاب کا کوئی اور ایڈیشن یا اشاعت عمل میں آئی ہو گی۔ ورنہ اس کا سن اشاعت ۱۸۵۴ء ہی ہے۔

۵۴۔ عطش درانی: ''پنجاب میں اردو اور دفتری زبان''، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۸۷ء،ص: ۱۳

۵۵۔ ایضاً،ص: ۱۴

۵۶۔ مولوی کریم الدین (۱۸۲۱ء - ۱۸۷۹ء) دلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ ۱۸۵۰ء تا ۱۸۵۷ء آگرہ کالج میں مدرس اردو رہے۔ ۱۸۶۰ء کے اوائل میں لاہور آئے اور ۶۲-۱۸۶۱ء میں حلقہ لاہور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس ہوئے اور دس بارہ برس اس عہدے پر فائز رہے۔ ان کو تدریسی سرگرمیوں کا گذشتہ ۲۰ سالہ تجربہ تھا جس بناء پر انگریز حکام انہیں لاہور لے آئے۔ لاہور آنے سے قبل ان کا کام ''قواعد المبتدی'' ۱۸۵۷ء میں لاہور کے مدارس میں درسی نصاب کے طور پر پڑھائی جا رہی تھی۔ لاہور آنے کے بعد مولوی کریم الدین نے بہت سی کتابیں لکھیں جنہیں مطبع سرکاری لاہور نے شائع کر کے نصاب تعلیم میں شامل کیا۔

۵۷۔ ''دلی کالج اردو میگزین''، (قدیم دلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء،ص: ۹۷

۵۸۔ صحیفہ، لاہور، شمارہ نمبر ۴۰، جولائی ۱۹۶۷ء،ص: ۱۶

۵۹۔ ایضاً،ص: ۱۶

۶۰۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی''،ص: ۲۰۴

۶۱۔ ایضاً،ص: ۲۰۴

۶۲۔ ''دلی کالج اردو میگزین''، (قدیم دلی کالج نمبر) ۱۹۵۳ء،ص: ۹۷

۶۳ ایضاً،ص: ۹۸

یہ لغت کس قدر مفید تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ بالترتیب ۱۸۶۷ء میں مطبع مطلع نور لاہور، بلوم ہارٹ کی فہرست کتب اردو کے مطابق ۱۸۷۵ء مطبع پنجاب لاہور، ۱۸۷۶ء مطبع نارائن لاہور

اور ۱۸۷۷ء میں سرکاری مطبع لاہور سے اس کے کئی ایڈیشن چھپے۔

۶۴۔ ''صحیفہ'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۰ جولائی ۱۹۶۷ء، ص: ۱۶-۱۷

۶۵۔ عبدالوحید، خواجہ: (مرتب) ''جائزہ زبان اردو پنجاب''، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء، ص: ۱۱۰

۶۶۔ یہ قصہ باوجود کوشش کے نہیں ملا۔

۶۷۔ اس نام کا سولہ صفحات پر مشتمل ایک رسالہ گڑگانوں سے شائع ہوتا تھا (جائزہ زبان اردو پنجاب، ص: ۱۱۱)

۶۸۔ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ اول) ص: ۳۶۶

۶۹۔ ڈاکٹر اسد اریب کے بقول ''انشائے اردو'' ۱۸۷۱ء میں بموجب فرمان کرنل ہالرائیڈ ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب شائع ہوئی (اردو میں بچوں کا ادب، ص: ۵۱) جو کہ درست نہیں ہے
پھر بلوم ہارٹ کی ''فہرست اردو کتب'' کے مطابق اس کی دو اور اشاعتوں کے بارے میں معلوم ہوا ہے جو ۱۹۶۷ اور ۱۸۶۸ء میں مطبع وکٹوریہ لاہور سے شائع ہوئیں۔ ان متعدد اشاعتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک مقبول درسی و نصابی کتاب تھی۔

۷۰۔ کریم الدین، مولوی: ''انشائے اردو'' لاہور، حاجی چراغ الدین سراج الدین، تاجران کتب، سن ندارد، ص: ۱

۷۱۔ گارساں دتاسی کے مطابق مشہور خطاط محمد فاضل لاہوری نے اس کی کتابت کی اور پھر یہ لکھیو پر چھپی۔

۷۲۔ دتاسی کے مطابق ایسی کتب کی حیثیت تراجم سے زیادہ نہیں (خطبات گارساں دتاسی جلد اول) جبکہ امداد صابری اسے محض ایک الزام قرار دیتے ہیں (''تاریخ صحافت اردو'' جلد اول)

۷۳۔ ڈاکٹر اسد اریب کے مطابق تسہیل التعلیم ۱۸۶۶ء میں چھپی (''اردو میں بچوں کا ادب''، ص: ۴۹) بلوم ہارٹ کی فہرست کتب اردو کے مطابق ایک اشاعت ہندو پریس مطبع حسنی میں ۱۸۶۸ء میں بھی ہوئی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اردو نثر میں ایک مقبول درسی کتاب تھی۔

۷۴۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء، ص: ۲۳۵

۷۵۔ ''صحیفہ'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۰، جولائی ۱۹۶۷ء، ص: ۱۸

۷۶۔ محمد یحیٰی تنہا اس کا نام ''مخزن الطبیعات'' اور سن اشاعت ۱۸۶۵ء بتاتے ہیں (سیر المصنفین؛ ص: ۳۱۴) جبکہ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین نے جو حوالہ دیا ہے وہ ۱۸۶۵ء مطبع پنجابی لاہور کا ہے (تعلیقات خطبات گارساں دتاسی، ص: ۴۳۵) اس کتاب کی دوسری جلد ''اصول علم طبیعی'' کی ایک اشاعت ۱۸۶۷ء میں مطبع سرکاری سے ہوئی۔

۷۷۔ مولوی ضیاء الدین بن شیخ غلام حسن، دہلی کے رہنے والے تھے۔ دہلی کالج میں بطور نائب پروفیسر عربی کام کرتے رہے۔ مدرسہ تعلیم المعلمین (نارمل سکول) میں مدرس مقرر ہوئے محکمہ تعلیم کو چلانے اور اسے ترقی دینے کے لیے انگریز جن افراد کو دہلی (یو-پی) سے لاہور لائے ان میں مولوی ضیاء الدین بھی شامل تھے جنہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ ''فوائد ضیاء'' مخزن طبعی، اصول علم طبعی، وغیرہ کے علاوہ ''واقعات ہند'' (۱۸۶۴ء) ''رسوم ہند'' (۱۸۶۸ء) اردو کی تیسری کتاب (۱۸۶۸ء) اور قواعد اردو (۱۸۷۰ء) کی تیاری میں بھی معاونت کی۔

۷۸۔ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی''، (حصہ اول)، ص: ۴۰۵

۷۹۔ تنہا، محمد یحیٰ: ''سیر المصنفین''، (جلد اول) لاہور، عالمگیر الیکٹرک پریس، ۱۹ ستمبر ۱۹۲۸ء، ص: ۳۱۴

۸۰۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: ''تعلیقات گارساں دتاسی''، ص: ۲۶۶۔ اس کی ایک اشاعت ۱۸۶۸ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے بھی ہوئی۔

۸۱۔ عزیز الدین خان: ''جوہر عقل'' لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۵ء، ص: ۳

۸۲۔ ایضاً، ص: ۸

۸۳۔ عظیم الشان صدیقی: ''اردو ناول کا آغاز و ارتقا''، ص: ۱۱۵

۸۴۔ ڈاکٹر اسد اریب کے بقول ''محکمہ تعلیم پنجاب نے اس قصے کو بہت پسند کیا اور اپنے نصاب میں شامل کر لیا (''اردو میں بچوں کا ادب'' ص: ۴۸)

۸۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات وتصانیف''، ص: ۱۴۸

۸۶۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''نصیحت کا کرن پھول''، لاہور، اسلامیہ سٹیم پریس، ۱۹۱۷ء، ص: ۳۳

۸۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات وتصانیف''، ص: ۶۰۸

۸۸۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''نصیحت کا کرن پھول''، ص: ۷

۸۹۔ ایضاً، ص: ۱۲-۱۳

۹۰۔ ایضاً، ص: ۲۴

۹۱۔ ایضاً، ص: ۳۴

۹۲۔ ایضاً، ص: ۸۳-۸۴

۹۳۔ ایضاً، ص: ۳

۹۴۔ ایضاً، ص: ۳۲

۹۵۔ ایضاً،ص: ۳

۹۶۔ ایضاً،ص: ۸

۹۷۔ ایضاً،ص: ۱۲

۹۸۔ ایضاً،ص: ۳۵

۹۹۔ امداد صابری (''تاریخ صحافت اردو'' (جلد اول) ص: ۲۷۶) اور عظیم الشان صدیقی (''اردو ناول کا آغاز و ارتقا'' ص: ۱۰۹) اس کا سن تصنیف ۱۸۶۲ء کے درمیان بتاتے ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق ان ادبا سے سہو ہوا ہے۔ دراصل اس کا سن تصنیف ۱۸۶۴ء ہے۔ مذکورہ ادبا سے سہو ہونا فطری تھا کیونکہ ۴ اور ۲ کے لکھنے میں بے حد مماثلت ہے اور اس زمانے میں ۴ کے ہندسہ کو بیشتر ایسے ہی لکھا جاتا تھا کہ اس پر ۲ کا گمان گذرتا ہے۔ اس حقیقت کا انکشاف مقالہ نگار کو ''رسوم ہند'' کی ۱۸۶۹ء کی اشاعت کے صفحات پر درج نمبر شمار سے ہوا۔ جن پر ۲ کا ہندسہ ۴ سے اس درجہ مماثل ہے کہ اگر صفحہ نمبر کی ترتیب کے بغیر دیکھیں تو وہ ۴ ہی لگتا ہے۔ خط تقدیر کی سن اشاعت کے ضمن میں مقالہ نگار کا استدلال یہ ہے کہ اس وقت محکمہ تعلیم کے لیے درسی و نصابی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تصنیف و تالیف کا سلسلہ سرعت سے جاری تھا اور پھر ایسے میں جب طباعت کی سہولتیں بھی میسر ہوں، ممکن نہیں کہ ایک مختصر تمثیلی قصہ ۱۸۶۲ء کے درمیان میں شروع ہو اور ۱۸۶۵ء میں جا کر شائع ہوا ہو۔ چنانچہ اس بناء پر مقالہ نگار کا اغلب گمان ہے کہ ۱۸۶۴ء ہی درست سن تصنیف ہے۔

۱۰۰۔ ڈاکٹر محمود الٰہی نے ''خط تقدیر'' کو اپنے مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔

۱۰۱۔ کریم الدین، مولوی: ''خط تقدیر'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۵ء، ص: ۱۰-۱۱

۱۰۲۔ ایضاً،ص: ۱۶-۱۷

۱۰۳۔ ایضاً،ص: ۲۰

۱۰۴۔ ایضاً،ص: ۳

۱۰۵۔ ابن کنول: (مرتب) ''تحقیق و تنقید'' دہلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۶ء، ص: ۲۳۸

۱۰۶۔ ''صحیفہ'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۰، جولائی ۱۹۶۷ء، ص: ۴۰

۱۰۷۔ سلطان محمود حسین، سید، ڈاکٹر: ''تعلیقات گارساں دتاسی''، ص: ۲۹۶

۱۰۸۔ ایضاً،ص: ۲۲۹

۱۰۹۔ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ دوم)، ص: ۶۰

۱۱۰۔ ''صحیفہ'' لاہور، شمارہ نمبر ۶۰، جولائی ۱۹۶۷ء، ص: ۱۸

۱۱۱۔ ڈاکٹر اسد اریب کے مطابق آزاد نے ۱۸۶۶ء میں لکھی۔ (بچوں کا ادب، ص: ۵۸)

۱۱۲۔ نقوش شخصیات نمبر، سن ندارد، ص: ۱۳

۱۱۳۔ ملاحظہ ہو Catalogue of Urdu Books in the India Office Library 1800-1920 "Supplementary to James Fuller Blumbordt's Catalogue of 1900, Second edition compiled by Salim al Din Qureshi, published by: The British Library Great Russel Street London, Second edition, 1991, P.180

۱۱۴۔ ڈاکٹر انجم رحمانی اس سے متفق نہیں (برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ ص: ۲۲۳ تا ۲۲۷) جبکہ اسد ادیب ڈاکٹر اسلم فرخی سے اتفاق کرتے ہوئے آزاد ہی کی تصانیف قرار دیتے ہیں (بچوں کا ادب، ص: ۵۷)

۱۱۵۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: محمد حسین آزاد حیات و تصانیف''، ص: ۲۰۷، انگریزی کی مذکورہ عبارت مطبع مفید عام لاہور، ۱۸۹۰ء کی اشاعت پر بھی موجود ہے۔

۱۱۶۔ سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر، ص: ۱۶۱

۱۱۷۔ اس کے لیے ڈاکٹر انجم رحمانی کا غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی، ''برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ''، ص: ۲۲۷ ملاحظہ ہو۔

۱۱۸۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''اردو کی پہلی کتاب'' حصہ اول تا چہارم، (مرتب) اسلم فرخی، ڈاکٹر: کراچی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۶۳ء، ص: ۳۳ تا ۳۵

۱۱۹۔ نقوش شخصیات نمبر، ص: ۱۳

۱۲۰۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''مولانا محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص: ۱۲۹

۱۲۱۔ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)، ص: ۲۲۷

۱۲۲۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''اردو کی پہلی کتاب'' حصہ اول تا چہارم، مرتب، اسلم فرخی، ڈاکٹر، ص: ۳۷-۳۸

۱۲۳۔ ایضاً، ص: ۳۹

۱۲۴۔ حکیم احمد شجاع: ''لاہور کا چیلسی'' لاہور، پیکجز لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء، ص: ۳۱

۱۲۵۔ حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا کہ یہ کمیشن جو کتابیں تیار کرے گا ان میں سے بیشتر لاہور میں طبع کی جائیں گی۔

۱۲۶۔ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' (نویں جلد) میں اسے محمد حسین آزاد اور پیارے لال آشوب کی مشترکہ تالیف بتایا ہے (ص: ۴۹۳)

۱۲۷۔ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص: ۲۴۰-۲۴۱

۱۲۸۔ اس وقت محکمہ تعلیم سے جو مقامی اہل علم منسلک تھے ان میں آشوب کے علاوہ مولوی کریم الدین اور مولانا آزاد سر فہرست نظر آتے ہیں۔ پھر ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' میں ''رسوم ہند'' کا حوالہ اس طرح درج کیا گیا ہے، مولوی کریم الدین ''رسوم ہند'' پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی ۱۸۶۹ء (ص: ۴۹۷)

۱۲۹۔ اسد اریب: ''اردو میں بچوں کا ادب'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، ۱۹۸۴ء، ص: ۵۹

۱۳۰۔ اس حوالے سے ''دربار اکبری'' کے وہ حصے ملاحظہ ہوں جن میں مذہب کے بارے میں اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں وہاں ان کی مذہبی رواداری ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ اس حصے کو محمد عبداللہ قریشی نے ''مولانا آزاد کی آپ بیتی ''مشمولہ راوی'' آزاد نمبر ۱۹۸۳ء میں ''میرا مذہب'' کے عنوان سے بھی حوالہ دیا ہے۔ ان کے مقالات میں مضمون ''سمجھ'' بھی اس بات کا عکاس ہے۔

۱۳۱۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر: ''حیات آزاد پر ایک اہم نادر و معاصر ماخذ'' مشمولہ ''راوی'' آزاد نمبر، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۵۱

۱۳۲۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری سے ایک نشست، بتاریخ ۳۔فروری، ۲۰۱۰ء

۱۳۳۔ قیاس ہے کہ مولانا آزاد نے اور بھی کئی قصے لکھے ہونگے ایک قصے کی بابت فیاض رفعت کا کہنا ہے کہ ''راقم الحروف کو آزاد کا ایک مختصر تاریخی اور سوانحی افسانہ ''اہلیہ بائی'' ملا ہے۔ (اردو افسانے کا پس منظر، نئی دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۸ء، ص: ۱۰۰)

۱۳۴۔ مصنف نامعلوم: ''رسوم ہند'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۹ء، ص: ۹۰

۱۳۵۔ خلیل الرحمٰن داؤدی: دیباچہ ''رسوم ہند'' مرتبہ کارکنان مجلس ترقی ادب، لاہور، مجلس ترقی ادب، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص: ۱۰

۱۳۶۔ ملاحظہ ہو خلیل الرحمٰن داؤدی: دیباچہ ''رسوم ہند''، ص: ۱۱

۱۳۷۔ ''رسوم ہند'' (مرتبہ) کارکنان مجلس ترقی ادب، لاہور، مجلس ترقی ادب، طباعت دوم، ستمبر ۲۰۰۸ء، ص: ۱۳

۱۳۸۔ ایضاً، ص: ۱۵۷

۱۳۹۔ مولوی کریم الدین نے ''خط تقدیر'' (۱۸۶۲ء) کے دیباچے میں اسی خیال کو اجاگر کیا تھا۔

۱۴۰۔ ایضاً، ص: ۳۴

۱۴۱۔ ایضاً، ص: ۳۸

۱۴۲۔ ایضاً، ص: ۴۲

۱۴۳۔ ایضاً، ص: ۸۱

۱۴۴۔ خورشید ادا پیکر: ''رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء، ص: ۱۳۸

۱۴۵۔ ایضاً، ص: ۲۲۸

۱۴۶۔ ایضاً، ص: ۲۲۸

۱۴۷۔ ایضاً، ص: ۲۶۰

۱۴۸۔ ایضاً، ص: ۲۶۱

۱۴۹۔ ایضاً، ص: ۲۶۲۔۲۶۳

۱۵۰۔ ایضاً، ص: ۲۶۵

۱۵۱۔ ایضاً، ص: ۲۶۹

۱۵۲۔ ایضاً، ص: ۲۷۶

۱۵۳۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو ''مطالعۂ یلدرم'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مکتبہ کارواں، ۱۹۹۴ء

۱۵۴۔ (i) ''فرخ آباد کی کہانی'' (مطبوعہ ۱۸۵۰ء۔ الہ آباد) مصنفہ ڈاکٹر پنڈت مکن لال الہ آبادی۔

(ii) ''سورج پور کی کہانی'' (مطبوعہ ۱۸۵۰ء۔ آگرہ) مصنفہ چھجی لال انسپکٹر مدارس نے سری لال کے ہندی قصے کا اردو ترجمہ کیا جو جعل ساز پٹواری اور سندر سنگھ کے قصے پر مبنی ہے۔

(iii) ''قصہ کام روپ بہ عنوان دستور ہمت'' (۱۸۵۴ء) مصنفہ کندن لال (جو لاہور کا رہنے والا تھا)

(iv) ''سبدھی کبدھی'' (۱۸۵۵ء) ایک تمثیلی قصہ جس میں اچھے اور برے اخلاق کا فرق دکھایا گیا ہے۔

(v) ''درتنت وفادار سنگھ اور گدر سنگھ'' (۱۸۶۰ء) مصنفہ رام دیال نے لاہور میں مدرسے کے بچوں کے لیے ۲۴ صفحات پر مشتمل یہ کہانی لکھی۔

(vi) ''بتیال پچیسی'' (۱۸۶۲ء) جسے بکرم والاس یعنی بکر ماجیت کی کہانیاں بھی کہتے ہیں لاہور سے طبع ہوئی۔

(vii) داستان جمیلہ (۱۸۶۴ء) مصنفہ ایم کیمپسن ناظم تعلیمات صوبہ شمالی و مغربی

(viii) کنز الفوائد (۱۸۶۹ء) مصنفہ سید احمد دہلوی نے اصطلاحی تمثیلی قصہ لکھا جس پر انہیں انعام بھی ملا۔

(ix) ''خیالات کلیان بہ موسوم بہ مراۃ العقل'' (۱۸۶۹ء) مصنفہ منشی کلیان رائے نے سفر نامہ کے انداز میں یہ تمثیلی قصہ لکھا جس پر ۱۰۰ روپے انعام بھی دیا گیا۔

(x) ''انوار سہیلی'' (۱۸۷۳ء): مترجم بہاری لال (جو لاہور سے تعلق رکھتے تھے)

(xi) اوم، قصہ حقیقت رائے دہی'' از چرنجی لال

(xii) ''قصہ دلپذیر'' مولف شکر اللہ خان

(xiii) ''قصہ گلبدن'' مولف مراد علی

(xiv) ''قصہ بہرام گور'' مصنفہ فرخند علی

(xv) ''قصہ لیلیٰ مجنوں'' مصنفہ بھائی لال سنگھ

(xvi) ''قصہ چراغ جمال'' مصنفہ منشی چتر بھوج سہائے

(xvii) ''جنگ مقدس'' مترجم: بابو نولیس سنگھ

(xviii) ''تحفۃ الصادقین'' مصنفہ محمد عظیم اللہ کے علاوہ قصہ چندر بدن اور حکایت لقمان وغیرہ کے نام ملتے ہیں جو بیشتر درسی نصاب اور تعلیمی ضروریات اور اصلاح کے لیے لکھی گئیں۔

۱۵۵۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، ص: ۸۹-۹۰

۱۵۶۔ آشوب پیارے لال: ''اردو کی تیسری کتاب'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۶ء، ص: ۵۷-۵۸

۱۵۷۔ ایضاً، ص: ۷۹

۱۵۸۔ مصنف نامعلوم: ''مختصر تواریخ انگلستان'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۶۹ء، ص: ۲-۳

۱۵۹۔ بلوم ہارٹ کی فہرست کتب اردو کے مطابق یہ کتاب لاہور کے مطبع سرکاری سے ۱۸۷۰ء میں چھپی جس پر مصنف کا نام نہیں دیا گیا، ص: ۱۸۰

۱۶۰۔ ۱۸۷۱ء کی اس اشاعت میں دوسرے اور تیسرے حصہ میں ماسٹر پیارے لال آشوب کی ''اردو کی تیسری کتاب'' بھی شامل تھی۔

۱۶۱۔ اگر چہ اس پر مصنف کا نام نہیں لیکن ابتدائی درسی کتابوں کے انداز بیان کے پیش نظر مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ کتاب بھی مولانا محمد حسین آزاد نے تحریر کی۔

۱۶۲۔ مصنف نامعلوم ''اردو کی پہلی کتاب'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۱ء، ص: ۵

۱۶۳۔ ایضاً، ص: ۲۰

۱۶۴۔ یہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی نیو کیمپس کی لائبریری میں موجود ہے۔

۱۶۵۔ یہ نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے۔

۱۶۶۔ آشوب، پیارے لال: ''قصص ہند'' (حصہ اول) لاہور، مفید عام پریس، ۱۹۱۹ء، ص: ۳۲

۱۶۷۔ ایضاً،ص: ۵۲

۱۶۸۔ ایضاً،ص: ۵۸ تا ۶۰

۱۶۹۔ ایضاً،ص: ۳

۱۷۰۔ ایضاً،ص: ۴۴-۴۵

۱۷۱۔ ایضاً،ص: ۵۲

۱۷۲۔ اس کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا حصہ ’’تاریخ نویسی‘‘

۱۷۳۔ امداد صابری: ’’حیات آشوب‘‘، دہلی، یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۶ء، ص: ۱۵۰

۱۷۴۔ گارساں دتاسی کے مقالات اور امداد صابری کی ’’حیات آشوب‘‘ میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ’’اتالیق پنجاب‘‘ میں ’’تاریخ حکومت انگلستان‘‘ کے عنوان سے ایک مختصر مضمون کی صورت میں شائع ہوتی رہی۔

۱۷۵۔ امداد صابری: ’’حیات آشوب‘‘ ص: ۱۵۱

۱۷۶۔ ایضاً،ص: ۱۵۲

۱۷۷۔ ایضاً

۱۷۸۔ ایضاً،ص: ۱۵۷-۱۵۸

۱۷۹۔ خورشید اداد پیکر: ’’رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی‘‘ (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے) ص: ۴۴

۱۸۰۔ امداد صابری: ’’حیات آشوب‘‘ ص: ۱۵۹

۱۸۱۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ’’حالی کی اردو نثر نگاری‘‘ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۶۹

۱۸۲۔ ایضاً،ص: ۷۰

۱۸۳۔ ایضاً،ص: ۷۱

۱۸۴۔ گارساں دتاسی: ’’مقالات گارساں دتاسی‘‘ (جلد اول)، ص: ۳۳۱

۱۸۵۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ’’سخندان فارس‘‘ لاہور، مجلس ترقی ادب، (طبع اول)، جون ۱۹۹۰ء، ص: ۴۷

۱۸۶۔ ایضاً،ص: ۱۲۹

۱۸۷۔ ایضاً،ص: ۱۳۱

۱۸۸۔ ایضاً،ص: ۱۹۸

۱۸۹۔ ایضاً،ص: ۲۰۹

۱۹۰۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ’’محمد حسین آزاد احوال و آثار‘‘، ص: ۵۵

۱۹۱۔ ایضاً، ص: ۵۵

۱۹۲۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات تصانیف''، ص: ۳۷۳

۱۹۳۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص: ۵۱

۱۹۴۔ جہاں بانو نقوی کے مطابق ''نیرنگ خیال'' حصہ دوم ایسے ہی پڑا رہا اور مولانا آزاد کی وفات کے بعد آغا محمد طاہر نے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا (محمد حسین آزاد، حالات زندگی اور تصنیفات و کلام پر تبصرہ)

۱۹۵۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص: ۷۱

۱۹۶۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''نیرنگ خیال''، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء، ص: ۹۴

۱۹۷۔ ایضاً، ص: ۴۹۔۵۰

۱۹۸۔ ملاحظہ ہو مقالہ ہذا میں ''رسوم ہند'' کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

۱۹۹۔ جہاں بانو نقوی: ''محمد حسین آزاد، حالات زندگی اور تصنیفات و کلام پر تبصرہ'' حیدرآباد، دکن، ادارہ ادبیات اردو، ۱۹۴۰ء، ص: ۸۲

۲۰۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ''آزاد کی تمثیل نگاری پر ایک نظر'' مضمون مشمولہ ''فکر و خیال''، کراچی، مئی جون ۱۹۶۳ء، ص: ۵۴

۲۰۱۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص: ۷۵،۷۶ کے علاوہ ''نیرنگ خیال'' مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۶ کی اشاعت میں بھی ڈاکٹر محمد صادق نے اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

۲۰۲۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''نیرنگ خیال''، ص: ۴۸

۲۰۳۔ ایضاً

۲۰۴۔ معین الرحمٰن، سید، ڈاکٹر: حیات آزاد پر ایک اہم نادر اور معاصر ماخذ''مشمولہ''راوی'' آزاد نمبر، ۱۹۸۳ء، ص: ۱۵۵

۲۰۵۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ''حالی کی اردو نثر نگاری''، ص: ۳۵۸

۲۰۶۔ جہاں بانو بیگم نقوی: ''محمد حسین آزاد حالات زندگی تصنیفات و کلام پر تبصرہ''، ص: ۸۳

۲۰۷۔ پلگرامس پراگرس (زائر کا سفر) میں مسیحی عقائد اور محاسن اخلاق کو محسوس صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ ادب میں ایک صنف Mythology ہے جس میں انسانی جذبات اور مذہبی معتقدات مجسم صورت میں پیش کیے جاتے ہیں۔ انسان کا تخیل اشکال کو جلد گرفت میں لے لیتا ہے۔ مثلاً غصہ و رحم اور انصاف کو ان کے طبعی خصائص کی بناء پر ویسی ہی انسانی شکلوں میں پیش کیا جائے تو اس سے قاری جلد متاثر ہوتا ہے۔ انگریزوں نے اس طرز بیان پر مشہور کتاب پلگرامس پراگرس لکھی جس نے لوگوں کو انجیل کے بعد مسیحیت

قبول کرنے کی سب سے زیادہ ترغیب دی۔

۲۰۸۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص: ۷۴

۲۰۹۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف''، ص: ۳۴۵

۲۱۰۔ ''تاریخ'' لاہور نمبر، ص: ۱۸۳

۲۱۱۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد اسلم فرخی نے ایڈیسن اور جانسن کے دو مضامین کے متن کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ ملاحظہ ہو (''محمد حسین آزاد: حیات و تصانیف''، ص: ۳۵۷ تا ۳۶۱)

۲۱۲۔ غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر: ''حالی کا ذہنی ارتقا، کراچی، فضلی سنز، ۲۰۰۳ء، ص: ۵۶

۲۱۳۔ آزاد، محمد حسین: ''نیرنگ خیال''، ص: ۴۵ - ۴۶

۲۱۴۔ یہ مضمون ''رسالہ'' انجمن مفید عام قصور کے جولائی ۱۸۷۶ء کے شمارے میں چھپا۔

۲۱۵۔ آزاد، محمد حسین: ''نیرنگ خیال''، ص: ۱۵۸-۱۵۹

۲۱۶۔ مولانا الطاف حسین حالی دوبار لاہور تشریف لائے اول بار ۱۸۷۲ء میں آئے اور پنجاب بک ڈپو میں اسسٹنٹ ٹرانسلیٹر کے طور پر ملازم ہوئے اور ۱۸۷۴ء کے اواخر میں دہلی چلے گئے جبکہ دوسری بار جنوری ۱۸۸۷ء میں ایچیسن کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلباء کے اتالیق مقرر ہو کر آئے اور چھ ماہ بعد جون ۱۸۸۷ء میں دہلی واپس چلے گئے۔ قیام لاہور کے دوران مولانا الطاف حسین حالی نئے خیالات اور رجحانات سے نہ صرف روشناس ہوئے بلکہ لاہور ہی کی ادبی فضا نے انہیں ذہنی جلا بخشی جس کا ایک نمونہ ''مقدمہ شعر و شاعری'' (۱۸۹۳ء) کی صورت میں نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر وحید قریشی کہ ''نیچر کا خیال ہالرائڈ کے اثر اور گورنمنٹ بک ڈپو کے تراجم سے پیدا ہوا۔'' (حالی کی اردو نثر نگاری از ڈاکٹر عبدالقیوم، ص: ۳۵۴)

۲۱۷۔ ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) سے پتہ چلتا ہے کہ اشاعت اول پر ''اخبار پنجابی'' ۱۶ مئی ۱۸۷۴ء میں تبصرہ بھی شائع ہوا۔ نیز اس کی تیسری اشاعت ۱۸۸۱ء مطبع سرکاری لاہور سے ہوئی۔

۲۱۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص: ۱۹۶

۲۱۹۔ حالی، الطاف حسین، مولانا: ''مجالس النساء'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۸۱ء، ص: ۲-۳

۲۲۰۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ''حالی کی اردو نثر نگاری''، ص: ۹۰

۲۲۱۔ حالی، الطاف حسین، مولانا: ''مجالس النساء''، ص: ۷ تا ۹

۲۲۲۔ حالی، الطاف حسین، مولانا: ''مجالس النساء''، ص: ۱-۲

۲۲۳۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی''، (حصہ دوم)، ص: ۶۱

۲۲۴۔ یہ نسخہ پنجاب پبلک لائبریری میں موجود ہے اور مقالہ نگار کے پیش نظر رہا۔

۲۲۵۔ نقوش، آپ بیتی نمبر ۱۰۰، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص: ۵۷۰

۲۲۶۔ امداد صابری: ''حیات آشوب''، ص: ۱۲۲

۲۲۷۔ مصنف نامعلوم ''قصص ہند'' (حصہ سوم)، لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۵ء، ص: ۴۰۷

۲۲۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۵ء، ص: ۳۰۹

۲۲۹۔ بلوم ہارٹ ''فہرست کتب اردو''، ص: ۱۷۵

۲۳۰۔ گارساں دتاسی مقالہ ''ہندوستانی زبان وادب ۱۸۷۷ء میں'' اس کا تذکرہ اس اعتبار سے کرتے ہیں کہ یہ دو رسالوں فائز المعانی اور فائز البیان پر مبنی ہے۔ (ص ۴۶۱)

۲۳۱۔ دتاسی 'مقالات گارساں۔ میں فائض کی املا ''فائز'' لکھی گئی ہے۔

۲۳۲۔ اخبار ''پنجابی'' ۱۰ مارچ ۱۸۷۷ء کی اشاعت میں اس پر طویل مقالہ شائع ہوا (''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) ص: ۴۶۱

۲۳۳۔ مصنف نامعلوم: ''قواعد اردو'' لاہور، مطبع مفید عام، ۱۸۸۶ء، ص: ۱۷

۲۳۴۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات وتصانیف''، ص: ۶

ڈاکٹر اسلم فرخی کے مطابق طبع اول کے سر ورق پر یہ عبارت ملتی ہے ''لاہور وکٹوریہ پریس میں باہتمام رجب علی شاہ عفی عنہ ۱۸۸۰ء تعداد جلد ۱۰۵۰ قیمت فی جلد ایک (عہ) روپیہ محصول ڈاک ۳ آنے بار اول'' جبکہ ڈاکٹر محمد صادق کے مطابق ۱۸۷۶ء میں لکھنے کا ارادہ کیا اور پانچ برس تک اس کی تکمیل میں مصروف رہے اور ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی (محمد حسین آزاد احوال و آثار) ڈاکٹر اسلم فرخی کی بیان کردہ شہادت کی روشنی میں ڈاکٹر محمد صادق کا دیا گیا سن اشاعت درست نہیں رہتا۔

۲۳۵۔ بلوم ہارٹ نے اپنی 'فہرست کتب اردو' میں آب حیات کا شمار سوانح نگاری کی ذیل میں کیا ہے (ص:۲۶)

۲۳۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ''اردو شعراء کے تذکرے اور تاریخ نگاری'' مضمون مشمولہ دریافت، اسلام آباد، شمارہ ۸، ص: ۴۵

۲۳۷۔ اس حوالے سے ''مکتوبات آزاد'' میں میجر حسن بلگرامی کے نام ۱۰ فروری ۱۸۸۳ء کا خط ملاحظہ ہو۔

۲۳۸۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ''حالی کی اردو نثر نگاری''، ص: ۳۴۱

۲۳۹۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص: ۹۱

۲۴۰۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''آب حیات'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص: ۷

۲۴۱۔ ایضاً، ص: ۷۳

۲۴۲۔ ایضاً،ص: ۸

۲۴۳۔ آغا محمد باقر: ''مرحوم انجمن پنجاب'' مشمولہ ''مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین'' لاہور، ۱۹۷۰ء، ص: ۵۶

۲۴۴۔ اس حوالے سے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا میں ''رسالہ انجمن پنجاب'' کے ضمن میں مولانا آزاد کے مقالات کی فہرست اور ان کا سن اشاعت۔

۲۴۵۔ چند حقیقی یا قیاسی شکایات کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد صادق کی کتاب ''محمد حسین آزاد احوال و آثار''، ص:۹۰

۲۴۶۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''آب حیات'' ص: ۵۲

۲۴۷۔ ایضاً ص: ۵۳

۲۴۸۔ ایضاً، ص: ۵۶

۲۴۹۔ ایضاً ص: ۱۷۸

۲۵۰۔ جہاں بانو بیگم نقوی: ''محمد حسین آزاد، حالات زندگی اور تصنیفات و کلام پر تبصرہ''، ص: ۷۶

۲۵۱۔ آیا رام بی ای اے ایچ ای میکلوڈ پنجاب عربی فیلو پنجاب یونیورسٹی کالج میں اسسٹنٹ پروفیسر علوم و فنون مروجہ ریاضی تھے۔

۲۵۲۔ آیا رام: ''علم سکون'' لاہور، مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۸۰ء، ص: ۳

۲۵۳۔ ایضاً، ص: ۷۲

۲۵۴۔ محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' ص: ۹۷

۲۵۵۔ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''دربار اکبری'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۲۸-۱۲۹

۲۵۶۔ ایضاً، ص: ۳۸۲ - ۳۸۳

۲۵۷۔ یہ فہرست ڈاکٹر سید عبداللہ کی مرتب کردہ کتاب ''اردو میں سائنسی اور علمی کتابیں'' مطبوعہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۷۰ء کی مدد سے ترتیب دی گئی ہے۔

پنجاب بک ڈپو:

۲۵۸۔ امداد صابری: ''حیات آشوب''، ص: ۱۵۸

۲۵۹۔ حسن اختر، ڈاکٹر: ''مولانا محمد حسین آزاد کی درسی کتابیں'' مشمولہ ''راوی'' آزاد نمبر، ۱۸۸۳ء، ص: ۱۹۱

۲۶۰۔ ایضاً، ص: ۱۹۱

۲۶۱۔ احمد دہلوی، سید: ''محاکمہ مرکز اردو'' دہلی، شمسی پریس، ۱۹۱۱ء، ص: ۲۰

۲۶۲۔ امداد صابری: ''حیات آشوب''، ص: ۱۳۳

۲۶۳۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (حصہ دوم)،ص:۳۱۰

۲۶۴۔ ایضاً، (حصہ اول)،ص:۳۲۸۔۳۲۹

۲۶۵۔ پنڈت موتی لال ۱۸۷۶ء میں پنجاب یونیورسٹی میں اردو کے ممتحن مقرر ہوئے (مقالات گارساں دتاسی (جلد دوم)،ص:۳۵۱)

۲۶۶۔ عبدالحق، مولوی: ''مرحوم دہلی کالج''، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۴۵ء،ص:۱۶۵

۲۶۷۔ نقوش ''آپ بیتی نمبر''، جون ۱۹۶۴ء،ص:۵۶۹

۲۶۸۔ امداد صابری: ''اردو کے اخبار نویس'' (جلد اول)،ص:۳۷۰

۲۶۹۔ اس فہرست کتب کے لیے ملاحظہ ہو مقالہ ہذا کا ضمیمہ نمبر۲

۲۷۰۔ غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر: ''حالی کا ذہنی ارتقا''،ص:۲۱۔۲۲

۲۷۱۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (حصہ اول)،ص:۱۹۶

۲۷۲۔ رضیہ نور محمد: ''اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی)، لاہور، اورینٹل کالج یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء

۲۷۳۔ مسکین حجازی، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو صحافت'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، مئی ۱۹۹۵ء،ص:۲۳۹

اردو نثر کی ترقی میں
مطابع، اخبارات اور رسائل
کا کردار

لاہور میں اردو نثر اپنی منظم صورت میں اخبارات و رسائل کے اجراء سے بھی پروان چڑھی ہے۔ اخبارات و رسائل کی تخلیق میں سرعت طباعت ہی کی مرہون منت ممکن ہو پائی۔ اس طرح صحافت اور طباعت لازم وملزوم ٹھہریں۔ صحافت کی تاریخ میں پہلے پہل قلمی اخبارات کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن لاہور میں کسی ایسے اردو اخبار کا سراغ نہیں ملا۔ مطابع کے وجود نے اردو نثر کے ارتقا کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دی اور نشرواشاعت کا سامان مہیا کیا۔ یوں تو طباعت کی ایجاد ساتویں صدی ہجری میں چینیوں نے ٹھپے کی چھپائی سے کی اور یورپ (جرمنی، ہالینڈ، فرانس، اٹلی انگلستان) میں پندرہویں صدی سے اس کے آثار ملتے ہیں جبکہ برصغیر میں طباعت کی ابتداء ۱۵۵۰ء میں پرتگیزیوں نے کی۔ ۱۵۵۷ء میں مسیحیت کی تبلیغ کے پیش نظر ''گوا'' میں پہلے چھاپہ خانہ کا قیام عمل میں آیا۔ رفتہ رفتہ یہ سلسلہ بڑھا تو سترہویں صدی میں سورت کے مقام پر پارسیوں نے چھاپہ خانہ قائم کیا۔ انگریزوں نے سرکاری سطح پر اپنا پہلا چھاپہ خانہ بمبئی میں ۱۶۷۴ء، مدارس میں ۱۷۷۲ء، اور کلکتہ میں ۱۷۷۹ء میں قائم کیا۔ اس کے ساتھ کاغذ سازی کے کارخانے بھی کھلنا شروع ہو گئے۔

مطابع کے قیام سے جہاں اخبارات کی چھپائی میں آسانی اور تیزی آئی وہیں پر کتابیں بھی چھپنا شروع ہوگئیں۔ اس طرح مصنفین کو عوام کے بارے میں سوچنے اور ان سے خطاب کرنے کا موقع ملا۔ چھاپہ خانوں میں چھپائی ٹائپ میں کی جاتی تھی اور نستعلیق اور نسخ دونوں ٹائپ موجود تھے لیکن اس طرح کی چھپائی میں کچھ قباحتیں تھیں۔ جس کی جانب گارساں دتاسی نے اپنے خطبہ ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء میں اشارہ کیا ہے کہ ''ان مطبوعہ کتابوں کے حروف کی نسبت یہ خیال کیا جاتا تھا کہ یہ بے ثقل اور بے ڈول ہیں نہ تو یہ خط پورا نستعلیق ہے جو اعلیٰ درجے کی قلمی کتابوں اور قطعات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور نہ شکستہ اور نہ ہی خوبصورت عنوانات اور زیبائش کے لیے موزوں ہے۔''[۱] ٹائپ کا زیادہ تر رواج ۱۸۳۶ء تک رہا کیونکہ اسکے بعد لیتھو (یعنی پتھر کی چھپائی) کی طباعت شروع ہوگئی تھی۔ سب سے پہلے لیتھوگراف مطبع ۱۸۳۷ء میں دہلی میں قائم ہوا۔ چونکہ لیتھو کی طباعت ٹائپ کی نسبت ارزاں تھی اس لیے بہت جلد مقبول بھی ہوگئی۔ نیز اس نے پہلے سے موجود چھپائی کی دشواریوں کو بھی دور کر دیا تھا۔ اس طرح اردو اخبارات اور کتب کی چھپائی کے لیے لیتھو کی طباعت کا چلن عام ہوگیا[۲]

لاہور میں لیتھو اور ٹائپ کی سہولتیں انگریز اپنے ساتھ لائے تھے۔ اگر یہ سہولتیں میسر نہ آتیں تو جدید خیالات کے باوجود اردو نثر کو اس قدر جلد فروغ نہ ملتا۔ لاہور میں پہلا مطبع ''لاہور کرانیکل'' ۱۸۴۹ء[۳] میں لدھیانہ سے منتقل کیا گیا[۴]۔ اس کے ساتھ ہی لاہور میں مطبع کوہ نور کا قیام بھی ۱۸۴۹ء میں ہوا۔ بقول عتیق صدیقی

''۱۸۴۹ء گزشتہ چند ہفتوں ہی سے مطبع کوہ نور کا قیام عمل میں آیا ہے۔ جس کے متعلق کوئی رائے ظاہر کرنا قبل ازوقت ہو گا''۵ ان سے قبل لاہور میں کسی اور مطبع کا سراغ نہیں ملتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ علمی وادبی شہ پاروں کے لیے اعلیٰ درجے کے مشاق خطاط موجود تھے۔ ایسے خطاط کی موجودگی میں طباعت کی حوصلہ افزائی نہ ہو سکی۔ خطاطی اور کتابت کے حوالے سے مسجد وزیر خان اور اس کا بازار شہرت کے حامل رہے ہیں۔ لاہور کی تاریخ سے بھی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام الناس خطاطوں کی لکھی ہوئی عبارتیں پڑھنے کے عادی تھے۔ اس لیے قلمی کتابت بہت زیادہ پسند کی جاتی تھیں۔

انگریز حکومت نے الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے فوراً بعد لاہور میں انگریزی اور اردو پریس کی ضرورت کو محسوس کیا اور اسے فروغ بھی دیا۔ چنانچہ لاہور میں مطابع کا قیام بھی انگریزوں ہی کی مرہون منت ممکن ہوا۔ جنہوں نے ۱۸۴۹ء میں انگریزی پریس منشی محمد عظیم ۶ کی وساطت سے ''مطبع لاہور کرانیکل'' اور اردو پریس منشی ہرسکھ رائے کے ذریعے ''مطبع کوہ نور'' لاہور کی صورت میں اس کمی کو پورا کیا۔۷ چونکہ انگریز حکمران پریس کی طاقت سے واقف تھے اس لیے مطابع کے قیام کے لیے سہولتیں بھی فراہم کیں۔ یوں لاہور میں مطبوعہ صحافت کے بانی انگریزی حکمران ہی تھے۔ اگرچہ یہاں بھی ان کے پیش نظر اپنے ہی مفادات تھے لیکن بالواسطہ ان کے قائم کردہ مطابع کے ذریعے اردو نثر کی نشرواشاعت میں ترقی ممکن ہوئی۔ سرکاری سرپرستی میں مطابع قائم کیے گئے اور صحافت سے متعلق اشخاص نے اپنے چھاپے خانے لگائے۔ انہی مطابع سے جہاں اخبارات شائع کیے جاتے وہیں نثر کی کتابوں کی بھی چھپائی کی جاتی۔ ان مطابع کے قیام سے لاہور میں چھاپہ خانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن میں مطبع دریائے نور، مطبع مطلع نور، مطبع سرکاری، پنجابی پریس، مطبع لاہور گزٹ، مطبع انجمن پنجاب، مطبع محکمہ تعلیم پنجاب، مطبع جلوۂ انوار، مطبع آفتاب پنجاب، مطبع سول اینڈ ملٹری گزٹ، مطبع اسلامیہ، نیو امپریل پریس، مطبع قادری، مطبع سلطانی، مفید عام پریس، ہندوستان پریس، علمی پریس، انارکلی پریس، کریمی پریس، رفاہ عام پریس، سبحانی پریس، ہندو پریس، ایکسپرٹ پرنٹنگ پریس، کوآپریٹو پریس، انقلاب سٹیم پریس، فیروز پرنٹنگ پریس، ہوپ پریس، کیور آرٹ پریس، نارائن پریس، گلزار محمدی پریس، امرت پریس، وکٹوریہ پریس، مرکنٹائل پریس، اکالی پریس، حجازی پریس، آہوجہ پریس، دیوان پریس، گیلانی پریس، شیرازی پریس، صدائے ہند پریس، مطبع مصطفائی، مطبع خادم التعلیم، مطبع دارالاشاعت، مطبع قادریہ، مطبع محمد دین، مطبع متر بلاس، مطبع برہمو سماج، مطبع آریہ پریس، مطبع سیفی، مطبع لاہور پنچ، مطبع البرٹ گزٹ، مطبع رفیق ہند، مطبع دہلی پنچ، مطبع پیسہ اخبار، مطبع قانونی وغیرہ لاہور میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں قائم ہونے والے چند ایک مطابع ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے

کہ لاہور میں اردو نثر کی اشاعت نے انیسویں صدی کے نصف دوم سے ہی ترقی کی کس ڈگر پر قدم رکھا۔ ان میں سے بیشتر مطبعوں نے اپنے اخبارات بھی جاری کیے۔ مطابع کا یہ سلسلہ اس لیے بھی پھیلا کہ لاہور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بہت زیادہ متاثر نہ ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران ادبی اشاعت میں بھی خلل نہ پڑا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ۱۸۵۹ء میں لاہور سے مختلف موضوعات پر دو سو مطبوعات[۸] شائع ہوئیں۔

یہ مطابع لاہور میں زبان و ادب اور اخبارات کی ترویج و ترقی میں بے حد معاون اور فعال ثابت ہوئے۔ اُس وقت لاہور میں مطابع کا کثرت سے قائم ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ اخبارات کے علاوہ کتابوں کی مانگ میں مسلسل اضافہ ہو رہا تھا۔ اردو نثر کے علمی سرمایے کو اخبارات اور کتب کی صورت میں وسعت مل رہی تھی۔ اس بات کا اندازہ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۳ء تک مطبع کوہ نور سے شائع ہونے والی اردو کتب کی تعداد اور فروخت سے لگایا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۰ء

نمبر شمار	کتاب	تعداد	فروخت
۱۔	قانون دیوانی	۸۰۰	۳۶۸
۲۔	دستور العمل جاگیرداران	۴۰۰	۳۶۸
۳۔	دستور العمل پیمائش کشت وار	۲۶۰۰	۲۵۰۰
۴۔	ہدایت نامہ پیش کاران پرتال	۶۰۰	۵۰۰
۵۔	دستور العمل حاکمان پیمائش	۳۰۰	۲۰۰
۶۔	نمونہ کیفیت حیثیت دہی	۶۰۰	۵۰۰
۷۔	جنتری ۱۸۵۱ء	۵۰۰	۲۰۰
۸۔	کشف الغطا	۳۰۰	۲۲۵
۹۔	دستور العمل ترتیب نقشہ خسرہ	۲۱۰۰	۲۰۰۰
۱۰۔	ہدایت نامہ تحصیل دار پرتال	۶۰۰	۵۰۰

۱۸۵۱ء

نمبر شمار	کتاب	تعداد	فروخت
۱۔	جنتری ۱۸۵۲ء	۹۴۴	۷۶۵
۲۔	مجمع القوانین (قوانین دیوانی کا خلاصہ از مکھن لال)	۱۵۰	۴۸

		تعداد	فروخت
۳۔	دستور العمل دیوانی	۹۳	۷۵
۴۔	ہدایت نامہ مال (صیغہ مال کی ہدایات)	۳۰۰	۲۲۴
۵۔	ہدایت نامہ بندوبست (محکمہ بندوبست کے متعلق ہدایات)	۳۰۰	-
۶۔	جنتری پیائش	۴۹۸	۴۲۸
۷۔	کشف الغطا	۳۰۰	۲۹۹

۱۸۵۲ء

نمبر شمار	کتاب	تعداد	فروخت
۱۔	جنتری کرم ۱۸۵۲ء	۹۵۹	۵۷۲
۲۔	تفسیر سورۃ الفجر (قرآن کی ایک سورۃ کی تفسیر)	۳۰۰	۲۵۴
۳۔	دستور العمل تحصیلداران (صیغہ فوج داری)	۵۵۰	۲۳۱
۴۔	دستور العمل تحصیلداران (صیغہ دیوانی)	۵۵۳	۲۶۴
۵۔	چٹھی بورڈ (پنجاب کے باغات سے متعلق ایک چٹھی)	۵۵۳	۳۱۱
۶۔	ہدایت نامہ بندوبست (مسٹر میور نے محکمہ بندوبست کی ہدایات کا جو ترجمہ کیا تھا اس کا نیا ایڈیشن)	۲۳۹	۲۱۷
۷۔	تحفۂ کشمیر (اردو میں کشمیر کا حال)	۲۵۱	۱۳۷
۸۔	اشتہار باغات (باغات کے متعلق ایک سرکاری اشتہار)	۴۰۰	۳۵۱
۹۔	دستور العمل داروغہ اعلا (ہیڈ درواغہ کے متعلق ہدایات)	۵۰۳	۴۹۲

۱۸۵۳ء

نمبر شمار	کتاب	تعداد	فروخت
۱۔	ہدایت نامہ زمینداری پیائش	۱۵۰۰	۱۰۴۹
۲۔	رسالہ کیمیا	۲۰۰	۵۶
۳۔	اردو جنتریاں ۱۸۵۳ء	۱۵۰۰	۱۱۸۷
۴۔	تنبیہ الغافلین (پنجاب میں دختر کشی کی جو رسم ہے اس کے خلاف مفید رسالہ)	۵۰۰	مفت
۵۔	دستور العمل داروغہ	۲۰۰	۱۶

نمبر شمار	کتاب	تعداد	فروخت
۶۔	مسودہ قانون مال پنجاب (منٹگمری کی کتاب کا اردو ترجمہ)	۱۰۰	۱۰۰
۷۔	جنتری	۱۰۲۹	۱۰۲۶
۸۔	دستور العمل بار برداری	۱۵۹	۱۵۱
۹۔	دستور العمل (ریکارڈ آفسوں کو ترتیب دینے کی ہدایات)	۲۰۰	-
۱۰۔	پنجاب میں چائے کی کاشت سے متعلق ایک اردو رسالہ	۳۰۰	۲۰۰
۱۱۔	پنجاب میں چائے کی کاشت سے متعلق ایک اور رسالہ	۳۰۰	۲۰۰

جبکہ ''مطبع دریائے نور'' لاہور ۱۸۵۱ء میں اردو کی یہ دو کتابیں چھپیں۔ یہ مطبع جلد ہی ۱۸۵۲ء میں بند ہو گیا۔

نمبر شمار	کتاب	تعداد	فروخت
۱۔	''قانون دیوانی'' (پنڈت من پھول نے بورڈ آف ریونیو کے حکم سے اردو ترجمہ کیا)	۱۰۴	۷۸
۲۔	کریما۹	۱۲۶	۱۱۸ ۱۰

اردو نثر کو روزافزوں ترقی اردو صحافت نے بھی عطا کی ہے۔ درحقیقت لاہور میں اردو نثر کا نقطہ آغاز اخبارات ہی کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ مطابع کے قیام کے ساتھ ہی اخبارات چھپنا شروع ہو گئے۔ آج اردو نثر کے اولین دستیاب نمونے ان اخبارات ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اخبارات کے اجراء سے اردو نثر کو بے بہا فائدہ ہوا۔ ان کے ذریعے ہر روز غیر معمولی فنون و ایجادات سے واقفیت ملی، مختلف سیاسی و ملکی انتظامات، عمومی مسائل، علمی مباحث، اجنبی ممالک کے حالات، وہاں کے باشندوں کے اخلاق و عادات کے علاوہ اصلاح ملک میں بھی ممد ومعاون ثابت ہوئے۔ وہیں اردو نثر میں ارتقا کے باعث اردو صحافت کے میدان کو بھی وسعت ملی۔ اس میں مختلف قسم کے روزانہ، ہفتہ وار، پندرہ روزہ، ماہانہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ کے علاوہ تعلیمی، زراعتی، طبی، قانونی جیسے پیشہ وارانہ اور گروہی اخبارات و رسائل و جرائد ہر دور میں نمایاں خدمات انجام دینے کے قابل ہوئے۔

صحیح معنوں میں تو یہ اخبارات ہی تھے جنھوں نے ادبی نثر کی آبیاری کے لیے راہ ہموار کی۔ اخبارات و رسائل کی خوش بختی ہے کہ ان سے وابستہ احباب علمی و ادبی ذوق وشوق کے حامل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء ہی سے اخبارات میں ادبی نوعیت کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ اخبارات کے بعد اردو نثر میں رسائل اور جرائد کی صورت میں ادبی تسکین کا سامان فراہم ہوا یوں اخبارات علمی ترقی کا باعث بنے اور سرکاری سطح پر انہیں سرپرستی حاصل ہونے سے صحافت کے شعبہ میں ترقی ہونا شروع ہو گئی۔ اخبارات ہی نے جہالت کو دور اور تعلیم کو

عام کیا اوران کی بڑھتی ہوئی اشاعت سے معلومات عامہ میں بے حد اضافہ ہوا۔انیسویں صدی کے نصف دوم میں لاہور اردو صحافت کے ایک بڑے مرکز کے طور پر سامنے آیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادھر الحاق پنجاب کے ساتھ ہی پہلا انگریزی اخبار ''لاہور کرانیکل'' اور اردو اخبار ''کوہ نور'' جاری ہوا۔جس سے لاہور میں اردو صحافت کا آغاز ہوا۔اس کے اجراء کے بعد دیگر مختلف اخبارت جاری ہوئے جن میں سے بیشتر کو انگریز حکومت کی سرپرستی حاصل رہی۔ لہٰذا اس بحث کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ لاہورمیں انگریز، مطبع کے ساتھ باقاعدہ صحافت نگاری کا فن بھی اپنے ساتھ لائے تھے۔

یہاں ان اخبارات و رسائل کا تذکرہ ناگزیر ہے جنہوں نے اردو نثر کے ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا کیونکہ انہی کے آغوش میں ادبی موضوعات اور اسلوب نے اپنی نوک پلک سنواری۔ ہر چند کہ صحافت کا اسلوب ادبی نہیں ہوتا لیکن جہاں صحافت نے ادبی اسلوب اختیار کیا وہیں یہ ادب کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ بنیادی طور پر موضوع اور اسلوب ہی ہیں جو صحافت اور ادب کی حدود کا تعین کرتے ہیں۔موضوع ادب اور صحافت کا ایک ہی ہوتا ہے۔فرق اسلوب سے آتا ہے۔صحافت کا اسلوب ذاتی تجربے، مشاہدے اور مطالعے کو من وعن پیش کرتا ہے۔ بالفاظ دیگر حقائق کا بیان کیا جاتا ہے لیکن جہاں حقائق کی پیش کش میں لفاظی، جذبے اور تخیل کی رنگ آمیزی شامل ہو جاتی ہے تو ایسی تحریر ادب میں شمار کی جاتی ہے۔ اخبارات اور ادب دونوں ہی زندگی اور سماج کی ترجمانی کرتے ہیں اسلوب ان کے مابین حد فاصل قائم کرتا ہے ورنہ دونوں کا مقصد معاشرے کی تعمیر ہی ہے۔

لاہور سے نکلنے والے اخبارات کی اردو نثر میں اسلوب کی دونوں ہی خوبیاں دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ صحافت اگرچہ ادب نہیں لیکن صحافت میں ادب کا عنصر ضرور موجود ہوتا ہے کیونکہ ان اخبارات و رسائل نے ایک طرف ملکی، سیاسی، اور ادبی امور کو عوام تک پہنچایا تو دوسری جانب ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس لیے آج اردو نثر جس اوج کمال پر ہے اس میں اردو اخبارات اور رسائل کا کردار کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اس حوالے سے نمایاں اور چیدہ اخبارات و رسائل کا ذیل میں ذکر کیا جائے گا جنہوں نے اردو نثر کے ارتقا میں موضوع اور اسلوب بیان ہر دو اعتبار سے اپنا حصہ ڈالا۔

اس ضمن میں سب سے پہلا نام **''کوہ نور''** اخبار کا ہے۔ جو الحاق پنجاب کے چند ماہ بعد ہی ۱۴ جنوری ۱۸۵۰ء کو لاہور سے جاری ہوا۔عتیق صدیقی اس کی بابت لکھتے ہیں: ''پنجاب کے ابتدائی اخباروں میں کوہ نور کئی اعتبار سے قابل ذکر ہے ایک تو یہ کہ کوہ نور پنجاب کا پہلا اردو اخبار تھا دوسرے یہ کہ اردو اخبار نویسی کے ابتدائی دور میں ''کوہ نور'' شمالی ہند کے اکثر اخبار نویسوں کے لیے اخبار نویسی کا مکتب بن گیا اور تیسرے یہ کہ ''کوہ نور''

نے طویل عمر پائی۔"[۱۱]

اس بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ کوہ نور لاہور میں نہ صرف پہلا دستیاب اخبار ہے بلکہ لاہور میں اردو نثر کا اولین نثری نمونہ بھی یہی ہے کیونکہ اس سے قبل لاہور میں کوئی اردو نثری نمونہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لیے ''کوہ نور'' کی اہمیت دوگنی ہو جاتی ہے۔ لاہور میں پہلا اردو اخبار ہونے کے ساتھ ''کوہ نور'' کئی اعتبار سے ممتاز حیثیت کا حامل تھا۔ اول یہ کہ اسے حکومت کی آشیر باد حاصل تھی۔ دوم: ہر دلعزیز اور کثیر الاشاعت[۱۲] اخبار تھا۔ سوم: اپنے ہم عصر اخبارات میں طویل العمر تھا۔ چہارم: بے شمار صحافیوں اور ادیبوں مثلاً پنڈت سورج بھان، غلام محمد پرتی، منشی جمنا پرشاد، پنڈت مکند رام، منشی ہیرا لال، سید نادر علی سیفی، مولوی سیف الحق ادیب، لالہ دینا ناتھ، منشی نثار علی شہرت، تاج الدین، مرزا موحد، شیخ فقیر محمد، منشی نولکشور[۱۳]، منشی لال سنگھ، مولوی عبداللہ[۱۴]، مولوی محرم علی چشتی اور منشی محمد دین فوق وغیرہ کی صحافتی و ادبی تربیت کی۔ پنجم: ۱۸۵۷ء میں کئی اخبارات بند ہو گئے لیکن کوہ نور بدستور جاری رہا۔

لاہور میں اردو نثر کے ارتقا میں بنیاد فراہم کرنے والے اس اخبار کے بانی منشی ہرسکھ رائے تھے۔ جنھیں انگریز حکام سکندر آباد (یوپی) سے لاہور لائے۔ منشی ہرسکھ رائے کو نہ صرف انگریز سرکاری بلکہ مہا راجا کشمیر کے دربار میں بھی قدر و منزلت حاصل تھی۔ انگریز سرکاری ان افراد کو یو۔پی سے لاہور لائی جو علم و ادب اور صحافت میں وسیع تجربہ رکھنے کے ساتھ ساتھ ان کے وفادار بھی تھے۔ منشی ہرسکھ رائے کا شمار بھی ایسے ہی افراد میں ہوتا تھا۔ وہ متمول ہونے کے ساتھ انگریز سرکار کے منظور نظر بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ''کوہ نور'' زیادہ تر حکومت کی ہمنوائی کرتا رہا۔ منشی ہرسکھ رائے لاہور کی مجلسی زندگی میں بھی مقبول و معروف تھے۔ انجمن پنجاب میں سیکرٹری شعبہ فارسی اور میونسپل کمشنر لاہور بھی بنائے گئے۔

منشی ہرسکھ رائے نے ابتداء میں جب ''کوہ نور'' جاری کیا تو یہ چھ صفحات پر مشتمل ہفت روزہ تھا۔ پسندیدگی کی بناء پر بعد ازاں ہفتہ میں دو اور کچھ عرصہ بعد سہ روزہ حتیٰ کہ ۱۸۸۸ء میں روزنامہ ہو گیا اور ساتھ ہی صفحات کی تعداد بڑھ کر سولہ ہو گئی۔ یہ تجربہ کامیاب ثابت نہ ہوا اور تین ماہ بعد اس کی روزانہ اشاعت بند ہو گئی۔ اخبار میں صوبائی اور مقامی خبروں کے علاوہ غیر ملکی خبریں، سرکاری اعلانات اور احکام، ادبی معلومات، تراجم، ادبی مقالے، غزلیات، سماجی امور پر قارئین کے خطوط، کتابوں اور رسائل و اخبارات کے اشتہارات وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ ابتداء میں شائع ہونے والے مواد کی بابت عبدالسلام خورشید کا بیان قابل غور ہے۔

"۱۸۵۱ء کے فائل میں ہمیں مختلف النوع خبریں ملتی ہیں مثلاً موسمی اطلاعات، ملیریا کی وباء، پبلک

پیشاب گاہوں کی تعمیر، چاند گرہن کے بعد خوفناک زلزلے، اناج کے نرخ، سوڈا واٹر کی تیاری، سکولوں کا قیام، جرائم کی حالت، کانوں کی دریافت، سکھ دربار کی بیش قیمت اشیاء اور نوادر کی فروخت، ۱۸۵۱ء کی صنعتی نمائش (لندن) میں، نجوم کا گلاب، بھیجنے کی تجویز، ''لاہور کرانیکل کے مدیر مسٹر ہنری کوپ کی سیکرٹری شپ میں ''ہارٹی کلچرل سوسائٹی'' کا قیام، افسروں کی تبدیلی، افواج کی نقل و حرکت، عدالتوں کے سنسنی خیز مقدمے، ایک عالم دین خواجہ شاہ سلیمان کا انتقال ایک برطانوی فوجی افسر کو اپنے دیسی ساتھی کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا، کلکتہ کے ایک شخص کا دعوی کہ وہ غبارے میں اڑے گا۔ جنوبی ہند میں پارسیوں اور مسلمانوں کے درمیان فساد، حکومت کی آمدن کا صوبہ وار گوشوارہ، غیر ملکی خبریں، بالخصوص مصر کی خبریں، نواب پیر ابراہیم خان کا سفرنامہ مصر، کوہ نور کی تاریخ پر مقالہ اور تعلیم پر بعض مضامین ---''[۵]

مذکورہ مندرجات سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''کوہ نور'' میں چھپنے والے مواد کی ابتدائی نوعیت کیا تھی۔ جس میں بتدریج تبدیلی آتی چلی گئی۔ خبروں میں تفصیل اور جامعیت کے ساتھ ان کے معیار پر بھی توجہ دی جانے لگی۔ سیاست، تاریخ، جغرافیہ، مذہب، معاشرہ، قانون کے موضوعات پر مضامین، لطائف، غزلیات، سرکاری اشتہارات کے علاوہ نئی کتابوں کے اشتہارات وغیرہ کا بھی اضافہ ہوا۔ چونکہ کوہ نور کا اپنا مطبع تھا اس لیے زیادہ تر اسی مطبع سے شائع ہونے والی کتب کے اشتہارات دیئے جاتے تھے۔ کتابوں کے اشتہار اور ان کے انداز بیان کے دو نمونے ملاحظہ ہوں:

''اجلاد مجمع القوانین دیوانی المعروف بہ قانون مارش مین جو آگرے سے اس مطبع میں آنے والی تھیں اس ہفتے میں آ گئیں جن صاحب کو خریدنا ان کا منظور ہو سولہ روپے نقد بھیج کر مہتمم مطبع کوہ نور کے پاس سے منگوا لیں اور ہم راہ جلد مارش مین کے تتمہ کے جو باندراج احکامات ابتداء ۱۸۴۰ء لغایت ۱۸۴۹ء مولفہ منشی لکھن لال صاحب اس مطبع میں چھاپہ ہوا ہے مطلوب ہو تو چار روپے قیمت تتمہ کی ملا کر بیس روپے بھیج دیں اور قانون دیوانی ابتدائے عملداری سرکاری ایسٹ انڈیا کمپنی سے لغایت ۱۸۴۹ء تمام و کامل یعنی باندراج احکام کل پیش نظر اپنے سمجھیں۔''[۶]

رسالہ کیمیا کا اشتہار دیتے ہوئے کتاب کی تفصیلات کا احاطہ بھی کیا گیا ہے جو اشتہار بازی کا موثر انداز ہے:

''ایک کتاب نہایت دلپذیر بہتر از نسخہ اکسیر مسمی بہ رسالہ کیمیا، مولفہ منشی شیام لال صاحب اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر ضلع انبالہ تائید بر قیات علم اور ہنر میں مشتمل بر مفاد مفصلہ ذیل اس مطبع میں چھپ کر تیار ہوئی جس صاحب کو مطلوب ہو ایک روپیہ چار آنہ قیمت کا بھیج کر مہتمم کوہ نور سے

منگا یئے: تفصیل مفاد

اول: بیان خرید وفروخت

دوسرے: بیان محنت اور اختلاف شرح مزدوری

تیسرے: بیان غریب اور متمول کا

چوتھے: بیان روپے سے روپیہ کمانے کا اور کلوں کے فائدے کا

پانچویں: بیان قحط سالی اور اناج کی گرانی کا

چھٹے: بیان سرکاری محاصل کے توڑنے کا سبب اور طریق بُری سلطنت کا

ساتویں: بیان کرایہ محاصل اور قیمت زمین کا

آٹھویں: بیان تجارت کا۔''[۱۷]

اب ذرا اخبار کا پرکشش اشتہار بھی ملاحظہ ہو:

''یہ ہفتہ وار اخبار جو مضامین ملکی علمی، اخلاقی، تمدنی، تجارتی اور اخبار ہر دیار وامصار سے لبریز ہو کر ہمارے مطبع سے طبع ہوتا ہے ملک میں اس خوبی کا پہلا اخبار ہے اس کے صرف دو صفحوں پر دو تین سو خبریں درج ہوتی ہیں کسی ایک اخبار میں اس قدر مجموعہ خبروں کا نہیں مل سکتا۔ قیمت سالانہ معہ محصول کے خوبی دیکھنے پر منحصر ہے۔''[۱۸]

ان اشتہارات سے قطع نظر ''کوہ نور'' میں سیاسی، معاشرتی، معاشی، لسانی، اور علمی و ادبی خبروں کا احاطہ کیا جاتا تھا۔ یہ ادبی لحاظ سے ہندوستان کا اہم ترین اخبار تھا جس میں اردو، ہندی، فارسی اور سنسکرت کی جدید کتب سے متعلق اکثر تفصیلی تنقیدیں چھپا کرتیں۔ سفرنامہ کی صنف کی ابتداء ''نواب پیر ابراہیم خان کے سفرنامہ'' کی صورت میں رسالہ ''کوہ نور'' ہی کے صفحات سے ہوئی۔ لسانی مباحث کے حوالے سے اردو زبان کا زبردست حامی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی ۸ اپریل ۱۸۵۶ء کی اشاعت میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کی حمایت مدلل الفاظ میں کرتا ہے:

''حتی الامکان اپنی زبان میں اگر تعلیم علوم کی ہووے تو دوسری زبان کی بہ نسبت جلد حاصل ہوتی ہے خیال کیجئے کہ اگر اردو میں سب علوم کی کتابیں بن جاویں تو وہی علوم جلد تر عوام کو حاصل ہوں گے۔ کیا معنی؟ پہلے تو زبان ہے سیکھتے سیکھتے ان کے چھ سات برس گذر جائیں گے۔ غرض اس بارہ میں صواب آرائے مہتمم کوہ نور بہت درست ہے بلکہ جیسے انگریزوں نے زبان یونانی و سنسکرت سے اپنی بھاکہ میں سب علوم ترجمہ کر ڈالے ویسے ہی اردو و فارسی وانگریزی و سنسکرتی والوں کو چاہیے کہ ہر علوم کو ہر ایک زبان سے لے کر اردو میں ترجمہ کیا کریں۔''[۱۹]

مذکورہ تجویز پر کوہ نور خود بھی عمل کرتا تھا۔ چنانچہ اس میں بیشتر خبریں 'دہلی گزٹ'، 'جام جہاں نما' (کلکتہ) اردو اخبار (دہلی) اور ''ہرکارہ'' وغیرہ سے اخذ کرنے کے ساتھ ''لاہور کرانیکل''، ''مارننگ کرانیکل'' فرینڈ آف انڈیا، چشمہ فیض، انگلش مین، قرآن السعدین سے ترجمہ کی جاتی تھیں۔ ''کوہ نور'' اخبار کی زبان ابتداء میں فارسی آمیز تھی۔ چونکہ فارسی زبان سمجھنے، لکھنے اور پڑھنے والے موجود تھے اس لیے اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فارسی خطوط[۲۰] بھی شائع کیے جاتے۔ بعد ازاں فارسی آمیزش کے اثرات بتدریج کم ہوتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے جو شمارے دستیاب ہوئے ہیں ان کا اسلوب زیادہ سلیس اور نکھرا ہوا ہے۔ زبان کی ارتقا پذیری کا عمل ذیل میں بیان کیے جانے والے ان اقتباسات سے واضح محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ۱۲ جولائی ۱۸۵۱ء کا کوہ نور اس طرح لکھتا ہے:

> ''خبر کلکتہ: جب کہ ہنود کلکتہ جو پادریان فریب سے بجان آئے اور نوبت فریاد بزرگوں تک پہنچی یعنی ظاہر ہوا کہ اسکول کلاں موضع بھوانی پور میں اکثر ہنود نے تحصیل علم انگریزی کی اور نصرانی ہو گئے اور اس طرح موضع بھالا میں بھی علی ہذا القیاس چند کس نصرانی ہو گئے۔ بزرگان و مجتہدان ہنود نے اس میں سے کنارہ کشی واجب سمجھ کر بتقرر محفل مشورت تصرف زر خاص تجویز احداث مدارس انگریزی کی۔ چنانچہ اصحاب نامور نے صاحبان دولت و ہمت میں سے ایک اشتہار تجویز مذکور کا چھپوا کر مشتہر کیا۔''[۲۱]

اب ایک اور خبر ۲۷ اپریل ۱۸۶۰ء کے کوہ نور سے ملاحظہ ہو۔

> ''شادی بیوگان: شادی بیوگان ہنود کا پونا میں بڑا چرچا پھیل رہا ہے اور بہت لوگ اس بات کے رواج دینے پر مستعد ہیں۔ برہموں کے کئی افضل خاندانوں میں کئی بیوہ عورتوں کی شادی کی گفتگو ہو رہی ہے اور تین سو برہموں اور پنڈتوں کے قریب اس رائے پر متفق ہیں اور کہتے ہیں کہ پتر بواہ مناسب اور دھرم شاستر کے موافق ہے۔ بنگالہ میں یہ رواج کئی برس سے جاری ہو گیا ہے اور تیس عورتوں بیوہ سے زیادہ کا دوسرا بیاہ ہو چکا ہے۔''[۲۲]

اس سے اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ کوہ نور نے زبان اور اسلوب بیان کو بہتر کرنے کی طرف توجہ دی۔ مطالعہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ''کوہ نور'' کی زبان پر اعتراضات بھی کیے جاتے رہے۔ مثلاً اخبار انجمن پنجاب اپنی ۱۱ فروری ۱۸۷۶ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

> ''کوہ نور کو زبان کی غلطیوں کی کبھی پروا نہیں رہی اور اب تو غلط نویسی کا یہ حال ہے کہ جو طالب

علم اس کو پڑھے گا اردو بھول جائے گا۔قطع نظر اس کے اخبار کے نامہ نگاروں کا دائرہ وسیع ہے
اور اسی وجہ سے خبروں کا انتخاب بہت اچھا ہوتا ہے۔اخبار کے مالک منشی ہر سکھ رائے کو اپنے کام
کا بڑا تجربہ ہو گیا ہے۔اسکے مضامین نہایت کارآمد ہوتے ہیں۔طرز بیان کی بات دوسری ہے۔''۲۳

ہر چند کہ کوہ نور نے اپنی زبان اور اسلوب کو بہتر بنانے کی طرف بھی توجہ دی ہے لیکن مذکورہ اعتراض کی وجہ سمجھنی کچھ دشوار نہیں کہ ''کوہ نور'' کاروباری ذہن کے تحت چلایا جا رہا تھا۔اس کے لیے زبان ثانوی حیثیت رکھتی تھی۔منشی ہر سکھ رائے کے انتقال (۱۸۹۰ء) کے بعد منشی جگت نارائن نے اخبار کو سنبھالا۔پھر ان کے رخصت ہو جانے کے بعد منشی ہر سکھ رائے کی بیوہ نے اخبار کا انتظام دیکھا۔یہ وہ دَور تھا جب ''کوہ نور'' کی پہلے جیسی مقبولیت نہ رہی تھی۔اس کی ایک وجہ اخبارات و رسائل کا کثیر تعداد میں وجود میں آنا تھا۔کیونکہ اب قارئین کے پاس ایک وسیع انتخاب تھا۔ بالآخر کوہ نور ۱۸۹۴ء۲۴ میں بند ہو گیا۔لیکن درحقیقت ''کوہ نور'' لاہور، سے اخبارات اور پریس کو بہت ترقی ملی۔

دریائے نور:

۱۸۵۰ء۲۵ کے آخر میں لاہور سے جاری ہونے والا دوسرا اخبار ہے جو ہفتہ وار جاری ہوا اور اپنے ہی مطبع ''دریائے نور'' سے شائع ہوتا تھا۔عتیق صدیقی نے ''شمالی ہند کے کچھ اور اخبارات'' کے تحت جو گوشوارہ درج کیا ہے اس میں اخبار کی نوعیت کے ضمن میں اسے اتوار کے دن کا اخبار قرار دیا ہے۔۲۶ اس کی ادارت پر بالترتیب نجیب الدین حسین، منشی سندر لال اور شہسوار الدین فائز رہے۔اخبار ''دریائے نور'' عوامی خیالات کی ترجمانی اور حکومتی نظم و نسق کی خرابیوں اور کج رویوں پر نکتہ چینی ہی نہیں کرتا بلکہ سرکاری محکموں میں ہونے والی بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنے کی وجہ سے بھی عوام میں خاصا مقبول رہا۔''دریائے نور'' اور ''کوہ نور'' کے درمیان معاصرانہ چشمک کا سلسلہ بھی جاری رہا۔یہ اخبار ''کوہ نور'' کی نسبت زیادہ آزادانہ مزاج رکھتا تھا۔چونکہ ''دریائے نور'' کو ''کوہ نور'' کی مانند سرکاری سرپرستی حاصل نہ تھی اس لیے جلد ہی بند ہو گیا۔دتاسی کے خطبہ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء میں مطبع کے بند ہو جانے کے ساتھ ہی ''دریائے نور'' کی اشاعت بھی موقوف ہو گئی تھی۔ لیکن نور کے لاحقے سے شائع ہونے والے ان دو اخباروں سے متاثر ہو کر خطۂ پنجاب میں کئی دیگر اخبارات کا نام بھی اسی مناسبت سے رکھا گیا۔جس کا علم ''کوہ نور'' ۸ جولائی ۱۸۵۱ء جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۵۴ کی اس خبر سے ہوتا ہے کہ ''خطہ پنجاب میں خوب نور برس رہا ہے یعنی کوہ نور سے لے کر دریائے نور، ریاض نور، باغ نور، نور اعلیٰ نور، پانچ نور تو نازل ہو چکے......''۲۷ یہ امر اس بات کا غماز ہے کہ لاہور سے شائع ہونے والے اخبارات کا اثر پورے پنجاب پر پڑتا تھا۔

اخبار لاہور:

یہ اخبار بھی ۱۸۵۰ء ہی میں جاری ہوا۔ کیونکہ امداد صابری اپنی کتاب ''تاریخ صحافت اردو'' میں اسعد الاخبار آگرہ کے مختلف پرچوں ۸ اگست ۱۸۵۰ء، ۲۲ دسمبر ۱۸۵۰ء، ۸ فروری ۱۸۵۱ء کے ''اخبار لاہور'' سے خبر نقل کرنے کا حوالہ دیتے ہیں۔ مزید یہ کہ اخبار کا حوالہ ''دہلی اردو اخبار'' ۱۸۵۷ء میں بھی ملتا ہے لہٰذا یہ اخبار ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۷ء تک نکلتا رہا۔

ہمائے بے بہا:

یکم جنوری ۱۸۵۳ء کو یہ پندرہ روزہ اخبار منشی دیوان چند نے لاہور سے جاری کیا جو مطبع چشمۂ فیض سے شائع ہوتا تھا۔۲۸ اس اخبار میں علمی، ادبی، سائنسی اور تعلیمی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے نیز سرکاری سرکلر اور احکامات بھی درج کیے جاتے تھے۔ تاریخ صحافت کے بغور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء کے بعد جتنے بھی اخبارت وجود میں آئے خبروں کے ساتھ ان کا مقصد عوام کو مغربی علوم وفنون سے آشنا کرانا بھی تھا۔ اسی لیے ان میں خبروں کے علاوہ مضامین کا سلسلہ بھی نظر آتا ہے۔ جس کی واضح مثال ''ہمائے بے بہا'' ہے۔ بعد ازاں اس سلسلے نے وسعت اختیار کی اور ۱۸۵۳ء میں خالص علمی و ادبی رسائل کا اجراء بھی ہونے لگا۔ ''ہمائے بے بہا'' نے موضوع اور اسلوب کو علمیت کے نقطہ پر مرکوز کیا۔ چنانچہ اپنی ۲۸ فروری ۱۸۵۸ء کی اشاعت میں مقناطیس کی کیفیت کا احوال بیان کرتے ہوئے رواں اسلوب اختیار کیا ہے۔

> ''ہزار شکر و احسان خالق ہے کہ جس نے اپنی قدرت کاملہ سے اس سرزمین کو نعمت ہائے گوں ناگوں سے ہم لوگوں کی پرورش و آسائش کے واسطے مرتب کیا یہ زمین اندر باہر سے بے انتہا نعمتوں سے معمور ہے جتنا ہم غور کریں اتنا ہی کرشمہ نظر آتا ہے۔ دیکھیے اس مٹی کو جس کے ایک ایک ذرہ سے اس نور کا ظہور ہے چشم بینا چاہیے ورنہ جاہل کی نظر میں جوہر و کنکر ایک برابر ہے''۲۹

اسی اشاعت میں ڈاک بجلی، ٹیلی گراف، سیر کرہ، زمین وسعت عالم، سمندر میں لوہے اور پتھر کا ترنا، باکو کا آتش فشاں پہاڑ وغیرہ مضامین بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مژدہ فتح راحت گڑھ بہ تفصیل تمام کا بھی دلچسپ اسلوب میں بیان ہوا ہے۔

> ''واضح ہو کہ فاضل محمد خان نامی جاگیردار ریاست بھوپال نے راہِ بغاوت اختیار کیا تھا اور یہ تبلیس ابلیس خبیث باتفاق اور اخوان الشیاطین کے قلعہ راحت گڑھ کو ملجاوماوا بنا دیا تھا۔ ۲۵ تاریخ

ماہ حال کو فوج ہندوستان قلبی زیر حکم میجر جنزل سرھیوروز صاحب بہادر کے راحت گڑھ پر پہنچی۔ کنارہ جو پر محاذی قلعہ مذکور واقع ہے کچھ مفسدہ نظر آئے۔فوج سرکاری نے تاخت کی۔باغی پیٹھ دکھا کر قلعہ میں گھس گئے۔افسران فوج انگریزی تدابیری مزہ میں مصروف ہوئے اور ''اتواپ'' قلعہ شکن نصب کر کے قلعہ پر گولہ اندازی شروع کی۔۲۸ ویں تاریخ کو دیوار توڑ ڈالی اور حملہ کی تیاری ہوئی۔مفسد خوف جان سے ''سیاہی شپ'' میں فرار کر گئے بہت سے ماخوذ بھی ہوئے فاضل محمد خان موجد فساد کا مدار خان پنڈارہ ''گرفتارین'' سے تھے۔دروازہ قلعہ پر براہ پھانسی وہ میسر فنا ہوئے۔کار بہ کردہ راخبر این است۔''[۴۰]

لاہور گزٹ:

۱۸۵۳ء[۴۱] میں بابو تیج چندر کے زیر اہتمام اپنے ہی مطبع لاہور گزٹ سے ہفتہ وار جاری ہوا۔کب تک جاری رہا؟ اس کی بابت خورشید الاسلام کا یہ بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

''(کوہ نور اور دریائے نور کے اجراء کے) چند سال بعد لاہور گزٹ جاری ہوا اس نے بھی کوہ نور پر یورش کی اور اوپر سے اس کے مہتمم کو علم سے بے بہرہ قرار دیا۔اخبار کے ساتھ ایک مطبع بھی تھا۔جس کے کارکنوں کو چھ سات مہینے سے تنخواہ نہ ملی تھی۔انہوں نے ہڑتال کر دی یہ ۱۸۵۶ء کا ذکر ہے اور یہ ہڑتال لاہور میں کارکنوں کی پہلی ہڑتال تھی۔''[۴۲]

چشمہ فیض:

منشی دیوان چند نے ۱۸۵۳ء[۴۳] میں یہ ہفتہ وار اخبار مطبع چشمہ فیض[۴۴] لاہور سے جاری کیا۔

مفاد ہند:

۱۸۵۳ء[۴۵] میں ڈپٹی کمشنر کی سرپرستی میں لاہور سے جاری ہونے والا نیم سرکاری اخبار تھا۔

معلم ہند: [۴۶]

یکم جولائی ۱۸۵۴ء کو محمد احسن کلانوری کی ادارت میں یہ ماہنامہ جاری ہوا۔[۴۷] بقول امداد صابری اس میں سر رشتہ تعلیم کے سلسلہ میں امدادی مضامین چھپتے تھے چنانچہ یہ ایک تعلیمی نوعیت کا رسالہ تھا۔

خورشید پنجاب:

جنوری ۱۸۵۶ء میں جاری ہونے والا ایک معیاری علمی و ادبی رسالہ تھا۔جسے منشی ہرسکھ رائے نے مطبع ''کوہ نور'' لاہور کے زیر اہتمام جاری کیا۔[۴۸] اس کا بنیادی مقصد جدید علوم اور اس کی اشاعت کا فروغ تھا۔

پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ''خورشید پنجاب'' کی ایک فائل موجود ہے۔جس میں جنوری، فروری، مارچ ۱۸۵۶ء کے شمارے موجود ہیں جو مقالہ نگار کے پیش نظر رہے۔''خورشید پنجاب'' کے مندرجات پر نگاہ ڈالنے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ اس میں اخلاقی، علمی، تاریخی اور جغرافیائی موضوعات کے علاوہ سائنسی مضامین کو بھی اہمیت دی گئی ہے'' خورشید پنجاب'' ماہ جنوری ۱۸۵۶ء کا شمارہ کل ۴۳ صفحات پر مشتمل ہے جس کے مندرجات اس طرح ہیں:

تمہید، خیالات متعلق زبان اردو، اخلاق، اقوال حکما، لطائف وظرائف، حال طریقہ تعلیم، تواریخ، خیالات نسبت کرہ ہوائی، احکام سرکلر و ایکٹ مجریہ گورنمنٹ مغربی۔ خورشید پنجاب ماہ فروری ۱۸۵۶ء ۴۸ صفحات پر مشتمل کی فہرست مضامین میں نوع انسان میں شریف تر کون ہے مرد یا عورت، سراج العلم، تاریخ، تتمہ خیالات نسبت کرہ ہوائی، پیداوار ملک، سوالات قانونی، احکام و سرکلر و ایکٹ مجریہ گورنمنٹ مغربی کے عنوانات دیئے گئے ہیں۔ جبکہ مارچ ۱۸۵۶ء کے ۴۹ صفحات ہیں۔ اس شمارے کی فہرست موضوع میں سارٹیفکیٹ، تتمہ اخلاق، اقوال حکما، مختصر ہندوستان کے جغرافیہ کے بیان، علم و آداب تربیت، آداب محاورات، تتمہ کیفیت ڈاک بجلی، تتمہ تواریخ، سراج العلم، خیالات متعلق زبان اردو، احکام و سرکلر، ایکٹ مجریہ گورنمنٹ ممالک مغربی، گورنمنٹ ہند، شامل ہیں۔''خورشید پنجاب'' کے خدوخال کا اندازہ اس کے پہلے شمارے جنوری ۱۸۵۶ء کی اس تمہید سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ یہ عام خبروں پر مبنی نہیں تھا بلکہ اپنی نوعیت کا مکمل علمی و ادبی رسالہ تھا۔

> ''واجب ہے کہ سب سے پہلے سبب طلوع اور وجہ شیوع اس خورشید پنجاب کا ظاہر کیا جاوے جس سے دقیقہ سنجان حقیقت آگاہ کو واضح ہو کر شیوع اس خورشید سے کیا مقصود ہے اور طلوع اس مہر منیر سے کیا فائدہ مقصود ہے سو گذارش کیا جاتا ہے کہ غرض اصلی اجرائے اس نسخہ دلپذیر بہتر از اکسیر سے یہ ہے کہ پنجاب میں جو زبان اردو کا ربط ابھی اچھی طرح نہیں ہوا ہے اور بسبب اس کی کہ فی زماننا زبان اردو کو بدرجہ غایت اقتدار ہے۔ دفاتر سرکاری میں بھی اس کا رواج ہے شعروسخن میں بھی اوسکو لطیف سمجھتی ہیں بول چال میں بھی اوسکی فصاحت پر توجہ فرماتی ہیں اور دفاتر سرکاری کے عملگان بعض بعض ایسے ہیں کہ تنگی معاش کے باعث مکتب سے اٹھتے ہی تلاش نوکری میں مصروف ہو گئے اور نوکری بہم پہنچا کر تحصیل آئندہ سے محروم ہو رہے ہیں یا اکثر لوگ ایسے ہیں کہ مشاہرہ کی کمی سے کتب قیمتی قوانین سرکار اور دیگر علوم وفنون کی تو خرید نہیں سکتے اور اسی باعث سے ترقی آئندہ سے مجبور رہتے ہیں سو اکثر ایسے مضامین درج ہوا کریں گے اور جن سے زبان اردو کی ماہیت بوجہ احسن واضح ہو گی اور اس زبان کے شائقوں کو نفع خاطر خواہ بآئین بہین حاصل ہو گا اور پنجاب کے شرفا طالب علموں کو اس سے مدد کافی ملے گی اور عملگان کچہریاں

سرکاری کو اس کے مطالعہ سے ترقی علوم وفنون و ہم کار سررشتہ ہو گی۔ آئین اور قانون سے واقفیت بہم پہنچے گی اور اونکی طبیعت کو علوم کی طرف توجہ ہو گی یعنی علاوہ کار سرکار کے وہ یہ بھی جانیں گے کہ جغرافیہ، تواریخ، ہیئت، ہندسہ، حساب وغیرہ کیا شے ہوتی ہے اور اس سے کیا نفع حاصل ہوتا ہے۔''[۹۳]

اسی شمارے میں مضمون ''طریقہ تعلیم'' میں اس زمانے میں رائج طریقہ تعلیم کا تجزیہ اور اس میں اردو زبان کی وسعت اور اہمیت کا اظہار کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا ہے کہ علم کو علم کی حیثیت سے لیا جائے نہ کہ اسے حصول معاش کے ذریعہ سے مشروط کیا جائے۔ اس نقطے کو باور کرانے کے لیے سادہ رواں اور عام فہم اسلوب بیان اختیار کیا ہے۔ نمونہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بہت سے لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ تعلیم سے مدعا یہ ہے کہ معاش پیدا کرے سو اس کا بھی حال ہے اور سب پر بخوبی ظاہر کہ حاصل ہونا معاش کا لکھنے پڑھنے پر منحصر نہیں ہے بلکہ بہت سے پیشے ایسے ہیں کہ ان میں بخوبی معاش حاصل ہو جاتے ہیں اور تجارت کرنے کا مال جمع ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ بہت پڑھنے والے نہ دولت مند نہ ذی رتبہ ہوتے ہیں اور مذہب ناخواندے محتاج اور مفلس۔ قطع نظر اس کے اگر یہ بات بھی تسلیم کی جائے کہ یہ معاش کا ذریعہ ہے تاہم بڑی حسرت کی بات ہے کہ اس خیال مبہم اور مہمل سے کہ شاید اس ذریعہ معاش پر ملے گی ---علاوہ ازیں اس خیال میں پڑھا جاوے تو مدعا تعلیم کا صرف حصول معاش ہوا نہ حصول علم اور انسانیت اور جو نفع تعلیم سے حاصل ہوتے ہیں وہ نہ حاصل ہوئے ---غرض ہماری صرف یہ ہے کہ کسی زبان میں تعلیم ہو طریقہ اس کا اچھا چاہیے سب سے بہتر یہ ہے کہ اپنے دیسی زبان میں تعلیم ہو اور اس کام کے واسطے زبان اردو سب سے افضل ہے کہ یہ زبان تمام ہندوستان میں رائج ہے یعنی کلکتہ کے بھی بہت لوگ اس زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور دکن اور مغرب کے لوگ بھی۔ سوائے اس تمام ہندوستان کی عدالتوں میں یہی زبان مروج ہے مگر طریق تعلیم کا ایسا چاہیے کہ جس میں تضیع اوقات کم ہو اور تھوڑے عرصہ میں بہت سے علوم اور فنون حاصل ہو جاویں --- طالب علموں کو مار مار کر پڑھانے سے فائدہ نہیں بلکہ شوق دلانا چاہیے تاکہ بخوشی علم حاصل کریں اور یہ دیکھیں کہ نتیجہ اس کا کیا نکلتا ہے۔ یعنی وہ طالب علم ویسے ہی ہونگے جیسے انگریزی کے طالب علم ہوتے ہیں اور ان سے جلد تیار ہو جاوینگے کیونکہ اون بیچاروں کو ایک غیر زبان مشکل کا اول تحصیل کرنا پڑتا ہے اردو کے پڑھنے والوں کو زبان کی دقت نہ ہو گی صرف علوم سیکھنے پڑیں گے اور واقفیت اوس قدر حاصل ہو جاوے گی۔''[۹۴]

ایک اور مضمون ''خیالات متعلق زبان اردو'' کے ضمن میں جو کچھ لکھا ہے اس کے اسلوب بیان میں ادبیت کی کس قدر صاف اور واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مضمون نگار لکھتا ہے:

''جو فایدہ علم کے ہیں وہ سب حاصل ہوئے ہونگے حیثیت لوگوں کی بدل جائے گی یعنی بہتر ہو جائے گی۔ طبائع لوگوں کی زیادہ لطیف ہو جاویں گی۔ ربط و ارتباط جملہ باشندگان ملک میں زیادہ تر ہو گا۔ واقفیت ہر چیز کی زیادہ تر ہو جاوے گی۔ جو آسائش اور خوشی دنیا میں آدمی کے واسطے ہوتی ہے اس میں ترقی ہو گی۔ صورت ملک کی بدل جاوے گی جنگل باغ باغ رشک ارم بن جاویں گے۔ جہاں شیر اور بھیڑے بادشاہت کرتے ہیں وہاں آدمی تنہا آرام سے بسر کرے گا جان کی حفاظت زیادہ ہو گی۔''[۴۱]

''خورشید پنجاب'' کے تمام مضامین دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہیں۔ مقالہ نگار کے خیال میں یہ اردو صحافت میں پہلا مکمل علمی و ادبی رسالہ تھا۔ جس میں حسب ضرورت تصاویر سے بھی کام لیا گیا ہے۔ نیز انگریزوں کی ہمنوائی کرنے اور ان کی خوشنودگی حاصل کرنے کا احساس ''کوہ نور'' کی مانند ''خورشید پنجاب'' میں بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ امداد صابری کے مطابق یہ رسالہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہا اور جنوری ۱۸۵۷ء میں بند ہو گیا لیکن اس کے باوجود اپنے موضوع اور اسلوب کی بناء پر یہ کسی بھی معیاری رسالے کی ہمسری کر سکتا ہے۔

پنجابی اخبار:

منشی محمد عظیم نے مارچ ۱۸۵۶ء میں یہ ہفتہ وار اخبار مطبع پنجابی سے جاری کیا۔ سنجیدہ مذاق کے حامل اس اخبار کے مدیران میں بالترتیب دیوان محمد اکبر سیتانی خاور، محمد مردان علی رضا، میر انوار حسین ہما، قاضی نور حسین، اور منشی اللہ بخش وغیرہ کے نام لیے جاتے ہیں۔ منشی محمد عظیم نے اردو کے علاوہ انگریزی اور پنجابی میں بھی اسی نام سے اخبار جاری کیے۔[۴۲] اخبار ''پنجابی'' کی پالیسی غیر جانبدار اور ذاتیات سے بالاتر تھی۔ جس میں نیم سیاسی مضامین، انگریزی اخبارات سے تراجم، لسانی، مذہبی، بیرونی تعلقات کی خبریں اور موسم کی صورتحال اس میں شائع ہوتی تھی۔ ''پنجابی'' اخبار ۱۸۶۱ء تک جاری رہا پھر کچھ عرصہ بند رہ کر ۱۸۶۵ء میں اس کا دوبارہ اجراء سید محمد لطیف کی ادارت میں ہوا۔ جنہوں نے اخبار کو زبان و بیان کے حوالے سے مزید شائستہ بنایا۔ زبان و اسلوب کے معیاری ہونے کی وجہ سے محکمہ تعلیم اسے سرکاری مدارس کے لیے بھی لیا کرتا تھا۔ اب اس اخبار کے مندرجات میں خبروں، مراسلوں، انگریزی اخبارات کے بعض مندرجات کے تراجم اور نیم سیاسی مضامین اور نئے اخبارات و کتب کے اشتہارات اور تبصروں[۴۳] کے علاوہ نظام تعلیم کی بہتری،[۴۴] اخبار بینی کی اہمیت و فوائد،[۴۵] مذہبی مباحث،[۴۶]

عمومی موضوعات پر لکھنے کے ساتھ انجمن پنجاب کے مشاعروں میں پڑھی جانے والی نظموں، پیش کردہ لیکچروں اور متعارف کرائے گئے نئے شعری وژن پر تنقیدی مضامین تواتر سے شائع کیے جاتے۔ جس کا فائدہ اردو نثر کو یہ ہوا کہ بلند پایہ علمی و ادبی مضامین نے عوام میں نہ صرف اردو شاعری کا اعلیٰ مذاق پیدا کیا بلکہ اسے پروان بھی چڑھایا۔ اس اخبار نے اردو نثر میں شعری تنقید کی روایت کو مستحکم بنانے میں فعال کردار ادا کیا۔ ''پنجابی اخبار'' کی یہ خوبی نظر آتی ہے کہ یہ اپنے اخباری مقصد کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے بہترین استعمال کا بھی پختہ شعور رکھتا تھا اسی لیے وہ اخبار کے مدیران سیاس کا تقاضا بھی کیا کرتا تھا اس کا اندازہ اخبار پنجابی میں چھپنے والی اس تحریر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> ''اخبارات کی جادوبیانی یہ ہے کہ ایسے محاورات استعمال کیے جائیں جو عام فہم ہوں، زبان سلیس اور صحیح ہو اور سب اس کو سمجھ سکیں اور خیالات جن کا اظہار کیا جائے وہ واضح ہوں۔ اس کے سوا ضروری ہے کہ اڈیٹر خبروں کی عمدہ ترتیب کرے تا کہ انہیں دلچسپی کا موجب بنائے ـــــ مزید برآں اڈیٹر کو ذہین اور تجربہ کار ہونا چاہیے۔ ضروری ہے کہ وہ سماج سے اچھی طرح واقف ہو زندہ دل ہو موقع اور محل کی مناسبت سے کوئی برمحل محاورہ یا اچھا سالفظ استعمال کرنا جانتا ہو ایسی رائے جو عوام الناس کے لیے مفید ہو سلیس اور رواں مضامین میں ظاہر کر سکتا ہو۔ یہ سب خصوصیتیں ہر اڈیٹر کے لیے یہ ہر صورت ضروری ہیں لیکن اگر ان کے ساتھ ساتھ اڈیٹر صاحبان علوم اور فنون میں بھی قابلیت رکھتے ہوں تو دن بہ دن ان کے اخبارات کی شہرت اور مقبولیت ناظرین میں بڑھتی جائے گی۔''[۲۷]

بیان کردہ مذکورہ خصوصیات خود ''اخبار پنجابی'' میں بدرجہ اتم پائی جاتیں ہیں۔ جس کا ثبوت اس میں شائع ہونے والے ادبی مضامین ہیں جن میں اعلیٰ شعری و ادبی تنقید نے اخبار ''پنجابی'' کو ہر دلعزیز بنا دیا۔ اس حوالے سے اخبار پنجابی ۳۰ مئی ۱۸۷۴ء کی اشاعت میں ''انتظام نظم اردو'' کے عنوان سے لکھتا ہے:

> ''تاریخ اور قصص کی کتابیں اور نظم و نثر کی تمام تصانیف جو ہمارے نصابوں میں مقرر کی جاتی تھیں وہ ہمیشہ عشقیہ مضامین پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے صرف مذہبی کتابیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ہم سر رشتہ تعلیم کے شکرگزار ہیں کہ اس کے ذریعے سے اب ہمیں بہت سی ایسی کتابیں حاصل ہو گئی ہیں جو ہمارے اخلاق اور ہمارے حالات حاضری کے لیے فائدہ مند ہیں۔ لیکن افسوس اب تک شاعری کا کوئی مجموعہ ہماری نظر سے نہیں گزرا جس میں یہ خوبیاں، جن کی خواہش ہے موجود ہوں ہمیں توقع ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ایسا کلام بھی حاصل ہو جائے گا جو ہمارے موجودہ حالات اور اس کی ترقی کے موافق ہو گا جس کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔

اردو شاعری ایسا سامان تجارت ہو کے رہ گئی ہے جس کا کوئی اب خریدار نہیں پھر بھی ہماری تفریح اور ہماری دل بہلائی کے جلسے ہوں کہ رنج و غم کے اظہار مسرت اور اظہار رنج کے لیے شاعری ہی سے کام لیا جاتا ہے ۔۔۔ اس لیے ہماری امید بھری نظر ان لوگوں کی طرف ہے جو اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کے حامی ہیں۔ لیکن اب تک اس موضوع پر کسی مجلس یا کسی اخبار میں کوئی مثبت اور ٹھوس چیز پیش ہی نہیں کی گئی صرف یہ کہہ دیا جاتا رہا ہے کہ اردو شاعری میں اصلاح کی ضرورت ہے اس طویل اور پرجوش تقریر میں جو محمد حسین آزاد نے انجمن پنجاب کے ایک جلسے میں کی تھی یہی نقص موجود ہے۔ کبھی تو وہ اس شاعری کے جو موجود ہے مکمل ہونے کی تعریف کرتے ہیں کبھی یہ کہتے ہیں کہ برج بھاشا کی تشبیہات و استعارات استعمال کیے جائیں اور عربی اور فارسی کے پرانے صنائع ترک کر دیے جائیں۔ کبھی وہ انگریزی خیالات کے رواج پر زور دیتے ہیں کیونکہ اردو، عربی، فارسی الفاظ اور برج بھاشا کے الفاظ کے ملاپ سے بنی ہے اور ہندو مسلم خیالات کا مجموعہ ہے۔ اس لیے ان کی رائے میں اب یہ ضروری ہے کہ انگریزی خیالات بلکہ الفاظ بھی اس زبان میں رائج کیے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عشقیہ مضامین کو ترک کر دیا جائے اور بہار و خزاں کا بالکل ذکر نہ کیا جائے۔ بالآخر وہ شاعری کرنے کے لیے ایک نمونہ بھی پیش فرماتے ہیں مگر وہ خود بہار و خزاں کا ذکر کرتے ہیں اپنے قلب محزوں کی آہ و بکا کا نقشہ کھینچتے ہیں اور لیلیٰ مجنوں کا قصہ دوہراتے ہیں۔" ۴۸

سرکاری اخبار:

پنڈت اجودھیا پرشاد کی ادارت میں یہ ماہنامہ اخبار یکم مئی ۱۸۵۸ء کو جاری ہوا۔ ۴۹

گنج شائگاں: ۵۰

۱۸۶۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے یہ قانونی ماہنامہ جاری کیا۔ اس کے مدیر پنڈت سورج بھان اور منتظم مولوی فضل الدین تھے۔ رسالہ "گنج شائگاں" بالخصوص منتخب فیصلہ جات و احکام و سرکلرات و ایکٹ ہائے قانون ہند کا سالار تھا۔" لہٰذا اس میں صرف قانونی معلومات ہی درج کی جاتی تھیں۔

بحر حکمت: ۵۱

یہ ۱۸۶۲ء ۵۲ میں پندرہ روزہ اخبار مطبع کوہ نور سے چھپنا شروع ہوا۔ اس کے مالک منشی ہرسکھ رائے اور مہتمم منشی نتھو رام تھے۔

رسالہ انجمن پنجاب: ۵۳

۱۸۶۵ء میں لاہور سے یہ علمی و ادبی مجلّہ جاری ہوا۔ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب کے زیر اہتمام

چھپتا تھا۔ اسی میں انجمن کے جلسوں کی روداد اور مشاعروں کی کارروائی دی جاتی تھی۔

گیاونی پترکا:

یہ ماہنامہ رسالہ لاہور سے یکم جون ۱۸۶۵ء کو پنڈت مکند رام کی ادارت میں اردو ہندی دو حصوں میں نکلتا تھا۔ اس میں زیادہ تر علمی نوعیت کے مضامین چھپتے جو جغرافیہ اور ادب پر مبنی ہوتے تھے۔

خیر خواہ پنجاب:

۱۸۶۵ء میں مولوی سید محمد عظیم نے یہ اخبار حافظ عمر دراز کی ادارت میں ہفتہ وار جاری کیا۔ اس میں بلند پایہ ادبی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ترقی پسندانہ خیالات کا حامل علمی و ادبی اخبار تھا۔ اس کا اندازہ ''ہندوستانی شاعری'' کے عنوان کے تحت مارچ ۱۸۷۳ء کی اشاعت سے ہوتا ہے۔

> ''شعر گوئی کا ہندوستان سے جس قدر تعلق ہے شاید ہی کسی زبان سے ہو مگر بدقسمتی سے بجائے اس کے نئے خیالات تلاش کیے جائیں اور نئی طرح ادا کیے جائیں وہی اسلوب اور وہی صفتیں استعمال کی جاتی ہیں جو متقدمین استعمال کرتے تھے۔ ہندوستانی حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ لکھا جا سکتا تھا۔ متقدمین لکھ چکے ہیں اور اب یہ جز ان کے خیالات دہرانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔''[۵۴]

انجمن پنجاب کے تحت جدید شاعری کے حوالے سے جو تنقیدی شعور ملا اسی کی عکاسی اس وقت کے اخبارات میں بھی کی جا رہی تھی۔ یہی وہ خیالات ہیں جو حالؔی کی مقدمہ شعر و شاعری کا پیش خیمہ بنے۔ جس کا زیر نظر مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

انوار الشمس:

یہ ۱۸۶۷ء میں ہفتہ وار اخبار شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مالک دیوان بوٹا سنگھ اور مہتمم مولوی نبی بخش جبکہ پنڈت سورج بھان اس کے ایڈیٹر تھے۔ اس میں سرکاری قوانین و احکام کا اردو ترجمہ کے علاوہ عدالتوں کے فیصلے بھی نقل کیے جاتے تھے۔

اتالیق پنجاب:

ناظم تعلیمات پنجاب میجر ہولرائیڈ نے جولائی ۱۸۶۹ء[۵۵] میں نامعلوم وجوہات کی بناء پر ''سرکاری اخبار'' بند کر کے اس کی جگہ ماہوار رسالہ ''اتالیق پنجاب'' جاری کیا۔ گارساں دتاسی اپنے خطبہ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء میں اتالیق پنجاب کی بابت ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے۔

"اتالیق پنجاب: یہ اخبار "سرکاری اخبار" کے بند ہونے کے بعد اس کی جگہ شائع ہوتا ہے لیکن سابقہ اخبار کے مقابلے میں ادبی رنگ زیادہ غالب ہے میں نے یہ رائے اس کی چند اشاعتوں کو دیکھ کر قائم کی ہے جو مسٹر ہالرائیڈ ناظم تعلیمات صوبہ پنجاب نے ازراہ لطف مجھے بھجوائی ہیں۔"۵۶

اس معاصر حوالے کی موجودگی یہ ثابت کرتی ہے کہ "اتالیق پنجاب" ہالرائیڈ ناظم تعلیمات پنجاب نے "سرکاری اخبار" کے بند ہو جانے کے فوراً بعد اسی کی جگہ پر جاری کیا ہو گا۔ تبھی گارساں دتاسی نے اس کی چند اشاعتوں کے پیش نظر مذکورہ بالا رائے قائم کی۔ چنانچہ امداد صابری۵۷ اور روشن آراء راؤ۵۸ کا یہ کہنا کہ "اتالیق پنجاب" یکم جنوری ۱۸۷۰ء کو جاری ہوا درست نہیں رہتا۔ "اتالیق پنجاب" کے ایڈیٹر پیارے لال آشوب اور سب ایڈیٹر مولانا محمد حسین آزاد جیسے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ لالہ سری رام مولفہ "خمخانہ جاوید" کے مطابق مولانا آزاد کے بعد مولانا الطاف حسین حالی بھی کچھ عرصہ اس کے سب ایڈیٹر رہے۔۵۹

"اتالیق پنجاب" میں تاریخ، جغرافیہ، اور سائنس پر نہایت مفید تعلیمی و معلوماتی مضامین، سرکاری مدارس کی رپورٹیں اور علمی تبصرے شائع ہوتے تھے۔ مولف "خمخانہ جاوید" بتاتا ہے کہ ماسٹر پیارے لال آشوب اور مولانا محمد آزاد کی ادارت میں خاص و عام میں اس قدر مقبول ہوا کہ اپنے ہمعصر اخباروں پر سبقت لے گیا۔ گارساں دتاسی بھی "اتالیق پنجاب" کی بابت اپنے مقالات میں رطب اللسان رہتا ہے۔

"مسٹر ہولرائیڈ جو پنجاب کے ناظم تعلیمات ہیں اور ایک روشن خیال شخص ہیں اہل ہند کی تعلیمی ترقی کے لیے برابر کوشاں ہیں یہ ماہوار رسالہ ان کی سرپرستی میں بدستور منشی پیارے لال کے زیر ادارت شائع ہوتا ہے اس میں تاریخ، جغرافیہ، سائنس، پر نہایت مفید مضامین ہوتے ہیں جو مسٹر ہولرائیڈ کے فیاضانہ مقصد کی خوب تکمیل کرتے ہیں۔ موصوف از راہ نوازش یہ رسالہ مجھے برابر بھیجتے رہتے ہیں اس کی آخری اشاعت میں تاریخ حکومت انگلستان پر ایک مختصر مضمون ہے۔ انگلستان اور ہندوستان کے بادشاہوں کی ایک فہرست ہے جس میں ان کے عہد حکومت کا مقابلہ کیا گیا ہے اور ایک بیس صفحے کا "کنفیوشس" پر مضمون ہے۔"۶۰

گارساں دتاسی کے مقالہ "ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۱ء میں" کے علاوہ امداد صابری بحوالہ علامہ دتاتریہ کیفی کے توسط سے مارچ ۱۸۷۰ء کے مندرجات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ ماسٹر پیارے لال آشوب کی ترجمہ کردہ "تاریخ انگلشیہ" کا کچھ حصہ قسط وار اس میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ "تہذیب سوئیس" پر ایک معلوماتی مضمون بھی چھپا۔ اس مضمون کے مذکورہ اقتباس سے اس رسالہ کے نہایت رواں سلیس انداز تحریر کا پتہ چلتا ہے:

''اہل یورپ ان کی طباعی اور اولوالعزمی پر جس قدر آفرینی کہیں اور جتنا سراہیں بجا اور زیبا ہے اور کیوں نہ ہو جس کام میں کئی قرن تک بڑے بڑے طاقتور بادشاہوں نے کوشش کی اور گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ وہ آج یورپ والوں کی عالی ہمتی سے ایک فرانسیسی نے کر دکھایا یعنی بحیرہ قلزم و بحیرہ روم کے پاس ریتلی زمین کے ایک قطعہ میں جس کو خاکنائے سوئس کہتے ہیں نہر کاٹ کر دونوں بحروں کو ملا دیا اور اس نہر میں انگلستان اور ہندوستان کے جہازوں کی آمدورفت جاری ہو گئی۔ جہازوں کو پہلے کیپ کی راہ سے گزرنے میں خطرے پیش آتے تھے اور ۱۵ ہزار میل طے کرنے پڑتے تھے اب اس نہر کی بدولت جو ایم ڈی لسپ صاحب کی تجویز سے بنی ہے وہ اندیشے بالکل دور ہوئے اور فقط آٹھ ہزار میل کا راستہ رہ گیا ہے۔۔۔''[۹۱]

''اتالیق پنجاب'' اپنے اسلوب بیان اور پیش کردہ مواد کے حوالے سے بے حد اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی گواہی گارساں دتاسی بھی اپنے مقالہ ۱۸۷۲ء میں اس طرح دیتا ہے کہ ''لاہور کے ماہوار رسالہ اتالیق پنجاب میں جو سلاست اور شستگی کے باعث ممتاز ہے۔ صوبہ جات متوسط کے صدر مہتمم تعلیمات مسٹر ولموٹ (Wilmot) کی رپورٹ کی بابت ۱۸۷۱ء شائع ہوئی۔ یہ پہلی رپورٹ ہے جو مسٹر ولموٹ نے حکومت کے سامنے پیش کی ہے''[۹۲]۔ ۱۸۷۳ء میں بھی ''اتالیق پنجاب'' کامیابی سے جاری رہا۔ اس میں کچھ قابل قدر اضافے بھی ہوئے مثلاً اپنی نوعیت کا منفرد سلسلہ جس کی بابت گارساں دتاسی اپنے مقالہ ۱۸۷۳ء میں لکھتا ہے کہ ''خصوصیت سے قابل ذکر ایک سلسلہ مضامین ہے جن میں قدیم اور جدید ہندوستان کی مشہور خواتین کے تذکرے ہیں۔''[۹۳] لاہور میں اپنی اس خصوصیت کے حوالے سے یہ پہلا رسالہ ہے جس نے نامور خواتین کے تذکرے کو جگہ دی۔ چونکہ ''اتالیق پنجاب'' ایک تعلیمی اور علمی رسالہ تھا اور اس دور میں خواتین کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی تھی اس لیے نامور خواتین کے تذکرے کا سلسلہ بھی اس مقصد کی تکمیل کا ایک اہم حصہ تھا۔ ''اتالیق پنجاب'' چند سال ہی جاری رہا اور غالباً ۱۸۷۳ء یا ۱۸۷۴ء[۹۴] ہی میں بند ہو گیا۔ اس رسالہ کی اہمیت، اسلوب بیان، اس کی مقبولیت اور اس کے بند ہو جانے کے سبب کا تذکرہ لالہ سری رام ''خمخانہ جاوید'' میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ اخبار سرکاری اخبار تھا۔ سالانہ قیمت پبلک کے اخباروں سے نسبتاً کم تھی۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ سرکاری تھا اور زیادہ تر اس باعث سے کہ اڈیٹر و مددگار دونوں نہایت قابل و یگانہ روزگار تھے۔ یہاں تک مقبول خاص و عام ہوا کہ اپنے ہمعصر اخباروں سے بدرجہا بڑھ گیا اس کے مضامین کی خوبی، عبارت کی برجستگی و خوش اسلوبی نے ہر دلعزیز بنا دیا۔ یہ کیفیت دیکھ کر ہندوستانی اخباروں نے گورنمنٹ سے درخواست کی کہ گورنمنٹ رعایا کے مقابلے میں اخبار شائع کرنا در پردہ ملکی لوگوں

کو نقصان پہنچا ہے۔ گورنمنٹ کی عادلانہ پالیسی نے یہ معقول عذر تسلیم کر کے اخبار مذکور کی جگہ
ایک رسالہ پنجاب میگزین کے نام سے جاری کر دیا۔''۶۵

اس طرح ''اتالیق پنجاب'' اپنی مقبولیت کے باعث دیگر ہندوستانی اخبارات کے حسد کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ہمائے پنجاب:

انجمن پنجاب نے تعلیم کے فروغ کے لیے سولہ صفحات پر مشتمل یہ ہفتہ وار اخبار لاہور سے یکم اپریل ۱۸۷۰ء ۶۶ کو اس اخبار کا اجراء کیا۔ اس کے مہتمم پنڈت مکند رام اور ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ تھے۔ ۱۵ جون ۱۸۷۰ء کو مولانا محمد حسین آزاد نے اس کی ادارت سنبھالی۔ مولانا آزاد چونکہ سرکاری ملازم تھے اسی لیے ''ہمائے پنجاب'' کی ادارت کے لیے حکومت سے خصوصی طور پر اجازت لینا پڑی۔ یہ اجازت اس بات سے مشروط تھی کہ اخبار کی ادارت کی وجہ سے ان کے فرائض میں غفلت نہ ہو لیکن جلد ہی ہمائے پنجاب کی ایڈیٹری سے الگ ہو گئے۔ جس کی وجہ ۱۸۷۱ء میں اخبار میں سیالکوٹ کے نامہ نگار کا ایک خط محکمہ ڈاک کی چوری کی بابت شائع کرنا تھی۔ لہٰذا مولانا آزاد کے خلاف کارروائی شروع کی گئی اور ان کی جگہ منشی محمد لطیف کو فروری ۱۸۷۱ء میں اس کی ادارت سونپ دی گئی۔ اس رسالے میں علمی مضامین کے علاوہ انگریزی اخبارات سے ماخوذ ترجمے، اردو ہندی کی نئی کتب پر تبصرہ، نامہ نگاروں کے خطوط اور سرکاری اطلاعات درج کی جاتی تھیں۔ خورشید الاسلام کے مطابق ''آب حیات کا مواد مضامین کی صورت میں اسی اخبار میں چھپتا رہا۔۶۷ اس کے اسلوب نگارش کو لے کر دتا سی ''انڈین میل'' ۱۰ مئی ۱۸۷۰ء کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''اس اخبار کے طرز انشاء پر بھی اعتراض کیا گیا کہ اس میں یوروپین اثر حد سے زیادہ پایا جاتا ہے۔''۶۸

اخبار عام:

یکم جنوری ۱۸۷۱ء ۶۹ کو جاری ہونے والا یہ ایسا ہفت روزہ اخبار تھا جس نے بعد ازاں ۱۸۹۱ء ۷۰ میں روزانہ اخبار کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ یہ شہرت اسے ارزاں قیمت اور خالص اخباری نثر کو فروغ دینے کے باعث ملی۔ ایسے ہی اخبارات کی وجہ سے اخبار، عام اور نچلے طبقہ کی دسترس میں آیا۔ اردو نثر میں خصوصیت کے ساتھ خبریت کے ایسے عنصر کو پروان چڑھایا جو سنجیدگی اور متانت سے متصف تھا۔ اس اخبار کے مالک پنڈت مکند رام اور ایڈیٹر پنڈت گوپی ناتھ سہائے تھے۔ اس اخبار میں خبریں اختصار اور کثیر تعداد میں شائع ہوتی تھیں۔ وقتاً فوقتاً حکومت پر نکتہ چینی اور رائے زنی بھی کیا کرتا۔ بول چند اس کی بابت لکھتا ہے کہ اخبار عام کا اجراء پنجاب میں اردو صحافت کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل ہے۔۔۔ اس اخبار میں بہت زیادہ خبریں چھپتی تھیں یہ نہ صرف

ہندوستان کے بارے میں بلکہ بیرونی ملکوں کے متعلق بھی تازہ ترین خبریں شائع کرتا تھا۔"اے اور یہی اس کی بنیادی خوبی تھی۔ ابتداء میں ہر ملکی، غیر ملکی اور دیسی ریاستوں کی خبریں، مختصر مضامین اور ناول کی طرز پر کہانیاں چھپتی تھیں لیکن بعد ازاں انڈین نیشنل کانگریس کا ترجمان ہو کر سیاسی پرچہ بن گیا۔ اسلوب کے اعتبار سے سیدھا سادا فصیح انداز اختیار کرتے ہوئے کہیں کہیں طنز و مزاح کی سنجیدگی اور بذلہ سنجی کو بھی کام میں لایا جاتا۔ ۱۴ اپریل ۱۸۸۳ء کی اشاعت سے یہ اقتباس اسلوب کی اسی خوبی سے مزین ہیں۔

"پنجاب کے محسن جناب ڈاکٹر جی ڈبلیو لیٹنر (Leitner) کی کلکتہ میں بڑی تعریف ہو رہی ہے کہ جن کی عالی شان کوششوں نے اس خوش قسمت صوبے کی علمی ترقی کو بڑھانے میں یہاں تک کوشش کی کہ پنجاب کالج میں ۸۱ء میں چھ امیدوار امتحان بی اے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ۸۲ء میں فقط دو ہوئے اور اس سال ایک بھی نہیں"

"لاہور - لاء کلاس کے صاحب لیکچرار صاحب نے یہ قانون پاس کیا کہ کوئی دیسی جوتا پہن کر ان کے دربار میں نہ آوے۔"۲ے

اردو میڈیکل گزٹ:

یہ میڈیکل گزٹ ۱۸۷۱ء میں لاہور سے ماہوار شائع ہونا شروع ہوا۔ یہ یونیورسٹی کالج لاہور کے ایک حصہ شعبہ طب (جس کا افتتاح ۲ دسمبر ۱۸۷۰ء کو ہوا) کا رسالہ تھا۔۳ے

پولیس گزٹ:

۱۸۷۱ء میں لاہور سے محکمہ پولیس کی بہبودی و فلاح کے لیے یہ ہفتہ وار اخبار جاری ہوا۔ بقول طاہر مسعود "اس کے ناشر لیفٹیننٹ کرنل ہچیسن انسپکٹر پولیس جنرل پنجاب تھے مطبع سول سیکرٹریٹ میں چھپتا تھا۔ آٹھ صفحات پر مشتمل تھا۔"۴ے

مطلع انوار: ۵ے

۱۸۷۱ء میں لاہور سے اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخط میں سے شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار ہندوؤں کے رسم و رواج اور ان کے عقائد کی حمایت کرتا تھا۔ اس لحاظ سے ہندوؤں کا مخصوص اخبار تھا۔

کوہ طور:

یکم اپریل ۱۸۷۲ء ۶ے کو ہفتہ وار لاہور سے جاری ہوا۔ مرزا تقو بیگ مہتمم تھے جبکہ اس کی طباعت اپنے ہی مطبع کوہ طور پریس سے ہوتی تھی۔ علمی و ادبی مضامین بھی اس کے مندرجات میں شامل ہوتے تھے۔

امیر الاخبار:

یہ پندرہ روزہ اخبار جنوری ۱۸۷۲ء میں مطبع فخر المطابع سے شائع ہوتا تھا۔ جس کے مہتمم مرزا عبدالقادر بیگ تھے۔

حقیقی عرفان:

پنجاب ٹریک اینڈ بک سوسائٹی Punjab Tract and Book Society کے زیر اہتمام ۱۸۷۲ء میں جاری ہوا۔۷۷ؔ

اردو گورنمنٹ گزٹ پنجاب: ۸ؔ۷

یہ سرکاری اخبار پنجاب گزٹ کے نام سے مشہور ہوا جو اردو میں جنوری ۱۸۷۳ء میں لاہور سے مطبع سول سیکرٹریٹ سے ناظم تعلیمات کی زیر نگرانی شائع ہونا شروع ہوا۔ اس کے مہتمم پیارے لال آشوب تھے۔ اس میں سرکاری اطلاعات اور رپورٹوں کے علاوہ سال بھر میں چھپنے والی اردو کتب کی فہرست بھی دی جاتی تھی۔

آفتاب پنجاب:

یہ اخبار ۱۸۷۳ء ۷۹ؔ میں لاہور سے دیوان بوٹا سنگھ نے جاری کیا۔ اس میں بھی دیگر انگریزی اور اردو اخبارات سے خبریں اخذ وترجمہ کی جاتیں تھیں لیکن بنیادی طور پر مقامی معاملات، قومی فلاح و بہبود اور علمی و تعلیمی امور پر مضامین اور خبریں زیادہ تعداد میں شائع ہوتیں تھیں۔ شاعری کا حصہ بھی ہوتا تھا۔ دتاسی کے اس بیان سے کہ "آفتاب پنجاب لاہور کا اردو اخبار پہلے چھوٹی تقطیع کا تھا اب یہ بڑے سائز پر چھپنے لگا ہے اور یہ اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔"۸۰ؔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اپنے عہد کا مقبول اخبار رہا ہو گا پھر اس کی مقبولیت کی وجہ یہ بھی رہی ہو گی کہ اخبار "انوار الشمس" کے بعد اخبار "آفتاب پنجاب" میں بہت بڑی تعداد میں سرکاری احکامات اور قوانین کے ترجمہ کے علاوہ عدالتوں کے فیصلے بھی نقل کیے جاتے تھے۔ تبھی گارساں دتاسی اسے "انوار الشمس" کا جانشین ۸۱ؔ کہتا ہے۔ اس کی ادارت پر مختلف اوقات میں شیخ فقیر محمد، نبی بخش، حافظ عمر دراز فائز، جے گوپال، آیا سنگھ اور دیوان عطار سنگھ فائز رہے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں آفتاب پنجاب ہند فرقہ پرست اخبار بن گیا تھا۔ اس کی خبروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ طنزیہ اور تنقیدی اسلوب اختیار کیا کرتا تھا۔ مثلاً ۲۴ جنوری ۱۸۸۷ء کی اشاعت سے یہ خبر ملاحظہ ہو:

> "امریکہ میں کوئی ایسا مصالحہ ایجاد کیا گیا ہے جس کے ذریعے انسان پرواز جانوروں کی طرح ہوا میں پرواز کر سکے گا۔ نئے پر نئی دنیا کی مخلوق ہے یا کچھ نفسی ٹھٹھا۔ ہم تو جب جانیں کہ کوئی

افلاطون منش ایسا بھی نسخہ ایجاد کر سکے جس سے ہندوستان کا افلاس رفع ہو سکے۔"۸۲؎

ہادی حقیقت: ۸۳؎

یہ اخبار ۱۸۷۳ء میں بابو کیشب چندر سین نے پنڈت مکندرام کی ادارت میں پندرہ روزہ جاری کیا جو مطبع متر بلاس سے شائع ہوتا تھا۔ چونکہ یہ برہمو سماج کا آرگن تھا اس لیے زیادہ تر مذہبی مباحث پر ہی مشتمل ہوتا تھا۔ بقول دتاسی "اس میں خدا کی وحدت کے دلائل پیش کیے جاتے ہیں اور ہندو دہرم کے سچے اصول بیان کیے جاتے ہیں۔ گمراہ اور باطل اوہام کی تردید کی جاتی ہے اور مذموم رسوم کی اصلاح کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے"۸۴؎

روزنامچہ پنجاب:

یکم جنوری ۱۸۷۴ء۸۵؎ میں لاہور سے اردو کا پہلا روزانہ اخبار نثار علی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس میں عمومی نوعیت کی سیاسی وسماجی ودیگر خبریں شائع ہوتیں جن میں سے بیشتر خبریں دوسرے اخباروں سے لی جاتیں تھیں۔

پنجاب میگزین:

۱۸۷۴ء میں "اتالیق پنجاب" کی جگہ حکومت نے مولانا محمد حسین آزاد کی ادارت میں جاری کیا۔

اتالیق ہند:

یہ اخبار یکم دسمبر ۱۸۷۴ء ۸۶؎ کو نادر علی سیفی کی ادارت میں جاری ہوا۔ غالباً "اتالیق پنجاب" سے متاثر ہو کر نکالا گیا اور اسی کا سابقہ استعمال کرتے ہوئے "اتالیق ہند" نام رکھا۔ اس اخبار کا اشتہار ۲۱ نومبر ۱۸۷۴ء کے اخبار "پنجابی" میں چھپا اور اداریے میں اس کا تعارف ان الفاظ میں کرایا گیا:

> "یہ اخبار ایک اچھا اتالیق ہو گا اور عام خبریں دینے کے علاوہ حکومت و رعایا اور ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو مستحکم تر کرنے کے لیے وقف ہو گا اس میں فریقین کا فائدہ ہے ساتھ ہی ساتھ وہ اعتدال کے ساتھ حکومت کے اعمال کی تنقید کرے گا اور ان بدعنوانیوں کا قلع قمع بھی کرے گا جو ملک کی ترقی میں حائل ہیں۔"۸۷؎

اخبار کے مقاصد کا اندازہ اس مذکورہ اشتہار سے لگایا جا سکتا ہے۔ اپنے ان مقاصد میں "اتالیق ہند" کافی حد تک کامیاب رہا۔ اسی لیے تو کئی اخبارات نے اس کے اجراء اور چھپنے والے مواد کے حوالے سے اس کی ستائش کی۔ مثلاً انجمن علی گڑھ کے اخبار ۲۹ جنوری ۱۸۷۵ء کے علاوہ "اخبار انجمن پنجاب" نے بھی اپنی ۸ جنوری ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں "اتالیق ہند" کو ان الفاظ میں سراہا ہے:

"ہم نے اس کے ہر نمبر کو دیکھا جواب تک نکلا ہے اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی ادارت محنت اور قابلیت سے کی جاتی ہے۔ یہ جس اصول پر چل رہا ہے اس پر ہر اخبار کو عمل پیرا ہونا چاہیے۔ یعنی حکومت کے خلوص کے ساتھ اور صاف صاف صحیح مشورہ دینا عوام کی خدمت کرنا اور اپنے کو ان کے احساسات کا ترجمان بنانا۔ اتالیق ہند اس راستے پر بڑی آزادی اور نیک نیتی سے چل رہا ہے اس کے ایڈیٹر سیفی صاحب کو جو ایک مسلمان ہیں علم و فضل سب پر روشن ہے اور چونکہ وہ خود ایک عالم آدمی ہیں اس لیے وہ خود اس اخبار میں بڑے قیمتی مضامین لکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے اخبار کا اجراء صوبہ پنجاب کی خوش قسمتی کا باعث ہو گا اور یہاں اسے بے قدری کی شکایت نہ ہوگی اور وہ مفید کام کر سکے گا۔"۸۸

یہ شہادت ایک معاصر اخبار کی ہے جو اپنی جگہ صائب ہے۔ گارساں دتاسی بھی اس اخبار کے اسلوب کی بناء پر اسے سراہتا ہے کہ "اگر یہ اخبار جاری رہا اور اس کا اسلوب بھی زیادہ پختہ بنا تو اسے ملک کے صف اول کے اخباروں سے شمار کیا جا سکے گا"۸۹ "اتالیق ہند" قدیم وجدید خیالات کی آویزش کی تجویز پر زور دیتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد "اخبار پنجابی" ۳۱ جولائی ۱۸۷۵ء کی اشاعت سے "اتالیق ہند" بند ہو جانے کی خبر ملتی۔

رہبر ہند:

یکم اپریل ۱۸۷۵ء کو منشی نادر علی سیفی کی ادارت میں ہفتہ وار شائع ہوا۔۹۰ جس میں خبروں کے علاوہ مضامین بھی بڑے سلیقے سے دیے جاتے تھے۔ نیز حکومتی اقدامات پر نکتہ چینی کرنے کے ساتھ بہتر نظم ونسق کی تعریف بھی کیا کرتا تھا مثلاً ۱۳ مئی ۱۸۹۵ء کی اشاعت میں سلطان ترکی کے بارے میں انگریزوں کی پالیسی پر نکتہ چینی کی۔۹۱ بقول ڈاکٹر مسکین حجازی "انجمن پنجاب کے صدر ڈاکٹر لائٹنر پر کڑی تنقید کرتا تھا۔"۹۲ اس میں خبریں زیادہ تر عمومی نوعیت کی ہوتی تھیں۔

ہندو بانڈھو:

یکم اپریل ۱۸۷۵ء کو یہ ماہنامہ رسالہ شیو نرائن اگنی ہوتری کی ادارت میں مطبع کوہ نور سے شائع ہوا۔۹۳ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ رسالہ ہندوؤں کی ابتر حالت کو سنوارنے اور اخلاقیات کی اصلاح کے لیے جاری کیا گیا۔ یہ رسالہ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی شائع ہوتا تھا۔

گنجینۂ قانون:۹۴

یہ ماہنامہ رسالہ یکم جولائی ۱۸۷۵ء کو شائع ہونا شروع ہوا۔ خالصتاً قانونی نوعیت کا رسالہ تھا۔ جو خصوصاً

آئین وقوانین کے لیے وقف تھا۔اس کے ایڈیٹر پنڈت سورج بھان تھے۔

ناصر الایمان:

یہ رسالہ ۱۸۷۵ء میں سید نادر علی شاہ سیفی کی ادارت میں شیعوں کی دینی و دنیاوی ترقی کے لیے ۱۶۰ صفحات پر مشتمل نکلتا تھا۔لہٰذا خالصتاً مذہبی نوعیت کا اخبار تھا۔

آریا ساچار گپت رائے میگزین:

یہ ماہنامہ رسالہ ۱۸۷۵ء میں لاہور سے جاری ہوا۔ اس میں اردو نثر میں سائنسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔

مراۃ الہند:

۱۸۷۵ء میں لاہور سے رسالوں یعنی اجزاء کی شکل میں نکلتا تھا۔۹۵

گنجینۂ نظائر:

یکم جنوری ۱۸۷۶ء کو جاری ہوا۔۹۶ یہ انڈین لا رپورٹ (Indian Law Report) کا اردو ایڈیشن تھا اور مطبع کوہ نور میں چھپتا تھا۔

نور الہدیٰ:

یہ ماہنامہ رسالہ جون ۱۸۷۷ء ۹۷ میں قصبہ قصور، ضلع لاہور سے غلام اللہ صدیقی کی زیر ادارت جاری ہوا۔ یہ رسالہ اسلام کی اشاعت کے لیے وقف تھا جو تین حصوں میں منقسم ہوتا۔ اس میں ایک حصہ مذہب، دوسرا ارکان مذہب جبکہ تیسرا تاریخ اسلام سے مخصوص ہوتا تھا چنانچہ خالصتاً اسلامی اخبار تھا جو دین محمدی کے علاوہ کسی اور چیز سے لگاؤ نہ رکھتا تھا۔

حافظ صحت:

یہ ماہوار طبی رسالہ حکیم غلام نبی نے یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو جاری کیا جو مطبع پنجابی سے شائع ہوتا تھا۔حکیم غلام نبی خود ہی اس کی ادارت کیا کرتے تھے۔حکیم غلام نبی فارسی اور عربی علوم پر دسترس رکھنے کے ساتھ علوم طب یونانی کے مستند طبیب کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے تھے۔طب کے موضوع پر اردو اور فارسی میں بلند پایہ مضامین کے علاوہ اسی موضوع سے متعلق کئی اردو نثری کتب ۹۸ کے مصنف نیز میونسپل کمیٹی لاہور کے ممبر بھی تھے۔حکیم صاحب نے اپنا ایک مطب جاری کیا اور اس کے ساتھ ہی ''حافظ صحت'' کے عنوان سے یہ رسالہ بھی نکالا۔

پنجاب پنچ:

۱۸۵۷ء کے بعد کی سیاسی فضا کے بدلنے سے تمام شعبہ ہائے زندگی متاثر ہوئے۔ زندگی کی اقدار اور اس کے رویوں میں تبدیلی نے تہذیب و ثقافت کو بھی تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ نئی اور پرانی اقدار و روایات کے تصادم سے پیدا ہونے والے حالات نے اردو نثر میں صحافتی طنز و مزاح کو جنم دیا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے وسط میں لندن سے نکلنے والے ''پنچ'' سے متاثر ہو کر پنچ اخبارات کا ایک سلسلہ شروع ہوا۔ یہ اخبارات اس قدر مقبول ہوئے کہ مزاحیہ صحافت، سنجیدہ صحافت پر غالب آ گئی۔ ان اخبارات سے بھی اس عہد کے بڑے بڑے ادیب و انشاء پرداز وابستہ رہے۔ جنہوں نے سنجیدگی سے اردو نثر میں مزاح نگاری کے انداز نگارش کو منظم کیا۔

لاہور میں لکھی جانے والی اردو نثر میں طنز و مزاح کے باقاعدہ اثرات کا آغاز ''پنجاب پنچ''۹۹ (۱۸۷۸ء) سے ہوا۔ جسے فتح الدین بسمل نے جاری کیا۔ اس اخبار کی ادارت سے نثار علی شہرت اور منشی محمد دین جیسے انشا پرداز وابستہ رہے۔ مزاح نگاری جو ایک رویے کا نام ہے اور کسی بھی تحریر میں جگہ پا سکتا ہے۔ اس نے ایک سو بتیس برس قبل صنف نثر کے طور پر ''پنجاب پنچ'' کی صورت میں اپنے خدوخال متعین کرنا شروع کیے اور اصلاح کے آلہ کار کے طور پر اپنا کردار ادا کیا۔ ''پنجاب پنچ'' نے طنزیہ، مزاحیہ اور فکاہیہ انداز کے مضامین کے ذریعے زندگی کے ہر پہلو کو نہایت خوبصورتی سے اس طرح اپنا موضوع بنایا کہ معاشرے کی بھرپور سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی مزاح نگاری کے پیرایہ میں متحرک نظر آتی ہے۔ اسی اخبار سے متاثر ہو کر اردو نثر میں لاہور سے کئی طناز پرچے۱۰۰ شائع کیے گئے۔ جس سے طنز و مزاح کی روایت نے انیسویں صدی کے نصف دوم میں ہی اپنی بنیادیں مستحکم کر لی تھیں۔

دہلی پنچ:

مولوی فضل الدین کی ادارت میں یکم جون ۱۸۸۰ء ۱۰۱ کو لاہور سے جاری ہونے والا ایک مزاحیہ اخبار تھا۔ سرسید کے مخالفین کا ترجمان اور انگریزوں کا مخالف تھا۔ اپنی مزاحیہ اور طنزیہ تحریروں میں نکتہ چینی کرنا ہی اس کی بنیادی خوبی تھی۔ اس میں ظریفانہ تحریروں کے ساتھ کارٹون بھی قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کراتے تھے۔ ''دہلی پنچ'' اپنی کارکردگی، فرائض اور اس میں لکھی جانے والی نثر اور اسلوب کا احاطہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> ''یہ ظریف اخبار ملک کے واسطے گلدستہ ظرافت ہے اور آئینہ فطرت اسی کا نام ہے۔ ایک نمکین
> جملہ میں ملک کی رائے ختم کرتا ہے اور بغلیں بجا بجا کر فعایا اور گورنمنٹ کی دوستی کا دم بھرتا ہے
> کبھی بانتیجہ راگوں سے رعایا کو توجہ دلاتا ہے اور ظریفانہ اشعار سے گورنمنٹ اور ملک دونوں کو
> جگاتا ہے۔ نئے روپ بھر کر ملک کے سامنے آتا ہے اور ہر ایک فقرے میں اتنے پتے کی بات

کہہ جاتا ہے۔حروف زوائد کا استعمال نہیں کرتا۔خوشامدانہ بے نتیجہ مضامین نہیں بھرتا اردو زبان کو چمکانے والا ، لفظ زبان قلم ہی سے محظوظ نہیں کرتا بلکہ مضمون کو تصویر کے لباس میں لاتا ہے جس میں سینکڑوں آرٹیکلوں کا مزا آتا ہے۔"۲۰۱

آئینہ ہند:

یہ ماہنامہ یکم جنوری ۱۸۸۳ء۳۰۱ میں مایا داس اور اس کے بیٹے رنگی رام مختار نے جاری کیا۔اس ماہنامہ میں زراعت،صحت و صفائی، فلسفہ و منطق کے بارے میں مضامین شائع ہوتے تھے۔

رفیق ہند:

صحافت میں اردو نثر کی ترقی کو فعال بنانے والا معیاری ہفت روزہ اخبار تھا جو ۵ جنوری ۱۸۸۴ء۴۰۱ کو نامور صحافی اور ادیب مولوی محرم علی چشتی کی ملکیت اور ادارت میں سرسید کے افتتاحی مقالہ کے ساتھ جاری ہوا۔ سرسید تحریک کی حمایت ۵۰۱ اور اس کے شانہ بشانہ مسلمانوں کے سیاسی و قومی حقوق کا علمبردار بن کر قومی خدمت کا فریضہ انجام دینا ہی اس اخبار کی پالیسی تھی۔یوں بنیادی طور پر یہ ایک علمی، اخلاقی، اور اصلاحی پرچہ تھا۔ رفیق ہند کی کارکردگی کے پیش نظر محرم علی چشتی ۱۵ جنوری ۱۸۸۷ء کے شمارے میں اسکے فریضہ کو ان الفاظ میں باور کراتے ہیں:

> "یہ پرچہ انگریزی اخبارات کو پورے نمونے پر محض آزادی سے اپنے قومی حقوق کے اظہار کے لیے جاری کیا گیا ہے۔ یہ حتی المقدور قوم میں عمدہ خیالات اور عام اتحاد کی اشاعت میں سعی کرتا ہے اور پورے طور پر ان کے خلاف قانون زیادتیوں کو ظاہر کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہے جو خصوصاً بیرونجات میں بعض سرکاری عہدہ داروں کے ہاتھوں سرزد ہوتی ہیں۔ جہاں لوگ اپنے حقوق سے اچھی طرح واقف نہیں۔"۶۰۱

اس اخبار کی خوش بختی تھی کہ اسے اپنے عہد کے نامور ادباء اور اہل قلم کا تعاون حاصل رہا ان میں سرسید احمد خان، محسن الملک، وقار الملک، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر لائٹنر، مولوی ذکاء اللہ، مولانا الطاف حسین حالی، خان بہادر قادر بخش ، لالہ لاجپت رائے ،عبدالحلیم شرر، وحید الدین سلیم پانی پتی،عبدالقدوس قدسی،عزیز الدین احمد، محمد علی پُردل، پادری رجب علی، شہسوار علی جگور، نواب محمد عمر علی خان، خلیل الرحمٰن، سید اقبال علی، فقیر سید جمال الدین، مولوی مرزا فتح محمد جالندھری، مولانا غلام قادر گرامی، سید سلیم حسین اغلب وغیرہ شامل تھے۔"رفیق ہند" میں انتظامیہ پر کڑی تنقید کرنے کے ساتھ قومی، سیاسی، مذہبی ،لسانی اور ادبی موضوعات پر باقاعدہ مقالے بھی شائع ہوتے تھے۔ مقالہ نگاری کے حوالے سے اس اخبار نے اردو ادب کی ترویج و اشاعت اور ترقی میں معاون کردار ادا

کیا۔ یہ اخبار اس خصوصیت کی بناء پر بھی اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں مولانا محمد حسین آزاد کا سفرنامہ بعنوان ''مسافر ایران'' ۷۰۷ء اور سر سید احمد خان کی پنجاب آمد (۱۸۸۴ء) پر کوائف نگاری کا معتبر مواد اس اخبار میں محفوظ ہے۔ دینی، تعلیمی، ادبی اور لسانی موضوعات پر مقالات کی اس فہرست سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ''رفیق ہند'' نے مقالہ نگاری کے فن کو کس سنجیدگی سے پروان چڑھایا۔

۱۔	انگریزی محاورات کو اردو میں لانے کا بیان	عبدالقدوس قدسی	۹ فروری ۱۸۸۴ء
۲۔	انگریزی الفاظ کا اردو میں استعمال	عزیز الدین احمد	یکم مارچ ۱۸۸۴ء
۳۔	اردو لٹریچر میں نئے مذاق کی بنیاد	نامہ نگار	ایضاً
۴۔	اردو کی زبان دانی	محرم علی چشتی	۱۵ مارچ ۱۸۸۴ء
۵۔	انگریزی اور اردو کا رشتہ	پادری رجب علی	۲۹ مارچ ۱۸۸۴ء
۶۔	ایضاً	ایضاً	۱۹ اپریل ۱۸۸۴ء
۷۔	ایضاً	ایضاً	۱۰ مئی ۱۸۸۴ء
۸۔	پادری رجب علی اور حضرت قدسی	بجنوری	۷ جون ۱۸۸۴ء
۹۔	اردو زبان پر ایک منصفانہ نظر	جوہر	۲۳ اگست ۱۸۸۴ء
۱۰۔	مسلمانوں کی بدحالی کا مرثیہ	محمد تہور علی	۲۷ ستمبر ۱۸۸۴ء
۱۱۔	تعلیم نسواں	قادر بخش خان بہادر	۱۱ اکتوبر ۱۸۸۴ء
۱۲۔	تعلیم نسواں	راقم بدارد	۷ فروری ۱۸۸۵ء
۱۳۔	ہم اور ہمارا لٹریچر	شہسوار علی جگور	۷ مارچ ۱۸۸۵ء
۱۴۔	مسلمان مستورات کی تعلیم کا انتظام	محرم علی چشتی	۱۶ مئی ۱۸۸۵ء
۱۵۔	مسلمانوں کی تعلیم پر گورنمنٹ ہند کا ریزولیشن	ایضاً	یکم اگست ۱۸۸۵ء
۱۶۔	اردو نظم و نثر کی اصلاح	نواب محمد عمر خاں	۱۲ ستمبر ۱۸۸۵ء
۱۷۔	ہمارے حکام کی ناواقفیت ہماری زبان سے	محرم علی چشتی	۲۸ نومبر ۱۸۸۵ء
۱۸۔	ایضاً	ایضاً	۵ دسمبر ۱۸۸۵ء
۱۹۔	کتاب اسلام و مسلمان	سید محمد حسین اغلب	۱۲ جون ۱۸۸۶ء
۲۰۔	آداب تحریر	خلیل الرحمٰن	۱۹ جون ۱۸۸۶ء

۲۱۔	لاہوری عورتوں کی حالت	پنجابی شیکسپیئر	۱۶اگست ۱۸۸۷ء
۲۲۔	اسلام اور اسلامی مدارس	ڈاکٹر لائٹنر	۱۷ مارچ ۱۸۸۸ء
۲۳۔	قومی نوحہ	وحید الدین سلیم	۱۸اگست ۱۸۸۸ء
۲۴۔	ہم اور سرسید	محرم علی چشتی	۲۲ دسمبر ۱۸۸۸ء
۲۵۔	سرسید اور پنجاب	اکبر علی	۲۹ دسمبر ۱۸۸۸ء ۱۰۸

طب حیوانات:

یکم جولائی ۱۸۸۴ء ۱۰۹ کو لاہور سے یہ ماہنامہ رسالہ جاری کیا گیا۔ایڈیٹر و مہتمم ڈاکٹر محمد دین ڈنری تھے۔ اس میں جانوروں کے امراض اور طریق تشخیص وعلاج کے بارے بتایا جاتا تھا۔اس موضوع پر لاہور میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا۔

آئینہ اخلاق:

یہ ہفت روزہ اخبار ۱۸۸۴ء میں عبدالرحمٰن اور محمد ابو عبدالعزیز نے باہمی اشتراک سے جاری کیا۔اس میں عموی اور مقامی خبریں شائع ہوتی تھیں۔

شفیق ہند:

یہ ہفت روزہ اخبار ۱۸۸۴ء میں مولوی سیف الحق ادیب کی ادارت میں جاری ہوا۔خبروں کی عمومی نوعیت کے اس اخبار میں حکومتی اقدامات پر بے لاگ تنقید کی جاتی تھی۔اس کی اپنے ہم عصر اخبار رفیق ہند سے شدید معاصرانہ چشمک تھی۔جو ۱۸۸۶ء میں اس کے اختتام کے ساتھ ہی ختم ہوگئی۔

''نسیم صبح'' اور ''شام وصال'':

یکم اکتوبر ۱۸۸۴ء میں ان کا اجراء ''شفیق ہند'' (۱۸۸۴ء) کے ضمیموں کے طور پر ہوا۔اپنے ناموں کی مناسبت سے انہی اوقات کار کے ضمیمے تھے۔ان میں ادبی نثر کی جہت نمایاں تھی۔ڈاکٹر مسکین حجازی کے مطابق لاہور میں روزانہ ضمیموں کی اشاعت میں یہ پہلا تجربہ۱۱۰ تھا۔۱۸۸۶ء میں ''شفیق ہند'' کے بند ہو جانے کے ساتھ ہی یہ ضمیمے بھی اختتام پذیر ہو گئے۔

جعفر زٹلی:

یکم جولائی ۱۸۸۵ء میں یہ ہفت روزہ محمد بخش عرف مولانا ڈفل نے جاری کیا۔اس کی ادارت پر محرم علی

چشتی، مفتی حفظ الاسلام، محمد بخش، مولوی الہ دین وغیرہ مامور رہے۔ چونکہ یہ ایک طناز پرچہ تھا اس لیے اس میں چھپنے والی بیشتر تحریریں مزاحیہ اور طنزیہ پیرا یہ میں بیان کی جاتیں تھیں۔ جن کا انداز بیان ناصحانہ ہوا کرتا تھا۔ جسے ہر طرح کے موضوعات میں اختیار کیا جاتا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر ظفر عالم ظفری کے مطابق ''نومبر دسمبر ۱۸۹۷ء کے پرچے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ''جعفرزٹلی'' مرزائیت کے خلاف جہاد کرتا تھا۔ اسلام پسند تھا اور مرزا غلام احمد پر بڑی شدید طنز کرتا تھا۔''۱۱۱ پھر اس کے مزاج کا اندازہ ۲۲ جون ۱۸۸۵ء کے ''سراج الاخبار'' (جہلم) کی اس خبر سے بھی ہوتا ہے۔

> ''پھر آپ جانتے ہیں کہ مولانا منشی عالم فاضل مسٹر پنڈت جعفر زٹلی صاحب بغیر اپنی زٹل لگائے کیوں چپ رہنے والے تھے آپ بھی یکم ماہ جولائی ۱۸۸۵ء سے اپنی بڑ لگانا شروع کر دیں گے اور چیدہ چیدہ مذاقانہ فقرے سنائیں گے کہ ہنستے ہنستے ہر کسی کے دل میں بل نہ پڑ جائیں تو ہمارا ذمہ نذرانہ گویا کچھ بھی نہیں ایک روپیہ بارہ آنے سالانہ پیشگی مع محصول مالیہ کا حساب ندارد۔ بھئی ناظرینوں تمہیں بھی قسم ہے جو آدھ آنہ بھیج کر ایک جھلک نہ دیکھو۔ خدا کی قسم لٹو ہو جاؤ گے۔ زیادہ طول محض فضول۔''۱۱۲

ملا دو پیازہ:

یہ ہفت روزہ ۱۸۸۵ء۱۱۳ میں لاہور سے جاری ہوا۔ احمد بخش اور الہ دین اس کی ادارت پر مامور رہے۔ طنز و مزاح کے انداز میں انگریزوں کی پالیسیوں پر تنقید کیا کرتا تھا۔ خالصتاً مزاحیہ اخبار تھا جس میں سیاسی کارٹون اور مزاحیہ مضامین شائع ہوتے تھے۔ اندازبیان کے حوالے سے ۲۴جنوری ۱۸۸۷ء کی اشاعت سے خبر کا یہ نمونہ ملاحظہ ہو۔

> ''الہ آباد کی رنڈیوں پر بھی ٹیکس کا لگنا سنا جاتا ہے وہ حرام کی کمائی کہہ کر بری ہونا چاہتی ہیں مگر ہماری گورنمنٹ اس پیسہ کو حرام نہیں سمجھتی وہ کہتی ہے کہ اگر حرام بھی ہو تو کچھ پروا نہیں کیونکہ حرام کا مال میٹھا ہوتا ہے۔'' ۱۱۴

لاہور پنچ المعروف پاٹے خان:

یہ اخبار ۲ جنوری ۱۸۸۶ء کو منشی عبدالرحمٰن نے جاری کیا۔ کچھ عرصہ محرم علی چشتی بھی اس کی ادارت پر مامور رہے۔ طنزیہ اور مزاحیہ اردو نثر میں ممتاز حیثیت کے حامل اس ہفت روزہ کی پالیسی کیا تھی؟ اس حوالے سے خبر ''سراج الاخبار'' (جہلم) اپنی ۳ دسمبر ۱۸۸۵ء کی اشاعت میں چھپنے والے اس اشتہار۱۱۵ سے دیتا ہے۔

> ''عالم اخبارات میں ''پاٹے خان بہادر'' کا ظہور انیسویں صدی کا کوئی کم قابل یادگار واقعہ نہیں۔

یہ پولیٹیکل پہلوان جو ظرافت کا لنگوٹ باندھے، مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا ملکی اکھاڑے میں پینترے بدلتا ہوا آ رہا ہے کسی شخص کو اپنا مدمقابل بنانا نہیں چاہتا بلکہ ہندو اور ہندوستانیوں میں دنگل جمانا اس کا فرض خاص ہوگا۔ یہ اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر کھلے بندوں بے دھڑک ان کی گت بنائے گا۔ جو اس کے پیارے ملک کی طرف ذرا سی نظر بد بھی کریں گے اور ملک کو دکھا دے گا کہ انگریزی ظرافت کے مذاق کو ایشیائی جامہ پہنا کر ہر دلعزیز بنا دینا کس کو کہتے ہیں اسکی نئی قسم کی ظرافت اور ٹھیک انگریزی پنچ کا نمونہ بنا دینے کی نسبت ہم بڑے زور سے دعویٰ کرتے ہیں بشرطیکہ ہم کو اپنی نسبت مخالفوں سے اپنے منہ میاں مٹھو کی پھبتی سننے کا خوف نہ ہوتا اس لیے اس امر کا تصفیہ ہم اپنے مبصر قدر دانوں پر چھوڑ دیں گے کہ اس پرچہ نے کہاں تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی اور جدید ظرافت کا مذاق کہاں تک اپنے ملک میں پھیلایا۔''[۶]

''جدید ظرافت'' کے دعویٰ دار ''پاٹے خان'' نے سیاسی و سماجی معاملات میں طنز و مزاح سے اپنی تحریروں کو مزین کیا جن میں مزاحیہ مضامین، نظمیں، لطائف، ساقی نامے اور سلسلہ وار ناول بھی شامل کیے۔ ۱۸۹۰ء میں ''پاٹے خان'' نے اپنا نام بدل کر ''لاہور پنچ'' رکھ لیا تو اس کی اطلاع اس شگفتہ انداز سے دی۔

''اتر دکن والو! آج سے ہم اعلان کرتے ہیں کہ آئندہ کے واسطے ہم نے اپنا نام اور چولا بدل لیا ہے ۔۔۔ چونکہ ہمارے پہلے نام سے تمھیں کسی قدر انس ہو گیا ہے لہذا ہم یہ بھی تمہارے ناز اٹھائیں گے۔ اگر تم کچھ مدت تک ''پاٹے خان'' کے نام سے مخاطب کر لو لیکن آئندہ ہمیشہ کے لیے اپنی جائے ولادت کو پیش نظر رکھ کر ''لاہور پنچ'' کہلائیں گے۔ امید ہے کہ آپ بھی اپنے دل میں اس نام کو جگہ دیں گے۔''[۷]

''لاہور پنچ'' جہاں مغربی تہذیب و معاشرت پر طنز و مزاح کے لہجے میں کڑی تنقید کرتا تھا وہیں سر سید احمد خان پر بھی تنقید کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا جو مغربی علوم و فنون اور زبان کو اپنانے پر زور دیتے تھے۔ اردو نثر کو ''لاہور پنچ'' نے شگفتہ اسلوب بیان دیا۔ جس کی زبان صاف اور شفاف ہے۔ انگریزی تہذیب پر تنقید کا سنجیدہ رویہ بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً یہ نمونہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''انگریز قوم نے اپنے مہذب پن کا ڈھول دنیا میں تو بہت بجایا ہے مگر خبر سے جب دیکھا گیا ڈھول کے اندر پول ہی دیکھا گیا۔ ہماری سمجھ میں تو اس انگریزی تہذیب کے معنی کچھ نہیں آئے جو زیادہ تر بے حیائی اور عشق بازی کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اخبارات میں آئے دن بعض یورپین مردوں اور عورتوں کی ایسی ایسی شرمناک کرتوتیں دیکھی جاتی ہیں جن سے تہذیب کے نام لیواؤں کو تو کچھ شرم نہیں آتی مگر تہذیب کو ضرور شرم آ جاتی ہے۔''[۸]

اس طرح ''لاہور پنچ'' نے طنز ومزاح کے انداز اور زبان و بیان میں تنوع پیدا کیا۔ اگر چہ اس اخبار پر فحش نگاری کے الزامات لگے جو کسی حد تک درست بھی تھے لیکن اخبار کے مجموعی تاثر کے حوالے سے اسے ''مہذب صحافت''[۱۱۹] کا نمونہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس نے تہذیب و معاشرت میں ہونے والی ناروا تبدیلیوں کے راستے پر اپنی طنز ومزاح سے لبریز تحریروں کا بند باندھا اور اردو نثر میں صحافتی مزاح کو ہر دلعزیز بنایا۔

امپیریل پیپر:

یہ ہفتہ وار اخبار ۲۰ مارچ ۱۸۸۶ء کو جاری ہوا۔ اس کے مالک سید رجب علی شاہ[۱۲۰] اور مہتمم سید رحمت علی شاہ تھے۔ اس میں انگریزی ناولوں کے سلیس تراجم کے علاوہ سنجیدہ مضامین بھی کثرت سے چھپتے۔ جس نے اسے اور بھی دلچسپ بنا دیا تھا۔ اس کا منظوم اشتہار چھپتا تھا۔

''رعیت کے مطالب با ادب سرکار عالی سے ہر اک موقع پہ کرنا عرض اس پرچے کا منشا ہے
عبارت شستہ کاغذ خوشنما چھاپہ ظرافت اسقدر جتنا نمک کھانے میں ہوتا ہے
جو انگریزی میں اعلیٰ مضامین اہل یورپ کے اونہیں اردو میں لا کر زیب دینا کام اس کا ہے[۱۲۱]

ہفت روزہ رفیق ہند ۷۔ اپریل ۱۸۸۶ء کی اشاعت میں اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے۔

> ''یہ اخبار جس کے اجراء کا مژدہ ہم اپنے ناظرین کو سنا چکے ہیں بہت آب و تاب سے نکلا ہے آج تک اس کے کئی نمبر نکل چکے ہیں جن کو ہم نے بالاستیعاب دیکھا۔ مضامین کثرت سے ہوتے ہیں اور متانت اور عمدگی سے لکھے جاتے ہیں۔ انگریزی اخبارات اور بعض دلچسپ انگریزی ناولوں کے ترجموں نے اس کو اور بھی پسندیدہ بنا دیا ہے۔''[۱۲۲]

پیسہ اخبار: [۱۲۳]

۱۸۸۹ء میں لاہور سے منشی محبوب عالم کی زیر ادارت ہفت روزہ کی حیثیت سے جاری ہوا۔ جو بعد ازاں ۱۶ مارچ ۱۸۹۷ء[۱۲۴] کو روزانہ ہو گیا۔ ''اخبار عام'' (۱۸۷۱ء) کے بعد دوسرا بڑا اخبار تھا جس نے روزنامہ کی حیثیت سے شہرت اور عروج حاصل کیا۔ ''پیسہ اخبار'' کے مالک و مدیر منشی محبوب عالم کی شخصیت میں ایک صحافی اور ادیب کی خوبیاں بیک وقت مجتمع تھیں۔ انہوں نے اردو صحافت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا جو دراصل اردو نثر ہی کی ترویج و اشاعت تھی۔ ''پیسہ اخبار'' میں ملکی، معاشرتی، صنعتی، اخلاقی، معلوماتی، مضامین اور عام دلچسپ خبریں بڑی متانت اور سنجیدگی کے ساتھ شائع کی جاتی تھیں۔ ان خبروں میں حکومتی پالیسیوں پر بے لاگ تنقید و تبصرہ کرتے

ہوئے اسلوب میں شوخ اور تیکھا پن اختیار کیا جاتا تھا۔ عوامی تحریکوں کی حمایت اور سماجی بہبود کے لیے آواز اٹھانے میں پیش پیش اور اسلامی حقوق کا علمبردار اور آزادیٔ رائے کی حمایت کیا کرتا تھا۔ ہر چند کہ اس اعتبار سے پیسہ اخبار ایک خالص اخبار قرار دیا جاتا ہے لیکن مولوی محبوب عالم کے تحریر کردہ سفرناموں اور اس میں شائع ہونے والے سیاسی ناولوں نے اس اخبار میں ادبیت کے عنصر کو بھی شامل کیے رکھا۔

پیسہ اخبار اس لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ ''کوہ نور'' کے بعد اس کی آغوش میں مستقبل کے کئی نامور ادباء اور صحافیوں[۱۲۵] نے تربیت پائی اور اردو نثر کے ارتقا میں صحافت کو جدید خطوط پر استوار کیا۔ اس اخبار نے اہل اخبار کا خیال علم کی طرف متوجہ کیے رکھا اس کے لیے ولایت کے اخبارات سے عمدہ تراجم شائع کیے جاتے تھے۔ نیز اس کے ایڈیٹر کے لیے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی کا جاننا بھی ضروری خیال کیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد لاہور سے جو اردو اخبارات نکلے ان کے مدیران زیادہ تر انگریزی دان تھے۔ اس سبب نے اردو نثر کو جدید خیالات و افکار سے روشناس کرایا۔

رسالہ شریف بیبیاں:

۱۸۹۳ء[۱۲۶] میں لاہور سے منشی محبوب عالم نے یہ ماہوار رسالہ جاری کیا۔ جس کا مقصد بالخصوص خواتین کی بہتری اور ان کی تعلیم و تربیت کو فروغ دینا تھا۔ اس اعتبار سے یہ نہ صرف لاہور میں نسوانی صحافت کا پہلا رسالہ تھا بلکہ اس نے خواتین کو اردو نثر نگاری کی ترغیب بھی دلائی۔ اپنے پہلے ہی شمارہ ستمبر ۱۸۹۳ء میں منشی محبوب عالم نے اس کے مقاصد بیان کرتے ہوئے لکھا:

> ''رسالہ شریف بیبیاں جاری کرنے سے غرض یہ ہے کہ ہندوستان کی لاکھوں بے زبان مخلوقات (فرقہ نسواں) کی خانہ داری کی تعلیم سے متعلق ایسے امور اس میں درج کیے جایا کریں کہ جس سے نہ صرف ہر ایک گھرانہ بہشت کا نمونہ بن جاوے بلکہ آئندہ نسل کے اٹھان میں بھی اس سے مدد ملے۔ یہ ہے ہمارا ارادہ اب خداوند کریم سے دعا ہے کہ اسے استقلال و استحکام بخشے آمین۔''[۱۲۷]

رسالہ شریف بیبیاں کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں جہاں تعلیم نسواں کی ترقی پر معاشرتی و اصلاحی مضامین دیئے جاتے تھے وہیں معاشرتی و اصلاحی ناول کی طرز پر کہانیاں بھی تحریر کی جاتی تھیں، نسیم آراء کے توسط سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں مستقل عنوانات ممتاز عورتیں، شریف بیبیاں، زنانہ بہادری کی مثالیں، روئے زمین کی عورتیں، انتظام خانہ داری، دسترخوان اور تربیت اطفال وغیرہ تھے۔ رسالے کا بیشتر مواد تاریخی نوعیت کا ہوا کرتا تھا۔

اس کے ذریعے منشی محبوب عالم ماضی کے آئینہ میں خواتین کے حال اور مستقبل کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ''شریف بیبیاں'' کے عنوان سے مستقل کالم لکھا کرتے جو تعلیم نسواں پر مبنی ہوتے تھے۔ رسالہ غالباً ۱۸۹۵ء تک نکلتا رہا۔۱۲۸؎ اس رسالہ کا اسلوب کس قدر رواں اور شفاف تھا اس کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

''عورتوں کی تعلیم کے متعلق آج تک بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عورتوں کو صرف کسی قدر مذہبی تعلیم دینی چاہیے اس سے زیادہ تعلیم کا اثر ان پر بہت بُرا پڑے گا۔ ان کے اخلاق اور حیا کو نقصان پہنچائے گا اور پردہ سسٹم سے باہر جانے کی ترغیب دے گا۔ افسوس ہے کہ ایسے لوگ یہ نہیں خیال کرتے کہ اگر یہی عورتیں جو بچوں کی بہترین اتالیق ہیں۔ جاہل اور نالائق رہ جائیں گی تو ان کے شاگرد (یعنی بچے جو دنیا کی آئندہ آبادی ہونگے) بوجۂ حسن کنندۂ ناتراش اور جاہل نکلیں گے۔ اس سچے اصول کا کوئی بھی توڑ نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی ساری شائستگی کا مدار کسی ملک کی عورتوں پر ہے۔ افسوس ہے کہ بے انصاف لوگ اس بات کو مقدم سمجھتے ہیں کہ عورتوں پر ناجائز حکمرانی کریں۔ ان کو غلامی کے حلقے سے باہر نہ جانے دیں کیونکہ اگر تعلیم کی روشنی ان کی آنکھوں میں بھر گئی تو جہالت کی تاریکی میں وہ زیادہ عرصہ رہنا پسند نہیں کریں گی اور یہ کیسا ظلم ہے کہ عورتوں کو صرف عورتوں کے حیلہ پر جاہل رکھا جائے۔ خواہ نسل ہی مسخ یا یوں کہو کہ منقطع کیوں نہ ہو جائے۔ کیونکہ بُری نسل سے نسل کا منقطع ہونا ہی بہتر ہے۔''۱۲۹؎

زبدۃ الاخبار:

حکیم غلام نبی نے فروری ۱۸۹۵ء میں یہ ہفتہ وار مولوی رؤف کی ادارت میں جاری کیا۔۱۳۰؎ اس رسالے کا مقصد سرکاری ملازمین کے مسائل اور ان کی تکالیف کو ارباب اختیار تک پہنچانا تھا۔ نیز دیسی ریاستوں کے معاملات پر نظر رکھتا اور عدالتی فیصلوں پر آزادانہ تنقید کیا کرتا تھا۔ اپنا نصب العین واضح کرتے ہوئے یکم مارچ ۱۸۹۵ء اشاعت میں لکھتا ہے:

''جوڈیشل عدالتوں کے فیصلوں پر آزادی سے نکتہ چینی کر کے ہر ایک محکمہ اور دفتر کے ملازموں کی تکلیفوں کو گورنمنٹ کی خدمت میں پیش کرنا اور مختلف محکمہ جات کے مستحق ملازموں کے حقوق کو ان کے افسران کے کانوں تک پہنچانا تا کہ وہ مستحقین کے حق کو ضائع نہ ہونے دیں۔ دیسی ریاستوں کے معاملات پر خاص توجہ رکھنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہر ایک معاملہ میں اپنے ہم وطنوں کا یہ اخبار ایک آزاد اور دیانتدار اور وفادار وکیل ہو۔''۱۳۱؎

انتخاب لاجواب:

یہ ہفت روزہ ۱۸۹۵ء میں منشی محبوب عالم اور بابو دینا ناتھ کی ادارت میں جاری ہوا۔ بقول خورشید الاسلام

لندن کے ہفت روزہ ''ٹٹ بٹس'' سے متاثر ہو کر نکالا گیا۔۱۳۲؎ اپنے زمانہ کا اس لحاظ سے منفرد اخبار تھا کہ اس میں علم و حکمت، ادب، سائنسی علوم، رسم و رواج، سوانح عمریاں، افسانے، دلچسپ کہانیاں، پرلطف معلومات اور لطائف کے علاوہ قسط وار ناول بھی چھپتے تھے۔ چنانچہ نہایت کامیاب جریدہ تھا۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جاتی تھی۔ اس کے لیے دنیا کی نہایت دلچسپ اور مفید کتابوں، اخباروں، رسالوں اور تحریروں سے قارئین کو دلچسپ معلوماتی تحریریں بھیجنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ علاوہ ازیں انتخاب لاجواب کی طرز کے پسندیدہ مضامین بھیجنے والوں کو معقول اجرت بھی دی جاتی اور ناظرین کو کئی قسم کے انعام بھی تقسیم کیے جاتے تھے۔

تہذیب نسواں:

مولوی ممتاز علی نے یکم جولائی ۱۸۹۸ء ۱۳۳؎ کو یہ ہفتہ وار رسالہ اپنی زوجہ محمدی بیگم کی ادارت میں جاری کیا۔ لاہور سے جاری ہونے والا یہ دوسرا رسالہ تھا جس نے خواتین کی بیداری؛ ان میں تعلیمی تحریک اور تحریر و تصنیف کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ اخبار نصف صدی تک جاری رہا۔ اس رسالہ کی پیشانی پر یہ عبارت درج ہوتی تھی۔

> ''ہندوستان میں سب سے پہلا زنانہ ہفتہ وار اخبار'' اور پیشانی کے نیچے لکھا ہوتا تھا ''محترمہ محمدی بیگم نے لڑکیوں کے فائدے کے لیے ۱۸۹۸ء میں جاری کیا۔'' ۱۳۴؎

رسالہ ''تہذیب نسواں'' کے مندرجات اس بات کے عکاس ہیں کہ تعلیم نسواں اور اصلاح و تربیت نسواں کے ساتھ ساتھ تعلیمی، مذہبی، ادبی، اخلاقی، معاشرتی، تاریخی، سیاسی، سائنسی نگارشات نے خواتین میں علمی و ادبی مذاق کو جلا دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کیونکہ ''یہ پرچہ جولائی ۱۸۹۸ء میں اس وقت جاری ہوا جبکہ مستورات میں لکھنے پڑھنے کا عام طور پر چرچا نہیں تھا اور نہ فرقہ نسواں کی بہبودی کے لیے کوئی اخبار یا رسالہ ہندوستان میں جاری تھا۔ یہ پرچہ نرالے اغراض و مقاصد کے ساتھ امید و بیم کی حالت میں نکلا کیونکہ اول ہم کو یہ شبہ تھا کہ اس کے دیکھنے والے کہاں سے آئیں گے۔'' ۱۳۵؎ مولوی سید ممتاز علی کی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس زمانے میں مستورات کی لکھائی پڑھائی پر خصوصی توجہ نہیں دی جاتی تھی لیکن ڈاکٹر نسیم آراء کی نشاندہی پر رسالہ ''شریف بیبیاں'' (۱۸۹۳ء) کی موجودگی میں یہ کہنا کہ خواتین کی بہبودی کے لیے کوئی اخبار یا رسالہ نہ تھا درست نہیں ہے۔ البتہ ''تہذیب نسواں'' کو یہ اعزاز ضرور حاصل ہے کہ کسی خاتون کی ادارت میں نہ صرف لاہور بلکہ ہندوستان سے جاری ہونے والا پہلا رسالہ تھا۔

چونکہ ''تہذیب نسواں'' ایک خاتون کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اس لیے خواتین کو بھی اس میں لکھنے کی ترغیب ہوئی۔ تہذیب نسواں کے مندرجات سے خواتین میں تعلیم، رسوم و عقائد، معاشرتی امور کی اصلاح، تہذیب و شائستگی کا فروغ، مذہبی معلومات، علمی و ادبی ذوق کی آبیاری، سیاسی شعور کی بیداری اور تصنیف و تالیف کا شوق پروان چڑھا۔ پہلی بار اتنی بڑی تعداد میں اہل قلم خواتین کے نام اسی اخبار کے توسط سے منظر عام پر آئے۔ جن میں وحیدہ بیگم، آصفہ جہاں، حجاب امتیاز، زہرا فیضی، خاتون اکرم، نذر سجاد، مسز محمد شفیع، بنت خواجہ غلام الثقلین، عباسی بیگم، زاہدہ خاتون، فاطمہ صغریٰ بیگم، احمدی بیگم، آبرو بیگم، عزیز فاطمہ، خورشید بیگم، سلطان جہاں نواب بیگم، حمیدہ بیگم، بلقیس بیگم تاج بیگم، شہزادی بیگم، خدیجۃ الکبریٰ، زبیدہ خانم، صغرا، ہمایوں مرزا، انیس فاطمہ، قرۃ العین وغیرہ شامل تھیں۔[۱۳۶] ''تہذیب نسواں'' کے ذریعے نسوانی دنیا میں صالح اقدار کو فروغ دیا گیا اور اس کے لیے اردو نثر کا سہارا لیا گیا۔ چنانچہ اس رسالہ نے افسانہ، ناول، ڈراما، مضمون کے ساتھ ہر قسم کی صنف نثر کو خواتین میں مقبول بنا کر ان میں لکھنے پڑھنے کے شوق کو رواج دیا۔

کشمیری گزٹ:

یہ ماہوار رسالہ ۱۸۹۹ء میں محمد دین فوق نے جاری کیا۔ جو بعدازاں ''کشمیری میگزین'' کے نام سے بدل دیا گیا۔

مذکورہ اردو صحافتی نثری سرمایے کو پیش نظر رکھیں تو اس میں بے شمار خوبیاں نظر آتی ہیں کہ ان اخبارات میں خبروں کے علاوہ ملکی و غیر ملکی حالات حاضرہ پر تبصرہ؛ تنقیدی و معلوماتی مضامین؛ نظام حکومت کی کج روئیوں پر تنقید؛ سماجی برائیوں اور غلط رسم و رواج کے خلاف فکاہی کالموں میں صدائے احتجاج بلند کرنا؛ قسط وار ناول اور سیاسی، سماجی، لسانی، معاشی مسائل و مباحث پر فکروخیال کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے علوم و ادبیات کے تراجم شائع کیے جاتے جو علم و ادب کے حوالے سے ان اخبارات و رسائل کا بہت بڑا کارنامہ تھا۔

بالخصوص لسانی و ادبی حوالے سے ان اخبارات و رسائل کی اردو نثر کا جائزہ لیں تو یہ خصائص واضح طور پر موجود نظر آئیں گے کہ ان میں اصلاحی رجحان غالب تھا۔ جس سے ادب میں مقصدیت کا عنصر داخل ہوا اور ساتھ ہی مذہبی نقطہ نظر بھی اس میں شامل ہو گیا۔ جدید علوم و فنون پر مضامین لکھنے کا رواج عام ہوا۔ جس سے انگریزی علوم کو اردو زبان میں منتقل کرنے کا کام ہوا اس کے لیے تراجم کی صنف کو بروئے کار لایا گیا۔ انگریزی زبان کو اہل لاہور کے لیے قابل قبول بنایا۔ اس کے لیے طرز بیان میں سادگی اور حقیقت پسندی کا اسلوب اختیار کیا گیا۔ ''رسالہ انجمن پنجاب'' کی بدولت اردو نثر کو نئی اصطلاحات اور الفاظ کے ساتھ ادبی نثر میسر آئی۔ نثر میں تشبیہات و

استعارات کے استعمال کو فروغ ملا۔ جدید سائنسی علوم پر معلومات افزاء مضامین لکھے گئے۔ پہلی بار انگریزی الفاظ کا باقاعدہ اردو ترجمہ کرنے کی جانب توجہ مبذول کی گئی۔ تعلیم اور جدید علوم وفنون کی طرف متوجہ کیا اور انگریزی الفاظ و اصطلاحات کے استعمال کے رجحان کو اردو نثر میں عام کیا۔ شاعری سے متعلق نئے نظریات کو متعارف کرایا اور اس کے اجتماعی افادی نقطۂ نظر پر زور دیا۔ اس کے ساتھ علمی و تخلیقی نثر میں سلاست اور مدعا نگاری کے رجحان کو تقویت دی اور اردو نثر کو ذاتیات کے اظہار کی بجائے معاشرے کی ترجمان بنایا۔ اسی وجہ سے ایک طرف ذہنی تبدیلی کے نئے دریچے وا ہوئے تو دوسری جانب اردو نثر کو موضوع اور اسلوب میں جلا ملی۔

چنانچہ بلامبالغہ ان اخبارات و رسائل نے اردو نثر کو فروغ دینے اور اس کی ترویج و اشاعت میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ نیز ان اخبارات و رسائل کے مدیران کی نثری تحریروں نے اردو نثر میں علمی، مذہبی، اخلاقی، سیاسی، تاریخی، سماجی اور لسانی تصورات میں بالغ نظری پیدا کی اور اسے ترقی کے مدارج پر پہنچایا۔

حواشی:

۱۔ گارساں دتاسی : ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ اول)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت ثانیہ ۱۹۷۹ء، ص: ۱۸۵

۲۔ ''سفرنامہ امین چند'' کی طباعت بھی لیتھو میں ہوئی (''خطبات گارساں دتاسی'' خطبہ۴ دسمبر ۱۸۵۴ء)

۳۔ عبداللہ قریشی (صحیفہ جولائی ستمبر ۱۹۸۴ء ص: ۶۴) اور نور احمد چشتی سید محمد لطیف کے حوالے سے (تحقیقات چشتی، ص: ۳۸) ۱۸۴۹ء ہی کا ذکر کرتے ہیں جبکہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی (''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' ص: ۶۹) کے مطابق ۱۸۴۸ء میں قائم کیا گیا۔

۴۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر کے مطابق اس مطبع کو ۱۸۳۵ء میں انگریز مشنریوں کیپٹن ویڈ (Wade) اور مسٹر لوری (Lowrie) نے قائم کیا اور ۱۸۴۸ء میں منشی محمد عظیم اسے خرید کر لاہور لے آئے اور اس کا نام ''لاہور کرانیکل'' رکھا۔ (''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا'' ص: ۸۵) جبکہ عبدالسلام خورشید کے مطابق ۱۸۳۵ء میں نہیں بلکہ ۱۸۳۳ء میں لدھیانہ میں قائم کیا گیا۔ (''صحافت پاکستان و ہند میں''، ص: ۸۳)

۵۔ عتیق صدیقی: ''صوبہ شمالی و مغربی اخبارات و مطبوعات'' علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، طبع اول ۱۹۶۲ء، ص: ۱۲۶

۶۔ منشی محمد عظیم دہلی کالج کے پروردہ اور تعلیم نسواں کے بہت بڑے حامی تھے۔ اخبار اور پریس کا اچھا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ''لاہور کرانیکل'' (۱۸۴۹ء) اخبار پنجابی (۱۸۵۶ء) دی پنجابی (۱۸۵۷ء) جیسے معتبر اخبارات انہی کے کارہائے نمایاں ہیں۔ اسی وجہ سے عبداللہ قریشی نے انہیں پنجاب پریس کا بانی کہا ہے۔

۷۔ دتاسی کے خطبہ ۱۸۵۱ء میں بھی لاہور کے صرف انہی دو مطبعوں کا ذکر ملتا ہے۔

۸۔ دتاسی کا خطبہ ۵ مئی ۱۸۵۹ء ملاحظہ ہو۔

۹۔ سعدی کا ''پندنامہ'' ہندوستان میں ''کریما'' کے نام سے مشہور تھا اور کئی مرتبہ اس کا ترجمہ چھپا (مقالات گارساں دتاسی (جلد دوم) ص: ۱۹۶) سید سلطان محمود حسین پند نامہ سعدی کی بابت لکھتے ہیں کہ ''فارسی شاعر شیخ شرف الدین مصلح بن عبداللہ (۶۹۰ھ - ۵۸۰ھ ۱۲۹۱ء - ۱۱۸۴ء) کی مثنوی ہے چونکہ لفظ کریما سے شروع ہوئی ہے اس لیے اسے کریما بھی کہتے ہیں۔'' (تعلیقات گارساں دتاسی، ص: ۱۴۱)

۱۰۔ یہ فہرست عتیق صدیقی کی کتاب ''صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات'' سے مرتب کی گئی ہے۔

۱۱۔ عتیق صدیقی : ''صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات'' ص: ۱۲۶

۱۲۔ ۱۸۵۰ء میں شمالی ہند میں چھپنے والے اخبارات میں سے اس کے خریداروں کی تعداد ۲۲۷ تھی جو سب سے

زیادہ تھی (ملاحظہ ہو "ہندوستانی اخبار نویسی" مصنفہ عتیق صدیقی)

۱۳۔ منشی نولکشور سترہ سال کی عمر میں منشی ہرسکھ رائے کے ساتھ شریک کار ہوئے اور چار برس تک مطبع کوہ نور میں کام کرتے رہے ("اردو کے اخبار نویس" جلد اول، ص: ۳۲۲)

۱۴۔ انہوں نے عیسائی مذہب قبول کرلیا تھا بعد ازاں دوبارہ اسلام کی جانب لوٹ آئے لیکن پھر سے عیسائیت قبول کر لی (مقالات دتاسی، جلد دوم، ص: ۴۰۴)

۱۵۔ عبدالسلام خورشید: "صحافت پاکستان و ہند میں"، لاہور، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۳ء، ص: ۱۱۵

۱۶۔ "کوہ نور" لاہور، جلد ۱، شمارہ نمبر ۵۰، ۲۴ جون ۱۸۵۱ء

۱۷۔ "کوہ نور" لاہور، جلد ۴، شمارہ نمبر ۵۱، ۲۰ دسمبر ۱۸۵۳ء

۱۸۔ "کوہ نور" لاہور، جلد ۳۹، شمارہ نمبر ۱۹، ۱۴ جنوری ۱۸۸۷ء

۱۹۔ عبدالسلام خورشید: "صحافت پاکستان و ہند میں"، ص: ۱۱۸

۲۰۔ اس حوالے سے ۲۴ جون ۱۸۵۱ء کا کوہ نور ملاحظہ ہو۔

۲۱۔ امداد صابری: "تاریخ صحافت" (جلد اول)، دہلی، چوڑی والان، یکم جنوری ۱۹۵۳ء، ص: ۳۸۰

۲۲۔ ایضاً، ص: ۳۸۱

۲۳۔ ایضاً، ص: ۲۴۱

۲۴۔ طاہر مسعود: "اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ" لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۴ء، ص: ۲۵۹

۲۵۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر کے مطابق اس کی تاریخ اجراء مولوی احمد بخش یکدل نے اس طرح موزوں کی

"چیست آں تاریخ ایں یک مصرعیت "شد شہانہ مطبع دریائے نور"

۱۸۵۰ء

۲۶۔ ملاحظہ ہو "ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں"۔

۲۷۔ محمد عتیق صدیقی: "صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات" علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند)، طبع اول، ۱۹۶۲ء، ص: ۱۲۸

۲۸۔ محمد عتیق صدیقی: "ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں" علی گڑھ، انجمن ترقی ہند، بار اول دسمبر ۱۹۵۷ء، ص: ۲۵۶

۲۹۔ مسکین حجازی، ڈاکٹر: "پنجاب میں اردو صحافت"، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۵ء، ص: ۱۲۳

۳۰۔ امداد صابری: "تاریخ صحافت اردو (جلد اول)، ص: ۲۶۲ - ۲۶۳

۳۱۔ عتیق صدیقی "صوبہ شمالی و مغربی اخبارات و مطبوعات"، ص: ۱۳۰

امداد صابری (''تاریخ صحافت'' جلد اول) میں اس کی تاریخ اجراء ۱۸۵۵ء بتاتے ہیں جو کہ درست معلوم نہیں ہوتا۔

۳۲۔ نقوش ''لاہور نمبر''، ص: ۸۴۳

۳۳۔ عتیق صدیقی: ''ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں''، ص: ۳۰۵

۳۴۔ بقول عتیق صدیقی ۱۸۵۲ء میں چشمہ فیض کے نام سے ایک پریس لاہور میں کھولا گیا جبکہ تاریخ صحافت کی دیگر کتب کے مطابق چشمہ فیض سیالکوٹ سے جاری ہوا اور حکومت کے حکم پر لاہور منتقل ہو گیا اور ''چشمہ خورشید'' کے نام سے جاری ہونے لگا۔ انقلاب کے بعد سیالکوٹ سے دوبارہ چشمہ فیض کے نام سے جاری ہو گیا۔ (تاریخ صحافت اردو (جلد اول) ''صحافت پاکستان و ہند میں'')

۳۵۔ امداد صابری: ''تاریخ صحافت اردو (جلد اول)، ص: ۲۶۳

۳۶۔ اُردو نثر میں لاہور سے جاری ہونے والا پہلا ماہنامہ ہے۔

۳۷۔ عبدالسلام خورشید: ''صحافت پاکستان و ہند میں''، ص: ۱۳۸

۳۸۔ ڈاکٹر ممتاز گوہر کے بقول منشی دیوان چند نے جاری کیا (پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا، ص: ۸۸) جو کہ درست نہیں ہے کیونکہ امداد صابری نے جو قطعہ تاریخ دیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ منشی ہرسکھ رائے نے ہی اسے جاری کیا۔ (''اردو کے اخبار نویس'' جلد اول، ص: ۲۳۱)

۳۹۔ ''خورشید پنجاب'' لاہور جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر، جنوری ۱۸۵۶ء، ص: ۱

۴۰۔ ''خورشید پنجاب'' لاہور جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۱، جنوری ۱۸۵۶ء، ص: ۲۵ تا ۳۲

۴۱۔ ''خورشید پنجاب'' لاہور جلد نمبر ۱، شمارہ نمبر ۲، فروری ۱۸۵۶ء، ص: ۴۳

۴۲۔ دتا سی کے خطبات اور مقالات کے توسط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اجراء ۱۸۵۷ء میں ہوا۔

۴۳۔ ۲۱ مارچ ۱۸۷۴ء کے ''پنجابی'' اخبار میں ''مقیاس فحش'' مصنفہ پنڈت کشن لال مشمولہ ''اخبار انجمن پنجاب'' ۲۱ فروری ۱۸۷۴ء کا بڑی ژرف نگاہی سے تجزیہ وتبصرہ کرتے ہوئے پنڈت کشن لال کے تصور فحش نگاری کو متعصب پرمبنی قرار دیتا ہے۔

۴۴۔ اس کے لیے اخبار ''پنجابی'' کی یکم مئی ۱۸۷۵ء، ۱۳ فروری ۱۸۷۵ء، ۲۷ مارچ ۱۸۷۵ء، ۱۷ جون ۱۸۷۵ء، ۱۰ مارچ ۱۸۷۷ء، ۱۴ اپریل ۱۸۷۷ء کی اشاعت دیکھی جاسکتی ہیں۔

۴۵۔ ۲۵ اپریل ۱۸۷۴ء، ۳۱ جولائی ۱۸۷۵ء، ۳۰ جنوری ۱۸۷۶ء، ۱۳ مئی ۱۸۷۶ء، ۷ جون ۱۸۷۶ء کی اشاعت ملاحظہ ہو۔

۴۶۔ اس حوالے سے ۱۶ اکتوبر ۱۸۷۲ء، ۵ جون ۱۸۷۳ء ، ۲۰ ستمبر ۱۸۷۳ء، یکم جنوری ۱۸۷۴ء، ۲۷ فروری ۱۸۷۴ء، ۲۱ فروری ۱۸۷۴ء، ۸ اپریل ۱۸۷۶ء، ۲۵ اپریل ۱۸۷۴ء، ۲۰ فروری ۱۸۷۵ء، ۱۰ جون ۱۸۷۶ء ، ۱۷ جون ۱۸۷۶ء کی اشاعت ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔

نوٹ: اخبار پنجابی کی یہ اشاعتیں ''مقالات گارساں دتاسی'' جلد اول اور جلد دوم میں استعمال کیے گئے حوالوں سے مرتب کی گئی ہیں۔

۴۷۔ گارساں دتاسی : ''مقالات گارساں دتاسی'' (حصہ اول)،ص: ۳۵۳

۴۸۔ ایضاً،ص: ۳۰-۳۱

۴۹۔ سرکاری اخبار کا تفصیلاً ذکر مقالہ ہذا کے حصہ 'عدالتی ، دفتری و انتظامی اردو نثر'' کے باب میں ملاحظہ ہو۔

۵۰۔ مقالہ ہذا کے حصہ ''دفتری و انتظامی و عدالتی، اردو نثر'' کی ذیل میں بھی اس کا ذکرملاحظہ ہو۔

۵۱۔ اسی نام کا اردو نثر میں ایک طبی رسالہ ۱۸۷۵ء میں ڈاکٹر رحیم خان کی ادارت میں لاہور سے جاری ہوا۔

۵۲۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر،سید: ''تعلیقات گارساں دتاسی''، لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۷ء،ص:۲۸۲

۵۳۔ رسالہ انجمن پنجاب کا تفصیلی مطالعہ کے لیے مقالہ ہذا میں ''انجمن پنجاب'' کا حصہ ملاحظہ ہو۔

۵۴۔ امداد صابری: ''تاریخ صحافت اُردو''، (جلد دوم)، کلکتہ، حسن زمان رحیم الدین، سن ندادر،ص: ۱۹۹

۵۵۔ امداد صابری اپنی تصانیف ''اردو کے اخبار نویس'' ''تاریخ صحافت (جلد دوم)'' اور ''حیات آشوب'' میں اور روشن آراء راؤ اپنے پی ایچ ڈی کے غیر مطبوعہ مقالہ 'ادبیات اردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار'' میں اس کا سن اجراء یکم جنوری ۱۸۷۰ء لکھتے ہیں جو کہ دتاسی کے ۲ دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبہ کی روشنی میں غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

۵۶۔ گارساں دتاسی : ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ دوم)،ص: ۲۸۳

۵۷۔ ''اردو کے اخبار نویس'' (جلد اول)،ص: ۳۷۷، ''حیات آشوب''،ص: ۱۲۴

۵۸۔ ''ادبیات اردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) لاہور ، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء،ص: ۹۵

۵۹۔ سری رام، لالہ : ''خمخانہ جاوید'' (جلد اول)، دہلی، مخزن پریس، ۱۳۲۵ھ،ص: ۳۶

۶۰۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، طبع دوم، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۰۲-۱۰۳

۶۱۔ امداد صابری: ''حیات آشوب'' دہلی، یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۶ء، ص: ۱۲۷

۶۲۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، ص: ۲۶۴

۶۳۔ ایضاً، ص: ۳۴۹

۶۴۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ۱۸۷۳ء کے بعد ''مقالات گارساں دتاسی'' میں کہیں بھی موضوع مواد اور اسلوب کے حوالے سے اہمیت کے حامل ''اتالیق پنجاب'' کا حوالہ نہیں ملتا جبکہ امداد صابری کے مطابق پانچ چھ سال جاری رہا جو کہ درست نہیں ہے کیونکہ تاریخ کی کتب میں کہیں بھی اس حوالے کی تائید یا تذکرہ نہیں ملتا۔ چنانچہ اغلب یہی ہے کہ ۱۸۷۳ء میں رسالہ ''اتالیق پنجاب'' بند ہو گیا ہو گا۔

۶۵۔ سری رام، لالہ: ''خمخانہ جاوید'' (جلد اول)، ص: ۳۶

۶۶۔ امداد صابری: ''اردو کے اخبار نویس'' (جلد اول)، ص: ۳۹۵

۶۷۔ خورشید الاسلام: ''اردو صحافت'' مشمولہ ''نقوش'' (لاہور نمبر) ص: ۸۴۵

۶۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، ص: ۴۳

۶۹۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، ص: ۳۴۰

۷۰۔ مسکین حجازی: ''پنجاب میں اردو صحافت''، ص: ۱۸۱

۷۱۔ ایضاً، ص: ۱۸۳

۷۲۔ خورشید الاسلام: ''صحافت پاکستان و ہند میں''، ص: ۳۱۲

۷۳۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، ص: ۱۱۴

۷۴۔ طاہر مسعود: ''اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۲ء، ص: ۳۲۵

۷۵۔ گارساں دتاسی نے اپنے مقالہ ۱۸۷۲ء میں اس کا تذکرہ ادبی انجمنوں کے رسائل کے ضمن میں کیا ہے لیکن نشاندہی نہیں کی کہ کس ادبی انجمن کی طرف سے شائع ہوتا تھا۔ ملاحظہ ہو ص: ۲۲۳

۷۶۔ امداد صابری: ''تاریخ صحافت اردو'' جلد اول، ص: ۲۲۲ لیکن دتاسی کے مقالہ ۱۸۷۲ء میں اس کی پہلی اشاعت ۱۶ اپریل ۱۸۷۲ء کی بتائی جاتی ہے۔ دتاسی اسے ادبی انجمن کے رسائل کے ضمن میں بیان کرتا ہے لیکن انجمن کی نشاندہی نہیں کرتا کہ کس انجمن کی جانب سے شائع ہوتا ہے۔

۷۷۔ یہ بھی سائنٹی کا رسالہ تھا، ''مقالات گارساں دتاسی''، (جلد اول) ص: ۲۲۵

۷۸۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، ص: ۳۴۳

۷۹۔ خورشید الاسلام (صحافت پاکستان و ہند میں) ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین (تعلیقات خطبات گارساں دتاسی) اور طاہر مسعود (اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ) میں اس کا سن اجراء ۱۸۷۳ء بتاتے ہیں جبکہ ڈاکٹر مسکین حجازی (پنجاب میں اردو صحافت) ۱۸۶۶ء لکھتے جبکہ امداد صابری (تاریخ صحافت اردو) کے مطابق ۱۸۶۶ء میں کوئی اخبار یا رسالہ شائع ہی نہیں ہوا تھا پھر گارساں دتاسی جو معاصر گواہ ہو سکتے تھے وہ بھی ''آفتاب پنجاب'' کا ذکر اپنے مقالہ ''ہندوستانی زبان و ادب ۱۸۷۴ء میں کرتے ہیں لہذا ثابت ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مسکین حجازی کا دیا گیا سن اجراء درست نہیں۔

۸۰۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص:۷۹

۸۱۔ ایضاً، ص: ۱۸۱

۸۲۔ مسکین حجازی: ''پنجاب میں اردو صحافت''، ص: ۲۳۷

۸۳۔ دتاسی نے اپنے مقالہ ۱۸۷۳ء میں اس کا ذکر کیا ہے (ص:۳۴۰) جبکہ ۱۸۷۷ء کے مقالہ میں بتاتے ہیں کہ شاید یہ ہندو بندھو اخبار کا ہی اردو نام ہے۔ (ص: ۴۸۲)

۸۴۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص: ۳۴۱

۸۵۔ مسکین حجازی: ''پنجاب میں اردو صحافت''، ص: ۱۷۹

۸۶۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص: ۱۸۷

۸۷۔ ایضاً، ص: ۱۸۷

۸۸۔ ایضاً، ص: ۱۸۸

۸۹۔ ایضاً، ص: ۱۸۲

۹۰۔ ایضاً، ص: ۱۸۵

۹۱۔ مسکین حجازی: ''پنجاب میں اردو صحافت''، ص: ۲۰۶

۹۲۔ ایضاً، ص: ۱۸۱

۹۳۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص: ۳۳۱

۹۴۔ دتاسی نے اپنے مقالہ ۱۸۷۶ء میں اسے ''گنجینۂ قوانین ہند'' کے نام سے یاد کیا ہے، (ص:۳۳۰)

۹۵۔ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم)، ص: ۴۹۴

۹۶۔ ایضاً، ص: ۳۳۰

۹۷۔ ایضاً،ص: ۴۸۳

۹۸۔ حکیم غلام نبی کی تحریر کردہ کتب کی فہرست کے لیے ''اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ'' از طاہر مسعود،ص: ۱۷۷ ملاحظہ ہو۔

۹۹۔ ۱۸۹۸ء میں منشی محمد دین نے اپنے والد کے انتقال کے بعد اس کا نام بدل کر''صدائے ہند'' رکھ دیا (اخبار نویسوں کے حالات)

۱۰۰۔ ''دہلی پنچ''(۱۸۸۰ء)، ''ملادو پیازہ''(۱۸۸۵ء)، ''جعفر زٹلی''(۱۸۸۵ء)، ''شیخ چلی''(۱۸۸۵ء)، ''پاٹے خان''(۱۸۸۶ء)،''تیس مارخان''(۱۸۸۶ء)،''اخبار ملکی شہدا''(دہلی پنچ کا ضمیمہ)۱۸۸۶ء، ''شریر'' (۱۸۸۷ء)

۱۰۱۔ ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر: ''اردو صحافت میں طنز ومزاح'' لاہور، فیروز سنز، باراول، ۱۹۹۶ء،ص: ۱۰۸

۱۰۲۔ ایضاً،ص: ۱۰۸

۱۰۳۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر ،سید: ''تعلیقات گارساں دتاسی'' ص: ۲۵۹ جبکہ ڈاکٹر مسکین علی حجازی اس کا سن اجراء ۱۸۸۴ء بتاتے ہیں جو کہ درست نہیں (پنجاب میں اردو صحافت،ص: ۱۲۹

۱۰۴۔ گوہر نوشاہی،ڈاکٹر:''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات''،لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی،۱۹۹۳ء،ص:۲۵۳

۱۰۵۔ خورشید الاسلام کے مطابق ۱۸۸۸ء تک حمایت کرتا رہا لیکن بعد ازاں سرسید سے مذہبی عقائد سے اختلاف کی وجہ سے ان کا زبردست تنقیدی و تنقیصی مخالف بن گیا۔ (اردو صحافت پاکستان و ہند میں)

۱۰۶۔ ''رفیق ہند'' لاہور، شمارہ نمبر ۳، ۱۵ جنوری ۱۸۸۷ء،ص:۱۶

۱۰۷۔ ممتاز گوہر، ڈاکٹر:''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا''، لاہور،مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء،ص:۱۹۹

۱۰۸۔ یہ فہرست مضامین ڈاکٹر ممتاز گوہر کی کتاب ''پنجاب میں اردو و ادب کا ارتقا'' سے مرتب کی گئی ہے۔اس کے لیے ملاحظہ ہوں ،ص: ۱۸۹، ۲۰۰، ۲۰۱

۱۰۹۔ طاہر مسعود : ''اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ،ص: ۲۳۱

۱۱۰۔ مسکین حجازی ، ڈاکٹر:''پنجاب میں اردو صحافت''،ص: ۱۸۰

۱۱۱۔ ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر: ''اردو صحافت میں طنز ومزاح''، لاہور، فیروز سنز، باراول ۱۹۹۶ء،ص: ۱۰۷

۱۱۲۔ مسکین حجازی ، ڈاکٹر:''پنجاب میں اردو صحافت''،ص:۱۷۳

۱۱۳۔ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری اپنی کتاب ''اردو صحافت میں طنز ومزاح'' میں ملادو پیازہ کی ۱۶ نومبر ۱۸۸۵ء کی اشاعت سے حوالہ دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہفت روزہ کا اجراء ۱۸۸۵ء میں ہوا۔ تاریخ صحافت کی

کتابوں میں بیشتر سن اجراء ۱۸۸۶ء دیا گیا ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

۱۱۴۔ مسکین حجازی، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو صحافت''،ص: ۲۳۷

۱۱۵۔ یہ اشتہار کئی ایک مزاحیہ اخبارات میں شائع ہوا جن میں سے ایک اخبار ''ملا دو پیازہ'' ۱۶ نومبر ۱۸۸۵ء کی اشاعت کا حوالہ ڈاکٹر ظفر عالم ظفری نے بھی دیا ہے۔

۱۱۶۔ مسکین حجازی، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو صحافت''،ص: ۱۷۲

۱۱۷۔ ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر: ''اردو صحافت میں طنز ومزاح''،ص: ۱۰۲

۱۱۸۔ طاہر مسعود: ''اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ''،ص: ۲۶۸

۱۱۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: ''انیسویں صدی کا ایک مزاحیہ اخبار پاٹے خاں'' مشمولہ ''قومی زبان'' کراچی، اپریل ۱۹۶۴ء

۱۲۰۔ گارساں دتاسی اپنے مقالہ میں بتاتے ہیں کہ مسلمان سے عیسائی ہو گئے تھے۔

۱۲۱۔ امپریل پیپر، جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۲، ۸ جنوری ۱۸۸۷ء

۱۲۲۔ طاہر مسعود: ''اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ''،ص: ۹۷

۱۲۳۔ پیسہ اخبار کی ابتداء ۱۸۸۷ء میں موضع فیروزوالہ (ضلع گوجرنوالہ) سے ہفتہ وار ''ہمت'' اخبار کی صورت میں ہوئی۔ بعد ازاں اسی اخبار کو ''پیسہ اخبار'' کے نام سے ۱۸۸۹ء میں لاہور سے جاری کیا جوان دنوں بڑا شہر ہونے کے علاوہ اخبارات کا بھی بہت بڑا مرکز بن چکا تھا۔

۱۲۴۔ فوق، محمد دین: ''اخبار نویسوں کے حالات'' لاہور، رفاہ عام سٹیم پریس، اکتوبر ۱۹۱۲ء، ص: ۴

۱۲۵۔ ان میں لالہ دینا ناتھ (ہندوستان) حکیم غلام نبی (الحکما) منشی احمد دین (غمخوار عالم) منشی محمد دین فوق (کشمیری میگزین) مولوی شجاع اللہ (ملت) میر جالب دہلوی (ہمت) منشی عبداللہ منہاس (وکیل)، محی الدین خلیق (ریلوے اینڈ انجیرنگ نیوز) مولانا اسلم جیراج پوری (رسالہ جامعہ دہلی) مرازا علی حسین (''فتح المبین'' ''اخبار وقت'') مولوی رؤف (زبدۃ الاخبار) صوفی مراد آبادی (''اخبار جامع العلوم'' مراد آباد) کے علاوہ ساغر آکبر آبادی اور منشی انجا پرشاد وغیرہ شامل تھے۔

۱۲۶۔ نسیم آراء: ''اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) کراچی، شعبہ اردو جامعہ کراچی، سن ندارد، ص: ۱۳۴

۱۲۷۔ ایضاً، ص: ۲۰۸

۱۲۸۔ کچھ عرصہ بعد جولائی ۱۹۰۹ء میں یہی رسالہ نام بدل کر "شریف بی بی" کے عنوان سے فاطمہ بیگم (منشی محبوب عالم کی بیٹی) کی ادارت میں جاری ہوا۔ (اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ، ص: ۲۱۲)

۱۲۹۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر: فیاض محمود، سید: "تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند" (نویں جلد)، لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۷۲ء، ص: ۴۸۵

۱۳۰۔ طاہر مسعود: "اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ"، ص: ۲۰۴

۱۳۱۔ امداد صابری: "تاریخ صحافت اردو" (جلد سوم)، دہلی، جدید پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۲ء، ص: ۲۷۹

۱۳۲۔ خورشید الاسلام: "صحافت پاکستان و ہند میں" ص: ۳۱۹

۱۳۳۔ نسیم آراء: "اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ" (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) ص: ۲۲۷

۱۳۴۔ حسن نثار: "ایک اور طرح کا کالم" روزنامہ جنگ، لاہور، ۱۶ مئی ۲۰۱۰ء، ص: ۲

۱۳۵۔ افسر عباس زیدی، سید: "شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی (مرحوم)" (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، لاہور ۱۹۶۷ء، ص: ۹۳

۱۳۶۔ نسیم آراء: "اردو صحافت کے ارتقا میں خواتین کا حصہ" (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) ص: ۲۲۷

انیسویں صدی کی آخری
دو دہائیاں اور اردو نثر

انیسویں صدی کے نصف دوم میں اخبارات و رسائل اور بالخصوص درسی نثری کتب میں موجود تاریخ، تذکرہ، سوانح، تنقید، سفرنامہ، رپورتاژ، آپ بیتی، افسانہ، ناول، تمثیل، ڈراما، مضمون، انشائیہ، کالم نگاری اور طنز و مزاح کی روایت غیر محسوس انداز میں پروان چڑھی۔ اخبارات و رسائل کے اجراء اور درسی نثری کتب کی تصنیف و تالیف کے سلسلہ نے علم و ادب سے شغف رکھنے والے افراد کے ادبی مذاق اور مزاج کو تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس طرح اردو نثری اصناف کی اولین صورت پذیری انہی درسی نثری کتب میں رونما ہوئی اور انہی کی آغوش میں ابتدائی پرورش پا کر اپنے خدوخال کو واضح اور متعین کیا۔ لہٰذا اخبارات و رسائل اور درسی کتب بے پناہ اہمیت کی حامل ہیں کہ مستقبل میں مستقل صورت اختیار کرنے والی مذکورہ بالا نثری اصناف کی جڑیں انہی میں پیوست ہیں۔ جسے ان کا عبوری دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ انیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں بالخصوص سوانح، ناول، ڈراما و تراجم کا فن اپنی الگ شناخت کے ابتدائی مرحلے سے گذرتا ہے۔ جس کا احوال ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں **سوانح نگاری** (جس میں خاکہ نگاری کی خوبیاں بھی موجود تھیں) نے مقبولیت حاصل کی اور ایک صنف ادب کے طور پر اپنی پہچان کرائی۔ سوانح جو فرد کی شخصی، نفسیاتی، سماجی، تاریخی اور اخلاقی پہلوؤں کا مرقع ہوتی ہے زبان و بیان کی خوبی اسے ادب کے دائرے میں لے آتی ہے۔ بالخصوص ایک الگ صنف کے اعتبار سے یہ انیسویں صدی کے اواخر میں سامنے آئی۔ جبکہ اس سے قبل سفرنامہ، تاریخ، تذکرہ، مضامین کی صورت میں سوانحی مواد موجود تھا۔ اس ضمن میں درسی نثری کتب ہی ہمیں حوالہ فراہم کرتی ہیں جو بیشتر تاریخ کے موضوع سے متعلق ہیں۔ جن میں تاریخ اور تاریخی شخصیات سے روشناس کرانے کے لیے ان کے مرقع پیش کیے جاتے تھے۔ خاکہ نگاری اور سوانحی نقوش کے آثار ''سفرنامہ منشی امین چند'' ''قصص ہند'' ''رسوم ہند'' ''تواریخ ہند'' ''مختصر تاریخ انگلستان'' اردو کی تیسری کتاب'' ''تاریخ انگلشیہ'' ''نگارستان فارس'' ''واقعہ راجہ رامچندر'' ''واقعہ سکندر'' ''آب حیات'' ''دربار اکبری'' اور انجمن پنجاب میں پڑھے جانے والے مضامین میں دکھائی دیتے ہیں جبکہ درسی نثری کتب سے قطع نظر جو کتابیں اس صنف سے متعلق نظر آتی ہیں ان میں (۱) ''وقائع بابا نانک'' جس میں پنڈت سورج بھان نے بابا نانک کے احوال و واقعات کو بیان کیا ہے۔ یہ کتاب آرکسٹ کی بابا نانک پر ایک تالیف کا ترجمہ ہے جو ۱۸۶۰ء میں لاہور سے طبع ہوئی۔[۱] (۲) ''تذکرۃ المشاہیر'' جس میں منشی سدا سکھ لال نے مشہور و معروف لوگوں کے حالات بیان کیے ہیں۔ یہ کتاب بھی ۱۸۶۰ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ (۳) ''حیات پال'' (۱۸۶۰ء)، ''باغ آدم'' میں انبیاء علیہ السلام کے حالات درج کیے گئے۔ جو ۱۸۶۱ء کے بعد شائع ہوئی۔ (۵) ''سراب عالم اسباب''[۲] (۱۸۷۶ء) مصنفہ مولوی سید نصرت علی قیصر دہلوی[۳] نے اینگلو انڈین حضرات کے احوال

قلمبند کیے ہیں۔ کتاب بارہ ابواب میں منقسم دنیا دار لوگوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ ہر ایک میں انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر بحث ہے مثلاً ان میں شخصی کردار، سعادت، تونگری، اخلاص، بہادری، سمجھداری، مروت، شاعری، خوش اخلاقی وغیرہ شامل ہیں۔ ہر بات میں حکایتوں اور نمونوں کی رنگ آمیزی کرتے ہوئے اسے عملی اخلاق کا پند نامہ بنا دیا ہے جبکہ کتاب کے آخری باب میں نپولین بونا پارٹ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ (۶) ''حدیقۃ الاولیاء'' مفتی غلام سرور لاہوری کا مرتب کردہ سوانحی تذکرہ ہے جو ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں دہلی، لاہور سمیت پنجاب بھر کے مقتدر علماء اور اولیاء کے حالات قلمبند کرنے کے ساتھ قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔ علماء اور اولیاء کی یہ سوانح عمریاں زیادہ تر مناقب، محاسن اور ان کی کرامات پر مشتمل ہیں۔ (۷) ''مدینۃ اولیاء'' اولیائے کرام کے حالات پر قلمبند کیا گیا ایک ضخیم تزکرہ ہے جو تقریباً ۱۲۸۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مفتی غلام سرور لاہور نے اسے چار سال کی محنت شاقہ کے بعد مکمل کیا۔ (۸) ''رحمت عظیم'' مولوی سید نصرت علی قیصر دہلوی نے اس کتاب میں اولیاء اللہ کے حالات درج کیے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔ (۹) ''روضۃ الادبار'' مصنفہ مولوی دین اس میں پرانے حکماء کی سوانح حیات درج ہے۔ ان کے علاوہ ''مخزن حکمت'' ''تاریخ مخزن پنجاب'' اور ''بہارستان تاریخ''، وغیرہ میں بھی سوانحی معلومات کو قدرے مربوط صورت میں بیان کیا گیا ہے۔

یہ وہ سوانحی نثری آثار ہیں جنہوں نے لاہور میں اردو نثر میں سوانح نگاری کے فن کو بنیاد فراہم کی۔ اردو نثر میں سوانح کا فن ابتداء میں زیادہ تر تاریخی کتب کا حصہ رہا ہے کیونکہ سوانح نگاری کو تاریخ ہی کی ایک شاخ تصور کرتے ہوئے ان کے درمیان کوئی فرق روا نہ رکھا جاتا تھا۔ لہذا اول اول سوانح نگاری کا فن تاریخ نگاری ہی کے پیرائے میں تشنۂ تکمیل پاتا رہا اور اپنی باقاعدہ صورت میں انیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں متشکل ہوا۔ اس دور میں جو سوانح عمریاں لکھی گئیں ابتداً ان کو اصلاحی مقصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ چنانچہ مشاہیر کی سوانح لکھتے ہوئے شخصیت کے ایسے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا جو قارئین پر مثبت تعمیری اثر ڈال سکیں اور یہ پہلو زیادہ تر ان کی مذہبی و اخلاقی، بہادری، ہنرمندی اور ان کی مدابرانہ شخصیت کو سامنے لانے پر مشتمل ہوتے تھے۔ نتیجتاً اس دور میں اردو نثر میں سوانحی کتب علمی و ادبی منظر نامے پر اپنی الگ شناخت کے ساتھ نمودار ہوئیں جنہوں نے آگے چل کر فن سوانح نگاری کو رواج دیا۔ اس اعتبار سے درج ذیل سوانحی کتب ملاحظہ کی جا سکتی ہیں جن کا حلقہ اثر نہ صرف لاہور بلکہ پورے پنجاب میں پھیلا دکھائی دیتا ہے۔ ان میں ''سوانح عمری بابا نانک'' از پنڈت ہرگوپال، ''سوانح عمری راجا کرن'' از دیوی پرکاش، ''کبیر منشور'' از سادھو پرمانند داس، ''گورونانک پرکاش'' از گورومکھ سنگھ، ''مہاتما بدھ کی سوانح عمری'' از پنڈت رام ناتھ کوشل، ''راجہ رام موہن رائے کی سوانح عمری'' از منشی نتھو رام نند، آئین سکندر (سکندر اعظم کی سوانح عمری) از منشی

محبوب عالم، ''سوانح عمری رسولؐ'' از سید اقبال علی خان، ''حضرت محمد رسولؐ کی مختصر سوانح عمری'' از مولوی احمد بخش، ''تذکرہ شکسپئر'' (مترجم) میر کرامت اللہ، ''تذکرہ سلطان محمود غزنوی''، ''حالات سعدیؒ'' ''حیات ذوق اور اس کے کلام پر تبصرہ'' اور ''تذکرہ مشاہیر یورپ'' از خان احمد حسین خان، ''سیرت النبیؐ'' از مولوی محمد فیروز الدین، ''سلسلہ تذکرہ المشاہیر نمبر از شیخ محمد یعقوب علی، ''سوانح بابا کبیر'' از موتی رام، ''واقعات مسیحؑ'' از حسام الدین، وگیا نکوش (بابا نانک کی سوانح عمری) از گنڈا سنگھ، ذکر ممدوح (ملکہ وکٹوریہ کی سوانح عمری) از منشی محبوب عالم، ''سیرت فاروق'' از سراج الدین، ''تذکرہ بابر'' از محمد حبیب الرحمان خان، ''تذکرہ تیمور'' از منشی احمد شفیع، ''سرگذشت بوعلی سینا'' از شرف الدین احمد، ''یادگار ذوق'' از ظہور الدین وحشی، ''سرسید احمد خان کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری'' از منشی محمد شجاع الدین، ''مولوی نذیر احمد کے لیکچروں کا مجموعہ مع مختصر سوانح عمری'' از میر کرامت اللہ، ''فضائل اسلام فی ذکر خیر الانام المعروف تاریخ محمدیؐ'' (حصہ اول) از مولوی محمد فیروز الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ انہی کتب نے فن سوانح نگاری کی روایت کو استوار کیا۔

ناول: اردو نثر میں ناول نگاری کو دو عوامل نے تقویت پہنچائی اور اس کے خدوخال سنوارے اول یہ کہ داستانوی انداز میں تحریر کردہ درسی نثری قصے جنہوں نے ناول، ڈرامے اور افسانے کے لیے کہانی اور تراجم کی راہ بھی ہموار کی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ان قصوں کا اثر لاہور سمیت پورے پنجاب میں پھیل جاتا ہے اور قصہ کہانی، افسانے، ناول اور ڈرامے کی ہیئت میں ڈھل کر عام پسند مشغلہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا جہاں جہاں مطابع موجود تھے وہاں سے ناول ڈرامے اور افسانے شائع ہونا شروع ہو گئے۔ لاہور میں ناول کے ناشروں میں خادم التعلیم لاہور کا نام اہم اور قابل ذکر ہے کیونکہ یہ ادارہ نہ صرف ناول شائع کرتا بلکہ نئے لکھنے والوں کی تلاش میں لگا رہتا اور بڑے لکھنے والوں سے ناول بھی لکھواتا۔ مثلاً خان احمد حسین خان کے بیشتر ناول خادم التعلیم لاہور ہی سے چھپے۔

دوم یہ کہ درسی قصے کہانیوں کے ساتھ ساتھ انگریزی ناولوں کے اردو تراجم نے بھی لاہور میں اردو ناول نگاری کی فضا کو سازگار بنانے میں فعال کردار ادا کیا۔ ناول جس میں زندگی کی تصویر کشی کرتے ہوئے تمام ممکنہ تفصیلات کو بروئے کار لاتے ہوئے افراد اور ماحول کے باہمی عمل اور ردعمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے متنوع حالات اور گوں ناگوں کیفیات کا احاطہ کیا جاتا ہے۔ ابتداً رومانوی، مذہبی و معاشرتی اصلاح کے آلہ کار کے طور پر اس صنف کو بروئے کار لایا گیا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں تعلیمی ترقی کی بناء پر بہترین مذاق رکھنے والا طبقہ وجود میں آیا جس کی تنقیدی حس نے اچھے بُرے ناولوں میں تمیز کرنا شروع کی اور ایسے ناولوں کو اہمیت دی جانے لگی جو

مذاق اور فن کے معیار کو بہتر سے بہتر بنا سکتے تھے۔ اس احساس عمل نے اچھے طبعزاد ناولوں کی اہمیت اور ضرورت کی جانب متوجہ کیا۔ اس سے انگریزی کے متعدد اخلاقی، اصلاحی، مذہبی، معاشرتی، کرداری، تاریخی، رومانی، تخیلی، جاسوسی اور علمی فلسفیانہ ناول نہ صرف اردو میں منتقل ہونا شروع ہو گئے بلکہ ان کے ذریعے ادبی ذوق کا حامل طبقہ انگریزی ناولوں کے خیالات، مذاق اور فنی رموز یعنی مرکزی خیال، کہانی، پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، زمان و مکان، منظر نگاری، جذبات نگاری، اسلوب بیان اور مقصد حیات وغیرہ سے آشنا ہوا۔ جی ڈبلیو ایم رینلڈز (G.W.M. Reynolds) ان مغربی ناول نگاروں میں سے ہے جس کے کم و بیش چالیس ناولوں کے اردو تراجم ہوئے جن میں سے کچھ تراجم کی نشاندہی ہو پائی ہے جو لاہور سے شائع ہوئے۔ اس حوالے سے عظیم الشان صدیقی لکھتے ہیں:

> ''بت کیمین'' جو رابرٹ کیسیورینا کا ترجمہ ہے۔ تین جلدوں میں ہے مترجم کا نام بی ایم کار ہے یہ ترجمہ ۱۸۹۲ء میں گلشن ہند پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔ رینلڈ کے اس ناول میں مافوق الفطرت عناصر بھوت پریت کا بھی سہارا لیا گیا۔ ''نیرنگی فلک'' میری اسٹوارٹ ملکہ سکارٹ لینڈ کا ترجمہ ہے یہ ترجمہ مولوی نوازش علی خان شاہ جہانپوری نے لالہ دوارکا ناتھ کمپنی لاہور کے لیے کیا تھا۔ جو ۱۸۹۳ء میں وکٹوریہ پریس لاہور سے شائع ہوا۔ اس کے حصہ دوم کا ترجمہ بھی ایم کمار نے کیا ہے۔ رینلڈ کا یہ تاریخی ناول ہے اس میں اس زمانہ کو ناول کا موضوع بنایا گیا ہے۔ جبکہ فرقہ پروٹسٹنٹ کی سرگرمیاں عروج پر تھیں اور کیتھولک مذہب کے ماننے والوں سے ملکہ کے ہنری سے شادی کرنے پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا اور بعد میں ملکہ کو قتل کر دیا تھا۔ مولوی شفیع الدین خان نے رینلڈز کے ناول ''پگوری'' کا ترجمہ ''جذبہ الفت'' کے نام سے کیا تھا یہ ناول بار چہارم میں خادم التعلیم پریس لاہور سے شائع ہوا تھا۔''[۴۲]

عظیم الشان صدیقی ہی کے توسط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ پنڈت موتی لال نے ڈاکٹر گریکری کے انگریزی ناول کا ترجمہ ''طلسم فرہنگ'' یعنی ''سحر جلال'' کے نام سے کیا جو ۱۸۶۸ء سے قبل شائع ہوا کیونکہ اس کی دوسری اشاعت ۱۸۶۸ء میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ اس ناول کا قصہ ایک اخلاقی اور معلوماتی ناول کی ہیئت میں بیان ہوا ہے۔ خطوط کی تکنیک کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف موضوعات پر اظہار خیال کیا اور مفید معلومات کو جمع کر دیا گیا ہے۔ مقالہ نگار کے مطابق چونکہ مولانا آزاد کے ناول ''نصیحت کا پھول'' (۱۸۶۴ء) میں بھی خط کی تکنیک کو بروئے کار لایا گیا ہے۔ اس لیے اغلب ہے کہ موتی لال جو اس وقت لاہور میں پنجاب گورنمنٹ کے میر منشی تھے ان کا ترجمہ کردہ ناول ''طلسم فرہنگ'' ۱۸۶۴ء سے قبل لاہور سے چھپا ہو گا۔

بیشتر تراجم میں ایک نئی اختراع یہ کی گئی کہ ان میں اشعار وغیرہ کو بھی برتا گیا۔ جس کا مقصد ادبی ذوق کی تسکین اور قصہ کو پرکشش بنانا تھا۔ پھر اکثر ناولوں کی کہانی کو زیادہ مانوس بنانے کے لیے تراجم شدہ ناولوں میں قطع و برید سے کام لے کر اکثر کرداروں کے نام بدل کر انہیں ملکی ماحول اور معاشرت میں ڈھال کر پیش کیا گیا۔ چنانچہ اس طرح آہستہ آہستہ ناول کے فن نے ترقی کے مختلف مراحل طے کرنا شروع کیے۔ علمی ادبی شخصیات کی طبع آزمائی نے اسے تقویت دی۔

مولوی سید ممتاز علی نے علم و ادب سے شغف رکھنے کی بناء پر اپنی زندگی کا بیشتر حصہ علمی و ادبی مشاغل میں صرف کیا۔ مغربی ناولوں سے تراجم کے سلسلہ میں انہوں نے بھی ۱۸۸۸ء میں ایک ناول ''شیخ حسن'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ جسے سید امتیاز علی تاج نے ۱۹۲۰ء میں دارالاشاعت سے شائع کیا۔ یہ وہ دور تھا جب مولوی سید ممتاز علی لاہور چیف کورٹ میں بحیثیت مترجم ملازم تھے۔ مولوی صاحب کی علمی کاوشوں سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں روحانیت سے خاص لگاؤ تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناول کا بنیادی موضوع روحانیت پر مبنی ہے اور دوسری وجہ یہ کہ ابتداء میں ناول زیادہ تر اصلاحی رنگ لیے ہوئے تھے اس لیے بھی اس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہوگا۔ قصے کا مرکزی کردار شیخ حسن جس پر ناول کا نام رکھا گیا ہے روحانیت کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ ناول میں سفرنامہ کی تکنیک کو بروئے کار لایا گیا ہے اس لیے سید امتیاز علی تاج نے اس کے دیباچہ میں اسے بیک وقت قصہ اور سفرنامہ کی ذیل میں شمار کیا ہے۔ قصہ اپنی بناوٹ کے اعتبار سے ناول کے فنی تقاضوں کو حتی المقدور پورا کرتا ہے۔ قصے میں رومانوی رنگ کو شامل کرتے ہوئے روایتی رقیب کے کردار کو بھی قصے کا حصہ بنا دیا ہے۔ مذکورہ ناول ابتدائی کاوش ہونے کے باوجود ترجمہ نگاری کی عمدہ مثال ہے۔ آج سے ایک صدی قبل لکھے جانے والے اس ناول میں فنی تقاضوں کو اس خوش اسلوبی سے نبھایا گیا ہے کہ دلچسپی کا عنصر برقرار رہتا ہے۔

انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں ایک نمایاں ناول نگار کے طور پر خان احمد حسین خان لاہور کے ادبی منظر نامے پر نمودار ہوئے اور علمی و ادبی حوالے سے اہمیت اختیار کر گئے جو جدید ادبی مذاق کے حامل تھے۔ ناول نگاری پر انہوں نے خصوصی توجہ دی اس دوران یکے بعد دیگرے ان کے ناول ''قتل عمد'' (۱۸۹۵ء) ''سادھو کی کرتوت'' (۱۸۹۵ء) ''فتنہ'' (۱۸۹۵ء) ''جوانمردی'' (۱۸۹۵ء) ''آئینہ روزگار'' (۱۸۹۶ء) ''شامت اعمال'' (۱۸۹۶ء) ''تصویر رسوائی'' (۱۸۹۸ء) ''آفت ناگہانی'' (۱۸۹۷ء) ''افغانی چھرا'' (۱۸۹۹ء)، ''مسٹریز آف امرتسر'' (۱۸۹۹ء) ''حسرت'' (۱۹۰۰ء) ''تخم بدی'' (۱۹۰۰ء) اشاعت پذیر ہوئے۔ خان احمد حسین خان نے اپنی زودنویسی کی بناء پر ناول کے فن کو نہ صرف رواج دیا بلکہ اس میں قصہ پن کے عنصر کو بھی پروان چڑھایا۔ ان کے بیشتر ناولوں

میں اخلاقی اور اصلاحی رنگ غالب ہے۔اس لحاظ سے ان کے بیشتر ناول معاشرتی ناول قرار دیئے جا سکتے ہیں۔اس زمانے میں قصہ نگاری کے میدان میں نئے آنے والوں کے ذہن میں مغربی ناولوں سے جو حقیقت پسندانہ سوچ نشوونما پا رہی تھی اس نئے شعور کی عکاسی ''آئینہ روزگار'' کا تعارف کراتے ہوئے ان الفاظ میں کی ہے۔ جو اس عہد کے لکھنے والوں کی ذہنی وفکری عکاسی بھی ہے۔

''آجکل عوام الناس کا میلان زیادہ تر قصہ خوانی کی طرف ہے۔ چنانچہ کوئی بوستان خیالِ خیال کے سبع سیاع میں رستم ہفت خوانی گاؤ زوریوں کا نمونہ دکھلاتے ہیں کوئی اجرام راجام کے بارہ مرحلوں کی نیرنگیوں پر دم بخود ہیں۔کوئی مہتر توفیق کی عیاریاں جشن کتاب خوانی کی تیاریاں شمع تاجدار کی نازک ادائیاں، زہرہ جبیں کی دلربائیاں دیکھ دیکھ کرتے ہیں کوئی امیر حمزہ پڑھتے پڑھتے عمرو کی زنبیل میں گم -کوئی طلسم ہوشربا میں صم وبکم - جن کم بضاعت افلاس زدوں کو اسقدر استطاعت نہیں کہ کوئی قیمتی حصہ خرید سکیں وہ گل بکاؤلی ،اگر گل، فسانہ عجائب سروشِ سخن وغیرہ سے ہی اپنا دل خوش کر لیتے ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ فسانے اپنی اپنی طرز میں بے نظیر ہیں مگر اب وہ زمانہ نہیں کہ ہر جگہ عشق و عاشقی کی گرم بازاری ہو۔محبت کا نام آئے تو مجنوں اور فرہاد طفل مکتب بنیں۔ بہادری اور مردانگی کا ذکر آئے تو رستم وسہراب کا زہرہ آب ہو جائے۔سردی زمستان میں اس بلا سے پالا پڑے کہ کرہ ناری زمہریر ٹھہرے۔آندھی کے زور سے چراغ زردشت گل ہوں۔ بھونچال رجعت قہقری ٹھہرے۔ بارش آئے مگر طوفانِ نوح کی آبرو پر پانی پھر جائے۔ بھوت پریت، جنات، عفریت کا یہ عالم کہ تل رکھنے کی جگہ نہ رہے غرض مطلب چاہیے۔غت و بود ہی کیوں نہ ہو جائے۔ بے پر کے تیتر اڑا کے پر کا کوا ضرور بنے۔غلو تو در کنار اس تبلیغ سے کام جائے کہ اغراق بھی غرق ہو۔

آجکل کے مہذب معاشرے اس قسم کی کتابوں کو وقت کا دشمن سمجھتے ہیں اور سیاست مدن کی رو سے محنت لاحاصل خیال کرتے ہیں۔مغربی لٹریچر میں بھی ایسے بہت فسانے موجود ہیں۔مگر زمانہ کی چال کے موافق گذشتہ دو صدیوں سے اس قسم کی تحریروں نے ایسا روپ بدلا ہے کہ اب ناول ایک سچا واقعہ معلوم ہوتا ہے۔اسی کتاب کے لکھنے سے مجھے یہ مدنظر نہیں کہ میں کسی گنتی میں آجاؤں صرف مذکورہ خیالات سے مغربی ناول کی طرح پر ''آئینہ روزگار'' مشرقی روزانہ واقعات کا مرقع ہے جس کی ہر ایک فصل میں ایک نہ ایک اخلاقی نتیجہ پایا جاتا ہے۔''[۵]

ان کے ناولوں کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ''آئینہ روزگار'' فتنہ، سادھو کے کرتوت، حسرت، قتل

عمد، افغانی چھرا، اصلاحی رجحان کے معاشرتی ناول ہیں۔ ''مسٹریز آف کورٹ آف لندن'' مصنفہ رینالڈز کی تقلید میں لکھے گئے۔ ناول مسٹریز آف امرتسر میں رومانی احساس غالب ہے جبکہ ''جوانمردی'' ایک تاریخی ناول ہے۔

ناول نگاری کے فن کو جدت کے راستے پر گامزن کرتے ہوئے مقبول صنف ادب بنانے میں طبعزاد اور ترجمہ شدہ ناولوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جن میں ''دوستی'' ازمنشی محمد دین، ''انارکلی'' اور ''عصمت آراء'' از محمد دین فوق، ''پدمنی'' ازمنشی بہاری لال، ''ڈریا کمین''، موتیوں کا جزیرہ (جلد اول و دوم) ''برگنڈی کی شہزادی'' ''فسانہ عجیب الخلقت'' ''شہر پیرس کے اسرار''(جلد اول) ''عمر پاشا'' حصہ اول و دوم (رینلڈز کے ناول کا اردو ترجمہ) ''دربار لندن کے اسرار (رینلڈز کے ناول کا اردو ترجمہ) ''بوسہ بیکار'' اور ''بشا بھرکشا'' (بنگالی ناول کا اردو ترجمہ) مولوی غلام قادر فصیح کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ''صدائے الم'' ''فرحت'' ''یادگار حسین'' ''صداقت'' ''دلنواز'' اور ''بزم خیال'' (حصہ اول) وغیرہ مرزا سلطان احمد نے لکھے۔ جن کو تاریخی ناول نگاری کے حوالے سے پنجاب کا سروالٹر سکاٹ کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ''قصہ پورن بھگت'' از محمد صدیق، ''قصہ ہاروت و ماروت'' از محمد عبدالرحمٰن، ''ثمرہ دیانت'' قاضی عزیز الدین احمد، ''حامد اور دل بہار'' ازمنشی ارشاد نبی، ''سولہ سہیلیاں'' از سالک رام، ''سچا یاتری'' از لالہ دولت رام، ''سلکِ مروارید'' (مترجم) منشی محبوب عالم، مبارک اور اس کی دلربا ''روپ سنگھار'' از سید مملوک علی شاہ مملوک، ''نیرنگ فلک'' (رینلڈز کے ناول Mary Stuart کا ترجمہ) از مولوی نوازش علی، ''سلسلہ حیرت خیز نمبر ا - بحر تحیر'' مصنفہ مولوی نوازش علی، ''شرابی کی بیوی'' از میر کرامت اللہ ''لذات الحیات'' از حافظ فخر الدین، ''حق پرست'' از پنڈت رامیشور ناتھ، ''فریاد ہند'' ''عجیب وغریب ناول خوشحالی'' اور ''انڈیا و برطانیہ'' مصنفہ لالہ گوجر مل، ''مسٹریز آف لاہور'' از لالہ وزیر چند، ''کارروائی مقدمہ قتل'' بابو ہیرا لال، ''مختصر حکایت کا سلسلہ'' از پنڈت شیو نرائن، ''واقعات عجیبہ'' ازمنشی غلام نبی، ''ہنستے ہی گھر بستے ہیں'' از مرزا عبداللہ، ''سر دلبراں'' از مولوی سید احمد، ''ثمرہ عصمت'' (انگریزی ناول کا ترجمہ) از دیوان بشن سنگھ، ''زندہ دل'' از لالہ ہری داس، ''شرمیلی'' مولوی سید احمد یاس، ''قزاق'' از قاضی عزیز الدین احمد، ایک عبرت ناک وقعہ'' از گوجر مل، ''سلطان اور حشمت آراء'' از سید محمد مصطفیٰ خورشید، سیر ظلمات (رائیڈر ہیگرڈ کے انگریزی ناول People of the Mist کا اردو ترجمہ) از مولانا ظفر علی خان، ''شمع سحر'' (لارڈلٹن کے انگریزی ناول کا ترجمہ) از خان احمد حسین خان، وغیرہ ایسے ہی ناول بیسویں صدی میں اردو ناول کو کئی اقسام واقعاتی ناول، کرداری ناول، مہماتی ناول، جاسوسی ناول، صحافتی ناول (قسط وار اخبارات میں شائع ہونے والے) معاشرتی ناول، تاریخی ناول، نفسیاتی ناول اور رومانی ناول کو مضبوط بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ مذکورہ فہرست پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ ڈراموں کی طرح ترجمہ شدہ ناولوں کے تتبع میں طبعزاد ناول نگاری کا

آغاز ہوا۔ جس میں رومانی ہی نہیں بلکہ مذہبی و معاشرتی اصلاح کے آلہ کار کے طور پر بھی ناول کی صنف کو استعمال کیا گیا۔

ڈراما: لاہور میں انیسویں صدی کے اواخر میں اردو نثر میں ایک اور صنف نثر ڈراما کا آغاز ہوا۔ عام مفہوم میں ڈراما ایسی صنف ادب ہے جس کے ذریعے انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو الفاظ اور عمل کے ذریعے کر کے دکھایا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ انسانی زندگی کی نقالی ہے جو حرکات وسکنات کے ساتھ مکالموں کی صورت میں جذبات و احساسات کی تصویر کشی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس سے ڈراما کی دو اقسام المیہ یا حزنیہ اور طربیہ وجود میں آتی ہیں۔ ابتداء میں ڈراما تھیٹر سے مخصوص تھا۔ لاہور میں ڈراما بظاہر کوئی نئی چیز اس اعتبار سے نہ تھا کہ تمثیل نگاری کی صورت میں ماسٹر پیارے پیارے لال آشوب، مولوی کریم الدین، عزیز الدین خان اور سب سے بڑھ کر مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں میں اسی کے آثار موجود تھے۔

لاہور کی اردو نثر میں جلوہ گر ہونے سے قبل اردو ڈراما کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو اس کی ابتداء یونانیوں نے کی اور اردو میں اس کا باقاعدہ آغاز منظوم رہس اور ناٹک سے ہوا۔ جو امانت لکھنوی کے ''اندر سبھا'' (۱۸۵۱ء) کی صورت میں موجود ہے۔ بعد ازاں راجا گوپی اور جالندھر (۱۸۵۳ء) منظر عام پر آتا ہے۔ جس پر ڈاکٹر اے بی اشرف واجد علی شاہ اختر پیا کے ناٹک ''رادھا کنہیا'' (۱۸۴۳ء) کو اس سے دس سال قبل لکھے جانے کی وجہ سے اردو کا پہلا ڈراما قرار دیتے ہیں جبکہ پہلا نثری ڈراما احمد حسن وافر کا ''بلبل بیمار'' (۱۸۵۶ء) ہے۔ بمبئی میں ڈرامے کی ابتدا ۱۷۵۰ء میں ہوئی اس کے بعد بنگال (۱۸۵۲ء) اور ۱۸۵۳ء میں پارسی تھیٹر کی ابتداء ہوئی۔ جو خالصتاً کاروباری اور تجارتی اغراض و مقاصد پر مبنی تھی۔ ان تھیٹر سے متعلق مصنفین کو نہ تو ڈرامے کے فنی تقاضوں سے شناسائی تھی اور نہ ہی ادب سے کوئی لگاؤ تھا کیونکہ ان کا مقصد نئے تجارتی مراکز کی روز افزوں آبادی کے لیے تفریح مہیا کرنا تھا۔ لہٰذا ایسے ڈراموں کا کوئی مرتبہ نہ تھا۔ ہر چند کہ ڈراما زندگی کی ترجمانی کے ساتھ تفریح کا سامان بھی بہم پہنچاتا ہے اور یہ تبھی ممکن ہے جب ڈراما اسٹیج اور ادب کے امتزاج سے اپنا پیکر تخلیق کرتا ہے۔ چونکہ ڈراما دوررس تہذیبی نتائج کا حامل ہوتا ہے اس لیے اس کی تشکیل میں ادب کے ساتھ دیگر فنون لطیفہ، موسیقی اور رقص بھی اس کا حصہ بنے۔ بہت سی تھیٹریکل کمپنیاں وجود میں آ ئیں۔ جن کو نسر وان جی مہروان آرام، شیخ محمود احمد رونق، غلام حسین المعروف حسینی میاں ظریف، حافظ عبداللہ، مرزا نظیر بیگ، پنڈت ناٹک پرشاد طالب، سید مہدی حسن احسن لکھنوی، پنڈت نرائن پرشاد بیتاب نے ڈراموں کے رونق بخشی۔

بیشتر تھیٹریکل کمپنیاں بمبئی میں تھیں جبکہ لاہور میں البرٹ تھیٹریکل کمپنی آف پنجاب (مہتمم ماسٹر رحمت علی رحمت) اورینٹل اوپیرا اینڈ ڈرامیٹک تھیٹریکل کمپنی پنجاب، گلوب تھیٹر پنجاب، پریم پرچارنی ناٹک منڈلی (مالک و مہتمم نانک چند)، جمعدار تھیٹر، پنجاب ریفارمنگ تھیٹریکل کمپنی اور جہاں آراء تھیٹریکل کمپنی وغیرہ کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ انیسویں صدی کے نصف دوم میں لاہور میں بھی تھیٹر ڈراما کی روایت موجود تھی۔ لاہور میں اس عہد میں تھیٹر ڈراما کے اسٹیج کا نقشہ ملاحظہ ہو جسے جان کیمبل نے ڈراما ''الہ دین کا چراغ'' دیکھتے ہوئے بیان کیا ہے:

''تھیٹر عارضی طور پر لاہور میں میو ہسپتال کے قریب بنایا گیا تھا ایک لمبے چوڑے سائبان کے وسط میں فانوس لٹکا ہوا تھا جس میں چار شمعیں تھیں۔ دائیں بائیں چوبی کھمبوں پر دیواری لیمپ آویزاں تھے اس سب کے مجموعے سے جو روشنی تھیٹر میں ہوئی ہوگی اس کا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان چھ شمعوں کے علاوہ سٹیج کے سامنے ایک طرف سے ڈھکی ہوئی روشنیوں کی قطار بھی تھی۔ بس پورے تھیٹر میں روشنی کا یہی انتظام تھا۔ سٹیج پر تو فانوس کی وجہ سے کچھ ہلکی ہلکی روشنی موجود تھی باقی سارا پنڈال نیم تاریکی میں تھا۔ میں اور میرا دوست کھیل شروع ہونے سے تقریباً بیس منٹ پہلے تھیٹر میں پہنچے۔ یہ اونچے طبقہ کے سوا دیسی لوگوں کے ہر طبقے سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اگلی قطاروں میں نچلے طبقے کے کچھ یورپی اور اینگلو انڈین بھی موجود تھے ان میں چند معزز خواتین بھی شامل تھیں...... سٹیج یورپی طرز کا بنایا گیا تھا جس میں کئی فرشی دروازے اور اوپر پہنچانے والی خودکار سیڑھیاں لگی ہوئی تھیں تاکہ اس کہانی میں بار بار آنے والا جن اچانک نمودار ہو سکے اور اچانک غائب ہو سکے۔''[۲]

لاہور میں صحیح معنوں میں ڈراما کی ابتداء انیسویں صدی کے نصف دوم کے آخری دو عشروں میں ہوئی۔ ویسے بھی ۱۸۵۷ء سے قبل اور اس کے بعد اردو ڈرامے کا فقدان ہی رہتا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ شکست و ریخت کی وہ فضا تھی جو تقریباً ڈیڑھ صدی سے معاشرے پر چھائی ہوئی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ لاہور میں ۱۸۸۵ء میں بزرگ شاہ لاہوری نے ڈراما نویسی کی جانب توجہ مبذول کی اور زیادہ تر ڈرامے ۱۸۸۶ء میں تھیٹریکل کمپنیوں کے لیے لکھے۔ ان میں ''طلسماتِ سلیمانی'' ''اکسیر اعظم'' ''قمر الزمان و بدورا'' ''نور الدین حسن افروز عرف کنیز پارس'' مشہور ہوئے۔ یوں تو ابتداء میں ڈرامے زیادہ تر منظوم ہی تھے پھر آہستہ آہستہ نثری حصہ غالب آ گیا۔ بعد ازاں اس میں مغربی ادب سے اخذ و ترجمہ کی صورت میں بھی اضافہ ہوا اور انہی ترجمہ شدہ ڈراموں کی تقلید میں ڈرامے لکھے گئے۔ جس سے اردو نثر میں ڈراما نگاری کو فنی شعور بھی ملا۔ اس فنی شعور کی پہلے پہل صورت محمد حسین آزاد کے ہاں نظر آتی ہے۔ ڈراما نگاری سے محمد حسین آزاد کو فطری لگاؤ تھا اس بات کا احساس ان کی تصانیف پڑھنے سے

بخوبی ہوتا۔ ڈرامائی عناصر ان کی تحریروں میں جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ اگر مولانا آزاد اس صنف پر بالخصوص توجہ دیتے تو بلا شبہ ایک ڈراما نگار کے طور پر بھی اپنی پہچان کراتے کیونکہ وہ فن ڈراما نگاری کے رموز سے آگاہ ضرور تھے اس کا اندازہ مولانا آزاد کے اس خط سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ڈرامے کے پس منظر سے کس قدر واقفیت رکھتے تھے:

> ''ہندوستان کے دانا عہد قدیم میں کبھی بغرض تفریح اور کبھی بغرض اصلاح بعض رسوم ملکی کے بعض معاملات کو بطور نقل کے اس کے کل سامان کے ساتھ محفلوں میں اس طرح ادا کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو نقل سے اصل کا مزہ آجاتا تھا شاعر اور انشاپرداز اس میں زور طبع کی داد دیتے تھے اور ذہین و طباع لوگ اسے وجود عملی میں لا کر دکھاتے تھے اور اسے ناٹک کہتے تھے کیونکہ وہ فقط اندر سبھایا راس دھاریوں کا سوانگ نہیں ہوتا تھا بلکہ عظیم الشان بادشاہوں کے معرکے اس میں بیان ہوتے تھے کبھی نیک یا بد رسموں کی خوبیاں برائیاں دکھا کر لوگوں کے دلوں میں برائی سے نفرت اور بھلائی پر رغبت پیدا کی جاتی تھی لیکن افسوس ہے کہ مدت ہائے دراز سے یہ مفید اور دلچسپ کام اس ملک سے محو ہو گیا اور اگر ہے تو عجیب حالت میں ہے''۔[۷]

اگر مولانا آزاد کے اس بیان کا بغور مطالعہ کریں تو یہ نہ صرف ڈرامے کی ادبی صنف کا پہلا باقاعدہ تعارف ہے بلکہ ترقی پسند نظریہ کا حامل بھی ہے۔ ڈرامے سے مولانا آزاد کی دلچسپی ہی تھی کہ پرنسپل گورنمنٹ کالج کے کہنے پر ''میکبتھ'' کا ترجمہ شروع کیا لیکن اس کے ترجمہ میں جی نہ لگا اور یہ مکمل نہ ہو سکا۔ بعد ازاں مولانا آزاد نے ایک طبع زاد نیم تاریخی ڈراما ''اکبر'' کے نام سے لکھا۔ ڈرامے کا خاکہ اور مختلف ایکٹوں کی تفصیل لکھی۔ مولانا آزاد انگریزی ڈرامے کی روایت سے بہت کچھ واقفیت ضرور رکھتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ ڈراما لکھا۔ اس کے علاوہ بھی ان کا ایک ڈراما ملتا ہے جسے انہوں نے ''ابوالحسن'' کے عنوان سے لکھا۔ جو رسالہ ''کارواں'' کے پہلے شمارہ ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر اسلم فرخی کے توسط سے آغا محمد طاہر کے مطابق ۱۸۸۵ء کے قریب مولانا آزاد نے ڈراما ''اکبر'' لکھا۔ ابھی چار جھلکیاں ہی لکھی تھیں کہ اس وقت دیوانگی نے قلم ہاتھ سے چھین لیا لہٰذا یہ مکمل نہ ہو سکا۔ البتہ اس کا کچھ حصہ رسالہ ''مخزن'' ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا اور تبھی یہ منظر عام پر آیا۔ اس نامکمل ڈراما کو بعد میں مولانا آزاد کے شاگرد ناصر نذیر فراق دہلوی نے مکمل کیا جو ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ مولانا آزاد کے اس ڈراما کے بارے میں ڈاکٹر اسلم فرخی کا کہنا ہے کہ ''وہ ڈرامے کو سیدھا سادا سا ناول سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے ڈرامے اور ناول کا آمیزہ تیار کر دیا۔ جس میں نہ ڈرامائیت ہے نہ ناولیت[۸] لیکن ڈراما ''اکبر'' سے اردو میں ادبی ڈرامے کی روایت کا آغاز ہوا مگر افسوس وہ اس کو مکمل نہ کر پائے اور یہ نقش ناتمام ہی رہ گیا۔ ڈراما ''اکبر'' موضوع اور فن دونوں حوالوں سے ہی ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کراتا ہے کہ لاہور کی اردو نثر میں ڈراما نگاری اپنی

خام شکل میں اسی کی صورت ہمارے سامنے آتی ہے جہانگیر اور نور جہاں کے جذبہ عشق کی لازوال داستان اور اکبر کے دربار اور اہل دربار کی شخصیتوں کو موضوع بنا کر ڈراما کا تانا بانا بُنا گیا۔ جو جہانگیر اور نور جہاں کا اپنے اپنے کردار کے حوالے سے ایک المیہ ہے چونکہ مولانا آزاد کو اکبر کی شخصیت کے ساتھ لگاؤ تھا غالباً اس بناء پر اس ڈراما کو ''اکبر'' کا نام دیا۔ اپنے ایک خط میں اس ڈرامے سے متعلق لکھتے ہیں: ''فی الحال میں نے ایک ڈراما اردو میں لکھا ہے جس میں اکبر کے دربار کی بعض مفید حالتیں اور اہل دربار کی لیاقتیں دکھائی ہیں اور یہ بھی سمجھایا ہے کہ اکبر بادشاہ غیر ممالک کے ہندوؤں اور ہندوستانیوں سے گھل مل کر ...... شیر وشکر ہو گیا تھا اور کالج کے طلباء اس تصنیف کے ادا کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں اور یہی بڑی خوبی کی بات ہے کہ ہندوستان کا ایک کمال جو گردش ایام سے مٹ کر محو ہو گیا تھا پھر تازہ ہوتا ہے۔''[9] ڈراما ''اکبر'' کا پلاٹ قدرے ڈھیلا اور سیدھا سادا ہے۔ چونکہ مولانا آزاد اسے مکمل نہ کر پائے تھے اس لیے ڈرامے کے بنیادی عناصر وضاحت، کشمکش، تصادم، نقطہ عروج اور اختتام کی تشنگی واضح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ البتہ شگفتہ اور برجستہ مکالموں کے ذریعے کردار نگاری کے عنصر کو بہت خوبی سے نبھایا ہے۔ واقعات کو نیم تاریخی انداز سے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اہم اور غیر اہم واقعات کو یکجا کر دیا ہے۔ مثلاً ڈرامے کا آغاز اکبر اور ہیموں کی جنگ سے ہوتا ہے پھر مینا بازار کا منظر پیش کیا ہے جو موزوں اور مناسب ہے اس مرقع کشی سے یہ احساس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا یہ ڈراما سٹیج کے لیے موزوں نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد اکبر کی جوانمردی اور اس کے عہد کی جھلک پیش کرنا تھا۔ دو مناظر کے بعد ڈرامے میں سلیم (جہانگیر) اور مہر النساء (نور جہاں) کے کردار سامنے آتے ہیں۔ جس میں جہانگیر کا کردار اجاگر ہوتا ہے اور کسی قدر کشمکش کا آغاز ہوتا ہے لیکن مناظر کی طوالت کے باعث ڈرامے کا یہ عنصر بھی مجروح ہوتا ہے۔

بھرپور کردار نگاری، خوبصورت مکالمے، کشمکش کے عناصر اور اشعار کے استعمال کے ساتھ ایک خوبی اس ڈراما کی یہ بھی ہے کہ مولانا آزاد نے اپنے خاص مرصع اسلوب میں سادگی لانے کی کوشش کی ہے۔ ڈراما سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں برمحل مکالموں کے ذریعے کردار نگاری کی گئی ہے۔

''(خان اعظم، منعم خان، خضر خواجہ داخل ہوئے)

خان خاناں: اے ارا کین مملکت - اے اساطین سلطنت تم سے قائم ہے
سلطنت تم سے دائم ہے مملکت
ابھی جانب مشرق سے اک سوار سوار سر تو سن اضطرار
یہ دلی سے آیا ہے لے کر خبر کہ عدلی کا موذی وزیموں ڈھوسر

بنگالہ سے چلا ایک ہی میدان میں لشکر شاہی کو ہٹا دیا۔ اب دہلی کو جیت بکرماجیت کا لقب لیا ہے اور بڑھا چاہتا ہے۔

کرو مشورات اس میں اور دو صلاح   بچے ملک و دولت جو کچھ ہو صلاح

(سب دم بخود)

خان اعظم: ایسے نازک وقت میں کہ جنت مکانی نے ابھی استقبال بھی نہ پایا تھا ان کا مرجانا اس پر بنگال سے دلی تک دفعۃً ہاتھ سے نکل جانا اور پھر مقابلے پر ایسے دشمنِ قوی کا آنا نہایت خطرا کا مقام ہے۔

خضر خواجہ: پناہ بخدا۔ اگلے پچھلے انقلاب سامنے کھڑے ہیں اور وقت مصلحت تو یہی ہے کہ اطمینان کے ساتھ کابل میں چل بیٹھیں۔ چڑھے سال خاطر خواہ بندوبست کر کے ادھر آئیں۔

خان خاناں: آج کچھ نہ ہوا تو سال آئندہ کیا ہوگا۔ بادشاہ تو لڑکا ہے خواہ بدنامی۔ خواہ نیک نامی جو کچھ ہے تمہارے سر ہے۔ دال خور بنیئے کے سامنے سے ہٹ جانا بڑی شرم کی بات ہے۔

خضر خواجہ: نہیں اسے ہٹنا نہیں کہتے۔ سال آئندہ کچھ دور نہیں۔

خان اعظم: نازک وقت ہے حضور کے دادا کا زمانہ دیکھا شاہ جنت مکان کا عہد دیکھا خدا کی پناہ فلک نے پھر وہی وقت دکھایا۔"[۹۱]

مولانا آزاد کے علاوہ خان احمد حسین خان نے بھی ڈراما نگاری میں طبع آزمائی کی۔ اس کا آغاز انہوں نے ۱۸۹۲ء میں شکسپیر ڈراما "اوتھیلو" سے اخذ و ترجمہ کرتے ہوئے ڈراما "جعفر" سے کیا۔ بعد ازاں لارڈلٹن کے ڈراما Countess of Lyons کا ترجمہ کیا۔ ان کے ناولوں میں بھی ڈرامائیت کے عناصر کثرت سے موجود ہیں۔ ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں قائم ہونے والے ڈرامیٹک کلب نے بھی ڈراما نگاری کو مہمیز لگائی۔ نتیجتاً انیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں اردو نثر بالخصوص ادب جو معاشرے کے خیالات و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے انگریزی ادبیات کے اثرات سے اس کی اصناف نثر کی قدرے واضح تر صورت رونما ہونا شروع ہوئی۔ چنانچہ ناول اور ڈرامے کو رواج ملا۔ ان آخری دو عشروں میں ابتداً انگریزی ڈراموں کا اردو ترجمہ کیا گیا۔ بعدازاں انہی ترجمہ شدہ ڈراموں کی تقلید میں ڈرامے لکھے گئے۔ یوں ابتداء میں ڈراما کی صنف تو آ گئی تھی لیکن ادبی حیثیت سے ان میں کوئی خاص بات موجود نہ تھی۔ اس حوالے سے درج ذیل ڈراموں کے نام ملتے ہیں۔

''فتنہ عالم ناٹک'' ''فرخ سبھا'' ''کھیل بدر منیر بے نظیر'' اور ''کھیل گل بکاؤلی'' مصنفہ حسین بخش، ''نقش سلیمانی'' از عبدالعزیز، ''گلشن قدرت'' ''داستان ابوالحسن و شمس النہار'' اور ''دیوتاؤں کا درشن'' مصنفہ عبدالمجید، ''انجام عیاشی'' اور ''قمر الزمان'' از سید بزرگ شاہ لاہوری، ''گوپی چند'' از کشن سنگھ، ''نور الدین حسن افروز'' از پنڈت نرائن مل، ''بدھوا'' از مول چند، ''مچھندر سبھا ناٹک'' از لالہ دنی چند، ''البرٹ نمبر ۸۵'' از منشی امداد علی، ''بال بواہ'' از لالہ ٹھاکر داس، ''داستان بطرز ناٹک راجہ امر سنگھ راٹھور و شہنشاہ اکبر بادشاہ دہلی'' از لالہ نانک چند، ''مخمور چند کی کیفیت عرب کھیل کا کھیل نصیحت کی نصیحت'' اور ''دارالسرور'' از میر کرامت اللہ، ''جمنار نجنی'' از منشی گرجا پرشاد ''غنچہ محبت عرف انجام الفت'' از رحمت علی، ''ناکامی عشاق عرف منصور سوہنا'' از شیخ معز الدین احمد، ''جام مدہوش یعنی شراب خانہ خراب کے بُرے نتائج'' از بھگوان سروپ کے علاوہ ''خورشید لقا'' ''قصہ بلبل بیمار'' ''نیرنگ عشق'' ''عشرت سبھا'' ''نیرنگ افلاک عرف آئینہ ادراک''[۱] وغیرہ نامی ڈرامے لکھے گئے۔ غرض دیگر اصناف کی طرح اردو ڈراما کی طرف بھی باقاعدہ توجہ بیسویں صدی کے آغاز میں دی گئی۔

تراجم: انیسویں صدی کے نصف دوم میں جتنی بھی علمی و ادبی اردو نثری کتب دستیاب ہوئیں ہیں ان میں بیشتر اخذ و ترجمہ ہی کا نتیجہ ہیں۔ مختلف زبانوں سے اخذ و ترجمے کے اس فن نے بالواسطہ نثر میں اردو زبان و ادب کو وسعت اور گہرائی سے ہمکنار کرنے میں بے حد اہم کردار ادا کیا۔ ترجمہ نگاری کے فن کو مقبول بنانے میں مقالہ ہذا میں بیان کردہ ترجمہ شدہ کتب ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ علمی، ادبی، سائنسی، مذہبی اور قانونی کتب کے تراجم کے ذریعے اردو نثر کو نئے نئے اسالیب بیان، جدید طرز احساس اور نیا فکری شعور ملا۔ چنانچہ تراجم نے اردو نثر کے ارتقاء کو فعال بنایا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں بھی انگریزی، عربی، اور فارسی سے اردو ترجمہ کی روایت مستقل برقرار رہتی ہے۔ اس دور میں جو تراجم منظر عام پر آتے ہیں ان کا حلقہ اثر پورے پنجاب میں پھیل جاتا ہے۔ متفرق موضوعات پر ایسے ہی چند تراجم میں ''خیر القال'' ''رد الملاحدہ'' (مترجم) مولوی سید ممتاز علی، ''فال نامہ'' (مترجم) میراں بخش، ''مسکوی کرانے کا قانون دیسی فوج کے واسطے'' (مترجم) غلام محی الدین، ''فتوح الغیب'' (مترجم) مولوی محمد ابوالحسن، ''منہاج العابدین الجنت المعروف بہ رسالہ راہ بہشت'' (مترجم) مولانا محمد شاہ، ''مطالعہ فطرت'' (بابو شوشی چندر کی کتاب Half Know with Nature کا اردو ترجمہ) (مترجم) منشی نتھو رام نند، ''عہد حکومت خلیفہ المومنین عبدالحمید خان ثانی شہنشاہ ترکی'' (مترجم) مولوی ثناء اللہ، ''ترجمہ بزبان اردو مکتوبات حضرت غوث الاعظم جیلانی'' (مترجم) حافظ انور علی، مجموعہ وظائف مالاالخیرت (مترجم) شیخ الٰہی بخش، ''پنچ رتن'' (اردو ترجمہ از سنسکرت) (مترجم) لالہ گنپت رائے، ''مخزن الحکمت'' مترجم انعام علی، ''مہابھارت اردو'' حصہ

اول(مترجم) حافظ عمر دراز فائض، رسالہ فرائض حصہ اول(Joseph Mazinni کی کتاب Duties of Man کا اردو ترجمہ)(مترجم) منشی نتھو رام، ''حقیقت روح انسانی'' (مترجم) مفتی شاہ دین، ''قوت فیصلہ'' (مترجم) مولوی حسن علی، ''حکایات حکیم لقمان'' (مترجم) منشی محبوب عالم، ''قوت فیصلہ'' (فوسٹر کی کتاب Decision of Character کا اردو ترجمہ) (مترجم) عبدالواحد، ''کشف المحجوب'' (مترجم) مولوی فیروز الدین، ''عجائبات و موجودات'' (مترجم) اللہ دین، اور راجگان پنجاب (سر لیپل گرفن کی کتاب کا ترجمہ)(مترجم) سید محمد حسن وغیرہ نے ترجمہ نگاری کی روایت کو استحکام بخشا۔

متفرق موضوعات پر نثری کتب:

انیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو نثر کو لاہور میں جو ترقی ملی شاید ہی کہیں اور ملی ہو۔ لاہور میں اردو نثر کے ارتقاء نے وجود میں آنے والے نثری سرمایے کو موضوع اور اسلوب ہر دو اعتبار سے وقار بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ وسیع پیمانے پر طب، فلسفہ، اخلاقیات، نفسیات اور تاریخ جیسے متفرق موضوعات پر کتب کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہونا شروع ہو گیا۔ مقالہ نگار اپنے مطالعہ کی بناء پر نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ اس زمانے میں ایسا کوئی موضوع نہ تھا جسے اردو نثر میں احاطہ تحریر میں نہ لایا گیا ہو۔لہٰذا متفرق موضوعات پر مبنی ان کتب کا تذکرہ بے جا نہ ہو گا جنہوں نے اردو نثر کو موضوع اور اسلوب بیان کی وسعت سے ہمکنار کیا۔

طب:

''رسالہ تشخیص و معالجہ ہیضہ و تپ و بائی'' ''حسب قواعد حکمات یونانی'' (۱۸۶۱ء) مرتبہ حکیم جگو پال لاہوری، ''مفتاح النجم'' (۱۸۶۳ء) از حکیم سید محمد صادق، ''علم و عمل طب'' از کرنل بھولا ناتھ، ''رسالہ چند امراض مویشی ہند'' ''طب رحمانی'' ''نیا میٹریا میڈیکا'' ''رسالہ علم فزیالوجی'' (ترجمہ) ''علم و عمل کا بلہ'' اور Dr. Cumigham کی کتاب Saintary Pramer کا ترجمہ بعنوان ''رسالہ حفظ صحت'' از ڈاکٹر رحیم خان، ''رسالہ جدری'' مولفہ شجاع الدین، ''علم و عمل فن جراحی'' از برج لال گھوش ''بحرالجواہر'' (مترجم) ڈاکٹر چیتن شاہ، ''رسالہ فصد'' احمد علی، تشریح انسانی'' از محمد حسین خان، ''زمرد اخضر یاقوت احمر'' (مترجم) حکیم منور علی، ''رسالہ نور العین'' از حافظ فخر الدین، ''مجربات اکبر علی'' از حکیم واجد علی -''قانون علاج اردو'' از حکیم عنایت شاہ ''نسخہ معدن حکمت'' (حصہ اول و دوم) از حکیم علم دین، ''رسالہ قوانین صحت'' از حکیم محمد دین، ''صحت النساء'' ڈاکٹر سید غلام حسین، ''معالجات بواسیر''، ''ٹیکا چیچک بیقاعدہ اور خطرناک حملہ ہے'' اور ''رموز حکمت'' از حکیم غلام نبی ''رسالہ درتدابیر دفع ہیضہ'' از نبی بخش، ''تشریح طب'' از حکیم سائی بخش۔

فلسفہ و اخلاقیات و نفسیات اور تاریخ:

''حقائق المجدد''(۱۸۶۵ء) از بابو چندر ناتھ متر، ''چراغ ہدایت'' (۱۸۶۶ء)از منشی محمد علی، ''سراج الہدایت''(۱۸۶۸ء) از محمد علی خان وزیر، ''اخلاق سروری'' (۱۸۷۲ء) اور ''مخزن حکمت'' (۱۸۷۲ء) از مفتی غلام سرور لاہوری، ''اکسیر اعظم'' (۱۸۷۲ء) از مولوی کریم بخش، ''اخلاق محمدی'' (۱۸۷۲ء) از مرزا محمد علی ''رسالہ خواب'' (مترجم) پنڈت بشن نرائن، ''اخلاق ناصری''[۲۱۲](مترجم) منشی نظام الدین، ''امین حکمت'' از نادر شاہ، ''گیان ساگر'' (مترجم) رائے گوپی ناتھ ''ناسکت'' (مترجم) لالہ برج لعل، ''جا تک منجری'' از لالہ آتما رام، ''آسائش دارین'' از شیخ ظہیر الدین، ''دستور المعاش والمعاد'' (یعنی دین و دنیا کا رہبر) از منشی گیان چند، رسالہ منطق استقرائی (ترجمہ) ''رسالہ علم ہیئت'' (ترجمہ) ''رسالہ علم اصول قانون'' (ترجمہ) ''رسالہ علم سیالات'' (ترجمہ) ''رسالہ علم سیاست و مدن'' (ترجمہ) اور اقسام حقیقت اراضی (ترجمہ) از مولوی محمد حسین، ''اصول اخلاق و قوانین'' (مترجم) پنڈت رام کشن، ''رسالہ علم منطق''[۲۱۳] (ڈاکٹر سکاٹ کی کتاب Logic کا ترجمہ)''کاشف الالہام'' (بابو کیشب چندر سین کے لیکچر Inspiration کا ترجمہ) ''حقوق نسواں'' (۱۸۹۸ء) اور ''طبیب نسواں'' (۱۸۹۹ء) از مولوی سید محمد ممتاز علی، ''فتوح عبدالحمید خان'' (۱۸۹۹ء) از مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی،''مشیر نسواں'' از حافظ فخر الدین، ''گلدستہ کشمیر'' پنڈت ہرگوپال کول، ''ہدایت الصبیان'' از حشمت علی، ''خورشید خالصہ'' (حصہ اول و دوم) نہال سنگھ، ''کلید اسرار کیمیا'' از حسین بخشی، ''رسالہ ستر عورت'' از محمد فخر الدین احمد، ''خلاصہ تاریخ ملکہ وکٹوریہ'' از محمد فخر الدین، ''خوان نعمت'' از مرزا امیر بیگ، ''بیر چرتر'' از منشی رادھا کشن، ''تہذیب النفس'' از مولوی محمد حسین، ''تاریخ کشمیر'' از مولوی محمد دین فوق ، ''تاریخ دنیا'' از پنڈت لیکھ رام، ''تاریخ عجیب'' از محمد جعفر، ''آئینہ حیات'' از پنڈت بشمبر ناتھ، ''تہذیب'' از سراج الدین احمد، ''شاہ چارلس دوم کا قصہ'' از لالہ نرائن داس، کے علاوہ فقیر سید نجم الدین نے سید امیر علی کی اسلامی تاریخ پر مبنی کتب ''ہسٹری آف اسلام'' اور ''ہسٹری آف سیراسینز'' کا اردو ترجمہ کیا۔

دیگر کتب:

''ریشم کا کیڑا''(۱۸۵۳ء) از موتی لال، ''چائے لگانے کی کتاب''(۱۸۵۴ء)، ''سرکلرات'' (۱۸۶۰ء) از محمد مرزا، ''بیوپاریوں کی پستک'' منشی ہرسکھ دیال (سر رشتہ دار جوڈیشل کمشنر) نے جوڈیشل کمشنر کے حکم پر بیوپاریوں کے افادے کے لیے یہ کتاب اردو نثر میں تحریر کی جو ۱۸۶۱ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے شائع ہوئی۔ ''رسالہ گرہن سمت ۱۹۱۲ء سے ۲۰۱۲ تک'' مولفہ لالہ کشن چند نے ۴۴ صفحات کے اس رسالے میں اردو اور ہندی میں چاند اور سورج گرہن سے متعلق آنے والے ۱۱۰ سال تک پیشین گوئی کی ہے۔ یہ رسالہ بھی ۱۸۶۱ء میں مطبع کوہ نور لاہور سے

طبع ہوا۔ ''رپورٹ مجموعی ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء'' کا انگریزی سے اردو ترجمہ پنڈت موتی لال نے کیا جو ۱۸۶۲ء میں میو پریس لاہور سے شائع ہوا۔ ''جنتری ۱۸۶۳ء'' (۱۸۶۳ء) مولفہ و مرتبہ پنڈت سورج بھان، ''مفید عام'' (۱۸۷۳ء) از سید نصرت علی قیصر دہلوی، ''انشائے یادگار اصغری'' از مفتی غلام سرور لاہوری ''قرض اور اس سے مخلصی کی تدابیر'' (۱۸۹۲ء) از منشی محبوب عالم، ''ایشیاء اور یورپ کی ضرب المثلیں'' اور ''معیار فصاحت'' از منشی محبوب عالم، ''پاکٹ بک آف انجینئرنگ'' از لالہ گنگا رام کے نام بھی ملتے ہیں۔

غرض انیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو نثر نے بے بہا ترقی کی۔ اردو نثر کا دامن مذہب، تصوف، اخلاقیات، تاریخ، فلسفہ، نفسیات، سائنس، طبعیات، ریاضیات، لسانیات، زراعت، کے موضوعات سے مالامال ہوا اور قصہ کہانی، افسانہ، سفرنامہ، رپوتاژ تذکرہ، سوانح، خاکہ نگاری، مضمون نگاری، ناول، ڈراما جیسی اصناف نثر تشکیلی مرحلے سے گذر کر ترقی کی راہ پر گامزن ہوئیں۔ جنہیں بیسویں صدی میں پختگی اور بلوغت نظری ملی اور اسی بناء پر یہ اصناف اپنی الگ منفرد ادبی پہچان بنانے میں کامیاب ہوئیں۔

حواشی:

۱۔ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: "تعلیقات خطبات گارساں دتاسی"، ص: ۲۰۲

۲۔ اس کتاب سے متعلق مذکورہ معلومات "مقالات گارساں دتاسی" جلد دوم کے ص ۳۰۳ اور ص ۴۵۹ سے لی گئی ہیں۔

۳۔ ہندوستان کے واحد عربی اخبار "مفید عام" لاہور کے ایڈیٹر تھے اور ۱۸۷۳ء میں "مفید عام" ہی کے عنوان سے لاہور سے روزمرہ استعمال کی ایک چھوٹی سی انسائیکلوپیڈیا شائع کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سی تاریخی، سوانحی، اور مذہبی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ (معلومات کے لیے مقالات گارساں دتاسی (جلد دوم) کے صفحات ملاحظہ ہوں، ۳۲۳، ۳۲۷، ۴۵۹)

۴۔ عظیم الشان صدیقی: "اردو ناول کا آغاز وارتقاء"، ص: ۴۸۸

۵۔ ہارون قادر: "خان احمد حسین خان شخصیت وفن" (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) لاہور، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ۲۰۰۸ء، ص: ۱۷۶-۱۷۷

۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: "اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، پچیسواں ایڈیشن ۲۰۰۳ء، ص: ۳۹۹

۷۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: "محمد حسین آزاد حیات وتصانیف"، ص: ۵۵۵

۸۔ ایضاً، ص: ۵۵۴

۹۔ ایضاً، ص: ۵۵۶

۱۰۔ آزاد، محمد حسین: "اکبر" لاہور، مطبع کریمی پریس، سن ندارد، ص: ۱۲ تا ۱۴

۱۱۔ یہ فہرست "جائزہ زبان اردو" (پنجاب) مرتبہ خواجہ عبدالوحید سے لی گئی ہے۔

۱۲۔ ناصر الدین محمد بن الحسن طوسی المتوفی (۱۲۷۳ء) کی کتاب "اخلاق ناصری" کا ترجمہ ہے جو "اخبار انجمن پنجاب" اپریل ۱۸۷۱ء کی اشاعت سے اس میں بالاقساط شائع ہوا۔

۱۳۔ مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ مولوی محمد دین نے ترجمہ کی ہو گی کیونکہ منطق کے موضوع پر ان کے مضامین "رسالہ" انجمن قصور میں چھپتے رہے۔ اس کے لیے مقالہ ہذا میں ملاحظہ ہو "اخبار انجمن پنجاب" میں مولوی محمد دین کا تذکرہ۔

بیسویں صدی میں اردو نثر کے امکانات

ا) اخبارات و رسائل

ب) علمی و ادبی انجمنیں، مجالس اور ادارے

ج) تحریکات و رجحانات

د) اصناف نثر (تحقیق وتنقید، ڈراما، طنز ومزاح، خطوط نگاری، خاکہ نگاری، کالم نگاری، خودنوشت، سوانح، رپورتاژ، سفرنامہ، انشائیہ)

انیسویں صدی کے اختتام تک لاہور میں جدید تعلیمی اداروں کے قیام اور علمی ترقی؛ ذرائع مواصلات اور رسل و رسائل کی تیز رفتاری، صحافت اور ادب کی ترویج و اشاعت اور انجمنوں کے قیام سے قدیم طرزِ فکر اور احساس کے ساتھ نیا سیاسی، سماجی اور علمی و فکری شعور پیدا ہو چکا تھا۔ جس نے انیسویں صدی کے نصف دوم میں افہام و تفہیم کی فضا کو سازگار بنائے رکھا۔ بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی نئی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو گئے۔ یہ زمانہ ابتدا ہی سے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی سیاسی و سماجی بیداری کے حوالے سے بے حد اہم رہا ہے۔ مجموعی اعتبار سے مسلمانوں کے لیے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر یہ الم انگیز سیاسی منظر نامہ تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اس صدی کے آغاز سے ہی سیاسی صورتحال دگرگوں رہی۔ تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) اردو و ہندی تنازعہ کا ایک بار پھر شدت اختیار کرنا؛ مسلم لیگ کا قیام (۱۹۰۶ء)، ۱۹۰۹ء کی اصلاحات اور مسلمانوں کو جداگانہ انتخابات کا حق ملنا؛ تنسیخ بنگال (۱۹۱۱ء)، جنگ بلقان اور طرابلس (۱۹۱۲ء) پر اٹلی کے حملوں کی وجہ سے حالات کا پریشان کن ہونا؛ سیلف گورنمنٹ کا مطالبہ (۱۹۱۳ء) کرنا؛ جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے بعد ترکوں کے سلسلہ میں مسلمانوں میں بے چینی پھیلنا؛ میثاق لکھنؤ (۱۹۱۶ء)، جلیانوالہ باغ کا سانحہ؛ یورپ میں ترکی کے حصے بخرے کرنے کی سازش (۱۹۱۹ء)؛ ''جمعیۃ العلماء'' (۱۹۱۹ء) اور مجلس احرار کا قیام؛ خلافت کمیٹی کا قیام (۱۹۱۹ء)؛ ترکِ موالات (۱۹۲۰ء)، مصطفیٰ کمال پاشا کا ترکی میں خلافت کے خاتمے کا اعلان (۱۹۲۱ء)؛ ہندوؤں کے انتہا پسند گروہوں شدھی اور سنگھٹن کی اشتعال انگیز کارروائیاں؛ نہرو رپورٹ (۱۹۲۸ء)، چودہ نکات (۱۹۲۹ء)، سول نافرمانی کی تحریک (۱۹۳۰ء)؛ گول میز کانفرنس کا انعقاد (۱۹۳۰ء-۱۹۳۲ء)؛ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ (۱۹۳۵ء)؛ ۱۹۳۷ء کے انتخابات اور کانگریس کی کامیابی؛ دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹ء - ۱۹۴۵ء) قراردادِ لاہور کی منظوری (۱۹۴۰ء)؛ مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی میں جھگڑا (۱۹۴۴ء)؛ شملہ کانفرنس (۱۹۴۵ء) ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی؛ وزارتی مشن کی آمد (۱۹۴۶ء) اور بالآخر قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کی صورت میں منزل مقصود کا ملنا۔ ان سیاسی و سماجی ارتقا پذیر حالات و واقعات نے اردو نثر کو بے حد متاثر کیا۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر رونما ہونے والے مذکورہ بالا سیاسی، سماجی، معاشی، لسانی احوال و آثار نے پورے سماج کو ایک ہیجان کی کیفیت میں مبتلا کیے رکھا۔ ڈاکٹر شفیق انجم نے اس دور میں رو پذیر ہونے والی ان تبدیلیوں کا ادب پر اثر انداز ہونے کے حوالے سے درست تجزیہ کیا ہے:

> ''خوف و امید کے گھٹتے بڑھتے سائے اور کرب و نشاط کے مسلسل بدلتے زاویے اس عہد میں پروان چڑھنے والے ذہن پر اپنا نقش جماتے رہے۔ جوشیلے اور ولولہ انگیز رویوں کے ساتھ اپنے آپ میں گم ہونے اور داخل کو بنانے سنوارنے کی بجائے پھٹ پڑے اور خارج کی ہنگامہ

آرائیوں کا حصہ بن جانے کی خواہش اس دور کی خاص پہچان ہے اپنے آپ پر نظر کرنے، سماج میں اپنی حیثیت تلاش کرنے اور آگے بڑھ کر اپنے ہونے کا احساس دلانے کا جذبہ ہر شعبہ زندگی میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔اس دور کے ادیبوں کے ہاں رویوں کی عکاسی بھی ہے اور ان سے وابستہ کڑیاں کسی بڑے فکر وفلسفہ سے جوڑنے کا عمل بھی۔ ماضی کی تابندہ روایتوں کا اظہار، تہذیبی و تاریخی عظمت و حرکت و عمل کے پیغاموں کے ساتھ ادب میں نئے جہانوں کی طرف پرواز، خوش آئیند لمحوں کی بازیافت اور جلال و جمال کی نئی نئی دنیاؤں کی طرف مراجعت کے تازہ کار رویے بھی ابھرتے ہیں۔فردواجتماع کا تعلق، مذہب و سیاست کا ملاپ، طبعیات، مابعد الطبیعات کے رشتے، بے حسی، غلامی، غربت، محرومی اور استحصالی قوتوں کے خلاف نفرت کا اظہار اور مزاحمتی رویے اس عہد کے ادب کی پہچان ہیں۔اضطراب، الجھاؤ اور ظلم و جبر کی فضا کی بدولت شاعری اور نثر دونوں میں ہنگامی وقتی موضوعات اور شدید تر جذباتی کیفیات کی کثرت ہے تاہم اعتدال وتوازن اور فنی اقدار کی پاسداری کی روایت بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔"[۱]

بیسویں صدی نے انسان کو فکرونظر کی بلوغت عطا کی۔جس کا اظہار وجود میں آنے والے اردو نثری سرمایے میں جاری و ساری دکھائی دیتا ہے۔ظہور پذیر ہونے والے نئے سیاسی و سماجی تناظر نے اردو نثر کو نئے نظریات اور موضوعات کا ادراک دلایا۔جس سے نئی تخلیقی اصناف نثر کا تنوع ، اظہار و اسالیب کی نئی جہتیں، تحاریک ورجحانات، نئے اخبارات و رسائل کے اجراء نے بیسویں صدی میں اردونثر کے ارتقا کوانقلاب آفرین بنا دیا۔جہاں ملکی اور بین الاقوامی سیاسی منظر نامے نے انسان کو نئی ذہنی وفکری صورتحال سے آگاہ کیا وہیں اردو نثر نے بھی ان نئی تبدیلیوں کو خود میں سمولیا۔ایسے میں اس تبدیلی کا مظہر رسالہ ''مخزن'' کے علاوہ علامہ محمد اقبال کی اولین نثری تصنیف ''علم الاقتصاد'' (۱۹۰۳ء) دکھائی دیتی ہے۔بیسویں صدی کی ابتدا میں جب اقتصادیات کا مضمون نظام تعلیم میں اہمیت اختیار کر رہا تھا۔ایسے میں ''علم الاقتصاد'' خالص علمی نثر کے بہترین نمونے کے طور پر منظر عام پر آئی اس کتاب نے علامہ اقبال کو علمی نثر نگار کے طور پر متعارف کرایا۔چونکہ اس دور میں علم اقتصادیات علم کی ایک نئی شاخ کے طور پر متعارف ہو رہا تھا اس لیے علامہ اقبال نے اس علم کے لیے عربی زبان کی متداول اصطلاحات کو نہ صرف اردو زبان میں منتقل کیا بلکہ خود بہت سی اصطلاحات وضع بھی کیں۔جس کا اظہار انہوں نے علم الاقتصاد کے ''دیباچہ'' میں کیا ہے۔اقبال نے ٹھوس علمی حقائق کو بیانیہ، استدلالی، تشریحی، توضیحی، درسی و تدریسی اسلوب میں اس علم سے متعلق معلومات کی بخوبی ترسیل کی ہے جو بیسویں صدی کی ابتدا میں علمی نثر کی ترقی یافتہ صورت بھی ہے مثال کے طور پر یہ نمونہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اگر چہ علم الاقتصاد دیگر علوم میں سے بعض کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتا ہے مگر علم الاخلاق کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرا ہے اس علم کی طرح علم الاخلاق کا موضوع بھی وہی اشیاء ہیں جو بعض انسانی مقاصد کے حصول سے وابستہ ہیں۔فرق صرف اس قدر ہے کہ علم اخلاق کا موضوع وہ افعال ہیں جو زندگی کے افضل ترین مقصد کے حصول کی شرائط ہیں اور علم الاقتصاد کا موضوع وہ اشیاء ہیں جو انسان کے معمولی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے معمولی مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لیے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نگاہ ڈالنا چاہیے مثلاً خوراک، لباس،مکان ،ہماری زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان مقاصد کی قدر پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصلی وقعت صرف اسی صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں۔اس لیے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے کسی قدر مطالعہ علم الاخلاق کا بھی ضروری ہے۔ اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلا لحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصور کی گئی جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔''[۹]

مجموعی طور پر اردو نثر میں نئے فکری خیال اور احساس میں انقلاب اور تنوع ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے موضوع اور اسلوب کے ساتھ ان مذکورہ سطحوں پر دکھائی دیتا ہے جو باہم لازم و ملزوم بھی ہیں، i) رسائل و جرائد، ii) علمی ادبی مجالس، انجمنیں اور ادارے، iii) تحریکات و رجحانات، iv) اصناف نثر ذیل میں ان حوالوں سے بیسویں صدی میں اردو نثر کے امکانات کا جائزہ لیا جائے گا۔

۱) بیسویں صدی اخبارات و رسائل :

مخزن:

بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں قائم ہونے والی ایک ادبی نشست بزم ادب نے اپنے ترجمان کے طور پر ماہنامہ ''مخزن'' (۱۹۰۱ء) کا اجراء کیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے اسے ''مخزن سبھا'' کی خصوصیت قرار دیا ہے جو ایسی ادبی نشست تھی جس میں شاعری کے علاوہ نثر بھی پیش کی جاتی جو دراصل ''مخزن'' کے حوالے سے ایک تنقیدی نشست تھی۔[۳] اردو نثر کے ارتقا میں کلیدی کردار ادا کرنے والا رسالہ ''مخزن'' بجا طور پر ایک ہمہ گیر ادبی تحریک ثابت ہوا جس کے اوراق نے نہ صرف نثری اصناف کو ان کی شناخت دی بلکہ بدلتے حالات ونظریات کے تناظر میں اردو نثر کو جدید خطوط پر استوار بھی کیا۔ اردو نثر کی ترویج وترقی میں ''مخزن'' کے کردار ونصب العین کا اندازہ ''مخزن'' اپریل ۱۹۰۴ء کے سہ ماہی ریویو میں شائع ہونے والی اس شق نمبر ۴ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

> ''نثر کی اہمیت قائم کرنا اور نثر کے لکھنے والوں کو مشق کا زیادہ موقع دینا یہ امر کہ ہماری نظر میں نثر کی ترقی کس قدر ضروری ہے اس سے ظاہر ہے کہ رسالہ کا دو تہائی حصہ نثر کے لیے رکھا گیا ہے اور اس میں دلچسپ طبع زاد مضامین کے علاوہ بہت سے مفید تراجم شائع ہوتے ہیں جن سے سرمایہ زبان میں اضافہ ہو رہا ہے اس نثر کے حصہ کو جو کامیابی ہوئی ہے اس پر ہم اگر ناز کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ اجرائے مخزن کی تاریخ سے آج تک کئی رسالے جو پہلے محض اشعار کے لیے وقف تھے اپنی پرانی حالت بدل کر نئے روپ میں نکلے ہیں اور اپنے اوراق کا معقول حصہ نثر کے معقول مضامین کی نذر کرتے ہیں جنہوں نے اس اصول کو مدنظر رکھا ہے اور کئی رسالے جن میں حصہ نثر محض ناول ہوتے تھے اس میں متفرق مضامین بھی شائع کرنے لگے ہیں۔''[۴]

اپریل ۱۹۰۱ء میں شیخ عبدالقادر کی ادارت میں جاری ہونے والے اس رسالے نے اردو نثر میں انقلاب برپا کر دیا۔ اسی وجہ سے خورشید الاسلام نے اسے ''اردو ادب کی نشاۃ ثانیہ''[۵] کہا ہے۔ اس میں جدید اذہان کو نمائندگی دینے کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی کی گئی۔ شاعری کے ساتھ نثر کی اہمیت قائم کرنا اور نثر لکھنے والوں کو مشق کا زیادہ موقع دینا'' اور ''انگریزی فرانسیسی یا دیگر مغربی زبانوں کی ادبیات کے بہترین نمونے سلیس اور بامحاورہ ترجموں کے ذریعے اردو دان صاحبان کے سامنے پیش کرنا اس کا نصب العین قرار پایا۔''[۶] یہ ''مخزن'' ہی تھا جس نے نئے زمانہ اور نئی تعلیم کے زیر سایہ نشوونما پانے والی نسل کو اردو زبان و ادب میں ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا۔ چنانچہ سجاد حیدر یلدرم کے ترکی زبان سے ترجمہ شدہ افسانے، راشد الخیری اور پریم چند کے افسانے

پہلے پہل مخزن ہی میں چھپے جن سے اردو نثر میں افسانے کی روایت نے پختگی کے مراحل طے کرنا شروع کیے۔ ''مخزن'' میں شائع ہونے والی تخلیقی نثر میں رومانیت، حقیقت نگاری، فطرت نگاری اور جمالیاتی اقدار بیک وقت پروان چڑھیں۔ چنانچہ ''مخزن'' کے پہلے شمارے اپریل ۱۹۰۱ء شمارہ نمبر۱ پر نگاہ ڈالیں (جو خادم التعلیم پریس لاہور سے شائع ہوا) تو نظم سے قطع نظر حصہ نثر کے عنوانات یہ تھے:

۱۔ بناوٹ و سادگی - ایڈیٹر
۲۔ مطالعہ الفاظ - مولوی احمد دین صاحب بی اے وکیل لاہور
۳۔ دہلی غدر سے پہلے - لالہ سری رام ایم اے دہلوی
۴۔ فن تقریر - ایڈیٹر
۵۔ خاتونوں کا ورق - ایڈیٹر ۷؎

مئی ۱۹۰۱ء کے دوسرے شمارے میں درج ذیل مضامین شامل تھے۔

۱۔ سعدی کی دو تصویریں - منشی محبوب عالم
۲۔ لارڈ فرن کی تقریر - شیخ عبدالقادر
۳۔ رموز حیات - قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی
۴۔ لطف سخن - غلام بھیک نیرنگ
۵۔ پبلک کیا ہے؟ - حافظ عبدالعزیز
۶۔ ایک بنگالی شاعرہ - مدن گوپال
۷۔ شعر کیا ہے؟ - اعجاز حسین بٹالوی ۸؎

رسالہ ''مخزن'' کو ابتدا ہی سے مولانا محمد حسین آزاد، علامہ محمد اقبال، اکبرالہ آبادی، مولانا ظفر علی خان، سجاد حیدر یلدرم، علامہ راشد الخیری، غلام بھیک نیرنگ، سید فضل حق آزاد رئیس عظیم آباد، داغ دہلوی، آغا حشر، آغا شاعر قزلباش، حکیم احمد شجاع، مرزا محمد ہادی، عزیز لکھنوی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا ذکاء اللہ، وحید الدین سلیم، ابوالکلام آزاد، خواجہ حسن نظامی، حامد اللہ افسر، تلوک چند محروم، پنڈت برجوہن دتاتر یہ کیفی، سید احمد دہلوی، دیانرائن نگم، حافظ محمود شیرانی، ریاض خیرآبادی، حفیظ جون پوری، مولوی احمد دین، خوشی محمد ناظر، حسرت موہانی، طالب بنارسی، شاد عظیم آبادی، سرور جہاں آبادی، منشی احمد حسین، مرزا امجد اشرف دہلوی، شوق قدوائی، قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی، منشی محبوب عالم، لالہ سری رام، نیاز فتح پوری، مولانا عبدالمجید سالک، سید امتیاز علی تاج اور ایم اسلم

جیسے مشاہیر ادب کا ساتھ میسر آیا۔ مذکورہ اصحاب کی نگارشات کی مرہون منت رسالہ ''مخزن'' کا دامن بیک وقت مختلف اصناف نثر اور اسالیب نثر کے ساتھ نئے رجحانات کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ رسالہ ''مخزن'' ہی نے انگریزی زبان کی بہت سی اصناف سے اردو نثر کو روشناس کرایا۔اس کے مدیر شیخ عبدالقادر چونکہ خود انگریزی تعلیم یافتہ تھے اس لیے ایسی نثر کو بالخصوص توجہ دی جو انگریزی ادب سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ اس طرح ایسے ادیبوں کو ابھرنے کا زیادہ موقع ملا جو انگریزی اصناف نثر سے اردو نثر کے دامن کو وسعت دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر نے ''مخزن'' کا نظریہ مقصد بیان کرتے ہوئے کہا:

> ''اول انگریزی مضمون نگاری کی دلچسپیاں اپنی زبان میں پیدا کرنا مگر ایسی نزاکت سے کہ پرانے مذاق کو ناگوار نہ ہو اور حتی الوسع اردو انشاء پردازی کے ضروری اصولوں میں سے کسی سے انحراف نہ ہو۔ انگریزی الفاظ و محاورات اور بندشوں کے اندھا دھند اردو میں داخل کرنا ناپسندیدہ عمل جو بڑھتا جاتا ہے اس کو روکنے کی کوشش کی جائے گی اور اس بات کی احتیاط کی جائے گی کہ ممکن ہو تو انگریزی لفظ کی بجائے اس کا ترجمہ لے لیں۔ بشرطیکہ پورا مفہوم ادا ہو جائے۔''۹

اس نظریہ کے پیش نظر ''مخزن'' نے مختلف نثری اصناف میں صاف رواں، اور دلکش نثر کی طرح ڈالی جو اردو نثر کی تیزی سے ترقی کا باعث بنی۔ لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ ''مخزن'' ۱۹۰۳ء کے شماروں میں علامہ اقبال کی نثری نگارشات، ''بچوں کی تعلیم و تربیت'' اور ''قومی زندگی'' کے علاوہ غلام بھیک نیرنگ کو ''اردو زبان میں افسانہ نگاری'' ''لطف سخن'' (پہلی قسط مئی ۱۹۰۱ء، دوسری قسط جون ۱۹۰۱ء) اور یلدرم کے افسانہ ''زہرا'' پر ''مخزن'' (مارچ ۱۹۰۴ء) میں تنقیدی مضمون لکھنے پر انہیں مضمون نگار اور نقاد کے طور پر متعارف کرایا۔ دیگر مضامین میں سید احمد دہلوی کا ''ترقی حرفت'' (مارچ ۱۹۰۳ء) ''ہماری شاعری اور انشا پردازی'' از لیاقت حسین بھاگلپوری (اکتوبر ۱۹۰۱ء) ''حسن'' جواد علی خان (اگست ۱۹۱۱ء) وغیرہ بھی اہم ہیں۔ مخزن میں تخلیقی اصناف نثر میں ناول بالاقساط چھپتے تھے۔ ان میں مولانا ظفر علی خان کے انگریزی افسانے اور ناولوں کے تراجم شائع ہوئے مثلاً ''خیابان فارس'' قساط وار شائع ہوتا رہا۔ ناصر زیدی کا ناول ''المورکھا'' (مخزن ۱۹۱۱ء) چھپتا رہا۔ جو بعد ازاں ۱۹۱۶ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔۱۰ جبکہ افسانہ نگاری میں راشد الخیری کا ''نصیر اور خدیجہ'' (دسمبر ۱۹۰۳ء) ''سکیما کی دوشیزہ کی داستان'' (دسمبر ۱۹۰۳ء) علی محمود کا ''پرانی دیوار'' (۱۹۰۴ء) یلدرم کے افسانے ''دوست کا خط'' (دسمبر ۱۹۰۶ء) ''حضرت دل کی سوانح عمری'' (فروری ۱۹۰۷ء)، ''چڑیا چڑے کی کہانی'' (اپریل ۱۹۰۷ء)، ''حکایہ لیلی مجنوں'' (اکتوبر ۱۹۰۷ء) سودائے سنگین (اگست ۱۹۰۸ء) اور ''اگر میں صحرانشین ہوتا'' شائع ہوئے۔ یلدرم کے علاوہ سلطان حیدر جوش کا ''نابینا بیوی'' (دسمبر ۱۹۰۷ء)

راشد الخیری کا ''عصمت اور حسن'' (اپریل ۱۹۰۷ء)، ناصر فراق زیدی کا ''گھن کا کیڑا'' (فروری ۱۹۱۴ء) اور سدرشن کا ''جنس صداقت'' (اپریل ۱۹۲۰ء) وغیرہ جیسے محض چند افسانے ہی اس نثری صنف کو وقار بخشنے کے حوالے سے کافی ہیں۔

''مخزن'' نے لسانیات کے موضوع پر بھی بالخصوص توجہ دی۔ اس ضمن میں ''اردو زبان پنجاب میں'' از شیخ عبدالقادر (ستمبر ۱۹۰۳ء) ''اردو زبان پنجاب میں'' از پنجابی انبالوی (ستمبر ۱۹۰۳ء) ''اردو زبان پنجاب میں'' از علامہ محمد اقبال (اکتوبر ۱۹۰۳ء) ''اردو اور دیسی زبان'' از برجموہن دتاتریہ کیفی (فروری ۱۹۰۵ء)، ''زبان اردو'' از مرزا سلطان احمد (جون ۱۹۱۹ء) کے علاوہ مولوی فضل حق (شیر پنجاب) کا تحریر کردہ مضمون ''اردو اور اہل زبان'' بالاقساط مخزن میں چھپتا رہا۔ لسانیا ت کے موضوع پر حافظ محمود شیرانی کے ابتدائی تحقیقی مضمون ۱۹۲۰ء سے ''مخزن'' کی زینت بننے شروع ہوئے۔ ان کا پہلا تحقیقی مقالہ ''قابوس نامہ'' ۱۹۲۰ء کے شماروں میں قسط وار شائع ہوا۔ پھر ''دقیقی'' پر تحقیقی وتنقیدی مقالہ لکھا۔ اس طرح رسالہ ''مخزن'' نے نہ صرف ''پنجاب میں اردو'' کے موضوع سے متعلق لسانی تحقیقی مباحث کا باقاعدہ آغاز کیا بلکہ لسانیات پر تحقیق کرنے کی ترغیب بھی دلائی۔ انہی لسانی مباحث کے نتیجے میں حافظ محمود شیرانی نے تحقیقی انداز سے ایک مبسوط اور مربوط کتاب ''پنجاب میں اردو'' (۱۹۲۸ء) لکھی۔ ورنہ اس سے قبل پنجاب میں اردو پر جتنا بھی کام ہوا تھا وہ مضامین کی صورت میں اس عہد کے اخبارات ورسائل میں ہی مدفون تھا۔ تمثیل نگاری کی طرز پر سر عبدالقادر، محمد اکرام، محمد صادق علی اور غلام حسین نے بھی اپنے تخلیقی جوہر دکھائے۔ غلام بھیک نیرنگ، مرزا سلطان احمد، سجاد حیدر یلدرم، مرزا محمد سعید دہلوی کے انگریزی وترکی زبان سے اخذ وتراجم کے سلسلے بھی مخزن کے صفحات کی زینت بڑھاتے رہے پھر خود شیخ عبدالقادر کی معتد بہ اور متنوع تخلیقات (جن میں خود نوشت، سوانحی، علمی ادبی اور تنقیدی مضامین اور تراجم کے ساتھ سفرنامہ بھی شامل ہے) بڑے تواتر کے ساتھ مخزن میں شائع ہوئیں اور انہوں نے ادیب کے طور پر اپنی ایک پہچان یہیں سے بنائی۔ ان میں سے چند کے ایک عنوانات ہی سے شیخ عبدالقادر کی ذہنی وفکری اُپج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ''فن تنقید'' (ستمبر ۱۹۰۱ء) ''نظم آزاد'' (نومبر ۱۹۰۱ء) دیوان سید محمد کاظم حبیب پر ایک نظر (فروری ۱۹۰۲ء) ''حیات جاوید پر ایک نظر'' (اکتوبر ۱۹۰۳ء) ''پٹنہ اور خان بہادر مولانا شاذ'' (اگست ۱۹۰۴ء) ''جنگ روس و جاپان پر ایک تنقیدی نظر'' (فروری ۱۹۰۶ء) ''میر انیس'' (اگست ۱۹۰۶ء) ''شہزادہ میرزا ارشد گورگانی'' (اپریل ۱۹۰۷ء) ''کلیات اکبر'' (اپریل ۱۹۰۹ء) ''شعرالعجم'' (جولائی ۱۹۱۰ء)[۱۱] کے علاوہ فرانسیسی زبان سے تین بہترین افسانے اردو میں اخذ وترجمہ کیے ان میں ''تاج دار بیوی کا بے تاج شوہر'' ''دل ہی تو ہے'' ''وطن آخر وطن ہے'' شامل ہیں جبکہ سفرنامہ کی طرز اپنے سفری حالات ''ساحل کی سیر،

پیرس یا پری، جنوب فرانس میں سرما، نت نئے نظارے، چند گھنٹے لیور پول میں" کے عنوانات سے مخزن کے لیے لکھے۔ سفرنامہ ہی کی ذیل میں محمد فاروق اور شیونرائن شمیم نے بھی مخزن میں اپنے سفری حالات قلمبند کیے۔

مجموعی طور پر مخزن کی زندگی پر نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہو گا کہ اس نے نہ صرف نت نئی اصناف نثر سے با قاعدہ متعارف کرایا بلکہ ان میں تراجم کی صورت میں نئے اور متنوع تجربات بھی اردو نثر میں منتقل کیے۔ تنقیدی روایت کو آگے بڑھایا۔ حالی کے بعد اردو تنقید میں شعر کی مائیت اور اصولوں سے متعلق حامد اللہ افسر کی کتاب "مبادیات تنقید" پہلے پہل قسط وار رسالہ مخزن (جولائی ۱۹۰۵ء) میں چھپنا شروع ہوئی۔ حالی نے اس میں مرزا سجاد بیگ کی کتاب "حکمت عملی" پر ریویو لکھا۔ پھر ۱۹۰۶ء میں مولانا محمد حسین آزاد کے خطوط کا سلسلہ اشاعت بھی پہلی بار مخزن ہی نے قائم کیا۔ اس کے علاوہ افسانے، تاریخ، انشائیے لطیف، تنقید، ترجمہ کتب، تحقیقی مضامین، تصوف، تعلیم، ریاضی، ہیئت، سفرنامے، رپورتاژ، سوانحی تذکرے، روزنامچے، سیرت نبویؐ، سائنس، سیاست، جغرافیہ، صحافت، طب، حکایات، طنز و مزاح، فنون لطیفہ، لسانیات، معاشیات، تمثیل، ناول، مکاتیب، واقعات حاضرہ اور واقفیت عامہ وغیرہ کے موضوعات سب مخزن کے تنوع اور رنگارنگی کا عکس ہیں۔ جس پر طرہ امتیاز یہ کہ ان تمام موضوعات پر مبنی تحریروں کا اسلوب بیان سادہ، سلیس اور رواں رکھا جاتا تھا۔

مخزن کے مضمون نگار چونکہ انگریزی علوم وفنون سے بہرہ ور تھے اس لیے ان کی نگارشات میں جدید افکار و نظریات اور رجحانات بڑی سرعت سے اردو نثر میں منتقل ہوئے۔ جس سے موضوع، خیال اور زبان و بیان کو وسعت ملی۔ اس طرح بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں "مخزن" کی بدولت اردو نثر کو ایک بہت بڑی کامیابی یہ ملی کہ شاعری کے ساتھ ادبی نثر پر بھی خصوصی توجہ مرکوز کی گئی۔ اس کے لیے "مخزن" نے اپنے مقاصد کو بارہا دوہرانے کا اہتمام بھی جاری رکھا۔ اس ضمن میں مخزن فروری (۱۹۱۳ء) کی اشاعت میں ایک بار پھر اپنے نصب العین کی وضاحت کرتا یوں دکھائی دیتا ہے:

۱۔ اردو علم و ادب کی زرخیزی اور ترقی - اعلیٰ درجے کی علمی، اخلاقی، تاریخی، ادبی، مجلسی، مضامین اور جدید و قدیم طرز کی بہترین شاعری کے ذریعے۔

۲۔ اردو دان پبلک میں اعلیٰ درجہ کے مضامین عمدہ اشعار اور نظمیں اور دلفریب افسانے لکھنے اور ان کے مطالعہ کرنے کا شوق پیدا کرنا۔

۳۔ اردو اور فارسی مصنفوں اور شعرا اور ان کے کارناموں سے متعلق تنقیدی مضامین شائع کرنا۔

۴۔ خاص مذہبی، نزاعی اور پولیٹکل مضامین کو مخزن میں جگہ نہیں دی جائے گی۔

۵۔ اردو نظم و نثر میں مفید اصلاح کرنا۔

۶۔ نئے مفید خیالات و جذبات کو اردو زبان میں داخل کرنا۔

۷۔ علوم جدیدہ کی طرف لوگوں کی توجہ دلانا۔

۸۔ دوسری زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحات کو نئے سانچہ میں ڈھال کر اردو میں رواج دینا۔[۱۲]

مذکورہ شقیں اس بات کی غماز ہیں کہ مخزن نے سب سے زیادہ توجہ نثر کی ترقی کی طرف دی اور رسالے کا معتدبہ حصہ نثر کے لیے مخصوص کرتے ہوئے اس میں دلچسپ، طبع زاد مضامین کے لیے بہت سے مفید تراجم کو جگہ دی گئی۔ جس سے اردو زبان کے سرمایے میں بے بہا اضافہ ہوا۔

مخزن کی ادارت مختلف ادوار میں شیخ عبدالقادر (۱۹۰۱ء) شیخ محمد اکرام (۱۹۰۷ء) مولانا غلام رسول مہر (۱۹۱۰ء) تاجور نجیب آبادی (۱۹۱۷ء)، حفیظ جالندھری (۱۹۲۷ء) فائز رہے۔ ان احباب کی ادارت میں ''مخزن'' ہی کی وجہ سے ادبی ذوق عام ہوا اور ''ہمایوں'' ''نیرنگ خیال'' ''عالمگیر'' ''ادبی دنیا'' اور ''ادب لطیف'' جیسے مجلّے منظر عام پر آئے جنھوں نے بالخصوص اردو زبان و ادب کو ترقی دی۔ قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) کے بعد مولانا حامد علی خان کی ادارت میں مخزن پھر سے زندہ ہوا اور ایک بار پھر بڑی تعداد میں ادباء کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہا۔ چنانچہ آغا محمد باقر، حمید احمد خان، ایم ڈی تاثیر، عبدالرشید چشتی، خلیفہ عبدالحکیم، یوسف ظفر، علی عباس جلالپوری، سید عابد علی عابد، پنڈت دتاتریہ کیفی، محمد اسمٰعیل پانی پتی، تلوک چند محروم، اثر صہبائی، جوش ملیسانی، آغا صادق، ہادی حسین، شیر محمد اختر، آغا حسین ارسطو جاہی، فیاض محمود وغیرہ کی تحریروں نے اس زمانے میں بھی مخزن میں نو واردان ادب کے تہذیبی و ادبی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔ ان میں انور جلال، ریاض الرحمٰن، مسعود اشعر، امین الرحمٰن، شمس الدین صدیقی، ارشد مسعود، صادقین، جاوید صدیقی، سعید احمد رفیق، تمکین کاظمی، بشیر ساجد اور جمیل جالبی کے نام نمایاں ہیں۔ مخزن میں شائع ہونے والی تمام نگارشات رومانیت، ترقی پسندی اور جدید نظریات کا بہترین مرقع ہیں۔ لہٰذا ڈاکٹر سید عبداللہ کا مخزن کو ایک تحریک قرار دیتے ہوئے یہ کہنا بالکل بجا ہے:

> ''مخزن کے ادیبوں نے پہلی مرتبہ اردو ادب کے لہجے میں ملائمت پیدا کی اور زندگی کی ان لطافتوں اور شیرینوں کا احساس دلایا جو کائنات میں چار سو پھیلی ہوئی ہیں مگر ذوقی تربیت نہ ہونے کے باعث لوگ ان سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ مخزن نے ان شیرینوں تک پہنچنے کے لیے راستہ صاف کیا۔ مخزن ہی میں پہلی دفعہ انسان نے انسان کو ڈھونڈا اور انسان نے اپنے اندر کے انسان

سے ملاقات کی اور پوری زندگی کی ان شرافتوں کا احساس زندہ ہوا جن سے انسانوں کی یہ بستی بسنے کے قابل ہوتی ہے۔مخزن کی ادبی تحریک میں ایک لطیف فکری لہر بھی پائی جاتی ہے اس میں علمی اور سائنسی سچائیوں کی تلاش بھی ہے اس میں انسانی زندگی اور ذہن کے تقریباً سبھی تقاضوں کے لیے رہبری اور رہنمائی کا سامان ملتا ہے۔ یہ انسانیاتی تحریک تھی جس نے عقل اور جذبے کی مفاہمت کے لیے موقعے پیدا کیے۔''[۱۳]

سن ۲۰۰۰ء میں''مخزن'' ہی کے تسلسل میں قائداعظم لائبریری نے اپنے شش ماہی رسالہ کا ''مخزن'' ہی کے نام سے اجراء کیا۔ جس کے پہلے ایڈیٹر ڈاکٹر وحید قریشی تھے جبکہ مجلس ادارت میں انتظار حسین، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر طاہر تونسوی، امجد اسلام امجد شامل تھے۔ ۲۰۰۹ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کی وفات کے بعد سے تا حال اس کے ایڈیٹر شہزاد احمد ہیں جبکہ مجلس ادارت میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر تحسین فاروقی اور ڈاکٹر خورشید رضوی شامل ہیں۔ شیخ عبدالقادر کے مخزن کے برعکس اس ''مخزن'' کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ایک خالص تحقیقی وتنقیدی مزاج کا حامل پرچہ ہے۔

زمیندار:

۱۹۰۳ء میں مولانا سراج الدین احمد نے اس ہفت روزہ اخبار کا اجراء کیا۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ اخبار زمینداروں، کاشتکاروں اور کسانوں کی بھلائی کے لیے نکالا گیا۔ ۹ نومبر ۱۹۰۹ء کوسراج الدین احمد کی وفات کے بعد ان کے ہونہار بیٹے مولانا ظفر علی خان نے اس کی ادارت سنبھالی۔ اس دور میں مسلمانوں پر کڑا وقت آیا ہوا تھا۔ مثلاً تقسیم بنگال کی تنسیخ، حادثۂ کانپور، جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے مسلمانوں کے لیے حالات کو سنگین بنا دیا تھا جس کا اثر اس وقت کی صحافت پر بھی رونما ہوا۔ ایسے میں ''زمیندار'' مولانا ظفر علی خان کی ادارت میں پرجوش اور ''طوفانی صحافت کا نقیب''[۱۴] ثابت ہوا۔ مولانا ظفر علی خان جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں قابلیت رکھتے تھے اپنی صلاحیت سے اس اخبار کا مزاج ہی بدل دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ''زمیندار'' مولانا ظفر علی خان زیر ادارت مقبول اور ہر دلعزیز اخبار بن گیا۔ اس میں معلوماتی مقالات، خبروں کی فراہمی، سامراج اور مغربی طاقتوں پر بے لاگ تنقید، حکایات اور ''افکار و حوادث'' جیسے مزاحیہ کالموں نے عوام میں اخبار بینی کے ذوق کو پروان چڑھایا۔ اخبار ''زمیندار'' کی اردو نثر نے اسلوب بیان میں وجاہت پیدا کی اور اسے خطابت کی صفت سے ہمکنار کیا۔ دلیل کے ساتھ ادبی رنگ کے تبصروں کو رواج دیا اور زبان کی نوک پلک درست کرنے پر خصوصی توجہ مرکوز کی۔ زبان و بیان کی اسی خوبی کے حوالے سے محمد دین فوق کی معاصر شہادت ہے کہ ''اخبار زمیندار'' کی نظم مستند اور اس کی نثر اردو لٹریچر کی جان

ہوتی ہے اور اکثر لوگ صرف زبان کا چٹخارہ اور عجیب عجیب ترکیبیں اور نئی نئی بندشیں دیکھنے کے لیے ہی اس کو شوق سے خریدا کرتے ہیں۔"۵۱ اخبار زمیندار میں غیر ملکی اخبارات سے اعلیٰ پائے کے تراجم کیے جاتے تھے۔ اخبار کے معیار کو بہتر بنانے میں مولانا ظفر علی خان کے لیے علاوہ عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش اور چراغ حسن حسرت نے بھی فعال کردار ادا کیا۔

راوی:

۱۹۰۶ء میں مایہ ناز علمی درسگاہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور نے اپنے اس علمی و ادبی مجلّہ کا اجراء کیا۔ ابتدا میں یہ مجلّہ انگریزی زبان میں شائع ہوتا رہا۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں پہلی بار اردو زبان کو اس میں جگہ ملی۔ جس کے بعد اردو زبان کے صفحات میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا گیا اور بالآخر ۱۹۱۹ء کے بعد اردو سیکشن مجلّہ "راوی" کا باقاعدہ حصہ بن گیا۔ پطرس بخاری کی ادارت (۲۱-۱۹۱۹ء) نے اسے زبان و بیان اور فکر و خیال کے اعتبار سے مستند بنانے کا تاریخی فریضہ انجام دیا جسے بعد ازاں امتیاز علی تاج، تاج محمد خیال، شیخ محمد اکرام، ن-م راشد، آغا عبدالحمید، سید محمد جعفری، ریاض الدین احمد، ضیاء جالندھری، عبدالکریم خالد، مظفر علی سید، شہزاد احمد، حنیف رامے، بذل حق محمود، انیس ناگی، محمود شام، سرمد صہبائی، محمد اجمل نیازی، ناصر سلطان کاظمی اور سراج منیر وغیرہ نے اسے وہ استحکام بخشا کہ "راوی" علمی مجلّہ کے ساتھ ساتھ باقاعدہ ادبی شمارے کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مجلّہ "راوی" نے مستقبل کے ادباء کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی جہات کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ ان کی ذہنی وفکری تربیت میں بھی فعال کردار ادا کیا۔ اس کے ساتھ پختہ فکر و نظر کے حامل ادباء کی تحریروں کی اشاعت سے "راوی" نو واردان ادب کے لیے راہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیتا رہا ہے۔ اسی کی آغوش میں علامہ اقبال، پطرس بخاری، امتیاز علی تاج، ن م راشد، فیض احمد فیض، مظفر علی سید، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، شیخ محمد اکرام، سید ضمیر جعفری، آغا بابر، ڈاکٹر محمد اجمل، الطاف گوہر، جاوید اقبال، اشفاق احمد، آفتاب احمد، داؤد رہبر، صدیق کلیم، غالب احمد، شہزاد احمد، جیلانی کامران، حفیظ ہوشیارپوری، منیر احمد شیخ، ظفر اقبال، کشور ناہید، صفدر میر، محمد صفدر، سعید اختر درانی، وزیر آغا، ریاض قادر، اختر احسن، محمد منور مرزا، ڈاکٹر معین الرحمن، صابر لودھی، قیوم نظر، وحید قریشی، اور عظیم مرتضیٰ (محض چند نام ہیں) وغیرہ نے علمی و ادبی تربیت پائی اور ادبی دنیا میں مستند و مقتدر ٹھہرے۔ لہٰذا مجلّہ "راوی" نے نہ صرف گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کی تعلیمی و علمی سرگرمیوں کے فروغ و ارتقا میں کلیدی کردار ادا کیا بلکہ لاہور کی اردو نثر کو بھی پروان چڑھانے میں اساسی اہمیت اختیار کر گیا۔ "راوی" اپنے عہد کے ادبی منظر نامے کا مستند مرقع ہے جس میں اردو نثری اصناف نے اپنی ساخت پر داخت کے ارتقائی مراحل طے کیے۔ نثری اصناف کا یہ تنوع بیک نظر بدر منیر الدین کے مقالہ "توضیحی اشاریہ رسالہ

راوی" (قیام پاکستان تک) ۱۹۸۷ء میں دیکھا جا سکتا ہے۔"راوی" تخلیق وتنقید اور تحقیق کی صحت مند اور توانا روایت کو ہنوز کامیابی سے جاری رکھے ہوئے ہے۔

پھول:

۱۱۳ اکتوبر ۱۹۰۹ء کومولوی سید ممتاز علی نے بنت نذر الباقر کی ادارت میں بچوں کا یہ رسالہ جاری کیا۔جس کا مقصد بچوں کے اخلاق بہتر بنانا اوران میں ادبی ذوق پیدا کرنا تھا۔ یوں یہ رسالہ نئے لکھنے والوں کی ذہنی تربیت کا فریضہ انجام دے رہا تھا۔ بعدازاں سید امتیاز علی تاج کی ادارت میں اس نے خوب ترقی کی بلاشبہ بچوں کا پہلا کامیاب رسالہ تھا جس نے نونہالوں کی علمی اوراخلاقی تربیت کی۔ اپنے عہد کے نامور ادباء مثلاً غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، راجہ مہدی علی خان، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، حفیظ ہوشیارپوری، ہری چند اختر، شوکت تھانوی، عظیم بیگ چغتائی، پطرس بخاری، سیفی سیوہاروی، محمد دین تاثیر، نور الٰہی، محمد عمر صاحبان، حامد حسن قادری، عبدالمجید سالک، وجاہت جھنجھانوی، نذر سجاد حیدر، قرۃ العین حیدر وغیرہ کی قلمی معاونت نے اسے ایک معیاری پرچہ بنا دیا۔

رسالہ ہزار داستان:

یہ پندرہ روزہ رسالہ حکیم احمد شجاع نے ۱۹۲۱ء میں جاری کیا۔اس رسالہ کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں تخلیقی اصناف نثر میں بالخصوص افسانہ اور ڈراما کوفوقیت دی گئی۔ اوراسے جدید فکر ونظر سے آراستہ کیا۔ چنانچہ اسے رسالہ مخزن کی نہج پر چلانے کی کامیاب کوشش کی گئی۔

ہمایوں:

جنوری ۱۹۲۲ء میں میاں بشیر احمد نے یہ رسالہ جاری کیا تو ہر فکر ونظر کے ادیب کی تحریر نے اس میں جگہ پائی۔ یہ اپنے دور کے مزاج اور مذاق کے حوالے سے متعدد تجربات کی آماجگاہ بنا رہا لیکن بنیادی طور پر رومانوی، ادیبوں نے زیادہ جگہ پائی ۔میاں بشیر احمد کے علاوہ تاجور نجیب آبادی، منصور احمد، حامد علی خان، یوسف ظفر، شیر محمد اختر ، مظہر انصاری ، ناصر کاظمی ہمایوں کی ادارت سے وابستہ رہے جو خود علمی و ادبی ذوق کے حامل تھے۔اس کے مستقل عنوانات "جہاں نما" "علمی شعاعیں" "نسوانی دنیا" اور "محفل ادب" کوعلمی وتعلیمی اسلوب سے مزین کیا گیا۔اس کے مضامین فنی، تنقیدی، فلسفیانہ، اورنفسیاتی موضوعات پرمبنی ہوتے تھے۔اصناف ادب میں بالخصوص افسانہ، ڈراما، اورسفرنامہ کو اہمیت دی گئی۔ جن سے ادب کو نئی ہیئت، تکنیک اور اسلوب کے حوالے سے کشادگی ملی۔ مثلاً مجموعہ"انگارے" میں شامل احمد علی کا افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" ہمایوں جنوری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔اس

کے علاوہ ''پرانی نسل کے خلاف ردعمل'' از انتظار حسین سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ دو مختلف مکتبہ فکر (ترقی پسندی اور اس کا ردعمل) اس رسالے کی آغوش میں بیک وقت پروان چڑھے۔ اس کے قلمی معاونین میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، ظہیر کاشمیری، دیویندر ستیارتھی، انتظار حسین، شفیق الرحمٰن، فیاض محمود، الطاف گوہر، آغا بابر، راجندر سنگھ بیدی، صلاح الدین احمد، اے حمید، میراجی، احمد ندیم قاسمی، شیر محمد اختر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جن سے رسالے کے معیار کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس رسالے کے خاص نمبر اور سالنامے چھاپنے کی روایت کو بھی مستحکم کیا چنانچہ ''افسانہ نمبر'' (۱۹۳۴ء) روسی ادب نمبر (۱۹۳۵ء) فرانسیسی ادب نمبر (۱۹۳۵ء) شائع کیے۔

ہمایوں نے ترقی پسند مصنفین اور حلقہ ارباب ذوق کے ادبا کو نمایاں جگہ دی۔ چنانچہ ''ہمایوں'' کا امتیاز رہا ہے کہ اس میں ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے دھارے بیک وقت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس نے دونوں نقطہ ہائے نظر کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد جو نئے نظری مباحث پیدا ہوئے مثلاً پاکستانی ادب اور لسانی تشخص کے موضوعات کی ترویج میں معاونت کی۔ اس حوالے سے میاں بشیر احمد، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر محمد باقر، عزیز احمد، رحمٰن مذنب، حسن عسکری، اور حامد علی خان پیش پیش رہے۔

ماہنامہ نیرنگ خیال:

جولائی ۱۹۲۴ء میں معنوی اور صوری خوبیوں سے مزین حکیم یوسف حسن خان کی ادارت اور محمد دین تاثیر کی معاونت میں جاری ہونے والا ایک اجتہادی رسالہ تھا۔ اس نے حلقہ نیاز مندان لاہور کی آواز بن کر معیاری ادبی ذوق کی آبیاری کی اور نئی سوچ اور فکر کو ایک جولاں گاہ دی۔ اسے ابتدا میں نیاز فتح پوری، حفیظ جالندھری، علم الدین سالک، امتیاز علی تاج، علامہ اقبال، آغا حشر، حامد اللہ افسر اور مالک رام [۱۶] جیسے ادباء کی قلمی معاونت میسر آئی۔ اس کے صفحہ اول پر یہ عبارت تحریر ہوئی ''ایجاد ہمارا حصہ ہے اور تقلید دوسروں کا''۔ [۱۷] اس رسالہ کی بڑی جدت طرازی سالانہ خاص نمبروں کا اجراء تھی۔ جس میں موضوعی نمبر مثلاً مصر نمبر، افغانستان نمبر، ایڈیٹر نمبر، دنیائے اسلام نمبر، اردو کانفرنس نمبر، گولڈن جوبلی نمبر، فلم نمبر، خواتین نمبر، مشرق نمبر، اقبال نمبر، افسانہ نمبر، چینی افسانہ نمبر، تاثیر نمبر وغیرہ مستقل نوعیت کی اشاعتیں تھیں۔ شوکت تھانوی کا سودیشی ریل، عبدالغفار کا سلسلہ لیلیٰ کے خطوط، ڈاکٹر تاثیر کا ترجمہ ''سلومی'' (آسکر وائلڈ کی تمثیل تھی) اور عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ افسانہ ''انگوٹھی کی مصیبت'' نے ''نیرنگ خیال'' ہی سے شہرت پائی۔

ڈاکٹر تاثیر کے مضامین ''شارحین غالب'' (جولائی ستمبر ۱۹۲۶) حضرت اصغر گونڈوی اور ادب آموز (ستمبر ۱۹۲۶) داستان اردو کا ایک باب (ستمبر ۱۹۳۳ء) ''جوش کی شاعری اور نیاز کی لغزشیں'' (اکتوبر ۱۹۳۳ء) وغیرہ ان کی

ادبی معرکہ آرائیوں کے حوالے سے اہم ہیں۔ نیرنگ خیال نے تمام اصناف نثر کو یکساں طور پر پروان چڑھایا۔ نیز دیگر رسائل بالخصوص ''ساقی'' کراچی سے ادبی معرکے بھی جاری رکھے۔

عالمگیر:

یہ ماہنامہ حافظ محمد عالم کی ادارت میں جون ۱۹۲۴ء میں جاری ہوا۔ اس کے لکھنے والے ترقی پسندانہ سوچ کے حامل تھے۔ مثلاً مرزا ادیب جن کی ابتدائی تنقیدی تحریریں ''گرد و پیش'' کے عنوان سے اسی رسالے سے مقبول ہوئیں۔ جو ترقی پسند فکر کی آبیاری کر رہی تھیں۔اس رسالے نے بالخصوص تاریخی ناول نگاری کے ذوق کو پروان چڑھایا اور افسانے مضامین پر توجہ دی۔ نیز قسط وار ناول ''دریتیم'' مصنفہ احسان بی اے اور'' چچا چھکن'' کے مقبول سلسلہ کو بادشاہ حسین سے لکھوایا۔ خاص نمبروں کو بھی رواج دیا۔ بقول ڈاکٹر سجاد حیدر پرویز ''عالمگیر نے اپنے ضخیم اور خاص نمبروں کی وجہ سے ادبی فضا پر قبضہ کیا ہوا تھا''۱۸۔ اس کے لکھنے والوں میں قرۃ العین حیدر، شوکت صدیقی، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، طفیل ملک، ظہور الحسن ڈار وغیرہ شامل تھے۔

اورینٹل کالج میگزین:

علوم شرقیہ السنہ کے اس تحقیقی جریدہ کا اجراء فروری ۱۹۲۵ء میں محمد شفیع کی ادارت میں ہوا۔ جس نے تحقیق کے مزاج اور شوق کو مستقل بنیاد فراہم کی۔ اس روایت کو مستحکم بنانے میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر سید محمد اکرام نے فعال کردار ادا کیا۔

ادب، تاریخ، اور لسانیات کے موضوعات پر تحقیق و تنقید کے نئے دریچے وا کیے۔۱۹ پروفیسر محمد اقبال کا مقالہ ''شاہ نامہ اسلام کے ماخذ'' حافظ محمود شیرانی کا ''رابعہ بن کعب'' اور ''منیر لاہوری'' پروفیسر عبدالعزیز میمن کا ''ابوالعلا اور ابوالمصور خازن'' محمد نور الحق علوی کا ''دائرۃ الوجود'' مولوی محمد شفیع کا ''فارسی تذکرے'' عبدالرحمٰن دہلوی کا ''محمد شاہ بن تغلق'' محمد حمید اللہ کا ''زبان اور اللہ کا کلام'' ڈاکٹر محمد وحید مرزا کا ''برصغیر پاک و ہند میں علوم مشرقیہ کی بقا اور انگریز'' ڈاکٹر سید محمد اکرام کا ''فکر غالب میں ارتقائی رجحان'' ڈاکٹر جمیل جالبی کا ''ولی کا سال وفات'' ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا ''مصحفی کی شخصیت'' اور ''دستاویزی تحقیق'' افتخار احمد صدیقی کا ''اقبال اور نذیر احمد کے فکری روابط'' ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کا ''قطعہ غالب'' اور'' گل رعنا نسخہ مالک رام''، امین اللہ وثیر کا ''ملا محمد باقر لاہوری'' عارف نوشاہی کا ''ذخیرہ شیرانی کا جائزہ'' اہم معیاری تحقیقی مقالے اس کی زینت بنے۔ نیز نادر متون ''گلزار چین'' مصنفہ محمد خلیل علی خان رشک ''زبدۃ المعاصرین'' مصنفہ سید میر حسین الحسینی شیرازی ''نقلیات'' مؤلفہ ڈاکٹر جان گلکرسٹ ''افسانہ

عشق'' مؤلفہ الٰہی بخش شوق اور نوادارت کی اشاعت سے نئے تحقیقی کارناموں کو ادبی تحقیق میں متعارف کرایا۔ حافظ محمود شیرانی ۲۹ اور قاضی فضل حق کے مقالات ''پنجاب میں اردو'' لسانیات کے موضوع پر خاصے کی چیزیں رہی ہیں۔

ادبی دنیا:

۱۹۲۹ء میں تاجور نجیب آبادی کی ادارت میں جاری ہونے والے اس رسالے نے ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کے تحت مختصر افسانہ اور بلند پایہ نظریاتی وتنقیدی مضامین کو جگہ دے کر دو بڑے رجحانات کو تشکیل دیا۔ تخلیقی اصناف کے علاوہ مغرب کے افسانوں کے تراجم کو بالخصوص اہمیت دی۔ مولانا صلاح الدین احمد، منصور احمد، حفیظ ہوشیار پوری، عاشق حسین بٹالوی اور میرا جی، محمد عبداللہ قریشی، وزیر آغا نے ادبی دنیا کی ادارت کے فرائض انجام دیئے۔ کلاسیکیت اور جدیدیت کے امتزاج کا یہ رسالہ اس اعتبار سے بے حد اہم ہے کہ اس نے خالص ادب کو پروان چڑھانے کے ساتھ خاص نمبروں اور سالناموں کے اجراء کی روایت کو آگے بڑھایا۔ منصور احمد، میرا جی، حامد علی خان، جلیل قدواتی، خلیل بی اے، سراج الدین، احمد نظامی کے مغربی ادب کے عمدہ تراجم کا سلسلہ اس کی گراں قدر خدمت تھی۔ میرا جی نے والٹ وٹمن، بودلیئر، ملارمے، لارنس، چنڈی داس، ودیاپتی اور امارو وغیرہ کے مطالعے کے بعد ''ادبی دنیا'' ہی میں ان شعرا پر تنقیدی مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کر کے تنقید میں کشادہ نظری کی فضا کو استوار کیا۔

حمید احمد خان کا سفرنامہ ''میری بھارت یاترا'' اور ڈاکٹر محمد حسین کا ''سفرنامہ جاپان''، جبکہ افسانہ نگار راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، دیویندر ستیارتھی، ممتاز مفتی، بلونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، احمد ندیم قاسمی، آغا بابر، شمس آغا، کے فن کو پختگی عطا کی اور نئے ادبی تجربات کو خوش آمدید کہا۔ فکری اور نظری تنقید کو پروان چڑھایا۔ قیام پاکستان کے بعد اقبالیات کے ساتھ نئے ادبی مباحث، لفظ اور خیال کا رشتہ، حسن کیا ہے؟ وقت کیا ہے؟ صبح تہذیب کا انسان، شاعری میں علاقوں کا مسئلہ، وجودیت اور صنف انشائیہ کو متعارف کرایا۔ نیز سید علی عباس جلالپوری کے اقبال کے علم کلام پر بے لاگ تنقید و تجزیے کا سلسلہ مضامین بھی خاصے کی چیز ہیں۔ مضامین کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں: ''ابا جان مرحوم'' ''ماڈل ٹاؤن کی کہانی'' ''لمحے'' ''داؤد رہبر'' ''انشاء کی ریختی'' از امجد الطاف ''ادب اور جمالیات'' از ریاض احمد، ''سر عبدالقادر ایک صاحب طرز انشاپرداز، ''بلاد اسلامیہ اقبال کی نظر میں'' ''اقبال کا تصور فقر، ''رومی اور اقبال کا مشترکہ نظریہ حیات'' ، ''ظفر علی خان کی شاعری'' ''اقبال پیغمبر حرکت وحرارت'' ''آزاد اردو کا اولین انشا پرداز'' ''میرا جی کے منظوم تراجم'' ''اقبال کا تصور مملکت'' ''نذیر احمد کے عمرانی نظریات'' از مولانا صلاح الدین احمد، ''اردو تنقید غدر سے پہلے'' از ڈاکٹر وحید قریشی، ''خوجی کا مزاحیہ کردار'' اور ''اردو نثر میں طنز ومزاح کا پہلا دور''، ''قدیم اردو ڈرامے میں مزاح کا عنصر'' از ڈاکٹر وزیر آغا، جیسے مقالات نے اسے معیار بخشا۔ خاص نمبروں کے علاوہ رسائل

کے ادبی معرکوں نے بھی اردو نثر کو پروان چڑھایا۔ ''ادبی دنیا'' کے ساتھ ''ساقی'' کراچی کا معرکہ ہوا۔ مولانا صلاح الدین احمد نے ''ادبی دنیا'' میں ''کہنے کی باتیں'' کے عنوان سے یہ سلسلہ جاری رکھا۔

ادب لطیف:

ماہنامہ ادب لطیف کا اجراء ۱۹۳۶ء میں چودھری برکت علی نے کیا۔ مرزا ادیب نے اسے فعال اور متوازن بنایا انھوں نے ''صحرانورد کے خطوط'' کا سلسلہ اول اول اسی ماہنامے میں شروع کیا اور بحیثیت افسانہ نگار اور ڈراما نگار اپنی پہچان کرائی۔ ''ادب لطیف'' نے ترقی پسند تحریک کی حمایت کی اور اس کے فکری نظریات و خیالات کی ترویج کا آلہ کار بن گیا۔ چنانچہ اس کی ادارت پر ترقی پسند مصنفین ، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی، قتیل شفائی، فکر تونسوی، احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین وغیرہ مامور رہے۔ ادب لطیف کی وسیع القلبی تھی کہ اس نے غیر ترقی پسندانہ نظریات کے حامل ادبا پر قدغن نہیں لگائی۔ چنانچہ افتخار جالب کے نئے نظریات کے علاوہ انتظار حسین کے علامتی و تجریدی افسانوں کو پیش کیا۔ ترقی پسند افسانے، یک بابی ڈرامے، تنقیدی مضامین، کو بالخصوص فروغ دیا۔ نیز خاص نمبر اور سالناموں کے اجراء کا بھی اہتمام کیا گیا۔ مضامین کے چند عنوانات ''فکر کی شاعری'' از عارف عبدالمتین ، ''تہذیب کی تشکیل'' از اظہار حسین، ''ترقی پسند تحریک کا مستقبل'' از جلیل کریر، ''اردو غزل میں ہیئت کے تجربے'' از سجاد باقر رضوی، ''اردو کے رسم الخط کا مسئلہ'' شاد امرتسری سے موضوعات کی رنگا رنگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انتظار حسین کی ادارت میں اس کا مزاج بدل گیا ہے جسے آج کل صدیقہ بیگم قائم رکھے ہوئے ہیں۔

شاہکار:

یہ رسالہ اپریل ۱۹۳۵ء میں تاجور نجیب آبادی نے جاری کیا۔ جو نئے تنقیدی مباحث میں فعال رہا۔ ن م راشد کے تنقیدی اداریے ''تنقید کا مقصد'' ''ادبیات میں اجتہاد'' ''ادبیات میں ابتذال'' ''تکنیک کی آزادی اور اس کا مفہوم وغیرہ کے علاوہ مرزا محمد سعید دہلوی کا مقالہ ''مذہب اور باطنیت'' ۱۲ پریم چند کا تنقیدی مضمون ''نفسیات اور ادب'' کے علاوہ افسانہ ''ڈال کا قیدی'' ''آقا بیدار بخت کا'' ''اردو نظم کی تنقید کا معیار''، شیکسپیئر کے ڈراموں میں عورت کا کردار از صدیق کلیم، امین حزیں کی ڈراما نگاری' سعادت حسن منٹو اور راجہ مہدی علی خان کے تراجم نے اسے تنوع بخشا۔ یہ رسالہ ترقی پسند ادب کی خامیوں پر تنقید کرنے والوں میں سرفہرست تھا۔

کتاب:

جنوری ۱۹۴۲ء میں جاری ہونے والے اس رسالے کو مرزا ادیب، عبادت بریلوی، شوکت تھانوی، آغا محمد

باقر،عشرت رحمانی، اوپندر ناتھ اشک اور ڈاکٹر وحید قریشی کے ادبی مضامین نے اسے رونق دی۔ یہ فعال علمی جریدہ اس اعتبار سے اہم تھا کہ اس میں ایک پورا ناول پیش کیا جانے لگا مثلاً ارل سٹیلے گارڈنر کا ناول ''دی کیس آف دی فائری فنگرز'' (فروری مارچ ۱۹۵۸ء) میں شائع ہوا۔

اوراق نو:

یہ ماہنامہ قیام پاکستان سے قبل عبدالقادر نے ریاض قادر اور ناصر کاظمی کی ادارت میں جاری کیا۔قلمی معاونین میں سعادت حسن منٹو(افسانہ - خالد میاں) حسن عسکری (مسلمان اور ترقی پسندی)، ڈاکٹر نذیر احمد ، میرا جی، قیوم نظر، یوسف ظفر،عبدالرحمٰن چغتائی جیسے مشاہیر ادب شامل تھے۔

چٹان:

شورش کاشمیری نے جنوری ۱۹۴۸ء میں یہ ہفت روزہ رسالہ جاری کیا۔یہ اس اعتبار سے اہم رسالہ ہے کہ ادبی مضامین اور اقبالیات کے موضوع ''اقبال کا ذہنی ارتقا'' ،از سید نذیر نیازی، اقبال نمبر کے ساتھ آپ بیتی اور خاکہ نگاری کی صنف کو بھی پروان چڑھایا۔شورش کاشمیری کی آپ بیتی ''دود چراغ محفل'' کی اشاعت اسی رسالہ میں ہوئی۔

سویرا:

یہ رسالہ جنوری ۱۹۴۸ء میں چودھری نذیر احمد نے جاری کیا۔ جو ترقی پسند ادب کا ترجمان تھا۔ سعادت حسن منٹو، شفیق الرحمٰن (سناٹا)، ممتاز مفتی، ظہیر کاشمیری، عزیز احمد (پگڈنڈی) عبدالمجید سالک، ممتاز شیریں (تکنیک کا تنوع) کی افسانوی و تنقیدی تحریروں نے اسے معیاری و مثالی ادبی جریدہ بنا دیا۔اس نے بھی خاص نمبروں اور سالناموں کی روایت کو قائم رکھا۔ مختلف اوقات میں احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی، عارف عبدالمتین ظہیر کاشمیری ،احمد راہی، حنیف رامے، سلیم الرحمٰن، ریاض احمد چودھری، ظفر اقبال، صلاح الدین محمود اسے مرتب کرتے رہے۔آزادی کے بعد ''سویرا'' ہی کے صفحات پر لسانی تشکیلات کی نئی تحریک نے بھی جگہ پائی۔

نقوش:

مارچ ۱۹۴۸ء میں محمد طفیل نے احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں یہ رسالہ جاری کیا۔نقوش نے ترقی پسند نقطۂ نظر کو فروغ دیا۔ اس کے پہلے شمارے پر یہ الفاظ ''زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا ترجمان'' ۲۲ اس کی ترقی پسندی ہی کا نعرہ تھے۔اس میں بالخصوص ترقی پسند ادبا کی تحریروں کو جگہ دی جاتی تھی۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی کی ادارت (مارچ ۱۹۴۸ء تا اپریل ۱۹۵۰ء) کے ابتدائی دس شماروں میں سید احتشام حسین کا ''ادیب، حب الوطنی اور وفاداری''

اختر انصاری کا "یہاں ڈالرا گتے ہیں" ظہیر بابر کا "یا خدا" اور اس کا دیباچہ" ڈاکٹر عبادت بریلوی کا "اردو ادب کی ترقی پسند تحریک" وغیرہ میں ترقی پسندی کا نیم سیاسی انداز بھی نمایاں رہا لیکن وقار عظیم کی ادارت (مئی ۱۹۵۰ء تا مارچ ۱۹۵۱ء) میں ادبی عنصر کو اہمیت ملی اور انھوں نے نظریاتی سطح پر اس میں توازن قائم کیا۔ لہٰذا ایسے ادبا بھی نقوش میں جگہ پانے لگے جو جمالیاتی اقدار کے خواہاں اور ادب کی روایتوں کے امین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نیاز فتح پوری کا" اندلس میں آثار علمیہ" ممتاز شیریں کا "اردو کا بہترین رپورتاژ" عابد علی عابد کا "فورٹ ولیم کالج کے چند ناول نگار" نصیر الدین ہاشمی کا "قدیم اردو رزمیہ مثنویاں" مولانا صلاح الدین احمد کا "اردو ناول" صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کا "اردو شاعری کی طرف پیش قدمی" کے علاوہ ۱۹۵۱ء میں ناولٹ نمبر میں انتظار حسین کا ناولٹ "اللہ کے نام پر" اے حمید کا "برف گرتی ہے" اشفاق احمد کا "مہمان بہار" شوکت تھانوی کا "سسرال" اور سعادت حسن منٹو کا "کتاری" شائع ہوئے۔ جبکہ سفرنامہ میں اسلم کمال کا "سوکڑور" پطرس بخاری کا "سفر لندن" قدرت اللہ شہاب کا "اے بنی اسرائیل" محمد طفیل کا "مسافرانہ" نے اس صنف کو مقبول بنایا پھر محمد طفیل کی عہد ادارت (۱۹۸۶ - ۱۹۵۱ء) میں "نقوش" کسی ایک دائرہ میں مقید نہیں رہا۔ اس کے ادارۂ تحریر میں ہر نقطۂ نظر کا حامل ادیب اور ہر نوع کی ادبی نثر رسالے کا حسن بڑھاتی ہے۔ جس سے "نقوش" ایک مکمل اور مستند ادبی رسالہ کے طور پر اپنی شناخت مستحکم کرتا ہے۔ جس کا اندازہ محض ان چند مضامین کے عنوانات سے ہی لگایا جا سکتا ہے۔ جن میں "شاعری میں عظمت گناہ" از ڈاکٹر اعجاز حسین، "وقت ادب اور زندگی کے ساتھ رشتہ" از یوسف جمال انصاری، "مزے دار شاعری" از حسن عسکری، "غالب کی آوارہ خرامی" از ڈاکٹر وزیر آغا، "آتش کی غزل گوئی"، از ڈاکٹر وحید قریشی، "فسانہ عجائب کے کردار" از نیر مسعود رضوی، "خدیجہ مستور کی شخصیت وفن کے کرشمے" از احمد ندیم قاسمی، "خالص شاعری" از اثر لکھنوی، "اسلامی ادب کیوں نہیں؟" از احسن فاروقی، "لاہور کا چیلسی" از حکیم احمد شجاع، "غالب کا مقدمہ پنشن" از خواجہ احمد فاروقی، "اردو داستان کا فنی تجزیہ" از سہیل بخاری، "اسلامی ادب" از شوکت سبزواری، "اردو ادب میں جذبات کا عنصر" از محمد شمس الدین صدیقی، "اردو غزل تقسیم کے بعد" اور "تصوف کے ماخذ" از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، "باغ و بہار و فسانہ عجائب کا قصہ" از وقار عظیم، "داغ، تغزل اور اس کے سماجی محرکات" "جدید اردو غزل" "نظیر اکبر آبادی کی غزل" از ڈاکٹر عبادت بریلوی، "منٹو کا فن" سید عابد علی عابد شامل۔ پاک و ہند کے ادبی مشاہیر کی کہکشاں اسے اپنے تحقیقی، تنقیدی اور تخلیقی نثر پاروں سے سجاتی ہے۔ کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، عزیز احمد، ممتاز مفتی، ابوالخیر مودودی، ڈاکٹر یوسف حسین خان، عندلیب شادانی، علی عباس جلال پوری، محی الدین قادر، رشید احمد صدیقی، شوکت سبزواری، ایم آر کیانی، غلام جیلانی برق، حفیظ جالندھری، اثر لکھنوی، ڈاکٹر اعجاز حسین، آنند نرائن ملا، محمد عبداللہ قریشی، امتیاز

علی عرشی، جوش ملیح آبادی، حجاب امتیاز علی، عبدالرحمٰن چغتائی، وزیر آغا، احمد علی، ابوالفضل صدیقی، صلاح الدین احمد، جوگندر پال، بلراج کومل، سہیل عظیم آبادی، کسری منہاس، علی عباس حسینی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، مختار مسعود، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، مسعود رضوی ادیب، حکیم یوسف چشتی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، فریاد زیدی، نثار عزیز بٹ، عذرا مسعود، اختر جمال، صادق حسین، جیلانی بانو، بشریٰ رحمٰن، بانو قدسیہ، غلام الثقلین نقوی، اشفاق احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، حفیظ صدیقی، صدیق جاوید، ڈاکٹر تحسین فراقی، جمیل ملک، وغیرہ محض چند ایک نام ہیں۔تخلیقی وتنقیدی نثر کو رواج دینے کے لیے متعدد سالناموں کے علاوہ خاص نمبروں کا اہتمام بھی کیا گیا جن میں ''افسانہ نمبر'' ''شخصیات نمبر'' ''خطوط نمبر'' ''لاہور نمبر'' ''اقبال نمبر'' ''غالب نمبر'' ''پطرس نمبر'' ''شوکت تھانوی نمبر'' ''طنز ومزاح نمبر'' ''آپ بیتی نمبر'' اور رسول نمبر (تیرہ جلدوں میں) وغیرہ وقیع ادبی نثری سرمایہ ہیں۔

قندیل:

یہ ہفت روزہ جولائی ۱۹۴۸ء میں روزنامہ ''نوائے وقت'' کے اضافی ضمیمے کے طور پر جاری ہوا۔ چونکہ اسے شیر محمد اختر اور احمد بشیر جیسے مدیر میسر آئے اس لیے اس کا ادبی رنگ نکھرا۔اس میں حلقہ ارباب ذوق کی ہفتہ وار کارروائی درج کی جاتی تھی۔معیاری مضامین کے علاوہ اشفاق احمد کا افسانہ ''رات بیت رہی ہے'' سلسلہ تراجم میں عرش صدیقی کا ''لارڈ جم'' ملک عزیز حیدر نے طامس مور کی ''یوٹوپیا'' انعام الحق نے ''ڈیوڈ کاپرفیلڈ'' جبکہ مرزا ادیب نے ''اوڈیسی'' کا ترجمہ کیا جو اس میں شائع ہوا۔ قندیل نے اقبالیات کے موضوع کو بالخصوص اہمیت دی۔ نیز عبدالمجید سالک کی خودنوشت سوانح بھی اسی ہفت روزہ میں قسط وار شائع ہوئی۔

اُردو ادب:

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۹ء میں سعادت حسن منٹو اور حسن عسکری کی ادارت میں جاری ہونے والے آزادی اظہار کے علمبردار اس رسالہ کی صرف دو ہی اشاعتیں منظر عام پر آسکیں۔ اس میں مضامین کا تنوع، نئے رنگ کے افسانے، بے لاگ تبصرے، تراجم سبھی کچھ شامل تھا۔مضامین خاصے خیال انگیز تھے جن میں ''ہم جنسیت پر ایک اجمالی نظر'' از ڈاکٹر سعید اللہ ''ہمارا ادبی شعور اور مسلمان'' اور ''فن برائے فن'' از حسن عسکری، ''شاعری میں کفر'' از آفتاب احمد، ''ہیر سیال وارث شاہ کا ایک ترقی پسند کردار'' از دوست محمد طاہر، جبکہ افسانوں میں ''خالی بوتلیں خالی ڈبے'' از سعادت حسن منٹو، ''تصور شیخ'' از عزیز احمد، ''اس کی بیوی'' از غلام عباس، ''کالو'' از کرتار سنگھ، ''سنگ دل'' ''بابا'' از اشفاق احمد، ''گوبر کے ڈھیر'' از ممتاز مفتی، ''مسز ڈین'' از ابوسعید قریشی، خاصے کی چیزیں تھے۔

اقدام:

یہ رسالہ اپریل ۱۹۵۰ء میں جاری ہوا۔ میاں محمد شفیع، ممتاز احمد خان اور عبداللہ بٹ کی ادارت میں رہنے والے اس سیاسی ہفت روزہ کو اقبال شناسی، خودنوشت، سوانح، یادنگاری، روزنامچے، اور ادبی مضامین نے ادبیت کے عنصر سے ہمکنار کیا۔ فکر انگیز مضامین میں ''یاد اقبال'' از جسٹس ایس اے رحمان، ''اقبال ایران میں'' از احمد نبی خان، ''اقبال کا نظریہ اشتراکیت'' از خیال امروہوی ''اقبال کے پیغام کی عالمگیری'' از خواجہ غلام الدین، ''اقبال اور قائداعظم'' از محمد ظہیر، ''مذہب کا انتہائی درجہ'' از دیوان سنگھ مفتون، ''پاکستان اور اسلامی نظریہ'' جسٹس کیانی، ''مہر کی غزل'' امجد کندیانی، ''سید سلیمان ندوی کی شاعری'' از ریاض احمد پرواز شامل ہیں۔

استقلال:

۱۹۴۸ء میں جاری ہونے والا یہ ہفت روزہ، سرکاری پرچہ تھا۔ جس نے سرکاری مقاصد کے ساتھ ادب کی خدمت بھی کی۔ اسے نامور مشاہیر ادب کا قلمی تعاون میسر رہا۔ جن میں شیر محمد اختر، ممتاز مفتی، انتظار حسین، اشتیاق احمد، غلام الثقلین نقوی، قیوم نظر، عارف عبدالمتین، خلیل احمد خان، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، حسن عسکری، ہاجرہ مسرور کے نام شامل ہیں۔ اس میں شائع معیاری ادبی مضامین کا اندازہ ان عنوانات سے ہوتا ہے۔ جن میں ''اسلامی فن تعمیر کی روح'' از حسن عسکری، ''اردو میں سیاسی شاعری کا ارتقا'' از انتظار حسین، ''پاکستان میں آرٹ کا مستقبل'' از اینا مولکا احمد، ''تہذیب اور اس کی خصوصیات'' از صفدر حسین، ''زمین کا مسئلہ تخلیق'' از ملک شیر خان، ''مسلمانوں کا فن نقاشی'' از امین الرحمٰن، وغیرا شامل ہیں۔

اقبال:

یہ سہ ماہی مجلّہ ۱۹۵۲ء میں ''بزم اقبال'' کے ترجمان کے طور پر جاری ہوا۔ اس کا مقصد اقبال کے افکار اور علوم وفنون کے حوالے سے نئے گوشوں کی تحقیق وتنقید کی بازیافت کے سلسلہ کو جاری کرکے اقبالیات کو فروغ دینا تھا۔ چنانچہ اس کے صفحات سے اقبال شناسوں کا ایک گروہ تشکیل پایا۔ اس میں چھپنے والے مذکورہ مضامین کا حوالہ ہی اس کے مستند اور معیاری ہونے کی دلیل ہے۔ جن میں ''علامہ اقبال اور بوعلی قلندر'' از عباد اللہ فاروقی، ''تصوف اور اقبال'' از عبدالغنی نیازی، ''اقبال اور آرٹ'' از محمد فرمان، ''اقبال اورینٹل کالج میں'' ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ''اقبال اور حیدرآباد دکن'' از عبدلواحد، ''حیات اقبال کا ایک جزباتی دور'' از محمد عثمان، ''اقبال شعرا فارسی کی صف میں'' از ڈاکٹر سید عبداللہ، ''فکر اقبال مسئلہ اجتہاد'' از بشیر احمد ڈار، ''اقبال کا تصورفقر'' از محمد مظہر الدین صدیقی، اقبال کی شاعری میں عشق کا مفہوم از خلیفہ عبدالحکیم دیکھے جاسکتے ہیں۔

نئی تحریریں: ۲۳

یہ حلقہ ارباب ذوق کا نمائندہ معیاری ادبی جریدہ تھا جو لاہور سے ستمبر ۱۹۵۴ء میں جاری ہو کر ۱۹۵۶ء میں بند ہو گیا۔ اس میں چھپنے والی تخلیقات نے ادبی نثر میں فکروخیال کی ندرت اور تازگی پیدا کی۔ اس ضمن میں "اقبال اور انگریزی شعرا" از حمید احمد خان، "ہیئت کے تجربے اور قیوم نظر" اور "اردو میں فکری شاعری" از ریاض احمد، "ادب اور صحافت" از ریاض احمد، "بانگ درا پر ایک نظر" از خواجہ منظور حسین، "چند ملاقاتیں" از آفتاب احمد، "میرا جی کے چند خطوط" از الطاف گوہر، "سرسید کا ایک رفیق" از مختار الدین احمد، "موسیقی میں شور کی اہمیت" از مسعود پرویز، "شاعری کی تین آوازیں" از ن م راشد، "میر کے ادھورے گیت" از ڈاکٹر سید عبداللہ، "سودا کی غزل گوئی" از ڈاکٹر وحید قریشی، "غالب اور بیدل" از سید عابد علی عابد، "ہنسی کا مسئلہ" از ڈاکٹر وزیر آغا جبکہ عالمی ادب کے تراجم کے ذریعے مغربی ادب سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ لائنل ٹرلنگ کے مضمون "ادب اور فرائیڈ" کا ترجمہ امجد الطاف، پال ویلری کے مضمون "شاعری اور فکر مجرد" کا ترجمہ محمد حسن عسکری، سینٹ بیو کا مضمون کلاسیک کیا ہے؟ کا ترجمہ غلام یعقوب انور نے کیا۔ یہ صرف چند مضامین کے نام ہیں جن سے دیگر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ افسانہ نگاری میں اچھوتا انداز اختیار کرنے والوں میں آغا بابر، رحمٰن مذنب، صلاح الدین اکبر، یزدانی ملک، اعجاز حسین بٹالوی، ممتاز مفتی اور جیلانی بانو کے نام نمایاں ہیں۔

ماہِ نو:

یہ رسالہ قیام پاکستان کے بعد لاہور سے کشور ناہید کی ادارت میں جاری ہوا۔ اصناف نثر سے مزین اس رسالے نے ادبی ذوق کی آبیاری اور رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ منٹو کا افسانہ "عشقیہ کہانی" عزیز احمد کا "خدنگ جستہ" غلام عباس کا "کوندنی والا تکیہ"، اشفاق احمد کا "توتا کہانی" مسعود مفتی کا "دوزخ" غلام الثقلین نقوی کا "شیرا نمبردار" احسان ملک کا "شاہکار"، فرخندہ لودھی کا "کوپی" جیسے اچھے افسانے اس میں جگہ پاتے رہے۔ تحقیقی وتنقیدی مضامین میں پطرس بخاری کا "آج کا اردو ادیب" ڈاکٹر یوسف حسین خان کا "موج تغزل" وزیر آغا کا "سمبلزم کی تحریک" مولانا صلاح الدین احمد کا "شعروادب میں اسلامی اصطلاحیں"، وقار عظیم کا "اندر سبھا کی ادبی حیثیت" انتظار حسین کا "ناول میں کہانی کا عنصر" وغیرہ سے اس کی تنقیدی جہت کا اندازہ ہوتا ہے۔ "ماہ نو" ڈاکٹر تبسم کاشمیری، محمد علی صدیقی، ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر انوار احمد، ڈاکٹر سہیل احمد خان، رضی عابدی، ڈاکٹر سعادت سعید اور قاضی جاوید جیسے ناقدین کی تنقیدی تحریروں کا مسکن رہا ہے۔ "ماہ نو" نے انشائیہ، سفرنامہ، اور ڈراما کی اصناف میں بھی معیاری تخلیقات کو متعارف کرایا۔

یثرب:

قیام پاکستان کے بعد یہ رسالہ لاہور میں اسلامی ادب و ثقافت کے ترجمان کے طور پر ریاض خالد اور ابن انوار کی ادارت میں نمودار ہوا۔ جس نے اسلامی ادب کی تحریک کو پروان چڑھایا۔ اس کی ادبی جہت کو اجاگر کرنے میں ابو صالح اصلاحی، مسعود جاوید، شمیم جاوید، عاصی ضیائی رامپوری، جیلانی بی اے، شفقت کاظمی وغیرہ شامل تھے۔

تعمیر انسانیت:

۱۹۵۵ء میں مولانا کوثر نیازی اور عبدالمجید کی ادارت میں جاری ہونے والے اس ماہنامے کا بنیادی مقصد تحریک ادب اسلامی کا فروغ تھا۔ اس کے قلمی معاونین میں نعیم صدیقی، ماہر القادری، امین احسن اصلاحی، محمد عثمان رمز، اسرار احمد، عاصی کرنالی، لالہ صحرائی، ابن فرید، اسعد گیلانی، گوپال متل، مخمور سعیدی، عارف عبدالمتین، عرش صدیقی اور مرزا ادیب شامل تھے۔

صحیفہ:

مجلس ترقی ادب کا سہ ماہی جریدہ جون ۱۹۵۷ء میں سید عابد علی عابد کی ادارت میں جاری ہوا۔ ابتدا میں سید عابد علی عابد کی سرپرستی میں تنقید، تحقیق اور تخلیقی اصناف نثر کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۳ء میں تحقیقی رنگ غالب آنا شروع ہو گیا اور بعد ازاں ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں خالصتاً تنقیدی اور تحقیقی جریدہ بن گیا۔ اس جریدہ سے تراجم، افسانہ، ڈراما، انشائیہ، اور تخلیقی نثر کی دیگر اصناف کو فروغ ملا۔ مضامین میں اہم اور نادر علمی مباحث کو موضوع بنایا گیا۔ چنانچہ ابتدائی پرچہ میں غلام علی چودھری اور جمیل الزمان کے افسانے، چیخوف کے ترجمہ شدہ افسانے، ڈاکٹر محمد باقر کا سفرنامہ ''لاہور بنگلے سے لاہور تک'' ''لاہور سے لندن تک'' ''چھ مہینے ایران میں'' اور قیوم نظر کا سفرنامہ ''پیرس سے روم تک'' ریحانہ سلیم کا ''سفرنامہ جرمنی'' خاصے کی چیزیں تھیں۔ محمود نظامی کا بطور ڈراما نگار اور قیوم نظر کے محققانہ انداز نقد کے علاوہ دیگر ادباء ریاض احمد، شوکت تھانوی، خادم محی الدین، سجاد حیدر، امجد حسین، شہرت بخاری اور ڈاکٹر وحید قریشی کی تحریروں نے اسے اعتبار بخشا۔ صحیفہ کے اوراق کی زینت بننے والے متنوع تنقیدی و تحقیقی مضامین کی ندرت کا اندازہ لگانے کے لیے ذیل کے چند تنقیدی و تحقیقی مضامین ملاحظہ ہوں[۴۲] جن سے اردو نثر میں تنقید و تحقیق کا ذوق پروان چڑھا۔ ''گنج الاسرار'' از شرافت نوشاہی، ''اقبال اور حافظ کے ذہنی فاصلے'' از ڈاکٹر سید عبداللہ ''تاریخ ادب کا مطالعہ'' از مظفر علی سید، ''اردو میں شخصیات نگاری'' از سید صفدر حسین، ''آزاد کی حمایت میں'' از ڈاکٹر محمد صادق، ''سائنسی طرز تنقید'' از صدیق کلیم، ''اردو ادب میں مغربی تنقید'' از مظفر علی سید، ''انجمن پنجاب کے مقاصد و قواعد'' از اشفاق احمد، ''طبقات الشعرائے ہند اور مولوی کریم الدین احمد'' از ڈاکٹر

غلام حسین ذوالفقار، ''سندھ میں اردو کا پہلا شاعر'' از اعجاز الحق قدوسی، ''برج موہن کیفی'' از محمد اسماعیل پانی پتی، ''مواج نامہ قادر یار'' از جیلانی کامران، ''شبلی اور حالی کی بعض غیر مطبوعہ تحریریں'' از احمد نواز، ''علم عروض اور وزن و آہنگ کا امتیاز'' از سید جابر علی، ''دیباچہ گلزار عشق'' از جمیل جالبی، ''قیس کی اردو مثنوی ہیر رانجھا'' از بذل حق محمود، ''پنجاب میں مسلم لیگ کے انتخاب اور مسلم لیگ کی سول نافرمانی'' از اکرام علی ملک، وغیرہ شامل ہیں۔صحیفہ نے متعدد نمبر شائع کیے۔مثلاً عابد نمبر، تاج نمبر، غالب نمبر، اقبال نمبر، قائداعظم نمبر شامل ہیں۔صحیفہ بڑی خوش اسلوبی سے مجلس ترقی ادب کے خاص مقاصد کو ہنوز پایہ تکمیل تک پہنچا رہا ہے جو اردو نثر کے لیے بے حد فائدہ مند ہے۔

لیل و نہار:

۱۹۵۷ء میں جاری ہونے والے اس ہفت روزہ نے بالترتیب فیض احمد فیض، سبط حسن، ظہیر بابر، اشفاق احمد صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم کی ادارت میں تخلیقی ادب اور فکری مضامین سے ترقی پسند تحریک کی اشتراکی حقیقت پسندی اور قومی تہذیبی ادبی رجحانات کو پروان چڑھایا۔اس میں شائع ہونے والے مضامین میں ''قومی تعمیر کے تقاضے'' از غلام رسول مہر، ''ادب میں کردار کی تلاش'' از مرزا ادیب، ''جمالیاتی حسن اور جمالیاتی ذوق'' از حکیم صابر ملتانی، ''ٹیڈی ازم'' از منیر احمد شیخ، ''کچھ اپنی ثقافت کے بارے میں'' از انور رومان، ''فارسی شاعری کا نیا احساس'' از عبدالشکور احسن، اور ''سرمایہ اردو'' کے عنوان سے لسانی بحث کا آغاز بھی کیا گیا۔جبکہ دیگر اصناف، سفرنامہ، طنز ومزاح، کالم نگاری کے علاوہ اقبالیات کو بھی فروغ دیا۔بالخصوص رپورتاژ کی صنف اسی ہفت روزہ سے پروان چڑھی۔چنانچہ اے حمید کے رپورتاژ اجلے بچوں کا دن، ایک دن کی بادشاہت، پت جھڑ کی نشانیاں، بازگشت کے ماتم، روشنی کے مسافر، لاہور یاترا، موسیے کے پھول، الحمراء کی ایک شام، اسٹوڈیو کی ایک رات، مقبروں کی بستی، انقلاب کی روشنی، کے علاوہ احمد شمیم کا ''جھلسی زمین''، احمد بشیر کا ''والٹ ڈزنی کی جادو نگری''، امین اختر کا ''تفریح میں ایک حسین شام''، سید عبدالرحمٰن کا ''شکار اور سیر''، سید امجد حسین کا ''گوا میں چند روز''، شمس نعمان کا ''رواں دواں رہا قافلہ بہاروں کا''، ارشاد احمد صدیقی کا ''اپنی دھرتی اپنے پھول''، عبدالسلام خورشید کا ''یادایام'' ''ایمسٹرڈم''، قدرت اللہ شہاب کا ''ایس ایس ٹیوتریا''، ممتاز مفتی کا ''انوکھی گاڑی''، اس کے ثبوت ہیں۔نیز اس کے خاص نمبر بھی اردو نثر میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

سیارہ:

یہ ماہنامہ جنوری ۱۹۶۱ء میں جاری ہوا۔اس کی مجلس ادارت میں نعیم صدیقی، پروفیسر فروغ احمد، فضل من اللہ، طاہر شادانی اور حفیظ الرحمٰن احسن شامل رہے۔چونکہ نعیم صدیقی تحریک آزادی کے بعد ظہور پذیر ہونے والی اسلامی ادب کی تحریک سے وابستہ تھے جس کا مقصد اسلامی تعلیمات کو ادبی فن پاروں کا موضوع بنانا تھا۔اس اعتبار

سے سیارہ ایک نظریاتی ، ادبی پرچہ تھا۔ جس کا مقصد تعمیر فکر اور اصلاح معاشرہ تھا۔ چنانچہ اس نے ملک کے نامور ادبا کے ادبی مذاکرے، انٹرویو، افسانے، انشائیے، سفرنامے اور تنقیدی مضامین شائع کیے اور ساتھ ہی ادباء کو دینی خدمت کا فریضہ بھی تفویض کیا۔ اس حوالے سے مضامین کے یہ عنوانات ''سیارہ'' کی مذکورہ جہت کے عکاس ہیں۔ جن میں ''مولانا مودودی کا اسلوب'' از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ''مولانا مودودی مصنف اور مضمون نگار'' از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ''مولانا کی ادبی حیثیت'' از ابوالخیر کشفی، ''مولانا بحیثیت ایک ادیب'' از ڈاکٹر سید محمد یوسف، ''مولانا ایک عظیم انشا پرداز'' از اسلم کاشمیری، ''مولانا کی نثر نگاری'' از سلطان احمد اصلاحی وغیرہ شامل ہیں۔

''سیارہ'' کی دوسری بڑی خوبی ''اقبالیات'' کا فروغ تھا۔ جس کے ذریعے مطالعہ اقبال کے نئے گوشے سامنے لانے پر توجہ مرکوز کی گئی۔ ایسے مضامین میں ''اقبال اور جستجوئے گل'' از ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ''دنیائے اسلام میں اشتراکیت کا مسئلہ اور اقبال'' از ڈاکٹر معین الدین عقیل، ''اقبال مردمومن اور مودودی کا مرد صالح'' از مولانا اسعد گیلانی، ''اقبال کی نثر نگاری'' از ماہر القادری، ''اقبال کی تحلیل'' از نظیر صدیقی، ''مطالعہ سائنس اور اقبال'' از ڈاکٹر خیرات ابن رسا، ''اقبال اور اردو'' از ڈاکٹر وزیر آغا، ''اقبال اور علم کلام'' از حسین احمد پراچہ، ''رگ مجازی اور اقبال'' از مرزا محمد منور، ''قائداعظم اور اقبال'' از رفیع الدین ہاشمی، کے عنوانات سے ہی رسالہ کی اس خاصیت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ''سیارہ'' نے اپنی تحریروں کے ذریعے اجتماعی سوچ اور فکر وخیال کے متنوع زاویے اجاگر کیے۔ جبکہ سفرنامہ کی صنف میں اشفاق نقوی کا ''الریاض کی سیر'' ذوالفقار علی سید کا ''یاد یار مہربان'' غلام قادر کا ''سفرنامہ یورپ'' مستنصر حسین تارڑ کا ''نکلے تری تلاش میں'' وغیرہ نے مقبولیت حاصل کی۔

فنون:

۱۹۶۳ء میں احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں جاری ہونے والے اس سہ ماہی جریدے نے علم وفن کی تخلیقی جہت کو فروغ دیا۔ یہ رسالہ ترقی پسندی کا پرتو ہے۔ افسانہ، سفرنامہ، طنز ومزاح، تبصرے، خیال انگیز مضامین کے ساتھ اردو ادب کی قریباً تمام اصناف میں پاکستان وہندوستان کے نامور ادباء کا قلمی تعاون حاصل رہا۔

راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''جوگیا'' ''چلتے پھرتے چہرے'' کرشن چندر کا ''بڑا آدمی'' محمد خالد کا سفرنامہ ''کاغانی مہم'' اور عطا الحق قاسمی کا سفرنامہ ''شوق آوارگی'' محمد کاظم کا ''مغربی جرمنی میں ایک سال'' اکرام اللہ کا ''دریائے سوات'' محمد سعید اختر کا ''لوپ'' شیخ منظور الٰہی کا ''مانوس اجنبی'' تنقیدی وتحقیقی مقالات میں ''غالب کے غیر مطبوعہ خطوط'' از ڈاکٹر عبارت بریلوی، ''اردو شاعری پر ایک اور نظر'' از ڈاکٹر سید عبداللہ، ''ہمارے ادب کا نیا دور''

از ڈاکٹر وحید قریشی، ''میرا جی - دیشنومت اور دھرتی پوجا'' ازعمیق حنفی، ''تنقیحات و تصریحات'' از سید علی عباس جلال پوری، ''اقبال کا علم کلام ایک تجزیہ'' از بشیر احمد ڈار، ''اردو انشائیہ کے خدوخال'' از مشکور حسین یاد، ''سائنس اور سائیکی '' از شہزاد احمد، ''شعری تجربہ اشاریت اور معنویت'' از قاضی عبدالقادر، ''تحقیق کی واماندگیاں'' از رشید ملک، ''اردو کا پہلا افسانہ'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، ''پنجاب میں اردو - مزید تحقیق'' از محمد اکرام چغتائی، ''مکاتیب سرسید'' از قاضی فضل حق قریشی، ''ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری'' از خورشید الاسلام وغیرہ جیسی معیاری تخلیقات اس کا حصہ بنتی رہی ہیں۔

مجلّہ علمی:

جولائی ۱۹۶۴ء میں جامعہ پنجاب کے ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور سے یہ علمی و تحقیقی رسالہ جاری ہوا۔ جس کا مقصد پاکستان کے بارے میں نئے تحقیقی زاویے سامنے لانا تھا۔ اس کی مجلس ادارت میں ڈاکٹر محمد باقر، پیر حسام الدین راشدی، سید رضی واسطی اور فیاض محمود شامل تھے۔ ''فہرست مخطوطات شیرانی'' کے علاوہ ''خاندان نوشاہیہ اور شاہان وقت کے شاہی فرامین اور تاریخی تحریریں'' از قریشی احمد حسن ''محمد اعظم - مصنف تاریخ واقعات شمر'' از بلقیس بیگم ''غنیمت کنجاہی کی شاعری پر ایک نظر'' از پروفیسر غلام ربانی عزیز جیسے پر مغز علمی مقالات اس رسالہ کے ذریعے منظر عام پر لائے گئے۔

اوراق:

جون ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں جاری ہونے والے اس علمی، ادبی و ثقافتی رسالے نے مختلف افکار و تصورات کو افسانہ، خودنوشت، تنقیدی مباحث، تجزیہ نگاری، تبصرہ نگاری، انشائیہ، سفرنامہ، تراجم اور خیال انگیز مقالات کے ذریعے متعارف کرایا۔

فرخندہ لودھی کا افسانہ ''پارتی'' مشتاق قمر کا انشائیہ ''چھڑی'' اور جمیل آذر کا انشائیہ ''پکنک'' غلام الثقلین نقوی کا سفرنامہ ''ارض تمنا'' الطاف فاطمہ کا پورتاژ ''اُس کا آشوب'' جبکہ مضامین میں ''سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ'' از گوپی چند نارنگ، ''نئی تنقید کا منصب'' از ڈاکٹر جمیل جالبی، ''فیض اور ان کی شاعری''، از ڈاکٹر وزیر آغا، ''جدید اسلوبیات کا بانی'' از ریاض صدیقی، ''ایک صورت خرابی کی'' از شہزاد احمد، ''انشائیہ کیا ہے؟'' از ڈاکٹر بشیر سیفی، ''اردو سفر نامہ'' از رحمٰن مذنب، ''نئی غزل ایک مطالعہ'' از حامد کاشمیری، ''نئی فکر کے ابتدائی سوال'' از جیلانی کامران، ''ادب میں خیال کی اہمیت'' از وقار احمد رضوی، جیسے موضوعات کے ذریعے اردو نثر میں ادب کی افادیت کو کامیابی سے بیان کرنے کی روایت ہنوز جاری ہے۔

المعارف:

ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ترجمان اور علمی، ادبی و تحقیقی رسالہ کا اجراء محمد سرور جامعی کی ادارت میں ۱۹۶۸ء میں ہوا۔ جس میں اقبالیات، تاریخ و سوانح، فلسفہ و کلام اور تحقیق و ادبیات و ثقافت، کو فروغ دیا گیا۔ مثلاً ''شہنشاہ جہانگیر کا ذوق شعر و ادب'' از ڈاکٹر ظہور الدین احمد، ''خلیفہ عبدالحکیم کا اسلوب تنقید'' از ممتاز اعجاز، ''اسلام کی علمی تاریخ میں عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصانیف کا مقام'' از شبیر احمد غوری، ''رومی کی تمثیل نگاری'' از مجید یزدانی، ''جدید سوانح نگاری'' از امتیاز علی تاج، ''احسان دانش اور ان کی شاعری'' از اختر علی، ''نصیر الدین ہمایوں کا علمی ذوق'' از حفیظ پھلواری، ''مرزا غالب نقاد کی حیثیت سے'' از غلام رسول مہر، ''صوبہ سرحد کا پہلا اردو اخبار'' از فضل حق قریشی وغیرہ اس کی ادبی جہت کو اجاگر کرتے ہیں۔

تخلیق:

اس ماہنامہ کو ۱۹۶۹ء میں اظہر جاوید نے جاری کیا۔ تخلیقی نثر کے اظہار کے لئے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے اس پرچہ نے ادبی رسائل میں اپنا معیار قائم کر لیا۔ ادبی تخلیقات میں ''سفرنامہ'' اور رپورتاژ'' تراجم اور مذاکرے کی صنف کو پروان چڑھایا۔ نثری اصناف کے تنوع میں آزادی اظہار، نئی سوچ نئی فکر اور خیال کی وسعت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس ماہنامے کو اپنے عہد کے بڑے ادبا کا قلمی تعاون حاصل رہا ہے۔ جن میں فکر تونسوی، ضمیر جعفری، ضیاء ساجد، میرزا ریاض، ممتاز مفتی، سلیم آغا قزلباش، عطاالحق قاسمی اور ڈاکٹر سلیم اختر کی تحریروں نے اس کا ادبی معیار قائم کیا۔ ''کہانی نمبر'' اور ''سندھی ادب و ثقافت نمبر'' کی صورت میں خاص نمبروں کی اشاعت کی روایت میں اپنا حصہ ڈالا۔ کچھ عرصہ تک عذرا اصغر بھی اس کی ادارت کے فرائض انجام دیتی رہی ہیں۔ آج کل یہ پرچہ اظہر جاوید ہی کی زیرادارت کامیابی سے اپنا سفر جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔

لفظ:

یہ رسالہ اورینٹل کالج لاہور جامعہ پنجاب کے زیر اہتمام ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر سہیل احمد خان کی نگرانی اور مرزا حامد بیگ کی ادارت میں جاری ہوا۔ جو نئے ادبی رجحانات کو پروان چڑھانے والا خالص ادبی پرچہ تھا۔

مجلہ تحقیق:

جامعہ پنجاب کے زیر اہتمام یہ مجلّہ ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں جاری کیا گیا۔ جس کا مقصد جامعہ پنجاب کے اساتذہ کے تحقیقی مقالات کی اشاعت کرنا تھا۔ اس مجلّہ کے علمی معیار کا اندازہ ان مقالات

سے بخوبی ہوتا ہے۔ ''شاہ قدرت اللہ قدرت'' از مشفق خواجہ، ''منصور حلاج رومی کی نظر میں'' از ڈاکٹر نسرین اختر، ''کلام محمود کے نادر لغات و اصلاحات'' از ڈاکٹر بشیر حسین، ''مکاتیب اقبال پر ایک تنقیدی نظر'' از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ''شیدا فتح پوری'' از سید محمد اکرم، ''خط بہار'' از ڈاکٹر وحید قریشی، ''سراج الاخبار'' از فضل حق قریشی، ''جنگ نامہ احمد شاہ درانی'' از محمد اقبال مجددی، ''الخصائص الصغریٰ کا مقدمہ اور متن'' از ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ''فارسی قونیات'' از ڈاکٹر عبدالشکور احسن وغیرہ چند ایک حوالے ہیں۔

محراب:

یہ رسالہ ۱۹۷۸ء میں ڈاکٹر سہیل احمد خان اور احمد مشتاق نے کتابی صورت میں جاری کیا۔ جس کا بنیادی مقصد ''حلقہ ارباب ذوق'' کے تحت حسن عسکری کے بنیادی نقطہ نظر کی از سر نو ترویج و اشاعت تھا۔ چنانچہ افسانے میں فرانسیسی ادبا کے اسلوب میں ہیئت و اظہار کے تجربات کو فروغ دینے کے ساتھ تجزیاتی انداز اختیار کیا گیا۔ نیز تراجم بھی اس کی امتیازی خصوصیت تھے۔ اس کے مستقل لکھنے والوں میں انتظار حسین، سلیم الرحمٰن، منیر نیازی، صلاح الدین عادل، صلاح الدین محمود، جیلانی کامران، شمیم حنفی، سلیم احمد، مظفر علی سید، منیر نیازی، منیر الدین احمد، فاروق حسن، اعجاز احمد، محمد اسحاق میر اور زاہد ڈار وغیرہ شامل تھے۔

معاصر:

۱۹۷۹ء میں حبیب اللہ خان نے یہ رسالہ جاری کیا۔ جس نے پاکستانی ادب کے نقطہ نظر کو سنجیدگی سے فروغ دیا اور ہر نوع کے ادیب کو پاکستان، اسلام اور اقبالیات کے موضوع پر لکھنے کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ سلیم احمد اور فتح محمد ملک کے مابین مکالماتی محاربہ ''اقبال اور سرزمین پاکستان''، ''اسلامی ادب کے تنقیدی لوازم'' از پروفیسر فروغ احمد ''سرسید کا خواب'' از ڈاکٹر صفدر محمود، ''مذہب کا تصور'' از احسان دانش، ''سورۂ ابراہیم'' از مولانا ابوالخیر مودودی، ''تفسیر قرآن اور فلسفہ جدید'' از محمد حسن عسکری، کے علاوہ ادبی موضوعات پر ''ادب اور مسئلہ خیر وشر'' از ڈاکٹر رؤف انجم، ''محمد حسن عسکری کا تصور روایت'' از سلیم احمد، ''یہ رنگ اک خواب کے لیے'' از سراج منیر، ''فتوحات مکیہ'' از اکرام چغتائی، ''جدید افسانہ اور عصری صداقتیں'' از شہزاد منظر، اور ''ژاں پال سارتر'' از وحید عشرت وغیرہ سے اس کی ادبی جہت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اردو نامہ:

''مجلس زبان دفتری'' کی سرکردگی اور سرگرمی کا ایک نمونہ ماہنامہ جریدہ ''اردو نامہ''[۲۵] ہے جو مارچ ۱۹۸۱ء میں جاری ہوا۔ جس میں مجلس کے منظور کردہ قوانین، قواعد و ضوابط، مختلف محکموں کے فارموں اور اصطلاحات کے

تراجم، دساتیر العمل، ضلعی مجالس کی کار روائیوں کے علاوہ دفتری اور انتظامی اردو نثر کے فروغ و ارتقا میں معاون مضامین اوردیگر تحریریں (خط و کتابت، سرکاری مراسلہ جات کے نمونے) شائع کی جاتیں ہیں۔شعیب بن عزیز اور عطش درانی اس کے ادارت کرتے رہے ہیں۔اب قواعد کے ساتھ زبان وادب سے متعلق علمی مضامین بھی اس کا حصہ بنتے جا رہے ہیں۔ یہ جریدہ اردو کو قومی و دفتری زبان بنانے اوراس کی ترقی،ترویج و نفاذ کے لیے کوشاں ہے۔ ''مجلس زبان دفتری'' پنجاب کا یہ ترجمان مجلّہ آج کل کاشر عدیل کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔

تحقیق نامہ:

یہ شعبہ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کا تحقیقی مجلّہ ہے جو۹۲-۱۹۹۱ء میں صدر شعبہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی ادارت میں جاری ہوا۔۲۶؎ اس تحقیقی مجلّے نے نہ صرف علمی تحقیق کی روایت کو مزید مستحکم کیا بلکہ جدید معیاری تحقیقی وتنقیدی مباحث کو بھی فروغ دیا۔ چنانچہ اس کے پہلے ہی شمارے میں مقالات اور نادرات کے تحت چودھری محمد حسین اور علامہ اقبال روابط اور مکاتیب از ثاقف نفیس،''انجمن پنجاب کے مشاعرے:ایک تعارف'' از عارف محمود، ''خواجہ منظور حسین: کچھ یادیں اور یادگاریں'' از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن،''یلدرم کی ایک نایاب نگارش'' از ڈاکٹر یونس حسنی،''روش صدیقی کی چند قلمی یادگاریں'' از پروفیسر سعید ارشد حسام لاہوری: ایک قدیم غزل گو از عبدالعزیز ساحر کے مضامین کے عنوانات سے اس کی تحقیقی جہت وجستجو کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تحقیق نامہ کے مندرجات میں ''مقالات و نادرات'' کے علاوہ اقبالیات، غالبیات،شخصیات ، جہان سرسید، اور تبصرے بھی شامل رہے ہیں۔ جو اس کی تنقیدی جہت کے غماز ہیں۔ معاصرین کے مکاتیب بنام محمد طفیل خصوصی شمارہ ۲۰۰۵-۲۰۰۶ء انٹرنیشنل کانفرنس ۲۰۰۶ء منعقدہ جی سی یو میں ادب آرٹ اور فرد افروزی، ادب کلچر اور عالمگیر یت، اور ادب کلچر اور روشن خیالی، پر منتخب مقالات کا شمارہ ۲۰۰۷ء بھی خاصے کی چیزیں ہیں۔ شمارہ ۳-۴ ۹۵-۱۹۹۴ء اور شمارہ ۶-۷، ۹۸-۱۹۹۷ء غالبیات کے موضوع سے مختص ہیں۔ بعد ازاں خاکہ، انشائیہ اور یادنگاری کو بھی اس میں جگہ دی گئی۔

مذکورہ علمی ادبی و تحقیقی،اخبارات و رسائل خواہ وہ کسی مخصوص نظریے کی ترویج و اشاعت کرتے رہے یا مختلف افکارونظریات کے حامل ادباء کے ذہنی ارتقا کی آبیاری کا فریضہ انجام دیتے رہے ہوں درحقیقت یہ اردو نثر کو فکرونظر کے نت نئے سرچشموں سے سیراب کر رہے تھے۔جن کا بنیادی مقصد زبان و ادب کا فروغ،علمی و ادبی مذاق کی تشکیل نو اور مسائل کو تنقیدی انداز میں دیکھنے کا رجحان مرتب کرنا تھا۔ انہی رسائل نے ادباء کی مختلف ادبی

جہتوں کو نہ صرف دریافت کیا بلکہ انہیں شناخت بھی دی۔ مثلاً ''صحیفہ'' میں قیوم نظر کو محقق اور ''اسلوب'' نے صابر لودھی کو ڈراما نگار (ارجن کا درخت) کے طور پر بھی متعارف کرایا۔ پھر اخبارات و رسائل میں ایسے پرچے بھی تھے جو خالصتاً ادبی نہیں تھے لیکن چونکہ انہیں ادیب نکالتے یا پھر ان کی ادارت پر مامور ہوتے تھے اس لیے ان پرچوں کے مزاج میں ادبیت کا عنصر بھی شامل رہتا تھا کیونکہ وہ ایک ادیب کی حیثیت سے ملکی اور عالمی مسائل پر نگاہ رکھتے تھے۔ اس سے تعمیری صحافت اور تعمیری ادب ایک ساتھ وجود میں آئے جس سے اردو نثر میں فکر و خیال کو نئی تحریک ملتی رہی۔ لہٰذا تخلیقی، تنقیدی و تحقیقی نثر کی تمام اصناف (افسانہ، ناول، ڈراما، مضمون، تنقید، تراجم، تحقیق، سفرنامہ، رپورتاژ، آپ بیتی، تاریخ نگاری، کالم نگاری، مزاح نگاری، خطوط نگاری) ان اخبارات و رسائل کی شکر گذار ہیں جنھوں نے ان کی ترویج و اشاعت میں کلیدی کردار ادا کیا۔ تمام اصناف نثر اپنی موضوعاتی اور اسلوبیاتی نیرنگی اور فنی تنوع کے ساتھ اول اول رسائل ہی کے صفحات پر اپنی آبیاری کرتی اور نشوونما پاتی رہی ہیں۔ نیز اخبارات و رسائل نے کہنہ مشق ادیبوں کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کے لیے بھی کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ اس طرح یہ اخبارات و رسائل ادبی تربیت کا گہوارہ اور مستقبل کے نامور ادباء کا اولین تعارف بھی بنے۔ نتیجتاً علم و ادب کی شمع کو انہی اخبارات و رسائل نے فروزاں رکھا ہوا ہے اور لاہور کو ایک ایسا شہر بنا دیا ہے جہاں سب سے زیادہ اخبارات و رسائل نکلتے ہیں کہ اس خوبی میں دوسرا کوئی اس کا حریف نہیں۔

(ب) علمی و ادبی انجمنیں، مجالس اور ادارے:

حسب سابق لاہور کی ادبی و تہذیبی زندگی کو بیسویں صدی میں قائم ہونے والی علمی و ادبی انجمنوں اور مجالس نے متنوع موضوعات ادبی، لسانی، تاریخی، سیاسی، تنقیدی اور ان کے اسالیب بیان پر غور و فکر کا موقعہ فراہم کیا۔ یہ وہ پلیٹ فارم تھے جو علمی و ادبی تربیت کی آماجگاہ تھے۔ جہاں دنیا بھر کے موضوعات پر تبادلہ خیال کرنے کے ساتھ جدید افکار و نظریات پر بحث و مباحثہ نے اردو نثر میں نئے نئے علوم و فنون اور اصناف نثر کے لیے نئے دریچے وا کیے۔ اس اعتبار سے علمی و ادبی انجمنوں اور گروہوں کے تنوع نے اردو نثر کو نئے ذائقوں کے ساتھ متحرک اور جاندار بنایا۔ بعض ادبی مجالس زیادہ شعری روایت کو زندہ رکھنے اور مشاعروں کے انعقاد کی غرض سے وجود میں آئیں۔ اس ضمن میں ''بھارت سبھا'' (۱۹۰۶ء) ''بزم سخن'' (۱۹۰۸ء) ''بزم اردو'' (۱۹۱۶ء) اور ''بزم احباب'' (۱۹۱۷ء) وغیرہ نے شہرت پائی۔

انجمن ارباب علم پنجاب:

۱۹۱۸ء کے اواخر میں مولانا تاجور نجیب آبادی (جو رسالہ ''مخزن'' کی ایڈیٹری سے عملی زندگی کا آغاز کر چکے تھے) کی کاوشوں کا نتیجہ تھی۔ جس سے نہ صرف مشاعروں کی روایت کو تقویت ملی بلکہ اس کے دستور العمل میں

پنجاب میں رائج اردو کورس کی اصلاح کرنا، زبان کو سوقیانہ الفاظ سے پاک کرنا، علمی، ادبی، تاریخی، لسانی نقد ونظر کے مباحث پر مبنی لیکچروں کا اہتمام کرنا اور دیگر زبانوں مثلاً عربی، سنسکرت، انگریزی اور فرنچ وغیرہ سے علمی و ادبی مضامین کے مفید تراجم کرانا بھی شامل تھا۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے انجمن نے ''دائرہ علمیہ'' کو تشکیل دیا۔ نیز ہر ماہ منعقد ہونے والے علمی مشاعرے میں معلومات افزاء مفید تاریخی مضامین پڑھنے کا سلسلہ جاری کیا اور انجمن پنجاب کی طرز کی تنقیدی روایت ڈالی جسے ''مجلسی تنقید'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس انجمن کے کارپردازان نے اردو نثر کی زبان کو پسندیدہ اور مقبول بنانے کی کامیاب کوشش کی۔ مختلف ادبی نشستوں میں تاجور نجیب آبادی نے ''بلینک ورس کی ضرورت کیا ہے؟''، ''اردو زبان کی تاریخ'' اور برجموہن دتاتریہ کیفی نے لسانیات کے موضوع ''پنجاب میں اردو'' پر لیکچر دیئے۔ اس انجمن کی رونق بڑھانے والوں میں بالا امتیاز ہر مذہب وقوم کے ادباء شامل تھے جن میں حفیظ جالندھری، خلیفہ عبدالحکیم، میاں بشیر احمد، پنڈت میلا رام وفا، منشی مہاراج بہادر، پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی، مولانا ظفر علی خان، منشی محبوب عالم، مولانا ظفر علی خان، لالہ رام برچھاں، برجموہن دتاتریہ کیفی، مولانا سید جلال الدین حیدر، سراج الدین آرزو، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، کرپال سنگھ، جگن ناتھ آزاد، گوپال متل، پورن سنگھ اور اودھے سنگھ وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

حلقہ نیازمندان لاہور:

انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ایک ایسا ادبی گروہ جلوہ گر ہوا جو چوتھی دہائی تک ادبی منظر نامے پر چھایا رہا۔ یہ ادبی گروہ جدید علوم وفنون کی تحصیل کی بناء پر اپنے عہد کی توانا طرز فکر کا منطقی نتیجہ تھا۔ جو ''حلقہ نیاز مندان لاہور'' ۲۸ کہلایا۔ جدید تعلیم سے آراستہ اور بین الاقوامی سیاسی و معاشی تحریکوں کے ادراک کے حامل ان احباب میں ایم۔ڈی تاثیر، پطرس بخاری، مجید ملک، عبدالرحمٰن چغتائی، عبدالمجید سالک، حفیظ جالندھری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، چراغ حسن حسرت، ہری چند اختر اور امتیاز علی تاج وغیرہ شامل تھے۔ جنہوں نے مستقبل کے ادباء کے فکر ونظر کی جدید خطوط پر تربیت کی۔ ان تربیت پانے والوں میں حکیم احمد شجاع، غلام عباس، ن۔م راشد، فیض احمد فیض وغیرہ کے نام ہی اس حلقہ کی ساکھ کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں۔ شعروادب سے لگاؤ کی وجہ سے حلقہ نیازمندان لاہور اپنے عہد کے نامور ادباء کا گروہ تھا۔ اس گروہ کے دو ارکان نے نئی نسل کی ادبی، ذہنی وفکری تربیت میں براہ راست حصہ لیا۔ پہلے پطرس بخاری جو گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی کے پروفیسر تھے اور طلبہ کے لیے ادبی انجمن ''مجلس'' ۲۹ کے سربراہ تھے۔ دوسرے ایم۔ڈی تاثیر جو گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور میں انگریزی کے استاد اور طلباء کی ادبی بزم ''بزم فروغ اردو'' ۳۰ کے روح رواں تھے۔ دونوں احباب اپنی قابلیت اور انگریزی و

اردو تحریر و تقریر کے سبب اپنے اپنے تعلیمی اداروں میں ثقافتی اور علمی و ادبی شہرت کے مرکزی کردار تھے۔ جنہوں نے اپنے اداروں کی مذکورہ ادبی مجالس میں طلباء اور مستقبل کے ادباء کو انگریزی ادب کی تفہیم و تشریح اور اردو ادب میں انگریزی اصولوں کے اطلاق کی تربیت دی۔ انہی اہل علم احباب کی کاوشوں کا ثمر تھا کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے قابل طلباء و ادیب ن ۔م راشد، فیض احمد فیض، حفیظ ہوشیارپوری، آغا حمید، سید رشید احمد، شیخ عمر فاروق، شیر محمد حمید، جبکہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے محمود نظامی، جیلانی کامران، حفیظ جاوید، خضر تمیمی، عبدالبشیر آذری، مرزا ادیب اور ناصر کاظمی میں مجلسی رابطوں سے اردو کے ساتھ انگریزی ادبیات کا توانا ادبی ذوق وشوق پروان چڑھا جو مشترکہ نشستوں کا نتیجہ بھی تھا کیونکہ بقول فیض احمد فیض ''الگ الگ جلسوں کے علاوہ مشترکہ جلسے بھی ہوا کرتے تھے''۔۳۱ ان جلسوں میں حلقہ نیازمندان لاہور اور دیگر احباب کی شرکت سے نئی نسل نے براہ راست جدید افکار و خیالات سے استفادہ کیا۔

پطرس بخاری کی انجمن ''مجلس'' نے نئے لکھنے والوں میں تنقیدی ادب کو جانچنے اور پرکھنے کے ساتھ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بھی جلا دی۔ اکثر جلسوں میں پطرس بخاری کے ساتھ ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، امتیاز علی تاج، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، حامد علی خان اور حکیم یوسف حسن خان شریک محفل ہو کر علمی و ادبی مقالات، طبعزاد افسانوں اور تراجم پر ہونے والے مباحث کا وقار اور رتبہ بڑھاتے۔ بعدازاں ''مجلس'' میں پڑھے جانے والے مضامین کو ''مجلس'' ہی کے عنوان کے تحت دارالاشاعت پنجاب سے شائع کرا دیا گیا۔ علاوہ ازیں پطرس بخاری، امتیاز علی تاج اور صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ''سوندھی ٹرانسلیشن سوسائٹی'' کی بنیاد رکھی۔ جہاں اعلیٰ پائے کے ادبی تراجم کرائے جاتے۔ ان تراجم نے اردو نثر کا دامن جدید خیالات سے آراستہ کیا اور بقول ڈاکٹر گوہر نوشاہی ''تاثیر، بخاری، مجید ملک، صوفی تبسم، عبداللہ چغتائی، فضل حسین، شیخ قمر الدین، اور عبدالمجید سالک وغیرہ نے ترجمے میں بڑی اعلیٰ درجے کی چیزیں اردو و ادب کو دیں۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اس دور کے ان تراجم کے بڑے مداح ہیں جو بخاری اور عبدالمجید سالک نے کیے۔ صوفی صاحب کا کہنا ہے کہ اس دور میں سب سے زیادہ ترجمے بائرن اور ٹیگور کے ہوئے۔''۳۲ پطرس بخاری نے نہ صرف ادب و فلسفہ، طنز و مزاح اور فنون لطیفہ پر مضامین لکھے بلکہ امتیاز علی تاج کے ساتھ مل کر کئی انگریزی ڈراموں کے اردو تراجم کیے نیز ''برٹرنڈ رسل، ہیڈرک فان لون اور ایف ایل برمن کی تین ضخیم انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کیا۔''۳۳

حلقہ نیازمندان لاہور کی ادبی کاوشوں کی جولاں گاہ اس عہد کے ادبی رسائل ''مخزن'' بالخصوص ''نیرنگ خیال'' اور ''کارواں'' بنے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اردو نثر میں جدید علوم و فنون سے آگاہی، روشن خیالی اور ترقی

پسندانہ نصب العین اپنانے کی روایت کو فروغ ملا۔ پطرس بخاری کے مزاحیہ مضامین اور دیگر تحریریں پہلے پہل ''نیرنگ خیال'' ہی میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر کے مضمون ''شاد حسین طالب'' کو پذیرائی ملی۔ امتیاز علی تاج نے ڈراما ''انارکلی'' تحریر کیا۔ نئے تنقیدی خیالات اور زبان و بیان میں روزمرہ اور محاورہ کی رو سے دہلی اور لکھنؤ کے کچھ رسائل میں ''نیازمندان لاہور'' پر تنقید کی گئی۔ جس کی جوابی کارروائی کے نتیجہ میں اردو نثر میں تخلیقی و تنقیدی مضامین کو فروغ ملا۔ اس قلمی جنگ میں ''انقلاب'' اردو رسائل کی تاریخ کا پہلا سالنامہ ''کارواں'' (۱۹۳۳ء) لاہور شامل ہوا۔ جس کا اجراء مجید ملک اور ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر نے کیا۔ بہترین سوچ کے حامل ''کارواں'' نے طویل سنجیدہ تنقیدی، ادبی مقالات، عالمی ادب سے انتخاب، دیگر زبانوں (عربی، فارسی، انگریزی، فرانسیسی) کے کلاسیکی ادب پاروں کے تراجم کے ذریعے دیگر علوم وفنون سے آگاہی کے علاوہ آرٹ اور فنون لطیفہ پر تنقیدی مضامین نے اس عہد کے نئے اور معیاری ادب کی نہ صرف نمائندگی کی بلکہ فروغ ادب وفن کے جدید تقاضوں کو بھی اجاگر کیا۔ ۱۹۳۳ء کے آخر میں ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر کے لندن چلے جانے کے بعد مجید ملک ''کارواں'' کا ایک اور سالنامہ (۱۹۳۴ء) نکال سکے جو اپنے سابقہ معیار کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔ یوں اس کے بس دو ہی شمارے منظر عام پر آ سکے۔ ''کارواں'' کے پہلے شمارے کی فہرست پر نگاہ ڈالیں تو حلقہ نیازمندان لاہور میں سے سب سے زیادہ تحریریں پروفیسر ایم۔ڈی تاثیر کی ہیں جن میں ''سخہائے گفتنی''، ''محبت کا گیت''، ''تصاویر''، ''فنون لطیفہ کے آٹھ الواح''، ''قوس قزح''، ''تنہائی''، ''لیکچرار بیوی'' ''رقص حیات'' شامل ہیں جبکہ ''یورپ کی جدید مطبوعات'' پر ایم ڈی تاثیر اور دیگر احباب نے لکھا۔

مجید ملک کی تحریروں میں ''میں'' اور ''انکار'' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی ''آسمانی سوار''، ''قند پارسی''، ''عربوں کا علم موسیقی اور اس کا اثر یورپ پر''، عبدالمجید سالک کی ''زہرہ کے بندے'' اور حضرت سالک کا خط، حفیظ جالندھری کی تین نغمے، دعای صحرا، عبدالرحمٰن چغتائی نے ''عورت'' ''مرقع'' اور ''ساغر'' لکھا۔ سید امتیاز علی تاج کا ڈراما ''چکیلی صبح'' محمود نظامی کی ''مخاصمت'' اور غلام عباس کے افسانے ''دیوتاؤں کا رقص'' ''ہرنی'' ''مجسمہ'' اور ''ارتھی'' شائع ہوئے۔ جبکہ شمارہ ۱۹۳۴ء میں مجید ملک نے اس کا دیباچہ ''سخن ہائے گفتنی'' کے علاوہ ''آپ بیتیاں'' (افسانہ) ''پرانے دوست'' (ڈراما) ''گورکھ دھندا'' (ڈراما) مدوجزر (ادب لطیف) لکھا۔ پطرس بخاری نے ''سیب کا درخت'' (ترجمہ) ''لاہور کا جغرافیہ'' (مزاحیہ مضمون) امتیاز علی تاج نے ''اردو ڈراما کی مفاہمتیں'' (مضمون) ''عالم دوبارہ نیست'' (افسانہ) ''برفباری کی ایک رات'' (ڈراما) ''ہسپتال'' (انشائے لطیف) عبدالمجید سالک نے ''محبوبہ سے درخواست'' (انشائے لطیف)، غلام عباس کے ''محبت کے گیت'' (افسانہ) کے

علاوہ ''حلقہ نیازمندان لاہور'' کے قلمی نام سے تحریر کردہ ''یو پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں'' خاص توجہ کا مضمون ہے۔ رسالہ ''کارواں'' صحیح معنوں میں اپنے ادبی نعرہ جو کہ اس کے سرورق پر یوں درج ہے۔''مشرق ومغرب کے علوم وفنون کا معیاری رسالہ''۴۳ کا بہترین نقیب تھا۔ اس اعلیٰ معیاری رسالے کو اپنے عہد کے نامور ادباء علامہ اقبال، مولوی عبدالحق، حافظ محمود شیرانی، اکبرالہ آبادی، رشید احمد صدیقی، سید سلیمان ندوی، عبدالرحمٰن بجنوری، عبدالقادر سروری، محمد الدین قادری زور، غلام رسول مہر، حجاب اسماعیل اور عبداللہ چغتائی وغیرہ کا قلمی تعاون حاصل تھا۔ ''حلقہ نیازمندان لاہور'' کی مذکورہ بالا تحریروں پر یو-پی کے اہل قلم نے زبان و بیان کے حوالے سے اعتراضات کیے تو جواباً ''یو-پی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں'' (کارواں ۱۹۳۴ء) ''انارکلی'' مخلص صاحب اور ہم نیاز مند، اور ''غنچۂ تبسم کے دیباچوں پر ایک نظر'' نیرنگ خیال میں چھپے۔ اس قلمی و لسانی جنگ کا دوسرا محاذ ایس-پی-ایس کے ہال (نزد لاہوری دروازہ) کے مشاعرے تھے جہاں تاجور نجیب آبادی کا حلقہ اردو زبان و ادب میں قدیم روایت کا علمبردار تھا۔ اس حلقہ کے نمائندے وقار انبالوی، فاخر ہریانوی، روشن صدیقی، سائل دہلوی، بے خود دہلوی، جگر مرادآبادی، اصغر گونڈوی، اختر شیرانی اور احسان دانش وغیرہ شامل تھے۔ جبکہ حلقہ جدید کی صورت میں حلقہ نیازمندان لاہور نے انجمن اردو کی بناء رکھی۔ جو انگریزی اثرات سے اخذ وقبول کرتے ہوئے زبان وادب میں نئی راہوں کے متلاشی تھا۔ چنانچہ پطرس بخاری، ایم ڈی تاثیر، اور مجید ملک نے اردو نثر کو نہ صرف جدید انگریزی خیالات سے روشناس کرایا بلکہ انگریزی شعرا اور انشاء پردازوں کو اردو کے پیرائے میں ڈھال کر زبان وادب کو وسعت سے بھی ہمکنار کیا۔ یوں مذکورہ دونوں گروہوں کے ادبی معرکے جاری رہے۔ اگرچہ یہ معرکے ایک حد تک مناقشانہ تھے لیکن ان سے اردو نثر میں موضوعات، زبان اور اسلوب بیان میں تازگی کا عنصر شامل ہوا۔ الغرض حلقہ نیازمندان لاہور نے اردو زبان وادب میں نثر کے تحفظ وفروغ اور جدید خیالات ونظریات سے مالا مال کر کے موضوع و اسلوب ہر دو حوالوں سے عملی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ لہٰذا غلام رسول ازہر کا نیازمندان لاہور کی بابت یہ کہنا بالکل درست ہے کہ:

> ''نیازمندان لاہور بے لاگ اور بے پھڑک نقاد تھے کیونکہ اردو زبان وادبیات کے علاوہ انگریزی زبان کے بھی مستند عالم تھے اور صنف ادب کے کسی باب میں بھی بند نہ تھے۔ جونہی کہیں جھول دیکھتے فی الفور اسی کی گرفت کرتے اور دلائل کے ساتھ اپنا نقطہ نظر پیش کرتے۔ اس اعتبار سے نیازمندان لاہور کی اصلاحی بغاوت کی علمی و ادبی کاوشیں ہندوستان گیر اثرات کی حامل تھیں اور ان کے پیش نظر ادب کی صحیح معنی میں خدمت تھی۔ لہٰذا دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ اور حیدرآباد دکن تک کے مکاتب علم وفن ان کے نقد ونظر کا نشانہ بنے۔ فی الحقیقت مشرق ومغرب کے علم و ادب پر

محیط یہ ایک ایسا منفرد علمی و تہذیبی طائفہ تھا جو علمی مباحث اور براہین و دلائل کی تہذیبی رہنمائی میں ہرطرح کی رجعت پسندی اور جمود کے خلاف صف آراء ہونے پر ہمہ وقت مستعد رہتا تھا اور تازہ خیالات سے ادب کی آبیاری کرنے پر مُصر تھا۔''۵۹؎

پنجاب لٹریری لیگ:

''حلقہ نیازمندان لاہور'' اور ''انجمن ارباب علم پنجاب'' ہی کے زمانہ میں اس ادبی سوسائٹی کی بنیاد پڑی۔ جس میں اس عہد کے علمی و ادبی مشاہیر، علامہ اقبال، سرذوالفقار علی، حفیظ جالندھری، میاں بشیر احمد، راجہ نرنیدر ناتھ، عبدالمجید مسالک، پطرس بخاری اور صوفی غلام مصطفی تبسم وغیرہ شرکت کیا کرتے۔

بزم ہزار داستان:

بیسویں صدی کی تیسری دہائی کی ابتدا میں حکیم احمد شجاع نے اس بزم کو سجانے کا اہتمام کیا اور میر صولت، بیدل شاہ جہاں پوری، عبدالمجید سالک، پنڈت سدرشن، امتیاز علی تاج، پطرس بخاری، سید عابد علی عابد اور اختر شیرانی نے اس کی رونق بڑھائی۔ نیز حکیم احمد شجاع نے ۱۹۲۲ء میں ''رسالہ ہزار داستان'' کا اجراء اس بزم کے ترجمان کے طور پر کیا۔

بزم لطائف:

عبداللہ بٹ نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے آغاز میں اس بزم کی تشکیل دی۔ جس نے اردو نثر میں لطیفہ کے فن کو پروان چڑھایا۔ اس میں شرکت کرنے والوں میں عبدالمجید سالک، خواجہ دل محمد، ظہیر کاشمیری، حمید نسیم، مسعود پرویز، ہری چند اختر، عبدالجلیل عشرت اور محمد فاضل وغیرہ شامل تھے لیکن یہ بزم جلد ہی برہم ہو گئی۔

انجمن اردو پنجاب:

۱۹۳۶ء میں قائم ہونے والی اس انجمن کا مقصد ریڈیو پر اردو میں مختلف موضوعات پر مضامین اور تقاریر کا اہتمام کرانا تھا۔۶۰؎ اس انجمن سے تاجور نجیب آبادی، امتیاز علی تاج اور حفیظ ہوشیارپوری جیسے ادبا وابستہ تھے۔

انجمنوں کے قیام کے شانہ بشانہ نت نئے افکار و خیالات پر تبادلہ کے لیے ادبی محفلیں ہوٹلوں اور چائے خانوں کی زینت بنیں۔ جنھوں نے اردو نثر میں فکروخیال کی تازگی اور جدید نظریات کی ترسیل کا کام جاری رکھا۔ ان میں ''عرب ہوٹل'' سرفہرست ہے۔ جو چراغ حسن حسرت، اختر شیرانی، ن۔م راشد، فضل کریم خان درانی، حفیظ ہوشیار پوری، خواجہ دل محمد، سید عابد علی عابد، حفیظ جالندھری، ایم ڈی تاثیر، مظفر حسین شمیم، کرشن چندر، باری علیگ، عبدالمجید سالک، راجہ حسن اختر، حکیم محمد حسن قریشی، مولانا صلاح الدین احمد، عبدالمجید بھٹی، پروفیسر علیم الدین

سالک، ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر فیاض محمود جیسے اہل قلم کی نشست گاہ بنا رہا۔ اسی ہوٹل میں حلقہ نیازمندان لاہور کے ارباب علم و ادب باجماعت اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اس کے بعد دوسرا بڑا اہم ادبی مرکز ''نگینہ بیکری'' تھا جہاں تاجور نجیب آبادی، دیوان چند شرما، ڈاکٹر عنایت اللہ، صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر صابر علی، پروفیسر علیم الدین سالک، آغا بیدار بخت، شورش کاشمیری، عاشق حسین بٹالوی، باری علیگ، عبداللہ قریشی اور گوپال متل جیسے ادباء نے ادبی فضا سازگار بنائے رکھی۔ اس کے بعد ادیبوں کے حلقہ کا مقبول اور سب سے بڑا پڑاؤ ''پاک ٹی ہاؤس'' بنا۔ جہاں صبح سے شام تک ادبی محفلیں سجی رہتیں۔ جس میں اس عہد کے تقریباً سبھی ادباء اور شعرا شریک رہتے۔ اشفاق احمد، ناصر کاظمی، منیر نیازی، احمد مشتاق، شہرت بخاری، انتظار حسین، یوسف جمال انصاری، اعجاز بٹالوی، شیر محمد اختر، ریاض احمد، اے حمید، سجاد باقر رضوی، شہزاد احمد، ڈاکٹر سہیل احمد خان، انجم رومانی، قیوم نظر، کنہیا لال کپور، عارف عبدالمتین، شاد امرتسری، دیوندر ستیارتھی، سید عابد علی، باری علیگ، علیم الدین سالک، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا صلاح الدین، ڈاکٹر وزیر آغا، میاں بشیر احمد، شہرت بخاری، حامد علی خان، احسان دانش، عمر فیضی، مشکور حسین یاد، محمد خلیل الرحمٰن، افتخار جالب، جیلانی کامران، ڈاکٹر سعادت سعید، شہزاد احمد اور انیس ناگی وغیرہ کے دم قدم سے پاک ٹی ہاؤس میں اردو شعری ادبی محفلوں کی رونقیں دوچند رہیں۔ پاک ٹی ہاؤس کے علاوہ ''کافی ہاؤس'' ''چینی لنچ ہوم'' ''ممتاز ہوٹل'' ''لاہور ہوٹل'' ''لارڈز ریستوران'' ''پراکٹس ٹی ہاؤس'' ''لورینگر'' وغیرہ بھی ایسے مقامات تھے جہاں وقتاً فوقتاً ادباء کی بیٹھک جمتی رہتی۔ اردو نثر کے ارتقا میں موضوعات اور خیالات کی تازہ کاری کی ایک رو کو قائم رکھنے میں مذکورہ بیٹھکوں نے بھی معاونت کی۔

ان علمی و ادبی انجمنوں میں ہونے والے تنقیدی مباحث نے خیالات اور نظریات کے حوالے سے اردو نثر کو جدید افکار سے روشناس کرایا۔ یہ جدید افکار تخلیقی و تنقیدی نثر بن کر رسائل کی زینت بنتے رہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اردو نثر کو ملنے والے جدید موضوعات اور اسلوب بیان کا تنوع انہی انجمنوں اور مجلسوں کا مرہون منت ہے۔ ہر تحریک اور رجحان کو انہی کی ادبی نشستوں میں توانائی ملی۔ ان علمی ادبی انجمنوں اور محفلوں میں آنے والے ارباب علم و ادب اور اخبارات کے مدیر افسانہ، ناول، ڈراما، سفرنامہ، تاریخ، تحقیق، تنقید، خود نوشت سوانح، مضمون، انشائیہ، تراجم، کالم اور خاکہ نگاری کے میدان میں اپنی جولانیاں دکھا رہے تھے۔ سیاسی، علمی، ادبی، معاشرتی اور معاشی موضوعات پر باہمی تبادلہ خیال، کے ان ادبی تہذیبی اور ثقافتی مراکز نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بدلتے ہوئے تناظر میں ادبی نثر میں تخلیق و تنقید کے اعلیٰ معیار قائم کرنے میں معاونت کی۔ مختلف ادبی تحاریک سے منسلک ادباء انہی مجالس میں باہم اکٹھے ہوتے جہاں باہم گفتگو کا مستقل موضوع علم و ادب ہوتا جس سے نظریات

کے اخذ و استخراج کی اصلاح کا عمل جاری و ساری رہا اور اردو نثر جدید خطوط پر استوار ہوئی۔ مختلف نظریات و خیالات (ترقی پسند، تہذیبی نظریات ، ادب برائے ادب، اسلامی ادب، لسانی تشکیلات) کے حامل ادباء کا سنگم انہی جگہوں پر ہوتا ہے جس سے اردو نثر میں تازہ کاری اور جدت کا عمل فروغ پاتا رہا ہے۔ بلاشبہ بیسویں صدی کی ادبی انجمنوں نے ادبی اقدار اور فکرواحساس کو معاشرے کی مجموعی تہذیب و ثقافت سے ہم آہنگ رکھنے میں بھی نا قابل فراموش کردار ادا کیا ہے۔

بیسویں صدی میں عمومی، ادبی، علمی اور ثقافتی انجمنوں کے شانہ بشانہ اردو نثر کی بقا، تحفظ، ترقی اور فروغ کے لیے مختلف اداروں نے بھی کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ جنہیں کسی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان اداروں کی بدولت اردو نثر نے علم و ادب تحقیق اور تراجم کے میدان میں ترقی کی منازل طے کیں ہیں۔ جن میں قدیم اردو نثر پاروں کی تلاش وجستجو اور ان کی محققانہ تدوین و اشاعت، اردو قواعد و لغات کو مرتب کرنا، اصطلاحات وضع کرنا، اردو زبان کی لسانی تاریخ، عالمی ادب، علاقائی ادب، مختلف علوم وفنون کے تراجم، تنقید تاریخ ادب، عمرانیات، سائنس و فلسفہ، معاشیات، مذہب اور قانون کی کتب کی تصنیف و تالیف اور رسائل کا اجراء جیسے کارہائے نمایاں سرانجام دے کر اردو نثر کی ترویج و اشاعت کے ضامن بنے۔

مجلس زبان دفتری (حکومت پنجاب):

یہ مجلسی ادارہ ۱۹۴۹ء میں حکومت پنجاب نے قائم کیا۔ جس کا مقصد دفتری اور عدالتی اردو نثر کو فروغ دینا اور اردو زبان کے نفاذ میں ذرائع اور طریقہ کار بارے حکومت کو تجاویز دینا ہیں۔ ذیلی مجالس (لسانی مجلس، مجلس مترجمین، مجلس استناد، فنی مجلس، تعلیمی مجلس، عدالتی مجلس، تجارتی مجلس جبکہ ایک مجلس کا تعلق طریقہ کار سے تھا) کے تحت اس کام کا آغاز کیا۔ جس سے زیادہ منظم اور مربوط سطح پر دفتری عدالتی و انتظامی اردو نثر کو فروغ ملا۔ بورڈ آف ٹرانسلیٹرز مجلس مترجمین (جولائی ۱۹۵۰ء) اور ''مجلس استناد'' (ستمبر ۱۹۵۰ء)[۳۷] نے تراجم اور انکے مستفید ہونے کی سفارشات نے اردو نثر میں ترجمہ نگاری کی روایت کو تقویت اور استحکام بخشا۔ اس سے دفتری مراسلت کے نمونے، مختلف محکموں، اداروں اور سرکاری عہدوں کے نام، اور ان سے متعلق قوانین وضوابط کے تراجم پر بالخصوص توجہ دی گئی اور عمومی اصطلاحات اور محاورات پر مشتمل کتابچے چھاپے گئے۔

مجلس زبان دفتری کے مذکورہ بالا تمام امور نامور صاحبانِ علم و ادب نے ہی انجام دیئے جو انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے جن میں جسٹس ایس۔اے رحمان، شیخ محمد اکرام، عبدالمجید سالک،

سید نذیر نیازی، حافظ عبدالحمید، سید نور احمد، ایس ایم شریف، سید امتیاز علی تاج، ایم۔ڈی تاثیر، مولانا صلاح الدین احمد، میاں عبدالعزیز، احمد شاہ بخاری پطرس، حکیم احمد شجاع، خلیفہ عبدالحکیم، سید وزیر الحسن عابدی، تاج محمد خیال، چودھری محمد علی، پروفیسر حمید احمد خان، ڈاکٹر نذیر احمد، عاشق حسین بٹالوی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، مولانا حامد علی خان، سید وقار عظیم، اشفاق احمد، فتح محمد ملک، پروفیسر محمد عثمان، سید قاسم محمود، سید منصور عاقل، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مرزا محمد منور، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر سید امجد الطاف، سید قاسم محمود، علامہ شبیر بخاری، سید غلام حیدر، محمد نصیب، برہان احمد فاروقی، احمد ندیم قاسمی، پروفیسر احمد سعید، ڈاکٹر سلیم فارانی، ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک، ڈاکٹر خالد علوی، ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، اشفاق احمد، بشریٰ رحمٰن، پروفیسر محمد منور، عطا الحق قاسمی، ڈاکٹر صفدر محمود، مختار مسعود، وغیرہ نے ''مجلس زبان دفتری'' کی بنیادوں کو مضبوطی سے استوار کیا ہے۔مجلس نے ماہنامہ ''اردو نامہ'' کے اجراء سے بھی اپنے مقاصد کو عملی صورت دی۔

مجلس ترقی ادب:

۱۹۵۰ء میں ''مجلس ترجمہ'' کے نام سے قائم کیے گئے اس ادارہ کا ابتدا میں کام صرف مشرق ومغرب کی معیاری اور بلند پایہ علمی کتب کے اردو تراجم کرانا تھا لیکن جب ۱۹۵۸ء میں ادارہ کی تشکیل نو ہوئی تو اس کا نام ''مجلس ترقی ادب لاہور'' رکھا گیا اور اس کو نئے اغراض و مقاصد بھی ملے جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ کلاسیکی ادب شائع کرنے کا مناسب اہتمام

۲۔ بلند پایہ ادب کی اشاعت

۳۔ غیر زبانوں کی معیاری کتب کا ترجمہ کرا کے شائع کرنا۔

۴۔ ہر سال بہترین ادبی مطبوعات کے مصنفین کو انعام دینا۔

۵۔ رسائل کے بہترین مطبوعہ مضامین اور منظومات پر انعام دینا۔[۳۸]

مجلس نے جو کلاسیکی ادب شائع کیا اس کا موضوع داستان، حکایت، فلسفہ، شاعری، تاریخ، سوانح، سفرنامہ، مکاتیب یاد داشت، وغیرہ پر مشتمل تھا۔ ان موضوعات سے متعلق مخطوطات، نایاب کتب اور دستیاب اشاعتوں کے متون کی تصحیح وترتیب و تدوین، حواشی وتعلیقات، مبسوط اور عالمانہ مقدموں کے ساتھ ان کی اشاعت کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے۔

مخطوطات کے ضمن میں ''عجائب القصص'' از شاہ عالم ثانی ''دیوان جہاندار'' (شاہ عالم ثانی کے بیٹے

جہاندار کا اردو دیوان) ''تذکرہ طبقات الشعرا'' از قدرت اللہ شوق سنبھلی ''کلیات مصحفی'' '' کلیات جرأت'' کے علاوہ فورٹ ولیم کالج کی نایاب مطبوعات کے حصول اور تحقیق و تدقیق کے بعد حواشی ومقدمات کے ساتھ ازسرنو اشاعت کی گئی۔ نیز سرسید کے مقالات سولہ جلدوں میں مرتب کیے گئے۔ جو مجلس کا بہت بڑا کارنامہ ہے کیونکہ سرسید پر اس قدر جامع اور وقیع کام اس سے قبل کبھی نہیں ہوا۔مجلس کے اس عملی تجربے نے تحقیق کے شوق کو نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ محققین کے لیے ایک تربیت گاہ بھی مہیا کی۔مجلس کی بیشتر توجہ کلاسیکی ادب کو محفوظ کرنے کی طرف ہی رہی ہے۔لیکن اس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا ایک وقیع نثری سرمایہ بھی ظہور میں آیا جس کو پانچ موضوعات کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ سوانح نگاری ۲۔ تنقید نگاری ۳۔ تحقیق و تدوین

۴۔ تاریخ نگاری ۵۔ تراجم

سوانحی تصانیف میں ''ذوق سوانح وانتقاد'' از تنویر احمد علوی ''مومن حالات زندگی اور کلام'' از کلب علی خان فائق، جبکہ تنقید اور عملی تنقید کی کتب میں ''اصول انتقاد ادبیات'' ازسید عابد علی عابد ''شاعری اور تحقیق'' ''مغربی شعریات'' از مرزا ہادی حسین، ''ڈراما نگاری کا فن'' از محمد اسلم قریشی ''حالی کی نثر نگاری'' از ڈاکٹر عبدالقیوم ''مرزا ہادی رسوا'' ازمیمونہ انصاری، ''میر امن سے عبدالحق تک'' اور ''مباحث'' از ڈاکٹر سید عبداللہ۔تحقیق و تدوین کے حوالے سے تذکروں کی تدوین میں مجلس ترقی ادب کا کردار نہایت قابل ستائش ہے۔ان میں ''تذکرہ مخزن نکات'' از قائم چاند پوری، مدون ڈاکٹر اقتدار حسین، ''طبقات الشعرا'' از قدرت اللہ شوق، مدون ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، ''تذکرہ گلشن بے خار'' از نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مدون کلب علی خان فائق، ''تذکرہ خوش معرکہ زیبا'' (دو جلدیں) از نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، مدون مشفق خواجہ، ''گلستان سخن'' (دو جلدیں) ازمرزا قادر بخش صابر دہلوی، مدون خلیل الرحمٰن داؤدی، ''تذکرہ نکات الشعرا'' از میر تقی میر اور ''آب حیات'' ازمولانا محمد حسین آزاد کی اشاعت پر خصوصی توجہ دی جبکہ تحقیقی مقالات میں ''مقالات شیرانی'' از حافظ محمود شیرانی، ''مقالات و یادداشت ہائے مولوی محمد شفیع'' از مولوی محمد شفیع ''مقالات عرشی'' از امتیاز علی خان عرشی، تاریخی کتب میں ''شاہجہاں نامہ'' ''بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی'' ''دربار ملی'' ''دکنی کلچر'' ''اردو صحافت پاکستان و ہند میں'' ازعبدالسلام خورشید وغیرہ شامل ہیں۔

تراجم کے سلسلہ میں موضوعات کا دائرہ بے حد وسیع ہے جن میں فلسفہ، مذہب ، اخلاقیات، انسانیات،

تاریخ، سیاست، داستان، نفسیات، تنقید، سائنس، سوانح، قواعد، معاشیات، تعلیم، جغرافیہ، عمرانیات، تاریخ ادب، ڈراما وغیرہ شامل ہیں۔ ان حوالوں سے محض چند تراجم کے ناموں ہی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں کس قدر تنوع موجود ہے۔ ''تزک جہانگیری'' ''تاریخ بخارا'' ''دولت مغلیہ کی مرکزی ہیئت'' ''مسلمانوں کی سیاسی تاریخ'' اور سٹڈی ان ہسٹری از ناٹن بی کا ترجمہ ''مطالعہ تاریخ'' کے نام سے جبکہ آر سی ٹمپل کی حکایات پنجاب، ایل ایل ہوگبین کی سائنس سب کے لیے، سارٹن کی ''مقدمہ تاریخ سائنس''، نظام ملک طوسی کا ''سیاست نامہ''، ایڈم سمتھ کی ''دولت اقوام'' اور ای کیوری کی ''مادام کیوری'' کے علاوہ فلسفہ اور نفسیات کے موضوع پر امام غزالی، ایڈون اے- برٹ، جی -ای-مور، جیمز فریزر، ولیم جیمز، اور برٹرنیڈرسل جیسے مصنفین کی کتب کے تراجم کیے گئے۔ مجلس ترقی ادب میں اردو نثر کو علمی وادبی اور تحقیقی ترقی نامور ارباب علم شیخ محمد اکرام، سید وقار عظیم، حکیم احمد شجاع، ڈاکٹر سید عبداللہ، سید امتیاز علی تاج، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر وحید قریشی، حمید احمد خان، احمد ندیم قاسمی اور شہزاد احمد کی سرپرستی میں ملی۔ جبکہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، خلیل الرحمٰن داؤدی، کلب علی خان فائق، انتظار حسین، ریاض چودھری، خالد نذیر صوفی، مرتضیٰ فاضل لکھنوی، مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، احمد ربانی، عشرت رحمانی، ڈاکٹر ابالليث صدیقی، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، نورالحسن نقوی اور احمد رضا جیسی ادب پرور شخصیات نے نمایاں تدوینی خدمات انجام دیں۔ مجلس ترقی ادب کا ایک اور کارنامہ سہ ماہی مجلّہ ''صحیفہ'' (۱۹۵۷ء) کا اجراء ہے۔ جس میں علمی و ادبی موضوعات کے ساتھ پاکستان کے مختلف حصوں کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ پر بلند پایہ تحقیقی، مقالات بھی شائع ہوتے ہیں۔ مجلس کے موجودہ سرپرست شہزاد احمد ہیں۔

ادارہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ:

اسلامی تاریخ، مذہب، ادب، سوانح نگاری اور مختلف علوم وفنون کی تحقیق و تدوین، تصنیف و تالیف اور اس کی اشاعت کے لیے ۱۹۵۰ء میں جامعہ پنجاب نے ڈاکٹر محمد شفیع کی سربراہی میں ادارہ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' قائم کیا۔ مولوی محمد شفیع کے ساتھ مولوی ظفر اقبال، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر علاؤ الدین صدیقی، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ اور ڈاکٹر سید عبداللہ وغیرہ اس ادارہ کے انتظام و انصرام پر مامور ہوئے۔ ادارہ کا سب سے بڑا کارنامہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ہالینڈ کے علمی مرکز لائیڈن کا چار جلدوں اور ایک ضمیمے ۳۹ پر مشتمل انسائیکلوپیڈیا ہے) کا ترجمہ اور اس کی تکمیل و تدوین ہے جو ۲۲ جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا اسلامی تصورات، اسلامی سوانحی کتب، اہم شخصیات، عقائد اور اسلامی علوم وفنون پر ایک مستند دستاویز ہے۔ اس سلسلہ کو زیادہ منظم اور مربوط طور پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے جاری رکھا جو ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۲ء تک ادارہ کے سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے۔ ادارہ کے دیگر

کارناموں میں مختصر ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' اشاریہ اور دائرہ معارف اسلامیہ، سیرت خیرالانام، تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ جلد اول ہیں۔ اس علمی و تحقیقی کام کی تفصیل وترتیب اس طرح ہے۔

شمارہ جلد	عنوان	سال طباعت
اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۸	لاہور..........محمل	۱۹۸۵ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۱۹	محمدؐ..........معجزہ	۱۹۸۵ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۰	محمود..........مسجد الحرام	۱۹۸۶ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۱	مسح..........میا فارقین	۱۹۸۷ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۲	ت..........وقائع نویس	۱۹۸۹ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲۳	وقت..........پیلا	۱۹۸۹ء
۲۴ (اشاریہ)		۱۹۹۲ء
مختصر اردو دائرہ معارف اسلامیہ	(الف..........ی)	۱۹۸۷ء
سیرت خیر الانامؐ		۱۹۹۹ء
تکملہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (جلد اول)		۲۰۰۲ء

ادارہ ثقافت اسلامیہ:

یہ ادارہ ۱۹۵۰ء میں لاہور میں خلیفہ عبدالحکیم کی تجویز پر قائم ہوا۔ جس کے پیش نظر مقاصد میں سے ایک بنیادی مقصد اسلامی فکر اور ثقافت پر علمی و تحقیقی کام کے ساتھ قانون، فلسفہ، تاریخ، معاشیات، ادبیات، مختلف سائنسی علوم وفنون پر کتب، رسائل اور دیگر دستاویزات کی تصنیف و تالیف تھا۔ جس نے اردو نثر کو گراں قدر سرمایہ دیا۔ اس ادارہ کا امتیاز ہے کہ اس نے اسلام کی علمی وفکری جہت کو نمایاں کیا۔ چنانچہ قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، سیرت، اسلام اور دیگر مذاہب، مسلمانوں کی تاریخ، اور انکے علوم و افکار، اخلاق، تہذیب وتمدن، ثقافت، سیاست، تعلیم، طب، تصوف اور اقتصادیات پر منفرد نوعیت کی کتب شائع کیں نیز ابن تیمیہ، غزالی، رومی، ابن خلدون ، شاہ ولی اللہ، سرسید، علامہ اقبال، الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، سید امیر علی کے افکار وخدمات پر بھی محققانہ تصانیف پیش کیں۔

ادارہ کو فعال بنانے میں خلیفہ عبدالحکیم، مولانا محمد حنیف ندوی، مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری، بشیر احمد ڈار، مولانا مظہر الدین صدیقی، مولانا رئیس احمد جعفری، شاہد حسین رزاقی، ڈاکٹر محمد رفیع الدین ،میاں محمد شریف، شیخ محمد اکرام،

شیخ محمد سعید نے قابل ستائش خدمات انجام دیں ہیں۔ادارہ نے ایک علمی وتحقیقی رسالہ ''ثقافت'' کا اجراء بھی کیا جو بعد ازاں ''المعارف'' کے نام سے جاری رہا۔جس میں اعلیٰ پائے کے علمی، تاریخی اور اسلامی مضامین شائع ہوتے ہیں۔

بزم اقبال:

۱۹۵۰ء میں حکومتی سرپرستی میں قائم ہوئی۔جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے اس کا بنیادی مقصد علامہ اقبال کی تعلیمات اور افکار کی بابت تحقیق کی حوصلہ افزائی کرنا اور فکر اقبال پر کتب شائع کرانا ہے۔یہ شعبہ اقبالیات پر تحقیق وتنقید کے نئے گوشوں کو سامنے لانے میں کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔فکر اقبال پر تحقیق وتنقید کی سرپرستی اس ادارہ سے متعلق صاحبان علم و ادب جسٹس ایس اے رحمان، پروفیسر ایم ایم شریف، ڈاکٹر محمد شفیع، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، سید نذیر نیازی، ڈاکٹر محمد جہانگیر خان، میاں بشیر احمد، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا علم الدین سالک، ڈاکٹر سید عبداللہ، احمد ندیم قاسمی وغیرہ کرتے رہے ہیں نیز ادارہ ''بزم اقبال'' نے علامہ اقبال کی زندگی اور فلسفے پر بلند پایہ مضامین کی ترویج و اشاعت کے لیے سہ ماہی مجلّہ ''اقبال'' کا اجراء بھی کیا۔

اقبال اکیڈمی پاکستان:

اقبال اکادمی ۱۹۵۱ء میں کراچی میں قائم ہوئی لیکن اقبال کے صد سالہ جشن سے قبل لاہور منتقل ہوگئی۔اس ادارہ کا بنیادی مقصد بھی افکار اقبال کی ترویج و اشاعت ہے۔اس کے لیے ادارہ نے ''اقبال شناسی'' کے لیے تحقیق وتنقید کی حوصلہ افزائی کی۔چنانچہ بالخصوص فکر اقبال کے تقریباً ہر موضوع پر نامور ادباء اور اقبال شناسوں سے کتابیں لکھوا کر اردو نثر میں شعبہ اقبالیات کو فعال بنایا۔ادارہ کے انتظامی عہدے پر بیشتر اعلیٰ پائے کے محقق اور ادیب فائز رہے جو اقبال شناسی میں بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ان میں ڈاکٹر رفیع الدین، بشیر احمد ڈار، ڈاکٹر عبدالرب نشتر، ڈاکٹر معز الدین، ڈاکٹر وحید قریشی، پروفیسر مرزا محمد منور، شہرت بخاری، اور سہیل عمر شامل ہیں۔اقبال اکیڈمی نے بھی ''اقبال ریویو'' کے نام سے علمی وتحقیقی مجلّہ کا اجراء کیا۔اس سہ ماہی جریدہ میں اقبال کی زندگی، شاعری اور فکر پر علمی، تحقیقی وتنقیدی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ان مضامین میں علوم وفنون جن سے اقبال کو دلچسپی تھی مثلاً اسلامیات، فلسفہ، مذہب، تاریخ، عمرانیات، فنون لطیفہ، زبان وادب وغیرہ سے متعلق تنقیدی مطالعہ سامنے لایا جاتا ہے۔

مغربی پاکستان اردو اکیڈمی:

اس ادارہ کا قیام ۲۹ دسمبر ۱۹۵۵ء میں عمل میں آیا۔جس کے مقاصد میں اعلیٰ درجہ کی سائنسی کتب کی

تصنیف و تالیف اور ترجمہ اور اردو کے ادبی سرمایے میں اضافہ کے ساتھ اسے زندگی کے تمام شعبوں، تعلیم، تجارت اور انتظامی امور کے اظہار کا مؤثر ذریعہ بنانا، دفتری نثر اور مضمون نویسی کو فروغ دینا، سائنس اور انجینئرنگ کے موضوعات پر لیکچرز کا اہتمام کرنا وغیرہ شامل تھے۔ ادارہ کے مقاصد کو تکمیل دینے میں ڈاکٹر سید عبداللہ (ناظم ادارہ) کا ساتھ لیڈی عبدالقادر، حفیظ جالندھری، غلام رسول مہر، آغا شورش کاشمیری اور جمیل الدین عالی نے دیا۔ ادارہ نے شیخ منہاج الدین کی ''قاموس الاصطلات'' کے علاوہ سائنس نفسیات، اقبالیات، ادب فلسفہ اور دیگر متعدد موضوعات پر کتب کی اشاعت کی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کے انتقال کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی اکیڈمی کے نگران بنے اور اس حیثیت میں انہوں نے بہت اچھا کام بھی کیا۔ ان دنوں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس کے سربراہ ہیں۔

ادارہ تالیف و ترجمہ:

۱۹۶۲ء میں جامعہ پنجاب میں ادارہ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا جو Urdu Development Committee کو دوسرا نام ہے۔[۱۲] جس کا مقصد جدید سائنسی اور عمرانی علوم وفنون کو اردو نثر میں منتقل کرنا اور اصطلاحات سازی کرنا نیز جدید علمی موضوعات پر تعارفی کتب کی تیاری اور ان کی اشاعت کرنا تھا۔ جن میں علم طبقات الارض، نباتات، فلکیات، حیوانیات، ریاضی، علم دوا سازی، جغرافیہ طبیعات، فلسفہ، انجینئرنگ، زراعت، معاشیات، کیمسٹری، نفسیات، قانون، وغیرہ جیسے مضامین شامل تھے۔ سائنسی اور علمی و ادبی کتابیں جو ادارہ نے شائع کیں ان میں اضافیت کا نظریہ خصوصی، ہم رشی کیمیا، فولاد سازی، ایٹم کی ساخت، شماریاتی میکانیات، مرکزائی کیمیا، فونڈری ٹیکنالوجی، تجاذب اور سیاروی حرکت، مرکزائی اشعاع اور زراعت میں ان کی اہمیت، کیمیائی بندوساخت، صنعتی معاشریات، قاموس نباتات، پاکستان کی معدنی دولت (پروفیسر مس منور جہاں رشید)، فولادی کنکریٹ، دھاتیں اور ان کے استعمالات، رنگ نگاری (ڈاکٹر محمد ظفر اقبال) تاریخ سائنس (پروفیسر سی اے وقار) ''تعلیم بذریعہ کھیل'' ''بچوں کے مفکر) (پروفیسر مس منور جہاں رشید) اصطلاحات کیمیا اور اصطلاحات طبیعات (سید ضیاء احمد رضوی) حیاتیاتی وغیر نامیاتی کیمیا کے روابط (ڈاکٹر ظفر اقبال) مغربی ڈراما ور جدید ادبی تحریکیں (رضی عابدی) ژونگ کے نفسیاتی نظریات (ڈاکٹر سہیل احمد خان) برگساں کا فلسفہ، (ڈاکٹر نعیم احمد) سیاسی جماعتیں (مترجم مسعود احمد خان) جدید طبیعات کے مشاہیر حصہ اول (ڈاکٹر مجاہد کامران) تفہیم طبیعات (مترجم پروفیسر منیر احمد خان) ذہنی معذور بچوں کی تربیت (نذیر چودھری) فضائی آلودگی (ڈاکٹر جمیل انور چوہدری) سفالیات (رؤف نظامی) خودی ایک نفسیاتی جائزہ (ریحان اصغر منیر) اساس ٹھوس حالت طبیعات (ڈاکٹر محمد انیس عالم) مبادیات تعلیمی تحقیق (ڈاکٹر عبدالرشید) توانائی کا بحران (پروفیسر منیر احمد خان) ذہنی ونفسیاتی دباؤ (نذیر

چودھری) فلسفے کی ماہیت (ڈاکٹر نعیم احمد) ''ہوائی توانائی اور ''اسیر ذہن'' (محمد سلیم الرحمٰن) ''تحقیق مقالہ نگاری'' (پروفیسر محمد عارف) ادارہ نے مذکورہ کام کا سلسلہ علمی وادبی شخصیات جسٹس ایس اے رحمان پروفیسر حمید احمد خان، سید وقار عظیم، ڈاکٹر سید عبداللہ، ضیاء احمد رضوی، ملک عبدالرحمٰن، ڈاکٹر بدر الدین، ڈاکٹر یاسین خان نیازی، ڈاکٹر رفیق احمد، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ضیاء الاسلام، ڈاکٹر نادرہ زیدی، ڈاکٹر عبید اللہ خان، رفیع الدین ہاشمی کے بعد ڈاکٹر تحسین فراقی کی سربراہی میں جاری وساری ہے۔

اُردو سائنس بورڈ یا مرکزی اُردو بورڈ:

۱۹۶۲ء میں حکومتی سرپرستی میں قائم ہونے والے اس ادارہ کے مقاصد میں اردو زبان وقواعد کی توسیع و ترقی، اردو نثر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی تدریس اور اردو زبان کی ترقی میں دیگر اداروں سے باہمی تعاون شامل ہیں۔ تعلیم بالغاں کے نصاب اور اردو مختصر نویسی کی تربیت بورڈ کی اہم خدمات ہیں لیکن بورڈ کی بیشتر توجہ کا مرکز ایسی کتابوں کی اشاعت ہے جو سائنسی اور فنی اور تکنیکی موضوعات پر مبنی ہیں۔ ایسی کتب کے علاوہ بورڈ نے لغات، درسی کتابیں، صحافت، تاریخ، تمدن اور قواعد اور اردو کی ترویج وترقی سے متعلق تصانیف بھی کثرت سے شائع کیں۔

ادارہ کا مرکزی کارنامہ یہ ہے کہ اردو نثر کو پختہ سائنسی زبان بننے کے سلسلہ میں جو رکاوٹیں حائل تھیں انہیں دور کیا۔ یہ کام نامور اہل علم وادب حنیف رامے، اشفاق احمد، قدرت اللہ شہاب، پیر حسام الدین راشدی، ممتاز مفتی اور خیال بخاری کی سرپرستی میں تکمیل کے مراحل طے کرتا رہا ہے۔

نیشنل بک کونسل:

حکومتی سرپرستی میں قائم ہونے والے اس ادارے کی ایک شاخ ۱۹۶۳ء لاہور میں قائم ہوئی۔ جس کے مقاصد میں کتابوں کی ترقی فروغ اور اشاعت کے لیے منصوبہ سازی کرنا ہے۔ اس سے بھی اردو نثری کتب کو فروغ ملا۔ نیز اس نے ایک ماہنامہ ''کتاب'' کا اجراء بھی کیا۔

شعبہ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند:

یہ شعبہ جامعہ پنجاب میں ۱۹۶۴ء میں قائم ہوا۔ جس کے تحت سولہ جلدوں پر مشتمل منفرد اور بہت بڑا تصنیفی منصوبہ ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اس کا مقصد ان فکری عوامل اور شعائر زندگی کو اجاگر کرنا تھا جس سے برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی، معاشرتی، مذہبی، اقدار کی تعمیر ہوئی۔ ادبی زندگی میں تصوف،

فلسفہ، اخلاقیات، تاریخ، لسانیات، سوانح، تذکرہ، افسانے، انشائیے، تنقید، مکتوبات، صحافت، ناول، ڈراما، شاعری، بچوں کا ادب وغیرہ ہر چیز شامل ہے۔ اس تاریخ کے ذریعے مصنفین اور ان کے فن پاروں کو منفرد انداز سے ادبی دنیا میں روشناس کرانا تھا۔

اس تاریخ کی تدوین کے انتظامات پر پروفیسر حمید احمد خان، پروفیسر علاؤ الدین، جسٹس ایس اے رحمان، ڈاکٹر شیخ محمد اکرام، کرنل مجید ملک، سید فیاض محمود، ڈاکٹر عبدالشکور احسن اور ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ مامور رہے جبکہ تاریخ کی مختلف جلدوں کی ادارت حسب ذیل صاحبان علم پر مشتمل تھی۔

پہلی جلد مقدمہ	مصنف سید فیاض محمود
دوسری جلد (عربی ادب ۷۱۲ء - ۱۹۷۰ء) مدیر خصوصی	پروفیسر عبدالقیوم
تیسری جلد (فارسی ادب ۱۰۰۰ء - ۱۵۲۶ء) مدیر خصوصی	ڈاکٹر وحید مرزا
چوتھی جلد (فارسی ادب ۱۵۲۶ء - ۱۷۰۷ء) مدیر خصوصی	پروفیسر مرزا مقبول بیگ بدخشانی
پانچویں جلد (فارسی ادب ۱۷۰۷ء - ۱۹۰۷ء) مدیر خصوصی	پروفیسر وزیر الحسن عابدی
چھٹی جلد (اردو ادب - ۱۷۰۷ء) مدیر خصوصی	ڈاکٹر وحید قریشی
ساتویں جلد (اردو ادب ۱۷۰۷ء - ۱۸۰۳ء) مدیر خصوصی	پروفیسر وقار عظیم
آٹھویں جلد (اردو ادب ۱۸۰۳ء - ۱۸۵۷ء) مدیر خصوصی	سید فیاض محمود
نویں جلد (اردو ادب ۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء) مدیر خصوصی	ڈاکٹر عبادت بریلوی
دسویں جلد (۱۹۱۴ء - ۱۹۷۰ء) مدیر خصوصی	سید فیاض محمود
گیارہویں جلد (بنگالی ادب اول) مدیر خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
بارہویں جلد (بنگالی ادب دوم) مدیر خصوصی	ڈاکٹر سید علی اشرف
تیرہویں جلد (علاقائی ادبیات مغربی پاکستان اول) مدیر خصوصی	سید فیاض محمود
چودھویں جلد (علاقائی ادبیات مغربی پاکستان دوم) مدیر خصوصی	سید فیاض محمود
پندرھویں جلد (علاقائی ادبیات ہند) مدیر خصوصی	سید فیاض محمود

سولہویں جلد (خلاصہ جملہ جلد ہائے ادبیات در انگریزی) مدیر خصوصی سید فیاض محمود

ان دنوں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' پر نظر ثانی کے بعد ان کی طباعت نو کا اہتمام کر رہے ہیں۔ اب تک وہ چار جلدیں طبع کروا چکے ہیں۔

مجلس یادگار غالب :

جامعہ پنجاب نے پروفیسر حمید احمد خان کی سربراہی میں ۱۹۶۷ء میں یہ مجلس قائم کی۔ غالب کی تصانیف اور فن پر بلند پایہ کتب متون کی تصحیح اور حواشی کے ساتھ مرتب اور شائع کرنا ہی اس کا بنیادی مقصد تھا۔ چنانچہ دیوان غالب کا نسخہ حمیدیہ (مرتبہ) حمید احمد خان، ''خطوط غالب'' غلام رسول مہر، ''دیوان غالب'' (مرتبہ) حامد علی خان، ''افادات غالب'' (مرتبہ) سید وزیر الحسن عابدی، ''غالب۔ذاتی تاثرات کے آئینے میں'' از سجاد باقر رضوی، ''تنقید غالب کے سو سال'' (مرتبہ) سید فیاض محمود اور اقبال حسین، ''اشاریہ غالب'' (مرتبہ) ڈاکٹر سید معین الرحمان وغیرہ اسی مقصد کی عملی صورتیں ہیں۔ اس ادارہ نے اردو نثر میں شعبہ غالبیات کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس ادارہ سے وابستہ ارکان میں مستند صاحبان علم و ادب شامل رہے ہیں جو غالب شناس بھی ہیں۔ جن میں عبدالرحمٰن چغتائی، مولانا غلام رسول مہر، پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ، مولانا حامد علی خان، جسٹس ایس اے رحمان، ڈاکٹر قاضی سعید الدین، کیپٹن عبدالواحد، سید فیاض محمود، ڈاکٹر سید عبداللہ، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر محمد باقر، سید وقار عظیم، سید وزیر الحسن عابدی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، محمد صفدر میر، ڈاکٹر محمد اجمل، پروفیسر اختر اقبال کمالی، ڈاکٹر وحید قریشی، انتظار حسین اور اقبال حسین وغیرہ شامل تھے۔

ان کے علاوہ دیگر اداروں میں ''ادارہ تعلیم و تحقیق جامعہ پنجاب'' (۶۰-۱۹۵۹ء) جس کا مقصد تعلیم و تحقیق کو فروغ دینا ہے۔ ''ریسرچ سوسائٹی مغربی پاکستان'' (۱۹۶۳ء) اور اس کا سہ ماہی جریدہ ''ارمغان علمی'' (۱۹۶۴ء) (جس کے مدیر ڈاکٹر وحید قریشی تھے) علماء اکیڈمی'' (۱۹۷۱ء) جس کا مقصد اسلامی علوم وفنون کی اشاعت کرنا ہے۔ اس کے لیے تحقیقی مرکز ''مرکز معارف اولیاء'' بھی قائم کیا گیا۔ علامہ عبدالرحمٰن الجزیری کی تصنیف ''کتاب الفقہ'' کی پانچ جلدوں کا اردو ترجمہ اکیڈمی کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ ''پنجاب آرٹس کونسل'' (۱۹۷۵ء) کا مقصد تحریر و تخلیق کی حوصلہ افزائی اور مذاکرے کرانا اور ادبی تحقیق، لسانیات، ناول و افسانہ کی بہترین کتب پر انعام دینا ہے۔ ''ادارہ معارف اسلامی'' (۱۹۷۹ء)، جس کا مقصد اسلامی ادب کو فروغ دینا ہے۔ ''شعبہ اقبالیات'' (۱۹۸۰ء) کلیہ علوم اسلامیہ و شرقیہ جامعہ پنجاب میں اقبال کے فکر وفن پر تحقیق کو فروغ دینے کے لیے پروفیسر مرزا محمد منور کی سربراہی میں قائم ہوا۔ ان اداروں کی خدمات کے پیش نظر یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ ان اداروں سے بھی اردو نثر کی ترویج و اشاعت اور فروغ و ترقی میں معاون کردار ادا کیا۔

ج) تحریکات و رجحانات:

۱۸۵۰ء سے ۱۹۰۰ء تک کے عہد میں نیا نثری منظر نامہ تخلیق ہو چکا تھا جو روزمرہ زبان و بیان اور ذہنی و فکری تصورات و موضوعات کے لیے مغربی نثر سے قریب تر تھا اور جس کا نفس مضمون بھی سابقہ نثری سرمایے سے بالکل جدا تھا۔ اس حوالے سے لاہور میں ظہور پذیر ہونے والے اردو نثری سرمایے میں ادبیت، رومانیت اور ترقی پسندی سبھی کچھ شامل تھا۔ ان مذکورہ عوامل نے بالخصوص بیسویں صدی میں شہرت پائی۔ نتیجتاً مولانا آزاد اور دیگر مشاہیر ادب کے آنے سے لاہور میں متعدد، مختلف اور متضاد، رجحانات اور تحریکات کا آغاز ہوا۔ جسے بعدازاں دو بڑے نظریوں کی صورت ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' میں منقسم کیا گیا۔ ادب میں بنیادی کلیہ بنا لیا گیا ہے کہ رجحانات اور تحریکات کو الگ الگ قرار دے کر ایک دوسرے کا منطقی نتیجہ قرار دیا جائے گا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ہر عہد میں بیک وقت کئی دھارے اردو نثر میں کارفرما رہتے ہیں۔ ان میں رومانویت، حقیقت پسندی، عقلیت پسندی، تحلیل نفسی، جمالیات، اظہاریت وغیرہ سبھی کچھ ساتھ ساتھ شامل ہیں۔ گویا یہ ایک نامیاتی عمل ہے جو جاری و ساری رہتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ان عوامل میں سے کوئی ایک وقتی طور پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ورنہ محض کسی ایک نظریہ سے وابستگی فنکار کی قوت متخیلہ کو زک پہنچاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریباً تمام اچھے نثر نگاروں کے یہاں مذکورہ عوامل کے آثار کی موجودگی دیکھی جا سکتی ہے۔ اردو نثر کو نظریات، رجحانات اور تحریکات کی بدولت روزافزوں ترقی ملی۔ جو اس کے ارتقا و فروغ میں انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔

رومانویت میں انسان کی لاشعوری کیفیت کے تحت تخلیقی تجربے کا زبان کے راستے اظہار کیا جاتا ہے۔ اس تحریک کی آواز پہلے پہل فرانس میں روسو (مفکر) نے اٹھائی۔ مروّج معنوں میں رومانویت کی اصطلاح فن وادب کے اس دور کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے جو اٹھارویں صدی کے آخر سے شروع ہوا اور جس نے عقلیت، روایت پسندی، توازن، نظم و ضبط کے مقابلے میں تخیل، جذبے، وجدان، بغاوت اور انفرادیت کو فن کی بنیاد بنایا۔ دوسری جانب یہ اصطلاح ایسے فن پاروں کے لیے بھی استعمال کی گئی جو خواہ کسی بھی عہد میں لکھے گئے لیکن ان میں تخیل، وجدان، جذبہ اور انفرادیت کے اوصاف نمایاں تھے۔ جدید تعلیم اور انگریزی زبان و ادب سے واقفیت کے ساتھ مغربی، سماجی و معاشرتی رویے بھی اردو زبان و ادب میں وارد ہوئے۔ جس سے اردو داں طبقہ انگریزی زبان و ادب کی اس تحریک سے آگاہ ہوا لیکن یہ امر اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ اردو ادب میں رومانویت، روشن خیالی، فکر جدید یا ترقی پسندی کے رجحانات کا چلن مغربی ادب سے مختلف نہج پر ہوا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد حسن کا یہ کہنا درست ہے:

"یورپ میں روشن خیالی اور فکر جدید کی جو تحریکیں اٹھارویں صدی میں ابھریں وہ وہاں کے متوسط طبقے کی تھیں جو بنیادی طور پر صنعتی کارخانوں کا مالک تھا اور قدیم جاگیرداری نظام کے ہاتھ سے سیاسی اور تہذیبی تسلط کی باگ ڈور چھین لینا چاہتا تھا یہ جنگ ادب میں بھی لڑی گئی اور رومانوی طرز فکر اسی جنگ کا حصہ ہے۔ ہندوستان میں صنعتی انقلاب آیا ہی نہیں لہذا کسی ایسے متوسط طبقے کا ابھرنا بھی ممکن نہ ہو سکا جو صنعتی کارخانوں کا مالک ہوتا اور جاگیرداری کے توہم پرستانہ اور ضابطہ پرست مسکہ بند نظام سے ٹکرا کر روشن خیالی اور جدت فکر کے دروازے کھولتا۔ یہاں جسے "متوسط طبقے" کی اصطلاح سے پہچانا جاتا ہے وہ محض انگریزی تعلیم یافتہ نوکر پیشہ طبقہ ہے جو شاید صرف آمدنی کے حساب سے متوسط کہا جا سکتا ہے۔"[۴۲]

اگرچہ یہ درست ہے کہ یہاں یورپ کی مانند ویسا انقلاب رونما نہیں ہوا اور نہ ہی اردو ادب میں ویسا کلاسیکی جامد ماحول تھا جیسا رومانویت کے احیاء کے موقع پر یورپین اور بالخصوص انگریزی ادب میں موجود تھا لیکن انگریزی تعلیم یافتہ متوسط طبقہ نے اٹھارویں اور انیسویں صدی میں شروع ہونے والی یورپ کی مذکورہ بالا تحریکوں اور ان کی نمائندہ تحریروں سے روشناس کرایا۔ بین الاقوامی حالات اس خطے پر بھی اثرانداز ہوئے جہاں کا سرمایہ دارانہ نظام جاگیرداروں کے شکنجے میں شدت سے جکڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر محمد خان اشرف بھی اسی جانب توجہ دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کا بنیادی سبب ہندوستان کے ساکن اور مصنوعی تمدن کا (جو انیسویں صدی تک جاگیردارانہ نظام پر ہی تھا) مغربی ترقی پذیر سرمایہ دارانہ نظام سے ٹکراؤ اور تصادم تھا جس نے ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقات کو ذہنی اور جذباتی طور پر بیدار اور آزاد کرایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی نئی جمہوری سیاست کی انفرادیت اور انگریزی تعلیم کے ساتھ مغربی رومانوی تحریک کے اثرات بھی ہندوستان میں سرایت کر گئے جس نے نوجوان طبقے کے ذوق، تخیل، وجدان اور جذبہ حب الوطنی کو مہمیز لگائی۔"[۴۳]

اردو نثر میں رومانوی اثرات کو قبول کرنے کی ایک وجہ ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی بیان کی ہے:

"بیسویں صدی میں علوم کی ترقی نے انسان کے سارے تیقن کو پارہ پارہ کر دیا اور اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ مرکز کائنات نہیں رہا ـــ اور ماحول کے ساتھ اس کا رشتہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے جب وہ بنیاد ہی لرزہ براندام ہو جس پر معاشرے کی عمارت کھڑی ہے تو انسان قدرتی طور پر تخیلہ کو بروئے کار لاتا ہے تاکہ ایک بہتر اور خوب تر جہاں کا نظارہ کر سکے۔"[۴۴]

ایک سطح پر رومانویت سرسید تحریک کی عقلیت پسندی کا ردعمل بھی تھا۔ اس طرح اردو نثر میں بیسویں صدی

کے ابتدائی عشرے میں مغربی اثرات اور سرسید تحریک کی عقلیت پسندی کے ردِعمل کے طور پر رومانویت کا رجحان پروان چڑھا۔ رومانویت جسے کلاسکیت (عقلیت، اصول پرستی، خارجیت، میانہ روی، روایت کی پاسداری، قدامت پرستی، ہیئت پر زور، تجربے کی حوصلہ شکنی، متعین موضوعات کی تقلید) کے خلاف ردِعمل کی تحریک قرار دیا جاتا ہے اور جس میں روایتی قوانین و ضابطوں، پابندیوں سے بغاوت، اعتقادات، روایات، اور معیارات کی مروجہ حدود وقیود سے آزادی، انفرادیت، تخیل، وجدان، جذبات، نئے موضوعات اور نئی قدروں کی بازیافت، ہیئت کے تجربات، داخلیت وغیرہ کے خصائص پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی لیے ڈاکٹر محمد حسن نے یہ کہا: ''رومانیت اس طاقتورانا اور زبردست خودی کی مظہر ہے جو پرانے مسلمات کو رد کرتی ہے اور دنیا کو اپنے جذب وشوق کے سانچے میں ڈھالتی ہے۔''[۲۵] چنانچہ بغاوت جو رومانویت کا بنیادی استعارہ ہے بیسویں صدی کی ابتدا ہی میں رسالہ ''مخزن'' اور ناول نگاری میں سب سے پہلے مرزا محمد سعید دہلوی کے ناول خواب ہستی (۱۹۰۵ء) اور ''یاسمین'' (۱۹۰۸ء) کی صورت میں دکھائی دیتا ہے۔ جس میں انہوں نے مروجہ اصلاحی اور حقیقت نگاری کے تحت لکھے جانے والے ناولوں میں اختراع کرتے ہوئے نفسیاتی ناول لکھنے کی طرح ڈالی۔ مرزا محمد سعید دہلوی جو انگریزی زبان میں مہارت اور فکشن میں مغربی نظریات سے آگاہی رکھتے تھے۔ اپنے اولذکر ناول میں عثمان اور مؤخر الذکر میں اختر کر کردار کے ذریعے فرد کی نفسیاتی کشمکش کو بیان کرتے ہوئے اس کی تسکین و تطہیر مذہب، روحانیت اور تصوف میں بتائی ہے۔ ان نفسیاتی ناولوں میں رومانیت کا عنصر غالب ہونے کے ساتھ معاشرتی شعور کا رچاؤ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ نیز فنون لطیفہ پر مباحث اور ناول کے فنی لوازمات کے برتنے میں مرزا محمد سعید دہلوی نے فنکارانہ مہارت کا بھی ثبوت دیا ہے۔

یوں دیکھیں تو ترقی پسندی کے رجحان نے رومانویت کے سائے میں پرورش پائی لیکن جیسے ہی حالات کے تقاضے بدلے ترقی پسندی اپنی بلوغت کو پہنچ کر ادبی منظر نامے پر چھا گئی۔ درحقیقت رومانویت اور ترقی پسندی میں بغاوت کا عنصر قدر مشترک ہے۔ اول الذکر میں ادیب اپنے گردوپیش کے سنگین اور تلخ حقائق کو تخیل کی رنگینی، کرب یا سرمستی میں بیان کرتا ہے جبکہ مؤخر الذکر میں سماجی ناانصافیوں اور کج روئیوں کو دور کرنے کی تگ و دو پر زور دیتا ہے جس میں تخیل کی کارفرمائی اور عمل دخل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت نگاری کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ مذکورہ دونوں رنگ انجمن پنجاب کی نثر کے علاوہ رسالہ ''مخزن'' کے صفحات پر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جسے رومانویت کا اولین استعارہ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ رومانویت اور حقیقت پسندی کا ایک ملا جلا رجحان اردو نثر میں بیسویں صدی کے آغاز سے ہی دکھائی دیتا ہے۔ اس کی دوسری مثال ''حلقہ نیاز مندان لاہور'' ہے جو جدید مغربی خیالات اور رومانویت کے ساتھ ترقی پسند سوچ کا حامل بھی تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ''۱۹۳۵ء میں لندن میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی

بنیاد ڈالنے والوں میں ملک راج آنند اور سجاد ظہیر کے ساتھ تاثیر صاحب بھی شامل تھے۔"[۴۶] دوسرے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم جو ۱۹۳۸ء میں لاہور میں ترقی پسند انجمن کے سکریٹری بنے۔ تیسرے ترقی پسند کرشن چندر جن کے ہاں حقیقت اور رومانویت کا خوبصورت امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ بیسویں صدی میں رومانویت اور حقیقت پسندی کا طرز بیان ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ جس پر بعد ازاں حقیقت نگاری غالب آ جاتی ہے اور رومانویت کا عنصر بتدریج مدھم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایسا ہونا بدیہی امر تھا کیونکہ جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء - ۱۹۱۸ء) کے دوران برصغیر میں اقتصادی معاشرتی حالات تلخ اور سیاست میں مختلف تحریکوں کی ہلچل اور استعماریت کے خلاف آوازیں بلند ہونا شروع ہوگئیں تھیں۔ بغاوت کے یہ رجحانات معاشرتی رسم و رواج کی قدغنوں کو توڑنے اور سیاسی سطح پر استعمار کے خلاف عوام کو جدوجہد پر بیدار کر رہے تھے۔ پھر انقلاب روس (۱۹۱۷ء) سے اشتراکی نقطہ نظر کو فروغ ملا تو فرد اور معاشرے کی شکست و ریخت سے اجتماعیت کے عنصر کو تقویت ملنا شروع ہوگئی۔ اس سے قوم پرستی کی تحریک کو بھی اہمیت حاصل ہوئی۔ کارل مارکس، اینگلز، اور لینن کے سیاسی و معاشی نظریات نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ جس کا لب لباب یہ الفاظ تھے:

> "رفیقانِ قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہمنوائی کیجئے ہمارا قلم ہمارا فن، ہمارا علم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، جو روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔"[۴۷]

یہ وہ دور تھا جب ایک طرف فرانس میں فطرت نگاری کی تحریک پروان چڑھ رہی تھی اور دوسری جانب فرائڈ اور یونگ کی تحلیل نفسی اور ایڈلر کے احساس کمتری اور احساس برتری کے نظریات کے اثرات بھی جذب کیے جا رہے تھے۔ کروچے کا نظریہ اظہاریت اور روسی ادب بھی مقبول تھا۔ جس میں فن کا اصل مقصد اپنا اظہار کرنا تھا۔ اس ضمن میں قاری کے جذبات و احساسات کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یوں بیشتر ادبی نظریہ سازی کے عمل میں یورپ میں فرانس کا کردار کلیدی رہا ہے۔ اردو نثر میں ہمہ گیر تبدیلیوں کے یہ اثرات اور نظریات و افکار، جدید حصول علم کے رجحان اور تراجم کی صورت میں منتقل ہوئے۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں بین الاقوامی مشاہیر ادب آندرے مارلو، رومین رولاں، اور میکسم گورکی کی سرکردگی میں ترقی پسند انجمن قائم ہوئی۔ جس سے سیاسی، سماجی، اور معاشی حالات کی ابتری سے ترقی پسندی کو ایک منظم صورت دے کر ادب کو معاشرے کی اصلاح و فلاح و بہبود کی جدوجہد میں ایک کارآمد حربے کے طور پر استعمال کرنے کی بناء پڑی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء ہی میں لندن میں سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی۔ جس کا منشور یہ تھا کہ جذبات کی بجائے عقل و فکر سے سماجی و سیاسی

تغیرات کو واقفیت کا آئینہ دار بنایا جائے گا۔ اس انجمن نے ہندوستان بھر میں اپنی شاخیں قائم کر لیں۔ لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے پہلے اجلاس (اپریل ۱۹۳۶ء) سے ہی اس مکتبہ فکر کو مولوی عبدالحق، پریم چند اور پنڈت جواہر لال نہرو کی حمایت ملی، جبکہ انجمن کا پہلا باقاعدہ منظم منشور لاہور میں مرتب ہوا اور اسے ڈاکٹر تاثیر، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، اور صوفی تبسم نے ابتدائی شکل دی۔[۴۸] سجاد ظہیر نے ایک اعلان نامہ جاری کیا جو ترقی پسند تحریک کا اولین اعلامیہ تھا۔

> ''اس وقت ہندوستان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔۔۔ پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست و ریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک گونہ فراریت کا شکار رہا ہے ۔۔۔ ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسندوں کی حمایت کریں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کے انداز تنقید کو فروغ دیں جس سے خاندان، مذہب، جنس، جنگ اور سماج کے بارے میں رجعت پسندی اور ماضی پرستی کے خیالات کی روک تھام کی جا سکے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں جو فرقہ پرستی، نسلی تعصب اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔۔۔ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک پیاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوتِ تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔''[۴۹]

مذکورہ اعلان نامہ کی روشنی میں ترقی پسند انجمن نے جن اصولوں کو متعین کیا وہ اردو نثر کی ترقی، ترویج اور اشاعت کو فعال بنانے میں معاون ثابت ہوئے۔

اول: تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کرنا اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

دوم: ترقی پسند مضامین لکھنے اور ان کا ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور رجعت پسند رجحانات کے خلاف جدوجہد کر کے اہل ملک کی آزادی کی کوشش کرنا۔

سوم: ترقی پذیر مصنفین کی مدد کرنا۔

چہارم: آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔[۵۰]

پہلی شق کے تحت ''ادب برائے زندگی'' از اختر حسین رائے پوری ''شعلے'' از احمد علی، ''انگارے'' (سجاد ظہیر، احمد علی، رشید جہاں، محمود الظفر کی افسانوی تحریروں کا مجموعہ) کی نگارشات مذکورہ منشور کی نقیب ٹھہریں جنھوں نے اردو نثر میں نقطہ نظر اور افسانوی مودا کی پیشکش میں علامتی، اشاراتی، جنسی اور بے باک خیالی کے نئے پہلوؤں سے آشنا کرایا۔ ترقی پسندی ہی کے زیراثر ادب کے جدلیاتی نظریے کا فروغ ہوا۔ ادب اور زندگی کے مسئلے کو ایک نئے اقتصادی پس منظر میں پیش کیا جانے لگا۔ ادب کا معیار، ادیب کا فرض اور اس کی تحریر کی خاص قدر اور اس کی خوبی اس حقیقت کو قرار دیا گیا کہ ادب اگر زندگی کا مطالعہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ دوسری شق کے تحت تراجم کے ضمن میں ترکی، روسی، فرانسیسی، انگریزی، ایرانی، جاپانی زبانوں سے کیے گئے فکشن کے ترجموں سے اردو نثر کے دامن کو مالا مال کیا گیا۔ تراجم ہی کی وجہ سے اردو فکشن میں ''عورت'' کا موضوع بہت مقبول ہوا۔ نیز فلابیر، موپساں، ہارڈی، ترگنیف، گورکی، دستوفسکی اور ٹالسٹائی کے خیالات کو اردو نثر میں متعارف کرایا گیا۔

ترقی پسند تحریک کو موضوع اور اسلوب ہر دو حوالوں سے لاہور کی ادبی فضا میں پروان چڑھانے کے لیے سجاد ظہیر نے ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر اور فیض احمد فیض کے ساتھ مل کر لاہور میں مشاہیر ادب سے مشاورتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ [۵۱] جس کے نتیجے میں لاہور میں ۱۹۳۸ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تشکیل ہوئی۔ اس انجمن میں فیض احمد فیض، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور اختر شیرانی کے علاوہ میاں افتخار الدین نے بھی تحریک کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لاہور شہر نے اس نئے ادبی منشور کو ہندوستان بھر میں پھیلانے میں مسلّمہ کردار ادا کیا۔ جس کا اعتراف خود سجاد ظہیر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''ہم میں سے کسی کو بھی یہ وہم و گمان نہیں تھا کہ لاہور کی ادب پرور زمین پر یہ وہ پہلا لغزیدہ قدم ہے جو بعد کو اردو کے کھلیان میں سنہرے خوشوں کا اتنا بڑا انبار لگا دے گا چند سال کے اندر اندر یہیں سے کرشن چندر، فیض، بیدی، احمد ندیم قاسمی، مرزا ادیب، ظہیر کاشمیری، ساحر، فکر، عارف، رہبر، اشک وغیرہ جیسے شاعروں اور ادیبوں نے ترقی پسند ادب کے علم کو اتنا اونچا کیا کہ اس کی درخشاں بلندیاں ہمارے وطن کے دوسرے حصے کے ادیبوں کے لیے قابل رشک بن گئیں۔'' [۵۲]

اس تحریک کو مذکورہ احباب کے علاوہ حمید اختر، جگن ناتھ آزاد، عبداللہ ملک، بلونت سنگھ، مخمور جالندھری، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، حفیظ جالندھری، دیویندر ستیارتھی، غلام عباس، اختر اورینوی، مولانا صلاح الدین احمد، مولانا حامد علی خان، باری علیگ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، عزیز احمد، اوپندر ناتھ اشک، شوکت صدیقی، سعادت حسن منٹو، اے حمید، مہندر ناتھ، کنہیا لال کپور، ڈاکٹر عبادت بریلوی وغیرہ نے بھی اسے اپنا تحریری مسلک بنایا۔ ترقی پسند

تحریک نے تخلیقی نثر (افسانہ، ناول، ڈراما) کے ساتھ تنقیدی نثر کے سانچے بھی مارکس، لینن، اینگلز اور گورکی ہی کے نظریات سے اخذ کیے۔ مصنفین کی تخلیقات کو جدلیاتی فلسفے اور معیار پر پرکھتے ہوئے ادبی تحریروں کا افادی تجزیہ سماجی، سیاسی اور تاریخی پس منظر میں کرنے پر زور دیا۔ اس مقصد کے لیے تنقید کا سائنٹفک طریقہ یعنی مارکسی (اشتراکی) اور سائنسی انداز اختیار کیا گیا۔ اس انداز نقد نے مارکسی فلسفے کی جزئیات کو واضح کیا۔ نیز اس سائنٹفک طریقہ تنقید نے اردو نثر کو نئے مباحث فلسفہ، تاریخ اور نفسیات وغیرہ کے علوم کے استعمال سے ادب پاروں کی تفہیم و تجزیہ اور تشریح کا ایک نیا انداز پیدا کیا۔ جس سے اردو میں تنقیدی نثر کو بے بہا فائدہ پہنچا۔ اس طرح ترقی پسند تحریک نے جہاں ایک طرف نئی سوچ کے حامل مصنفین کا وسیع حلقہ قائم کیا تو دوسری طرف تخلیقات کو جدلیاتی فلسفے پر پرکھنے کے لیے ناقدین کی ایک فعال جماعت بھی پیدا کی۔ جنھوں نے مارکسی فلسفے کی جزئیات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی جن کے بارے میں ہندوستان کے ادیبوں کا ذہن واضح نہیں تھا اور جن کو سمجھے بغیر ترقی پسند تحریک کو قدم قدم پر رکاوٹوں کا سامنا تھا۔ سجاد ظہیر (روشنائی) فیض احمد فیض (میزان) ظہیر کاشمیری (ادب کے مادی نظریے) عزیز احمد (''ترقی پسند ادب'' ''اقبال ایک نئی تشکیل'') علی سردار جعفری (ترقی پسند ادب) اختر انصاری (''افادی ادب'' ''حالی کا تنقیدی شعور'') ڈاکٹر عبادت بریلوی (اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے) سید وقار عظیم (جنھوں نے افسانے کو فن اور اسلوب بیان کے حوالے سے تنقید کا موضوع بنایا) کے علاوہ صفدر میر، ظ۔ انصاری، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر اعجاز حسین، عارف عبدالمتین، اور عابد حسن منٹو وغیرہ نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے ترقی پسند نقطہ نظر کی بھرپور وضاحت کی۔ چنانچہ مذکورہ ادباء نے مادی جدلیات کی روشنی میں ادب کے سماجی رابطے کا جائزہ لیتے ہوئے ادب اور ادیب کی حیثیت اور اہمیت کا تعین کیا۔

آغاز میں ترقی پسند ادب کی تحریک میں ماضی سے یکسر رشتہ منقطع کرنے کا رجحان نمایاں تھا۔ لیکن مذکورہ بالا ادباء میں ایسے ادیب بھی تھے جنھوں نے اشتراکیت کے بارے میں اعتدال اور توازن سے کام لیتے ہوئے ادب میں نئی جہات دریافت کیں۔ ترقی پسند تحریک نے ادب اور زندگی کا رشتہ استوار کرنے کی بھرپور کوشش کی جس سے ادب میں یکسانیت اور بے رنگی بھی پیدا ہوئی۔ اس طرح کے انتہا پسندوں کے باعث ترقی پسند تحریک کی بنیادیں کمزور ہونے لگیں اور ادب پر سیاست غالب آنا شروع ہو گئی۔ مادیت پرستی کے باعث ادب میں روحانی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کا فروغ رک گیا۔ اس کے باوجود ترقی پسند ایک جامع تحریک تھی کہ اس کے پس پشت ایک واضح مقصد تھا۔ چنانچہ اس نے نہ صرف ادب میں مختلف مباحث پیدا کیے بلکہ زندگی پر اثر انداز ہونے کی بھی کوشش کی۔ اس اعتبار سے دیکھیں تو اردو نثر کے ارتقا میں ترقی پسند مصنفین کا نمایاں حصہ ہے۔

لاہور میں اپنی ابتدا سے ۱۹۴۷ء تک اردو نثر میں ترقی پسندانہ اثرات کو ''ہمایوں'' ''ادبی دنیا'' ''ادب لطیف'' ''سویرا'' ''نقوش'' ''لیل ونہار'' ''نظام'' ''جاوید'' اور ''سحر'' جیسے رسائل نے بھی فروغ دیا۔ ان رسائل نے ترقی پسندی کے موضوع اور اسلوب ہر دو سطح پر اردو نثر پر اچھا اثر ڈالا اور اسے مزید وسعت سے ہمکنار کیا۔ مزید برآں چودھری برکت علی نے ''مکتبہ ادارہ اردو'' بالخصوص ترقی پسند ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے قائم کیا۔ اس طرح ترقی پسند تحریک کے لیے لاہور ایک بڑا اشاعتی مرکز بھی بن گیا۔ ترقی پسندی کے اس دور میں بھی رومانویت کی جھلک بدستور ''ادب لطیف'' کے صفحات پر دکھائی دیتی ہے۔ جو خالصتاً ترقی پسندوں کا نمائندہ رسالہ تھا۔ قیام پاکستان سے قبل ترقی پسند تحریک انتظامی سے زیادہ انفرادی سطح پر زیادہ کارفرما رہی۔ جبکہ انتظامی سطح پر باقاعدگی عبداللہ ملک کی نظامت (۱۹۴۴ء) میں ملی۔ جسے سجاد ظہیر نے بھی سراہا کہ ''اب پنجاب میں ہماری تحریک تنظیم و وسعت ادبی تخلیق اور ترقی پسند رسالوں اور کتابوں کی طباعت و اشاعت کے لحاظ سے دن بدن ترقی پذیر تھی۔''۵۳ مجموعی طور پر دیکھیں تو ترقی پسند تحریک محض ایک ادبی تحریک ہی نہیں بلکہ سیاسی تنظیم بھی تھی جس کا مقصد ادب کے حوالے سے محکوم ہندوستان کی معاشی اور سیاسی آزادی کی جدوجہد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حب الوطنی، سامراج دشمنی، انسان و مزدور دوستی اور سیاسی و معاشی آزادی کے موضوعات ترقی پسند مصنفین میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے تھے۔ تقسیم ملک اور فسادات کے نتیجہ میں نئے ملکی حالات کے پیش نظر ترقی پسند تحریک کے انتہا پسند عناصر نے لاہور میں ۱۹۴۹ء میں پہلی کانفرنس میں ایک قرارداد کی صورت تمام سرکاری و نیم سرکاری جرائد، ریڈیو اور اس نوع کے دیگر اداروں سے قلمی رابطہ منقطع کرنے اور غیر ترقی پسند ادیبوں پر اپنے پرچوں کے دروازے بند کرنے کا جارحانہ لائحہ عمل مرتب کیا۔۵۴ جس سے جماعت اور اعتدال پسند ترقی پسند مصنفین کو نقصان پہنچا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء ۵۵ میں جب کیمونسٹ پارٹی پر پابندی لگائی گئی تو تحریک کو بھی خلاف قانون قرار دے کر اس کی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی۔ یوں انجمن ترقی پسند تحریک کا شیرازہ بکھر گیا۔

لاہور شہر کی فضا سیاسی، سماجی اور ادبی سطح پر رونما ہونے والے نت نئے فکری خیالات و نظریات کو پروان چڑھانے کے لیے ہمیشہ سازگار رہی ہے۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں اس کا اظہار ''ادب برائے زندگی'' کے نظریے کے تحت ترقی پسند تحریک کی صورت میں رونما ہوا تو دوسری جانب اس تحریک کی انتہا پسندی سے نالاں، نامتفق یا غیر وابستہ ''ادب برائے ادب'' کے نظریے کے حامل احباب نے اپنے لیے ایک الگ پلیٹ فارم، ''حلقہ ارباب ذوق'' کی صورت میں ۱۹ اپریل ۱۹۳۹ء کو ''بزم داستان گویاں''۵۶ کے نام سے قائم کیا۔ جو جدید ادبی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

"جس نے سماجی جمود کے بجائے ادبی انجماد کو توڑنے کی کوشش کی اور نہ صرف زندگی کے خارج کو مناسب اہمیت دی بلکہ انسان کے داخل کی پراسرار آواز کو بھی گوش ہوش سنا۔۔۔ بیشتر رومانوی تحریک کے ان اثرات کو قبول کیا جو فرد کو زندگی کی مادی آلائشوں سے بلند ہونے اور متخیلّہ کی گھمبیر گہرائیوں سے انکشاف ذات اور عرفان حیات پر مائل کرتے ہیں۔"۵۷

بزم داستن گویاں کے پہلے جلسہ میں نسیم حجازی، تابش صدیقی، محمد فاضل، اقبال احمد، محمد سعید، عبدالغنی اور شیر محمد اختر شامل ہوئے۔ نسیم حجازی نے طبعزاد افسانہ "تلافی" پیش کیا۔۵۸ حلقہ کے ہفتہ وار جلسوں میں شاعری اور افسانے پڑھے جاتے اور ان پر تنقید کی جاتی۔ یوں اردو نثر میں "انجمن پنجاب" کے تسلسل میں جدید مجلسی تنقید کی روایت کو بھی حلقہ ارباب ذوق نے قائم رکھا۔ رفتہ رفتہ شعرا کی تعداد افسانہ نگاروں پر غالب آ گئی تو یکم اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اجلاس میں اس کا نام "حلقہ ارباب ذوق" رکھ دیا گیا۔۵۹ جس کے اغراض و مقاصد قیوم نظر نے اس طرح بیان کیے ہیں:

اول: اردو زبان کی ترویج و اشاعت

دوم: نوجوان لکھنے والوں کی تعلیم وتفریح

سوم: اردو لکھنے والوں کے حقوق کی حفاظت

چہارم: تنقید ادب میں خلوص اور بے تکلفی پیدا کرنا

پنجم: اردو ادب وصحافت کے ناسازگار ماحول کو صاف کرنا۔۶۰

مذکورہ مقاصد کے پیش نظر ابتدا میں "حلقہ ارباب ذوق" ایک مخصوص حلقہ تھا لیکن ۱۹۴۰ء میں میرا جی کی شمولیت نے اسے صحیح معنوں میں تقویت بخشی اور اس کے دائرہ کار کو وسعت ملی۔ میرا جی، انگریزی، فرانسیسی شعرا (بودیئر، ڈمس، نطشے) کے مطالعے اور مشرقی ادب پر گہری نگاہ اور تنقیدی تجزیے کے باعث حلقے پر چھا گئے۔ میرا جی نے حلقہ ارباب ذوق کے ذریعے جس عملی تنقید کو ابھارا اس میں تین خصوصیات تجزیاتی انداز، نفسیاتی نقطہ نگاہ اور جمالیاتی پرکھ کو معیار بنایا جاتا۔ اس طرح دیکھا جائے تو حلقہ نے اردو نثر کو دو بنیادی نقطہ نظر دیئے۔ اول ادب برائے ادب اور دوم نفسیاتی انداز نقد، جو ایسے عوامل کے مطالعے میں مدد دیتی جو کسی فنکار کی شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں۔ فرائڈ، یونگ اور ایڈلر وغیرہ کے نظریات اس میں اساسی کردار ادا کرتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق نے پہلی بار باقاعدہ نفسیاتی انداز نقد کو رواج دیا جو کہ ادب اور ادیب کو ایک بالکل مختلف زاویہ نگاہ سے پرکھتا ہے۔ تنقیدی نثر میں یہ انداز نقد حلقہ کی بہت بڑی دین ہے۔ اس سے قبل ترقی پسند، مارکسی، عمرانی، تاثراتی یا جمالیاتی

انداز نقد تو استعمال کیے جاتے رہے لیکن علم نفسیات کو تنقیدی اور تخلیقی سطح پر برتنے کے سلیقہ کو حلقہ ارباب ذوق نے ہی مقبول بنایا۔ ادب میں نفسیاتی تنقید کی بنیاد داخلیت، انفرادیت اور نفسیاتی کیفیات پر استوار ہوئی ہے جہاں ادیب کے ذہن اور اس کے محرکات سے دلچسپی لی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ فنکار کے ذہن میں مرتب ہونے والے خارجی اثرات سے زیادہ تخلیق پر مرتب ہونے والی مصنف کی داخلی نفسیاتی کیفیتوں کی چھان بین کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔ اس کے تحت نقاد فن پارے کے مطالعے کے ذریعے مصنف کے ذہن تک رسائی حاصل کر کے تخلیق کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے کہ فنی تخلیق میں وہ کون سے احساسات کارفرما رہے ہیں جن کے نتیجے میں تخلیق وجود میں آئی۔ یوں نفسیاتی ناقدین فن پارے میں مضمر فنکار کے نفسی کوائف کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ تخلیق کار کی نجی زندگی اور اس کی شخصیت کو سمجھے بغیر تخلیق کی صحیح تفہیم ممکن نہیں اس لیے تخلیق کار کی شخصیت کو صرف نفسیات ہی کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے۔ لہٰذا یہاں علم نفسیات نقاد کی رہنمائی کرتا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھیں تو نفسیاتی تنقید بیک وقت دو مقاصد سرانجام دیتی ہے۔ ایک تخلیق کار کی شخصیت کی نفسیاتی ساخت سے بحث کرتے ہوئے اس کے ذہن، شخصیت اور تخلیقی عمل کا جائزہ لیتی ہے اور دوسرے فنکار کی تخلیقات اور اس کی روشنی میں تشریح وتحلیل کا کام کرتی ہے۔ نفسیات کا علم تین بڑے نفسیات دانوں کے تصورات پر استوار سمجھا جاتا ہے۔ فرائیڈ جس کی تحلیل نفسی کی بنیاد لاشعور ہے اور یونگ کی نفسیات اجتماعی لاشعور پر مبنی ہے جبکہ ایڈلر کا تصور نفسیات احساس برتری اور احساس کمتری پر مشتمل ہے۔

ان تینوں کے نظریات نے مل کر جدید نفسیاتی تنقید کے دبستان کی تشکیل کی۔ حلقہ ارباب ذوق میں ادب پر تحلیل نفسی کے تصور کا زیادہ اثر پڑا اور اس کی اہمیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ اس سے ادب میں افسانے، ناول اور ڈرامے میں مواد اور طریق کار دونوں پر واضح اثر پڑا۔ اس سے قبل ہم نفسیات کے اثرات بیسویں صدی کے اوائل میں مرزا سعید دہلوی کے ہاں ناول ''خواب ہستی'' کی صورت میں ملتے ہیں لیکن اس رجحان کو باقاعدگی میراجی نے دی۔ جنہوں نے فرائیڈ کی تحلیل نفسی کی روشنی میں شعرا کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔ ان کے یہ تنقیدی مضامین بعد ازاں ''مغرب ومشرق کے نغمے'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ یوں میراجی نے نفسیاتی تنقید کی باقاعدہ داغ بیل ڈالی اور اردو ادب سب سے پہلے جس ماہر نفسیات سے روشناس ہوا وہ فرائیڈ تھا۔ میراجی کے علاوہ ریاض احمد نے تنقید کے علاوہ شاعری میں بھی آزاد تلازم خیال کے حوالے سے نفسیات کے مطالعے سے کام لیا۔ ڈاکٹر اجمل نے ''تحلیلی نفسیات'' میں یونگ کے نقطہ نظر کی روشنی میں ادبیات کے بارے میں کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ افسانے میں سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، شیر محمد اختر، عزیز احمد، رحمان مذنب، ڈاکٹر سلیم اختر نے افسانوں

اور تنقید میں علم نفسیات سے مدد لی۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو نفسیات سے جدید اردو ادب نے نظری تنقید میں کم اور عملی تنقید سے حتی المقدور استفادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں ایڈلر اور میک ڈوگل کی نسبت فرائیڈ اور یونگ کے نظریات زیادہ مقبول رہے۔ جن میں قیام پاکستان سے قبل میرا جی کے علاوہ اختر اوریںوی، رفیع الزماں خاں، مظہر عزیز، وجیہ الدین، شمشاد عثمانی جبکہ قیام پاکستان کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی، محمد حسن عسکری، ریاض احمد، سلیم احمد، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر محمد اجمل، سجاد باقر رضوی، علی عباس جلال پوری، ڈاکٹر آفتاب احمد خان، محمد موسیٰ کلیم اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ شامل ہیں۔ مذکورہ احباب میں بعض ایسے بھی ہیں جنھوں نے خود کو محض نفسیاتی تنقید کے لیے وقف نہیں کیا بلکہ ادب وفن تفہیم کے تجزیے کے لیے حسب ضرورت علم نفسیات سے مدد لی۔ اگر اردو تنقید کے تنقیدی دبستان پر نظر ڈالیں تو ترقی پسند اور عمرانی تنقید کے بعد جس تنقید انداز تنقید نے ناقدین کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ نفسیاتی تنقید ہے۔ موجودہ دور میں بھی اس کی اہمیت مسلّم ہے۔

میرا جی جوفنی، جمالیاتی اور نفسیاتی نظریہ ادب کے قائل تھے انھوں نے نہ صرف اس ضمن میں نظریہ سازی کی بلکہ عملی اطلاق ''(اس نظم میں'') کی مثالیں بھی قائم کیں۔ ان کی شخصیت اور نظریہ ادب کا حلقہ پر اس قدر اثر ہوا کہ ان کے نظریے کو ہی حلقے کا نظریہ خیال کیا جانے لگا۔ ان کی سرکردگی میں حلقے کی فعالیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ۱۸ مئی ۱۹۴۱ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک حلقے کی کل ۱۴۱ اجلاس ہوئے اور ان جلسوں میں ۲۱ افسانے، ۱۹ مقالے، ۲ ڈرامے، ۱۱۱ انشائے لطیف اور ۶۸ غزلیں اور نظمیں پڑھی گئیں۔''[۱۱] حلقہ ارباب ذوق پر میرا جی کی شخصیت اور نظریہ ادب کی چھاپ ضرور ہے لیکن اس میں تعصب نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حلقہ میں ہر فکر و ذہن کا ادیب شریک ہوا کرتا تھا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں: ''یہ ایک اوپن پلیٹ فارم ہے جہاں پر ذہن کا قلم کار تخلیق پیش کرسکتا ہے بحث کرسکتا ہے اور جمہوری طریقے سے اس میں فعال کردار ادا کرسکتا ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔''[۱۲] حلقہ کی یہی خاصیت ترقی پسندوں کے لیے بھی کشش کا باعث بنی۔ چنانچہ کرشن چندر، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی، مہندر ناتھ، احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ اشک، دیویندر ستیارتھی، سعادت حسن منٹو، صفدر میر، کنہیا لال کپور، ظہیر کاشمیری، عارف عبدالمتین، وغیرہ بھی اپنی تخلیقات کے ساتھ شریک ہوتے رہے۔ حلقہ کی وسیع القلبی ہی اس کی وسیع المشربی اور مقبولیت کی ضامن بنی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدا ہی سے ہر مکتبہ فکر کا ادیب اس کے جلسوں کی رونق بڑھاتا رہا ہے۔ مثلاً ۱۹۴۱-۱۹۴۲ء میں مذکورہ احباب اس کے ہفتہ وار اجلاس کی صدارت کرتے نظر آتے ہیں۔ جن میں 'ایم ڈی تاثیر، پروفیسر حمید احمد خان، تاجور نجیب آبادی، سید عابد علی عابد، فیاض محمود، میاں

بشیر احمد، صلاح الدین احمد، سید امتیاز علی تاج، رفیع پیر، حامد علی خان، سید نذیر نیازی، پنڈت ہری چند اختر، صوفی تبسم، تصدق حسین خالد، دیویندر ستیارتھی، راجندر سنگھ بیدی، عاشق حسین بٹالوی، پروفیسر موہن سنگھ دیوانہ، ڈاکٹر محمد باقر، حفیظ ہوشیارپوری، قیوم نظر، آفتاب احمد، صفدر میر، آغا بابر، یوسف ظفر، نذیر احمد مرغوب، کنہیالال کپور، رفیق خاور، عبدالمجید بھٹی، میرا جی۔''۹۳ وغیرہ شامل تھے

میرا جی کے بعد حسن عسکری نے اردو نثر کو مغربی خیالات ونظریات سے روشناس کرانے میں فعال کردار ادا کیا۔ اس کی گونج ان ناقدین کے ہاں سنائی دیتی ہے جو انگریزی علوم سے بہرور تھے۔ ان کی موجودگی میں ''حلقہ نے نئے ادب کو ہمدردی سے سمجھنے اور پرکھنے کے لیے سازگار ماحول مہیا کیا اس نے جس قسم کی آزادانہ بحث وتمحیص اور تنقید وتبصرے کو رواج دیا وہی نئے طرز فکر واحساس کی حدود متعین کرنے اور ادب میں نئے معیار قائم کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔''۹۴ جس نے اردو فکشن میں موضوع، ہیئت اور تکنیک کے نئے تجربات اور جدید تنقیدی خیالات کی حوصلہ افزائی کی۔ جدید اذہان کے احساس اور فکروخیال کو پروان چڑھا کر یہ احساس دلایا کہ ادیب زندگی کے کسی بھی پہلو (داخلی، خارجی، روحانی، نفسیاتی، حقیقی یا ماورائی) کو موضوع بنا سکتا ہے۔ نیز فن کے لیے فنی لوازم ناگزیر ہوتے ہیں۔ اگرچہ کسی بھی تحریر کی فکری حیثیت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا لیکن فنی لوازم کے بغیر اس کو فن پارے کا درجہ بھی نہیں دیا جا سکتا۔ جبکہ ترقی پسند تحریک کے تحت ادیب پر سماجی و معاشرتی انقلابی مقصدیت کی قید تھی۔ حلقہ ارباب ذوق اس قید سے بالکل آزاد تھا کیونکہ آزادی فکر ہی اس کی بنیاد تھی۔ اس مکتبہ فکر سے وابستہ ادباء کی افسانوی تحریریں اس کی غماز ہیں۔ مثلاً گرہن (راجندر سنگھ بیدی)، ''ننگی آوازیں''، ''خالد میاں''، ''بسم اللہ''، ''خودفریب''، ''مرلی دھرن''، ''۱۹۱۹ء کی ایک رات'' ''تین گولے''، ''موذیل''، ''صاحب کرامات''، ''سرکنڈوں کے پیچھے''، ''عزت ناموس''، ''فرشتہ''، ''دودھا پہلوان'' ''بابو گوپی ناتھ''، ''ممی''، ''بادشاہت کا خاتمہ''، ''ممید کا ماضی''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' (سعادت حسن منٹو) ''کنکری''، ''شہر افسوس''، ''آخری آدمی'' (انتظار حسین) ''جزیرے''، ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' (محمد حسن عسکری) ''ننگا پاؤں'' (شیر محمد اختر) ''نروان''، ''کچے دھاگے''، ''چونے کی کلھیا''، ''چاک داماں تک'' (امجد الطاف) ''اجلے پھول''، ''شب خون''، ''امی''، ''گڈریا''، ''گالو''، ''بتاشے'' (اشفاق احمد) سوزِ ناتمام (عاشق حسین بٹالوی) ''چاک گریباں''، ''اڑن طشتریاں''، ''لب گویا''، ''پھول کی کوئی قیمت نہیں''، ''باجی ولایت''، ''رات والے''، ''گلاب دین چھٹی رساں''، ''تعجب''، ''چارلس ہیجڑا'' (آغا بابر) ''بارہ من کی دھوبن''، ''گرل فرینڈ''، ''کینچلی''، ''تاج نہیں مانگتی'' (اعجاز حسین بٹالوی) ''نفسانے''، ''ماں جی''، ''دورنگا''، ''تلاش''، ''سردار جسونت سنگھ''، ''عائشہ آ گئی''، ''پری محل'' (قدرت اللہ

شہاب) ''چیپ''، ''احسان علی'' ''کھونٹ والا بابا''، ''سوپور کی کھڑکی''، ''جوار بھاٹا''، ''لیکن''، ''دودھیا سویرا'' (ممتاز مفتی) ''یہ قربتیں یہ فاصلے سے''، ''زبان بے زبانی''، (صلاح الدین اکبر) ''آپا''، لنگر العل''، ''بیاہ بدھ''، ''اینٹ کا چہرہ''، ''نیا سوئمبر (غلام علی چودھری) ''چڑھتا سورج''، ''گوری گلاباں''، باسی گلی''، ''تیلی جان''، ''لال چوبارہ'' (رحمان مذنب) ''دکھوں کا بیوپاری''، ''جھنور''، ''بیر بہوٹی''، ''سون گڑیا'' (الطاف فاطمہ) ''اندھیرا خواب'' (حجاب امتیاز) ''دیوار اور دروازہ''، ''سب سے پرانی کہانی''، ''دوب ہوا اور لہجا'' (ڈاکٹر انور سجاد) ''شرابی''، ''تیند کے ماتے''، ''ہوا کی موج میں محبت''، ''شہر کے لوگ''، ''آرسی'' (فرخندہ لودھی) ''شہر آشوب''، ''چھوٹا سائل''، ''چیونٹی کا قاتل'' (سید قاسم محمود)۔ مذکورہ افسانوی تحریروں نے فکشن میں موضوع ہیئت اور تکنیک (شعور کی رو، تجسیم، تجرید، علامت، آزاد تلازمہ خیال، خود کلامی) کے نئے تجربات کیے۔ نیز تاریخ و تہذیب، فلسفہ عصری رویوں اور انسانی نفسیات کے حوالے سے منفرد تحریریں وجود میں آئیں۔

یہی وہ دور تھا جب سماجی اور طبقاتی حقیقت نگاری کے ساتھ فطرت نگاری اور نفسیاتی حقیقت نگاری کے رجحان کا چلن بھی عام ہوا۔ جو بالخصوص اردو فکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حقیقت نگاری کے معنی تو یہ تھے کہ ادب میں حقائق کو اس طرح پیش کیا جائے جیسے کہ وہ حقیقت میں ہوتے ہیں یہ حقائق چاہے تلخ اور ناخوشگوار ہی کیوں نہ ہوں جبکہ فطرت نگاری حقیقت نگاری سے ایک درجہ آگے کی چیز ہے۔ بقول عزیز احمد ''فطرت نگاری --- دراصل حقیقت نگاری کا منطقی ارتقا ہے۔ فطرت نگاری حقیقت نگاری کی وہ قسم ہے جو زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنا چاہتی ہے جن کو روایتی روحانیت نے عمداً فراموش کر دیا تھا۔ وہ عقلی ثبوتیت کو ادب پر منطبق کرنا چاہتی ہے''۔[۲۵] فطرت نگاروں کے خیال میں چونکہ حقیقت نگار زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش نہیں کرتے اس لیے ان کی کوشش یہ تھی کہ زندگی سے متعلق ہر بات پیش کی جائے۔ فطرت نگاروں کا حقیقت نگاروں پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ زندگی کے ناخوشگوار، بدصورت اور مذموم پہلوؤں کی عکاسی میں ناکام رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فطرت نگار انسانی فطرت کے اعلیٰ پہلوؤں کی مصوری نہیں کرتے بلکہ زندگی کے برے اور بدصورت پہلوؤں پر اتنا زور دیتے ہیں کہ اکثر اوقات اس کے اچھے پہلو نظر انداز ہو کر زندگی ایک بدصورت اور ناخوشگوار حقیقت کا روپ دھار لیتی ہے جو خود فطرت نگاری کے اس رجحان کی خامی ہے۔

فطرت نگاری پر مارکس اور فرائیڈ کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ مارکس کے اثر کے معنی یہ کہ انسان کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ وہ سماجی ارتقا کا ایک جزو ہے جبکہ فرائیڈ کے اثر کے معنی یہ ہیں کہ انسان زیادہ تر اپنے شعور کے زیر اثر رہتا ہے اور یہ کہ زندگی انفرادی نشوونما اور مسرت پر المناک پابندیاں عائد کرتی ہے۔ غرض علم

نفسیات کے مختلف تصورات مغربی فکشن نگاروں ڈی ایچ لارنس، مارسل پروست، گستاف فلاپیر، گون کور، ایملی زولا، چیخوف، موپساں، جیمز جوائس کی تحریروں کی خاصیت بنتے ہیں۔ جن کے ہاں لاشعوری محرکات کی حامل کیفیات، جنسی ونفسیاتی الجھنیں، تحلیل نفسی، آزاد تلازمہ خیال، خود کلامی، خوابوں کا بیان، تخیلی فضا، اشاریت، تاثریت، شعور کی رو، علامتی پیرایہ اظہار، سرریلی انداز اور وجودیت کے میلانات پائے جاتے ہیں۔ تراجم ہی کی مرہونِ منت اردو نثر بالخصوص فکشن میں ان رجحانات سے آگاہی ہوئی۔ جیسے جیسے مذکورہ احباب کا مطالعہ اردو ادب میں عام ہوا ویسے ویسے ان کے اثرات و میلانات فکشن میں راہ پاتے چلے گئے۔ جس سے اردو فکشن کو موضوعاتی، فنی، فکری، تکنیکی اور اسلوبیاتی زاویوں سے بے حد فائدہ پہنچا۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے حامیوں نے اپنی اپنی سوچ اور استطاعت کے مطابق حسب ضرورت ان سے استفادہ کیا۔ یوں تو اس کا آغاز ''انگارے'' کی تحریروں سے ہو چکا تھا جس نے نئی تکنیک، موضوع اور ہیئت کو متعارف کرایا لیکن فطرت نگاری کے ضمن میں سعادت حسن منٹو کا نام سرفہرست ہے کیونکہ ''اس نے زندگی کے جن مریضانہ، کج رویا، گندے پہلوؤں کو لیا ان کی ویسی ہی تصویریں پیش کیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے زبان اور تشبیہات سے بہت کام لیا اس کے افسانے پڑھ کر بعض اوقات منہ پر جو تھپڑ پڑنے کا احساس ہوتا ہے تو اس وجہ بھی یہی ہے کہ انسان اپنی تمام خباثتوں، آلائشوں اور مکاریوں کے ساتھ ننگا نظر آتا ہے اور اسی سے اس نے انسانی فطرت کا حسن بے نقاب کیا ہے۔''[۲۹] سعادت حسین منٹو نے یہ اثرات میکسم گورکی، سامرسٹ ماہم اور موپساں سے لیے ہیں۔ جو ان کے افسانوں ''دھواں''، ''بلاؤز''، ''پھاہا''، ''کالی شلوار''، سرکنڈوں کے پیچھے''، ''لذت سنگ''، ''چغد''، ''ٹھنڈا گوشت''، ''یزید''، ''سڑک کے کنارے''، ''نمرود کی خدائی''، ''کھول دو''، ''موذیل''، وغیرہ میں واضح دکھائی دیتے ہیں۔ ہر چند کہ اردو نثر میں فطرت نگاری کی کوئی باقاعدہ تحریک نہیں چلی اور نہ ہی فطرت نگاری کے بنیادی مفروضات ونظریات کو سامنے رکھ کر ادب تخلیق کرنے کی کوشش کی گئی تاہم ادب میں کہیں کہیں فطرت نگاری کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ خصوصاً فکشن میں نفسیات کے مختلف تصورات اور فطرت نگاری کا رویہ منٹو کے علاوہ راجندر سنگھ بیدی (''اپنے دکھ مجھے دے دو''، ''متھن''، ''ببل''، ''لاجونتی''، ''گرہن''، ''کوکھ جلی''، ''ورشی''، ''ترمنیں سے پرے''، ''گرم کوٹ''، ''دیوالہ اغواء''، ''گھر میں بازار میں''، ''زین العابدین'') کرشن چندر (''گرجن کی شام''، ''ویکسی نیٹر''، ''جنت اور جہنم''، ''بچپن'') حسن عسکری (''پھسلن''، ''حرامجادی''، ''چائے کی پیالی'') اختر انصاری (''اندھی دنیا''، ''نازوخونی''، ''لو ایک قصہ سنو'') ممتاز مفتی (''آپا''، ''کورا''، ''باجی''، ''جھکی جھکی''، ''آنکھیں''، ''چپ''، ''ان کہی''، ''جوار بھاٹا''، ''سمیع و اسارہ''، ''بیگم اور ٹیار'' ''ماتھے کا تل'' ''بدمعاش''، ''چٹ'') انتظار حسین (''آخری آدمی''، ''کشتی''

،''دیوار''،'' کھوے'') قدرت اللہ شہاب (''یا خدا''، ''گوراں''، ''پہلی تنخواہ'') عزیز احمد (''خطرناک پگڈنڈی''، ''ممولشکا''، ''مدن سینا اور صدیاں'') رحمان مذنب (''چڑھتا سورج''، ''تیلی جان''، ''باسی گلی''، ''لال چوبارہ''، ''گوری گلاباں'') امجد الطاف (''کچے دھاگے''، ''چونے کی کلاہیا'') صلاح الدین اکبر (''یہ قربتیں یہ فاصلے''، ''زبان بے زبانی'') ڈاکٹر سلیم اختر (''بکری''، ''دو سپارے''، ''پابندی وقت'') ڈاکٹر انور سجاد (''منڈریلا''، ''پرومیتھیس''، ''پتھر لہو کتا'') دیویندر ستیارتھی ((''گائے جا ہندوستان'') کے علاوہ اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، فیاض محمود، بلونت سنگھ، شیر محمد اختر اور غلام عباس اور نے بھی خفی یا جلی انداز میں نفسیاتی و جنسی کشاکش اور تحلیل نفسی کے مختلف پہلوؤں کو اپنی تحریروں میں برتا۔

اردو فکشن کے ساتھ اردو تنقید کو بھی حلقہ ارباب ذوق نے جدید علوم کی روشنی میں موضوع اور اسلوب کے حوالے سے نظری اور عملی سطح پر جلا بخشی جس کا اندازہ حلقہ میں پڑھے گئے ان مقالات سے لگایا جا سکتا ہے۔ نئی شاعری کی بنیادیں (میرا جی) ''قدیم اردو'' (حافظ محمود شیرانی) ''روایت کیا ہے؟''،''فن برائے فن'' (حسن عسکری) ''کرشن چندر کے افسانے''، ''پرانی نسل کے خلاف ردعمل''، ''پاکستان کا نیا ادب''، ''اردو ناٹک کی ایک سکیم'' (انتظار حسین) ''بستانِ حکمت پر ایک نظر''، ''پریم چند کا مقصد ناولوں کے آئینے میں''، ''غالب کی تنہائی''، ''غالب اور ہمارا عہد''، (سجاد باقر رضوی) ''پاک و ہند کی کلاسیکی موسیقی کا ثقافتی مزاج اور امیر خسروؒ''، (سید عابد علی عابد) ''نئی نظم کے بنیادی اصول''، ''بے زبان قوم''، ''تنقید کے نئے پہلو'' (الطاف گوہر) ''ہمارا ادب تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے بعد'' ''غالب خطوط کے آئینے میں''، ''غالب کا غم''، ''ادیب اور معاشیات''، ''غزل اور تنقید'' (ڈاکٹر آفتاب احمد خان) ''لکھنوی دبستان شاعری کا تاریخی پس منظر''، ''اندر سبھا امانت''، ''اندر سبھا کے مآخذ''، ''امانت لکھنوی کی زندگی اور اس کا ماحول''، ''اندر سبھا سے پہلے ڈرامے کا مطالعہ'' (قیوم نظر) ''جدید اُردو شاعری''، ''جدید ایرانی شاعری کا ادبی و سیاسی پس منظر'' (ن م راشد) ''شیکسپیئر کے ڈراموں میں عورت کا کردار''، ''سائنسی تنقید''، ''تخلیقی عمل'' (صدیق کلیم) ''تنقید کی آزادی''، ''فیض کی میزان''، ''نئی اور پرانی نسل''، ''اردو افسانے کے نقاد'' (مظفر علی سید) ''اسلامی تہذیب اور ضمیات''، ''ادب اور قومی شخصیت''، ''ادب میں اسلام کا حصہ''، ''ادب اور بنیادی انسانی اقدار''، ''عجمی شعری روایت'' (جیلانی کامران) ''فن کی ولادت'' (حنیف رامے) ''لفظ اور خیال کا رشتہ'' ''ادب اور جمالیات''، ''اقبال کا تصور فن''، ''سرسید کا دبستان تنقید''، ''روایت اور جدید اردو شاعری''، ''علم معانی و بیان''، ''اقدار کا مسئلہ''، جدید اردو تنقید'' (ریاض احمد) جرمن شاعر فراسو کی مثنوی، ''عشق افزاء''، ''اردو اور علاقائی زبانیں'' (ڈاکٹر محمد باقر) ''غالب کے خطوط'' (حمید احمد خان) ''اردو ادب میں قدیم اصطلاحیں''، ''غالب کا

نظریہ شعر''، ''اردو تنقید غدر سے پہلے''، ''اردو زبان اور اس کے مسائل'' (ڈاکٹر وحید قریشی) ''خلل اعصاب کی جنسی وجہ جواز''، ''بچوں کی نفسیات'' (اختر علاؤ الدین)، ''اردو شاعری میں تجربات'' (احمد سعید قریشی) ''ڈرامے کے رجحانات''، ''ڈرامے کے امکانات''، ''سٹیج ڈراما کا ارتقا''، ''پاکستان میں اسٹیج ڈراما کا مستقبل''، ''جدید شاعری کا اوائلی دور'' (اصغر بٹ) ''اقبال میں نرگسی الجھاؤ''، ''مارکسیانی نظریہ ادب''، ''نیا شوالہ''، ''سائنس اور شاعری''، ''شاعری اور معانی'' (حزب اللہ) ''شعر کی تفہیم''، ''یوسف ظفر زنداں میں''، ''قیوم نظر کی شاعری میں بنی آدم'' (رفیق احمد) ''اردو شاعری اور مرثیہ''، ''اردو ناول میں طوائف کا کردار''، ''اردو پر تقسیم ملک کا اثر'' (صلاح الدین احمد) ''جدید ادب میں تکنیک'' (طالب کور بچن سنگھ) ''اردو نثر کا سماجی پس منظر''، ''ادب اور معاشرہ''، ''تنقید کے مادی اصول''، ''ادب اور فرقہ وارانہ جنگ'' (ظہیر کاشمیری)، ''فارسی ڈراما نگاری'' (عبدالحمید) پطرس کی مزاح نگاری (کنہیالال کپور) ''عروض میں ترمیم کی ضرورت'' (انجم رومانی) ''باغ و بہار و فسانہ عجائب کا قصہ'' (سید وقار عظیم) ''ترقی پسند ادب کا انحطاط''، ''اسلامی ادب اور اقبال''، ''یونان میں کھیلوں کا رواج''، ''زوال ادب'' (رحمان مذنب) ''نفسیات کی چولی تعلیم کا دامن''، ''حقیقت کے روبرو'' (ریکس سموئیل)، ''تحلیل نفسی''، ''نفسیات ہی کیوں'' (سید ورث بیدی) ''ادب میں مجرمانہ تشخص'' (مختار صدیقی) ''اقبال اور تقابل عقل وجدان'' (علی عباس جلالپوری) ''ہماری قومی زندگی اور ادیب'' (فتح محمد ملک) ''انشائے لطیف کیا ہے'' (ڈاکٹر وزیر آغا) وغیرہ کے علاوہ حلقہ نے ''نئی تحریریں'' کے عنوان سے ایک رسالہ کا اجراء بھی کیا۔ جس میں دیگر زبانوں کے اہم نظریاتی مضامین کے تراجم نمایاں طور پر شائع کیے جاتے تھے۔ مثلاً ''ایلیٹ کا مضمون''، ''شاعری کی تین آوازیں'' (مترجم ن م راشد) پال ویری کا مضمون ''شاعری اور فکر مجرد'' (مترجم حسن عسکری) سینٹ بیو کا مضمون ''کلاسیک کیا ہے'' (مترجم غلام یعقوب انور) لائنل ٹرلنگ کا مضمون ''ادب اور فرائڈ'' (مترجم سید امجد الطاف) زینو سیوریٹی کا مضمون ''مارکیست اور فن'' (مترجم سجاد باقر رضوی) چنانچہ ایسے ہی مضامین کی وجہ سے اردو نثر میں نئے خیالات کی ترسیل کا سلسلہ متحرک رہا۔ ''حلقہ ارباب ذوق'' کے جلسوں میں پیش کیے جانے والے تنقیدی مقالات کے ساتھ متنوع ادبی مباحث ۷۶؎ جس میں تمام مشاہیر اور مبتدیانِ ادب بشمول ترقی پسند شرکت کیا کرتے جو اردو نثر بالخصوص تخلیق و تنقید کے لیے نہایت سودمند ثابت ہوئے۔ جن کی بازگشت بیسویں صدی کی تخلیقات میں صاف سنائی دیتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد جہاں تخلیقی ادب کا موضوع ہجرت اور فرقہ وارانہ فسادات تھے وہیں یہ تنقیدی بحث بھی اٹھائی گئی کہ فسادات کے متعلق ادب کیسا ادب ہے؟ چونکہ ہندوستان میں بھی اسی طرح کا ادب تخلیق کیا جا رہا تھا اس لیے یہ سوال بھی زیر بحث آیا کہ فسادات سے متعلق پاکستانی اور ہندوستانی نقطہ نظر کیا ہے؟ فسادات کی

تصویر کشی کرتے وقت کس حد تک انصاف اور سچائی سے کام لیا جا رہا ہے؟ اس طرح کے مباحث پر ظہیر کاشمیری، قیوم نظر، پروفیسر حمید احمد خان، رحمان مذنب، الطاف گوہر، مختار صدیقی، نے وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حلقہ ارباب ذوق کے پلیٹ فارم سے حسن عسکری جیسے بااثر نقاد نے فسادات کے موضوع پر لکھے جانے والے ادب کو یہ کہہ کر ہی مسترد کر دیا کہ فسادات ادب کا موضوع نہیں بن سکتے۔ اس پر ترقی پسندوں کی جانب سے ردِعمل بھی ہوا اور یہ بحث چل نکلی کہ فسادات، ہنگامی واقعات کو موضوع بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ بعد ازاں حسن عسکری نے کئی اور اہم بحثیں اپنے تنقیدی مضامین میں چھیڑیں۔ مثلاً قوم سے متعلق ادیبوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ اور انھیں کس انداز سے پورا کرنا چاہیے؟ یعنی ادیبوں کی کمٹمنٹ کا سوال اٹھایا۔ پاکستان کے لئے پاکستانی ادب کا نعرہ بلند کیا کہ اس میں پاکستان کا تشخص نمایاں ہونا چاہیے جو ہمارے قومی اور تہذیبی مزاج کی آئینہ داری کر سکے اور چونکہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی بنیاد اسلام ہے اس لیے پاکستانی ادب کو اسلامی ادب ہونا چاہیے۔ یوں پاکستانی ادب کا نعرہ بعدازاں اسلامی ادب میں تبدیل ہو گیا۔ حسن عسکری نے پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی یہ بحث 'ہفت روزہ نظام'' لاہور میں ''پاکستانی اردو ادب اور قومی تقاضے'' پھر ایک مضمون ''قوم سے بے نیازی اور ادب'' لکھ کر شروع کی۔ پاکستانی ادب کے سلسلے میں منٹو اور حسن عسکری نے مل کر ''اردو ادب'' کے نام سے ایک مجلّے کا اجراء کیا۔ جس کے صرف دو ہی شمارے شائع ہو سکے اس ضمن میں یہ واضح رہے کہ حسن عسکری کا اسلامی ادب کا تصور تحریک ادب اسلامی کے تصور اسلامی ادب سے بالکل مختلف تھا۔ ان کے نزدیک اسلامی ادب محض مذہبی اور تبلیغی ادب نہ تھا جس میں اسلامی تعلیمات پر عمل کی تلقین کی گئی ہو بلکہ اس کا مقصد ادبی فنی اور تخلیقی کارناموں میں اسلامی روح کی کارفرمائی تھا اس کا اظہار انہوں نے اپنی کتاب ''جھلکیاں'' میں بھی کیا ہے۔ درحقیقت حسن عسکری دور جدید کے تقاضوں کے مطابق اجتہاد کا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے بالفاظ دیگر اسلامی ادب میں کٹھ ملائیت کے بجائے اسلام میں ماڈرن ازم کے قائل تھے کیونکہ حسن عسکری کا استدلال یہ تھا:

> ''بعض لوگ مسلمانوں کی پوری تاریخ کو سرے سے ہی رد کر دیتے ہیں جب یہ لوگ اسلامی ادب کا نام لیتے ہیں تو مطلب یہی ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے اب تک جتنا ادب پیدا کیا ہے۔ حافظ، سعدی میر، مصحفی، غالب، میر امن، الف لیلی، طلسم ہوشربا، سب ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا جائے ان لوگوں کے نزدیک ادب کا مقصد اخلاق کی درستگی ہے یا موعظت اور وہ بھی خاصے کھلے کھلے لفظوں میں۔ انسان کی پوری شخصیت پر آرٹ کا جو اثر ہوتا ہے اس سے یہ لوگ ناواقف ہیں ان لوگوں کو احساس ہے کہ ادب آسانی سے نہیں ہٹ سکتا اس لیے سوچتے ہیں کہ چلو ادبی عناصر جتنا کم رہ جائیں اتنا ہی غنیمت ہے۔ یہی بات زیادہ نقصان رساں ہے اگر کوئی صاف کہہ دے

کہ ادب کی ضرورت باقی نہیں رہی تو وہ بات سمجھ میں آتی ہے مگر ادب کے نام پر "غیر ادب" کا
مطالبہ کرنا غلط ہے۔"۶۸

پاکستانی ادب اور اسلامی ادب کی بحث میں ممتاز شیریں، صمد شاہین، سلیم احمد، شمیم احمد، سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے حسن عسکری کے نقطۂ نظر کو تقویت پہنچائی۔ چنانچہ حسن عسکری سمیت علیم احمد، مظفر علی سید، ناصر کاظمی، سید گزار حسین، انتظار حسین، سجاد باقر رضوی، جیلانی کامران، فتح محمد ملک، ڈاکٹر سہیل بخاری، منیر احمد شیخ، ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ نے ایک نیا تہذیبی رجحان پیدا کیا۔ جس میں لکھنے والوں نے نہ صرف علامتوں اور استعاروں کے نئے معنی دریافت کیے بلکہ ماضی کے قدیم ادب کی تعمیر نو کا فریضہ بھی انجام دیا۔ انھوں نے مندرجہ ذیل خیالات کو تخلیقی و تنقیدی اردو نثر میں متعارف کرایا۔

۱۔ ماضی کے ادب کو اپنے شعر و ادب کے معیار پر پرکھا جائے۔

۲۔ مغرب کے تنقیدی نظریات کی روشنی میں تہذیب و روایات و اقدار کو پرکھنے کی بجائے اپنے تہذیبی تقاضوں کی روشنی میں مغرب کے تنقیدی نظریات کو جانچا جائے۔

۳۔ ادب کو قومی تہذیب و روایات اور طرز احساس کی بنیاد پر پرکھا جائے۔

مذکورہ احباب کا خیال تھا کہ ہر قوم کا ادب اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور اپنی تہذیب کی عکاسی کرتا ہے اس لیے وہ اپنا معیار خود وضع کرتا ہے۔ اس لیے قوم کے ادب وفن کو اسی معیار اور اقدار کی روشنی میں جانچنا چاہیے۔ ثقافتی اور تہذیبی مباحث کے سلسلے میں دو سوالات اٹھائے گئے۔ اول یہ کہ پاکستان کی تہذیب ہند ایرانی ہے یا ہند اسلامی۔ دوم: ہم انڈو مسلم تہذیب کو کس حد تک قبول کریں کہ ہمارا اپنا تشخص متاثر نہ ہو۔ قیام پاکستان کے بعد مذکورہ سوالات شدت سے ابھرے کہ ہمارے ملک کا تہذیبی رشتہ کہاں اور کس قدیم تہذیب سے ملتا ہے؟ تہذیبی فکر کے پس منظر میں پیدا ہونے والے ان تنقیدی رجحانات کو ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کے توسط سے تین نظریوں میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلا نظریہ آسانی نظریۂ تہذیب تھا یہ رجحان تہذیب کو آسمانی مظہر تصور کرنے کے نتیجے میں سامنے آیا۔ اس نظریے کے قائل تہذیب کی تشکیل میں زمینی عناصر کو اہمیت نہیں دیتے اور اپنا رشتہ اسلامی روایات سے جوڑتے تھے۔ اس رجحان کے تحت لکھنے والوں نے الحاد، بے دینی، فحاشی اور عریانی کو نشانہ بنایا اور بالواسطہ طور پر اس نظام فکر کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا جو اسلام کے نظریات قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ یہی اسلامی ادب کی تحریک تھی۔

جس کی کونپل حلقہ ارباب ذوق ہی سے لگی۔

دوسرا زمینی نظریہ تھا اس نظریے کے قائل تہذیب کا تعین زمین کے حوالے سے کرتے اور اسے تخلیقی و مادری اصول قرار دیتے تھے۔ان کے خیال میں پاکستانی تہذیب کو برصغیر کی تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس نظریے کی حمایت کرنے والے بیشتر ترقی پسند تھے۔کیونکہ ترقی پسندوں نے زمین کو اہمیت دی تو اس کا مقصد زمین کے واسطے مادی نظام کی تشکیل اور غیر طبقاتی معاشرے کا فروغ تھا۔چونکہ ترقی پسند تہذیب کی جڑیں ہڑپہ اور موہنجوداڑو میں تلاش کرتے تھے اس لیے مذکورہ نظریہ کو بھی تہذیب سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا نظریہ مذکورہ بالا دونوں نظریوں کے باہم اختلاط سے وجود میں آیا۔جس کا منتہا یہ تھا کہ مسلمان برصغیر کے میں آئے تو اپنے ساتھ مذہب سے پیدا شدہ مابعد الطبیعات واقدار لے کر آئے۔اس کے مقابل یہاں پہلے سے موجود تہذیب آب و ہوا اور جغرافیائی ماحول کی حیثیت گویا زمینی، تخلیقی یا مادری اصول کی تھی اس طرح مسلمان مادری اصول میں مقامی لوگوں کے ساتھ آ کر شریک ہو گئے جبکہ پدری اصول میں ان کا مقامی آبادی سے اختلاف تھا۔ چنانچہ اس نظریے کے حامی مادری یعنی تخلیقی اور پدری یعنی تنظیمی اصول کی یکساں اہمیت کے قائل تھے اور یہ کہ ان کے باہم ملنے سے تہذیب جنم لیتی ہے۔انہی رجحانات نے آگے چل کر پاکستانی تہذیب کی صورت اختیار کر لی۔حسن عسکری اور سجاد باقر رضوی اس نظریہ کے علمبردار تھے۔

حلقہ ارباب ذوق ہی کے پلیٹ فارم سے متعلق چند ادباء (خورشید احمد، نجم الاسلام، اسرار احمد سہاروی، ہارون الرشید، نعیم صدیقی، فروغ احمد) نے قیام پاکستان کے بعد اردو زبان و ادب میں اسلامی تحریک چلائی۔جس کے پیش نظر عوام کی ذہنی اور اخلاقی تربیت کے لیے اسلامی افکار ونظریات کو ادب وفن کے ذریعے رواج دے کر ادبی تخلیقات کا جزو لازم بنانا تھا۔اس اعتبار سے خالصتاً مقصدی تحریک تھی۔ ۱۹۴۷ء میں ایک نظریاتی اسلامی مملکت پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد جو ادبی مباحث (ثقافتی وتہذیبی پاکستانی) عام ہوئے ان میں اسلامی ادب کا نعرہ بلند ہونا اس وقت کے حالات کے پیش نظر ناگزیر بھی تھا۔

اسلامی ادب کی تحریک کے نظریات کو فعال بنانے کے لیے رسالہ ''سیارہ''، ''یثرب''، ''چراغ راہ'' کا اجراء کیا۔ نیز حلقہ ارباب ذوق کی طرز پر بحث ومباحثہ کے لیے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس کا اہتمام بھی کیا گیا۔اس تحریک نے ادب کا اسلامی نقطہ نظر سے جائزہ لینے کے رجحان کو مقبول بنایا اور اسلام کی اصل روح کو تنقیدی اور تخلیقی اصناف نثر میں پیش کرنے کی سعی کی۔ چنانچہ اسعد گیلانی، پروفیسر فروغ احمد، ماہر القادری، پروفیسر ہارون الرشید،

ابن فرید، نجم الاسلام، خورشید احمد، اسرار احمد سہاروی، نجات اللہ صدیقی، جیلانی بی اے، محمود فاروقی، فضل من اللہ، لالہ صحرائی، نسیم حجازی، م نسیم، ابوالخطیب، حمید اللہ صدیقی، حسان کلیمی، علی سفیان آفاقی، صدیق الحسن گیلانی، نصر اللہ خان عزیز، عبدالحمید صدیقی، آباد شاہ پوری، کوثر نیازی، پروفیسر خورشید احمد، آسی ضیائی، پروفیسر عثمان رمز، رشید احمد، منظر حسین، رخشندہ کوکب، سلمیٰ یاسمین نجمی، ام فاروق، رئیسہ عزیز، نظر زیدی وغیرہ نے اس رجحان کو فروغ دیا۔ ابواللیث صدیقی اور آفتاب احمد خان نے اس کی حمایت کی لیکن بیشتر نظریاتی مسائل کے حل اور انہیں واضح کرنے کی کاوش کی گئی۔ تحریک اسلامی ادب کا ادبی پہلو بالعموم مولانا مودودی کے نظریات کے گرد ہی گھومتا ہے۔ اس سے جس ادبی بحث کو فروغ ملا اس میں ادب کی محض نظریاتی سطح پر تفہیم کی کوشش کی گئی جبکہ تخلیقی عمل کی بابت کوئی بات نہ کی گئی۔ اسی لیے ڈاکٹر محمد عزیز نے کہا: ''اسلامی ادیب کو یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ وہ واعظ یا ناصح نہیں ادیب ہے اس کا کام منطقی استدلال نہیں بلکہ مرقع کشی ہے۔''۶۹ اسلامی ادب کی اس تحریک نے نظری تنقید کی سطح پر تو بہتر کام کیا لیکن تخلیقی اصناف نثر کے حوالے سے اسے کامیابی نہ مل سکی۔ اس کی وجہ انور سدید اس طرح بیان کرتے ہیں: ''جن ادباء میں افسانہ تخلیق کرنے کا سلیقہ موجود تھا وہ تنظیم کی دوسری سرگرمیوں میں کھو گئے اور بیشتر ایک ہی ادیب نے تنقید، شاعری، افسانہ، اور مزاح لکھنے کا فریضہ سرانجام دیا (مثلاً ماہر القادری، نعیم صدیقی وغیرہ) نتیجہ یہ ہوا کہ کسی ایک صنف میں بھی انفرادیت کا نقش پیدا نہ ہو سکا۔''۷۰

اس کے باوجود تحریک ادب اسلامی نے اردو نثر کے ارتقا میں افسانہ، ناول، مضمون، ڈرامہ، خاکہ اور تنقید نگاری میں جو اپنا حصہ ڈالا اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نعیم صدیقی کا افسانوی مجموعہ ذہنی زلزلہ ''نقطے اور لکیریں''، ''یوں بھی ہوتا ہے''، ''جزیرہ''، ''زندہ دلان''، ''ایک عورت آ گئے''، ماہر القادری کے افسانے ''بھکارن''، ''خندق کے نیچے''، ''کورٹ مارشل''، ''ہارتا چلا گیا''، جبکہ ناول ''دریتیم'' آسی ضیائی کا افسانوی مجموعہ ''تقابل'' اور ''چھینٹے'' کے مزاحیہ خاکوں اور ڈراموں میں ''سیوف کی باتیں''، ''بقول مزدک''، ''کھوٹے سکے''، اسعد گیلانی کے افسانوں میں ''مونچھیں''، ''ایک عورت دو ملک''، ''لاشوں کا شہر''، ''پتھر اور نیند''، ''ایک بہتر اشتراکی''، ''کارزار حیات''، ''آدم کے تین بیٹے''، ''خاکوں کا مجموعہ'' ''تصویریں'' اور ''انتظار'' جبکہ ناول میں ''جہنم کے دروازوں پر'' ''مضامین کا مجموعہ''، ''کتاب انقلاب''۔ ''محمود فاروقی نے کرداری افسانے لکھے جن میں ''ذہنی مجرم''، ''تاباں کی موت''، ''قاہرہ کے بیٹے''، ''پڑاؤ''، ''بساطی باڑہ''، ''جیلانی بی اے کے افسانوں میں ''اذان''، ''دیوار کے اس پار''، ''خالص آدمی''، ''پکا ہوا پھل''، ''انتخاب''، ''پیالہ'' م۔نسیم کے افسانے ''سیلز گرل''، ''انتہا سے پہلے''، ''محسن''، ''ناشکرا''، ''نور الٰہی'' ابن فرید کے افسانے ''عشرت لاج میں اجنبی'' ''چاند سمندر اور شہر''، ''پھر فضا مسکرانے لگی''

''شک کرتا ہے سواد آسمان'' ابوالخطیب کے افسانے ''جب وحشت کا جگر چیرا''، ''محبت کا ایک روپ''، ''کب تک سحر نہ ہو گی''، ''ترک محبت کے باوجود''، ''پرنور اندھیر''، کے علاوہ ناول ''سحر کا انتظار تھا سحر کا انتظار ہے۔ حمید اللہ صدیقی کا افسانوی مجموعہ ''رقص شرر ہونے تک'' حسان کلیمی کا ''لی جاؤ بھارت میں''، ''نوشی ناچی''، ام فاروق کے افسانے ''چوکھٹ کے اندر'' نظر زیدی کے ناول ''خاتون'' ، ''نیا گھر''، ''کنیز'' کی صورت میں موضوع، فن اور اثر آفرینی کے حوالے سے بے حد کامیاب تجربے ہیں۔ جن میں زندگی اور ادب سے متعلق تمام موضوعات کا بیان صاف اور ستھرے اور پاکیزہ اسلوب میں کیا گیا ہے۔

ساٹھ کی دہائی میں حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ ایک ایسا گروہ منظر پر آیا جس نے اظہار و ابلاغ کو سہل بنانے کے لیے زبان کے مروجہ قواعد اور لسانی ڈھانچے کو توڑنا ضروری خیال کیا۔ جن کے نزدیک اور موضوع کے برعکس اولین اہمیت لسانی تجربات کی تھی۔ چنانچہ استعارہ سازی کا نیا تصور، علامت و تجرید کے مباحث موضوعات پر حاوی ہو گئے۔ ہیئت اور تکنیک کے نئے تجربوں اور اسلوب و اظہار کے نئے انداز نے تفہیم و ترسیل کے مسائل پیدا کر دیے۔ نتیجتاً موضوعات کا دائرہ محدود ہو گیا لیکن ہیئت اور تکنیک اور اظہار و اسلوب کے نت نئے تجربات کے لیے رستہ ہموار ہوا اور یہ نیا رجحان ''لسانی تشکیلات'' کے نام سے پہچانا گیا۔ جس کا دائرہ مباحث بیشتر شاعری کے گرد گھومتا ہے۔ اس گروہ کے سرخیل افتخار جالب تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''نئی شاعری'' کے ذریعے زبان کے مروج سانچے سے بیزاری کا اظہار کیا۔ نئی لسانی تشکیلات کے زیر اثر جو تبدیلیاں آئیں ان میں زبان کا نیا نظام وضع کرنے کی کوشش کی گئی جس سے فارسی مزاج کی بجائے پاکستانی مزاج وجود میں آیا۔ پرانی لغت میں نئے الفاظ کی شمولیت سے زبان کو وسعت دی۔ تراکیب سے احتراز اور اضافتوں سے بچنے کی شعوری کوشش نے زبان کا سانچہ بدل دیا۔ امیجز ، پیکر تراشی اور تمثیل کاری سے پرانے استعاراتی نظام کو بھی یکسر تبدیل کر دیا۔ نیز افسانوی زبان میں شعریت کے تاثیر نے بیانیہ کے برعکس ایک نئی زبان تشکیل دی اور افسانوں میں علامت، استعارہ، امیجز اور تمثیل کاری سے معنویت میں اضافہ کیا۔ اس رجحان کا تتبع ظفر اقبال، زاہد ڈار، جیلانی کامران، سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر انور سجاد، انور ادیب، محمد صفدر، عباس اطہر، مبارک احمد، سمیع آہوجا اور انیس ناگی کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔

مذکورہ بالا رویے، رجحانات اور رنگا رنگ آوازیں حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ احباب کے حوالے سے بلند ہوتی ہیں۔ پھر ۱۸۶۵ء کے بعد جب ادیبوں کی نظریاتی کمٹمنٹ کی بحث چلی تو اس وقت ادب میں نظریاتی کمٹمنٹ کو ضروری خیال کیا گیا۔ کیونکہ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ سے پہلی مرتبہ خالص پاکستانی ادب کی

بنیاد حلقہ ہی سے پڑی۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''پہلی بار ادباء کو پاکستان کے وجود اور نظریے کے تحفظ کے لیے ایک عملی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا''۔اہے اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ پاکستانیوں کا ایک مستقل طرز احساس بھی ہے جس کی انسانی سطح کے علاوہ ان کے تفکر کی ایک مقامی سطح بھی ہے۔ نتیجتاً ادیب اپنے ملک کی مخصوص صورتحال سے متاثر ہوئے اور ادب میں واضح خط فاصل کھینچ گیا جو قیام پاکستان کے وقت قدرے مبہم اور دھندلا تھا۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد ۱۹۷۲ء میں حلقہ دوحصوں میں بٹ گیا ایک حلقہ ارباب ذوق (ادبی) دوسرا حلقہ ارباب ذوق (سیاسی)۔ ادبی حلقہ نے سابقہ نظریات ہی کو اہمیت دی جبکہ دوسرا حلقہ نوترقی پسندی کی جانب مائل ہوا اور مارکسی نقطہ نظر قائم رکھا۔ اس طرح ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث ایک ساتھ پھر شروع ہو گئی۔ تحقیق وتنقید اور تخلیقی اصناف نثر کی کوئی صنف ایسی نہیں ہے جسے حلقہ نے حسب حال پروان نہ چڑھایا ہو۔ یہ حلقہ ارباب ذوق کا امتیاز ہے کہ متنوع ادبی رویوں کے ادیب باہم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے اور اس کی آزادانہ پالیسی اردو نثر میں مغربی فنون و ادبیات میں نمودار ہونے ادبی رویوں اور رجحانات (تاثریت علامت نگاری، وجودیت، سرئیلزم) کا پیش خیمہ بنی۔ آج بھی حلقہ ارباب ذوق ایک دبستان کی صورت میں اپنی عملی زندگی کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔

مذکورہ تحریکوں اور رجحانات کے زیر اثر اردو فکشن کے ارتقائی مراحل کا اجمالی جائزہ لیں تو موضوع، اسلوب اور تکنیک کی سطح پر جو تنوع دکھائی دیتا ہے اس سے اردو نثر کو توانائی اور رعنائی ملی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں رومانی رجحان ہو یا ''انگارے'' (۱۹۳۲ء) میں صورت مواد کی پیش کش، کردار نگاری یا نقطہ نظر جس سے علامتی، اشارتی، جنسی اور بے باک خیالی کے نئے زاویوں نے اردو فکشن کو روشناس کرایا یا پھر ترقی پسند تحریک جس نے مارکسیت کے نظریات سے متاثر ہو کر فرد اور سماج کی آویزش کو موضوع بنا کر طبقاتی کشمکش، ناانصافی، بے بسی ولاچاری، اور مظلومیت کو بیان کرنے کے ساتھ انقلابی طرز عمل کا پرچار بھی کیا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے نتیجے میں برپا ہونے والے فسادات، ہجرت اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی قتل و غارت، لوٹ مار، بربریت، نقل مکانی، معاشرتی انتشار، انسانیت سوزی، بے رحمی اور اخلاقی قدروں کے زوال کے المناک پہلوؤں کو بھی ترقی پسندوں اور حلقہ سے وابستہ ادباء نے اپنے اپنے طور پر فکشن کا موضوع بنایا اور اس پس منظر میں جو تخلیقات منصہ شہود پر آئیں ان میں وسیع سیاسی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ معاشرتی، معاشی، نفسیاتی، جذباتی اور تہذیبی سطح پر ایک پوری قوم کا تجربہ سمونے میں کامیابی ہوئی جس سے ماضی کی یاد، جڑوں کی تلاش کی کے علاوہ روایات واقدار، تہذیبی ورثے اور انسانی رویوں کے متعلق ژرف نگاہی سے غور وفکر کے نئے دریچے کھلے۔ مثلاً اس

ضمن میں ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، ''سہائے''، ''کھول دو'' (سعادت حسن منٹو) ''آزادی سے پہلے'' ''امرتسر'' ''پشاور ایکسپریس'' ''جانور'' ''دوسری موت'' ''مدرسہ'' ''ہم وحشی ہیں'' (کرشن چندر) لاجونتی (راجندر سنگھ بیدی) ''میں انسان ہوں'' ''چڑیل'' ''تسکین'' ''پرمیشر سنگھ'' (احمد ندیم قاسمی) ''کالی رات'' ''جھوٹا خواب (عزیز احمد) ''لمحے'' ''ایک معمولی لڑکی'' ''تعمیر'' ''پہلا پتھر'' (بلونت سنگھ) یا خدا (قدرت اللہ شہاب) ''گڈریا'' (اشفاق احمد) ''بڑے انسان بنے بیٹھے ہو'' ''اور قافلہ چلا ہے'' (ہاجرہ سرور) ''بن لکھی رزمیہ'' ''گلی کوچے'' ''کنکری شہر افسوس'' ''آخری آدمی'' (انتظار حسین) ''کبو'' (آغا بابر) وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۵ء تا ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں علامتی افسانے نے فروغ پایا جس کے کئی ایک اسباب تھے۔ مثلاً مارشل لاء کے باعث آزادی اظہار پر پابندی، مغربی ادب سے انسلاک، بیانیہ اور سیدھے سادے انداز کے خلاف ردِعمل وغیرہ۔ ۱۹۶۰ء میں علامتی طرز کے ساتھ تجریدی افسانے بھی لکھے جانے لگے جس میں کسی ٹھوس واقعہ کے بجائے کسی تاثر خیال، سوچ یا احساس کو اولیت دی گئی اور منطقی ربط معروضی مشاہدہ اور بیانیہ کی بجائے شاعرانہ اسلوب استعمال کیا گیا۔ بالفاظ دیگر تجریدی افسانے میں تصویر کی جگہ اس کا ہیولا دکھایا جاتا ہے یہ دراصل تکنیک کا افسانہ ہوتا ہے جس میں پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے ارتقا سے دلچسپی نہیں لی جاتی، شعور کی رو کی تکنیک کو اکثر تجریدی افسانے میں برتا گیا۔ علامتی اور تجریدی افسانے نے موجودیت کے مباحث، اساطیری، تلمیحی، حکایاتی، داستانی، تمثیلی اور دیومالائی کردار و واقعات کو بروئے کار لا کر اپنے دائرہ کو وسعت دی۔ ان میلانات و رجحانات کے ساتھ احیاء ادب اسلامی کی تحریک کے تحت اسلامی اقدار، اخلاقیات اور نظریات کی ترجمانی کا فریضہ بھی اردو فکشن نے ادا کیا۔ پھر اردو افسانہ میں ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے نتیجے میں ارض وطن سے محبت اور حب الوطنی کے احساسات اور جذبات کے رجحان کو فروغ ملا تو ۱۹۷۱ء کی جنگ کے نتیجہ میں سقوط ڈھاکہ نے جذباتی صدمے سے دوچار اور ذہنی کرب میں مبتلا کیا۔ جس سے ارضی و ثقافتی رجحان کو مزید تقویت ملی۔ چنانچہ اس تلخ تجربے کے محرکات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اثرات مثلاً نسلی و لسانی کشمکش، بغاوت و تصادم، کشت و خون، ظلم و تشدد، سیاستدانوں سے نفرت اور بداعتمادی، بے کسی، لاچارگی، مظلومیت اور ہجرت فکشن کا جوہر قرار پائے۔ ایسے ہی افسانوں میں ''موم بتی کے سامنے'' (حجاب امتیاز علی) ''کپاس کا پھول'' (احمد ندیم قاسمی) ''پاکستان'' (ممتاز مفتی) ''ٹھنڈا میٹھا پانی'' (خدیجہ مستور) ''ماں اور تھیم کرن کی بگلی'' (عنایت اللہ) ''پارٹی'' (فرخندہ لودھی) ''نغمہ اور آگ'' ''سبز پوش'' ''جلی مٹی کی خوشبو'' (غلام الثقلین نقوی) ''شہر افسوس'' ''دوسری دیوار'' (انتظار حسین) ''دکھ جو مٹی نے دیئے'' ''ڈاب اور بیئر کی ٹھنڈی بوتلیں'' (مسعود اشعر) وغیرہ شامل ہیں۔

اردو افسانہ کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد اردو ناول میں بھی مذکورہ موضوعات و رجحانات ہر دور میں ہر مصنف کے ہاتھوں مختلف روپ اختیار کرتے رہے ہیں۔ ان میں ''بستی'' ''تذکرہ'' ''آگے سمندر ہے'' (انتظار حسین) ''یا خدا'' (قدرت اللہ شہاب) ''خدا کی بستی'' ''جانگلوس'' (شوکت صدیقی) ''پندرہ اگست'' (رشید اختر) ''خاک اور خون'' ''آخری چٹان'' ''شاہین'' (نسیم حجازی) ''زوال الحمرا''، ''رقص ابلیس'' (ایم اسلم) ''مجاہد''، ''بالا کوٹ'' (رئیس احمد جعفری) ''آنکھیں''، ''زمین'' (خدیجہ مستور) ''ایسی بلندی ایسی پستی''، ''گریز''، ''آگ'' (عزیز احمد) ''تلاش بہاراں''، ''چہرہ بہ چہرہ۔روبہ رو''، ''روہی''، ''دشت سوس'' (جمیلہ ہاشمی) ''نگری نگری پھرا مسافر''، ''نے چراغ نے گلے''، ''کاروانِ وجود''، ''دریا کے سنگ سنگ''، (نثار عزیز بٹ) ''ڈربے'' (اے حمید) ''میر اگاؤں'' (غلام الثقلین نقوی) ''جھوک سیال'' (سید شبیر حسین) راجہ گدھ (بانو قدسیہ) ''علی پور کا ایلی'' (ممتاز مفتی) ''لمحوں کی راکھ'' (مرزا ادیب) ''چلتا مسافر'' (الطاف فاطمہ) ''پھول اور بارود'' (اختر جمالی) ''چاکیواڑہ میں وصال'' (محمد خالد اختر) ''گھر میرا راستے غم کے''، ''اس شمع کے آخری پروانے''، ''لڑکی ایک دل کے ویرانے میں'' (رشیدہ رضویہ) ''سیاہ آئینے''، ''اپنی دعاؤں کے اسیر'' (فاروق خالد)، ''غبار کوچہ جاناں''، ''کہانی عہد زوال کی'' (آغا سہیل) ''معتوب'' (اعجاز راہی) ''گرگ شب'' (اکرام اللہ) ''ایک اور سومنات'' (سید انور) ''تنہا'' (سلمیٰ اعوان) ''اللہ میگھ دے'' (طارق محمود) ''صدیوں کی زنجیر (رضیہ فصیح احمد) ''دیوار کے پیچھے'' (انیس ناگی) ''درد کی رُت''، ''سیاہ برف''، ''لیفٹ اوور'' (سائرہ ہاشمی) ''دام سحر'' (بلقیس ریاض) ''ضبط کی دیوار'' (ڈاکٹر سلیم اختر) ''خوشبوں کا باغ'' ''جنم روپ'' (ڈاکٹر انور سجاد) ''پاگل خانہ'' ''اندھیرا خواب'' (حجاب امتیاز) ''سات گمشدہ لوگ''، ''بے وطن''، ''ایک مرے ہوئے شخص کی کہانی'' (فخر زمان) ''بیسویں صدی کا چنگیز خان''، ''کشور'' (سلیم قیصر) ''فاختہ''، ''پیار کا پہلا شہر''، ''بہاؤ''، ''راکھ'' (مستنصر حسین تارڑ) ''جنت کی تلاش''، ''وادی گماں میں''، ''تن تن تارا'' (رحیم گل) ''غلام باغ'' (اطہر بیگ) کی صورت میں موضوعات تکنیک، ہیئت اور اسلوب کے متنوع تجربات نظر آتے ہیں جس میں بیانیہ انداز، اشتراکیت، حقیقت نگاری، ہجرت، فسادات، سقوطِ ڈھاکہ، نفسیاتی تحلیل، انسانی اقدار کی بلند سطح، داخلیت، لاشعور اور جنسی نفسیات، ناسٹلجیا، اخلاقی نظام کی بازگشت، ہندو دیو مالائی اقدار، حزنیہ واقعاتی تشکیل، علامتی، تجریدی، تلازمہ خیال، خود کلامی، وجودی نقطہ نظر، ریاستی جبر، متصوفانہ انداز جیسے سبھی رخ دیکھے جا سکتے ہیں۔

مذکورہ تحریکات و رجحات کا کردار اردو نثر میں تنقیدی اور تخلیقی نثر کے ضمن میں بنیادی رہا ہے جبکہ بقیہ اصناف رسائل کی مرہونِ منت پروان چڑھیں اور اپنی شناخت سے اردو نثر کے دامن کو موضوع اسلوب اور ہیئت

کے اعتبار سے وسعت، گہرائی اور تنوع دیا۔ درحقیقت بیسویں صدی میں اردو نثر کے ارتقا کو فعال بنانے والے یہی وہ بنیادی سرچشمے ہیں جنہوں نے اردو نثر کو تازگی اور ندرت سے ہمکنار رکھا۔ اس باب میں جن رجحانات اور تحریکات کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنے مخصوص سماجی ماحول اور خاص طرح کے حالات و واقعات کے زیر سایہ صورت پذیر ہوئیں۔ اس لیے بڑی حد تک ان سے اپنے زمانے کے مذاق، ذہنی رجحان اور انداز فکر کا پتہ چلتا ہے ورنہ ادب میں حدبندی سے کام لینا انتہائی مشکل امر ہے کیونکہ اثرات کا عمل اور ردعمل وہ مخفی اور خاموش سلسلہ عمل ہوتا ہے جس کا آغاز محسوس نہیں ہوتا مگر یہ اثرات اندر ہی اندر معروف کار اور اپنے اظہار کے لیے کسی اہم وقت اور موقعہ کے منتظر اور تلاش میں رہتے ہیں اور جب وقت آ جاتا ہے تو اثرات کا یہ سلسلہ کسی تحریک یا کسی مخصوص ادبی نظریہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مصنفین کو کسی ایک دور میں نہیں رکھا جا سکتا۔ جو ذہنی و فکری ارتقا کے مرحلے سے گذرتے ہوئے مختلف تحریکات و رجحانات کی ترویج و اشاعت کا کام جاری رکھتے ہیں۔

اس پیش منظر کو سامنے رکھتے ہوئے عہد حاضر کے ادبی وتنقیدی منظر نامے پر نگاہ ڈالیں تو موجودہ دور میں اس وقت کوئی مخصوص ادبی تحریک، نظریہ یا رجحان کے تحت شدومد کے ساتھ ادب تخلیق نہیں کیا جا رہا کہ اس دور کو کسی مخصوص ادبی تحریک کا عہد قرار دے سکیں۔ البتہ حلقہ ارباب ذوق اپنے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے اپنے آزادانہ نقطۂ نظر کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہے۔ عہد حاضر میں بیسویں صدی کے مختلف رویوں، رجحانات اور تحریکات کی جھلک بدستور موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی کی یک رخی تصویر کشی کو مقصود فن قرار دینا بھی ادبی نثر کے دائرہ کو محدود کر دینے کے مترادف ہے۔ پیش منظر میں اگر ادبی نثر کا تجزیاتی مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس میں نت نئی تبدیلیاں، نئی نئی تحریکیں اور نئے نئے افکار و خیالات کے محرکات نے جدت، اختراع اور وسعت کے ساتھ اردو نثر کو برگ و بار دیئے ہیں۔ یوں روایات کی تعمیر اور تجربات کی تشکیل کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور اس مسلسل ارتقا میں باقاعدگی پائی جاتی ہے جس سے ادبی نثر نے مستقل اور مسلمہ حیثیت اختیار کر لی ہے۔

د) اصنافِ نثر:

بیسویں صدی میں فکشن کے علاوہ دیگر اصنف نثر نے مضبوط بنیادوں پر اپنا وقار اور اعتبار قائم کرتے ہوئے موضوع، ہیئت اور اسلوب کے حوالے سے اردو نثر کو مہتم بالشان سرمایہ دیا۔ ذیل میں اس کا اجمالی جائزہ لیں تو احساس ہوگا کہ بیسویں صدی اردو نثر کے لیے انقلاب آفریں ثابت ہوئی۔

انیسویں صدی میں اردو نثر میں **تحقیق وتنقید** کی روایت کا آغاز ڈاکٹر لائٹنر کی وساطت انجمن پنجاب اور

پنجاب یونیورسٹی کے پلیٹ فارم سے ہو چکا تھا۔ جن کے اغراض و مقاصد میں مشرقی علوم کے احیاء کو خصوصی اہمیت دی گئی تھی۔ بالخصوص ان دو اداروں سے وابستہ ادباء ہی نے تحقیق و تنقید کی با قاعدہ داغ بیل ڈالی۔ جس میں مولانا محمد حسین آزاد پیش پیش تھے جبکہ بیسویں صدی میں علمی و ادبی تحقیق و تنقید کا ذوق بدستور پروان چڑھانے میں اورینٹل کالج لاہور سے متعلق ادیب اساتذہ، اورینٹل کالج میگزین اور دیگر علمی و ادبی اداروں نے تنقید و تحقیق کے میدان میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محمد شفیع، حافظ محمود شیرانی کے مقالات اور تصانیف کو تحقیق و تنقید میں خصوصی اہمیت حاصل ہوئی۔ اورینٹل کالج لاہور سے وابستہ ان اساتذہ کی بیشتر تحقیق ادبی تاریخ اور لسانیات سے متعلق تھی۔ بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو زبان و ادب کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق خاصی تحقیق ہوئی۔ اس سے قبل تاریخ زبان اردو اور تاریخ ادب کے موضوعات پر کل سرمایہ محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' کچھ لیکچرز، سخندان فارس، کے علاوہ متفرق رسائل اور درسی کتب[۲] کے اسباق تک محدود تھا۔ قلیل ہونے کے باوجود اس تحقیقی و تنقیدی سرمایے نے اردو نثر میں ایک مستقل بنیاد فراہم کی۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں لالہ سری رام نے ''خمخانۂ جاوید''[۳] چھ جلدوں پر مشتمل ضخیم تذکرہ لکھ کر شعرا و ادباء کے حوالے سے تاریخ ادب کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ۱۹۲۷ء میں رام بابو سکینہ نے انگریزی زبان میں اردو ادب کی تاریخ لکھی جس کا ترجمہ ۱۹۳۱ء میں محمد عسکری نے کیا۔ اس میں پہلی مرتبہ نظم و نثر کا بحیثیت مجموعی احاطہ کیا گیا نیز ناقدانہ انداز اختیار کرتے ہوئے محتاط فیصلوں سے درست نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی گئی۔ جس کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔[۴] جبکہ لسانیات کے موضوع پر اردو زبان کی ابتدا سے متعلق خاص علمی بحث اول اول اخبارات و رسائل میں شروع ہوئی جس میں اولیت کا سہرا رسالہ ''مخزن''[۵] اور ''پیسہ اخبار'' کے سر ہے بعد ازاں ''اورینٹل کالج میگزین'' نے بھی اسے تقویت دی۔ انھی اخبارات و رسائل کے مضامین سے ترغیب پا کر حافظ محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' (۱۹۲۸ء) لکھ کر با قاعدہ مدلل علمی لسانی نظریہ سازی کا آغاز کیا۔ اپنی اس تصنیف میں حافظ محمود شیرانی نے مدلل انداز میں خطہ پنجاب کو اردو کا ابتدائی اور اصلی وطن قرار دیا ہے۔ یوں ۱۹۲۸ء سے قبل لاہور میں پنجاب میں اردو پر لسانی حوالے سے جتنا کام ہوا وہ مضامین کی صورت میں اس دور کے اخبارات و رسائل میں موجود تھا لیکن حافظ محمود شیرانی کا یہ امتیاز ہے کہ انہوں نے تحقیقی انداز سے ایک مبسوط اور مربوط کتاب کی صورت میں اپنے نظریہ کو تفصیل سے بیان کیا۔ حافظ محمود شیرانی نے اس میں جو تاریخی دلائل و براہین اور لسانی خصائص و شواہد دیئے ہیں۔ اس سے مذکورہ نظریہ کو درست تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں رہتا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو زبان مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی اور اس اختلاط کے اولین مراکز سندھ اور پنجاب ہی تھے جہاں پہلے پہل عربوں کے زیر اثر اور بعد ازاں

غزنوی دور میں ہندو مسلم اختلاط ہوا۔ درحقیقت پنجاب ہی اردو زبان کا مسکن تھا اس نظریہ نے لسانی مباحث کی تنقید و تحقیق کا وسیع پیمانے پر آغاز کیا۔ جس کی مخالفت میں بھی مختلف نظریات اور تصانیف وجود میں آئیں۔۷۶ے اس نظریہ کے حق میں مولوی محبوب عالم (پیسہ اخبار) علامہ اقبال (''اردو زبان پنجاب میں'' مطبوعہ ''مخزن'' اکتوبر ۱۹۰۳ء) پنڈت دتاتریہ کیفی (''منشورات'' ''کیفیہ'') آغا محمد باقر (اردوئے قدیم پر ایک مضمون مشمولہ اورینٹل کالج میگزین ۱۹۴۱ء) موہن سنگھ دیوانہ، پنجابی انبالوی، مولوی فضل حق اور مرزا سلطان احمد نے بھی بہت کچھ لکھا۔ حافظ محمود شیرانی کی تصانیف ''خالق باری'' ''پرتھوی راج راسا'' کے علاوہ مقالات (آٹھ جلدیں) بھی اردو لسانیات پر اعلیٰ معیار کی تحقیق و تنقید پیش کرتے ہیں۔ حافظ محمود شیرانی نے پہلی بار تحقیق میں واقعاتی شواہد کے ساتھ داخلی شواہد کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ نیز جدید تحقیق میں اصول سازی کا اہتمام بھی کیا۔ جبکہ ان کی تنقید نے بھی اردو تنقید نگاری کو ایک معیار دیا جس میں تحقیق کا عنصر غالب رہا اس ضمن میں ان کی کتب ''تنقید بر حیات'' ''تنقید شعرالعجم''، ''فردوسی پر چار مقالے'' دیکھے جا سکتے ہیں۔ اردو تحقیق و تنقید کی بنیاد کو مستحکم بنانے میں حافظ محمود شیرانی نے جو نمایاں کردار ادا کیا اور جس منظم روایت کا آغاز کیا اس کی وساطت محققین اور ناقدین نے مندرجہ ذیل پہلوؤں سے تنقیدی و تحقیقی سرمائے کا جائزہ لے کر سائنٹیفک اصولوں پر اس روایت کو مستحکم کیا۔

۱۔ قدیم فنون اور ادبی سرمایے کی بازیافت
۲۔ ادیبوں اور شاعروں کے احوال و آثار
۳۔ سیاسی و سماجی پس منظر میں ادبی موضوعات کا جائزہ
۴۔ اردو اور پاکستانی زبانوں کے لسانی رشتوں کا تعین
۵۔ تدوین لغت، اصطلاحات سازی یا اشتراک لغات
۶۔ غالبیات، اقبالیات جیسے مستقل موضوعات۔۷۷ے

مذکورہ حوالوں سے جن محققین اور ناقدین نے کام کیا اور تحقیق و تنقید کے میدان کو زرخیز بنایا ان میں مولوی محمد شفیع (''مکاتبات رشیدی'' ''وامق عذرا'' ''مثنوی سحر البیان کا ایک قدیم دیباچہ'' ''مطلع سعدین کی تصحیح و حواشی نگاری'') شیخ محمد اکرام (''حکیم فرزانہ'' ''غالب نامہ'' ''شبلی نامہ'' ''یادگار شبلی'' ''حیات غالب'' ''آب کوثر'' ''رود کوثر'' ''موج کوثر'') قلب علی خان فائق (کلیات مومن کی تدوین) مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی (''منتخب مراثی انیس'' ''مجموعہ نثر غالب'' ''عود ہندی'' اردوئے معلی کی تصحیح'') ڈاکٹر محمد باقر (''تذکرہ شعرا پنجاب'' ''اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں'' ''تاریخ ممتاز'' ''تاریخ کوہ نور'' ''واقعات درانی'' ''لاہور کا ماضی و حال'' ''تہذیب

امن'' ''تاریخ سا سانیہ'') فقیر وحید الدین (روزگار فقیر)، حسن عسکری (''جھلکیاں'' ''وقت کی راگنی'' ''ستارہ یا بادبان'' ''انسان اور آدمی'') سلیم احمد (''نئی نظم پورا آدمی'' ''غالب کون'' ''اقبال ایک شاعر'') شمیم احمد (''زاویہ نگاہ'' ''۵=۲+۲'' ''برش قلم'') ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (''ڈپٹی نذیر احمد احوال و آثار'' ''کلیات نظم حالی'' ''عروج اقبال'') ڈاکٹر محمد صادق (''محمد حسین آزاد احوال و آثار'') ڈاکٹر اقتدار حسین (''کلیات جرات'') ڈاکٹر شمس الدین قادری (کلیات سودا) خواجہ منظور حسین (اردو غزل کا خارجی روپ بہروپ) ریاض احمد چودھری (''دیوان میر'' ''مہدی مجروح'') ڈاکٹر سید عبداللہ (''مقالات اقبال'' ''اطراف غالب'' ''بحث و نظر'' ''مباحث'' ''نقد میر'' ''ولی سے اقبال تک'' ''وجہی سے عبدالحق تک'' ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' ''اردو تذکرے اور تذکرہ نگاری'' ''اردو ادب'' ''شہر آشوب کی تاریخ'' ''تخلص کی رسم اور تاریخ'' ''فارسی تذکروں میں تنقیدی عنصر'') ڈاکٹر وحید قریشی (مقدمہ شعر وشاعری کا تحقیقی مطالعہ'' ''شبلی کی حیات معاشقہ'' ''مطالعہ حالی'' ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' ''اردو کا انشائی ادب'' ''نذر غالب'' ''اقبال اور پاکستانی قومیت'') سید وقار عظیم (''فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ'' ''ہماری داستانیں'' ''اقبال شاعر اور فلسفی'' ''نیا افسانہ'' ''داستان سے افسانے تک'' اور اندر سبھا، الف لیلی اور باغ و بہار پر مبسوط تحقیقی مقدمات) ڈاکٹر عبادت بریلوی (''اردو تنقید کا ارتقا'' ''مقدمات عبدالحق (ترتیب)'' ''رسالہ کائنات'' (ترتیب)''ہفت گلشن'' (ترتیب) ''خطبات عبدالحق'' (ترتیب)) الف-د-نسیم (''دلی کا شاعرانہ ماحول'' ''اردوئے قدیم اور صوفیائے چشت'') خلیفہ عبدالحکیم (''فکر اقبال'' ''مقالات حکیم'') ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ''پنجاب تحقیق کی روشنی میں'' ''ظفر علی خان ادیب و شاعر'' ''شاہ حاتم کے حالات و کلام'' ''اردو کی کہانی شیرانی کی زبانی'' مشمولہ اورینٹل کالج میگزین شمارہ ۲۲۲-۲۲۳ ''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر'' ''دیوان زادہ'' مقدمہ و حواشی) ڈاکٹر محمد اسلم قریشی (ڈرامائی نظریات اور تکنیک کی روشنی میں اردو ڈرامے کا جائزہ) پروفیسر حمید احمد خان (''نسخہ حمیدیہ'' (ترتیب) ''اقبال کی شخصیت اور شاعری'' ''ادب، ادیب اور معاشرہ'' ''ارمغان حالی'' ''تعلیم و تہذیب'' ''اسوہ حسنہ'' ''اسلام اور حریت اسلامی'') غلام رسول مہر (''غالب'' ''خطوط غالب'' (مرتبہ)) سید نذیر نیازی (''اقبال کے حضور'' ''تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'') عبداللہ قریشی (''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' ''شاد اقبال'' (مرتبہ)) مرزا منور (''علامہ اقبال کی فارسی غزل'' ''میزان اقبال'' ''ایقان اقبال'') پروفیسر محمد عثمان (حیات اقبال کا ایک جذباتی دور) رئیس احمد جعفری (واجد علی شاہ اور ان کا عہد) سید عابد علی عابد (''اصول انتقاد ادبیات'' ''انتقاد'' ''البدیع'' ''البیان'' ''اسلوب'') ڈاکٹر سہیل بخاری (''اردو کا روپ'' ''اردو کی کہانی'' ''اردو زبان کی فونالوجی'') ڈاکٹر اکرام چغتائی

(''تاریخ مشغلہ مصنفہ واجد علی شاہ (تحقیق و تدقیق) ''پنجاب میں اردو'' (تحقیق و ترتیب)) مرزا ہادی حسین (''مغربی شعریات'' ''زبان اور شاعری'') آغا افتخار حسین (''یورپ میں تحقیقی مطالعے'' ''یورپ میں اردو'') وزیرالحسن عابدی (''باغ و دور'' تصحیح و تحقیق) شیخ عطا محمد (''اقبالنامہ'' دو جلدیں) بشیر احمد ڈار (انوار اقبال) ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (''اشاریہ غالب'' ''تحقیق غالب'' ''غالب کا علمی سرمایہ'' ''غالب اور انقلاب ستاون'' جامعات میں اقبال کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ'' ''خیالستان'' (مرتبہ) ''مطالعہ یلدرم'' ''دیوان غالب نسخہ خواجہ'') ڈاکٹر تبسم کاشمیری (''ادبی تحقیق کے اصول'' ''لا= راشد'' ''اردو ادب کی تاریخ ابتدا سے ۱۸۵۷ء تک'' ''شعریات اقبال'' ''اقبال اور نئی قومی شناخت'' ''آب حیات'' (مرتبہ) ''تاریخ ادب اردو'' از رام بابو سکینہ پر حاشیہ نگاری'' ''مصحفی کے دیوان، قصائد کے مختلف نسخوں کا تذکرہ اور بالخصوص کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی میں موجود تین جلدوں کی مکمل فہرست'' مشمولہ صحیفہ جنوری ۱۹۷۰ء) ڈاکٹر ظہیر کاشمیری (رسوا کی ناول نگاری) جیلانی کامران (''تنقید کا نیا پس منظر'' ''نئی نظم کے تقاضے'' ''غالب کی تہذیبی شخصیت'') ڈاکٹر گوہر نوشاہی (''ہشت عدل اور واسوخت'' ''مطالعہ غالب'' ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'') ڈاکٹر تحسین فراقی (''عبدالماجد دریا بادی احوال و آثار'' ''سفرنامہ عجائبات فرنگ'' (تحقیقی مقدمہ)) ممتاز منگلوری (''تاریخی ناول کی تحقیق'' ''شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' ''نوابی دربار کی حاشیہ نگاری'' ''اندر سبھا'' تدوین و مقدمہ) ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (اکبرالٰہ آبادی تحقیقی و تنقیدی مطالعہ) رفیع الدین ہاشمی (''خطوط اقبال'' ''رجب علی بیگ سرور اور افسانہ عجائب'' ''تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ'') ڈاکٹر عطش درانی (''اردو اصطلاحات سازی'' ''اردو زبان اور یورپی اہل قلم'' ''پنجاب میں اردو اور دفتری زبان'') ڈاکٹر سہیل احمد خان (''داستانوں کی علامتی کائنات'' ''طرفین'' ''طرزیں'' ''سرچشمے'' ''داستان در داستان'' (مرتبہ)) ڈاکٹر سلیم اختر (''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ''اقبال کا نفسیاتی مطالعہ'' ''نفسیاتی تنقید'' ''اردو افسانہ حقیقت سے علامت تک'' 'شعور ولاشعور کا شاعر غالب'' ''تنقیدی دبستان'') ڈاکٹر خورشید رضوی (''دیوان غالب مرتبہ حامد علی خان کے حواشی کا محققانہ تجزیہ) ڈاکٹر ملک حسن اختر (''تاریخ ادب اردو'' ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تاریخ'' ''دائرہ معارف اقبال'' ''تنقیدی اور تحقیقی جائزے'' ''اقبال ایک تحقیقی مطالعہ'' ''حیات غالب کا ایک باب'' ''تہذیب و تخلیق'') رضی عابدی (مغربی ڈراما اور جدید ادبی تحریکیں) ڈاکٹر صدیق جاوید (''اقبال پر تحقیقی مقالے'' ''بال جبرئیل کا تنقیدی مطالعہ'') ڈاکٹر وزیر آغا (''اردو ادب میں طنز و مزاح'' ''تخلیقی عمل'' ''تنقید اور احتساب'' ''اردو شاعری کا مزاج'') شیخ عنایت اللہ (''اردو زبان کے ترکی عناصر'' (مضمون)) ڈاکٹر محمد صابر (''اردو میں ترکی اور منگولی الفاظ'' ''اردو کی تاریخ'' (مضمون)) ڈاکٹر

سعادت سعید (''اقبال ایک ثقافتی تناظر'' ''ادب اور نفی ادب'' ''فن اور خالق'' ''جہت نمائی'') ڈاکٹر آفتاب احمد (''غالب آشفتہ نوا'' ''ن م راشد شخص اور شاعر'') ڈاکٹر سعید اختر درانی (''اقبال یورپ میں'' ''نوادر اقبال یورپ میں'') ڈاکٹر جاوید اقبال (زندہ رود) ڈاکٹر انور سدید (''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' ''اردو ادب کی تحریکیں'' ''اقبال کے کلاسیکی نقوش'' ''غالب کا جہاں اور'' ''اردو افسانہ عہد بہ عہد'' ''مولانا صلاح الدین احمد ایک مطالعہ'') ڈاکٹر مظفر عباس (''اردو کی زندہ داستانیں'' ''اردو کی قومی شاعری'') وغیرہ محض چند نام ہیں جنھوں نے مختلف نظریات و رجحانات کو بروئے کار لا کر تحقیق و تنقید کے موضوعات کو وسعت دی۔

چنانچہ ادبی تاریخ، لسانیات، تذکرے، ادبی شخصیات، اصناف، شعر و نثر کے علمی، ادبی، لسانی اور تاریخی ورثے کو دریافت کرنے اور کلاسیکی متون کی تدوین و بازیافت پر بھی بھرپور توجہ دی گئی۔ جس سے اردو نثر میں تحقیق و تنقید میں سائنٹفک انداز کو برتنے کی روایت قائم ہوئی۔ اس سلسلہ کو وقیع اور مستند بنانے کے لیے تحقیق و تنقید کی مبادیات پر بھی کام کیا گیا۔ بیسویں صدی میں مجموعی اعتبار سے تنقید نے تحقیق کی نسبت زیادہ ترقی کی۔ ادبی تحریکوں اور رجحانات کے تحت تنقید کے کئی دبستانوں [۸] (رومانی، جمالیاتی، عمرانی، تاریخی، تاثراتی، مارکسی، نفسیاتی، تشریحی، ساختیاتی) کے وجود میں آنے سے تنقیدی زاویوں میں اضافہ ہوا۔ جس سے اردو زبان و ادب اور ادبی شخصیات (بالخصوص میر، غالب، اقبال، فیض) کی تفہیم میں بہت مدد ملی۔ انہی عوامل نے تنقید کا میدان خاصا زرخیز بنا دیا ہے اور ہنوز یہ سلسلہ کامیابی سے جاری ہے جبکہ قیام پاکستان کے بعد سے عہد حاضر تک لاہور میں تحقیق کی روایت کو علمی و ادبی رسائل و اداروں اور جامعات میں ہونے والے تحقیقی کام نے زندہ رکھا ہوا ہے۔ [۹]

ڈراما: لاہور میں اردو ڈراما کا چلن انیسویں صدی کی آخری دو دہائیوں میں شروع ہوا۔ جس نے صحیح معنوں میں ارتقائی مراحل بیسویں صدی میں طے کیے۔ تھیٹریکل کمپنیوں کے ڈراموں، ریڈیو ڈراما، کتابی ڈراما (جو پڑھنے کے لیے کتابی صورت میں شائع کیا جاتا ہے) اور ٹیلی ویژن ڈراما کی کڑیاں ترقی کی منازل طے کرنے کے بعد مقبول صنف ادب کے طور پر آج بھی رائج ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اردو ڈراما کی عنان آغا حشر، حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج، میر عباس علی، سید دلاور شاہ، ابراہیم محشر، میر غلام عباس، محمد شاہ اسماعیل، غلام علی دیوانہ، دیوان آتما نند شرر وغیرہ کے ہاتھوں میں تھی۔ آغا حشر نے اردو تھیٹر ڈراما کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے ۱۹۱۰ء میں انڈین شیکسپیئر تھیٹریکل کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ [۸۰] جسے لے کر مارچ ۱۹۱۳ء اور ۱۹۱۷ء میں لاہور آئے۔ پھر جب ۱۹۱۳ء میں لاہور میں نانک چند سیٹھ نے البرٹ تھیٹریکل کمپنی کا آغاز کیا تو یہ آغا حشر ہی تھے

جن کے آنے سے تھیٹر کا مزاج بدل گیا۔ اس دور میں سٹیج کیے جانے والے ڈراموں میں مقفٰی و مسجع نثر کے ساتھ معتد بہ حصہ نظم پر مشتمل ہوتا تھا جو اسٹیج ڈراموں کے لیے ناگزیر ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ اس کا مقصد کاروباری مقاصد کے پیش نظر عوام کو تفریح فراہم کرنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آغا حشر کے ڈراموں ''آفتاب محبت'' ''مارآستین'' ''مرید شک''، ''اسیر حرص'' ''خون ناحق'' اور شہید ناز کے مکالموں میں شعروں کی تعداد زیادہ رہی۔ لیکن جیسے جیسے انہوں نے اپنی حیثیت کو منوانا شروع اور ذہن وفکر میں خوداعتمادی کے ساتھ فنی پختگی آئی تو ڈراموں سے گانوں کی تعداد کم اور نثر کا حصہ بتدریج بڑھتا چلا گیا۔ ایسے میں صرف وہ اشعار استعمال کیے گئے جو مکالموں کو جاندار بنا دیتے تھے۔ آغا حشر نے شیکسپیئر اور دیگر یورپین ڈراما نگاروں کے ڈراموں کے آزاد تراجم بھی کیے اور اس میں اختراع یہ کی کہ المیہ کو طربیہ میں بدل دیا۔ اسیر حرص، یہودی کی لڑکی، سفید خون، صید ہوس، سلور کنگ، خواب ہستی، خوبصورت بلا، خود پرست، بلوامنگل، میں یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ فنی اعتبار سے آغا حشر کے بہترین ڈراموں میں انوکھا مہمان، نعرہ توحید، ہندوستان، ترکی حور، پہلا پیار، آنکھ کا نشہ، رستم وسہراب، اور دل کی پیاس وغیرہ ڈراما نگاری کی روایت کو پروان چڑھانے میں ممدومعاون ثابت ہوئے۔ اس زمانے میں گورنمنٹ کالج لاہور۸۱؎ کی ڈرامیٹک سوسائٹی ۸۲؎ نے بھی اہم کردار ادا کیا کہ اسٹیج کے لیے انگریزی سے مختلف ڈراموں کے تراجم کیے گئے۔ مثلاً ۱۹۱۷ء میں اسٹیج کے لیے شیکسپیئر کا ایک ڈراما ''اے کامیڈی آف ایررز'' کا ترجمہ ''گورکھ دھندا'' کے نام سے پنڈت نرائن پرشاد بیتاب نے کیا۔ ۸۳؎ اسی طرح ۱۹۱۸ء میں سوسائٹی نے شیکسپیئر کے ڈراما ''ہملٹ'' کے علاوہ ''مہارانی آف اراگان'' ''بوکس اینڈ کوکس'' اور ''دی مین ہوایٹ پوپومیک'' کا ترجمہ کرکے اسے اسٹیج کیا۔ نیز اس زمانے میں بہت سی انگریزی ڈراموں کو سوسائٹی نے اردو کا جامہ پہنایا۔ پھر ''۱۹۳۰ میں گوگول کے مشہور ڈرامے ''انسپکٹر جنرل'' کا ترجمہ ڈاکٹر محمد صادق نے کیا یہ ڈراما بے حد مقبول ہوا اور لاہور کے علاوہ کراچی میں بھی اسٹیج ہوا۔ ۱۹۳۳ء میں چیکوسلواکیہ کے ادیب کیرل چپیک کے ڈرامے ''راسمز یونیورسل روباٹ'' (آر-یو-آر) کا ترجمہ پطرس بخاری نے مکمل کیا۔'' ۸۴؎ اسی ماحول میں حکیم احمد شجاع نے بھی خود کو بحیثیت ڈراما نگار متعارف کرایا۔ جو آغا حشر سے متاثر تھے ان کے ڈراموں میں قدیم روایات کے ساتھ جدت کا امتزاج بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ ڈرامے کو اس تکنیک میں فنکارانہ چابکدستی سے بیان کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ نیز آغا حشر سے تلمذ کی بناء پر ان کے یہاں خطابت کا انداز بھی نمایاں ہے۔ ایسے ہی ڈراموں میں'' باپ کا گناہ'' اور ''بھیشم پرگتیا'' میں آغا حشر کے اثرات نمایاں ہیں۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں جو ڈرامے لکھے وہ زیادہ تر ہندوستان کی معاشرتی اور مجلسی زندگی سے متعلق تھے۔ اس ضمن میں ''دھن وان'' ''دوعورتیں'' ''آنسوؤں کی دنیا'' ''جانباز دلہن'' ''بھارت کا

لال‘‘ ’’حسن کی قیمت‘‘ اور ’’رات کا گناہ‘‘ نے شہرت عام اور مقبولیت دوام پائی۔ جبکہ کچھ ڈرامے دنیا کے بڑے بڑے تاریخی واقعات پر مبنی تھے۔ مثلاً ’’آخری فرعون‘‘ اور ’’صلاح الدین ایوبی‘‘ ایسے ہی ڈرامے تھے جسے ارباب علم نے بے حد سراہا۔ اس کے ساتھ ترجمہ کے فن کو بھی ڈراما نگاری کے لیے استعمال کیا۔ اس حوالے سے انہوں نے تین بنگالی ڈرامے ’’مینا‘‘ ’’منقوش‘‘ اور ’’تارا‘‘ گورنمنٹ کالج لاہور کی ڈرامیٹک سوسائٹی کے لئے ترجمہ کیے۔ ان ڈراموں کی مقبولیت کی بابت خود حکیم احمد شجاع لکھتے ہیں:

’’تین ڈراموں کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ نے بہت پسند کیا نقادانِ فن اور صاحبانِ ذوق کی نگاہوں میں میرے لکھے ہوئے ڈراموں کی یہ قدر و منزلت بھی ہوئی کہ انہیں ہندوستان کی بڑی بڑی نامی درسگاہوں کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کی اسٹیج پر بھی تمثیل کیا گیا اور ان کی تمثیل میں گورنمنٹ کالج لاہور کے موجودہ پرنسپل مسٹر گوردوت سوندھی، آل انڈیا براڈکاسٹنگ کے کنٹرولر سید احمد شاہ بخاری، ہندوستان کے نامور ادیب سید امتیاز علی تاج، پنجاب کے مشہور تمثیل نگار دیوان آتما نند شرر اور اس ملک کے مایہ ناز کریکٹر ایکٹر مسٹر جگل کشور نے حصہ لیا۔‘‘ ۸۵؎

حکیم احمد شجاع کے علاوہ اردو نثر میں ڈراما کو ادبی شاہکار بنانے میں امتیاز علی تاج اور ان کے ڈراما ’’انارکلی‘‘ نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ اگرچہ یہ تھیٹر کی تکنیک پر پورا نہ اترنے کی وجہ سے اپنی اصل صورت میں اسٹیج نہ ہو سکا لیکن اپنی دلکش ادبیت، مکالموں کی چستی، برجستگی اور زبان کی خوبی، کردار نگاری اور فنی چابکدستی کی بناء پر بہت مقبول ہوا۔ امتیاز علی تاج نے ڈراما کے موضوع، تکنیک، پلاٹ کے ارتقا اور واقعات کی ترتیب میں فنی ہنر مندی کا ثبوت دیتے ہوئے اکبر، سلیم اور انارکلی کا بہترین المیہ تخلیق کیا۔ امتیاز علی تاج نے انگریزی ڈراموں سے اخذ و ترجمہ بھی کیا مثلاً ’’برنارڈ شاہ کے ڈرامے، ’’آرمز اینڈ دی مین‘‘ کا ترجمہ پطرس بخاری کی زیر نگرانی کیا۔ ۸۶؎ اور شیکسپیر کے ڈراما "A Mid Summer Night Dream" کا ترجمہ ’’ساون رین کا سپنا‘‘ کے نام سے کیا۔ ان کے ساتھ ’’ایمان کا فیصلہ‘‘، ’’رتناولی‘‘، ’’نکاح ثانی‘‘ اور ’’ملے میزاں نین برآں‘‘ بھی گورنمنٹ کالج لاہور کے اسٹیج پر پیش کیے گیے۔ اس کے علاوہ ’’قرطبہ کا قاضی‘‘ انگریز ڈراما نویس لارنس ہاوس مین کے ون ایکٹ کی بے حد کامیاب ٹریجڈی ہے۔ امتیاز علی تاج کے علاوہ ظفر علی خان، ڈاکٹر عابد حسین، اشتیاق حسین قریشی، جلیل قدوائی، اور عبدالغفار نے بھی گالزوری، بودلیر، گوئٹے، میٹرلنک، آسکر وائلڈ، شلر، چیخوف کے ڈراموں سے اخذ و تراجم کیے۔ ہر چند کہ یہ کوئی خاص معیار قائم نہ کر سکے لیکن ڈراما کے ارتقا میں ضرور معاون ثابت ہوئے۔ کاروباری نقطہ نظر سے لکھے جانے والے اردو ڈراموں میں زندگی کی گہرائیوں سے شناسائی کا فقدان دکھائی دیتا ہے

لیکن اس کے باوجود حکیم احمد شجاع، امتیاز علی تاج، جیسے ڈراما نگاروں، رفیع پیر تھیٹر اور اجو کا تھیٹر نے سٹیج ڈرامے کو اس کے تجارتی مقاصد سے نکال کر تفریحی اور فنی لوازمات کے ساتھ کامیابی سے برتا۔ اردو ڈراما نگاری کی صنف کو مقبول بنانے میں ''راج دلاری'' رفیع پیر (اکھیان) انور عنایت اللہ (''عورت اور تاش کے پتے'' ''جب تک چمکے سونا'') پنڈت دتاتریہ کیفی (''مراری دادا'' ''راج دلاری'') اصغر بٹ (''عدل جہانگیری'' ''چھوٹے میاں'' ''موضوع کی تلاش'' ''کرائے کا مکان'' ''نقو خیری'') محمد عمر نور الٰہی (''تین ٹوپیاں'' ''ظفر کی موت'' ''ہمہ خانہ آفتاب'' ''بگڑے دل'') آغا بابر (''گنج فراواں'' ''سیز فائر'' ''بڑا صاحب'') عتیق اللہ شیخ (''قصہ ایک محبت کا'' ''کیا مذاق ہے'') انور سجاد ((''قافلے'' ''ایک تھی ملکہ'' ''وہ بات اور تھی'') یونس ادیب (''اونچے نیچے لوگ'' ''بڑے وہ ہیں'') سلیم چشتی (اور شبنم روتی رہی) بانو قدسیہ (''منزل منزل'' ''اک تیرے آنے سے پہلے'' ''یہ جنوں نہیں تو کیا ہے؟'') انتظار حسین (''خوابوں کے مسافر'' ''درد کی دوا کیا ہے؟'') ابو سعید قریشی (نخرے) امجد اسلام امجد (گھر آیا مہمان) شعیب ہاشمی (مہمان کیسے کیسے) فاروق ضمیر (وہ رہے وضو کرتے) خادم محی الدین (بہار تمثیل) عشرت رحمانی (''نیا سویرا'' ''کالا سورج'' ''لال قلعہ کی ایک شام'' ''یہ تیرا بیان غالب'' ''شاہجہاں'') رحمٰن مذنب (''جہاں آراء'' ''کڑوا رس'' ''اندھی مالن'' ''عمر خیام'' ''کنگال'' ''بت زریں'' ''مجرو'' ''کانچ کے پتلے'' ''تکون'' ''نیا آدم'' ''مزاج یار'' ''پیار کی قیمت'' ''ای ڈی پس'' ''سوم رس'') جبکہ مغربی ڈراموں سے ترجمہ کرنے والوں میں امتیاز علی تاج (''آداب عرض'' از گولڈ سمتھ) مہر نگار سرور (''گڑیا کا گھر'' از ابسن) اظہار کاظمی (''مجرم کون'' از جے بی پریسٹلے) وغیرہ نے ڈراما نگاری کی راہیں ہموار کیں اور اس صنف نثر کو پروان چڑھانے میں فعال کردار ادا کیا۔ چنانچہ ملکی و سیاسی حالات کے ناسازگار ہونے کی وجہ سے جب اردو تھیٹر ڈراما رو بہ زوال ہوا تو ادبی رسائل اور کتابی ادبی ڈراموں نے ڈراما نگاری کو زندہ رکھا۔ اور ساتھ ہی ریڈیو ڈراما (صوتی ڈراما) کو بھی فروغ ملا۔ جس نے ڈراما کو سنانے کی چیز بھی بنا دیا۔ اس سے قبل ہومر، شیکسپیئر، دانتے، گوئٹے، ٹالسٹائی، چیخوف، مولیئر، شلر، میترلنک، ابسن، الیٹ، پرانڈیلو اور گالزوری، وغیرہ سے اخذ شدہ یا تلخیصی صورت میں تخلیقی ڈراموں کی کمی کو پورا کیا جا رہا تھا لیکن ریڈیو ڈراما نے اسے تخلیقی جہت بھی عطا کی اور ہر طرح کے طبعزاد ڈرامے (تاریخی، سماجی، رومانوی، مزاحیہ، جاسوسی) لکھنے کی روایت کو تقویت دی۔ ریڈیو ڈراما نے یک بابی ڈراما کو مقبول بنایا تو کئی ادبا نے ریڈیو کے لیے بہت اچھے ڈرامے لکھے اور اس کے فن پر خصوصی توجہ دی۔ ان میں راجندر سنگھ بیدی (''خواجہ سرا''، ''چاکیہ'') کرشن چندر (''سرائے کے باہر'' دروازہ'' ''نیل کنٹھ'' ''بیکاری'' ''حجامت'') سعادت حسن منٹو[8] (''آؤ'' ''کروٹ'' ''جنازے'' ''منجدھار سے پہلے'' ''تین عورتیں'') امتیاز علی

تاج (''الو کی زبان'' ''ناموس'' ''میری جان کس نے لی'' ''ورجینیا'' ''قرطبہ کا قاضی'' ''قید اور صیاد'' ''شیخ برادران'') سید عابد علی عابد (''روپ متی'' ''باز بہادر'' ''دلی کا قتل عام'' ''عمر خیام'' ''چنگیز خان'' ''زندگی کی تلاش'' ''ید بیضا'') رفیع پیر (''طیلی'' ''کفارہ'' ''گجر'' ''ولے بخیر گذشت'' ''نواب صاحب قبلہ'') شوکت تھانوی (''منشی جی'' ''مجھے خرید لو'' ''قاضی جی'') اشفاق احمد (''اللہ کے پیارے'' ''گل فروش'' ''امی'' ''بھرم'') بانو قدسیہ (آدھی بات) انتظار حسین (آخری آدمی) اوپندر ناتھ اشک (''چرواہے'' ''تلون'') احمد ندیم قاسمی (''دارالشکوہ'' ''مصور'') اصغر بٹ (''تعاقب'' ''ساحل کی تمنا'') محمود نظامی (الف لیلی کی رات) قدرت اللہ شہاب (سرخ فیتہ) ممتاز مفتی (''آپا'' ''رکھوالا'') خدیجہ مستور (''آخری لمحوں کا سکون'' ''کھڑکی'') جاوید اقبال (''غدار'' ''گردش'') انور سجاد (''دستک'' ''لمحے کی داستان'') سلیم احمد (''خودکشی'' ''الٹ پھیر'') ریاض فرشوری (جھوٹے پر لعنت) خاطر غزنوی (''چاند کا مسافر'' ''زرینے'') شہزاد احمد (کلارک ناور) یوسف ظفر (شہہ سوار) مرزا ادیب (''پس پردہ'' ''فصیل شب'') باسط سلیم (محاصرہ) ابوالحسن نغمی (ویران حویلی) کے علاوہ کنہیالال کپور، ہاجرہ مسرور، مختار صدیقی اور انور جلال وغیرہ نے بھی ڈراما نگاری کو فنی معیار اور استحکام دیا جبکہ ادبی تحریکوں سے وابستہ ادیبوں نے اپنے مخصوص نقطہ نظر سے ڈرامے تخلیق کیے۔ یوں بیسویں صدی میں ڈراما زندگی کے متنوع رنگوں کے ساتھ جلوہ گر رہا۔ لاہور میں اردو ڈراما کے ارتقا میں ریڈیائی ڈراموں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ ریڈیو ڈراما کے علاوہ کتابی مجموعوں نے بھی ڈرامے کے فن کو فروغ دیا۔ ایسے ڈرامے فنکار کی تخلیقی اپج کا اظہار ہوتے ہیں۔ جنہیں ضرورت پڑنے پر ریڈیو اور اسٹیج کے لیے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہ ایسے ڈراموں کی ذیل میں آتے ہیں جنہیں بیشتر پڑھنے کے لیے لکھا جاتا ہے اس لیے ان کے لیے کتابی ڈراما کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ ایسے ڈراموں میں ''انارکلی'' ''انوکھا دربار'' (امتیاز علی تاج) ''جنگ روس و جاپان'' ''تولہ بھر ریڈیم'' (مولانا ظفر علی خان) ''ماموں جان اور ماموں جان'' ''ستون'' ''آنسو اور ستارے'' ''لہو اور قالین'' ''شیشہ و سنگ'' ''ایک مسافر'' (مرزا ادیب) ''وہ لوگ'' ''تیسری منزل'' (ہاجرہ مسرور) ''قید حیات'' (اوپندر ناتھ اشک) ''اس منجدھار میں'' (سعادت حسن منٹو) ''سوکھے درخت'' ''اداس موڑ'' ''دھوئیں کے آنچل'' (ابراہیم یوسف) ''ثریا کی گڑیا'' ''جادو کا لفظ'' (غلام عباس) ''تین ناٹک'' (احمد ندیم قاسمی) کرشمہ جہالت (کنہیا لال کپور) ''اڑنے والا پتھر'' ''ننھا گڈریا'' (کمال احمد رضوی) ''پٹھان کا بیٹا'' (مسلم ضیائی) ''دوسری شام'' ''کھیتی'' ''ہیروئن کی تلاش'' (محمد مجیب) ''سرخ بالوں والی لڑکی'' (انور سجاد) ''سوگوار'' (مرزا ریاض) مثال کے طور پر (رضی ترمذی) ''لال قلعے کی شام'' ڈررامے چند (عشرت رحمانی) ''نیم شب'' ''گناہ کی دیوار'' ''ہمزاد'' ''صید زبوں'' (اشتیاق قریشی) ''آگرہ

بازار" (حبیب تنویر) تماشا گر (پروفیسر حق نواز) وغیرہ جیسے مجموعوں نے ڈراما نگاری کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھا۔ انتظار حسین، رضیہ فصیح احمد اور آغا بابر نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا۔

اسٹیج ، ریڈیو اور کتابی ڈراما کی اگلی منزل ٹیلی ویژن ڈراما (بصری ڈراما) بنی۔ جس نے ازسرِنو ڈرامے کو اس کی اصل معنویت کے ساتھ زندہ کیا۔ اردو ڈراما کے احیاء میں موضوعات و اظہار کے سب سے زیادہ تجربے کرنے میں ٹیلی ویژن ڈراما نے خاصا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ٹیلی ویژن ڈراما کو ادبی تخلیق کاروں کی سرپرستی میسر آئی جس سے المیہ اور طربیہ ڈراموں نے نہ صرف مقبولیت کی انتہا کو چھوا بلکہ ڈرامے کا اس نئے میڈیم کے لیے ادبی اور تخلیقی مزاج بھی متعین ہوا۔ ایسے ہی ڈراموں میں "خدا کی بستی" (شوکت صدیقی) "سونا چاندی" "ابابیل" "دروازہ" "کھڑکی اور آئینہ" (منو بھائی) الف ۔ نون (کمال احمد رضوی) "وارث" "دکھوں کی چادر" "سمندر" (امجد اسلام امجد) "کافی ہاؤس" (حمید کاشمیری) "کہانی" "ایک محبت سو افسانے" "شہر آرزو" "حیرت کدہ" (اشفاق احمد) "ضرب، جمع تقسیم" "ساتول موڑ مہاراں" (بانو قدسیہ) "آخر شب" "یہ قربتیں یہ فاصلے" (صفدر میر) "تعبیر" "الٹ پھیر" "رخصتی" "اعتراف" (سلیم احمد) "تکون" (رحمان مذنب) "رات پچھلا پہر" "رشتے" "دریچہ" "صبح سے پہلے" (انور سجاد) "مراۃ العروس" (پروفیسر حق نواز) "نشیمن" (سلیم چشتی) "اندھیرا اجالا" "کانچ کا پل" (یونس جاوید) "ہزاروں راستے" "پرندہ" "سورج کے ساتھ ساتھ" "شہہ پر" "کالاش" (مستنصر حسین تارڑ) "قاسمی کہانی" (احمد ندیم قاسمی) "لیمپ پوسٹ" "کیسے کیسے لوگ" (سرمد صہبائی) "بندھن" (بشریٰ رحمٰن) "شب دیگ" "خواجہ اینڈ سنز" "شیدا ٹلی" (عطا الحق قاسمی) "راہیں" (منشا یاد) "غلام گردش" "الاؤ" "چاند گرہن" "نجات" "بول میری مچھلی" (اصغر ندیم سید) وغیرہ نے ٹیلی ویژن ڈرامہ کو سیریل، سیریز، طویل دورانیہ کا کھیل کی صورت میں فنی معیار بخشا۔ اردو ڈراما کی ترقی میں یہ اختراع بھی معاون ثابت ہوئی کہ طبعزاد ڈراموں کے ساتھ کلاسیک ناولوں اور افسانوں کو بھی ڈرامائی صورت میں ڈھالنے کا رجحان بھی رائج رہا ہے۔ مقالہ نگار کے خیال میں اس کی ابتدا شوکت صدیقی کے ناول "خدا کی بستی" سے ہوئی۔ بعد ازاں ڈپٹی نذیر احمد، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، مستنصر حسین تارڑ، رضیہ بٹ، بشریٰ رحمٰن، عمیرہ احمد اور رضیہ بٹ وغیرہ کی افسانوی تحریروں کو ڈرامائی تشکیل دے کر جدت سے ہمکنار کرنے کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ عہد حاضر میں فنی اور تکنیکی حوالے سے سوپ ڈراما کے ساتھ ڈراما نگاری کی صنف نثر ٹیلی ویژن کی سطح پر بدستور اپنی مقبولیت قائم رکھے ہوئے ہے۔

طنز و مزاح نگاری: طنز و مزاح نگاری جو زندگی کا ایک رویہ تھی۔ بیسویں صدی میں آ کر با قاعدہ ایک صنف کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جس کی تربیت ونشوونما اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے فکاہیہ کالموں نے کی۔ معیاری طنز و مزاح نگاری اپنی خصوصیت کے اعتبار سے انتہائی مشکل کام ہے لیکن پھر بھی اردو نثر میں تسلسل کے ساتھ جاری و ساری نظر آتا ہے۔ نثر میں مزاح نگاری کے ہر حربہ (پیروڈی، لفظی ہیر پھیر، لطیفہ طرازی، مزاحیہ کردار، بذلہ سنجی) کو اس خوبی سے برتا گیا ہے کہ نثری اصناف میں اس نے اپنا ایک الگ اور منفرد مقام بنا لیا ہے۔ طنز و مزاح نگاری کی خوش بختی ہے کہ اسے نامور ادباء کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ بیسویں صدی میں طنز و مزاح نگاری کی روایت کو تقویت دینے میں سعادت حسن منٹو (''تلخ ترش شیریں'') پطرس بخاری (پطرس کے مضامین) چراغ حسن حسرت (جدید جغرافیہ پنجاب، حرف و حکایت، کیلے کا چھلکا) امتیاز علی تاج (چچا چھکن) کنہیا لال کپور (''سنگ وخشت'' ''نرم وگرم'' ''بال و پر'' ''شیشہ و تیشہ'') شوکت تھانوی (''بحر تبسم'' ''سودیشی ریل'' ''بُزبُھس'' ''لاہوریات'' ''مضامین شوکت'') محمد خالد اختر (مکاتیب خضر) سید محمد جعفری (''کتابی چہرے'' ''اڑتے ہوئے خاکے'') ۸۸ شفیق الرحمٰن (''کرنیں'' شگوفے'' ''حماقتیں'') عطا الحق قاسمی (''حبس معمول'' ''شرگوشیاں'' ''خند مکرر'' ''جرم ظریفی'' ''عطایئے'') مشکور حسین یاد (''لا حول ولا قوت'' ''تماشا کہیں جسے'' ''دشنام کے آئینے میں'' ''ستارے چھپاتے ہیں'' ''ستم ظریفی'') فکر تونسوی (''فکریات'' ''پیاز کے چھلکے'') امجد حسین (''جملہ معترضہ'' ''میرا گریبان'') مسعود مفتی (سر راہے) مرزا محمد منور (اولاد آدم) ایم-آر کیانی (افکار پریشان) اے حمید (''داستان غریب حمزہ'' ''غالب رائل پارک میں'') یوسف ناظم (''فی الحال'' ''ذکر خیر'') مرزا ریاض (دست وگریباں) انتظار حسین (ذرے) مستنصر حسین تارڑ (''الو ہمارے بھائی ہیں'' ''گزارا نہیں ہوتا'' ''چک چک'') یونس بٹ (''شناخت پریڈ'' ''ظل دستہ'' ''عکس درعکس'')۸۹ اشفاق احمد ورک (''قلمی دشمنی'' ''ذاتیات'') اعتبار ساجد (مزید فلکاریاں) ظفر بخاری (بے ادب بامراد) شفاعت احمد (شگفتہ شگفتہ) شمس کاشمیری (زیرو پوائنٹ) کبیر خان (کشمیر کا تاریک جغرافیہ) اظہر حسن صدیقی (آئینہ کیوں نہ دوں) سلمٰی یاسمین نجمی (کوئے ملامت) اختر حسین (شیخیاں) تنویر حسین (''مزاج بخیر'' ''شاباش'' ''خوش آمدید'') وغیرہ نے اردو نثر کو موضوع اور اسلوب کی شگفتگی اور تازگی سے ہمکنار کر رکھا ہے۔

خطوط نگاری: مکتوب نگاری نجی ضروریات کے تحت وجود میں آنے والی ایسی صنف ہے جو صدیوں سے اپنا وجود رکھتی ہے لیکن اسے ادبیت کا درجہ غالب کے خطوط سے ملا۔ شخصیت پر تنقید و تحقیق کے لیے ان کی اہمیت اساسی نوعیت کی ہوتی ہے کیونکہ ''صرف ایک ہی شے انسان کی حقیقی شکل وصورت کا آئینہ ہوسکتی ہے اور وہ اس

کے ذاتی اور نجی خطوط اور مکاتیب کا ذخیرہ ہے۔ چونکہ لکھنے والے کو یہ کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ اس کے یہ پوشیدہ اعترافات کبھی منظر عام پر آئیں گے۔ پھر ایسے بہت سے مکتوب الیہ ہوتے ہیں جو اس کے محرم اسرار اور عزیز دوست ہوتے اور جن سے کوئی پردہ نہیں رہتا اس لیے وہ نہایت سادگی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنا ہر حال اور خیال بے پس و پیش حوالۂ قلم کرتا جاتا ہے اس لیے اس آئینہ میں انسان ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ درحقیقت وہ ہے۔''۹۰ لہٰذا یہ خطوط ہی ہیں جو کسی ادیب کی شخصیت مزاج اور نظریات کو سمجھنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ اسی بناء پر نجی خطوط کو تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے کہ ان میں اپنے عہد کی تصویری جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ لاہور میں اردو نثر میں مکتوب نگاری کی صنف کو فروغ دینے کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز میں رسالہ ''مخزن'' نے کی۔ مدیر ''رسالہ مخزن'' شیخ عبدالقادر نے سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد کے خطوط چھاپنے کے لیے سعی و دلچسپی ظاہر کی۔ کیونکہ غالب کے بعد مولانا آزاد ہی کے خطوط میں یہ خصوصیت موجود ہے کہ ان سے عبارت آرائی کا حظ اٹھایا جا سکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ غالب کے خطوط میں ہمہ گیریت ہے جبکہ مولانا آزاد کے خطوط بیشتر ان کی ذاتی اور نجی زندگی کے نشیب و فراز کی دستاویز ہیں۔ عبارت آرائی اور مرقع کشی کا وصف دونوں ادباء کے ہاں مشترک ہے۔ خواجہ حسن نظامی کا کہنا درست ہے کہ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے مؤثر آسان اور سمجھ میں آنے والے الفاظ۔۔۔غالب اور آزاد کے واقعات میں بہت مشابہت ہے زمانہ بھی دونوں کا قریب قریب تھا دل بھی دونوں کے سلطنت اسلامی کے انقلاب نے مجروح کر دیئے تھے۔ چوٹ کھایا ہوا دل دوچار قطرے خون کے عبارت میں ملا دیتا تھا جس سے پڑھنے والا مسحور ہو جاتا تھا۔''۹۱ یہی وجہ رہی ہو گی کہ شیخ عبدالقادر نے ''مخزن'' ۱۹۰۶ء میں مکتوبات آزاد کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا یہ خطوط مولانا آزاد نے میجر سید حسن بلگرامی کے نام لکھے تھے۔ جو بعد ازاں کتابی صورت میں کچھ مزید خطوط کے ساتھ چھپ گئے جن میں مولانا آزاد کے شاگردوں محمد دین، لالہ دونی چند، ناصر نذیر فراق کے علاوہ ڈاکٹر لائٹنر، سرسید احمد خان، منشی ذکاء اللہ، نواب علاؤ الدین، حافظ غلام رسول ویراںؔ کے نام خطوط بھی شامل ہیں۔ خطوط میں عبارت آرائی کے یہ دو نمونے ملاحظہ ہوں جن میں اولذکر میجر سید حسن بلگرامی کے نام جبکہ دوسرا منشی ذکاء اللہ کے نام لکھا گیا۔

> ''آزاد نے کہا سحر کا نور، شفق کی سرخی، صبح کا عالم جب نظر آتا ہے اہل دل کہتے ہیں سبحان اللہ! صبا و نسیم پھولوں کی شمیم لاتی ہیں۔ دل کہتا ہے صلی علی۔ اس میں آفتاب سے اجازت اور اس میں خسرو گل سے اتخراج کون کرتا ہے۔''۹۲
>
> ''حقیقت میں لطف عجیب حاصل ہوتا جاتا تھا سینہ ہلکا ہوتا تھا گھبراہٹ تھم جاتی تھی۔ جوہڑ کے کنارے پر پہنچے تو ہوا کی لہریں پانی سے مباحثہ کر رہی تھیں۔ شیشم کا ہرا بھرا درخت اس کی

شادابی کا لطف، ٹھنڈی ہوا کی موجیں حکم ہوا کہ یہاں رات کا سامان کر بیٹھو دل بھوکا ہے پیٹ بھوکا ہے گھر آ کر تقاضائے شفقت سے صرف دہی چاٹ کر اور ڈیڑھ کباب سے منہ سلونا کر کے دسترخوان زیادہ کیا۔''۹۴

مجموعی طور پر خطوط نگاری کا جائزہ لیا جائے تو بالخصوص ادباء اور بڑی شخصیات کے خطوط ہی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔اس میں ادبی عنصر کے علاوہ شخصیت کے نفسیاتی،فکری، معاشرتی اور جذباتی زندگی کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں۔جس سے شخصیت اور اس کی تخلیقات نئی اور بہتر معنویت کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نفسیاتی تنقید میں خطوط کی حیثیت بنیادی ماخذ کی ہوتی ہے۔اسی اہمیت کے پیش نظر بیسویں صدی میں خطوط نگاری کو بھی صنف نثر میں شمار کیا گیا۔جس کی خشت اول رسالہ ''مخزن'' نے رکھی اور جب یہ سلسلہ آگے بڑھا تو اردو نثر میں خطوط کے سب سے زیادہ مجموعے جس ادبی شخصیت کے منظر عام پر آئے وہ علامہ اقبال ہیں۔جس سے خطوط نگاری کا سلسلہ تنومند ہوا۔علامہ اقبال کے خطوط ان کی وفات کے بعد ''اقبالنامہ'' مرتبہ شیخ عطا اللہ، مکاتیب اقبال (بنام غلام قادر گرامی) مکتوبات اقبال(بنام سید نذیر نیازی) مکاتیب اقبال (بنام نیاز الدین خان) کی صورت میں منظر عام پر آئے۔ جو علامہ اقبال کی نثر نگاری کا بھی عمدہ نمونہ ہیں۔علامہ اقبال نے اپنے بیشتر خطوط میں اپنے افکار کی وضاحت یا کسی مسئلے پر اظہار خیال اور بعض صورتوں میں دقیق علمی مسئلے (خودی،تصور زمان و مکاں) پر استفسار کا جواب بے ساختگی سے دیا ہے۔

علامہ اقبال نے بیشتر فلسفیانہ مسائل بیان کرتے ہوئے ان سے متعلق اصطلاحات کا فی البدیہہ استعمال کرتے ہوئے اسلوب کی سلاست کو بھی برقرار رکھا ہے۔پھر ان کے وہ خطوط جو انہوں نے مختلف سفر کے دوران لکھے ان میں جو تاثرات بیان کیے ہیں ان کا اسلوب انہیں ادبی دائرے میں لے آتا ہے۔ جہاں انشائیہ نگاری، رپورتاژ اور سفرنامہ جیسی اصناف نثر کے جوہر دکھائی دیتے تو ساتھ ہی اسلوب میں تشبیہ، استعارہ اور منظر نگاری کی خوبیاں بھی توجہ حاصل کرتی ہیں اور مکتوب الیہ سے جہاں بے تکلفی کا عنصر در آتا ہے وہاں شوخی،ظرافت، بذلہ سنجی اور لطف طبع کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

علامہ اقبال کے علاوہ جن مشاہیر ادب کے خطوط منظر عام پر آئے۔ان میں عبدالرشید چشتی،مولانا ظفر علی خان،مولانا غلام رسول مہر، جوش ملیح آبادی، سعادت حسن منٹو، میرا جی، ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر،پطرس بخاری، احمد ندیم قاسمی، خواجہ منظور حسین، پروفیسر حمید احمد خان، آغا محمد باقر، فیض احمد فیض، ڈاکٹر نذیر احمد،حسن عسکری ، مرزا

ادیب، اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ کے خطوط منظر عام پر آ چکے ہیں۔۹۴ انہی موضوعات اور اسلوبیاتی جہت سے خطوط کو اردو نثر میں ایک صنف نثر کے طور پر اعتبار بخشتا ہے۔

خاکہ نگاری: بیسویں صدی میں خاکہ نگاری کے نقوش بھی واضح ہوئے کہ اس نے ایک باقاعدہ تخلیقی صنف نثر کی حیثیت اختیار کر لی۔۹۵ شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں کی بے لاگ تصویر کشی سے پیدا ہونے والے بھرپور تاثر اور اسلوب بیان کی خوبصورتی نے اسے دائرہ ادب میں شامل کر دیا ہے۔ بیسویں صدی میں اس نے سوانح نگاری سے الگ اپنی شناخت بنائی۔ اسے یہ منفرد پہچان دینے میں محمد دین فوق (یاد رفتگاں) سعادت حسن منٹو (''گنجے فرشتے'' ''لاؤڈ سپیکر'') مرزا ادیب (ناخن کا قرض) ڈاکٹر عبادت بریلوی (''یارانِ دیرینہ'' ''غزالاں رعنا'' ''آوارگان عشق'' ''شجر سایہ دار'' ''جلوہ ہائے صد رنگ'') رئیس احمد جعفری (دید وشنید) چراغ حسن حسرت (مردم دیدہ) عبدالمجید سالک (یاران کہن) اخلاق احمد دہلوی (پھر بیاں اپنا) حمید اختر (احوال دوستان) اشرف صبوحی (دلّی کی چند عجیب ہستیاں) ممتاز مفتی (''پیاز کے چھلکے'' ''اوکھے لوگ'' ''اور اوکھے لوگ'') سید ضمیر جعفری (''کتابی چہرے'' ''اڑتے خاکے'') محمد طفیل (''آپ'' ''جناب'' ''صاحب'' ''مکرم'' ''محترم'' ''معظم'' ''محبی'' ''مخدومی'') شوکت تھانوی (شیش محل) بانو قدسیہ (مرد ابریشم) فارغ بخاری (''البم'' ''دوسرا البم'') صادق الخیری (''آسماں کیسے کیسے'' ''نایاب ہیں ہم'') ایوب قادری (کاروان رفتہ) اے حمید (''سنگ دوست'' ''یادوں کے گلاب'') لطیف کاشمیری (جمال ہم نشیں) رفیق ڈوگر (چالیس چہرے) جگن ناتھ آزاد (آنکھیں ترستیاں) احمد عقیل روبی (کھرے کھوٹے) منو بھائی (جنگل اداس ہے) یونس جاوید (چاند چہرے) عطا الحق قاسمی (''مزید گنجے فرشتے'' ''عطایئے'') ڈاکٹر آفتاب احمد (بیاد محبت نازک خیالاں) ڈاکٹر طارق عزیز (اللہ میری مغفرت کرے) محمد اجمل نیازی (''تخلص'' ''تشخص'') ڈاکٹر انور سدید (قلم کے لوگ) ڈاکٹر یونس بٹ (''شناخت پریڈ'' ''غل دستہ'' ''عکس بر عکس'') ڈاکٹر انور سدید (''محترم چہرے'' ''قلم کے لوگ'' ''ادیبان رفتہ'') اکبر حمیدی (چھوٹی دنیا بڑے لوگ) عوض سعید (خاکے) مقصود زاہدی (یادوں کے سائے) نظیر صدیقی (جان پہچان) نصر اللہ خان (ایک قافلہ جاتا ہے) رحیم گل (''پورٹریٹ'' ''خدوخال'') وغیرہ نے اہم کردار ادا کیا۔ مذکورہ ادباء کے علاوہ دیگر نامور مشاہیر ادب حسن عسکری، شیخ منظور الٰہی، عبدالسلام خورشید، ابوالخیر کشفی، احمد بشیر، ڈاکٹر خورشید رضوی، مرزا محمد منور، ڈاکٹر وزیر آغا، یوسف ظفر، اور مسعود اشعر، صابر لودھی نے بھی اخبارات و رسائل کے صفحات پر اس صنف کو معنویت عطا کی۔

کالم نگاری: انیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو صحافت کی آغوش میں پرورش پانے والی ایک اور صنف کالم نگاری نے بھی بیسویں صدی میں اپنے خدوخال متعین کیے اور اپنے موضوع اور اسلوب کی بناء پر نامور مشاہیر ادب کے ہاتھوں اپنی الگ شناخت بنانے میں نہ صرف کامیاب رہی بلکہ مقبولیت بھی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ نامور کالم نگاروں کے کالم کتابی صورت میں شائع ہو کر خاص و عام میں مقبول ہیں۔ فکاہیہ کالم نثر کی ایک ایسی صنف ہے جس میں لکھنے والا ''مسائل حیات سے لے کر معاشرے کے غیر متوازن رویوں، سماجی و سیاسی موضوعات تک بڑی بے تکلفی سے اظہار خیال کرتا ہے اور جو بات اداریہ نویس اور فیچر نگار بوجوہ کہنے سے قاصر رہتے ہیں وہی بات فکاہیہ کالم نگار ہنسی ہنسی میں کہہ جاتا ہے۔''۹۶ اس طرح فکاہیہ کالم نے طنز و مزاح نگاری کی روایت کو بھی اپنے ساتھ پروان چڑھایا۔ اخبار ''زمیندار'' کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء میں ''افکار و حوادث'' کے نام سے فکاہیہ کالم کو باقاعدہ مستقل بنیادوں پر تحریر کرنے کا آغاز کیا۔۹۷ جسے عبدالمجید سالک لکھا کرتے تھے۔ جب عبدالحمید سالک اور غلام رسول مہر نے اپنا الگ اخبار ''انقلاب'' (۱۹۲۷ء) جاری کیا تو ''افکار و حوادث'' بھی اسی میں چھپنے لگا۔ اخبار ''ملاپ'' میں ''گپ شپ'' اخبار ''پرتاپ'' میں ''گپ شپ'' اور روزنامہ ''سیاست'' میں ''راز و نیاز'' کے عنوان سے چھپنے والے کالموں نے بھی اس صنف کو ہر دلعزیز بنایا۔ مقالہ نگار اپنے مطالعے کی بناء پر نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ کالم نگاری کو روزانہ صحافت نے جنم دیا اور اسی نے اسے توانا بنایا۔ چنانچہ کالم نگاری کی صنف کو مختلف عنوانات کے تحت لکھ کر فروغ دینے میں مندرجہ ذیل احباب اور لاہور کے اخبارات و رسائل نے کلیدی کردار ادا کیا۔

چراغ حسن حسرت (''فکاہات'' اخبار زمیندار) (''مطائبات'' اخبار ''احسان'' اور رسالہ ''شیرازہ'') عطا محمد چشتی المعروف حاجی لق لق (''فکاہات'' ''ملاحظات'' اخبار زمیندار) وقار انبالوی، حمید نظامی، پروفیسر سلیم شیخ، پروفیسر اسرار حسین زیدی، علی سفیان آفاقی، (''سر راہے'' روزنامہ نوائے وقت) پروفیسر سلیم شیخ (''گاہے بگاہے'' ''قصہ کالم'' روزنامہ نوائے وقت) سعادت حسن منٹو (''تلخ ترش شیریں'' روزنامہ آفاق) عطاالحق قاسمی (''روزن دیوار سے'' روزنامہ جنگ) احمد ندیم قاسمی (''لاہور، لاہور ہے'' ''رواں دواں'' روزنامہ جنگ) (''موج در موج'' روزنامہ حریت) آغا شورش کاشمیری (''قلم قتلے'' ''آنکھیں میری باقی ان کا'' ''تلخ نوائی'' ہفت روزہ چٹان) عبدالقادر حسن (''غیر سیاسی باتیں'' روزنامہ جنگ) (''اسرار و رموز'' روزنامہ ایکسپریس) (''لاہور کی ڈائری'' ہفت روزہ لیل و نہار) مجیب الرحمٰن شامی (''جلسہ عام'' روزنامہ پاکستان) نذیر ناجی (''سویرے سویرے'' روزنامہ جنگ) ظفر اقبال (''پارٹی پالیٹکس'' روزنامہ پاکستان) (''جنگ نامہ'' روزنامہ جنگ) منو بھائی (''گریبان''

روزنامہ جنگ) (''آئینہ'' روزنامہ امروز) رفیق ڈوگر (''دیدشنید'' روزنامہ جنگ و روزنامہ نوائے وقت) شفیع عقیل (''گردوپیش'' روزنامہ جنگ) حافظ مظہر الدین ، مولانا ابو صالح اصلاحی، عالی رضوی، عبدالوحید خان (''آج کی باتیں'' اخبار کوہستان) ظہور الحسن ڈار (''مجھے کہنا ہے اپنی زبان میں'' اخبار کوہستان) دلدار پرویز بھٹی (''آمنا سامنا'' روزنامہ پاکستان) ارشاد احمد خان (''آج کی باتیں'' روزنامہ مشرق و روزنامہ خبریں) انتظار حسین (''لاہور نامہ'' روزنامہ مشرق) مستنصر حسین تارڑ (''کارواں سرائے'' روزنامہ مشرق ہفت روزہ ''اخبار جہاں'') شبنم رومانی (''محفل محفل'' روزنامہ مشرق) یونس بٹ (''عکس ریز'' ''دلداریاں'' روزنامہ پاکستان) اظہار الحق (''تلخ نوائی'' روزنامہ پاکستان) اصغر علی گھروال (''ہلکی پھلکی باتیں'' روزنامہ پاکستان) اجمل نیازی (''بے نیازیاں'' روزنامہ پاکستان) حسن نثار (''چوراہا'' روزنامہ جنگ) ظہیر بابر (''ساتواں صفحہ'' ہفت روزہ لیل و نہار) نصر اللہ خان عزیز (''تکلف برطرف'' روزنامہ تسنیم) علی سفیان آفاقی (''اشارات'' روزنامہ آفاق) راشدہ افضال (''نہ حکائتیں نہ شکائتیں'' روزنامہ مشرق) مسعود اشعر (''آئینہ'' روزنامہ امروز و روزنامہ جنگ) مقبول جہانگیر (''حرف و حکایت'' روزنامہ امروز) بشریٰ رحمٰن (''سلسلہ مظالم کا'' ''چادر چار دیواری اور چاندنی'' روزنامہ جنگ) سید ضمیر جعفری (''راول رنگ'' روزنامہ جنگ) (''نظر غبارے'' روزنامہ مشرق و روزنامہ نوائے وقت) اسلم کاشمیری (''حرف و حکایت'' روزنامہ امروز) سعادت خیالی (''خیال در خیال'' روزنامہ مشرق) سید مظفر بخاری (''گستاخی معاف'' روزنامہ امروز و روزنامہ خبریں) امجد اسلام امجد (''چشم تماشا'' روزنامہ امروز و روزنامہ جنگ) عباس اطہر (''کنکریاں'' روزنامہ نوائے وقت) ڈاکٹر صفدر محمود (''صبح بخیر'' روزنامہ جنگ) نصیر انور (''جھوٹی باتیں'' روزنامہ مشرق) خالد مسعود خان (''ماٹھا کالم'' روزنامہ خبریں) جاوید چودھری (''زیرو پوائنٹ'' روزنامہ جنگ) یاسر پیرزادہ (''ذرا ہٹ کے'' روزنامہ جنگ) اصغر ندیم سید (''سچ جھوٹ'' روزنامہ جنگ) وغیرہ نے زندگی اور معاشرے کی ناہمواری اور کج روی کا کوئی رخ ایسا نہیں جسے اپنے کالموں کا موضوع نہ بنایا ہو۔ عہد حاضر میں لکھے جانے والے کالموں میں مزاح کا عنصر تقریباً معدوم ہو چکا ہے لیکن طنز کی کاٹ مزید گہری ہوئی ہے۔ حالات کی تلخی کے باعث ایسا ہونا بدیہی امر اور وقت کی ناگزیر ضرورت بھی ہے۔ آج اردو نثر میں کالم نگاری کا مذکورہ سلسلہ کامیاب، مستحکم اور جاندار روایت بن چکا ہے۔

خودنوشت سوانح: مختلف تحریکوں کے نقطہ نظر سے متفق ادبا نے بالخصوص ناول ، افسانہ، اور تنقید کو مرکز نگاہ بنایا جبکہ دیگر نثری اصناف (سفرنامہ، آپ بیتی ، خاکہ نگاری، سوانح، طنز و مزاح وغیرہ) جن کی آبیاری انیسویں صدی میں ہو چکی تھی۔ انہیں بھی اپنی جولاں گاہ بنا کر بیسویں صدی میں مقبول و معروف بنایا اور اردو نثر کو ترقی دی۔ مذکورہ نثری

اصناف اکثر و بیشتر بالاقساط اخبارات و رسائل کی زینت بن کر ادبی ذوق کو پروان چڑھانے کے ساتھ ادباء کے لیے بھی طبع آزمائی کی ترغیب کا باعث بنیں۔ بیسویں صدی میں مقبولیت حاصل کرنے والی ایک ایسی ہی صنف خود نوشت سوانح عمری یا آپ بیتی ہے۔ جسے لکھنے کا چلن خصوصاً قیام پاکستان کے بعد عام ہوا۔ خودنوشت سوانح نہ صرف فنکار کی شخصیت کے اسرار کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے بلکہ اس تخلیقات میں بھی معنویت کی گرہیں کھولنے میں قاری کی مدد کرتی ہے۔ نیز اس شخصیت کے عہد اور شب و روز کو زندہ کرنے کے ساتھ انکشاف ذات کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ جس سے تحقیق وتنقید کے راستے بھی ہموار ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے چند مشہور آپ بیتوں نے اس صنف کو معیار اور اعتبار بخشا ہے۔ جو کہ درج ذیل ہیں:

سرگذشت (عبدالمجید سالک) یادوں کی بارات (جوش ملیح آبادی) ''یاد عہد رفتہ'' (ڈاکٹر عبادت بریلوی) ''مٹی کا دیا'' (مرزا ادیب) ''پس دیوار زنداں'' ''نالہ دل دودِ چراغ محفل'' (شورش کاشمیری) جہان دانش (احسان دانش) ''الکھ نگری'' (ممتاز مفتی) ''اعمال نامہ'' (سر رضا علی) ''قید یا غستان'' (محمد اکرام صدیقی) ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' (شہرت بخاری) ''یادوں کی دنیا'' (ڈاکٹر یوسف حسین خان) ''چراغوں کا دھواں'' (انتظار حسین) ''جو رہی سو بے خبر رہی'' (ادا جعفری) ''بڑی عورت کی کتھا'' (کشور ناہید) ''رو میں ہے رخش عمر'' (عبدالسلام خورشید) ''مرے ماہ و سال'' (جاوید شاہین) ''ایک ادھوری سرگذشت'' (انیس ناگی) ''عشرت فانی'' (عشرت رحمانی) ''ناممکن کی جستجو'' (حمید نسیم) ''نشان جگر سوختہ'' (ڈاکٹر سلیم اختر) شام کی منڈیر سے (ڈاکٹر وزیر آغا) ''در در ٹھوکر کھائے'' (ڈاکٹر مبارک علی) ''نوک خار'' (ڈاکٹر یوسف عباسی) ''خدوخال'' (آغا بابر) ''گرداب کی شناوری'' (زہرا داؤدی) ''حیات مستعار'' (جلیل قدوائی) ''کہاں کے دیروحرم'' (ابوالفضل صدیقی) ''بجست بھر زندگی'' (اکبر حمیدی) ''اپلوں کا دھواں'' (رانا آفتاب عرفانی) ''اپنا گریباں چاک'' (ڈاکٹر جاوید اقبال) ''متاع فقیر'' (چودھری سردار محمد) ''جیون دھارا'' (جیون خان) ''پتا پتا بوٹا بوٹا'' (رفعت سروش) ''ایک زخمی دل کی آپ بیتی'' (کمانڈر سید انور) ''میں ایک جاسوس تھا'' (طارق اسماعیل ساگر) ''عہد رفتہ'' (نقی محمد خان خورجوی) ''میری داستان حیات'' (ڈاکٹر غلام جیلانی برق) ''میرا افسانہ'' (افضل حق) ''تحدیث نعمت'' (سر ظفر اللہ خان) ''آئینہ ایام'' (کرنل غلام سرور) وغیرہ میں اسلوب اور فنی تکنیک میں کہانی پن کا اس طور پر التزام برتا گیا ہے کہ ان میں سے بیشتر کو ''کرداری ناول'' قرار دیا جا سکتا ہے۔

رپورتاژ: ''رپورتاژ'' ایک ایسی صنف نثر ہے جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں منصہ ادب پر نمودار

ہوئی۔ رپورتاژ میں آنکھوں دیکھا حال اورصورت واقعہ کو ادبی پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے۔اردو نثر میں یہ صنف چونکہ سفرنامہ کا حصہ رہی تھی اس لیے کوئی نئی چیز نہ تھی لیکن بیسویں صدی میں آ کر اس نے اپنی الگ شناخت کو ظاہر کیا۔گزرتے وقت کے ساتھ اس صنف نثر نے نہ صرف ادبی تقاضوں کو پورا کرنے کی قابلیت پیدا کی بلکہ جذبات و احساسات و واقعات کو مشاہدات پر ردعمل اور تاثر کی مختلف النوع کیفیات کا احاطہ بھی کیا۔ عام طور پر رپورتاژ کی صنف کو ترقی پسند تحریک سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے کیونکہ اس کی بابت علی سردار جعفری کا کہنا ہے کہ ''اس سے ہمارے ادب کو بے انتہا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ترقی پسند تحریک کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ رپورتاژ ہمارے مقاصد کے لیے بہت ضروری ہے اس کے ذریعے ہم بڑے بڑے کام لے سکتے ہیں۔''۹۸ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسندوں (سجاد ظہیر، کرشن چندر، حمید اختر، عبداللہ ملک) نے احوال واقعی کی روداد کو اپنی جذباتی شمولیت کی بناء پر اس نثری صنف کی بنیادوں کو مضبوطی سے استوار کیا۔ جو اس سے قبل سفرنامہ کا ناگزیر حصہ اور چشم دیدہ واقعات کی روداد کے حوالے سے صحافت کا بنیادی جزو تھی۔ افسانوں اسلوب اور مصنف کے جذبات و تاثرات اور تخیل نے اسے ادب کے دائرے میں داخل کیا۔ غالبًا اس لیے بعض اچھے خاصے انسانوں (ان داتا، ''لاہور سے بہرام گلہ'') پر رپورتاژ کا گمان گذرتا ہے۔اس نے علمی، ادبی، ثقافتی، سفری اور سماجی واقعات ، فسادات، جنگ و جدل، اور شہر آشوب کے حوالے سے اپنے موضوعات میں تنوع پیدا کیا۔ جبکہ ہیئت کے اعتبار سے اس نثری صنف نے سفری، افسانوی، ڈرامائی اور مکتوباتی انداز اختیار کیا۔ اسی لیے رپورتاژ میں بیک وقت سفرنامہ، افسانہ، ناول، ڈراما، آپ بیتی، جگ بیتی، انشائیہ اور یادنگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ رپورتاژ جس کے ابتدائی نقوش انیسویں صدی میں لکھے جانے والے سفرناموں ''یہ تحفہ کشمیر'' (۱۸۵۰ء) ''سفرنامہ منشی امین چند'' (۱۸۵۴ء) اور ''سرسید کا سفرنامہ پنجاب'' (۱۸۸۴ء) میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ دراصل اسے موضوع ، اسلوب اور ہیئت کی سطح پر واضح خدوخال دینے میں مندرجہ ذیل مشاہیر ادب نے فعال کردار ادا کیا۔

پطرس بخاری (سفر انگلستان) کرشن چندر (''لاہور سے بہرام گلہ'' ''پودے'' ''ان داتا'' ''صبح ہوتی ہے'') سجاد ظہیر (''یادیں'' ''روشنائی'') حمید اختر (''نظام'' ''بمبئی میں ترقی پسند ادبی مجالس کی روداد'') فکر تونسوی (چھٹا دریا) خدیجہ مستور (پوپھٹے) قدرت اللہ شہاب(''یا خدا'' ''اے بنی اسرائیل'' ایس ایس اینوتریا) عبداللہ ملک (مستقبل ہمارا ہے) سید ضمیری جعفری (بنگلہ دیش جب مشرقی پاکستان تھا) انتظار حسین (سانجھ بھئی چوندیس) الطاف گوہر (مشرقی بنگال کا سفر) جیلانی کامران (زمین کے سینے سے) ممتاز مفتی (''معلق شاہراہ'' ''انوکھی گاڑی'' ''لبیک'' ''شاہراہ ریشم'') رضیہ فصیح احمد (پھنق) شیخ منظور الٰہی (قوس وقزح سے فرار) یونس خان

(سنکیانگ سے فرار) ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (یادایام) خ-غ-مرتضٰی (پشاور سے طورخم) اے حمید (''اجلے بچوں کا دن'' ''ایک دن کی بادشاہت'' ''پت جھڑ کی نشانیاں'' ''ایبٹ آباد سے لاہور تک'' ''بازگشت کا ماتم'' ''روشنی کے مسافر'' ''لاہور یاترا'' ''موہیے کے پھول'' ''الحمراء کی ایک شام'' ''سٹوڈیو کی ایک رات'' ''مقبروں کی بستی'' ''انقلاب کی روشنی) احمد بشیر (والٹ ڈزنی کی جادوگری) امین اختر (تفریحی بس میں ایک شام) ڈاکٹر سعید اختر درانی (زبان یارمن ترکی) شمس نعمان (رواں دواں ہی رہا قافلہ) یونس جاوید (سنگ میل) محمد بدر منیر (لاہور کی ایک رات) الطاف فاطمہ (اس کا آشوب) ارشاد احمد صدیقی (''اپنی دھرتی اپنے پھول'' ''ہم سفر'') سید امجد حسین (کوا میں چند روز) سلمٰی عنایت اللہ (ڈوب ڈوب کر ابھری ناؤ) ریاض انور (اوجاں گانگیرنیا) محمد طفیل (یاترا) ڈاکٹر انور سدید (تلاش کا سفر) ذوالفقار علی احمد (خان صاحب خرطوم میں) مختار مسعود (مینار پاکستان، سفر نصیب) اشفاق احمد (چنگوہ باچستان) سید شوکت علی (اجنبی اپنے دیس میں) بیگم اختر ریاض الدین (ہونگ کانگ) آغا اشرف (اسلامی کانفرنس کی کہانی) ڈاکٹر عبادت بریلوی (جشن اقبال) ڈاکٹر فضل الرحمٰن لاہوری (آندھیاں غم کی) سائرہ ہاشمی (''کل پاکستان اہل قلم کانفرنس'' ''پانچویں اہل قلم کانفرنس'') بشریٰ رحمٰن (سیما جانب بطحا گزرکن'' ''باؤلی بھکارن'') کشور ناہید (آ جاؤ افریقہ) اختر جمال (بھوپوشیما) آغا امیر حسین (اللہ کا مہمان) امجد حسین (کوانگ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ رپورتاژ کی صنف کو مقبول بنانے میں ہفت روزہ ''لیل و نہار'' ''ادب لطیف'' ''نقوش'' اور رسالہ ''قندیل'' نے بھی کلیدی کردار ادا کیا۔ جسے کسی طور پر فراموش نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس صنف کی آبیاری بھی ادبی رسائل میں ہوئی۔

سفرنامہ: اردو سفرنامہ ایک ایسی صنف ہے جس نے بیسویں صدی میں بڑی سرعت سے ترقی اور مقبولیت حاصل کی۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے اسے کئی حصوں مثلاً مشرق وسطٰی کے سفرنامے، یورپ کے سفرنامے، ہندوستان کے سفرنامے، حج کے سفرنامے، پاکستان کے سفرنامے وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جس میں قاری سفرنامہ نگار کے ہمراہ ان دیکھی دنیاؤں کی اس طرح سیر کرتا ہے کہ وہاں کی تہذیب وتمدن، رسم و رواج، معاشرت، طرز بودوباش اور رنگا رنگ زندگی کو گویا اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہو۔ اس صنف میں مختلف تکنیک روزنامچہ، ڈائری، مکتوباتی انداز، آپ بیتی، خواب سازی، یاد نگاری، خاکہ نگاری، افسانوی انداز، ڈرامائیت، تمثیل نگاری، تاریخ نگاری، رومانویت، مزاح نگاری کے ساتھ اسلوب کا فنکارانہ امتزاج دکھائی دیتا ہے۔ اس صنف کو تکنیک کے تنوع اور اسلوب کے حوالے سے بام عروج تک پہنچانے والوں میں محمد دین فوق (سفرنامہ کشمیر) منشی محبوب عالم (''سفرنامہ یورپ'' ''سفرنامہ بغداد'' ''سفرنامہ بلاد یورپ روم ومصر وشام'') نواب

فتح علی خان قزلباس (سیاحت فتح خانی) محمود نظامی (نظر نامہ) شجاع منعمی (سفرنامہ ایران) ڈاکٹر محمد حسین (سفرنامہ جاپان) عطیہ فیضی (زمانہ تحصیل) سر عبدالقادر (''مقامات خلافت'' ''سیاحت نامہ یورپ'') پنڈت شیو نرائن شمیم (سفرنامہ شمیم) آغا محمد اشرف (''دیس سے باہر'' ''لندن سے آداب عرض'') امیر خانم (میرا سفر) ڈاکٹر محمد باقر (لاہور سے لندن تک) بشیر ساجد (مشرقی پاکستان) احسان بی اے (روس میں آٹھ دن) پنڈت ٹھاکر دت شرما (سیر یورپ) سعید اختر درانی (''چند روز آغوش فطرت میں'' ''شیکسپیئر کے آستانے پر'') عبدالحمید خان (''نظرے خوش گذرے'' ''سفرنامہ مقامات مقدسہ و یورپ) ڈاکٹر عبادت بریلوی (''ارض پاک سے دیار فرنگ تک'' ''ترکی میں دو سال'' ''دیار حبیب میں چند روز'') عبدالصمد صارم (''سفرنامہ صارم'' سفر حج و زیارت'') قاضی عبدالغفار (نقش فرنگ) عزیز بیگ (یہ امریکہ ہے) قدرت اللہ شہاب (''اے بنی اسرائیل'' ''تو ابھی راہ گزر میں ہے'' ''جہان دیگر'') کرنل محمد خان (''بجنگ آمد'' ''بسلامت روی'') ڈاکٹر منظور ممتاز (''ارض حافظ و خیام'' ''کشور محمود و بابر'') ممتاز احمد خان (جہاں نما) نازلی رضیہ سلطان (سیر یورپ) نسرین بانو اکرم (الکویت) یعقوب علی عرفانی (مشاہدات عرفانی) الطاف قریشی، (قافلے دل کے چلے) سلطان داؤد (سفرنامہ حجاز) محمد مظہر الدین صدیقی (امریکہ کے تاثرات) بیگم اختر ریاض الدین (''دھنک پر قدم'' ''سات سمندر پار'') عبدالکریم ثمر (سفر حجاز) نسیم حجازی (پاکستان سے دیار حرم تک) مفتاح الدین ظفر (سفر مقدس) حمید احمد خان (میری بھارت یاترا) شورش کاشمیری (شب جائے کہ من بودم) جمیل صباء (سفر شرط ہے) ابن انشاء (''دنیا گول ہے'' ''ابن بطوطہ کے تعاقب میں'') امجد اسلام امجد (شہر در شہر) اشفاق نقوی (الریاض کی سیر) ڈاکٹر محمد اجمل (فرانس میں چند روز) جی الانا (دیس بدیس) پرتو روہیلہ (گرد کارواں) جمیل الدین عالی (''تماشا مرے آگے'' ''دنیا مرے آگے'') تاج محمد لنگاہ (چین تو چین ہے) مولانا خلیل احمد حامدی (ترکی قدیم و جدید) شریف فاروق (''اتاترک کے وطن میں'' ''لنکن کے وطن میں'' ''دیار دوست کی طرف'') ڈاکٹر عبدالسلام خورشید (''دیار فرنگ'' ''آگ پھول اور رقص'' ''جب طہران نور و سرور میں غرق تھا'' ''سنگاپور سے ٹوکیو تک'') مولانا مودودی (سفر ارض القرآن) عطا الحق قاسمی (''شوق آوارگی'' ''مسافتیں'' ''گوروں کے دیس میں'' ''دنیا خوبصورت ہے'') ڈاکٹر سلیم اختر (''عجب سیر'' ''اک جہاں سب سے الگ'') فخر زمان (گردش میں پاؤں) غلام قادر (سفرنامہ یورپ) مولانا کوثر نیازی (ایک ہفتہ چین میں) مرزا مقبول بیگ بدخشانی (سرزمین حافظ و خیام) محمود شام (''کتنا دور کتنا قریب'' ''لاڑکانہ سے پیکنگ تک'') مستنصر حسین تارڑ (''نکلے تیری تلاش میں'' اندلس میں اجنبی'' ''خانہ بدوش'' ''ہنزہ داستان'' ''جپسی'') صلاح الدین محمود (نقش اول کی تلاش) محمد شجاع ناموس (سفر حج و حرمین) محمد عارف (حریم دیدہ و

دل) ڈاکٹر وزیر آغا (ایک طویل ملاقات) صادق قریشی (پھر سوئے حرم) راغب شکیب (سرگودھا سے کراچی تک) ممتاز مفتی (''ہندیاترا'') شوکت علی شاہ (اجنبی اپنے دیس میں) نواب کریم خان (سیاحت نامہ) اشفاق احمد (''سفر مینا'' ''سفر در سفر'' ''عرش منیر'') حمیدہ فاطمہ (لاہور سے دیار حبیب تک) گلزار احمد (تذکرہ چین) اسعد گیلانی (مشاہدات حرمین) مرزا ریاض (مسافر نواز بتیرے) اے حمید (''امریکا نو'' ''ہم تو چلے رنگون'') محمد کاظم (مغربی جرمنی میں ایک سال) شیخ منظور الٰہی (''در دلکشا'' ''مانوس اجنبی'' ''نیرنگ اندلس'') نوشابہ نرگس (سفرنامہ امریکہ) انتظار حسین (زمین اور فلک اور) محمد اسلم چودھری (حرمین میں دو سو روز) غلام الثقلین نقوی (ارض تمنا) محمد سعید اختر (لوپ) خالد اختر (''سواتی مہم'' ''کاغانی مہم'' ''ڈیپلو سے نوکوٹ تک'' ''دوسفر'' ''یاترا'') شوکت علی شاہ (اجنبی اپنے دیس میں) رحمان مذنب (سنہری پہاڑوں کی وادی) مسعود سلطان لکھیر (سینۂ سنگ پر ابریشم کا رستہ) محمد طفیل (''سفرنامہ'' ''مسافرانہ'') قمر علی عباسی (لندن لندن) حمیدہ جبیں (جلا وطن) ڈاکٹر ریاض احمد (برسبیل سفر) ذوالفقار احمد تابش (جوار بھاٹا) سید سرور گیلانی (یادوں کے نقوش) شاہ محمود خان (میں نے روس میں کیا دیکھا) بشریٰ رحمٰن (''براہ راست'' ''ٹک ٹک دیدم'') شفیق الرحمٰن (''دجلہ'' ''برساتی'' ''ڈینوب'') خواجہ عبدالرشید (سیر فرنگ) عبداللہ ملک (''کیوبا سے چند خطوط'' ''پولینڈ ایک سفر ایک جائزہ'' ''ارض جنت سوویت یونین'' ''قونیہ سے چند خطوط'' ''حدیث دل'') اسلم کمال (''سو کروڑ'' ''اسلم کمال اوسلو میں'') اختر مونکا (پیرس ۲۰۵ کلومیٹر) بلدیو مرزا (ستروگا) بلقیس ظفر (مسافتیں کیسی) ڈاکٹر اعجاز راہی (راستے میں شام) افضل علوی (دیکھ لیا ایران) ڈاکٹر پرویز پروازی (سورج کے ساتھ ساتھ) مرزا ادیب (ہمالہ کے اس پار) ڈاکٹر مختار الدین احمد (زہے روانی عمرے) محمود الحسن (سفرنامہ حجاز) مختار مسعود (''سفر نصیب'' ''لوح ایام'') ماہر القادری (کاروان حجاز) قیوم نظر (پیرس سے روم تک) ڈاکٹر وحید قریشی (چین کی حقیقتیں اور افسانے) رام لعل (زرد پتوں کی بہار) محمد حمزہ فاروقی (''آج بھی اس دیس میں'' ''زمان و مکاں اور بھی ہیں'' ''سفر آشوب'') محمد کاظم (ایک برس جرمنی میں) رفیق ڈوگر (''اے آب رودگنگا'' ''نیل بہتا رہا'' ''اندلس کی تلاش'' ''جاپان نورد'') اجمل نیازی (مندر میں محراب) ثریا حفیظ الرحمٰن (جس دیس میں گنگا بہتی ہے) پروفیسر محمد اسلم (سفرنامہ ہند) نظیر صدیقی (دو سفرنامے) منیر فاطمی (دیواروں کے پار) سلمیٰ اعوان (میرا بلتستان) پروین عاطف (''کرن گولے'' ''تتلی'') حسین شاہد (گرتے پتے) ڈاکٹر زاہد علی واسطی (جا تیرا امریکہ دیکھ لیا) ڈاکٹر صابر آفاقی (کثرت نظارہ) قیصر اسلم (امریکہ جیسا میں نے دیکھا جیسا میں نے جانا) عثمان خاور (ہریالیوں کے دیس میں) فردوس حیدر (دائروں کے دائرے) عشرت ریحانہ (یورپ میں چھچلا) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر (روداد سفر) وحید نسیم (حدیث دل) داؤ طاہر (''شوق ہمسفر

میرا'' ''سفر زندگی ہے'') شوکت علی شاہ (سلگتے ساحل) ڈاکٹر آغا سہیل (''افق تا بہ افق'' ''ایران میں چودہ روز'') اکمل علیمی (نئی دنیا کا مسافر) علی سفیان آفاقی (''گوریوں کا دیس'' ''نیل کنارے'') نیلم احمد بشیر (نیلا نیپا لے میں) سائرہ ہاشمی (کیمبرج کیمبرج) تنویر ظہور (جسے چاہا در پہ بلا لیا) نے اس صنف نثر کو زرخیز بنایا۔ نیز دیگر زبانوں سے سفرناموں کے اردو تراجم نے بھی درحقیقت اس صنف کے دائرہ کار کو وسعت دی۔ جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں۔

''حالات نجد الحسا'' از ولیم بلگریو (مترجم نامعلوم) ''سفرنامہ سید، امیر علی'' از سید امیر علی (مترجم نامعلوم) ''سفرنامہ جاپان'' از علی احمد جرجاوی (مترجم حسن میاں پھلواری) ''سفر دارالمصطفیٰ '' از رچرڈ فریڈرک برٹن (مترجم: محمد انشاء اللہ خان) ''سفرنامہ مارکوپولو'' از مارکوپولو (مترجم نامعلوم) ''ایک چینی سیاح کا سفرنامہ'' از ہیوان سانگ (مترجم نامعلوم) ''سیر قسطنطنیہ'' از میکس ملر (مترجم: منشی احمد دین) ''داستان مغلیہ'' از نکولائی منوچی (مترجم سجاد باقر رضوی) ''قطبی برفستان'' از رسل اووین (مترجم: مرتضیٰ احمد میکش) ''واقعات کورگانی'' اور ''واقعات اظفری'' (مترجم سید علی عباس) ''کتاب الہند'' از البیرونی (مترجم لطیف ملک) ''مالدیپ'' از ایلین ویلر (مترجم نامعلوم) ''صحرا کا اجنبی'' از ڈورتھی ڈیزانا، ''بربروں کی سرزمین'' از بریان کلارک، اور ''کردستان'' از ہملٹن اے ایچ (مترجم: آبادشاہ پوری) ''توزک بابری'' از ظہیر الدین بابر (مترجم: رشید اختر ندوی) ''توزک جہانگیری'' از شہنشاہ جہانگیر (مترجم: احمد علی رام پوری) نیویارک سے پیرس تک پہلی پرواز'' از چارلس اے لنڈ برگ (مترجم: سید فیاض محمود) وغیرہ شامل ہیں۔

انشائیہ: انشائیہ جس میں مظاہر زندگی اور اشیاء کو انوکھے شخصی زاویوں سے دیکھتے ہوئے اپنے تاثر کو خوش طبعی، بذلہ سنجی اور اسلوب کی تازگی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں اس کے ابتدائی نقوش مولانا محمد حسین آزاد کی تحریروں میں موجود تھے جبکہ بیسویں صدی میں اسے تخلیقی جہت عطا ہوئی۔ جس نے اسے نثری اصناف کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس صنف نے بھی رسائل کے صفحات پر پرورش پا کر اپنے خدوخال وضع کیے۔ انشائیہ کی صنف کو موضوعاتی، فکری اور معنوی لحاظ سے مستحکم بنانے میں قاری سرفراز حسین عزمی دہلوی (''رموز حیات'' ''چھونا منع ہے'') شیخ محمد اکرام (''ٹوپی'' ''دستار'') خواجہ محمد اسحاق (سوچنا) محمد عبداللہ فاروقی (اگر موت نہ ہوتی) مشکور حسین یاد (''جوہر اندیشہ'' ''بات کی اونچی ذات'') ڈاکٹر وزیر آغا (''خیال پارے'' ''چوری سے یاری تک'' ''دوسرا کنارہ'') مشتاق قمر (''ہم ہیں مشتاق'' ''چھتری'' ''آئس کریم کھانا'') جمیل آذر (''شاخ زیتون''

''رت کے مہمان'') کامل القادری (''ہارڈ بیڈ'' ''سریش کا درخت'') سلیم آغا قزلباش (سرگوشیاں) احمد جمال پاشا (''شور'' ''ہجرت'' ''بے ترتیبی'') اکبر حمیدی (''جزیرے کا سفر'' ''تتلی کے تعاقب میں'') بشیر سیفی (برساتی، برزخ ، پھول اور تکھائی) شہزاد احمد (''آہٹ'' ''معجزہ'' ''گھوڑا اور میں'') غلام الثقلین نقوی (آوارہ خیالی) صابر لودھی (انتظار کا موسم) نظیر صدیقی (شہرت کی خاطر) ڈاکٹر انور سدید (ذکر اس پری وش کا) ارشد میر (موڑ) انجم نیازی (میں سورج اور سمندر) حامد برگی (بانداز دیگر) کے علاوہ محمد یونس بٹ، امجد طفیل، ریاض الرحمٰن، رعنا تقی، شمیم ترمذی، محمد اقبال انجم، رضی الدین رضی اور اسلام تبسم وغیرہ نے بھی اس صنف کی ترقی و فروغ کے لیے اپنی خدمات دیں۔

حواشی:

ا) اخبارات و رسائل:

۱۔ شفیق انجم، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ'' اسلام آباد، پورب اکادمی، ۲۰۰۸ء، ص: ۲۷-۲۸

۲۔ محمد اقبال، علامہ: ''علم الاقتصاد'' لاہور، اقبال اکادمی، بار اول ۱۹۷۷ء، ص: ۵۸

۳۔ رانا سہیل الرحمٰن: ''لاہور کی ادبی مجالس بیسویں صدی میں'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل)، لاہور پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص:۱۵۹

۴۔ سہ ماہی ریویو ''مخزن'' جلد ۷ نمبر ا، شمارہ نمبر ا، اپریل ۱۹۰۴ء

۵۔ خورشید الاسلام، ڈاکٹر: ''صحافت پاکستان و ہند میں''، ص: ۵۰۴

۶۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''سر عبدالقادر اور رسالہ مخزن کی خدمات'' مضمون مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، ص:۶۰۶

۷۔ روشن آراء راؤ: ''ادبیات اردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)، لاہور پنجاب یونیورسٹی، ص: ۲۰۹

۸۔ مذکورہ مضامین کی فہرست امداد صابری کی ''تاریخ صحافت اردو'' (جلد چہارم) سے لی گئی ہے۔

۹۔ امداد صابری: ''تاریخ صحافت اردو'' (جلد چہارم)، ص: ۱۱۴

۱۰۔ روشن آراء راؤ ''ادبیات اردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار'' غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)، ص:۲۲۸

۱۱۔ ان مقالات کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ''مقالات عبدالقادر'' مرتبہ محمد حنیف شاہد، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۲۔ روشن آراء راؤ: ''ادبیات اردو کے ارتقا میں رسائل کا کردار'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی)، ص:۲۱۳

۱۳۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید: ''اردو وادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء'' لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء، ص: ۵۶

۱۴۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: ''کاروان صحافت'' کراچی، انجمن ترقی اردو، اشاعت اول، ۱۹۶۴ء، ص: ۱۳۱

۱۵۔ فوق، محمد دین: ''اخبار نویسوں کے حالات'' لاہور، رفاہ عام سٹیم پریس، ۱۹۱۲ء، ص: ۱۴

۱۶۔ ۱۹۳۰ء میں مالک رام، گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کرنے کے بعد نیرنگ خیال سے وابستہ ہو گئے (''تاریخ ادب اردو'' از ملک حسن اختر، ص: ۷۸۸)

۱۷۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر: ''اردو افسانے فروغ میں ''ساقی'' کا کردار'' کراچی، انجمن ترقی اردو، ۲۰۰۵ء، ص: ۳۶

۱۸۔ ایضاً، ص: ۳۵

۱۹۔ اورینٹل کالج میگزین کے مقالات کی تفصیلی فہرست کے لئے محمد رمضان ایوبی کا غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے ''فہرست مقالات اورینٹل کالج میگزین، اور سنجیدہ احمد کا غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے'' اورینٹل کالج میگزین (وضاحتی فہرست) ملاحظہ ہوں

۲۰۔ حافظ محمود شیرانی کے مقالات مجلس ترقی ادب کی جانب سے دو جلدوں میں چھپ چکے ہیں۔

۲۱۔ یہ مقالہ بعد ازاں کتابی صورت میں ''مذہب اور باطنی تعلیم'' کے نام سے چھپا۔

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، جنوری ۱۹۹۲ء، ص: ۱۳۹

۲۳۔ پہلا شمارہ مرکزی حلقہ لاہور کی اجازت سے ۱۹۴۸ء میں کراچی سے چھپا (''حلقہ ارباب ذوق'' از ڈاکٹر یونس جاوید، ص: ۹۶)

۲۴۔ تفصیل کے لئے سلمیٰ حمید کا غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم اے، وضاحتی فہرست ''صحیفہ'' ملاحظہ ہو۔

۲۵۔ مارچ ۲۰۰۲ء سے قبل ماہوار شائع ہوتا رہا اور بعد میں سہ ماہی رسالہ ہوا، (محمد عباس چغتائی ''پنجاب میں نفاذ اردو کے ضمن میں مجلس زبان دفتری کا کردار'' مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، ص: ۴۲۰

۲۶۔ مئی ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر تبسم حمدانی، اس کے مدیر ہوئے جبکہ ۲۰۰۴ء تا ۲۰۰۸ء سہیل احمد خان اور ۲۰۰۹ء سے تا حال اب یہ ڈاکٹر سعادت سعید کی زیر نگرانی چھپ رہا ہے۔

۲۷۔ دیکھیئے، مقالہ ہذا میں اخبارات و رسائل کا ضمیمہ نمبر ۳

ب) علمی و ادبی انجمنیں، مجالس اور ادارے:

۲۸۔ شہرت بخاری اسے ''زندہ دلان پنجاب'' (''نقوش'' لاہور نمبر، ص: ۱۱۰۸) اور ڈاکٹر عبدالرؤف ''بزم ادب پنجاب'' (مضمون مشمولہ ''صحیفہ''، جولائی ستمبر ۱۹۸۸ء، ص: ۸۲) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

۲۹۔ عہد حاضر میں ''مجلس اقبال'' کے نام سے پروفیسر طارق زیدی کی سربراہی میں اپنا سفر رواں دواں رکھے ہوئے ہے۔

۳۰۔ اس بزم کے جلسوں کی تفصیلی روئداد کے لیے ملاحظہ ہو ''اسلامیہ کالج کی صد سالہ تاریخ'' از احمد حمید،

ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب، لاہور۔
۳۱۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر: ''نیازمندان لاہور اوران کا حلقہ اثر'' مضمون مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد) ص: ۶۴۰
۳۲۔ رانا سہیل الرحمٰن: ''لاہور کی ادبی مجالس - بیسویں صدی میں'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل)، ص: ۱۴۶
۳۳۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر: ''اردو نثر کے اسالیب'' ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۴ء، ص: ۱۱۳
۳۴۔ سالنامہ ''کارواں'' شمارہ ۱، ۱۹۳۳ء
۳۵۔ ''نقوش'' شمارہ نمبر ۱۴۲، سن ندارد، ص: ۴۱
۳۶۔ رانا سہیل الرحمٰن: ''لاہور کی ادبی مجالس - بیسویں صدی میں'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم فل) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۴ء، ص: ۵۶
۳۷۔ محمد عباس چغتائی: ''پنجاب میں نفاذ اردو کے ضمن میں مجلس زبان دفتری کا کردار'' مشمولہ ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، ص: ۴۱۳
۳۸۔ ایوب صابر: ''پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء، ص: ۱۵
۳۹۔ ایضاً، ص: ۱۹
۴۰۔ ایضاً، ص: ۳۶
۴۱۔ زاہد منیر عامر: ''تاریخ جامعہ پنجاب'' لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، اشاعت اول، ۲۰۰۴ء، ص: ۴۲۷

ج) تحریکات و رجحانات:

۴۲۔ محمد حسن، ڈاکٹر: ''اردو ادب میں رومانوی تحریک'' ملتان، کاروان ادب، ۱۹۹۳ء، ص: ۱۲۱
۴۳۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر: ''اردو تنقید کا رومانوی دبستان'' لاہور، مکتبہ اقبال اکیڈمی، طبع اول ۱۹۹۶ء، ص: ۱۶۶
۴۴۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں'' کراچی، انجمن ترقی اردو، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ص: ۴۲۵
۴۵۔ محمد حسن، ڈاکٹر: ''اردو میں رومانوی تحریک''، ص: ۲۰
۴۶۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر: ''نیازمندان لاہور اوران کا حلقہ اثر''، مشمولہ پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد) ص: ۶۳۸
۴۷۔ علی محمد خان، ڈاکٹر: ''لاہور کا دبستان شاعری'' لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء، ص: ۱۸۷
۴۸۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' لاہور، عزیز بک ڈپو، ۲۰۰۶ء، ص: ۴۲۷
۴۹۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں''، کراچی، انجمن ترقی اردو، اشاعت دوم، ۱۹۹۶ء، ص: ۴۷۴
۵۰۔ ایضاً، ص: ۴۷۸

۵۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''روشنائی'' مصنفہ سید سجاد ظہیر مکتبہ اردو لاہور، ۱۹۷۶ء

۵۲۔ سجاد ظہیر: ''روشنائی'' لاہور، مکتبہ اردو، ۱۹۷۶ء، ص: ۴۲

۵۳۔ ایضاً، ص: ۳۳۷

۵۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص: ۴۶۴

۵۵۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص: ۴۹۹

۵۶۔ یونس جاوید، ڈاکٹر: ''حلقہ ارباب ذوق'' لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول، ۱۹۸۴ء، ص: ۲۳

۵۷۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص: ۵۳۶

۵۸۔ یونس جاوید، ڈاکٹر، ''حلقہ ارباب ذوق''، ص: ۲۲

۵۹۔ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ'' ۱۸، لاہور، دانشگاہ پنجاب، طبع اول ۱۹۸۵ء، ص: ۵۹

۶۰۔ یونس جاوید، ڈاکٹر: ''حلقہ ارباب ذوق''، ص: ۳۱

۶۱۔ ایضاً، ص: ۱۹۲

۶۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اُردو ادب کی مختصر تاریخ ''ص: ۴۶۳

۶۳۔ یونس جاوید، ڈاکٹر: ''حلقہ ارباب ذوق''، ص: ۲۸۳

۶۴۔ آفتاب احمد، ڈاکٹر: ''حلقہ ارباب ذوق'' مشمولہ ''پاکستان میں اُردو'' (چوتھی جلد)، ص: ۶۳۵

۶۵۔ عزیز احمد، ''ترقی پسند ادب'' ملتان کاروانِ ادب، ۱۹۹۳ء، ص: ۱۹

۶۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ حقیقت سے علامت تک''، لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۶ء، ص: ۱۰۷

۶۷۔ مذکورہ ادبی مباحث کے موضوعات کی تفصیلی فہرست کے لیے ملاحظہ ہو ''حلقہ ارباب ذوق'' از ڈاکٹر یونس جاوید

۶۸۔ شہزاد منظر: ''پاکستان میں اردو تنقید کے پچاس سال'' کراچی، منظر پبلی کیشنز، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۳

۶۹۔ انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں''، ص: ۶۰۳

۷۰۔ ایضاً، ص: ۶۰۸

۷۱۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر: ''اردو ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک'' لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء، ص: ۲۷۴

و) اصناف نثر:

۷۲۔ رسائل میں ''خورشید پنجاب'' ''رسالہ انجمن پنجاب'' ''رسالہ'' انجمن مفید عام قصور جبکہ درسی کتاب میں پیارے لال آشوب کی ''اردو کی تیسری کتاب'' دیکھی جاسکتی ہے۔

۷۳۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۰۸ء میں لاہور ہی سے شائع ہوئی۔ (نقوش لاہور نمبر ص: ۹۳۰) اس کی پانچ جلدیں

لالہ سری رام نے تالیف کیں جبکہ چھٹی اور آخری جلد کا مواد لالہ سری رام کی وفات کے بعد پنڈت دتاتر یہ کیفی نے مرتب کیا۔

۷۴۔ سیر المصنفین (دو جلدیں) مصنفہ یحییٰ تنہا اور ارباب نثر اردو (دو جلدیں) از سید محمد انہی اثرات کا نتیجہ تھیں۔

۷۵۔ مخزن کے صفحات پر لسانیات کی بحث میں حصہ لینے والوں میں پنجابی انبالوی، علامہ اقبال، برجموہن دتاتر یہ کیفی، مولوی فضل حق، مرزا سلطان احمد وغیرہ شامل تھے۔

۷۶۔ ''دکن میں اردو'' از نصیر الدین ہاشمی، ''سندھ میں اردو'' اور ''نقوش سلیمانی'' از سید سلیمان ندوی، ''مغل اور اردو'' از نصیر الدین خیال، ''اردو زبان کا ارتقا'' اور ''اردو لسانیات'' شوکت سبزواری، ''اردوئے قدیم'' شمس اللہ قادری، ''ہندوستانی لسانیات'' اور ''اردو شہ پارے'' از محی الدین قادری زور، ''تاریخ زبان اردو'' از مسعود حسین خان

۷۷۔ عطش درانی، ڈاکٹر: ''مقدمہ ادبیات اصول تحقیق'' مشمولہ دریافت شمارہ ۴، سن ندارد، ص: ۸۸

۷۸۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''تنقیدی دبستان'' مصنفہ ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۷ء

۷۹۔ اس کے لیے ''اردو تحقیق یونیورسٹیوں میں'' مصنفہ ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، یونیورسل بکس لاہور، طبع اول، جنوری ۱۹۸۹ء اور ''تاریخ جامعہ پنجاب'' مصنفہ ڈاکٹر زاہد منیر عامر، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۲۰۰۲ء میں فہرست تحقیقی مقالہ جات کے لیے ملاحظہ ہو۔ص: ۶۲۵ تا ۶۲۸

۸۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز

۸۱۔ موجودہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

۸۲۔ گورنمنٹ کالج لاہور کی اس سوسائٹی کے ڈراموں نے بھی اردو ڈراما کو ترقی دینے میں فعال کردار ادا کیا جس میں پطرس بخاری، جی ڈی سوندھی، حکیم احمد شجاع کے علاوہ امتیاز علی تاج کے ڈارمے سرفہرست رہے اور تا حال یہ سلسلہ کامیابی سے جاری و ساری ہے۔

۸۳۔ حامد حسین: ''اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم'' غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء، ص: ۲۰۶

۸۴۔ ایضاً، ص: ۲۰۷، اس کے برعکس ڈاکٹر محمد سلیم ملک کے مطابق 'آر یو آر) کا ترجمہ امتیاز علی تاج نے کیا تھا جبکہ پطرس بخاری نے اس ترجمہ میں مدد دی تھی (سید امتیاز علی تاج ''زندگی اور فن''، ص: ۲۲۶)

۸۵۔ حکیم احمد شجاع: ''خوں بہا'' لاہور، فیروز سنز، بار دوم، ۱۹۵۰ء، ص: ۲۷۸۔

۸۶۔ حامد حسین: ''اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی) ص: ۲۰۷

۸۷۔ اپنے عہد میں سب سے زیادہ ریڈیائی ڈرامے منٹو نے لکھے۔ چند اور ناموں میں انتظار، کیا میں اندر آ سکتا ہوں، کبوتری، اکیلی، جیب کترا، نیلی رگیں، ساڑھی، نقش فریادی، جرنلسٹ، کمرہ نمبر ۹، قانون کی حفاظت، بیمار، تین انگلیاں، تحفہ وغیرہ شامل ہیں۔

۸۸۔ اگرچہ خاکوں کی کتاب ہے لیکن انداز بیان مزاح نگاری کا اختیار کیا گیا ہے۔

۸۹۔ اگرچہ خاکے ہیں لیکن مزاح کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔

۹۰۔ قدسیہ قریشی، ڈاکٹر: ''اردو سفر نامے انیسویں صدی میں'' لکھنؤ، نصرت پبلشرز، ۱۹۸۷ء، ص: ۲۲۴

۹۱۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، فیاض محمود، سید: (مدیران خصوصی) ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' (نویں جلد)، ص: ۴۶۷

۹۲۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، فیاض محمود، سید: (مدیران خصوصی) ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' (نویں جلد)، ص: ۴۶۸

۹۳۔ اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف'' ص: ۱۳۷

۹۴۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ ''نقوش'' کا دو جلدوں میں مکاتیب نمبر۔

۹۵۔ اس کا ایک ثبوت دو جلدوں میں نقوش کا شخصیات نمبر ہے۔

۹۶۔ عبدالغفار کوکب، ڈاکٹر: ''اردو صحافت اور فکاہیہ کالم نگاری'' ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۷ء، ص: ۳۰

۹۷۔ ایضاً، ص: ۱۱۰

۹۸۔ ظہور احمد اعوان، ڈاکٹر: ''داستان تاریخ رپورتاژ نگاری'' پشاور، ادارہ علم وفن پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص: ۳۷

مجموعی جائزہ:

لاہور کو عہد غزنوی ہی سے تاریخی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی، معاشرتی، ثقافتی، جغرافیائی، لسانی، روحانی، مذہبی اور علمی وادبی اہمیت کے اعتبار سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ جبکہ صحیح معنوں میں عروج شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں کے دور میں ملا۔ عہد مغلیہ میں مذکورہ تمام حوالوں سے لاہور میں ہونے والی ترقی کسی کارنامے سے کم نہیں۔ یہاں ہمیشہ سے شعری اور نثری وسیلے سے علم و ادب کی متحرک توانا، جاندار اور مضبوط روایت مختلف ادوار میں پروان چڑھتی رہی ہے۔ جس میں شاعری کو جذبے اور تخیل جبکہ نثر کو فکروخیال کے بہترین آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ شاعری سے قطع نظر نثر کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ تبلیغ افکار اور علم کی ترسیل، تشریح اور تجزیہ کا کام دیتی ہے۔ اس کے ذریعے ہر عہد میں سیاسی، سماجی، علمی، فکری اور تہذیبی مقاصد بآسانی پورے کیے جاتے رہے ہیں۔ دورِ غزنوی سے لے کر عہد رنجیت سنگھ تک شعر میں اردو اور فارسی جبکہ نثر میں صرف فارسی زبان کے استعمال کو اولیت اور فوقیت حاصل رہی ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ فارسی کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل تھی۔ فارسی کی بجائے اردو نثر کو پہلے پہل جملوں، اقوال منقولات اور ملفوظات کی صورت میں صوفیاء اور اولیاء کرام نے برتنے کا آغاز کیا جن کے بنیادی مقاصد مذہبی، روحانی، اور اخلاقی نوعیت کے تھے۔ اس اعتبار سے بالخصوص اردو زبان اور اردو نثر صوفیاء کرام کی منت بارِ احسان ہے۔ اردو نثر کی ساخت پرداخت کا عمل جنوبی ہند اور شمالی ہند میں تشکیل پذیر ہوا اور متعدد نثری کتب اور رسائل وجود میں آئے۔ جن کی زبان فارسی آمیز اور اسلوب مقفیٰ و مسجع تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب ہندوستان میں قدم رکھا تو یہاں پر فارسی کے ساتھ اردو زبان کی ترقی کے روشن امکانات کا ادراک بھی کر لیا۔ انیسویں صدی کی ابتداء میں ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے بیشتر حصے پر قابض ہو گئی۔ اپنے قدم مضبوط کرنے کے لیے فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) اور بعدازاں دہلی کالج (۱۸۲۵ء) کے پلیٹ فارم سے اردو نثر میں علمی و ادبی اور لسانی زندگی میں اجتماعی قوت عمل کو متحرک اور منظم کرنے والے انگریز مستشرقین نے مقامی ادباء کی معاونت حاصل کی۔ مذکورہ بالا دونوں علمی و ادبی اداروں نے نئی نثری زبان یعنی سادگی اور سلاست کی داغ بیل ڈالی۔ جس میں دلی کا محاورہ، روزمرہ بول چال، رسم و رواج، معاشرت کی جھلکیاں، سبھی کچھ موجود تھا۔ دونوں اداروں میں اردو زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیتے ہوئے علمی، ادبی و فنی نثر کو ترقی دی گئی۔ اس کے لیے عربی، فارسی، ہندی، سنسکرت اور انگریزی سے اردو نثری تراجم کو بطور وسیلہ اختیار کیا گیا۔ جو معلومات اور

تخلیقی صلاحیتوں میں اضافے کا سبب بنے۔ اس کے ذریعے اردو نثر متعدد موضوعات داستان، تذکرہ، تاریخ، ریاضی، طبعیات، جغرافیہ، علم ہندسہ، سائنس وغیرہ سے روشناس ہوئی۔ جس کے اسلوب بیان میں سادگی اور سلاست کو ملحوظ خاطر رکھا گیا لیکن ساتھ ہی ابھی بھی بالخصوص لکھنؤ میں مشکل پسندی اور رنگین عبارت ہی کی علمیت و ادبیت کا معیار سمجھا جا رہا تھا۔ یوں اردو نثر میں اسلوب کے دو دھارے بیک وقت موجود تھے۔ اول مقرس ومعرب اور دوم سلیس اور سادہ۔

اردو نثر کے ارتقا میں ایک انقلابی قدم غالب کے خطوط کی صورت نظر آتا ہے۔ جس میں اسلوب کی سادگی، روانی، برجستگی کے ساتھ تخلیقی اصناف نثر کے ابتدائی نقوش بھی موجود تھے۔ پھر اردو اخبارات اور رسائل کے اجراء سے اردو نثر کی ترقی وترویج کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ملی۔ انگریز حکومت نے ۱۸۳۴ء میں جب اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر فارسی کی حیثیت کو ختم کر دیا تو اردو نثر پہلی بار عدالتی انتظامی اور دفتری امور کے لیے بھی استعمال ہونا شروع ہوئی۔ اردو زبان کے عام اور سریع الفہم ہونے کی وجہ سے انگریز حکومت نے سرکاری عہدہ داروں کے لیے یہ امر لازمی قرار دیا کہ وہ اس کے سمجھنے اور بولنے کی قابلیت اور صلاحیت پیدا کریں۔ چنانچہ خصوصاً اضلاع شمالی ومغربی کے لیے اس زبان کو عدالتی، انتظامی اور دفتری امور میں برتنے کے علاوہ سرکاری سررشتہ تعلیم میں سب بولیوں سے بہتر ذریعہ تعلیم ''ورنیکلر'' قرار دیا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے خاتمہ تک سرحد، بلوچستان، سندھ اور ستلج پار کے جنوبی علاقے انگریزی عملداری میں آ چکے تھے۔ جبکہ پنجاب ایسا صوبہ تھا جو سب سے آخر (۱۸۴۹ء) میں انگریزی قلمرو میں شامل ہوا تو یہاں بھی اسی اصول کے تحت اردو دفاتر اور عدالتوں کی زبان قرار دی گئی۔ ۱۸۴۹ء سے قبل لاہور میں فارسی زبان سرکاری، خانگی اور معاشرتی امور میں متواتر استعمال ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ مہاراجہ رنجیت کی حکومت کے زمانہ میں بھی کل معاملات اور کاروبار سلطنت فارسی زبان ہی میں طے پاتے تھے۔ فارسی زبان ہی میں دنیاوی تعلیم جو علاوہ مکاتب مسجد، قصبات اور دیہات کے مکتبوں اور ہندو مسلم گھرانوں اور دیگر مقامات پر دی جاتی تھی۔ جبکہ اردو بول چال کی زبان کے طور پر موجود تھی۔ لاہور جو کہ ہمیشہ سے پنجاب کا مرکز تھا، اسے سکھا شاہی دور کی چیرہ دستیوں سے نجات دلانے میں انگریز نجات دہندہ ثابت ہوئے۔ وہ لاہور کی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر اثرانداز ہونے کے ساتھ علمی و ادبی میدان میں انقلابی تبدیلیاں لے کر آئے۔ یہ بات ایک مسلمہ امر ہے:

''زندگی ایک نامیاتی حقیقت ہے اس کا ارتقائی عمل ہمیشہ جاری و ساری رہتا ہے اس عمل میں تعمیر وتخریب کی قوتیں ہم آہنگ ہو کر زندگی کے نئے پیکر تراشتی ہیں جس سے نئی زندگی نئی تہذیب ظہور پذیر ہوتی ہے۔اس نئی تہذیب کے ظہور میں جہاں جدلیاتی عمل اور برسرپیکار رہنے والی قوتوں کو دخل ہے وہیں انسانی افعال و اعمال اور فکروخیال کے اساسی پہلو سے بھی انکار ممکن نہیں''۔[۱]

مذکورہ خیال کو پیش نظر رکھیں تو معلوم ہو گا کہ لاہور میں یہ واضح تبدیلی، تضاد اور کشمکش کا عمل محمود غزنوی کی آمد سے لے کر سکھا شاہی دور اور انگریزوں کے قابض ہونے تک بہت بڑے پیمانے پر جاری و ساری رہا اور حاکم وقوم نے محکوم قوم کی زندگی کے ہر شعبہ پر اثر ڈالا۔ انگریزوں کے تسلط اور ان کی انقلابی تبدیلیوں کے اثرات ہی کا نتیجہ تھا کہ قدیم جاگیردارانہ نظام کی جگہ صنعتی انقلاب؛ قدیم کے بجائے جدید طرز تعلیم؛ مذہبی مباحث، سیاسی، سماجی، معاشرتی، تمدنی، لسانی، معاشی تبدیلیاں، جدید خیالات وافکار کے فروغ اور نشرواشاعت کے لیے مطابع کا قیام اور اخبارات کے اجراء سے نئی زندگی اور نئی تہذیب ظہور میں آئی۔ جس نے تعمیر کا فریضہ تو انجام دیا لیکن ساتھ ہی تخریب کا عمل بھی جاری رکھا۔

لاہور میں انگریز حکومت ہی کے ثمرات تھے کہ نظام ریاست، عدل و انصاف، مواصلات، انتظامی مشینری، طب، صحت، صنعت وتجارت، معیشت وتعلیم، علوم وفنون، تہذیب و معاشرت، افکار و اقدار، اخلاق، ثقافت، رسم و رواج اور زبان و ادب کے ساتھ طرز احساس اور طرز عمل میں بھی تبدیلی آئی۔تبدیلی کے یہ اثرات ۱۸۵۷ء کے بعد شدت سے محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ انگریزوں کے قبضہ کے بعد لاہور علم و ادب کا گہوارہ بننے لگا تھا۔ چنانچہ لاہور میں اردو نثر کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے نصف دوم میں اخبارات کے اجراء اور مطابع کے قیام سے ہوا۔ جس کی خشت اولین اخبار ''کوہ نور'' (۱۸۵۰ء) اور مطبع کوہ نور بنا۔ پھر ایک طویل سلسلہ اخبارات و رسائل اور مطابع کے قیام کا جاری و ساری ہو گیا۔ لاہور میں انگریزوں کی آمد کے بعد اشاعت و طباعت کی آسانیوں نے اخبارات و رسائل کے اجراء کو آسان بنا دیا تھا۔ ابتدا میں اخبارات و رسائل کے صفحات کو قدرتاً وقتی مسائل اور عصری مباحث سے بھرا گیا۔مختصر مضامین و مقالات میں اجمالاً اپنا مدعا بیان کرنا بہ نسبت مستقل کتابیں لکھنے کے آسان تھا۔ اس لحاظ سے رسائل اور اخبارات روزمرہ زندگی میں پیدا ہونے والے سماجی، علمی، ادبی، تہذیبی، مذہبی، اور سیاسی مسائل کی بحث کے لیے نہ صرف بہت

موزوں ثابت ہوئے بلکہ رفتہ رفتہ نئے میلانات اور رجحانات، نئے رویوں اور تحریکوں کی فضا بھی سازگار بناتے چلے گئے۔ لہٰذا صحافتی نثر اپنے عہد کے سیاسی، اقتصادی، سماجی اور تعلیمی حالات کی بڑی اہم دستاویز ہے۔ جتنی معلومات اس عہد کے متعلق ان اخبارات و رسائل میں ملتی ہیں ان تک رسائی کا اس سے بہتر اور معتبر کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ اسی ذریعہ نے ایک نئی طرز حکومت، نیا طرز تعلیم اور زندگی کی نت نئی سہولتوں (ریل، کار، بحری جہاز، ٹیلی گراف، ڈاک کا نیا نظام، ہوائی جہاز) سے بھی عوام کو متعارف کرایا۔ چنانچہ ہمیں علمی و ادبی، دفتری و انتظامی، عدالتی و قانونی، مذہبی، طبی اور سیاسی نوعیت کے اخبارات و رسائل کی کہکشاں دکھائی دیتی ہے۔ جن میں 'کوہ نور' (۱۸۵۰ء) 'دریائے نور' (۱۸۵۰ء) 'لاہور گزٹ' (۱۸۵۳ء) 'ہمائے بے بہا' (۱۸۵۳ء) 'معلم ہند'[۲] (۱۸۵۴ء) 'پنجابی اخبار' (۱۸۵۶ء) 'پنجاب جرنل' (۱۸۵۶ء) 'خورشید پنجاب'[۳] (۱۸۵۶ء) 'چشمہ خورشید' (۱۸۵۷ء) 'بہار حکمت' (۱۸۵۷ء) 'سرکاری اخبار' (۱۸۵۸ء) 'گنج شائگاں' (۱۸۶۰ء) 'بحر حکمت' (۱۸۶۲ء) 'خیر خواہ پنجاب' (۱۸۶۵ء) 'رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ' (۱۸۶۵ء) 'آفتاب پنجاب' (۱۸۶۶ء) 'انوار الشمس' (۱۸۶۷ء) 'اتالیق پنجاب' (۱۸۶۹ء) 'ہمائے پنجاب' (۱۸۷۰ء) 'اخبار عام' (۱۸۷۱ء) 'پولیس گزٹ' (۱۸۷۱ء) 'مطلع انوار' (۱۸۷۱ء) 'اردو میڈیکل گزٹ' (۱۸۷۱ء) 'امیر الاخبار' (۱۸۷۲ء) 'کوہ طور' (۱۸۷۲ء) 'حقیقی عرفان' (۱۸۷۲ء) 'پنجاب گزٹ' (۱۸۷۳ء) 'ہادی حقیقت' (۱۸۷۳ء) 'روزنامچہ پنجاب'[۴] (۱۸۷۴ء) 'اتالیق ہند' (۱۸۷۴ء) 'پنجاب میگزین' (۱۸۷۴ء) 'رہبر ہند' (۱۸۷۵ء) 'ہندو باندھو' (۱۸۷۵ء) 'گنجینہ قانون' (۱۸۷۵ء) 'آریہ سما چار گپت رائے میگزین' (۱۸۷۵ء) 'ناصر الایمان' (۱۸۷۵ء) 'بحر حکمت' (۱۸۷۵ء) 'نور الہدیٰ' (۱۸۷۷ء) 'حافظ صحت' (۱۸۷۸ء) 'پنجاب پنچ' (۱۸۷۸ء) 'دہلی پنچ' (۱۸۸۰ء) 'سوانح عمری' (۱۸۸۲ء) 'آئینہ ہند' (۱۸۸۳ء) 'رفیق ہند' (۱۸۸۴ء) 'آئینہ اخلاق' (۱۸۸۴ء) 'شفیق ہند' (۱۸۸۴ء) 'طب حیوانات' (۱۸۸۴ء) 'نسیم صبح' 'شام وصال' (۱۸۸۴ء) 'جعفر زٹلی' (۱۸۸۵ء) 'شیخ چلی' (۱۸۸۵ء) 'تمیں مار خان' (۱۸۸۶ء) 'اخبار ملکی شہدا' (۱۸۸۶ء) 'لاہور پنچ/پاٹے خان' (۱۸۸۶ء) 'امپیریل پیپر' (۱۸۸۶ء) 'ملا دو پیازہ' (۱۸۸۶ء) 'باغبان' (۱۸۸۶ء) 'شریر' (۱۸۸۷ء) 'پیسہ اخبار' (۱۸۸۷ء) 'شور محشر' (۱۸۹۰ء) 'شریف بیبیاں' (۱۸۹۳ء) 'زبدۃ الاخبار' (۱۸۹۵ء) 'انتخاب لاجواب' (۱۸۹۵ء) 'تہذیب نسواں' (۱۸۹۸ء) 'کشمیری گزٹ' (۱۸۹۹ء) وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں سے تقریباً ہر اخبار کا اپنا مطبع ہونے کی وجہ سے نثر میں فکر و خیال کی نشر و اشاعت کی رفتار میں تیزی آئی۔ مطابع میں اخبارات و رسائل کے علاوہ کتب کی اشاعت نے اردو نثر کی ترسیل میں انقلاب

برپا کر دیا۔ اردو نثر جس کا تدریجی ارتقاء جنوبی ہند و شمالی ہند میں ہوا جب یہ لاہور پہنچی تو اپنی ترقی یافتہ شکل میں یہاں آئی۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید نثر کا آغاز لاہور ہی سے ہوا۔ جس میں انگریز حکومت کا یہ اقدام معاون رہا کہ کمپنی کے افسران کی آمد اور انتظامیہ کی معاونت کے لیے جونیئر اور معمولی درجے کے ملازمین کو کمپنی کے ساتھ یوپی، بہار اور بنگال سے لایا گیا۔ یہ اردو بولنے والے اور کمپنی کے تربیت یافتہ افراد تھے۔ کمپنی کے افسران بھی اردو بولتے تھے۔ انہوں نے اپنی آسانی کیلئے پنجاب میں پنجابی اور فارسی کی جگہ اردو کو فروغ دیا کیونکہ اردو ہی کو اس وقت ورنیکلر زبان کا درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ اسے ہی عدالتی، اخباری اور ضلعی انتظامیہ کی زبان بنایا گیا۔ یہی وہ نقطہ آغاز ہے جہاں سے لاہور میں اردو نثر کو فروغ ملنا شروع ہوا۔ نتیجتاً محکمہ تعلیم (۱۸۵۶ء) اور پنجاب بک ڈپو (۱۸۵۷ء) کا قیام عمل میں آیا۔ سن ستاون کے بعد نثر کو تیزی سے ترقی ملی۔ جس نے علمی و ادبی ذوق کو نہ صرف پروان چڑھایا بلکہ اس سیاسی اور تہذیبی انقلاب نے اہل علم کے زاویہ نگاہ اور طرز فکر پر بھی گہرا اثر ڈالا۔

۱۸۵۷ء کا سال سیاست، معاشرت اور ادب میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ چونکہ لاہور جنگ آزادی کے اثرات سے نسبتاً کم متاثر ہوا اس لیے دہلی اور لکھنؤ سے افراد نے لاہور کی جانب ہجرت کی۔ بعض کو انگریز خود لاہور لے کر آئے جن میں سے بیشتر محکمہ تعلیم سے وابستہ ہوئے۔ ان میں مولانا محمد حسین آزادؔ، منشی ہرسکھ رائے، مولوی کریم الدین، پنڈت اجودھیا پرشاد، ماسٹر پیارے لال آشوب، مولوی ضیاء الدین خان، پنڈت من پھول، خواجہ الطاف حسین حالیؔ، ماسٹر چندولال، مولوی محمد یوسف، مولوی مرزا اشرف بیگ خان، مولوی محمد سعید، سید احمد دہلوی، مولوی اعجاز حسین، سیف الحق ادیب، نادر علی سیفی، مولوی مرزا بیگ خان، پنڈت موتی لال، مولوی سید نصرت علی دہلوی، منشی عزیز الدین، نثار علی شہرت، پنڈت شیونرائن شمیم، منشی حکم چند، پنڈت رادھا کشن، منشی امین چند، پنڈت مکندرام، بابو چندر ناتھ، سید محمد عظیم، منشی درگاہ پرشاد نادرؔ وغیرہ ایسے ابتدائی نام ہیں جنہوں نے انگریز حکومت کی سرپرستی میں سیاسی معاملات اور مسائل سے الگ رہ کر صحافتی، علمی، ادبی، مذہبی نثر تخلیق کی۔ انہی اہل قلم کی کوششوں سے لاہور کو وہی مرکزیت حاصل ہوگئی جو اس سے پیشتر دہلی اور لکھنؤ کے لیے مخصوص تھی۔

''محکمہ تعلیم''، ''پنجاب بک ڈپو'' اور ''انجمن پنجاب'' نے ۱۸۵۷ء کے بعد رونما ہونے والی تبدیلی کو ایک منظم صورت دی۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ سن ستاون کے سیاسی زوال سے پرانی تہذیب اور

اقدار کی جگہ نئی قدروں نے لے لی۔ ایسے میں خیالات کی یہی تبدیلی نئی زندگی اور نئے نثر ادب کی بنیاد بنی۔

محکمہ تعلیم نے علمی و سائنسی نثر کا اولین رسالہ ''خورشید پنجاب'' (۱۸۵۶ء) جاری کیا۔ نیز علمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ادباء سے درسی کتب نہ صرف لکھوائیں بلکہ ترجمہ بھی کرائیں۔ ترجمہ کا کام بالخصوص پنجاب بک ڈپو میں کیا جاتا تھا جبکہ نصابی کتب محکمہ تعلیم کے افسران میجر فلر اور کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی اور ان کے حسب حکم تخلیق و ترتیب دی جاتیں۔ بہترین درسی کتب کی تخلیق کے لیے وقتاً فوقتاً محکمہ تعلیم میں کمیشن اور کمیٹیاں بنانے کے ساتھ انعامی مقابلوں کا اہتمام بھی کیا جاتا رہا۔ محکمہ تعلیم نے ادباء سے جو درسی کتب لکھوائیں اگر چہ وہ نصابی ضروریات کے لیے تھیں جن میں علمی اور معلوماتی پہلوؤں کی مقصدیت پر زور دیا جاتا تھا لیکن چونکہ اس کے لکھنے والے صاحب طرز ادیب تھے اس لیے ان درسی کتب میں ادبیت کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تخلیقی نثری اصناف کے ابتدائی نقوش بھی انہی درسی کتب کی صورت میں دکھائی دیتے ہیں۔ نصابی اور درسی سلسلہ تحریر نے اردو نثر کو بہت سی عمدہ کتابیں دیں۔ جن میں بیشتر نثری قصے کہانیوں میں نظم کی خوبصورت پیوندکاری بھی کی گئی۔ درسی کتب کی نثر ہی نئی ادبی نثر تھی کیونکہ اس سے قبل اخبارات کی جو نثر تھی اس میں ادبیت کا رنگ بے حد ہلکا تھا۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ اخبار نویسی کا مقصد ہی الگ ہوتا ہے۔ ۱۸۶۴ء محمد حسین آزاد (نصیحت کا کرن پھول)، منشی عزیز الدین (جوہر عقل) اور مولوی کریم الدین (خط تقدیر) نے بیک وقت ناول لکھنے کی ابتداء کی۔ ''نصیحت کا کرن پھول'' ناول کی تکنیک کے زیادہ قریب ہے جبکہ ''خط تقدیر'' اور ''جوہر عقل'' تمثیلی انداز میں لکھے گئے قصے ہیں جنھیں ناول کی خام صورت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ''رسوم ہند'' (۱۸۶۸ء) میں اولین افسانے ماسٹر پیارے لال آشوب کا ''من سکھی اور سندر سنگھ کا قصہ'' اور ''خوشحال چند اور ہیرا۔ دولت رام اور موہنا۔ کروڑی مل اور گنگی کا قصہ'' کے علاوہ غالباً محمد حسین آزاد کا ''جہاں آراء بیگم اور محمد یوسف، گیتی آراء بیگم اور محمد جمیل الدین کا قصہ'' ہیں۔ ان کی موجودگی میں مذکورہ اصناف نثر کے آغاز اور آبیاری میں اولیت کا سہرا لاہور مرکز کے سر جاتا ہے۔ اردو فکشن میں محمد حسین آزاد، منشی عزیز الدین اور مولوی کریم الدین پہلے ناول نگار جبکہ پیارے لال آشوب اور محمد حسین آزاد اولین افسانہ نگار قرار پاتے ہیں۔ اب اردو فکشن کی تاریخ از سر نو مذکورہ احباب سے مرتب کی جائے گی، نہ کہ ڈپٹی نذیر احمد، یلدرم، علامہ راشد الخیری یا پریم چند سے، جنہوں نے اردو فکشن کو مولانا آزاد، آشوب، منشی

عزیز الدین اور کریم الدین کے بعد ناول اور افسانے کو موضوع بنایا۔ ہر چند کہ مولانا آزاد، آشوب، منشی عزیز الدین اور مولوی کریم الدین، مروجہ معنوں میں فکشن نگار نہیں ہیں لیکن ان کی مذکورہ تحریریں ناول اور افسانے کی صنف کی خشت اولین ضرور ہیں۔ درسی ضروریات کے تحت لکھے گئے ان قصے کہانیوں میں پرانی تہذیب، ثقافت اور رسم و رواج کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ یہ انسانی سماج، معاشرہ، روایات، مذہبی اقدار و اخلاق، تہذیب و تمدن کی امین ہیں۔ چنانچہ قوموں کے تمدن اور اس کے نشیب و فراز، علم و ادب کی ترقی، اسلوب اور زبان کی کیفیت ان درسی و نصابی قصوں میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔ یوں مولوی کریم الدین، پیارے لال آشوب محمد حسین آزاد، اور دیگر اصحاب کی نثری خدمات کی وجہ سے اردو نثر نے علمی و ادبی زبان کا درجہ پایا یہ حضرات اردو نثر میں وسعت اور ترقی کے ایسے امکانات روشن کر گئے جس کے سہارے آج بھی اردو زبان ترقی کی منازل کامیابی سے طے کر رہی ہے۔

قصہ کہانی کی جتنی بھی درسی کتب تحریر کیں گئیں ان سب کا جوہر اصلاح اور ترقی پسند نقطہ نظر پر مبنی تھا۔ درسی کتب کے لیے فلسفہ، تاریخ، سائنس اور تعلیم کے موضوع پر لکھنے والوں کو نصابی کتب تحریر کرنے کا معاوضہ اس شرط کے ساتھ دیا جاتا کہ طرز بیان سادہ، دلکش اور عام فہم اردو نثر میں ہونا چاہیے جس سے اسلوب بیان میں تازگی کا عنصر در آیا۔ یہی وہ قصے کہانیاں اور تمثیلیں ہیں جنھوں نے ناول، افسانہ، ڈراما کے لیے میدان ہموار کیا۔ قصہ کی افادیت اور مقصدیت میں حقیقت اور واقعیت نگاری کا احساس دلایا۔ واقعات کے انتخاب، تسلسل و ربط، پلاٹ سازی، کردار نگاری، اور مکالمہ نگاری کا فنی شعور بخشا؛ مرکزی خیال کا احساس دلایا؛ اسلوب بیان کے نئے سانچے دیے اور قصہ کو اس قابل بنانے کی سعی کی کہ وہ حقیقی واقعات کا متحمل ہو سکے۔ پھر قاری اور ادیب کے ذہن کو افسانے، ناول اور ڈرامے کے لیے تیار کیا کہ وہ داستانوں کے بجائے حقیقی قصے کہانیوں میں دلچسپی لے سکیں۔

لاہور میں سفرنامہ کی صنف میں اولین سفرنامہ ''یہ تحفۂ کشمیر'' (۱۸۵۲ء) ہے جسے منشی ہر سکھ رائے نے فارسی سے اردو میں منتقل کیا۔ جبکہ طبعزاد ''سفرنامہ امین چند'' (۱۸۵۴ء) ہے جسے منشی امین چند نے تحریر کیا۔ اولین گرامر ''تحفہ چشتی'' (۱۸۵۴ء) اور شہری تاریخ کی اولین کتاب ''یادگار چشتی'' (۱۸۵۸ء) از نور احمد چشتی ہے۔ اولین تمثیل نگاری کی مثالیں جوہر عقل (۱۸۶۴ء)، از منشی عزیز الدین اور ''خط تقدیر'' (۱۸۶۴ء) از مولوی کریم الدین ہیں۔ مقالہ نگار کے مطابق اولذکر پہلی باقاعدہ اور مکمل تمثیل ہے جبکہ افسانوی تنقید کا آغاز

''خط تقدیر'' کے دیباچے سے ہوا۔ اردو زبان کی پہلی لغت مولوی کریم الدین کی تحریر کردہ ''کریم اللغات'' (۱۸۶۲ء) ہے۔ لسانیات کے موضوع پر اولین علمی تصنیف مولانا آزاد کی سخندان فارس (حصہ اول ۱۸۷۲ء) جونظری و عملی تنقید کا بھی اولین نقش ہے۔ انشائیہ کے اولین نقوش ''نیرنگ خیال'' (۱۸۸۰ء) ادبی تاریخ و تذکرہ اور خاکہ نگاری کا اولین نقش ''آب حیات'' (۱۸۸۰ء) از مولانا آزاد ہیں۔ درحقیقت لاہور میں مولانا آزاد موضوع اور اسلوب ہر دو حوالوں سے ایک دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کی تحریروں میں تخلیقی، تنقیدی، تحقیقی اور علمی نثر کی فراوانی ہے۔ بہترین انشا پردازی ان کے اسلوب کا خاصا ہے۔ مولوی کریم الدین، مولوی ضیاء الدین، الطاف حسین حالی جیسی مقتدر علمی و ادبی شخصیات کی نثری تخلیقات محکمہ تعلیم کی ملازمت کا نتیجہ تھیں۔ جو خالصتاً تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لیے لکھی گئیں۔ لاہور میں خالص ادبی خدمات کا موقع سوائے پیارے لال آشوب اور مولانا آزاد کے کسی کو نہیں ملا۔ انہوں نے اپنی انشاپردازی کے جوہر دکھا کر اردو نثر کے دامن کو مالا مال کیا۔ چونکہ آشوب واپس دہلی چلے گئے اور آزاد نے لاہور میں مستقل اقامت اختیار کی اور ادبی خدمت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اس لیے مولانا آزاد کی نثری تحریروں کا احاطہ موضوع اور اسلوب کے حوالے سے کیا جائے تو بلاشبہ مولانا آزاد ہی لاہور میں اردو نثر کے ہیرو قرار پاتے ہیں۔

اردو نثر کی پروان چڑھانے والا دوسرا بڑا پلیٹ فارم انجمن لاہور المعروف ''انجمن پنجاب''۔ ہے جو اگرچہ جدید اردو شاعری کا نقطہ آغاز سمجھا جاتا ہے لیکن اس کی نثری خدمات کا اس طرح تذکرہ نہیں کیا جاتا جیسا کہ کرنے کا حق ہے۔ انجمن لاہور نے مجلسی تنقید اور علمی، ادبی و سائنسی مضامین، تنقید نگاری اور تحقیق کا در وا کیا اور رسالہ ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ'' جاری کیا۔ انجمن پنجاب تعلیمی، سماجی، معاشرتی اور اصلاحی تحریک کے علاوہ ایک ادبی تحریک بھی ثابت ہوئی۔ اسی کی ادبی نشستوں سے الطاف حسین حالی لاہور میں اپنے چار سالہ قیام کے دوران جدید شعری تصورات سے روشناس ہوئے۔ جو بعدازاں ''مقدمہ شعروشاعری'' (۱۸۹۳ء) کا پیش خیمہ بنے۔ نیز قصہ پن کے جوہر سے بھی شناسائی لاہور کی اسی علمی و ادبی فضا میں ہوئی اوراصلاحی قصہ مجالس النساء (۱۸۷۲ء) بصورت ناول ڈرامائی خصوصیات کے ساتھ لکھا۔ علم و ادب کی تمام بڑی اور مقتدر شخصیات نے لاہور کے علمی و ادبی ماحول میں اپنی صلاحیتوں کو جلا دی اور شہرت پائی۔

''محکمہ تعلیم'' پنجاب اور ''انجمن پنجاب'' نے نہ صرف ادباء کو نئے موضوعات اور نئے اسالیب سے روشناس کرایا بلکہ ادب کا بہترین ذوق بھی پیدا کیا۔ مولانا آزا د نے مضمون ''انگریزی انشاپردازی کا اردو

انشاپردازی پر اثر'' کی صورت میں نئے خیالات سے متعارف کرایا۔ چنانچہ نئے ادب اور نئی نثر کی تشکیل کا آغاز محکمہ تعلیم پنجاب اور انجمن پنجاب کے تحت ہوا اور اس کی تقلید میں دیگر علمی و ادبی انجمنوں کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جنہیں انگریز مستشرقین میجر فلر، کرنل ہالرائیڈ، اور ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی حاصل تھی۔ بالخصوص لاہور میں اردو نثر کی ترقی میں جس طبقے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا وہ محکمہ تعلیم کے یہی افسران تھے۔ جنہوں نے علمی و ادبی سرگرمیوں کو تیز کرنے میں مصنفین کی مختلف طرح سے حوصلہ افزائی کی اور مقامی مصنفین کے اشتراک سے کتابیں بھی لکھیں۔ اس سے لسانیات کی تحریک کو خاص طور پر بڑا فائدہ پہنچا۔

انگریزوں کے لاہور پر قابض ہونے کے بعد ایک نئی بات یہ ہوئی کہ لاہور کی اردو نثر کا فارسی، ہندی، لسانی آمیزہ انگریزی زبان سے بھی متاثر ہوا۔ چنانچہ اس اختلاط اور تعلق سے اردو نثر میں انگریزی کے سینکڑوں الفاظ درآئے۔ یوں لاہور کے اندر تعلیمی، معاشرتی اور معاشی سرگرمیوں کا آغاز کسی مقامی رہنما کے بجائے انگریز حکام کی سرپرستی میں ہوا۔ ہمیں یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ انقلاب ستاون کے بعد درحقیقت لاہور میں علمی، سائنسی، ادبی وصحافتی و مذہبی نثر کے فروغ میں محکمہ تعلیم اور انجمن پنجاب ہی بنیادی پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور میں جدید اردو نثر سرسید تحریک سے پہلے وجود میں آچکی تھی۔ محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب، مولوی کریم الدین، وغیرہ لاہور میں ادبی تاریخ نگاری، قصہ نگاری، تمثیل نگاری، ادبی تنقید، مضمون اور انشائیہ کو فروغ دینے میں مصروف تھے اور یہ سب علی گڑھ تحریک سے پہلے ہو رہا تھا۔ آج تک علی گڑھ تحریک ہی کے زیر اثر اردو نثر کے فروغ کو فوقیت دی جاتی رہی ہے لیکن درحقیقت لاہور میں اردو نثر کے فروغ و ارتقا کے پیش نظر مرکز لاہور کو برتری حاصل ہے۔ جہاں سادہ اور بیانیہ نثر کی روایت تحریک سرسید سے پہلے اور الگ رہ کر پروان چڑھی بلکہ خود سرسید لاہور میں جاری علمی و ادبی ارتقاء سے متاثر ہوئے۔ اس ضمن میں تمام سرگرمیاں ان کے پیش نظر تھیں۔ پھر سرسید کے رفقاء کار بھی لاہور کے ادبی ماحول سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ سرسید احمد خان کا لاہور آنا، حالی کا پنجاب بک ڈپو اور ''انجمن پنجاب'' میں شریک رہنا، نذیر احمد، محسن الملک وقار الملک اور مولانا شبلی کا لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں لیکچر دینا۔ لاہور کے علمی و ادبی ماحول کی اہمیت کا اعتراف ہی تھا۔ بالفاظ دیگر لاہور میں جاری علمی و ادبی سرگرمیوں نے سرسید اور ان کے رفقاء کی علمی، ادبی، فکری اور نظریاتی خیالات کی نشوونما میں فعال کردار ادا کیا۔

علی گڑھ تحریک کے تحت پروان چڑھنے والی اردو نثر کا اس شدومد سے ذکر کیا گیا ہے کہ ہر نثری

صنف کا آغاز اسی تحریک سے منسلک کر دیا گیا حتیٰ کہ مولانا آزاد کی کاوشوں کو بھی علی گڑھ تحریک کے پلڑے میں ڈال کر لاہور کی اردو نثر کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جبکہ لاہور میں سادہ اور بیانیہ اردو نثر کا آغاز اسلوب اور موضوع ہر دو لحاظ سے تحریک سرسید سے پہلے ہوا۔ سرسید کی تحریک بنیادی طور پر ایک اصلاحی تحریک تھی۔ براہ راست اس کا مقصد ادب کی تخلیق کرنا نہ تھا لیکن لاہور میں ادب کی تخلیق کے لیے باقاعدہ ماحول فراہم کیا گیا جس سے براہ راست ادب کی تخلیق ممکن ہو پائی۔ یہ سب کچھ محکمہ تعلیم، اخبارات، رسائل، انجمن پنجاب، پنجاب بک ڈپو، گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی کا قیام ہی اس سب کا سبب بنے۔

وہ تمام نثری اصناف جن کا ذکر سرسید تحریک کے حوالے سے کیا جاتا ہے ان سب کا آغاز و ارتقا صحیح معنوں میں لاہور سے ہی ہوا۔ انیسویں صدی کے نصف اول تک جب فارسی ہی درباری و سرکاری، علمی و ادبی زبان تھی۔ نصف دوم میں الحاق پنجاب (۱۸۴۹ء) کے بعد لاہور میں اردو نثر اور اس کی اصناف کا اتنے کم عرصے میں فارسی کی جگہ مقبول و معروف ہو کر پروان چڑھنا خود ایک بہت بڑی بات ہے۔ اب جب بھی اردو نثر کی تاریخ بیان کی جائے گی تو ابتداء میں اولیاء کے ملفوظات و اقوال، فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اردو نثر میں لاہور کی خدمات اور پھر سرسید تحریک کا ذکر آئے گا۔ اس طرح ادبی مورخین کو ایک نئی ترتیب دینا پڑے گی۔ تبھی مجموعی طور پر اردو نثر کے ارتقا کو تسلسل و ترتیب کے ساتھ سمجھنا ممکن ہو پائے گا۔

انیسویں صدی کے نصف دوم میں عوامی ادب کو بھی مقبولیت ملی جن میں مقامی رسم و رواج کے بارے معلومات بہم پہنچائی گئیں۔ ان میں ''رسوم ہند'' ''قصص ہند'' وغیرہ شامل تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تاریخ نویسی کو بھی انگریزوں نے رواج دیا۔ لاہور سمیت پنجاب کے متعلق وسیع معلومات جمع کیں یہ کام انہوں نے مصنفین کے سفرناموں ''سفرنامہ امین چند'' اور ''یہ تحفہ کشمیر'' کے علاوہ ''یادگار چشتی''، ''تحقیقات چشتی''، ''تاریخ مخزن پنجاب''، تاریخ لاہور'' وغیرہ سے لیا۔ انیسویں صدی میں لاہور کے اردو نثری نمونوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت نثر کے بنیادی ڈھانچہ پر فارسی الفاظ و تراکیب کا اثر ہونے کے باوجود رواں، عام فہم، سادہ اور آسان اردو نثر کا چلن تھا۔

اُردو نثر میں تحقیق کی ایک مستقل روایت ۱۸۷۰ء میں اورینٹل کالج کی صورت میں شروع ہوئی۔ ڈاکٹر لائٹنر اور ان کے رفقا نے لسانیات اور تاریخ کے موضوعات پر تحقیق کی۔ جن میں سنسکرت، پنجابی، ہندی،

عربی، فارسی، اُردو اور مختلف علوم کی تحقیق میں لسانی مسائل اور تاریخی حقائق کو بنیادی حیثیت دی گئی۔ ادب میں تحقیق وتنقید کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں اورئینٹل کالج کے عالم اور فاضل اساتذہ نے نمایاں کردار ادا کیا جو تعلیمی سرمائے کا نہایت اہم حصہ ہے۔

اجمالاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ سن ستاون کے انقلاب کے بعد اہل لاہور انگریزوں کے ہاتھوں محکوم بن گئے تھے لیکن ان کے آنے سے زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نئی تبدیلی کے آثار بھی نمودار ہوئے تھے۔ جس نے ہماری تہذیبی معاشرتی ،علمی اور ادبی زندگی پر غیر معمولی اثر ڈالا۔ اس حوالے سے انیسویں صدی کا نصف دوم صحیح معنوں میں انقلابی عہد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہی وہ عہد تھا جب ایک جانب ہم اپنی پرانی اقدار سے بیگانگی اختیار کررہے تھے اور دوسری جانب نئے سیاسی ، ثقافتی اور ادبی رجحانات ہمارے اذہان میں داخل ہو رہے تھے۔ بالخصوص ۱۸۶۴ء تا ۱۸۸۰ء تک کا دور خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جسے اردو ادبیات میں ''نشاۃ ثانیہ'' کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ یہی وہ دور ہے جب اردو نثری ادب کو فروغ ملا۔ بہت سی علمی و ادبی کتب کے اردو تراجم کیے گئے۔ سوانح ،تنقید، ناول، افسانہ، تاریخ، تذکرہ، انشائیہ، سفرنامہ اور مضمون نگاری کی اصناف وجود میں آئیں اور ان میں فکروفن کے نئے گوشے سامنے آئے ۔اس دوران اردو نثر نے اپنے دامن کو اسقدر وسیع کیا کہ نہ صرف مضمون نویسی، مقالہ نگاری، صحافت، تاریخ اور قصہ نویسی وجود میں آئی بلکہ ٹھوس سائنسی مسائل، ریاضی، کیمیا، اور طبعیات کو بھی اپنی جولانگاہ بنایا۔ جس کی بدولت اردو نثر کا ارتقائی سفر کامیابی سے جاری و ساری رہا۔ اب اردو نثر میں طرز ادا کی رنگینی عبارت آرائی تک محدود نہ رہی تھی بلکہ مدعا نگاری اس کا اصل اور بنیادی مقصد بن گیا تھا۔ چنانچہ اردو نثر میں اسلوب، نفس مضمون اور مواد کو بھی اہمیت ملی۔ یہی سبب ہے کہ اردو نثر ٹھوس علمی و ادبی مسائل کے اظہار کا وسیلہ بننے کے ساتھ ساتھ کاروباری اور روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات اور مسائل کو بھی بیان کرنے لگی۔ مختلف درجوں کے نصاب کے لیے ذریعہ اظہار اور ذریعہ تعلیم بننے کے ساتھ خواتین اور بچوں کے لیے ہلکے پھلکے ادب کی تخلیق کا باعث بھی بنی۔ نیز بہت سے نئے اخبارات و رسائل کے ساتھ علمی و ادبی مجالس کا قیام بھی عمل میں آیا۔ جن کے زیر اثر اعلیٰ پایہ کی تصانیف اردو نثر میں ڈھالی گئیں اور اس میں سرفہرست ''انجمن پنجاب'' ہی ہے۔

مذکورہ بالا عوامل اور اقدامات نے دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد دکن کے بعد لاہور میں ایک نئے دبستان کی بنیاد ڈالی اور لاہور میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں اردو نثر میں ہر صنف ادب نے جنم لیا۔ جن میں

زندگی اپنے نئے رنگوں میں پیراہن ہو کر مسند ادب پر رونق افروز ہوئی۔ کہیں تمام اصناف نثر (ترجمہ نگاری، سفرنامہ، رپورتاژ، سوانح نگاری، خاکہ نگاری، تاریخ، تنقید و تحقیق، آپ بیتی، افسانہ، ناول، ڈراما، تمثیل نگاری، انشائیہ، مضمون نگاری، مقالہ نگاری، طنز و مزاح، فکاہیہ کالم، خطوط) باہم ملی جلی نظر آئیں اور کہیں اپنی خالص اور خام صورت میں دکھائی دیں۔ اردو نثر بالخصوص ادب جو معاشرے کے خیالات و احساسات کا آئینہ دار ہوتا ہے اپنے ابتدائی تجرباتی دور سے گذر کر انیسویں صدی کے آخری دو عشروں میں انگریزی ادبیات کے اثر سے اس کی اصناف نثر اپنی قدرے ایک الگ شناخت کے ساتھ جلوہ گر ہوئیں جبکہ اسلوب بیان کی سطح پر اتنی پختگی آ چکی تھی کہ ہر قسم کی اردو نثر میں نہایت صحت و صفائی کے ساتھ مطالب ادا کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پیدا ہو چکی تھی جنہیں موضوع اور اسلوب ہر دو حوالوں سے بیسویں صدی کے رسائل نے فروغ اور رواج دیا۔

بیسویں صدی انقلاب در انقلاب کا زمانہ ہے جس نے معاشرت، سیاست، اخلاق، تعلیم، ذہن اور فکر و خیال کے سانچوں کو بدل کر رکھ دیا۔ اس صدی کے آغاز سے ہی ادباء نے علم و ادب کو زندگی کے نئے تقاضوں کے پیش نظر تخلیق کرنا شروع کر دیا۔ علمی، ادبی، صحافتی اردو نثر تخلیق کرنے والوں کو تین بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ وہ ادباء جنہوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں لاہور کی علمی و ادبی فضا کو سازگار بنائے رکھا اور بیسویں صدی میں قدم رکھتے ہی نئے چیلنجز کو بھی قبول کیا اور ساتھ ہی قدیم وضع، اخلاق، تعلیم اور علمی و ادبی ذوق کو برقرار رکھتے ہوئے معیاری تخلیقات دیں۔ ان میں محمد حسین آزاد، مولانا فیض الحسن سہارنپوری، علامہ اقبال، سر عبدالقادر، تاجور نجیب آبادی، مولوی محبوب عالم، محرم علی چشتی، مولوی ممتاز علی، مولوی انشاء اللہ خان، محمد دین فوق، مرزا سعید احمد دہلوی، مولانا ظفر علی خان، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، غلام بھیک نیرنگ، آغا حشر، حکیم شجاع الدین، چراغ حسن حسرت، خان احمد حسین خان، فقیر سید زین العابدین، سید محمد لطیف، سردار گنڈا سنگھ، وغیرہ شامل تھے۔ دوسرے گروہ میں ایسے ادباء شامل ہیں جو انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا ہوئے لیکن ذہنی و فکری علمی نشوونما بیسویں صدی میں پائی۔ تاریخ کے اسی سنگم پر ادبا کے بہت بڑے اجتماع کے پیش نظر تاجور نجیب آبادی نے کہا کہ "دارالسلطنت لاہور مرکز علوم و اہل علم بن رہا ہے آج جتنے بھی اہل علم اور مشاہیر یہاں موجود ہیں کسی پورے صوبے میں نہ ملیں گے۔"[۵] تیسرا گروہ وہ ہے جس نے بیسویں صدی کے انقلابی دور میں آنکھ کھولی اور اپنے اذہان کو علمی، فکری، اور نظری حوالوں سے جدید مغربی علوم و فنون سے متاثر کیا۔ بین الاقوامی تحریکوں کے اثرات قبول کیے اور بدلتے

حالات اور تقاضوں کے پیش نظر اردو نثر کو علمی و تخلیقی سطح پر نئے اور متنوع خیالات دیئے۔ جن میں دو بنیادی نظریے ''ادب برائے ادب'' اور ''ادب برائے زندگی'' تھے۔ انہی دو نظریوں کو لے کر علمی و تخلیقی نثر میں مختلف میلانات، رجحانات، تحاریک اور حلقے وجود میں آئے جنہیں اخبارات و رسائل نے اعتبار اور وقار بخشا اور سیاسی معاملات سے لے کر تاریخی، تعلیمی، علمی و ادبی خدمات انجام دیں۔

بیسویں صدی کے آغاز پر جس رسالے نے اردو نثر کو فکری اور معنوی لحاظ سے انقلابی جہت سے ہمکنار کیا وہ رسالہ مخزن (۱۹۰۱) تھا۔ جس سے اس زمانے کے سب ادیب متاثر ہوئے۔ یہ وہ دور تھا جب ادب میں لطیف ادبی، رومانی رجحانات کے ساتھ شدید جذباتی رویے بھی پروان چڑھ رہے تھے۔ اس ادبی نثر کا ایک پہلو خالص ادبی اور دوسرا پہلو فکری تھا۔ اول الذکر کی عکاسی ''مخزن'' کے لکھنے والے کر رہے تھے اور مؤخرالذکر کی نمائندگی مولانا ظفر علی خان اور ان کی قبیل کے ادبا کر رہے تھے۔ ''مخزن'' نے باقاعدہ ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس رسالے کے توسط سے اردو نثر نئی اصناف سے آشنا ہوئی۔ نثر میں نئے تجربات کی حوصلہ افزائی کی گئی اور مغربی ادب کے شہ پاروں کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ جس سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے اردو نثر میں دلچسپی لی اور مغربی علوم و فنون اور فکر و فن کے اظہار کے لیے اسے اپنایا۔ ''مخزن'' کی صورت میں ادب و صحافت کے امتزاج کا قابل تقلید نمونہ ہی تھا جس کی پیروی میں اردو رسائل اور معیاری اخبارات و جرائد جن میں اخبار 'وطن' (۱۹۰۲ء) 'بچوں کا اخبار' (۱۹۰۲ء) 'تالیف و اشاعت' (۱۹۰۲ء) 'زمیندار' (۱۹۰۳ء) 'پنجۂ فولاد' (۱۹۰۳ء) 'راوی' (۱۹۰۶ء) 'آزاد' (۱۹۰۷ء) 'پھول' (۱۹۰۹ء) 'ستارہ صبح' (۱۹۱۷ء) 'کہکشاں' (۱۹۱۸ء) 'سیاست' (۱۹۱۹ء) 'شباب اردو' (۱۹۲۰ء) 'رسالہ ہزار داستان' (۱۹۲۱ء) 'ہمایوں' (۱۹۲۲ء) 'رومان' (۱۹۲۲ء) 'نیرنگ خیال' (۱۹۲۴ء) 'عالمگیر' (۱۹۲۴ء) 'اورینٹل کالج میگزین' (۱۹۲۵ء) 'نقاد' (۱۹۲۵ء) 'بہارستان' (۱۹۲۶ء) 'انقلاب' (۱۹۲۷ء) 'ادبی دنیا' (۱۹۲۹ء) 'سروش' (۱۹۲۹ء) 'خیالستان' (۱۹۳۰ء) 'شیرازہ' (۱۹۳۱ء) 'کارواں' (۱۹۳۳ء) 'احسان' (۱۹۳۳ء) 'شاہکار' (۱۹۳۵ء) 'نسوانی دنیا' (۱۹۳۵ء) 'ادب لطیف' (۱۹۳۶ء) 'نوائے وقت' (۱۹۴۰ء) 'کتاب' (۱۹۴۲ء) 'سویرا' (۱۹۴۸ء) 'امروز' (۱۹۴۸ء) 'استقلال' (۱۹۴۸ء) 'نقوش' (۱۹۴۸ء) 'قندیل' (۱۹۴۸ء) 'چٹان' (۱۹۴۸ء) 'ساغر' (۱۹۴۸ء) 'اقدام' (۱۹۵۰ء) 'سحر' (۱۹۵۰ء) 'الحمراء' (۱۹۵۱ء) 'اقبال' (۱۹۵۲ء) 'نئی تحریریں' (۱۹۵۴ء) 'تعمیر انسانیت' (۱۹۵۵ء) 'لیل و نہار' (۱۹۵۷ء) 'داستان گو' (۱۹۵۷ء) 'صحیفہ' (۱۹۵۷ء) 'محور' (۱۹۵۹ء) 'اقبال ریویو' (۱۹۶۰ء) 'اردو ادب'

(۱۹۶۰ء) 'سیارہ' (۱۹۶۱ء) 'فنون'(۱۹۶۳ء) 'روزنامہ مشرق' (۱۹۶۳ء) 'اوراق'(۱۹۶۴ء) 'المعارف' (۱۹۶۸ء) 'تخلیق'(۱۹۶۹ء)'تحریریں'(۱۹۷۰ء) 'لفظ' (۱۹۷۲ء) 'محراب' (۱۹۷۸ء) 'مجلّہ تحقیق' (۱۹۷۸ء) 'معاصر' (۱۹۷۹ء) 'روزنامہ جنگ' (۱۹۸۱ء) 'اردونامہ' (۱۹۸۱ء) 'دیدشنید' (۱۹۸۷ء) 'روزنامہ پاکستان' (۱۹۹۰ء) 'روزنامہ صداقت' (۱۹۹۵ء) 'روزنامہ دن' (۱۹۹۷ء) کے علاوہ 'اردو ڈائجسٹ' (۱۹۶۰ء) اور 'قومی ڈائجسٹ' (۱۹۷۷ء) کی اختراع وغیرہ نے بھی اردو نثر کو تازگی، وسعت، جدت اور تقویت دی اور اپنے خاص نمبروں سے موضوع اور اسلوب کے حوالے سے نہایت بیش قیمت مواد پیش کیا۔ان میں سے کئی رسائل ادبی تحریکوں اور رجحانات کے علمبردار تھے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ جدید رجحانات اور تحاریک اول اول رسائل اور اخبارات کے صفحات پر ہی پروان چڑھیں کہ بعد ازاں ان کی تشکیل پذیری ممکن ہو پائی۔

ادبی تحریکیں اپنے مزاج، رویے اور رجحان کے اعتبار سے تین طرح کی رہی ہیں۔اول جنھوں نے زبان و بیان، اسلوب و اظہار، ہیئت اور تکنیک میں جدت اور نت نئی تبدیلیوں کو اپنا مطمع نظر بنایا۔اس کی نمائندگی رومانویت کی تحریک اور حلقہ نیاز مندان لاہور نے کی جس نے روایت سے بغاوت کیساتھ نئے موضوعات، نئی اور خوبصورت زبان، ہیئت کے تجربات، تخیل جذبہ، وجدان، انفرادی تجربہ اور فطرت کا نامیاتی تصور دیا۔ دوم ایسی تحریک جن کی بنیاد اجتماعی احساس وشعور اور ایک واضح فکری نظام پر تھی۔جس کی عکاسی ترقی پسند تحریک نے کی جو ایک منظم اور شعوری تحریک تھی۔ اس نے ترجیحی سطح پر اردو نثر کو وسیلہ اظہار بنایا کیونکہ ان کے نزدیک ادب کا مقصد زندگی کا عرفان حاصل کرنا ہے اور بدلتی ہوئی اقدار، زندگی کی پیچیدگیوں، الجھنوں اور کشمکشوں کا بلیغ ترین اور بہترین ذریعہ اظہار نثر ہی ہوسکتی ہے۔ چنانچہ اس تحریک نے نثری اصناف کو فروغ دینے کی کوشش کی جن میں مقصدیت، اجتماعیت اور اصلاح کے عنصر پر زور دینے کے ساتھ معاشرتی، تہذیبی، تاریخی اور سیاسی مسائل کا ذکر کیا گیا۔ مارکسزم، جدید سائنسی اور سماجی علوم نے ترقی پسندوں کا رویہ مظاہر زندگی کے بارے میں زیادہ بے باک اور حقیقت پسندانہ بنا دیا تھا۔سوم، ایسی تحریک جو مخصوص نوعیت کے انفرادی تجربات اور ان کے تخلیقی اظہار کی ضامن تھی۔ حلقہ ارباب ذوق اور اس کے تحت پروان چڑھنے والے رجحانات، فطرت نگاری، نفسیات نگاری، علامت نگاری، تجریدیت، وجودیت اور لسانی تشکیلات نے اردو زبان و ادب کو جدید حسیات سے روشناس کیا جس سے یہ سہولت حاصل ہوئی کہ مستقبل کے ادبا نے نئی نئی علامتیں وضع کیں۔یہ سب رجحانات اسی زمرے میں شمار کیے جائیں گے۔

ان تمام تحریکوں کا حلقہ اثر اپنی اپنی جگہ بے حد وسیع رہا ہے۔ اردو نثر نے ان تمام تحریکوں کی خصوصیات اور اثرات کوموضوع،فن، ہیئت اور اسلوب کے حوالے سے متنوع جہتوں سے ہمکنار کیااور ہجرت، فسادات، اسلامی ادب کی تحریک، پاکستانی ادب کی شناخت، ہند اسلامی تہذیب وغیرہ جیسے متنوع مباحث بھی دیئے۔ وہیں عظیم الشان علمی و ادبی انجمنوں، اداروں اورمکتبوں نے بیسیوں صدی میں بھی علمی وتخلیقی تصنیف و تالیف کی روایت کو جاری و ساری رکھا۔ چنانچہ گورنمنٹ کالج لاہور، اورنیٹل کالج لاہور،مجلس ترقی ادب، ادارہ ثقافت اسلامیہ،بزم اقبال، مجلس زبان دفتری وغیرہ نے نہایت وسعت اور جامعیت کے ساتھ اردو نثر کی خدمت کو ہنوزجاری و ساری رکھا ہوا ہے۔الغرض جتنے بھی اخبارات و رسائل،علمی و ادبی ادارے اورتحریکیں تھیں بالواسطہ یا بلاواسطہ سب کے اغراض و مقاصد میں بنیادی عنصر اردو زبان کی ترویج واشاعت تھا اور اسی سبب اردونثر نے ترقی کی ارتقائی منازل کامیابی سے طے کیں۔

انہی تحریکوں اورعلمی و ادبی اداروں کی مرہون منت مختلف اسالیب بیان ایجاد ہوئے اور ان کے اثرات قبول کیے گئے جوتقریباً سب کے سب انگریزی زبان وعلوم سے متاثرنظر آتے ہیں۔ بیسویں صدی میں مغربی تعلیم سے اردو نثر کو جو سب سے بڑا فیض پہنچا اورصحیح معنوں میں زبان و ادب کی خدمت ہوئی۔ فلسفہ و سائنس،صحافت،اورادب و انشاء، میں ناول، ناولٹ، افسانہ،طویل مختصر افسانہ، ڈراما، سفر نامہ، رپورتاژ، آپ بیتی،سوانح نگاری، خاکہ نگاری، ترجمہ نگاری، کالم نگاری، طنز و مزاح نگاری، تاریخ نگاری،خطوط نگاری، تحقیق نگاری،اورتنقید نگاری وغیرہ کے مختلف موضوعات کے لیے الگ، مناسب اورموزوں اسالیب بیان مخصوص ہو گئے جبکہ انیسویں صدی میں ان نثری اصناف کے اسالیب خال اور خام صورت میں تھے۔ نیز تمام نثری اصناف کا اسلوب، زندگی اور فن کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوا۔ یوں مذکورہ اصناف کا آغاز موضوع اور اسلوب کے حوالے سے انیسویں صدی میں ہوا لیکن اصل میں فنی اور اسلوبیاتی ارتقا بیسویں صدی میں عمل میں آیا۔ مقالہ ہذا میں مذکورہ نثری شہ پاروں اور ان کے مصنفین ہی کی مرہون منت اردونثر نے فن اور اسلوب کی معراج حاصل کی ہے۔

لاہور کی اردو نثر متنوع اور مختلف رنگوں سے بھری ہے۔جس کی اپنی خوبصورتی ہے۔بعض پر ماضی کی گرد کی تہہ جم گئی تھی جسے جھاڑ پونچھ کر ان کے اصل رنگ کومقالہ ہذا میں نکھارنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہی وہ رنگ ہیں جو لاہور میں اردو نثر کے شاندار ماضی اور روشن مستقبل کے ضامن ہیں۔ وقت کا جولمحہ گذر جاتا ہے

وہ ماضی کا حصہ اور تاریخ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کی بازیافت ہی اسے حال میں زندہ اور مانوس بنائے رکھتی ہے۔ بازیافت کا یہ عمل اس قدر آسان نہیں ہے جس کی جانب ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے بجا طور پر اشارہ کیا ہے:

> ''تاریخ ماضی کی بازیافت ہے اس کا ایک اہم مقصد گئے گذرے زمانوں کو زندہ کرنا ہے۔ مورخ ماضی کے اندھیرے منظروں میں سفر کرتا ہے۔ خوابیدہ داستانوں کو بیدار کرتا ہے۔ گرد میں دبی ہوئی دستاویزات کو جھاڑتا ہے ان دستاویزات کے اوراق پر ماضی کے نام ور کرداروں سے متعارف ہوتا ہے اور ان سے مکالمہ کرتا ہے آہستہ آہستہ وہ تاریخ کے ان کرداروں سے مانوس ہو جاتا ہے اور اس کی دوستی ان لوگوں سے بڑھتی جاتی ہے۔ مورخ کو حال سے سفر کرتے ہوئے ماضی کے ان زمانوں تک جانا پڑتا ہے کہ جن زمانوں میں یہ کردار زندہ تھے''[۶]

اس مقالے میں اردو نثر کے مذکورہ رنگ گزرے ہوئے وقت میں علم و ادب کے وہ تخلیقی لمحے ہیں جنھیں مقالہ نگار نے بازیافت کرنے کی کوشش کی ہے۔

۱۔ فیاض رفعت: ''اردو افسانے کا پس منظر''، نئی دہلی، تخلیق کار پبلیشرز، ۱۹۹۸ء، ص:۷۵

۲۔ لاہور سے جاری ہونے والا پہلا ماہنامہ ہے۔

۳۔ لاہور سے جاری ہونے والا خالصتاً علمی و سائنسی نثر کا اولین رسالہ تھا۔

۴۔ لاہور سے جاری ہونے والا پہلا روزنامہ ہے۔

۵۔ طیب منیر، ڈاکٹر: ''چراغ حسن حسرت احوال و آثار'' کراچی، ادارہ یادگار غالب، ۲۰۰۳ء، ص: ۶۱

۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تاریخ ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک''، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص:۱۱

کتابیات

۱- آزاد، محمد حسین: ''نصیحت کا کرن ہول'' لاہور، اسلامیہ سٹیم پریس، طبع دوم ۱۹۱۷ء

۲- آزاد، محمد، مولانا: ''مقالات آزادؔ'' (مرتب) آغا محمد باقر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء

۳- آشوب، پیارے لال: ''قصص ہند'' (پہلا حصہ)، لاہور، مفید عام پریس، ۱۹۱۹ء

۴- آشوب، پیارے لال: ہالرائڈ، ڈبلیو، جے: ''رسوم ہند'' (مرتب) کارکنان مجلس ترقی ادب، لاہور، مجلس ترقی ادب، اشاعت اول ۱۹۶۱ء

۵- آغا سہیل، ڈاکٹر: ''ادب اور عصری حیثیت'' لاہور، محمد جمیل النبی، ۱۹۹۱ء

۶- آغا محمد باقر: ''تاریخ نظم و نثر اردو'' لاہور، شیخ مبارک علی، ۱۹۴۵ء

۷- ابو سلمان شاہجہاں پوری، ڈاکٹر: ''پاکستان میں اردو اخبارات اور رسائل'' (حصہ دوم) اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء

۸- ابوالخیر کشفی: ''اردو نثری ادب'' کراچی، ن-م، ۱۹۵۵ء

۹- ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر: ''ادب اور لسانیات'' کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء

۱۰- ابو سعید نور الدین: ''تاریخ ادبیات اردو'' (حصہ اول- نثر)، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء

۱۱- ابوالحسن نغمی: ''یہ لاہور ہے'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۱۲- ابن کنول: (مرتب) ''تحقیق و تنقید'' دلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۶ء

۱۳- الف-د-نسیم، ڈاکٹر: ''اردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول ۱۹۹۷ء

۱۴- احمد ندیم قاسمی: (مرتب) ''منٹو کے خطوط ندیم کے نام''، لاہور، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۱۹۹۱ء

۱۵- احسن مارہروی (مرتب) ''تاریخ نثر اردو'' علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی پریس، سن اردو-

۱۶- احسن مارہروی: ''نمونہ منثورات'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، جون ۱۹۸۶ء

۱۷- احتشام حسین، شہدہ ''اردو ادب کی تنقیدی تاریخ'' لاہور، مکتبہ خلیل، ۱۹۸۹ء

۱۸- احتشام حسین: ''داستان اردو'' کراچی، الکتاب، ۱۹۶۷ء

۱۹- اختر انصاری: ''افادی ادب'' دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس بار اول، سن ندادد
اختر انصاری: ''اردو فکشن کے بنیادی و تشکیلی عناصر'' کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۳ء
۲۰- اختر راہی: ''تذکرہ علماء پنجاب'' لاہور، مکتبہ رحمانیہ، ۱۹۸۱ء
۲۱- اسلم قریشی: ''برصغیر کا اردو ڈراما''، لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۸۷ء
۲۲- اسلم قریشی، ڈاکٹر: ''اردو ڈرامے کا تاریخی و تنقیدی پس منظر'' لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول ۱۹۷۱ء
۲۳- اسلم فرخی، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد حیات و تصانیف'' کراچی، انجمن ترقی اردو سندھ، ۱۹۶۵ء
۲۴- اشتیاق احمد: (مرتب) ''کلچر، منتخب تنقیدی مضامین'' لاہور، بیت الحکمت ۲۰۰۷ء
۲۵- اعجاز حسین، ڈاکٹر: ''مختصر تاریخ ادب اردو'' کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۵۵ء
۲۶- اعجاز الحق قدوسی: ''تذکرہ صوفیائے پنجاب'' کراچی، سلمان اکیڈمی، ۱۹۶۲ء
۲۷- اکرام علی ملک: ''تاریخ پنجاب'' لاہور، سلمان مطبوعات، جون ۱۹۹۰ء
۲۸- اکرام چغتائی: (مرتب) ''پنجاب میں اردو'' از حافظ محمود شیرانی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
۲۹- افسر صدیقی امروہوی و سرفراز علی، سید: ''مخطوعات انجمن ترقی اردو'' لاہور، ۲۰۰۵ء
۳۰- انجم رحمانی، ڈاکٹر: پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ'' لاہور، الفیصل، ۱۹۹۸ء
۳۱- انجم سلطان شہباز: ''اقوام پنجاب'' جہلم بک کارنر، سن ندارد
۳۲- انوار احمد، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ تحقیق و تنقید'' ملتان، بیکن بکس، ۱۹۸۸ء
۳۳- انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب میں سفر نامہ'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، سن ندارد
۳۴- انور سدید، ڈاکٹر: ''پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول جنوری ۱۹۹۲ء
۳۵- انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو نثر کے آفاق'' لاہور مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۵ء
۳۶- انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں'' کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت سوم ۱۹۹۶ء
۳۷- انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی تحریکیں'' کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۸۵ء
۳۸- انور سدید، ڈاکٹر: ''مزید ادبی جائزے'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۲۰۰۳ء
۳۹- انور سدید، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' لاہور، عزیز بک ڈپو، طبع پنجم ۲۰۰۶ء

۴۰- امین چند، "سفر نامہ پنجاب" رئیس بجواڑہ ضلع ہوشیار پور پنجاب، ۱۸۵۰ء
۴۱- امداد امام صابری: "تاریخ صحافت اردو" (جلد اول) دہلی، چوڑی والان، یکم جنوری، ۱۹۵۳ء
۴۲- امداد امام صابری: "تاریخ صحافت اردو" (جلد دوم) کلکتہ، ناشر حسن زمان، سن ندارد
امداد امام صابری: "تاریخ صحافت اردو" (جلد دوم) دہلی، جدید پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۲ء
امداد امام صابری: "تاریخ صحافت اردو" (جلد چہارم) دہلی، یونین پریس، ۱۹۷۴ء
امداد امام صابری: "تاریخ صحافت اردو" (جلد پنجم) دہلی، جمال پریس، ۱۹۸۳ء
۴۳- امدار امام صابری: "روح صحافت" دہلی، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار، ۱۹۶۸ء
۴۴- امدار امام صابری: "اردو کے اخبار نویس" (جلد اول)، دہلی، شر ندارد، ۱۹۷۳ء
۴۵- امداد امام صابری: "حیات آشوب" دہلی، پرنٹنگ پریس دہلی، ۱۹۵۶ء
۴۶- امداد امام صابری: "فرنگیوں کا جال" دہلی، علامہ محمد شیر میوات، ۱۹۴۹ء
۴۷- ایوب صابر، پروفیسر: (مرتب) "پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے" اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ستمبر ۱۹۸۵ء
۴۸- ایوب صابر، پروفیسر: "اردو کی ابتداء کے بارے میں محققین کے نظریات" ایبٹ آباد، سرحد اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء
۴۹- ایوب قادری، ڈاکٹر: "اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ" لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء
۵۰- اے حمید: (مولف) "اردو نثر کی داستان" ۱ تا ۷، لاہور، شیخ غلام علی سن ندارد۔
۵۱- اے حمید: یادیں نواں لاہور، "پرانا لاہور" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء
۵۲- اے حمید: "لاہور کی یادیں" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء
۵۳- اے-بی اشرف، ڈاکٹر: "اردو ڈراما اور آغا حشر" ملتان، بیکن بکس، ۱۹۹۲ء
۵۴- اے-بی-اشرف: ڈاکٹر: "مسائل ادب" لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۵ء
۵۵- بدر شکیب: "اردو صحافت" کراچی، کاروان ادب، ۱۹۵۲ء
۵۶- بشیر سیفی، ڈاکٹر: کالم نگاری فن و تنقید" لاہور، نذیر سنز، ۱۹۹۳ء
۵۷- بشیر سیفی، ڈاکٹر: تنقیدی مطالعے، لاہور، نذیر سنز پبلشرز، ۱۹۹۶ء
۵۸- پران نوائل: 'لاہور جب جوان تھا" لاہور، نگارشات، ۲۰۰۴ء

۵۹- تبسم کاشمیری، ڈاکٹر : ''اردو ادب کی تاریخ ابتداء سے ۱۸۵۷ء تک'' لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء

۶۰- تنہا، محمد یحیٰ: ''سیر المصنفین'' (جلد اول) لاہور، عالمگیر الیکٹرک پریس، ۱۹ ستمبر ۱۹۲۸ء

۶۱- جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد دوم) لاہور، مجلس ترقی ادب طبع پنجم اگست ۲۰۰۷ء

۶۲- جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) مجلس ترقی ادب، طبع پنجم ۲۰۰۵ء

۶۳- جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریک ادب اردو'' (جلد اول) لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریک ادب اردو'' (جلد دوم) لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۴ء

۶۴- جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریک ادب اردو'' (جلد سوم) لاہور، مجلس ترقی ادب، ۲۰۰۶ء

۶۵- جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''تاریک ادب اردو'' (جلد سوم) لاہور، مجلس ترقی ادب، اپریل ۲۰۰۸ء

۶۶- جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''معاصر ادب، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۶۷- جمیل جالبی، ڈاکٹر: ''ادبی تحقیق'' لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول جون ۱۹۹۴ء

۶۸- جمیل احمد رضوی: ''ذخیارس مخطوطات'' (جلد دوم) لاہور، مغربی اردو اکیڈمی پاکستان، ۲۰۰۵ء

۶۹- جہاں بانو بیگم نقوی: محمد حسین آزاد ''حالات زندگی اور کلام پر تبصرہ'' حیدر آباد دکن، ادارہ ادبیات اردو ۱۹۴۰ء

۷۰- حامد بیگ، ڈاکٹر، مرزا: ''اردو افسانے کی روایت''، اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، دسمبر ۱۹۹۱ء

۷۱- حامد حسن قادری: ''داستان تاریخ اردو'' کارچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۸۸ء

۷۲- حنیف فوق، ڈاکٹر: ''متوازی نقوش'' کراچی، نفیس اکیڈمی، طبع اول، اگست ۱۹۸۹ء

۷۳- حمید الغت ملتانی: ''پاکستانی زبانوں کا ادب'' ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۷ء

۷۴- حکیم احمد شجاع: ''لاہور کا چیلسی'' لاہور، پیکجز لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء

۷۵- خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر: ترقی پسند ادبی تحریک'' علی گڑھ، ایجوکیشنکل بک ہاؤس، ۱۹۷۵ء

۷۶- رشید امجد، ڈاکٹر: ''نیا ادب'' لاہور، سجاد انبالوی، ۱۹۶۹ء

۷۷- رشید امجد، ڈاکٹر: (مرتب) ''پاکستانی ادب'' ۱۰ انتخاب نثر) اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول، اگست ۱۹۹۱ء

۷۸۔ رشید امجد، ڈاکٹر: منشا یاد: (مرتبین) ''پاکستانی ادب'' اسلام آباد، اکادمی دیہات پاکستان، اگست ۱۹۹۲ء

۷۹۔ رشید احمد گوریجہ، ڈاکٹر، ''اردو میں یک بابی اور ریڈیو ڈرامے'' ملتان، بیکن بکس، ۱۹۹۶ء

۸۰۔ رشید احمد: (مرتب) ''مفصل فہرست مخطوعات'' (جلد اول) مشتمل بہ ذخیرہ عجائب گھر، لاہور ۱۹۷۱ء

۸۱۔ رشید احمد: (مرتب) ''مفصل فہرست مطبوعات مشتمل بہ ذخیرہ عجائب گھر، لاہور، ۱۹۷۲ء

۸۲۔ رضیہ سلطانہ، ''اردو نثر کا ارتقاء'' کراچی، کریم سنز، ۱۹۷۸ء

۸۳۔ زاہد حسین انجم، ڈاکٹر: ''بیسویں صدی ایک نظر میں'' لاہور، خزینہ ادب، ۲۰۰۱ء

۸۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، خالدہ حسین: مرتبین) ''پاکستانی ادب، (حصہ نثر) اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۳ء

۸۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: (مرتب) ''پاکستانی ادب'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستانی ستمبر ۲۰۰۱ء

۸۶۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ حقیقت سے علامت تک'' لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۶ء

۸۷۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''تنقیدی دبستان'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

۸۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۳ء

۸۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر : ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ستائیسواں ایڈیشن ۲۰۰۵ء

۹۰۔ سلیم فارانی، ڈاکٹر: ''اردو زبان اور اس کی تعلیم'' لاہور، ادارہ مطبوعات فارانی، طبع پنجم ۱۹۹۰ء

۹۱۔ سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر: ''جدید اردو افسانے کے رجحانات'' کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۰ء

۹۲۔ سیف اللہ خالد: ''پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال'' لاہور، شفیق پبلی کیشنز، دسمبر ۱۹۹۷ء

۹۳۔ سبط حسن: ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء'' کراچی، مکتبہ دانیال، چھٹا ایڈیشن ۱۹۸۶ء

۹۴۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر: ''تہذیب و تخلیق'' لاہور، مکتبہ ادب جدید، ۱۹۶۶ء

۹۵۔ سجاد حیدر پرویز، ڈاکٹر: ''اردو افسانے کے فروغ میں ''ساقی'' کا کردار'' کراچی، انجمن ترقی اور پاکستان، ۲۰۰۵ء

۹۶- سکینہ، رام بابو: ''تاریخ ادب اردو'' (مترجم) مرزا احمد حسن عسکری، لاہور، عشرت پبلشنگ، سن ندارد

۹۷- سالک عبدالمجید، ''سرگذشت'' لاہور، الفیصل، اگست ۱۹۹۳ء

۹۸- سلطان محمود حسین، ڈاکٹر، سید: تحلیقات خطبات گارساں و تاسی'' لاہور، ملس ترقی ادب، طبع اول، دسمبر ۱۹۸۷ء

۹۹- سید احمد دہلوی: ''محاکمہ مرکز اردو'' دہلی، شمسی پریس، ۱۹۱۱ء

۱۰۰- شگفتہ حسین: ''ماہنامہ ادب لطیف کی ادبی خدمات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' ملتان، صباوالدین زکریا یونیورسٹی، ۱۹۹۶ء

۱۰۱- شگفتہ زکریا، ڈاکٹر: ''اردو نثر کا ارتقاء: لاہور، سنگت پبلشرز ۲۰۰۴ء

۱۰۲- شفیق انجم، ڈاکٹر: ''اردو افسانہ'' اسلام آباد، یورپ اکادمی، طبع اول فروری ۲۰۰۸ء

۱۰۳- شہاب ظفر اعظمی، ڈاکٹر: ''اردو ناول کے اسالیب'' دہلی، تخلیق کار پبلشرز ۲۰۰۶ء

۱۰۴- شیرانی، حافظ محمود: ''مقالات شیرانی، (مرتبہ) مظہر محمود شیرانی، لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۶ء

۱۰۵- شیرانی، حافظ محمود: ''پنجاب میں اردو'' لاہور، کتاب نما، طبع چہارم ۱۹۷۲ء

۱۰۶- صفیہ بانو، ڈاکٹر: ''انجمن پنجاب تاریخ و خدمات'' کراچی، کفایت اکیڈمی، ۱۹۷۸ء

۱۰۷- ضیاء الدین، ڈاکٹر: (مرتب) ''اسالیب نثر پر ایک نظر'' دہلی ادارہ فکر جدید، سن ندا

۱۰۸- طاہر مسعود: ''اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ'' لاہور، مغربی پاکستان، اردو اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

۱۰۹- طاہر کامران، پروفیسر: (مترجم) ''تاریخ پنجاب ۱۸۴۹ء تا ۱۹۴۷ء'' از ائن ٹالبوٹ، لاہور، تخلیقات، ۲۰۰۶ء

۱۱۰- طاہر لاہور: ''سوہنا شہر لاہور'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء

۱۱۱- طیب منیر، ڈاکٹر: ''چراغ حسن حسرت احوال و آثار''، کراچی، ادارہ یادگار غالب، طبع اول ۲۰۰۳ء

۱۱۲- طیبہ خاتون، ڈاکٹر: ''اردو نثر کی داستان'' آزاد کشمیر، ارسلان بکس، ستمبر ۲۰۰۳ء

۱۱۳- ظفر عالم ظفری، ڈاکٹر: ''اردو صحافت میں طنز و مزاح'' لاہور، فیروز سنز، بار اول ۱۹۹۶ء

۱۱۴- ظہور الدین احمد، ڈاکٹر: ''پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ'' لاہور، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۷۴ء

۱۱۵- ظہور الدین، ڈاکٹر: ''جدید اردو ڈراما'' دہلی، ادارہ فکر جدید، ۱۹۸۷ء

۱۱۶۔ ظہور احمد اعوانی، ڈاکٹر: ''داستان تاریخ رپورتاژ نگاری'' پشاور ادارہ علم وفن پاکستان، دسمبر ۱۹۹۹ء
۱۱۷۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: ''فن صحافت'' لاہور، چٹان پرنٹنگ پریس، بار اول ۱۹۶۶ء
۱۱۸۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: صحافت پاکستان و ہند میں'' لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء
۱۱۹۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر: ''داستان صحافت'' لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۷۴ء
۱۲۰۔ عبدالسلام خورشید، ڈاکٹر ''کاروان صحافت'' کراچی، انجمن ترقی اردو ۱۹۶۴ء
۱۲۱۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ''حالی کی اردو نثر نگاری'' لاہور، مجلس ترقی ادب'' طبع اول ۱۹۶۴ء
۱۲۲۔ عبدالقیوم، ڈاکٹر: تاریخ ادب اردو'' کراچی ایجوکیشنل پبلشرز ۱۹۷۱ء
۱۲۳۔ عبدالحق، مولوی: ''اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیا اکرام کا کام'' کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۳ء
۱۲۴۔ عبدالحق، مولوی: ''مرحوم دہلی کا جل'' دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۴۵ء
۱۲۵۔ عبدالحق، مولوی: ''مرحوم دلی کالج'' دلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۸۹ء
۱۲۶۔ عبارت بریلوی، ڈاکٹر: ''اردو تنقید کا ارتقاء'' کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۹۶ء
۱۲۷۔ عبارت بریلوی، ڈاکٹر: ''ادب اور ادبی قدریں'' لاہور، ادارہ ادب وتنقید، اپریل ۱۹۸۳ء
۱۲۸۔ عظیم الشان صدیقی: ''اردو ناول آغاز و ارتقاء'' دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس ۲۰۰۸ء
۱۲۹۔ عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر: ''لاہور سکھوں کے عہد میں'' لاہور، پرنٹ لائن پبلشرز، اپریل ۲۰۰۰ء
۱۳۰۔ عبدالوحید، خواجہ: (مرتب) ''جائزہ زبان اردو'' (پنجاب)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء
۱۳۱۔ عبدالحی، خواجہ: (مترجم) ''تاریخ فرشتہ'' از محمد قاسم فرشتہ، لاہور، بک ٹاک، ۱۹۹۱ء
۱۳۲۔ عبدالغفار کوکب، ڈاکٹر: ''اردو صحافت میں فکاہیہ کالم نگاری'' ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۷ء
۱۳۳۔ عابدہ بیگم، ڈاکٹر: ''اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۷ء تک''، نئی دہلی، ثمر آفسٹ پریس دریا گنج، بار دوم ۱۹۹۲ء
۱۳۴۔ عماد الحسن آزاد فاروقی: (مرتب) ''ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء'' نئی دہلی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، بار اول مئی ۱۹۸۵ء
۱۳۵۔ عطاء الرحمٰن: ''پنجاب کی علمی و ادبی انجمنیں'' کراچی، نیو مجاز پریس، طبع اول ۱۹۹۷ء
۱۳۶۔ عارف نوشاہی: (مرتب) ''فہرست مخطوعات اردو کتاب خانہ گنج بخش'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۸۸ء

۱۳۷۔ عشرت رحمانی: ''اردو ڈرامے کا ارتقاء'' لاہور، شیخ غلام علی، ۱۹۴۸ء

۱۳۸۔ عقیلہ جاوید، ڈاکٹر: ''اردو نثر کے اسالیب'' ملتان، بیکن بکس، ۲۰۰۴ء

۱۳۹۔ عطش درانی، ڈاکٹر: ''اردو اصناف کی مختصر تاریخ'' لاہور، مکتبہ میری لائبریری، بار دوم ۱۹۸۶ء

۱۴۰۔ عطش درانی، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو اور دفتر زبان'' لاہور، نذیر سنز، پبلشرز ۱۹۸۷ء

۱۴۱۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید: ''اشارات تنقید'' لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۲ء

۱۴۲۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید: اردو ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک'' ، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۶۷ء

۱۴۳۔ عبداللہ، ڈاکٹر، سید: (مرتب) ''اردو میں سائنسی اور علمی کتابیں'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۷۰ء

۱۴۴۔ علی محمد خان، ڈاکٹر: ''لاہور کا دبستان شاعری'' لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

۱۴۵۔ عزیز احمد: ''ترقی پسند ادب'' ملتان، کاروان ادب، ۱۹۹۳ء

۱۴۶۔ عبدالرحمٰن چغتائی: لاہور کا ربستان مصوری، لاہور مکتبہ جدید پریس، بار دوم ۱۹۹۵ء

۱۴۷۔ عابد علی عابد، سید: ''اسلوب'' لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع دوم، جون ۱۹۹۶ء

۱۴۸۔ غفور شاہ قاسم: ''پاکستان ادب'' راولپنڈی، اینڈ پبلی کیشنز، اگست ۲۰۰۰ء

۱۴۹۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: (مرتبہ) ''تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور'' لاہور، جدید اردو ٹائپ پریس، ۱۹۶۲ء

۱۵۰۔ غلام مصطفیٰ خان، ڈاکٹر: ''حالی کا ذہنی ارتقاء'' کراچی، فضلی سنز، ۲۰۰۳ء

۱۵۱۔ غلام سرور لاہوری، مفتی: ''حدیقۃ الاولیاء'' ، لاہور، اسلامک بک فاؤنڈیشن ۱۹۷۶ء

۱۵۲۔ غلام سرور لاہوری، مفتی: ''تاریخ مخزن پنجاب'' لکھنو، نولکشور، ۱۸۷۷ء

۱۵۳۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: ''پنجاب تحقیق کی روشنی میں'' لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

۱۵۴۔ فیاض رفعت: ''اردو افسانے کا پس منظر'' نئی دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۱۹۹۸ء

۱۵۵۔ فرح بخش فرحت، پیر: ''اذکار قلندری'' لاہور، حمایت اسلام پریس، ۱۹۵۷ء

۱۵۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر: ''اردو نثر کا فنی ارتقاء'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۱۹۹۷ء

۱۵۷۔ فریہ احمد، حسن عباس رضا: (مرتبین) ''پاکستانی اہل قلم کی ڈائیریکٹری'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۷۹ء

۱۵۸- فتح محمد ملک، سردار احمد پیرزادہ، سید تجمل شاہ: (مرتبین) ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد پنجاب)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان طبع اول ۲۰۰۶ء
۱۵۹- فقیر محمد فقیر، ڈاکٹر: ''پنجاب زبان و ادب کی تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء
۱۶۰- فوق، محمد دین: ''لاہور عہد مغلیہ میں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء
۱۶۱- فوق، محمد الدین: ''اخبار نویسوں کے حالات'' لہاور، رفاہ عام سٹیم پریس، اکتوبر ۱۹۱۲ء
۱۶۲- قیصر امین الدین: ''لاہور تجھے سلام'' لاہور، الحق پبلشرز، ۲۰۰۲ء
۱۶۳- قمر رئیس: ''اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب'' دہلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۴ء
۱۶۴- کنہیا لال ہندی: ''تاریخ لاہور'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۱ء
۱۶۵- کنہیا لال ہندی: ''تاریخ لاہور'' لاہور، بک ٹاک، ۲۰۰۶ء
۱۶۶- کنہیا لال ہندی: ''تاریخ لاہور'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء
۱۶۷- کیفی، برجموہن دتاتریہ، پنڈت: ''منشورات'' دہلی، دریا گنج، ۱۹۴۰ء
۱۶۸- کیفی، برجموہن دتاتریہ، پنڈت: ''کیفیہ'' کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۰ء
۱۶۹- گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ اول) معہ مقدمہ عبدالحق، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت ثانی ۱۹۷۹ء
۱۷۰- گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (حصہ دوم) معہ مقدمہ مولوی عبدالحق کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت ثانی ۱۹۷۴ء
۱۷۱- گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد اول)، کراچی، انجمن ترقی، اردو پاکستان، طبع دوم ۱۹۶۴ء
۱۷۲- گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، اشاعت دوم ۱۹۷۵ء
۱۷۳- گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء
۱۷۴- گیان چند جین، سیدہ جعفر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اول) دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء

گیان چند جین، سیدہ جعفر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد دوم) دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء

۱۷۵- گیان چند جین، سیدہ جعفر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد چہارم) نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء

۱۷۶- گیان چند جین، سید جعفر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد سوم) نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء

۱۷۷- گیان چند جین، سید جعفر: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد پنجم) نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۱۹۹۸ء

۱۷۸- لالہ سری رام، ''خمخانہ جاوید'' جلد اول، دہلی، مخزن پریس، ۱۳۲۵ھ

۱۷۹- لالہ سری رام، ''خمخانہ جاوید'' (جلد سوم) ناشر ندارد، سن ندارد-

۱۸۰- لالہ سری رام، ''خمخانہ جاوید'' (جلد چہارم) دہلی، ہمدرد پریس، بار اول ۱۹۲۶ء

۱۸۱- لالہ سری رام، ''خمخانہ جاوید'' (جلد پنجم) دہلی، ولی پرنٹنگ پریس، ۱۹۴۰ء

۱۸۲- محمد لطیف، سید: ''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور''، لاہور سنگ میل پبلی کیشنز، طبع اول ۱۹۸۲ء

۱۸۳- محمد عتیق صدیقی، ''صوبہ شمالی ومغربی کے اخبارات ومطبوعات'' علی گڑھ، انجمن ترقی اردو (ہند)، طبع اول ۱۹۶۲ء

۱۸۴- محمد دین، کلیم: ''لاہور کے اولیاء سہرورد'' لاہور، مکتبہ تاریخ، ۱۹۶۹ء

۱۸۵- محمد عصیم، سید: (مترجم) ''اردو ادب کی تاریخ معہ حواشی وتعلیقات'' از ٹی گراہم بیلی، دہلی، ناشر سید محمد عصیم، ۱۹۹۳ء

۱۸۶- مسکین حجازی، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو صحافت'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۵ء

۱۸۷- ممتاز شیریں: ''معیار'' لاہور، نیا ادارہ، ۱۹۶۳ء

۱۸۸- محمد لطیف ملک: ''اولیائے لاہور'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

۱۸۹- محمد اقبال، علامہ: ''علم الاقتصاد'' لاہور، اقبال اکادمی پاکستان، بار اول ۱۹۷۷ء

۱۹۰- ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۷ء

۱۹۱- محمود شیرانی، حافظ: ''مقالات شیرانی'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء

۱۹۲- محمد خان اشرف، ڈاکٹر: ''اردو تنقید کا رومانوی'' لاہور، اقبال اکیڈمی پاکستان، طبع اول ۱۹۹۶ء
۱۹۳- محمد خان اشرف، ڈاکٹر: ''رومانویت، اردو ادب میں رومانوی تحریک'' لاہور، الوقار پبلیکشنز، ۱۹۹۸ء
۱۹۴- محمد دین کلیم: ''لاہور کے اولیائے چشت'' لاہور، مکتبہ نوبیہ، ۱۹۶۸ء
۱۹۵- محمد دین کلیم: ''لاہور میں اولیائے نقشبند کی سرگرمیاں'' لاہور، البلاغ پریس، ستمبر ۱۹۶۸ء
۱۹۶- محمد لطیف، سید: ''تاریخ لاہور'' لاہور، تخلیقات، نومبر ۱۹۹۴ء
۱۹۷- محمد لطیف، سید: ''تاریخ پنجاب'' لاہور، تخلیقات، ستمبر ۲۰۰۳ء
۱۹۸- محمد لطیف، سید: ''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور'' لاہور، بک ٹاک، ۲۰۰۲ء
۱۹۹- مالک رام، مختار الدین: (مرتبین) کربل کتھا'' دہلی، دیال پرنٹنگ پریس، ۱۹۶۵ء
۲۰۰- مجید بیدار، ڈاکٹر: ''نثری بیانیہ'' دہلی، تخلیق کار پبلشرز، ۲۰۰۵ء
۲۰۱- متین ہاشمی، سید: ساجد الرحمٰن صدیقی: (مرتبین) ''فہرست مخطوطات'' لاہور، مرکز تحقیق دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، ۱۹۷۵ء
۲۰۲- محمد نوشہ گنج بخش، سید: ''انتخاب گنج شریف'' لاہور، دارالمورخین، طبع اول ۱۹۷۵ء
۲۰۳- محمد صادق، ڈاکٹر: ''محمد حسین آزاد احوال و آثار'' لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول نومبر ۱۹۷۶ء
۲۰۴- محمود الحسن: (مرتب) ''پاکستان میں اردو اخبارات اور رسائل کتابیات، (حصہ اول)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۵ء
۲۰۵- محمد سرور رجا: (مترجم) ''اردو ادب کی جستجو'' از رالف رسل، کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۲۰۰۳ء
۲۰۶- محمد حسن، ڈاکٹر: جدید اردو ادب، کراچی، غضنفر اکیڈمی پاکستان، سن ندارد-
۲۰۷- محمد شاہد حسین، ڈاکٹر: ''عوامی روایات اور اردو ڈراما'' نئی دہلی، حسین پبلی کیشنز، ۱۹۹۲ء
۲۰۸- منظور احسن عباسی: ''تفصیلی فہرست مخطوطات متفرق'' ۱۰ردو، پنجابی، ہندی، کشمیری، ترکی)'' لاہور، پنجاب پبلک لائبریری، ۱۹۶۴ء
۲۰۹- محمد بشیر حسینی، ڈاکٹر: ''فہرست مخطوعات شفیع'' لاہور، دانش گاہ پنجاب، ۱۹۷۲ء
۲۱۰- محمد عبداللہ قریشی: ''حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' لاہور، بزم اقبال، اپریل ۲۰۰۱ء

۲۱۱- محمد عزیز، ڈاکٹر: مذاہب کی ترویج میں اردو کا حصہ، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۵۵ء
۲۱۲- محمد ایم اے، سید: ''ارباب نثر اردو'' حیدر آباد، دکن، مکتبہ ابراہیمیہ، بار دوم ۱۹۳۷ء
۲۱۳- مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر: ''اردو افسانے کی روایت'' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، دسمبر ۱۹۹۱ء
۲۱۴- مقبول بیگ بدخشانی، مرزا: (مدیر) ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' (چوتھی جلد) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء
۲۱۵- میاں محمد اسلم: ''اردو کے قدیم عدالتی نمونے'' اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۱ء
۲۱۶- محمد ریاض، ڈاکٹر، صدیق شبلی، ڈاکٹر: ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء
۲۱۷- محمد ایوب قادری، ڈاکٹر: ''اردو نثر کے ارتقاء میں علماء کا حصہ'' لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۸۸ء
۲۱۸- معین الحق، ڈاکٹر سید، اور دیگر: ''تاریخ ادب اردو'' جلد اول، کراچی، پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز لمیٹڈ، بار اول ۱۹۶۱ء
۲۱۹- ملک حسن اختر، ڈاکٹر: ''تاریخ ادب اردو'' لاہور، ابلاغ، ۱۹۹۴ء
۲۲۰- مبارک علی، ڈاکٹر: ''مغل دربار'' لاہور، فکشن ہاؤس، ۲۰۰۰ء
۲۲۱- مبارک علی، ڈاکٹر: ''آخری عہد کا مغلیہ ہندوستان'' لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴ء
۲۲۲- محمد باقر، ڈاکٹر: وحید مرزا، ڈاکٹر: (مدیران) ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' (تیسری جلد) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۱ء
۲۲۳- محمد باقر، ڈاکٹر: ''اردو کے قدیم رکن اور پنجاب میں'' لاہور، مجلس ترقی ادب، اگست ۱۹۷۲ء
۲۲۴- محمد بشیر حسین، ڈاکٹر: (مرتب) ''فہرست مخطوطات سہرانی'' لاہور، ریسرچ سوسائٹی اف پاکستان، لاہور، جلد اول ۱۹۶۸ء
۲۲۵- محمد بشیر حسین، ڈاکٹر: (مرتب) ''فہرست مخطوطات سہرانی'' لاہور، ریسرچ سوسائٹی اف پاکستان، لاہور، جلد دوم ۱۹۶۹ء
۲۲۶- محمد بشیر حسین، ڈاکٹر: (مرتب) ''فہرست مخطوطات سہرانی'' لاہور، ریسرچ سوسائٹی اف پاکستان، لاہور، جلد سوم ۱۹۷۳ء
۲۲۷- نگہت ریحانہ، ڈاکٹر: اردو مختصر افسانہ فنی و تکنیکی مطالعہ'' لاہور، بک وائز بار اول ۱۹۸۸ء

۲۲۸- نوازش علی، سید: (مترجم) ''تذکرہ روسائے پنجاب'' (جلد اول و جلد دوم) از سر لیپل ایچ گرفن و کرنل میسی، لاہور، نولکشور گیس پرنٹنگ ورکس، ۱۹۱۱

۲۲۹- نوازش علی، ڈاکٹر: (مرتب) ''پاکستان میں اردو ادب کے پچاس سال'' راولپنڈی، گندھارا بکس، ۲۰۰۵ء

۲۳۰- ناز، ایم ایس: ''لاہور نامہ'' لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۲ء

۲۳۱- نامی، غلام دستگیر: ''تاریخ جلیلہ'' لاہور، گلزار عالم پریس، ۱۹۶۰ء

۲۳۲- نادرہ زیدی، ڈاکٹر، سیدہ: ''منشی محبوب عالم کی علمی و ادبی خدمات'' لاہور، ایس اینڈ کے کمیونیکشن، سن ندارد۔

۲۳۳- نعیم اللہ ملک: (مترجم) ''لاہور گزیٹئر'' لاہور، ابوذر پبلی کیشنز، فروری ۲۰۰۸ء

۲۳۴- نگہت سلیم: (مرتب) پاکستانی اہل قلم کی ڈائریکٹری' اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، ۱۹۹۴ء

۲۳۵- وحید قریشی، ڈاکٹر: (مرتب) ''یونیورسٹی اورینٹل کالج کے اساتذہ کا تحقیقی ادبی اور دری سرمایہ'' لاہور، ندارد، ۱۹۷۰ء

۲۳۶- وزیر آغا، ڈاکٹر: (مرتب) ''عبدالرحمٰن چغتائی شخصیت اور فن'' لاہور، مجلس ترقی ادب، اپریل ۲۰۰۷ء

۲۳۷- وقار عظیم: ''فورٹ ولیم کالج تحریک اور تاریخ'' لاہور، یونیورسل بکس، ۱۹۸۶ء

۲۳۸- وہاج الدین علوی: ''اردو خودنوشت'' فنی و تجزیہ، نئی دہلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۹۸ء

۲۳۹- ہارون قادر، ڈاکٹر: ''خان احمد حسین خان شخصیت اور فن'' لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء

۲۴۰- ہمایوں ادیب: ''صحافت پاکستان میں'' لاہور، عزیز پبلشرز، ۱۹۸۴ء

۲۴۱- یاسر جواد: (تالیف و ترجمہ) ''لاہور عظمتوں کی کہانی- گناہوں کی داستان'' لاہور، نگارشات، ۲۰۰۶ء

۲۴۲- یونس جاوید: ڈاکٹر: ''حلقہ ارباب ذوق'' لاہور، مجلس ترقی ادب، طبع اول، جنوری ۱۹۸۴ء

۲۴۳- یونس ادیب: ''میرا شہر لاہور'' لاہور، آتش فشاں پبلشرز ۱۹۹۰ء

۲۴۴- 'فہرست کتب عربی و فارسی و اردو' مخزونہ کتب خانہ آصفیہ سرکاری عالی، حیدر آباد دکن، ۱۹۰۰ء

۲۴۵- 'فہرست مخطوطات مولانا محمد حسین آزاد دہلوی، لاہور مخزونہ پنجاب یونیورسٹی۔

اخبارات و رسائل:

۱- ''جعفر زٹلی'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۲، ۱۷ جون ۱۸۸۷ء

۲- ''جعفر زٹلی'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۷، ۲۴ جون ۱۸۸۷ء

۳- ''لاہور گزٹ'' لاہور، شمارہ نمبر ۲۴، ۲، جون ۱۸۸۶ء

۴- پنجاب پنچ، لاہور، ۲۵ اگست ۱۸۸۷ء

۵- دہلی پنچ، لاہور، شمار نمبر ۱، ۵ جنوری ۱۸۸۷ء

۶- دہلی پنچ، لاہور، شمار ندارد، ۱۹ جنوری ۱۸۸۷ء

۷- دہلی پنچ، لاہور، شمار ندارد، ۳ جون ۱۸۸۵ء

۸- پنجاب گزٹ : لاہور، ۱۹ اپریل ۱۸۷۴

۹- ''پائے خان'' لاہور، شمارہ نمبر ۱، ۵ جنوری ۱۸۸۷ء

۱۰- ''پائے خان'' لاہور، شمارہ نمبر ۲، ۱۲ جنوری ۱۸۸۷ء

۱۱- ''پائے خان'' لاہور، شمارہ نمبر ۴، ۲۶ جنوری ۱۸۸۷ء

۱۲- ''پائے خان'' لاہور، شمارہ نمبر ۶، ۹ فروری ۱۸۸۷ء

۱۳- ''پائے خان'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۱، ۱۶ مارچ ۱۸۸۷ء

۱۴- ''پائے خان'' لاہور، شمارہ نمبر ۳۷، ۱۴ ستمبر ۱۸۸۷ء

۱۵- ''رفیق ہند'' لاہور، شمارہ نمبر ۲۳، ۱۲ جون ۱۸۸۶ء

۱۶- ''رفیق ہند'' لاہور، شمارہ نمبر ۱، یکم جنوری ۱۸۸۶ء

۱۷- ''رفیق ہند'' لاہور، شمارہ نمبر ۳، ۱۵ جنوری ۱۸۸۶ء

۱۸- ''رفیق ہند'' لاہور، شمارہ ندارد، ۲۰ اگست ۱۸۸۶ء

۱۹- ''رفیق ہند'' لاہور، شمارہ نمبر ۳۸، ۱۷ ستمبر ۱۸۸۶ء

۲۰- ''غم خوار ہند'': لاہور، شمارہ نمبر ۵، ۲۵ دسمبر ۱۸۸۶ء

۲۱- امپیریل پیپر: لاہور، شمارہ نمبر ۳۸، ۱۷ ستمبر ۱۸۸۷ء

۲۲- امپیریل پیپر: لاہور، شمارہ نمبر ۳۵، ۲۷ اگست ۱۸۸۷ء

۲۳- امپیریل پیپر: لاہور، شمارہ نمبر ۷، ۱۲ فروری ۱۸۸۷ء

۲۴- امپیریل پیپر: لاہور، جلد نمبر۲، شمارہ نمبر ۲، ۸ جنوری ۱۸۸۷ء

۲۵- امپیریل پیپر: لاہور، شمارہ نمبر ۱۱، ۱۲ مارچ ۱۸۸۷ء

۲۶- امپیریل پیپر: لاہور، شمارہ نمبر ۲۶، ۲۵ جون ۱۸۸۷ء

۲۷- ''کوہ نور'' لاہور، نمبر ۵۰، ۲۴ جون ۱۸۵۱ء

۲۸- ''کوہ نور'' لاہور، شمارہ نمبر ۶، جلد نمبر ۳۹، جنوری ۱۸۸۷ء

۲۹- ''کوہ نور'' لاہور، ۱۸ جنوری ۱۸۸۷ء

۳۰- ''کوہ نور'' لاہور، ۲، جون ۱۸۸۵ء

۳۱- ''کوہ نور'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۳، جلد نمبر ۳۹، ۲۹ جنوری ۱۸۸۷ء

۳۲- ''کوہ نور'' لاہور، ۲ جون ۱۸۸۵ء

۳۳- ''کوہ نور'' لاہور، ۲۴ جون ۱۸۵۱ء

۳۴- ''کوہ نور'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۹، جلد نمبر ۳۹، ۱۴ فروری ۱۸۸۷ء

۳۵- ''کوہ نور'' لاہور، شمارہ نمبر ۷، ۱۲ جون ۱۸۸۷ء

۳۶- روزنامہ ''جنگ'' لاہور، ۲ جون ۱۹۹۷ء

۳۷- روزنامہ ''جنگ'' مڈ ویک میگزین، ۶ مئی ۲۰۰۹ء

۳۸- روزنامہ ''جنگ'' ۶ مئی ۲۰۰۹ء

۳۹- ''اخبار انجمن پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۱۸، ۲۹ جنوری ۱۸۸۷ء

۴۰- ''اخبار آفتاب پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۳، ۷ جنوری ۱۸۸۷ء

۴۱- ''اخبار آفتاب پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۴، ۱۲ جنوری ۱۸۸۷ء

۴۲- ''اخبار آفتاب پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۰، ۲۴ جنوری ۱۸۸۷ء

۴۳- ''اخبار آفتاب پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۹، ۹ جنوری ۱۸۸۷ء

۴۴- ''اخبار آفتاب پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۳۳، ۱۸ جنوری ۱۸۸۷ء

۴۵- ''اخبار آفتاب پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۰۲، ۲۶ جنوری ۱۸۸۷ء

۴۶- ''اخبار آفتاب پنجاب'' شمارہ نمبر ۷۰، ۱۱ جون ۱۸۸۶ء

۴۷- ''اخبار انجمن پنجاب'' لاہور، شمارہ نمبر ۵، جلد نمبر ۱۸، ۱۲ فروری ۱۸۸۷ء

۴۸- ''پنجابی اخبار''، لاہور، شمارہ نمبر ۱۰۵، ۲۹ دسمبر ۱۸۸۶ء

۴۹- ''پنجابی اخبار''، لاہور، شمارہ نمبر۱۰۴، ۱۲ جنوری ۱۸۸۷ء

۵۰- ''پنجابی اخبار''، لاہور، شمارہ نمبر ۱۰۶، ۱۹ جنوری ۱۸۸۷ء

۵۱- ''پنجابی اخبار''، لاہور، شمارہ نمبر ۱۱۲، ۹ فروری ۱۸۸۷ء

۵۲- ''پنجابی اخبار''، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲۱، ۱۲ مارچ ۱۸۸۷ء

۵۳- ''پنجابی اخبار''، لاہور، شمارہ نمبر ۱۷۵، ۱۷ ستمبر ۱۸۸۷ء

۵۴- ''پنجابی اخبار''، لاہور ۲۳ جون ۱۸۸۵ء

۵۵- ''اخبار آفتاب پنجاب'' لاہور، ۳ جون ۱۸۸۵ء

۵۶- ''اخبار عام'' لاہور، یکم جنوری ۱۸۸۷ء

۵۷- ''اخبار عام'' لاہور، ۳ فروری ۱۸۸۷ء

۵۸- ''اخبار عام'' لاہور، یکم مارچ ۱۸۸۷ء

۵۹- ''اخبار عام'' لاہور، ۱۵ ستمبر ۱۸۸۷ء

۶۰- اردو ڈائجسٹ ''آپ بیتی نمبر'' لاہور، جلد نمبر ۱۳، شمارہ نمبر ۱۲ دسمبر ۱۹۷۳ء

۶۱- ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۳-۴، جلد نمبر ۴۹، ۱۹۸۳ء

۶۲- ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲، جلد نمبر ۴۹، ۱۹۸۳ء

۶۳- ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۱-۴، جلد نمبر ۵۲، ۱۹۲۵ء

۶۴- ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۱۱-۴، جلد نمبر ۵۲ (گولڈن جوبلی نمبر)، ۱۹۸۶ء

۶۵- ادب لطیف، لاہور، شمارہ نمبر ۷، جلد نمبر ۷۰، ۲۰۰۵ء

۶۶- ادب لطیف، لاہور شمارہ نمبر ۴، جلد نمبر ۳۰، ۱۹۵۱ء

۶۷- ادب لطیف، لاہور شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۳۷، ۱۹۵۲ء

۶۸- ادب لطیف، لاہور شمارہ نمبر ۴، جلد نمبر ۳۵، ۱۹۵۲ء

۶۹- ادب لطیف، لاہور شمارہ نمبر ۵، جلد نمبر ۴، ۱۹۵۵ء

۷۰- ادب لطیف، لاہور شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۴۳، ۱۹۵۶ء

۷۱- ادب لطیف، لاہور (سالنامہ) شمارہ نمبر ۳، جلد نمبر ۳۰، ۱۹۵۳ء

۷۲- ادب لطیف، لاہور شارہ نمبر ۵، جلد نمبر ۳۶، ۱۹۵۲ء

۷۳- ادب لطیف، لاہور شارہ نمبر ۸، اگست ۱۹۸۱ء

۷۴- ''ادب لطیف'' لاہور، شارہ نمبر ۱-۵-۶، جلد نمبر ۲۳، ۱۹۴۶ء

۷۵- ''ادب لطیف'' لاہور، شارہ نمبر ۴، جلد نمبر ۲۴، ۱۹۴۷ء

۷۶- ''ادب لطیف'' لاہور، شارہ نمبر ۴-۵، جلد نمبر ۲۶، ۱۹۴۸ء

۷۷- ''ادب لطیف'' لاہور، شارہ نمبر ۱-۲-۶، جلد نمبر ۲۶-۲۷، ۱۹۴۸ء

۷۸- ''ادب لطیف'' لاہور، شارہ نمبر ۶، جلد نمبر ۲۷، ۱۹۴۹ء

۷۹- ''ادب لطیف'' لاہور، شارہ نمبر ۴، جلد نمبر ۲۹، ۱۹۵۰ء

۸۰- ''ادب لطیف'' لاہور، افسانہ نمبر ۱۹۴۹ء

۸۱- ''پیغام آشنا'' شمارہ ۴۰، جنوری تا مارچ ۲۰۱۰ء

۸۲- ''نیرنگ خیال''، لاہور، جلد نمبر ۵۲، ساہر نمبر ۵۷۴، ۵۷۵- ۱۹۷۵ء

۸۳- سہ ماہی ''تاریخ'' لاہور نمبر ''لاہور'' فکشن ہاؤس، جنوری ۲۰۰۲ء

۸۴- سہ ماہی ''سورج'' جلد نمبر ۲- ۲۰۰۵ء

۸۵- سہ ماہی ''سورج'' جلد نمبر ۳۶، شارہ نمبر ۴-۳، جنوری تا جون ۲۰۰۸ء

۸۶- ''نقوش'' لاہور نمبر، ادارہ فروغ اردو، فروری ۱۹۴۲ء

۸۷- نقوش، لاہور، شخصیات نمبر، لاہور، ادارہ فروغ اردو، سن ندارد

۸۸- لاہور، عصری ادب نمبر' شارہ نمبر ۱۲۹' ستمبر ۱۹۸۲ء

۸۹- لاہور، شارہ نمبر ۱۳۴، دسمبر ۱۹۸۶ء

۹۰- لاہور، شارہ نمبر ۱۳۲، جون ۱۹۸۵ء

۹۱- نقوش، لاہور، شارہ نمبر ۱۴۲، سن ندارد

۹۲- نقوش، لاہور، آپ بیتی نمبر، جون ۱۹۶۴ء

۹۳- ہمایوں، لاہور، جلد نمبر ۴۵، شارہ ۱، جنوری ۱۹۴۴ء

۹۴- گل خنداں ''لاہور نمبر'' جلد نمبر ۸، شارہ نمبر ۹، لاہور، سن ندارد

۹۵- ''صحیفہ'' لاہور جولائی ستمبر ۱۹۸۸ء

۹۶- ''صحیفہ'' لاہور، ستمبر، دسمبر ۱۹۸۱ء

۹۷- ''صحیفہ'' شمارہ نمبر ۳۹، اپریل ۱۹۶۷ء

۹۸- ''صحیفہ'' شمارہ نمبر ۴۰، جولائی ۱۹۶۷ء

۹۹- ''صحیفہ'' جنوری ۱۹۶۸ء

۱۰۰- ''صحیفہ'' : جولائی ستمبر ۱۹۸۴ء

۱- ''صحیفہ'': اپریل جون ۱۹۸۵ء

۲- ''صحیفہ'' : جنوری ۱۹۷۳ء

۳- ''صحیفہ'' : شمارہ نمبر ۵۲، اپریل ۱۹۶۸ء

۴- ''صحیفہ'': لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء

۵- ''صحیفہ'' لاہور، جنوری مارچ ۱۹۹۰ء

۶- ''دریافت'' شمارہ ۸، اسلام آباد، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگونجز، اسلام آباد

۷- ''دریافت'' شمارہ ۴، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگونجز،

۸- ادبی دنیا، لاہور، شمارہ نمبر ۱۱، جلد نمبر ۲۳، دسمبر ۱۹۴۵ء

۹- ادبی دنیا، لاہور، شمارہ نمبر ا، جلد نمبر ۲۳، دسمبر ۱۹۴۵ء

۱۰- ادبی دنیا، لاہور، شمارہ نمبر ۱۲، جلد نمبر ۳۳، دسمبر ۱۹۴۶ء

۱- اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۲۔۳۔فروری، مارچ ۱۹۷۴ء

۲- اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۴۔۷۔جلد نمبر ۲۳ (خاص نمبر) جون، جولائی ۱۹۸۸ء

۳- اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۱۱۔۱۲۔جلد نمبر ۲۲ (سالنامہ) نومبر، دسمبر ۱۹۸۷ء

۴- اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۱۱۔۱۲۔جلد نمبر ۲۲ (خاص نمبر) اگست ۱۹۹۰ء

۵- اوراق لاہور، شمارہ نمبر ۱۱۔۱۲۔جلد نمبر ۲۲ (سالنامہ) جنوری، فروری ۱۹۹۷ء

۶- ''فنون'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۶، جنوری تا اپریل، ۱۹۹۶ء

۷- ''فنون'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۱، جنوری تا اپریل، ۱۹۹۴ء

۸- ''فنون'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۷۔۴۸، مئی تا اگست/ستمبر تا دسمبر، ۱۹۹۶ء

۹- ''ماہ نو'' لاہور، شمارہ نمبر ا، جلد نمبر ۲۔۲۰۰۲ء

۱۰- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۴۔ مارچ، اپریل ۱۹۷۷ء
۱- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۱۹ اگست، ستمبر ۱۹۸۳ء
۲- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۲۱۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۴ء
۳- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۲۵۔ نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء
۴- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۲۷۔ اکتوبر، نومبر ۱۹۸۸ء
۵- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۳۱۔ جنوری تا مارچ (سالنامہ) ۱۹۹۱ء
۶- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۳۴۔ اکتوبر تا دسمبر ۱۹۹۱ء
۷- ''نقوش'' لاہور، شمارہ نمبر ۳۸۔ جنوری تا اپریل ۱۹۹۳ء
۸- ''نیرنگ خیال'' لاہور، گولڈن جوبلی نمبر ۲، شمارہ نمبر ۲۳۳، ۲۳۴، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۲ء
۹- ''نیرنگ خیال'' لاہور، اشاعت خصوصی، شمارہ نمبر ۶۵۸۔۶۵۹، ستمبر اکتوبر ۱۹۸۲
۱۰- ''نیرنگ خیال'' لاہور، خاص نمبر شمارہ نمبر ۶۶۰، جلد نمبر ۶۰، اپریل ۱۹۸۳ء
۱- ''نیرنگ خیال'' لاہور، (سالنامہ) شمارہ نمبر ۶۴۳۔۶۴۴، جلد نمبر ۵۷، ۱۹۸۱ء
۲- ''نیرنگ خیال'' لاہور، (سالنامہ) شمارہ ۶۷۲، جلد نمبر ۵۷، ۱۹۸۱ء
۳- ''نیرنگ خیال'' لاہور، (سالنامہ) شمارہ ۶۷۲، جلد نمبر ۶۰، ۱۹۸۳ء
۴- ''نیرنگ خیال'' لاہور، (فن وشخصیت ایڈیشن) شمارہ نمبر ۶۷۸، جلد نمبر ۶۰، مئی ۱۹۸۴ء
۵- تحریک، نئی دہلی، شمارہ نمبر ۴۔۵۔۶۔۷، سلور جوبلی نمبر، ۱۹۷۸ء
۶- سب رس، حیدر آباد، شمارہ نمبر ۵، مئی ۲۰۰۵ء
۷- سیارہ، لاہور، شمارہ نمبر ۳۔۴، جلد نمبر ۵۴، سن ندارد
۸- ''الماس'' تحقیقی مجلّہ، شعبہ اردو شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور سندھ، پاکستان ۲۰۰۳ء
۹- ''راوی'' لاہور، گورنمنٹ کالج لاہور، صدی شمارہ جلد نمبر ۸۶، اگست ۱۹۹۹ء
۱۰- ''مقالات منتخبہ'' اورینٹل کالج میگزین وضمیمہ، لاہور، ۱۹۷۰ء
۱- اورینٹل کالج میگزین، مقالات منتخبہ، لاہور، ۱۹۷۰ء
۲- اورینٹل کالج میگزین، لاہور پنجاب یونیورسٹی، فروری ۱۹۳۳ء
۳- اورینٹل کالج میگزین، لاہور پنجاب یونیورسٹی، نومبر ۱۹۴۱ء

۴۔ ''دلی کالج اردو میگزین'' (قدیم دلی کالج نمبر) دلی، پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۳ء
۵۔ ''غیر مطبوعہ مقالات'' پی۔ایچ۔ڈی، ایم فل، ایم۔اے
۶۔ انجم رحمانی: ''برطانوی دور میں اردو کے فروغ میں پنجاب کے نظام تعلیم کا حصہ'' (غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈ) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۰ء
۷۔ حامد حسین: ''اردو ادب میں انگریزی سے نثری تراجم'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ی ایچ ڈی) لاہور پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء
۸۔ نسیم آزاد، ڈاکٹر: ''اردو صحافت کے ارتقاء میں خواتین کا حصہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) کراچی، جامعہ کراچی سقبہ اردو، سن ندارد
۹۔ روشن آراء راؤ، ڈاکٹر: ''ادبیات اردو کے ارتقاء میں رسائل کا کردار'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء
۱۰۔ عفیرہ حامد علی، ڈاکٹر: ''اردو زبان ادب کی ترقی میں صحافت کا حصہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۸۴ء
۱۔ نازنین اختر: ''شمس العلماء سید ممتاز علی کی شخصیت اور علمی ادبی وصحافتی خدمات'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، سن
۲۔ ہارون قادر: ''خان احمد حسین خان شخصیت وفن'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، سن ۲۰۰۸ء
۳۔ رفاقت علی شاہد: ''انیسویں صدی میں اردو گلدستے'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور، اورینٹل کالج یونیورسٹی، ۲۰۰۵ء
۴۔ منظور الٰہی ممتاز: ''اردو سفر نامے تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور، اورینٹل کالج، ۱۹۷۹ء
۵۔ انور محمود خالد: ''اردو نثر میں سیرت رسول'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۱ء
۶۔ رفیق یار خان یوسفی: ''عدالتی اور قانون زبان کی حیثیت سے اردو کی وسعت اور صلاحیت'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) کراچی، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۱۹۹۳ء

۷- رضیہ نور محمد، ڈاکٹر: ''اردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی جائزہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی) لاہور اورینٹل کالج، یونیورسٹی، ۱۹۷۵ء

۸- شازیہ مختار: ''پنجاب میں میٹرک کی اردو نصابی کتب تحقیقی و تنقیدی جائزہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل) لاہور، ایجوکیشن یونیورسٹی، ۲۰۰۷ء

۹- رانا سہیل الرحمٰن: ''لاہور کی ادبی مجالس، بیسویں صدی میں'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل) لاہور، اورینٹل کالج، یونیورسٹی ۲۰۰۴ء

۱۰- بدر منیر الدین: توضیحی اشاریہ رسالہ ''راوی'' قیام پاکستان تک'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔فل) لاہور، گورنمنٹ کالج، لاہور، ۱۹۸۷ء

۱- افسر عباس زیدی، سید: ''شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی مرحوم'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، س ن

۲- خورشید ادا پیکر: ''رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب دہلوی'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۵ء

۳- محمد رمضان ایوبی: ''فہرست مقالات اورینٹل کالج میگزین'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۶۰ء

۴- سنجیدہ احمد: ''اورینٹل کالج میگزین (وضاحتی فہرست) (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے) لاہور، پنجاب یونیورسٹی ۱۹۸۹ء

۵- سلمیٰ حمید: ''وضاحتی فہرست ''صحیفہ'' (غیر مطبوعہ تحقیقی مقالہ برائے ایم۔اے) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۳ء

انسائیکلوپیڈیا

۶- ''دائرہ معارف اسلامیہ۔اردو'' جلد ۱۸، لاہور، دانش گاہ پنجاب، طبع اول ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء

۷- ''اردو ادب کی انسائیکلوپیڈیا'' لاہور، مطبع حیدری پرنٹنگ پریس، جولائی ۲۰۰۳ء

۸- انسائیکلوپیڈیا پاکستان کا لاہور، الفیصل، جولائی ۲۰۰۴ء

۹- ''اردو انسائیکلوپیڈیا'' لاہور، فیروز سنز، چوتھا ایڈیشن ۲۰۰۵ء

انگریزی کتب:

1- Pandit Shiv Norain " Koh-e-Noor" of 1851" Journal of the Punjab Univrsity Historical Societ, IV.

2- M. Baqir: Lahore past and present, Lahore, Punjabi Adbi Academy, 1984.

3- Samina Qureshi: "Lahore the City Within" Singapur, Concept Pvt Ltd, Singapur, Sep. 1988.

4- Margrit Pernau: (Edited) The Delhi College, Oxford Univeristy Press -2006.

5- Nazir Ahmad Chaudhry: Development of Urdu as official Language in unjab 1849 - 1974. Printed at: Evergreen Press. Lahore. 1974.

6- Punjab History Confrence Procedings 9th Session April, 1975.

7- Journals and Diaries A.R. Lahore 1846 - 1849.

8- Barrier, N. Gerald: The Punjab Past and Present Volume 4 - Issue I, Year 1970.

9- Salim al-din Quraish: (Complied) Catalogue of Urdu Books in the India office library 1800 - 1920 (Supplementary to James Fuller Elumhandt's Catalogue of 1900)" London, The British Library Board, Second Edition 1991.

10- Akram Ali Malik: A biblography of the Punjab 1849 - 1910, Lahore Research Society of Pakistan, 1968.

11- Journals and Diaries of the Assistant to the Agent Governer

General North - West Frontier and Resident at Lahore. 1846 - 1849, Printed at Pioneer Press Allahabad, 1911.

12- Press List of Public Dept Records 1748 - 1800. Vol. xviii Suplement, Calcutta, Suprintedent Government Printing India, 1922.

13- Gazattear of the Lahore District 1883-84. Published by Sang-e-meel Publication Lahore, 1989.

14- Ikram Ali Malik: A book of Readings on the History of the Punjab 1799 - 1947 Lahore, Research Soceity of Pakistan, 1970.

☆ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید: ''یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق'' لاہور، یونیورسل بکس، جنوری، طبع اول ۱۹۸۹ء

☆ ابن کنول: (مرتب) ''تحقیق وتنقید'' دہلی، کتابی دنیا، ۲۰۰۶ء

☆ حکیم احمد شجاع: ''لاہور کا چیلسی'' لاہور، پیکجز لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء

☆ ''رسوم ہند'' لاہور، مجلس ترقی ادب، اشاعت دوم ستمبر ۲۰۰۸ء

☆ ''رسوم ہند'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۹۶۹ء

☆ ''رسوم ہند'' لاہور، طبع سرکاری، ۱۹۷۳ء

☆ معین الرحمٰن، ڈاکٹر، سید: ''مطالعہ بلدوم''

☆ آشوب، پیارے لال: ''اردو کی تیسری کتاب'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۶ء

☆ ''مختصر تواریخ انگلستان'' لاہر، مطبع سرکاری، ۱۸۶۹ء

☆ ''اردو کی پہلی کتاب'' لاہور، مطبع سرکاری، ۱۸۷۱ء

☆ آشوب، پیارے لال: ''قصص ہند'' (حصہ اول)، لاہور، مطبع سرکاری ۱۸۷۳ء

☆ آشوب، پیارے لال ''قصص ہند'' (حصہ اول)، لاہور، مفید عام پریس، ۱۹۱۹ء

☆ آزاد، محمد حسین، مولانا: ''سخندان فارس'' لاہور، مجلس ترقی ادب، بع اول، جون ۱۹۹۰ء

☆ آزاد،محمد حسین،مولانا: ''نیرنگ خیال'' لاہور،مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۶ء

☆ حالی، الطاف حسین، مولانا: ''مجالس النساء'' لاہور،مطبع سرکاری، ۱۸۸۱ء

☆ ''قصص ہند'' (حصہ سوم)، لاہور،مطبع سرکاری، ۱۸۷۵ء

☆ ''قواعد اردو'' لاہور،مطبع مفید عام، ۱۸۸۶ء

☆ ''قواعد اردو'' لاہور،مطبع سرکار، ۱۸۷۹ء

☆ آزاد،محمد حسین،مولانا: ''آب حیات'' لاہور، سنگ میل بلی کیشنز ۱۹۸۵ء

☆ آیارام: ''علم سکون'' لاہور،مطبع انجمن پنجاب، ۱۸۸۰ء

☆ آزاد،محمد حسین،مولانا: ''دربار اکبری'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۵ء

☆ مجید بیدار، ڈاکٹر: ''نثری بیانیہ'' دہلی،تخلیق کار پبلشرز ۲۰۰۵ء

☆ ایم۔ایس۔ناز: ''لاہور نامہ'' لاہور مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

☆ اسلم فرخی، ڈاکٹر: (مرتب) ''مولانا محمد حسین آزاد کی درسی کتابوں کا سلسلہ'' حصہ اول تا چہارم، کراچی، ترقی اردو بورڈ، جون ۱۹۶۳ء

☆ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: (مرتب) ''یاد گار چشتی'' از xxxxxxxxxxxxx لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء

☆ سید عبداللہ، ڈاکٹر: اشارات تنقید، لاہور، مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۲ء

☆ آزاد،محمد حسین،مولانا: ''نظم آزاد'' لاہور،مطبع کریمی، بار سوم ۱۹۲۶ء

☆ آزاد،محمد حسین،مولانا: ''قصص ہند'' (حصہ دوم) لاہور، پبلشرز،منشی گلاب سنگھ، ۱۹۴۱ء

☆ آزاد،محمد حسین،مولانا: ''قصص ہند'' لاہور، بک ٹاک، ۲۰۰۶ء

☆ آغا محمد باقر: ''تاریخ نظم ونثر اردو'' لاہور، شیخ مبارک اینڈ سنز، ۱۹۵۰ء

☆ کریم الدین، مولوی: ''انشائے اردو'' لاہور، حاجی چراغ الدین، سراج الدین تاجران کتب: سن ندارد،

☆ عزیز الدین خان: ''جوہر عقل'' لاہور،مطبع مفید عام، ۱۸۸۵ء

☆ آزدا،محمد حسین،مولانا: ''نصیحتکا کرن پھول'' لاہور، اسلامیہ سٹیم پریس، ۱۹۱۷ء

☆ کریم الدین،مولوی: ''خط تقدیر'' لاہور،مطبع سرکاری، ۱۸۶۵ء

☆ ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' مصنفہ محمد حنیف شاہد، لاہور، کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، جولائی ۱۹۷۶ء

☆ غلام حسین ذوالفقار: (مرتبہ) تاریخ یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، لاہور جدید اردو ٹائپ پریس ۱۹۶۲ء

☆ ہاشمی فرید آبادی، سید: ''ماثر لاہور'' لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ،طبع اول ۱۹۵۶ء

☆ رضیہ سلطانہ، ڈاکٹر: ''اردو نثر کا آغاز و ارتقاء'' کراچی، کریم سنز پبلشرز ۱۹۷۸ء

☆ نعیم اللہ ملک: (مترجم) ''لاہور گزیٹئر'' لاہور، ابوذر پبلی کیشنز، فروری ۲۰۰۸ء

☆ محمد باقر، ڈاکٹر: ''اردوئے قدیم دکن اور پنجاب میں'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء

☆ ظہورالدین احمد، ڈاکٹر: ''پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ'' لاہور' مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء

☆ آئن ٹالبوٹ: ''تاریخ پنجاب'' (مترجم) ''طاہر کامران'' لاہور، ادارہ تخلیقات ۲۰۰۶ء

☆ طاہر لاہور، ''سوہنا شہر لاہور'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء

☆ فقیر محمد فقیر، ڈاکٹر: پنجابی زبان و ادب کی تاریخ'' لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۲۰۰۲ء

☆ محمو شیرانی، حافظ: ''پنجاب میں اردو'' (ترتیب و تدوین معہ اضافات) محمد اکرام چغتائی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

☆ انجم سلطان شہباز: ''اقوام پنجاب'' جہلم، بک کارنر، سن ندارد

☆ یاسر جواد : (ترجمہ و تالیف) ''لاہور عظمتوں کی کہانی و گناہوں کی داستان'' لاہور، نگارشات، ۲۰۰۶ء

☆ نامی، غلام دستگیر: ''تاریخ جلیلہ'' لاہور، گلزار عالم پریس،طبع دوم ۱۹۶۰ء

☆ اشتیاق احمد: (مرتب) ''کلچر منتخب تنقیدی مضامین'' لاہور، بیت الحکمت ۲۰۰۷ء

☆ فرشتہ، محمد قاسم: ''تاریخ فرشتہ'' (مترجم) عبدالحئی، خواجہ ایم اے، لاہور، ن ن ۔ ۱۹۹۱ء

☆ فتح محمد ملک، تجمل شاہ، احمد پیرزادا، سید: (مرتبین) ''پاکستان میں اردو'' (چوتھی جلد)، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان ۲۰۰۶ء

☆ انجم رحمانی، ڈاکٹر: ''پنجاب تمدنی و معاشرتی جائزہ'' لاہور، الفیصل، ۱۹۹۸ء

☆ محمد ریاض، ڈاکٹر، صدیق شبلی، ڈاکٹر: ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی

کیشنز، ۱۹۸۷ء

☆ سبط حسن، سید: ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء'' کراچی، مکتبہ دانیال، (چھٹا ایڈیشن) ۱۹۸۶ء

☆ مقبول بیگ بدخشانی، مرزا: (مدیر خصوصی) ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، چوتھی جلد، فارسی ادب، (دوم) ۱۵۲۶ء ۱۷۰۷ء، لاہور، پنجاب یونیورسٹی

☆ ممتاز گوہر، ڈاکٹر: ''پنجاب میں اردو ادب کا ارتقاء'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۱۹۹۷ء

☆ علی محمد خان، ڈاکٹر: ''لاہور کا دبستان شاعری'' لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۹۲ء

☆ کنہیا لال: ''تاریخ لاہور'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۱ء

☆ گارساں دتاسی: ''خطبات گارساں دتاسی'' (جلد اول) کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۷۹ء

☆ امین چند: ''سفر نامہ پنجاب'' رئیس بجواڑہ ضلع ہوشیارپور، پنجاب، ۱۸۵۰ء

☆ گارساں دتاسی: ''مقالات گارساں دتاسی'' (جلد دوم) کراچی، انجمن ترقی اردو''طبع دوم، ۱۹۷۵ء

☆ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، فیاض محمود، سید: ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاک و ہند'' (نویں جلد) لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۲ء

☆ کنہیا لال: ''تاریخ لاہور'' لاہور، وکٹوریہ پریس، ۱۸۸۴ء

☆ امداد صابری: ''فرنگیوں کا جال'' دہلی، شہر میوات، ۱۹۷۹ء

☆ اکرام علی ملک: ''تاریخ پنجاب'' (جلد اول) قدیم زمانہتا ۱۸۵۷ء، لاہور سلمان مطبوعات، بار اول ۱۹۹۰ء

☆ محمد دین کلیم: لاہور میں اولیائے نقشبند کی سرگرمیاں'' لاہور، مکتبہ تاریخ، طبع اول، ستمبر ۱۹۶۸ء

☆ پیران نوائل: ''لاہور جب جوان تھا'' (مترجم) نعیم احسن، لاہور، نگارشات، ۲۰۰۴ء

☆ محمد دین فوق: ''لاہور عہد مغلیہ میں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء

☆ عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر: ''لاہور سکھوں کے عہد میں'' لاہور، رنث لائن پبلشرز، اپریل ۲۰۰۰ء

☆ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر: ''پنجاب تحقیق کی روشنی میں'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۱ء

☆ محمد لطیف، سید: ''تاریخ پنجاب مع حالات شہر لاہور'' لاہور، بک ٹاک ۲۰۰۲ء

☆ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر: ''لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، ۱۹۹۳ء

☆ عبدالوحید، خواجہ: (مرتب) ''جائزہ زبان اردو'' (پنجاب)، اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان، ۲۰۰۵ء
☆ عبدالقیوم، ڈاکٹر: ''حالی کی اردو نثر نگاری'' لاہور، مجلس ترقیِ ادب، طبع اول ۱۹۶۴ء
☆ عبداللہ، ڈاکٹر، سید: ''اردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء'' لاہور، مکتبہ خیابان ادب، طبع اول، ۱۹۶۷ء
☆ نور احمد چشتی، مولوی: ''تحقیقات چشتی'' لاہور، الفیصل، مئی ۱۹۹۳ء
☆ نور احمد چشتی، مولو: ''یادگار چشتی'' (مرتبہ) گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۵ء
☆ سلطان محمود حسین، ڈاکٹر: ''تعلیقات خطبات گارساں دتاسی'' لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹ء
☆ امداد صابری: ''تاریخ صحافت'' جلد اول، دہلی، چوڑی والان'' ۱۹۵۳ء
☆ امداد صابری: ''حیات آشوب'' دہلی، یونین پرنٹنگ پریس، ۱۹۵۶ء
☆ آزاد، محمد حسین، مولوی: ''ڈراما اکبر'' لاہور، مطبع کریمی پریس، سن ندارد۔
☆ سلیم اختر، ڈاکٹر: ''اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ'' لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، چھواں ایڈیشن، ۲۰۰۳ء
☆ سلیم ملک، ڈاکٹر: ''امتیاز علی تاج زندگی اور فن'' لاہور، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی ۲۰۰۳ء
☆ احمد حمید: ''اسلامیہ کالج کی صد سالہ تاریخ'' لاہور، ادارہ تحقیقات پاکستان دانشگاہ پنجاب۔ سن ندارد
☆ زاہد منیر عامر: ''تاریخ جامعہ پنجاب'' لاہور، پنجاب یونیورسٹی اشاعت اول، ۲۰۰۴ء
☆ عتیق صدیقی: ''ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں'' علی گڑھ، انجمن ترقی ہند، بار اول ۱۹۵۷ء
☆ نوری احمد چشتی: ''یادگار چشتی'' (مرتبہ) گوہر نوشاہی، ڈاٹر: لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۷۵ء
☆ ابواللیث صدیقی: ادب ولسانیات کراچی، اردو اکیڈمی سندھ، ۱۹۷۰ء
☆ ملا وجہی، ''سب رس'' لکھنو، سرفراز قومی پریس، ۱۹۶۲ء
☆ فضلی، فضل علی: کربل کتھا''(مرتبین) مالک رام و مختار الدین، دہلی، دیال پرنٹنگ پریس ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۱
☆ عبدالحق، مولوی: ''مرحوم دلی کالج'' دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۹ء
☆ خلیق انجم، ڈاکٹر: (پانچ جلدیں) ''غالب کے خطوط'' دہلی، غالب انسٹیٹیوٹ، ۱۹۸۴۔۱۹۹۳ء
☆ کنہیا لال کپور، ''تاریخ لاہور'' لاہور وکٹوریہ پریس، ۱۸۸۴ء
☆ احمد دہلوی، سید: ''محاکمہ مرکز اردو'' دہلی، شمسی پریس، ۱۹۱۱ء

☆ عبدالحق، مولوی: ''مرحوم دلی کالج'' دہلی، انجمن ترقی اردو، دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء
☆ محمد حنیف شاہد: ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' لاہور، کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، جولائی ۱۹۷۶ء

Punjab Gazette April 9, 1874

Catalogue of Works

Government Central Book Department Punjab

Corrected upto 15th March 1874

Urdu Books

Araish-i-Mehfil آرائش محفل

Aina-i-Tarik Numa (Part-I) آئینہ تاریخ نما

Buzurg Robinson Crusoe بزرگ رابنسن کروسو

Dustur-ul-Amal Patwariyan (Cust) دستورالعمل پٹواریاں

Dustur-ul-Maash دستورالمعاش

Dustur-ul-Amal Daroghgan دستورالعمل داروغہ

Fehrist-i-Europe فہرست یورپ

Ganj-o-Tawasikh گنج التواریخ

Guldasta-i-Nasr گلدستہ نثر

Guldasta-i-Akhlaq گلدستہ اخلاق

Gulbahar or History of Derah Ghazi Khan District گلبہار یا تاریخ ڈیرہ غازی خان

Haqaiq-ul-Manjudat حقائق المنجدت

Halwai-Bedud حلوائی بیدد

Halat Dehi حالت دیہی

Hidayat Nama Zamindaran ہدایت نامہ زمین داران

Ditto Malguzari ہدایت نامہ مالگزاری

Ditto Patwariyan (Amin Chand) ہدایت نامہ پٹواریاں

Hindisa-wa-aimal Jama Tafriq Wagaria ہندسۂ العمل، جمع تفریق وغیرہ

Ikhwan-us-Safa (Urdu) اخوان الصفاء

Inshai-Khirad Afroz انشائے خرد افروز

Inshai-Mufid-un-nisa (Letters in Women's Language) انشائے مفید النساء

Inshai-i-Urdu Shikasta انشائے اردو شکستہ

Inshai-Urdu Nastaliq (Karimuddin) انشائے اردو نستعلیق

Jabr-o-Muqabila, Part I, Revised جبر و مقابلہ

Ditto (Part-II)

Ditto (Part-III)

Ditto Old (Part-II)

Jauhur-i-Aql جوہر عقل

Jam-i-Jahan Numa (Part-I) جام جہاں نما

Ditto (Part-II)

Ditto (Part-III)

Ditto (Part-IV)

Jantri Paimaish جنتری پیمائش

Jughrafia-i-Hind (Part-I) جغرافیہ ہند

Ditto (Part-II)

Jughrafia-i-Auwal جغرافیہ اوّل

Ditto Doam

Ditto Punjab

Ditto Awabd

Ditto Tabai (Prichard's)

Ditto Urdu (Dehli)

Ditto Jahan

Kalid-i-Gunj Imtihan کلید گنج امتحان

Khat-i-Taqdir خط تقدیر

Khayalat-us-Samaya خیالات السمایہ

Khulasa-i-Nazar-i-Shamsi خلاصہ نظرِ شمسی

Kisan Updesh کسان اُپدیش

Majmua-Zabita Faujdari (Act XXV) مجموعہ ضابطہ فوجداری

Mazhar-i-Qudrat مظہرِ قدرت

Miftah-ul-Ulum مفتاح العلوم

Miftah-ul-Qawaid, (Part-III) مفتاح القواعد

Mabadi-ul-Hisab, (Part-I) مبادیٔ الحساب

Ditto (Part-II)

Ditto (Part-III)

Ditto (Part-IV)

Mufid-un-Nisa (a book intended for use in female schools) مفید النساء

Mufid-ul-Atfal مفید الاطفال

Muntakhabat-i-Urdu منتخب اردو

Muntakhabat-i-Fasana-i-Ajaib منتخب فسانہ عجائب

Muntakhabat-i-Urdu (Part-III) (Allahabad) منتخب اردو

Mukhtasar-Tarikh-i-Inglistan منتخب تاریخ انگلستان

Mufid-us-Sibiyan مفید الصبیان

Mufid-ul-Mubtadi مفید المبتدی

Mufid Malguzari مفید مال گذاری

Mufid-uz-Zarain مفید الذرعین

Mauzu-i-Lifafajat موضوعِ لفافہ جات

Namuna-i-Africa نمونۂ افریقہ

Ditto (Varnished)

Naqsha-i-Shimali America (Varnished) نقشۂ شمالی امریکا

Naqsha-i-Janubi America (Varnished) نقشۂ جنوبی امریکا

Naqsha-i-Asia (Printed in England) نقشۂ ایشیاء

Naqsha-i-Europe (ditto) نقشۂ یورپ

Naqsha-i-Hindustan (large) varnished نقشۂ ہندوستان

Ditto (large) unvarnished

Ditto (small) unvarnished

Ditto (small) unvarnished

Ditto (Nagri) unvarnished

Naqsha-i-America Shimali نقشۂ امریکہ شمالی

Naqsha-i-America Janubi (unvernished) نقشۂ امریکہ جنوبی

Naqsha-i-Punjab (Nagri) نقشۂ پنجاب

Ditto (Urdu)

فیروز پور، جھنگ، ہوشیار پور، جالندھر، کانگڑہ امرتسر

Pand Nama-i-Kasht Karan پندنامہ کاشتکاران

Pand Nama-i-Aayal Daran پندنامہ عیال داراں

Pand Sudmund پند سودمند

Patwari ki Kitab (i) پٹواری کی کتاب

Patwari ki Kitab (ii) پٹواری کی کتاب

Patwari ki Kitab (iii) پٹواری کی کتاب

Patwari ki Kitab (iv) پٹواری کی کتاب

Qanoon-i-Mukhtasil Amar قانون مختصل امر

Qaida Haroof-e-Farsi-o-Angrezi قاعدہ حروف فارسی و انگریزی

Qases-i-Hind Hissa (i) قصص ہند حصہ

Qases-i-Hind Hissa (ii) قصص ہند حصہ

Qawaid Distric t Committee قواعد ڈسٹرکٹ کمیٹی

Qawaid-i-Urdu قواعد اردو

Qawaid-i-Urdu قاعدہ اردو

Qawaid-ul-Mubtadi قواعد المبتدی

Qawaid-i-Urdu Allahabad قواعد اردو - الہ آبادہ

Qisa-i-Allahdin aur Chalis Choron ki Kahani قصہ الہ دین اور چالیس چوروں کی کہانی

Qisa-i- Dharam Singh قصہ دھرم سنگھ

Qisa -i-Punjab Singh قصہ پنجاب سنگھ

Qisa-i- Surajpur قصہ سورج پور

Qisa-i- Wafadar Sing قصہ وفادار سنگھ

Rasoon-i-Hind (i) رسوم ہند

Rasoon-i-Hind (ii) رسوم ہند

Rasoon-i-Hind (iii) رسوم ہند

Rasoon-i-Hind (iv) رسوم ہند

Rasoon-i-Hind (v) رسوم ہند

Rasoon-i-Hind Mukamal رسوم ہند مکمل

Rasoon-i-Hind Cheap Edition رسوم ہند

Risala-i-Ilm-i-Intizam-i-Mudai (Translation of Senior's Political Economy) رسالۂ علم انتظام مدنی

Risala-i-Ilm-e-Musalas رسالۂ علم مثلث

Risala-i-Kausar Ashriya رسالۂ کوثر عشریہ

Risala-i-Kimiya Zarat رسالۂ کیمیا زراعت

Risala-i-Masahat رسالۂ مساحت

Risala-i-Qanoon-i-Aslia رسالۂ قانون اصلیہ

Risala-i-Chechak رسالہ چیچک

Sarnama Khird سرنامہ خرد

Sawalat Tehreer Aqleedas سوالات تحریر اقلیدس

Saneen -ul-Islam (History of the Arabs) by Dr.Leitner سنین الاسلام

Shara-i-ul-Taleem Part (I) شارع التعلیم

شارع التعلیم Shara-i-ul-Taleem Part (II)

شارع التعلیم Shara-i-ul-Taleem Part (III)

شارع التعلیم Shara-i-ul-Taleem Part (IV)

طریقہ سلطنت انگلشیہ Tareeqa-i-Saltanat-i-Inglishia (Translation of Collier's British Empire(i)

Ditto (part-ii)

تاریخ عالم Tareekh-i-Alam

تاریخ گوشہ پنجاب Tareekh-i-Gosha-i-Punjab

تاریخ بنگال Tareekh-i-Bangal

تاریخ مصر Tareekh-i-Misar

تاریخ یونان Tareekh-i-Unan

تاریخ ملک آزاد Tareekh-i-Mulk-i-Azam

تاریخ مغلیہ Tareekh-i-Mughlia

تاریخ ہند Tareekh-i-Hind

تاریخ کشمیر Tareekh-i-Kashmir

تاریخ ہندوستان(ہندو دور) Tareekh-i-Hindustan(Hindu Daur)Translation from Elphinstone (Part I)

محمدن دور Tareekh-i-Hindustan Muhammadan Daur(Part II)

تقریری حساب Taqreeri Hisab

ترجمہ انگلش پریمئر Tarjuma-i-English Premiere

ترجمۂ دوسری کتاب Tarjuma-i-Doosri Kitab

تسہیل التعلیم Tasheel-ul-Taleem

تسہیل الکلام Tasheel-ul-Kalam

تشہیر ظہوری Tashheer-i-Zahoori

تعزیرات ہند Tazeerat-i-Hind

Tazkiratul Mashaheer (i)(حصہ اول) تذکرۃ المشاہیر

Tazkiratul Mashaheer (ii)(حصہ دوم) تذکرۃ المشاہیر

Tazkiratul Mashaheer (iii)(حصہ سوم) تذکرۃ المشاہیر

Tazkiratul Mashaheer (iv)(حصہ چہارم) تذکرۃ المشاہیر

Tashreeh-i-Al-Rauf تشریح الرؤف

(Barnard Smith) by Zaka Ullah ترجمہ کتاب حساب

Urdu Adras اُردو ادرس

Urdu Entrance Course (bound)

Urdu Entrance Course (unbound)

Urdu Entrance Course (foolscap)

Urdu ki Pehli Kitab اردو کی پہلی کتاب

Urdu ki Doosri Kitab اردو کی دوسری کتاب

Asool-i-Qanoon-i-Diwani Punjab (i) (حصہ اول) اصول قانونِ دیوانی پنجاب

Asool-i-Qanoon-i-Diwani Punjab (ii) (حصہ دوم) اصول قانونِ دیوانی پنجاب

Asool-i-Ilm-i-Tabai (حصہ اول) اصول علم طبعی

Asool-i-Dastoor Qanoon-Diwani Punjab اصول دستور قانونِ دیوانی پنجاب

Urdu Astronomical Chart

Waqia-i-Ram Chandar واقعہ رام چندر

Waqia-i-Sikandar-i-Azam واقعہ سکندر اعظم

Zubdat-ul-Hisab (i)(حصہ اول) زبدۃ الحساب

Zubdat-ul-Hisab (ii)(حصہ دوم) زبدۃ الحساب

Zubdat-ul-Hisab (iii)(حصہ سوم) زبدۃ الحساب

Pyare Lal

Offg. Curator, Govt. Central Book Department

ہفت روزہ

خبرنامہ ہفت روزہ۔ پاکستان انجینئرنگ کمپنی، نیر اسلام: ہفت روزہ،

ماہنامہ

مشیر صحت: ماہنامہ، آداب عرض: ماہنامہ، ماہ نو: کشور ناہید، قائم نقوی نعرہ جنگ: ماہنامہ، نشان منزل: ماہنامہ، پنجاب ٹرانسپورٹ: ماہنامہ، افسانہ : ماہنامہ، دستور : ماہنامہ، سلیم واحد سلیم، دستور : ماہنامہ، سلیم واحد سلیم، الحکیم : ماہنامہ، الاعجاز : ماہنامہ، منبع : ماہنامہ، سرتاج : ماہنامہ، قانون کو شیخ ' ماہنامہ، مدرس : ماہنامہ، نفیس : ماہنامہ، اشاعت ادب: ماہنامہ، اعادہ شہاب: ماہنامہ، آبشار : ماہنامہ، عکاس : ماہنامہ، قاصد جدید : ماہنامہ، انجمن : ماہنامہ، چاند : ماہنامہ، آموزش : ماہنامہ، انوار العلوم : ماہنامہ، المستعد : ماہنامہ، الملک : ماہنامہ

روزنامہ

زراعت و باغبانی: سردار ہردت سنگھ

شاہین بچے : ماہنامہ

ضیاء : ماہنامہ

شمع : ماہنامہ

بچوں کا باغ: ماہنامہ

درویش : ماہنامہ

گیسوا:

راز و حیات : ماہنامہ

آتش کدہ : ماہنامہ

بعد

طبی شاہکار : ماہنامہ

شمع نور: ماہنامہ

حقیقت اسلام : ماہنامہ

بھائی بہن : ماہنامہ

دار الفرقان : ماہنامہ

تصور : ماہنامہ

حکیم پاکستان : ماہنامہ

شاہنواز : ماہنامہ

شبستان : ماہنامہ

فلمیشیا : ماہنامہ

دلبستان : گورنمنٹ سائنس کال لاہور کا ادبی مجلّہ

ایچی سونین: ایچی سن کالج لاہور کا ادبی مجلّہ

فاران : اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور

محور : پنجاب یونیورسٹی لاہور

تحفظ : ماہنامہ، ادارہ سماجی تحفظ ملازمین

پوسٹ مین: ماہنامہ، پاکستان پوسٹ مین اینڈ لوئر گریڈ یونین

پاکستان ریلویز ہفت روزہ، پاکستان ریلوے

امداد باہمی: پندرہ روز، مغربی پاکستان کوپریٹو یونین

قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والے اخبارات

منظر : ماہنامہ

مشعل : ماہنامہ

خزینہ مشرق: ماہنامہ

کیتھولک نقیب: ماہنامہ

جلاوطن : ماہنامہ

لالہ رخ: ماہنامہ

پیغام صلح ہفت روزہ

برق ہفت روزہ

سکھی گھر: ماہنامہ، پاپولیشن پلاننگ بورڈ

بہبود: سہ ماہی، محکمہ سماجی بہبود پنجاب

باٹا نیوز ہفت روز، باٹا شو کمپنی پاکستان

سوئی ناردن ہفت روزہ، سوئی ناردن کمپنی

ڈائریکٹر : ماہنامہ

سرچشمہ : گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور صدر کا علمی و ادبی مجلّہ

محمل : اسلامیہ کالج کروپر روڈ کا ادبی مجلّہ

اوج: گورنمنٹ کالج شاہدرہ لاہور

کریسنٹ : اسلامیہ کالج لاہور کا علمی ادبی مجلّہ

اقراء : ایم اے۔او کالج کا مجلّہ

گرل گائیڈ: ماہنامہ، عوامی ترقیاتی پروگرام

پاک جمہوریت: ہفت روزہ، وزارت اطلاعات حکومت پاکستان

نوائے لاہور: پندرہ روز، لاہور میونسپل کارپوریشن

کھاد: دو ماہی، نیشنل فرٹیلائزر کارپوریشن

خضر راہ: ماہنامہ

مظلوم کشمیر ہفت روزہ

کھلونا: ماہنامہ

خادم الحرمین: ماہنامہ

آئینہ قسمت: ماہنامہ

کاریگر : ماہنامہ

نوائے وطن ہفت روزہ

چشمک: مشکور حسین یاد

برقاب : ماہنامہ، واپڈا کی طرف سے شائع ہوا۔

اپنی زمین: ماہنامہ: زرعی ترقیاتی و سپلائی کارپوریشن

چیمبر نیوز ہفت روزہ، چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری

لیفو ہفت روز، لاہور انجینئرنگ فونڈری

انجمن ہفت روزہ، شورش کاشمیری

رضوان ہفت روزہ	ڈرائیور ہفت روزہ
رفتار زمانہ ہفت روزہ	دستکاری: ہفت روزہ
گل و خار: ہفت روزہ	سیف : ہفت روزہ
اجالا: ہفت روزہ	تیرونشتر: ہفت روزہ
مزدور دنیا: ہفت روزہ	آشیانہ : ہفت روزہ
آبشار : ہفت روزہ	حمایت اسلام : ہفت روزہ
کاشتکار جدید : ماہنامہ، رحمت خان تارڑ	خدمت خلق: ماہنامہ
آثار حکمت: ماہنامہ	معارف اسلامیہ: ماہنامہ
نمونہ: ماہنامہ	گل فشاں: ماہنامہ
مست قلندر: ماہنامہ	مست شہاب: ماہنامہ
بصیرت ہفت روزہ	کہانی، شہاب، اخبار جہاں ہفت روزہ
حقیقت : پندرہ روزہ	ہدایت: پندرہ روزہ
رضا کار ہفت روزہ	المائدہ : پندرہ روزہ
تسطیر : سہ ماہی، ترجمان	اذاں حق ہفت روزہ
کیفر کردار ہفت روزہ	حرف وحکایت
وحدت ہفت روزہ	احوال ہفت روزہ
نفسیات : ماہنامہ	تریاق: ماہنامہ
کائنات: ماہنامہ، غلام محمد، حامد علی حامد	جہاں اردو : ماہنامہ

ایسے رسائل جن کا حتمی سن اشاعت معلوم نہیں ہو سکا لیکن تاریخ صحافت کے مطالعہ کی بنا پر انہیں دوحصوں قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد میں منقسم کیا گیا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل شائع ہونے والے اخبارات و رسائل

انوار الاسلام : مرزا غلام رسول

ہنٹر: ہفتہ وار، ملا محمد بخش

ریاست : ہفتہ وار

ساربان: ماہنامہ

ناکیز:

خم دار گیسو:

نرال: ماہنامہ، کے۔ایس۔ اچنت

مغلیہ گزٹ: ماہنامہ

کاروان مشرق، لیلیٰ، نگاستان، سدا بہار

شوق: ماہنامہ، شوق لاہور

صاف گو: نوائے وطن

ہمالہ ہفت روزہ

نیا دور:

انصاف: روزنامہ، مولانا مرتضیٰ احمد خان رکش

آریہ گزٹ ہفت روزہ

ساز: ماہنامہ

ہونہار ہفت روزہ

علوم مشرقی ہفت روزہ

انوکھی دنیا ہفت روزہ

لطف شہاب: ماہنامہ، پریمانند

شجاعت ہفت روزہ

مشرق دنیا: ماہنامہ، کلیم یوسف

دوست: ماہنامہ

رہبر ہند ہفت روزہ

پنجاب سماچار: پنڈت راج نرائن ارمان

دلیش بھکت ہفت روزہ

چندا ہفت روزہ

درویش : ماہنامہ، سید ابوالقاسم دلاوری

حق پبلشی کمیٹی کا لاہور کا اخبار

بت کدہ

وارث : لالہ بانکے دیال

سچا سجن ہفت روزہ

گلشن : ماہنامہ، سید نورحسن نور

نیشنل کانگرس ہفت روزہ، ڈاکٹر ستیہ پال

ترجمان: ماہنامہ، تیرتھ رام فیروز پوری

اشاعت القرآن ہفت روزہ

جدید نظام: عالم تاب: ہماری دنیا

ہمدرد: روزنامہ،

آریہ ویر ہفت روزہ

طوفان ہفت روزہ

پنجاب ریویو: ماہنامہ، مولانا ظفر علی خان

اوم: ماہنامہ، گورکھ ناتھ نندا

موج بہار : ماہنامہ

جگت ویر ہفت روزہ

نونہال ہفت روزہ

نشیمن: ماہنامہ

فطرت: ماہنامہ

دھرم ہفت روز

منزل: خالد عرفان، سلطان: مسلم ضیائی، گردو پیش:

ہمکاری: پنڈت راج نرائن ارمان

گوروگھنٹال ہفت روزہ

شیر پنجاب ہفت روزہ
سعادت ہفت روزہ
امام: روزنامہ، ابوالمعالی منشی تاج الدین
مجاہد: روزنامہ
مارننگ نیوز (اردو) روزنامہ
وشو ملاپ، (اردو) روزنامہ
سرفراز: روزنامہ

دلیش: روزنامہ
کرم ویر ہفت روزہ
خاتون: روزنامہ، فاطمہ بیگم (دختر منشی محبوب عالم)
خالصہ ویر: روزنامہ
ایثار: روزنامہ
نیو ملاپ: روزنامہ
پیغام جدید: روزنامہ

لاہور میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل:

اخبار/ رسالہ	مالک / ایڈیٹر	سن اشاعت
کوہ نور	منشی ہرسکھ رائے	۱۸۵۰ء
دریائے نور	نجیب الدین حسین، منشی سندر لال، شہسوار الدین	۱۸۵۰ء
اخبار لاہور	۔	۱۸۵۰ء
چشمۂ فیض	منشی دیوان چند	۱۸۵۳ء
مفاد ہند	۔	۱۸۵۳ء
لاہور گزٹ	بابو تیج چندر	۱۸۵۳ء
ہمارے بے بہا	منشی دیوان چند	یکم جنوری ۱۸۵۳ء
معلم ہند	محمد احسن کلانوری	یکم جولائی ۱۸۵۴ء
پنجابی اخبار	منشی سیّد محمد عظیم	۱۸۵۶ء
پنجاب جرنل	۔	۱۸۵۶ء
خورشید پنجاب	منشی ہر سکھ رائے	جنوری ۱۸۵۶ء
بہار حکمت	۔	۱۸۵۷ء
سرکاری اخبار	اجودھیا پرشاد	یکم مئی ۱۸۵۸ء
گنج شائگاں	منشی ہرسکھ رائے	۱۸۶۰ء
بحر حکمت (پندرہ روزہ)	منشی ہر سکھ رائے	۱۸۶۲ء
خیر خواہ پنجاب (ہفتہ وار)	سید محمد عظیم	۱۸۶۵ء
رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ	انجمن پنجاب	۱۸۶۵ء
گیاونی پتر کا	پنڈت مکندرام	یکم جون ۱۸۶۵ء
آفتاب پنجاب	شیخ فقیر محمد، نبی بخش، حافظ عمر دراز، جے گوپال، آیا سنگھ، دیوان عطا سنگھ	۱۸۶۶ء
انوار الشمس (ہفتہ وار اخبار)	دیوان بوٹا سنگھ مولوی نبی بخش	۱۸۶۷ء
اتالیق پنجاب (ماہنامہ)	پیارے لال آشوب معاون مدیر محمد حسین آزاد	۱۸۶۹ء

ہمائے پنجاب (رسالہ)	پنڈت مکند رام، گوپی ناتھ، محمد حسین آزاد	یکم اپریل ۱۸۷۰ء
اخبار عام (ہفت روزہ)	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
پولیس گزٹ (ہفتہ وار)	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
مطلع انوار	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
اردو میڈیکل گزٹ	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
پولیس گزٹ	-	۱۸۷۱ء
امیر الاخبار (پندرہ روزہ اخبار)	مہتمم مرزا عبدالقادر بیگ	جنوری ۱۸۷۲ء
حقیقی عرفان	مہتمم مرزا عبدالقادر بیگ	۱۸۷۲ء
کوہ طور	مہتمم مرزا نھو بیگ	یکم اپریل ۱۸۷۲ء
پنجاب گزٹ	مہتمم مرزا نھو بیگ	جنوری ۱۸۷۳ء
اردو گورنمنٹ گزٹ پنجاب	مہتمم پیارے لال آشوب	جنوری ۱۸۷۳ء
آفتاب پنجاب اخبار	بوٹا سنگھ ایڈیٹر مولوی نبی بخش جولائی	۱۸۷۳ء
ہادی حقیقت (پندرہ روزہ اخبار)	بابو کیشب چند سین	۱۸۷۳ء
روزنامچہ پنجاب	مدیر نثار علی	یکم جنوری ۱۸۷۴ء
اتالیق ہند (اخبار)	نادر علی سیفی	یکم دسمبر ۱۸۷۴ء
پنجاب میگزین	محمد حسین آزاد	۱۸۷۴ء
رہبر ہند (ہفت روزہ)	منشی نادر علی سیفی	یکم اپریل ۱۸۷۵ء
ہندو باندھو (اخبار)	پنڈت شیو نارائن	یکم اپریل ۱۸۷۵ء
گنجینہ قانون / گنجینہ قوانین ہند (ماہنامہ)	پنڈت سورج بھان	یکم جولائی ۱۸۷۵ء
آریہ سماچار گیت رائے میگزین (ماہنامہ رسالہ)	پنڈت سورج بھان	یکم جولائی ۱۸۷۵ء
ناصر الایمان	نادر علی سیفی	۱۸۷۵ء
مراۃ الہند		۱۸۷۵ء
بحر حکمت	ڈاکٹر رحیم خان	۱۸۷۵ء

گنجینۂ نظائر (ماہنامہ)	مالک منشی ہر سکھ رائے	یکم جنوری ۱۸۷۶ء
البرٹ گزٹ (ہفتہ وار)	مالک خواجہ احمد حسن	۱۸۷۶ء
اخباروں کا قبلہ گاہ	ایڈیٹر مولوی نہال الدین	۱۸۷۶ء
خورشید عالم	مالک منشی جگن ناتھ	۱۸۷۷ء
نور الہدیٰ	غلام اللہ صدیقی	جون ۱۸۷۷ء
حافظ صحت (ماہنامہ)	حکیم غلام نبی -	یکم جنوری ۱۸۷۸ء
اشاعت السنہ	مہتمم مولوی ابو سعید محمد حسین	۱۸۷۸ء
پنجاب پنچ	مدیر منشی محمد دین - نثار علی شہرت	۱۸۷۸ء
دہلی پنچ (ہفت روزہ)	مالک حسین علی فرحت ایڈیٹر مولوی فضل الدین	یکم جون ۱۸۸۰ء
نظائر قانون ہند (ماہنامہ)	مالک رائے سکھ رائے	۱۸۸۰ء
تکمیل الحکمت	ایڈیٹر ڈاکٹر سید اکبر شاہ	۱۸۸۰ء
خزینۃ القوانین (پندرہ روزہ)	مالک سید نادر علی شاہ سیفی	۱۸۸۰ء
سوانح عمری (ماہنامہ)	مہتمم منشی تھو رام آنند	۱۸۸۲ء
رفارمر	ایڈیٹر پنڈت ہرگوپال	۱۸۸۲ء
آئینہ ہند (ماہوار رسالہ)	مالک لالہ رنگی رام مختار	یکم جنوری ۱۸۸۳ء
کلید قوانین	بانی لالہ زکی رام	۱۸۸۳ء
دھرم جیون	ایڈیٹر پربھ بادی ستیہ- نند اگن ہوتری	۱۸۸۳ء
گلزار حکمت	-	۱۸۸۳ء
گلدستہ انجمن (ماہنامہ)	ایڈیٹر مولوی سیف الحق ادیب	۱۸۸۳ء
ویلش اپکارک (ہفتہ وار)	مالک رائے سالک رام	۱۸۸۳ء
رفیق ہند (ہفت روزہ)	محرم علی چشتی	۵ جنوری ۱۸۸۴ء
آئینہ اخلاق (ہفت روزہ اخبار)	ایڈیٹر عبدالعزیز،عبدالرحمان	۱۸۸۴ء
راوی بے نظیر	ایڈیٹر شیوناتھ	۱۸۸۴ء
ہدایت (ہفتہ وار)	ایڈیٹر مولوی غلام علی قصوری	۱۸۸۴ء
طب حیوانات (ماہنامہ)	ایڈیٹر - ڈاکٹر مجد دین	یکم جولائی ۱۸۸۴ء

خیر خواہ کشمیر (ہفتہ وار)	مالک پنڈت سالگ رام کول	۱۸۸۴ء
شام وصال (روزنامہ)	مہتمم مولوی سیف الحق ادیب	۱۸۸۴ء
نسیم صبح (روزنامہ)	ایڈیٹر منشی سیف الحق ادیب	۱۸۸۴ء
معلم ہند (ماہنامہ)	بانی محمد حسن احسن کلانوری	۱۸۸۴ء
شفیق ہند	مہتمم مولوی سیف الحق ادیب	۱۸۸۴ء
رسالہ انجمن حمایت اسلام (ماہنامہ)	مہتمم مولوی کریم بخش	۱۸۸۴ء
غم خوار ہند	مہتمم علیم الدین	۱۸۸۵ء
طبیب لاہور (ماہنامہ)	اڈیٹر حافظ فخر الدین	۱۸۸۵ء
آفتاب عالم تاب (ہفتہ وار)	ایڈیٹر منشی رام سنگھ	۱۸۸۵ء
لاہور گزٹ (ہفتہ وار)	مالک منشی دیدار بخش	۱۸۸۵
ہر دلعزیز	ایڈیٹر رام سنگھ	۱۸۸۵ء
ناظم الہند	مالک -سید ناظر حسین ناظم	۱۸۸۵ء
کلید جنت	مالک -سردار علی اختر	۱۸۸۵ء
گلدستہ حکمت	مالک -حکیم احمد الدین	۱۸۸۵ء
رہبر ہند (ہفتہ میں دو بار)	مالک - سید نادر علی شاہ سیفی	۱۸۸۵ء
جعفر زٹلی (ہفت روزہ)	محرم علی چشتی، مفتی حفظ الاسلام، محمد بخش، مولوی الہ دین	یکم جولائی ۱۸۸۵ء
شیخ چلی	مالک مان سنگھ	۱۸۸۵ء
ملا دو پیازہ ہفت روزہ	الہ بخش، الہ دین	۱۸۸۶ء
ملکی نامہ بر	ایڈیٹر سید جواد علی شاہ	۱۸۸۶ء
ملکی شہدا	مالک مولوی فضل الدین	۱۸۸۶ء
باغبان (ماہنامہ)	منشی نور الدین	۱۸۸۶ء
تیس مار خان	منشی نور الدین	جنوری ۱۸۸۶ء
اخبار ملکی شہداء (دہلی پنچ کا ضمیمہ)	منشی نور الدین	جنوری ۱۸۸۶ء
پاٹے خان (ہفت روزہ)	محرم علی چشتی، عبدالرحمٰن	۲ جنوری ۱۸۸۶ء
نیو گائیڈ	مالک - ماسٹر غلام حسین	۱۸۸۶ء

امپیریل پیپر (ہفتہ وار)	مالک سید رجب علی	مارچ ۱۸۸۶ء
مجمع علوم و الفنون (ماہنامہ)	ایڈیٹر مولوی عبداللہ خاں	۱۸۸۶ء
خالصہ گزٹ	بانی - جھائی نند گوپال	۱۸۸۶ء
معائنہ	ایڈیٹر سید جواد علی	۱۸۸۶ء
عطّار		۱۸۸۶ء
شریر (پندرہ روزہ)	مہتمم اتم چندر کپور	۲۴ جون ۱۸۸۷ء
روشنی	مالک شیر بخش	۱۸۸۷ء
راوی	مہتمم پنڈت ہرگوپال، پی -ایچ-جی دتاتریہ	۱۸۸۷ء
پبلک نیوز	مہتمم پنڈت ہرگوپال، پی -ایچ-جی دتاتریہ	۱۸۸۷ء
تحفۂ ہند (ہفتہ وار)	ایڈیٹر یوسف علی خاں قزلباش	۱۸۸۷ء
رسالہ مدرسہ علوم اسلامیہ (ماہنامہ)	ایڈیٹر منشی تاج دین	۱۸۸۸ء
"پیسہ اخبار"	منشی محبوب عالم	۱۸۸۹ء
شورِ محشر	حکیم محمد شجاع	۱۸۹۰ء
پنجاب کا سماچار	مالک لالہ ہیرا لال کپور	۱۸۹۱ء
شریف بیبیاں	منشی محبوب عالم	۱۸۹۳ء
انصاف پسند	بانی لالہ تولا رام و بخشی تاراچند چھبر	۱۸۹۴ء
زبدۃ اخبار	ایڈیٹر غلام نبی	فروری ۱۸۹۵ء
انتخاب لا جواب	مالک مولوی محبوب عالم	۱۸۹۵ء
تہذیب نسواں	ایڈیٹر شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی	۱۸۹۸ء
کشمیری گزٹ (ماہوار)	محمد دین فوق	۱۸۹۹ء

لاہور میں بیسویں صدی کے نصف دوم میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل:

مخزن:	شیخ عبدالقادر	اپریل ۱۹۰۱ء
گلزار ہند:	محمد دین فوق	اگست ۱۹۰۱ء
خیر خواہ ہند: پندرہ روزہ	حکیم غلام نبی	۱۹۰۱ء
وطن ہفت روزہ	مولوی انشاء اللہ خان	جنوری ۱۹۰۲ء
ترقی : ماہنامہ	منشی فیروز خاں ساغر آبادی	جنوری ۱۹۰۲ء
بچوں کا اخبار: ماہنامہ	منشی محبوب عالم	مئی ۱۹۰۲ء
تالیف و اشاعت: پندرہ روزہ	مولوی سید ممتاز علی	یکم اگست ۱۹۰۲ء
دیہاتی گزٹ: ماہنامہ	منشی عبدالغنی	۱۹۰۲ء
شمشیر قلم: ہفتہ وار	حافظ نور احمد خوشنویس	۱۹۰۲ء
پنجہ فولاد: پندرہ روزہ	منشی محمد دین فوق	جنوری ۱۹۰۳ء
زمیندار: ہفتہ وار	منشی سراج الدین احمد	جون ۱۹۰۳ء
شریف : ہفتہ وار	سید جالب دہلوی	۱۸ اکتوبر ۱۹۰۳ء
اردو اخبار: ہفتہ وار	منشی رام اگروال، منشی محمد دین فوق	۱۹۰۳ء
ہندوستان ہفت روزہ	لالہ دینا ناتھ، رام بھیج دت	۲۶ اگست ۱۹۰۴ء
راجپوت گزٹ: ہفتہ وار	ٹھاکر سکھرام داس	۱۹۰۴ء
کامل: ماہنامہ	عبدالعزیز کامل لاہوری	۱۹۰۴ء
الہدیٰ: ماہنامہ	اصغر علی روحی	جنوری ۱۹۰۵ء
میونسپل گزٹ: ماہنامہ	منشی محمد دین	جولائی ۱۹۰۵ء
مشیر مادر: ماہنامہ	سید مولوی ممتاز علی، محمدی بیگم	۱۹۰۵ء
فصیح الملک: ماہنامہ	مولوی وجاہت حسین جھنجھانوی	۱۹۰۵ء
کشمیری میگزین:	منشی محمد دین فوق	جنوری ۱۹۰۶ء
تجلی: ماہنامہ	-	جنوری ۱۹۰۶ء

نشتر: ماہنامہ	محمد افضل خان	دسمبر ۱۹۰۶ء
راوی:	(گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور کا سلانہ مجلّہ)	۱۹۰۶ء
سادھو: ماہنامہ	بابو سومرت لال	۱۹۰۶
آزاد: ماہنامہ	بشن سہائے آزاد	جنوری ۱۹۰۷ء
اصلاح سخن: ماہنامہ	وجاہت حسین جھنجھانوی	جون ۱۹۰۷ء
حکمت: ماہنامہ	حکیم محمد فیروز الدین	۱۹۰۷ء
دولت ہند: ہفتہ وار	۔	۱۹۰۷ء
المجید: ماہنامہ	مولوی تاج الدین مجددی نقشبندی	جنوری ۱۹۰۸ء
رہنما تعلیم	مفتی محمد طالب پابند قریشی	جنوری ۱۹۰۸ء
معین الطلباء	۔	۱۹۰۸ء
قومی اخبار: ہفتہ وار	۔	۱۹۰۸ء
اورینٹل گزٹ: ماہنامہ	۔	۱۹۰۸ء
گئوماتا: ماہنامہ	بابو اللہ دیا جوگی	اکتوبر ۱۹۰۹ء
الکیمیا: ماہنامہ	حکیم فیروز الدین	نومبر ۱۹۰۹ء
پھول: ہفتہ وار	مولوی سید ممتاز علی	۱۹۰۹ء
شریف بی بی	۔	۱۹۰۹ء
تفسیر القرآن: ماہنامہ	۔	۱۹۰۹ء
ملت: ہفتہ وار	مولوی محمد شجاع اللہ	مارچ ۱۹۱۰ء
البرہان:	۔	دسمبر ۱۹۱۰ء
کشمیری گزٹ:	منشی محمد دین فوق	۱۹۱۰ء
ہندو: روزنامہ	پنڈت ہری لال شرما	۱۴ستمبر ۱۹۱۱ء
کسان: ماہنامہ	سردار احمد ڈپٹی کلکٹر	۱۵ اکتوبر ۱۹۱۲ء
ظریف: ماہنامہ	پیر زادہ عبدالرشید	دسمبر ۱۹۱۳ء
فانوس خیال:	مولانا عبدالمجید سالک	جون ۱۹۱۴ء

رسالہ طریقت:	منشی محمد دین فوق	۱۹۱۴ء
شوق: ماہنامہ	۔	۱۹۱۴ء
دیش: روزنامہ	لالہ دینا ناتھ	۱۹۱۵ء
ہمالہ ہفت روزہ	لالہ دینا ناتھ	۱۹۱۵ء
الحکیم: ماہنامہ	۔	۱۹۱۵ء
ستارہ صبح ہفت روزہ	مولانا ظفر علی خان	یکم فروری ۱۹۱۷ء
کہکشاں:	امتیاز علی تاج	ستمبر ۱۹۱۸ء
نظام	منشی محمد دین فوق	۱۹۱۸ء
آفتاب: روزنامہ	مولوی وجاہت حسین	۱۹۱۸ء
پرتاب، روزنامہ	مہاشہ کرشن	۳۰ مارچ ۱۹۱۹
رکاش: ہفتہ وار		۱۹۱۹ء
سیاست	مولوی محمد حبیب	۱۹۱۹ء
شباب اردو	خان احمد حسین خان	اپریل ۱۹۲۰ء
بندے ماترم	لالہ لاجپت رائے	جون ۱۹۲۰ء
تحریک: ماہنامہ	حکیم مظفر حسین اظہر	جون ۱۹۲۱ء
ہزار داستان: پندرہ روزہ	سید عابد علی عابد، حکیم احمد شجاع، محمد ہادی حسین قریشی	۱۹۲۱ء
ہمایوں:	میاں بشیر احمد	جنوری ۱۹۲۲ء
حامی الصحت:	۔	۱۹۲۲ء
الکمال:	ریاض شیرانی	۱۹۲۲ء
رومان:	اختر شیرانی، خلیل احمد	۱۹۲۲ء
ملاپ: روزنامہ	مہاشہ خوشحال چند خورسند	۱۳ اپریل ۱۹۲۳ء
گلدستہ ہفت روزہ	لالہ رگھوناتھ سہائے	۱۹۲۳ء
مشیر الاطباء	۔	۱۹۲۳ء

عالمگیر	حافظ محمد عالم، مرزا ادیب، عبدالرحیم شبلی بی کام	جون ۱۹۲۴ء
نیرنگ خیال: ماہنامہ	حکیم یوسف حسین	۱۹۲۴ء
سہیلی:	زہرہ بتول	۱۹۲۴ء
وصل حبیب:	ـ	جنوری ۱۹۲۵ء
اورینٹل کالج میگزین: سہ ماہی	ـ	۱۹۲۵ء
نقاد:	ـ	۱۹۲۵ء
نرالی دنیا: ماہنامہ	روشن لال دیوانہ	۱۹۲۵ء
مستانہ جوگی: ماہانہ	لچھمن پرشاد	۱۹۲۵ء
بہارستان:	اختر شیرانی	جنوری ۱۹۲۶ء
پریم: ہفتہ وار	تاجور نجیب آبادی	۱۹۲۶ء
انتخاب:	اختر شیرانی	۱۹۲۶ء
اتحاد: روزنامہ	تاجور نجیب آبادی، لالہ چرنجیو لال ماتھر ایم اے	۱۹۲۶ء
نور جہاں	ـ	۱۹۲۶ء
پیمانہ	ساغر نظامی	۱۹۲۶ء
انقلاب: روزنامہ	مولانا غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک	۴ اپریل ۱۹۲۷ء
اصلاح:	ـ	اگست ۱۹۲۷ء
ثریا: پندرہ روزہ	رضیہ ہاجرہ	جون ۱۹۲۸ء
فانوس: پندرہ روزہ	ـ	۱۹۲۸ء
سرتاج:	ـ	۱۹۲۸ء
اخوت، ماہنامہ	ـ	۱۹۲۸ء
بدر: ماہنامہ	شیخ عنایت اللہ	۱۹۲۸ء
ویر بھارت	ـ	۱۹۲۸ء
ادبی دنیا:	تاجور نجیب آبادی	اپریل ۱۹۲۹ء
اتحاد مادراں: سہ ماہی	مسز بی ایل رلیارام	۱۹۲۹ء

سروش	ـ	۱۹۲۹ء
پنجابی زمیندار: ماہنامہ	نوسیر سنگھ	اپریل ۱۹۳۰ء
ویر پرتاب ہفت روزہ	سیوارام مستانہ	اکتوبر ۱۹۳۰ء
خیام ہفت روزہ	حافظ محمد عالم	۱۹۳۰ء
زراعت: ماہنامہ	ـ	۱۹۳۰ء
مشیر باغبانی: ماہنامہ	جی۔ایم۔ملک	۱۹۳۰ء
یادگار: ماہنامہ	ـ	۱۹۳۰ء
خیالستان	اختر شیرانی	۱۹۳۰ء
شیرازہ: ہفتہ روزہ	چراغ حسن حسرت	۱۹۳۱ء
مسلمہ: ماہنامہ	عنایت عارف	۱۹۳۱ء
احرار: روزنامہ	چودھری فضل حق	۱۳ دسمبر ۱۹۳۱ء
گرہستی: ماہنامہ	ـ	۱۹۳۱ء
جہانگیر	محمد خان احمد	۱۹۳۳ء
القاضی:	ـ	۱۹۳۳ء
تبصرۃ الاطباء	ـ	۱۹۳۳ء
تعلیم الصحت:	ـ	۱۹۳۳ء
احسان: روزنامہ	ملک نورالٰہی	۱۹۳۳ء
حریت: روزنامہ	چودھری فضل حق، ابو سعید بزمی	۱۹۳۳ء
کارواں: (اولین سالنامہ)	ڈاکٹر ایم۔ڈی تاثیر۔مجید ملک	۱۹۳۳ء
اداکار:	عطا اللہ شاہ ہاشمی	۱۹۳۴ء
زیب النساء: ماہنامہ	رشیدہ عصمت	۱۹۳۴ء
نسوانی دنیا: ماہنامہ		مارچ ۱۹۳۵ء
شاہکار: ماہنامہ	تاجور نجیب آبادی، ن۔م۔راشد، محمد آصف	اپریل ۱۹۳۵ء
اختر	محمد علی برق، فاطمہ بیگم	مئی ۱۹۳۵ء

صنف نازک: ماہنامہ	عنایت اللہ احمد بیگم	۱۹۳۵ء
ادبِ لطیف: ماہنامہ	ممتاز مفتی، مرزا ادیب، فیض احمد فیض، راجندر سنگھ بیدی قتیل شفائی، فکر تونسوی، احمد ندیم قاسمی، عارف عبدالمتین، انتظار حسین، صدیقہ بیگم	۱۹۳۶ء
ہندو درد:	ـ	۱۹۳۶ء
فردوس	ـ	۱۹۳۷ء
وکیل جدید ہفت روزہ	ـ	۱۹۳۷ء
شہباز: روزنامہ	ـ	۱۹۳۸ء
طوفان:	شوکت تھانوی	۱۹۳۸ء
زمزم: سہ روزہ	مولانا نصر اللہ خان عزیز	۱۹۳۸ء
بجرنگ: روزنامہ	ـ	۱۹۳۸ء
کاشتکار: ماہنامہ	رحمت علی خان تارڑ	یکم مئی ۱۹۳۹ء
رفیق نسواں	حمیدہ خانم قریشی	اگست ۱۹۳۹ء
سہاگ: ماہنامہ	ـ	۱۹۳۹ء
انیس نسواں: ماہنامہ	بیگم شیخ محمد اکرام	۱۹۳۹ء
ترجمان القرآن: ماہنامہ	ـ	۱۹۳۹ء
حور: ماہنامہ	امت اللہ قریشی	جنوری ۱۹۴۰ء
نوائے وقت: روزنامہ	ـ	۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء
آئینہ: روزنامہ	ـ	۱۹۴۰ء
وقت ہفت روزہ	(خاکسار تحریک کا ترجمان)	۱۹۴۰ء
حسین دنیا: ماہنامہ	ـ	۱۹۴۰ء
ذوالفقار: روزنامہ	ـ	۱۹۴۰ء
تعلیم و تربیت: ماہنامہ	ـ	۱۹۴۱ء

کتاب: ماہنامہ	سید نذیر نیازی، محمد سرور جامی، قیوم نظر، ظفر کانپوری، عبدالسلام خورشید	جنوری ۱۹۴۲ء
پنچائیت ہفت روزہ	چراغ حسن حسرت، محمد شریف چشتی باری علیگ	۲۱ مارچ ۱۹۴۲ء
رنجیت:	۔	۱۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء
پربھات : روزنامہ	لالہ نانک چند نار	۱۹۴۲ء
حسن پرست ہفت روزہ	۔	۱۹۴۲ء
اجیت: روزنامہ	۔	۱۹۴۳ء
پاکستان ہفت روزہ	ابو سعید انور، جگر قریشی	۱۹۴۴ء
پنجابی کاشتکار: ششماہی	(محکمہ زراعت کا رسالہ)	۱۹۴۵ء
آزاد: روزنامہ	شورش کاشمیری، نواب زادہ نصر اللہ خان، عبدالقادر ملک، حمید اختر، آئی اے رحمان	۲۸ جولائی ۱۹۴۶ء
ہمارا پنجاب: سرکاری ہفت روزہ	باری علیگ، تاجور نجیب آبادی، عبدالسلام خورشید صادق قریشی	۱۹۴۶ء
شاہکار: ماہنامہ	اصغر حسین خان نظر، عبدالعلیم انصاری	۱۹۴۶ء
سحر: ماہنامہ	الطاف پرواز	ستمبر ۱۹۴۷ء
طاقت	علی محمد برق	اکتوبر ۱۹۴۷ء
سفینہ: روزنامہ	وقار انبالوی	۱۷ نومبر ۱۹۴۷ء
فانوس: پندرہ روزہ	جاوید ریاض	نومبر ۱۹۴۷ء
آغاز	میاں احسان الٰہی	۱۹۴۷ء
الفضل	۔	۱۹۴۷ء
حور:	۔	۱۹۴۷ء
حرم: ماہنامہ	ظہرہ بدر	۱۹۴۷ء
بانو:	مولوی محمد امین شرق پوری	۱۹۴۷ء
مغربی پاکستان	۔	۱۹۴۷ء

طلوع اسلام: ماہنامہ	محمد خلیل	۱۹۴۷ء
سویرا: دو ماہی رسالہ	احمد ندیم قاسمی' فکر تونسوی' نذیر احمد	جنوری ۱۹۴۸ء
مجلس: ماہنامہ	مقرب دہلوی	جنوری ۱۹۴۸ء
نفسیات: ماہنامہ	شیر محمد اختر	جنوری ۱۹۴۸ء
نظام ہفت روزہ	اے حمید' انتظار حسین	جنوری ۱۹۴۸ء
جدوجہد: ماہنامہ	-	جنوری ۱۹۴۸ء
امروز: روزنامہ		۴ مارچ ۱۹۴۸ء
نقوش	احمد ندیم قاسمی، حاجرہ مسرور، وقار عظیم محمد طفیل	مارچ ۱۹۴۸ء
قندیل ہفت روزہ	مظہر انصاری، شیر محمد اختر، بشیر	جولائی ۱۹۴۸ء
بچوں کی دنیا: ماہنامہ	محمد سلیم شرق پوری	۱۹۴۸ء
تنظیم الحدیث ہفت روزہ	حافظ محمد جاوید	۱۹۴۸ء
انیس: ماہنامہ	سید مظفر جعفری	۱۹۴۸ء
ساغر: ماہنامہ	قمر انبالوی، محمد اسماعیل متوالا ایم۔اے صدیقی	۱۹۴۸ء
چٹان ہفت روزہ	شورش کاشمیری	۱۹۴۸ء
جاوید: ماہنامہ	ظہیر کاشمیری، کشور یاسین، نصیر انور اے حمید	۱۹۴۸ء
خاتونِ مشرق	-	۱۹۴۸ء
احساس: پندرہ روزہ	-	۱۹۴۸ء
تسنیم	مولانا نصر اللہ خان	۱۹۴۸ء
غازی:	مولانا سیّد حبیب	۱۹۴۸ء
مہاجر:	-	۱۹۴۸ء
صوت الحرم:	-	۱۹۴۸ء
فلم لائٹ: ماہنامہ	-	۱۹۴۸ء
استقلال ہفت روزہ	-	۱۹۴۸ء
غالب: روزنامہ	محمد افضل خان	۸ جنوری ۱۹۴۹ء

نمکدان: پندرہ روزہ	ـ	۲۸ فروری ۱۹۴۹ء
نصرت ہفت روزہ	آغا اختر حسین خان	جون ۱۹۴۹ء
گلِ خنداں:	منظور احمد، ناصر زیدی، امین ہاشمی	اکتوبر ۱۹۴۹ء
الاعتصام ہفت روزہ	صلاح الدین یوسف	۱۹۴۹ء
ترجمان الحدیث	احسان الٰہی ظہیر	۱۹۴۹ء
اردو ادب:	سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری	۱۹۴۹ء
اقدام	میاں محمد شفیع، ممتاز احمد خان	۱۹۵۰ء
نورونار: ماہنامہ	کلثوم رحمان	اکتوبر ۱۹۵۰ء
سحر: ماہنامہ	فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی	۱۹۵۰ء
آفاق: روزنامہ	ـ	۱۹۵۰ء
شاہ وار: ماہنامہ	سید عاشور کاظمی	جنوری ۱۹۵۱ء
بنت راوی: پندرہ روزہ	ـ	۱۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء
ہنگام سحر: ماہنامہ	اشک بی اے، میاں نیاز احمد	۱۹۵۱ء
ممتاز ہفت روزہ	رشید جاوید	۱۹۵۱ء
الحمراء:	مولانا حامد علی خان	۱۹۵۱ء
ایشیاء: سہ روزہ	مولانا نصر اللہ خان عزیز	۱۹۵۱ء
عادل ہفت روزہ	شورش کاشمیری	۱۹۵۱ء
اقبال: سہ ماہی	ـ	۱۹۵۲ء
محفل: ماہنامہ	طفیل ہوشیار پوری، شورش مسعود	۱۹۵۲ء
ذوق سلیم: ماہنامہ	علامہ فخری	۱۹۵۲ء
آئین	مظفر بیگ	۱۹۵۲ء
لاہور: ہفت روزہ	ثاقب زیروی	۱۹۵۲ء
آثار	منصور علی خاں	۱۹۵۳ء
ملت	خواجہ نذیر، شبلی بی۔کام	۱۹۵۳ء

خیال: ماہنامہ	انتظار حسین	۱۹۵۳ء
محفل: ماہنامہ	طفیل ہوشیار پوری	جنوری ۱۹۵۴ء
ہلال پاکستان	محمد سلیم ایم اے ایل ایل بی اے	۶ اگست ۱۹۵۴ء
نئی تحریریں	قیوم نظر	ستمبر ۱۹۵۴ء
کہکشاں: بچوں کا رسالہ	محمد بشیر دیوانہ، غلام جیلانی	۱۹۵۴ء
داستان گو: ماہنامہ	اشفاق احمد	۱۹۵۴ء
منشور:	مظفر احسانی	۱۹۵۴ء
کھلونا: ماہنامہ	۔	۱۹۵۴ء
ثقافت: ماہنامہ	خلیفہ عبدالحکیم	جنوری ۱۹۵۵ء
عفت: ماہنامہ	۔	جنوری ۱۹۵۵ء
تعمیر انسانیت: ماہنامہ	مولانا کوثر نیازی، عبدالمجید	۱۹۵۵ء
درس قرآن	حاجی عبدالواحد	۱۹۵۵ء
صادق ہفت روزہ	عابد علی عابد، قاسم محمود	جنوری ۱۹۵۶ء
کوہستان	۔	۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء
عکس نو:	حسن زمانی عالمگیر	مارچ ۱۹۵۶ء
نوائے اقبال: ماہنامہ	شیخ عزت اللہ	مئی ۱۹۵۶ء
مجلس: ماہنامہ	رضوی خیر آبادی۔حکیم انور حسن ہاشمی	۱۹۵۶ء
اصلاح: ماہنامہ		۱۹۵۶ء
خدام الدین:	مولانا مفتی محمود	۱۹۵۶ء
معارف السلام	شیخ غیاث الدین	۱۹۵۶ء
لیل و نہار:	فیض احمد فیض، سید سبط حسن، ظہیر بابر، صوفی تبسم، اشفاق احمد	جنوری ۱۹۵۷ء
فطرت: ماہنامہ	رفیق احمد، لطف المنان ساحر	مارچ ۱۹۵۷ء
صحیفہ:	(مجلس ترقی ادب کا سہ ماہی رسالہ)	جون ۱۹۵۷ء

نیا پیام: پندرہ روزہ	محمد اکرم مبین صدیقی	۱۹۵۷ء
مصور: ہفت روزہ	غلام اکبر، جمیل الدین عالی، ذوالفقار رضوی، عاشق چودھری	۱۹۵۷ء
پیام عمل	-	۱۹۵۷ء
کشت زار: ماہنامہ	نصیر وارثی	اگست ۱۹۵۸ء
نقیب: ماہنامہ	-	ستمبر ۱۹۵۸ء
بتول:	حمیدہ بیگم، صفیہ سلطانہ	نومبر ۱۹۵۸ء
اندازے: ماہنامہ	-	۱۹۵۸ء
سکرین لائٹ: ہفت روزہ	شکور بٹ	۱۹۵۸ء
ندائے حق: ماہنامہ	یوسف سلیم چشتی	اپریل ۱۹۵۹ء
فاران:	(اسلامیہ کالج سول لائنز کا ادبی مجلّہ)	۱۹۵۹ء
حرف و حکایت:	عبداللہ بٹ	۱۹۵۹ء
پنکوما:	انجینئرنگ کالج لاہور کا رسالہ	۱۹۵۹ء
محور: سالانہ	احمد یوسفی، ظفر صمدانی، صفدر سلیم، رفیع الدین ہاشمی، عطا الحق قاسمی، امجد اسلام امجد	۱۹۵۹ء
تہذیب:	عشرت رحمانی، عصمت بشیر	اپریل ۱۹۶۰ء
افکارِ نو: ماہنامہ	محمد ارشد خان بھٹی	جون ۱۹۶۰ء
اردو ڈائجسٹ	ڈاکٹر اعجاز احسن قریشی، الطاف حسن قریشی، ظفر اللہ خان، طاہر قادری، امین اللہ وثیر	نومبر ۱۹۶۰ء
اسلوب: ماہنامہ	ضمیر فاطمی، شفیق شمس	۱۹۶۰ء
اقبال ریویو: سہ ماہی	(اقبال اکادمی پاکستان کا مجلّہ)	۱۹۶۰ء
گجر (دو ماہی رسالہ)	-	۱۹۶۰ء
اردو ادب: سہ ماہی رسالہ	اسلم ملک	۱۹۶۰ء

ترجمان اسلام ہفت روزہ	زاہد الراشدی	۱۹۶۰ء
حیات جاوداں: ماہنامہ	میاں عبدالرشید	جنوری ۱۹۶۱ء
سیارہ : ماہنامہ	فضل رحمٰن، نعیم صدیقی	جنوری ۱۹۶۱ء
افسانہ:	محمد غفور خان	جنوری ۱۹۶۱ء
حکایت: ماہنامہ	خورشید عالم، عنایت اللہ	مارچ ۱۹۶۱ء
نوید لاہور: ماہنامہ	-	۱۹۶۱ء
زراعت نامہ: پندرہ روزہ	محکمہ زراعت پنجاب	۱۹۶۱ء
منشور: پندرہ روزہ	راجہ عبدالمجید	جنوری ۱۹۶۲ء
آرگس: دوماہی	عزیز جاوید	جون، جولائی ۱۹۶۲ء
قہقہہ: ماہنامہ	محمود دہلوی	جولائی ۱۹۶۲ء
احوال ہفت روزہ	محمد شریف خان	اکتوبر ۱۹۶۲ء
تہذیب الاخلاق: ماہنامہ	عشرت رحمانی	۱۹۶۲ء
شیعہ:	ملک رضا علی	۱۹۶۲ء
حنفی، ماہنامہ	آغا احسان الحق	۱۹۶۳ء
مشرق: روزنامہ:	-	ستمبر ۱۹۶۳ء
حالات: روزنامہ	سعادت خیالی	۱۹۶۳ء
برگ نو:	دیال سنگھ کالج کا ادبی مجلّہ	۱۹۶۳ء
فنون: سہ ماہی	احمد ندیم قاسمی، حبیب اشعر	اپریل ۱۹۶۳ء
لیڈیز ڈائجسٹ	خان نعیم اللہ خان یوسف زئی، مسرت عزیز	۱۹۶۳ء
خاتون: ماہنامہ		فروری ۱۹۶۳ء
الجریدہ: ماہنامہ	محمد احسن	جنوری ۱۹۶۴ء
رباب: ماہنامہ	زبیدہ انصاری	جون ۱۹۶۴ء

مجلّہ علمی: سہ ماہی رسالہ(ادارہ تحقیقات پاکستان لاہور کا رسالہ)	شیخ عبدالرشید، ڈاکٹر وحید قریشی، شیخ محمد اکرام	جولائی ۱۹۶۴ء
اوراق:	وزیر آغا	جون ۱۹۶۴ء
بچوں کا ڈائجسٹ	حامد اللہ خان	۱۹۶۴ء
ویمن ڈائجسٹ	مسرت عزیز	جنوری ۱۹۶۵ء
الاقتصاد:	ہیلی کالج آف کامرس کا ملہ	جون ۱۹۶۵ء
فلم ڈائجسٹ:	کلیم نشتر	جولائی ۱۹۶۵ء
قارئین ڈائجسٹ:	علی نادر زیدی،حمید عسکری	۱۹۶۵ء
افشاں:	(دیال سنگھ کالج کا علمی مجلّہ)	۱۹۶۵ء
کتاب ماہنامہ	سید قاسم محمود	ستمبر ۱۹۶۶ء
جہاں نما ہفت روزہ	شریف فاروق	۱۹۶۶ء
خیابان: ماہنامہ	-	۱۹۶۶ء
اسلامک ایجوکیشن: دو ماہی	(آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس کا رسالہ)	جنوری ۱۹۶۷ء
گل فشاں:		۱۹۶۷ء
المعارف:	(ادارہ ثقافت اسلامیہ کا ترجمان)	جنوری ۱۹۶۸ء
فیملی ڈائجسٹ:	ارشادعلی نقوی، اعجازعلی جعفری اجمل وجیہہ	مئی ۱۹۶۸ء
زندگی ہفت روزہ	الطاف حسن قریشی، اعجاز حسن قریشی	۸ ستمبر ۱۹۶۹ء
ندائے ملت	مجید نظامی	۲۰ جون ۱۹۶۹ء
سکھی گھر: ماہنامہ	-	اگست ۱۹۶۹ء
اہل حدیث	-	۱۹۶۹ء
پیام عمل: ماہنامہ	ابوالعطاء جالندھری	۱۹۶۹ء
ورلڈ ڈائجسٹ	شاہد زبیری	۱۹۶۹ء
لطرس:	گورنمنٹ کالج لاہور نیو ہوسٹل کا ادبی مجلّہ	۱۹۶۹ء

مشیر کاشتکار : ماہنامہ	ـ	۱۹۶۹ء
تخلیق: ماہنامہ	اظہر جاوید	۱۹۶۹ء
تلاش ڈائجسٹ	ڈاکٹر ایس آئی سرور	جنوری ۱۹۷۰ء
چلمن: ماہنامہ	عابدہ جعفر، مولانا نصر اللہ خان	جنوری ۱۹۷۰ء
کلید صحت ڈائجسٹ	حکیم عبدالرشید جیلانی	جنوری ۱۹۷۰ء
ماہنامہ نو بہار	ظفر اقبال	۲۰ فروری ۱۹۷۰ء
آداب: ماہنامہ	غلام محمد خان	جون ۱۹۷۰ء
مساوات	حنیف رامے، ظہیر کاشمیری، بدر الدین	۷ جولائی ۱۹۷۰ء
احساسات:	ڈاکٹر تبسم رضوانی	جولائی ۱۹۷۰ء
فانوس: ماہنامہ		جولائی ۱۹۷۰ء
فخر خواتین: ماہنامہ	فخر النساء	ستمبر ۱۹۷۰ء
پاک ڈائجسٹ	عبدالکریم ثمر، فضل من اللہ	ستمبر ۱۹۷۰ء
جاوداں:	ـ	۱۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء
تحریریں: ماہنامہ	زاہدہ صدیقی	۱۹۷۰ء
دیہی رضا کار: پندرہ روز	ـ	۱۹۷۰ء
ضیائے حرم: ماہنامہ	پیر محمد کرم شاہ	۱۹۷۰ء
نئی صدی: پندرہ روزہ	ایم صفدر چودھری	۱۹۷۰ء
سورج: ماہنامہ	تسلیم احمد تصور	جنوری ۱۹۷۱ء
انقلاب نو: پندرہ روزہ	عبدالرشید تبسم، یزدانی جالندھری	۱۹۷۱ء
مجلّہ تحقیق	ڈاکٹر وحید قریشی	۱۹۷۱ء
تحریک احمدیہ:	رفیق احمد ثاقب	۱۹۷۱ء
زعفران:	ظفر اللہ خان	مئی ۱۹۷۲ء
نگارش: ماہنامہ	عاشق رسول عاشی	یکم جولائی ۱۹۷۲ء
لفظ:	(اورینٹل کالج، لاہور کا رسالہ)	دسمبر ۱۹۷۲ء

راہ نما:	ـ	۱۹۷۲ء
ایشیاء ڈائجسٹ:	این اے حسین چودھری	مئی ۱۹۷۳ء
محدث	حافظ عبدالرحمٰن مدنی	۱۹۷۳ء
جمہور:	ظہور عالم شہید	۱۹۷۳ء
سیاست:	اثر چوہان، عاشق چودھری	۱۹۷۳ء
شام وسحر: ماہنامہ	شیخ صفدر علی، خالد شفیق، شبیہ الحسن	جنوری ۱۹۷۴ء
بچوں کا باغ: ماہنامہ	ایم یوسف، عبداللہ محمود	۱۹۷۴ء
ملن:	پروین محمد علی	اپریل ۱۹۷۵ء
آنگن : ماہنامہ	رفعت	مئی ۱۹۷۵ء
افریشیا:ہفت روزہ	عبدالقادر حسن	۱۹۷۵ء
چاہت	ضیاء شاہد	اپریل ۱۹۷۶ء
اسلامی جمہوریہ:ہفت روزہ	مجیب الرحمٰن شامی، منصور طیب	۱۴ اگست ۱۹۷۶ء
قومی ڈائجسٹ	مجیب الرحمٰن شامی	جون ۱۹۷۷ء
صداقت: روزنامہ	حسن نثار، منو بھائی، محمد اسحاق قریشی	۲۱ اپریل ۱۹۷۸ء
بادبان:ہفت روزہ	مجیب الرحمٰن شامی	اپریل ۱۹۷۸ء
قافلہ: پندرہ روزہ	سید قاسم محمود	یکم اکتوبر ۱۹۷۸ء
آتش: ماہنامہ	مظہر مصطفیٰ صدیقی	نومبر ۱۹۷۸ء
محراب:	ڈاکٹر سہیل احمد خان، احمد مشتاق	۱۹۷۸ء
پلک	طارق فاروق	۱۹۷۸ء
حنا: ماہنامہ	سردار محمود، رضیہ جمیل	۱۹۷۸ء
معاصر	حبیب اللہ خان	اکتوبر ۱۹۷۹ء
احتساب: ماہنامہ	چاندنی بیگم	۱۹۷۹ء
اردو نامہ:	(پنجاب سیکرٹریٹ کا رسالہ)	مارچ ۱۹۸۱ء
جنگ : روزنامہ		۱۹۸۱ء

تلاش	طارق عزیز	۱۹۸۳ء
قوسِ قزح:	عمرانہ پرویز	۱۹۸۳ء
روایت:	محمد سہیل عمر	۱۹۸۳ء
باغبان: ماہنامہ	منشی نور الدین	یکم جنوری ۱۹۸۶ء
دید شنید:	رفیق ڈوگر	جنوری ۱۹۸۷ء
غنیمت	زمان کنجاہی	۱۹۸۷ء
پاکستانی فلسفہ: سہ ماہی	ڈاکٹر وحید عشرت	۱۹۸۸ء
آواز جہاں	رفعت	۱۹۸۸ء
پاکستان: روزنامہ	-	۱۹۹۰ء
تحقیق نامہ	شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی	۱۹۹۱ء
دن: روزنامہ	لاہور کا تحقیق مجلّہ	۱۹۹۷ء
مخزن	قائداعظم لائبریری کو مجلّہ	۲۰۰۰ء

لاہور میں انیسویں صدی کے نصف دوم میں شائع ہونے والے اخبارات و رسائل:

اخبار/ رسالہ	مالک / ایڈیٹر	سن اشاعت
کوہ نور	منشی ہرسکھ رائے	۱۸۵۰ء
دریائے نور	نجیب الدین حسین،منشی سندر لال،شہسوارالدین	۱۸۵۰ء
اخبار لاہور	-	۱۸۵۰ء
چشمۂ فیض	منشی دیوان چند	۱۸۵۳ء
مفاد ہند	-	۱۸۵۳ء
لاہور گزٹ	بابو تیج چندر	۱۸۵۳ء
ہمارئے بے بہا	منشی دیوان چند	یکم جنوری ۱۸۵۳ء
معلم ہند	محمد احسن کلانوری	یکم جولائی ۱۸۵۴ء
پنجابی اخبار	منشی سیّد محمد عظیم	۱۸۵۶ء
پنجاب جرنل	-	۱۸۵۶ء
خورشید پنجاب	منشی ہر سکھ رائے	جنوری ۱۸۵۶ء
بہار حکمت	-	۱۸۵۷ء
سرکاری اخبار	اجودھیا پرشاد	یکم مئی ۱۸۵۸ء
گنج شائگاں	منشی ہرسکھ رائے	۱۸۶۰ء
بحر حکمت (پندرہ روزہ)	منشی ہر سکھ رائے	۱۸۶۲ء
خیر خواہ پنجاب (ہفتہ وار)	سید محمد عظیم	۱۸۶۵ء
رسالہ انجمن اشاعت مطالب مفیدہ	انجمن پنجاب	۱۸۶۵ء
گیاونی پتر کا	پنڈت مکندرام	یکم جون ۱۸۶۵ء
آفتاب پنجاب	شیخ فقیر محمد، نبی بخش، حافظ عمر دراز، جے گوپال، آیا سنگھ، دیوان عطا سنگھ	۱۸۶۶ء
انوار الشمس (ہفتہ وار اخبار)	دیوان بوٹا سنگھ مولوی نبی بخش	۱۸۶۷ء
اتالیق پنجاب (ماہنامہ)	پیارے لال آشوب معاون مدیر محمد حسین آزاد	۱۸۶۹ء

ہمائے پنجاب (رسالہ)	پنڈت مکند رام، گوپی ناتھ، محمد حسین آزاد	کیم اپریل ۱۸۷۰ء
اخبار عام (ہفت روزہ)	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
پولیس گزٹ (ہفتہ وار)	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
مطلع انوار	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
اردو میڈیکل گزٹ	مکند رام کشمیری، پنڈت گوپی ناتھ	۱۸۷۱ء
پولیس گزٹ	-	۱۸۷۱ء
امیر الاخبار (پندرہ روزہ اخبار)	مہتمم مرزا عبدالقادر بیگ	جنوری ۱۸۷۲ء
حقیقی عرفان	مہتمم مرزا عبدالقادر بیگ	۱۸۷۲ء
کوہ طور	مہتمم مرزا نتھو بیگ	کیم اپریل ۱۸۷۲ء
پنجاب گزٹ	مہتمم مرزا نتھو بیگ	جنوری ۱۸۷۳ء
اردو گورنمنٹ گزٹ پنجاب	مہتمم پیارے لال آشوب	جنوری ۱۸۷۳ء
آفتاب پنجاب اخبار	بوٹا سنگھ ایڈیٹر مولوی نبی بخش جولائی	۱۸۷۳ء
ہادی حقیقت (پندرہ روزہ اخبار)	بابو کیشب چند سین	۱۸۷۳ء
روزنامچہ پنجاب	مدیر نثار علی	کیم جنوری ۱۸۷۴ء
اتالیق ہند (اخبار)	نادر علی سیفی	کیم دسمبر ۱۸۷۴ء
پنجاب میگزین	محمد حسین آزاد	۱۸۷۴ء
رہبر ہند (ہفت روزہ)	منشی نادر علی سیفی	کیم اپریل ۱۸۷۵ء
ہندو باندھو (اخبار)	پنڈت شیو نارائن	کیم اپریل ۱۸۷۵ء
گنجینہ قانون / گنجینہ قوانین ہند (ماہنامہ)	پنڈت سورج بھان	کیم جولائی ۱۸۷۵ء
آریہ سماچار گیت رائے میگزین (ماہنامہ رسالہ)	پنڈت سورج بھان	کیم جولائی ۱۸۷۵ء
ناصر الایمان	نادر علی سیفی	۱۸۷۵ء
مراۃ الہند		۱۸۷۵ء
بحر حکمت	ڈاکٹر رحیم خان	۱۸۷۵ء

گنجینۂ نظائر (ماہنامہ)	مالک منشی ہرسکھ رائے	یکم جنوری ۱۸۷۶ء
البرٹ گزٹ (ہفتہ وار)	مالک خواجہ احمد حسن	۱۸۷۶ء
اخباروں کا قبلہ گاہ	ایڈیٹر مولوی نہال الدین	۱۸۷۶ء
خورشید عالم	مالک منشی جگن ناتھ	۱۸۷۷ء
نور الہدیٰ	غلام اللہ صدیقی	جون ۱۸۷۷ء
حافظ صحت (ماہنامہ)	حکیم غلام نبی -	یکم جنوری ۱۸۷۸ء
اشاعت السنہ	مہتمم مولوی ابو سعید محمد حسین	۱۸۷۸ء
پنجاب پنچ	مدیر منشی محمد دین - نثار علی شہرت	۱۸۷۸ء
دہلی پنچ (ہفت روزہ)	مالک حسین علی فرحت ایڈیٹر مولوی فضل الدین	یکم جون ۱۸۸۰ء
نظائر قانون ہند (ماہنامہ)	مالک رائے سکھ رائے	۱۸۸۰ء
تکمیل الحکمت	ایڈیٹر ڈاکٹر سید اکبر شاہ	۱۸۸۰ء
خزینۃ القوانین (پندرہ روزہ)	مالک سید نادر علی شاہ سیفی	۱۸۸۰ء
سوانح عمری (ماہنامہ)	مہتمم منشی نتھو رام آنند	۱۸۸۲ء
رفارمر	ایڈیٹر پنڈت ہرگوپال	۱۸۸۲ء
آئینہ ہند (ماہوار رسالہ)	مالک لالہ رنگی رام مختار	یکم جنوری ۱۸۸۳ء
کلید قوانین	بانی لالہ زکی رام	۱۸۸۳ء
دھرم جیون	ایڈیٹر پربھ بادی ستیہ - نند اگن ہوتری	۱۸۸۳ء
گلزار حکمت	-	۱۸۸۳ء
گلدستہ انجمن (ماہنامہ)	ایڈیٹر مولوی سیف الحق ادیب	۱۸۸۳ء
ولیش اپکارک (ہفتہ وار)	مالک رائے سالک رام	۱۸۸۳ء
رفیق ہند (ہفت روزہ)	محرم علی چشتی	۵ جنوری ۱۸۸۴ء
آئینہ اخلاق (ہفت روزہ اخبار)	ایڈیٹر عبدالعزیز،عبدالرحمان	۱۸۸۴ء
راوی بے نظیر	ایڈیٹر شیوناتھ	۱۸۸۴ء
ہدایت (ہفتہ وار)	ایڈیٹر مولوی غلام علی قصوری	۱۸۸۴ء
طب حیوانات (ماہنامہ)	ایڈیٹر - ڈاکٹر مجد دین	یکم جولائی ۱۸۸۴ء

خیر خواہ کشمیر (ہفتہ وار)	مالک پنڈت سالگ رام کول	۱۸۸۴ء
شام وصال (روزنامہ)	مہتمم مولوی سیف الحق ادیب	۱۸۸۴ء
نسیم صبح (روزنامہ)	ایڈیٹر منشی سیف الحق ادیب	۱۸۸۴ء
معلم ہند (ماہنامہ)	بانی محمد حسن احسن کلانوری	۱۸۸۴ء
شفیق ہند	مہتمم مولوی سیف الحق ادیب	۱۸۸۴ء
رسالہ انجمن حمایت اسلام (ماہنامہ)	مہتمم مولوی کریم بخش	۱۸۸۴ء
غم خوار ہند	مہتمم علیم الدین	۱۸۸۵ء
طبیب لاہور (ماہنامہ)	اڈیٹر حافظ فخر الدین	۱۸۸۵ء
آفتاب عالم تاب (ہفتہ وار)	ایڈیٹر منشی رام سنگھ	۱۸۸۵ء
لاہور گزٹ (ہفتہ وار)	مالک منشی دیدار بخش	۱۸۸۵
ہر دلعزیز	ایڈیٹر رام سنگھ	۱۸۸۵ء
ناظم الہند	مالک -سید ناظر حسین ناظم	۱۸۸۵ء
کلید جنت	مالک -سردار علی اختر	۱۸۸۵ء
گلدستہ حکمت	مالک -حکیم احمد الدین	۱۸۸۵ء
رہبر ہند (ہفتہ میں دو بار)	مالک - سید نادر علی شاہ سیفی	۱۸۸۵ء
جعفر زٹلی (ہفت روزہ)	محرم علی چشتی، مفتی حفظ الاسلام، محمد بخش، مولوی الہ دین	یکم جولائی ۱۸۸۵ء
شیخ چلی	مالک مان سنگھ	۱۸۸۵ء
ملا دو پیازہ ہفت روزہ	الہ بخش، الہ دین	۱۸۸۶ء
ملکی نامہ بر	ایڈیٹر سید جواد علی شاہ	۱۸۸۶ء
ملکی شہدا	مالک مولوی فضل الدین	۱۸۸۶ء
باغبان (ماہنامہ)	منشی نور الدین	۱۸۸۶ء
تیس مار خان	منشی نور الدین	جنوری ۱۸۸۶ء
اخبار ملکی شہداء (دہلی پنچ کا ضمیمہ)	منشی نور الدین	جنوری ۱۸۸۶ء
پاٹے خان (ہفت روزہ)	محرم علی چشتی، عبدالرحمٰن	۲ جنوری ۱۸۸۶ء
نیو گائیڈ	مالک - ماسٹر غلام حسین	۱۸۸۶ء

امپیریل پیپر (ہفتہ وار)	مالک سید رجب علی	مارچ ۱۸۸۶ء
مجمع علوم و الفنون (ماہنامہ)	ایڈیٹر مولوی عبداللہ خاں	۱۸۸۶ء
خالصہ گزٹ	بانی - جھائی نند گوپال	۱۸۸۶ء
معائنہ	ایڈیٹر سید جواد علی	۱۸۸۶ء
عطّار		۱۸۸۶ء
شریر (پندرہ روزہ)	مہتمم اتم چندر کپور	۲۴ جون ۱۸۸۷ء
روشنی	مالک شیر بخش	۱۸۸۷ء
راوی	مہتمم پنڈت ہرگوپال، پی -ایچ -جی دتاتریہ	۱۸۸۷ء
پبلک نیوز	مہتمم پنڈت ہرگوپال، پی -ایچ -جی دتاتریہ	۱۸۸۷ء
تحفۂ ہند (ہفتہ وار)	ایڈیٹر یوسف علی خاں قزلباش	۱۸۸۷ء
رسالہ مدرسہ علوم اسلامیہ (ماہنامہ)	ایڈیٹر منشی تاج دین	۱۸۸۸ء
"پیسہ اخبار"	منشی محبوب عالم	۱۸۸۹ء
شورمحشر	حکیم محمد شجاع	۱۸۹۰ء
پنجاب کا سماچار	مالک لالہ ہیرا لال کپور	۱۸۹۱ء
شریف بیبیاں	منشی محبوب عالم	۱۸۹۳ء
انصاف پسند	بانی لالہ تولا رام و بخشی تاراچند چھبر	۱۸۹۴ء
زبدۃ اخبار	ایڈیٹر غلام نبی	فروری ۱۸۹۵ء
انتخاب لا جواب	مالک مولوی محبوب عالم	۱۸۹۵ء
تہذیب نسواں	ایڈیٹر شمس العلماء مولوی سید ممتاز علی	۱۸۹۸ء
کشمیری گزٹ (ماہوار)	محمد دین فوق	۱۸۹۹ء

ایسے رسائل جن کا حتمی سن اشاعت معلوم نہیں ہو سکا لیکن تاریخ صحافت کے مطالعہ کی بنا پر انہیں دو حصوں قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد میں منقسم کیا گیا ہے۔

ا) قیام پاکستان سے قبل شائع ہونے والے اخبارات و رسائل

انوار الاسلام : مرزا غلام رسول

ہنٹر: ہفتہ وار، ملا محمد بخش

چندا ہفت روزہ

ریاست : ہفتہ وار

درویش : ماہنامہ، سید ابوالقاسم ولاوری

ساربان: ماہنامہ

حق پبلسٹی کمیٹی کا لاہور کا اخبار

ناکیز:

بت کدہ

خم دار گیسو:

وارث : لالہ بانکے دیال

زلال: ماہنامہ، کے۔ایس۔اچنت

سچا تجن ہفت روزہ

مغلیہ گزٹ: ماہنامہ

گلشن : ماہنامہ، سید نور حسن نور

کاروان مشرق، لیلیٰ، نگاستان، سدا بہار

نیشنل کانگرس ہفت روزہ، ڈاکٹر ستیہ پال

شوق: ماہنامہ، شوق لاہوری

ترجمان: ماہنامہ، تیرتھ رام فیروز پوری

صاف گو: نوائے وطن

اشاعت القرآن ہفت روزہ

ہمالہ ہفت روزہ

جدید نظام: عالم تاب: ہماری دنیا

نیا دور:

ہمدرد: روزنامہ،

انصاف: روزنامہ، مولانا مرتضیٰ احمد خان رکش

آریہ ویر ہفت روزہ

آریہ گزٹ ہفت روزہ

طوفان ہفت روزہ

ساز: ماہنامہ

پنجاب ریویو: ماہنامہ، مولانا ظفر علی خان

ہونہار ہفت روزہ

اوم: ماہنامہ، گورکھ ناتھ نندا

علوم مشرقی ہفت روزہ

موج بہار : ماہنامہ

انوکھی دنیا ہفت روزہ

جگت ویر ہفت روزہ

لطف شہاب: ماہنامہ، پرمانند

نونہال ہفت روزہ

شجاعت ہفت روزہ

نشیمن: ماہنامہ

مشرق دنیا: ماہنامہ، کلیم یوسف

فطرت: ماہنامہ

دوست: ماہنامہ

دھرم: ہفت روز

رہبر ہند: ہفت روزہ

منزل: خالد عرفان، سلطان: مسلم ضیائی، گرد و پیش:

پنجاب سما چار: پنڈت راج نرائن ارمان

ہمکاری: پنڈت راج نرائن ارمان

دیش بھت: ہفت روزہ

گوروگھنٹال: ہفت روزہ

شیر پنجاب: ہفت روزہ

دیش: روزنامہ

سعادت: ہفت روزہ

کرم ویر: ہفت روزہ

امام: روزنامہ، ابوالمعالی مفتی تاج الدین

خاتون: روزنامہ، فاطمہ بیگم (دختر مفتی محبوب عالم)

مجاہد: روزنامہ

خالصہ ویر: روزنامہ

مارننگ نیوز (اردو) روزنامہ

ایثار: روزنامہ

وشو ملاپ، (اردو) روزنامہ

نیو ملاپ: روزنامہ

سرفراز: روزنامہ

پیغام جدید: روزنامہ

ب) قیام پاکستان کے بعد شائع ہونے والے اخبارات

خبرنامہ ہفت روزہ۔ پاکستان انجینئرنگ کمپنی

زراعت و باغبانی: سردار ہردت سنگھ

مشیر صحت: ماہنامہ

نیر اسلام: ہفت روزہ

مشیر الاطباء: ماہنامہ

مبلغ: ماہنامہ

آداب عرض: ماہنامہ

سرتاج: ماہنامہ

ماہ نو: کشور ناہید، قائم نقوی

قانون گو شیخ ' ماہنامہ

نعرہ جنگ: ماہنامہ

مدرس: ماہنامہ

نشان منزل: ماہنامہ

نفیس: ماہنامہ

پنجاب ٹرانسپورٹ: ماہنامہ

اشاعت ادب: ماہنامہ

افسانہ: ماہنامہ

اعادہ شہاب: ماہنامہ

دستور: ماہنامہ، سلیم واحد سلیم

آبشار: ماہنامہ

الحکیم : ماہنامہ
الاعجاز : ماہنامہ
چاند : ماہنامہ
آموزش : ماہنامہ
المستعد : ماہنامہ
شاہین بچے : ماہنامہ
ضیاء : ماہنامہ
شمع : ماہنامہ
بچوں کا باغ: ماہنامہ
درویش : ماہنامہ
گیسو:
راز و حیات : ماہنامہ
آتش کدہ : ماہنامہ
شبستان : ماہنامہ
فلمیشیا : ماہنامہ
دلبستان : گورنمنٹ سائنس کال لاہور کا ادبی مجلّہ
ایچی سونین: ایچی سن کالج لاہور کا ادبی مجلّہ
فاران : اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور
محور : پنجاب یونیورسٹی لاہور
تحفظ : ماہنامہ، ادارہ سماجی تحفظ ملازمین
پوسٹ مین: ماہنامہ، پاکستان پوسٹ مین اینڈ لوئر گریڈ یونین
پاکستان ریلویز:ہفت روزہ، پاکستان ریلوے
امداد باہمی: پندرہ روز، مغربی پاکستان کوپریٹو یونین

عکاس : ماہنامہ
قاصد جدید : ماہنامہ
انجمن : ماہنامہ
انوار العلوم : ماہنامہ
الملک : ماہنامہ
طبی شاہکار : ماہنامہ
شمع نور: ماہنامہ
حقیقت اسلام : ماہنامہ
بھائی بہن : ماہنامہ
دارالفرقان : ماہنامہ
تصور : ماہنامہ
حکیم پاکستان : ماہنامہ
شاہنواز : ماہنامہ
ڈائریکٹر : ماہنامہ
سرچشمہ : گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور صدر کا علمی و ادبی مجلّہ
محمل : اسلامیہ کالج کروپر روڈ کا ادبی مجلّہ
اوج: گورنمنٹ کالج شاہدرہ لاہور
کریسنٹ : اسلامیہ کالج لاہور کا علمی ادبی مجلّہ
اقراء : ایم۔اے۔او کالج کا مجلّہ
گرل گائیڈ : ماہنامہ،عوامی ترقیاتی پروگرام
پاک جمہوریت:ہفت روزہ، وزارت اطلاعات حکومت پاکستان
نوائے لاہور: پندرہ روز، لاہور میونسپل کارپوریشن
کھاد: دو ماہی، نیشنل فرٹیلائز کارپوریشن

منظر: ماہنامہ
مشعل : ماہنامہ
خزینہ مشرق: ماہنامہ
کیتھولک نقیب: ماہنامہ
جلاوطن : ماہنامہ
لالہ رخ: ماہنامہ
پیغام صلح ہفت روزہ
برق ہفت روزہ
سکھی گھر: ماہنامہ، پاپولیشن پلاننگ بورڈ
بہبود: سہ ماہی، محکمہ سماجی بہبود پنجاب
باٹا نیوز ہفت روز، باٹا شو کمپنی پاکستان
سوئی ناردن ہفت روزہ، سوئی ناردن کمپنی
رضوان ہفت روزہ
رفتار زمانہ ہفت روزہ
گل و خار: ہفت روزہ
اجالا: ہفت روزہ
مزدور دنیا: ہفت روزہ
آبشار: ہفت روزہ
کاشتکار جدید : ماہنامہ، رحمت خان تارڑ
آثار حکمت: ماہنامہ
نمونہ: ماہنامہ
مست قلندر: ماہنامہ
بصیرت ہفت روزہ
حقیقت : پندرہ روزہ

خضر راہ: ماہنامہ
مظلوم کشمیر ہفت روزہ
کھلونا: ماہنامہ
خادم الحرمین: ماہنامہ
آئینہ قسمت: ماہنامہ
کاریگر : ماہنامہ
نوائے وطن ہفت روزہ
چشمک: مشکور حسین یاد
برقاب : ماہنامہ، واپڈا کی طرف سے شائع ہوا۔
اپنی زمین: ماہنامہ: زرعی ترقیاتی و سپلائی کارپوریشن
چیمبر نیوز ہفت روزہ، چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری
لیفو ہفت روز، لاہور انجینئرنگ فونڈری
انجمن ہفت روزہ، شورش کاشمیری
ڈرائیور ہفت روزہ
دستکاری: ہفت روزہ
سیف : ہفت روزہ
تیر و نشتر: ہفت روزہ
آشیانہ : ہفت روزہ
حمایت اسلام : ہفت روزہ
خدمت خلق: ماہنامہ
معارف اسلامیہ: ماہنامہ
گل فشاں: ماہنامہ
مست شہاب: ماہنامہ
کہانی، شہاب، اخبار جہاں ہفت روزہ
ہدایت: پندرہ روزہ

رضا کار ہفت روزہ

المائدہ : پندرہ روزہ

تسطیر : سہ ماہی، نردبان

اذاں حق ہفت روزہ

کیفر کردار ہفت روزہ

حرف وحکایت

وحدت ہفت روزہ

احوال ہفت روزہ

نفسیات : ماہنامہ

تریاق: ماہنامہ

کائنات: ماہنامہ، غلام محمد، حامد علی حامد

جہاں اردو : ماہنامہ